100 عظیم مہمات
PDFBOOKSFREE.PK
ترتیب وتدوین: جان کیگنگ
تلخیص وترجمہ: قیصر چوہان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں قارئین کے مطالعے اور دعوتی و اصلاحی مقاصد کے لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

100 GREAT ADVENTURES

ترتیب وتدوین : جان کیٹنگ
تلخیص وترجمہ : قیصر چوہان

علم وعرفان پبلشرز
40-اردو بازار، لاہور فون: 042-7352332-7232336

نام کتاب	....	100 عظیم مہمات
		(100 GREAT ADVENTURES)
مصنف	....	جان کیتنگ
ناشر	....	گل فراز احمد
مطبع	....	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
تلخیص و ترجمہ	....	قیصر چوہان
کمپوزنگ	....	انیس احمد
پروف ریڈنگ	....	مسعود مفتی
سن اشاعت	....	ستمبر 2006ء
قیمت	....	-/300 روپے

☆......ملنے کے پتے......☆

علم و عرفان پبلشرز

34۔اُردو بازار، لاہور فون:7232336-7352332

سیونتھ سکائی پبلی کیشنز

غزنی سٹریٹ، الحمد مارکیٹ، 40-اردو بازار، لاہور

فون:7223584 موبائل:0300-4125230

فہرست

100 عظیم مہمات

''جرأت اور بہادری متاع عزیز ہے اگر جرأت اور بہادری رخصت ہو جائے تو سمجھ لیں کہ سب کچھ رخصت ہو گیا ہے۔'' (سر جیمز باری)

یہ کتاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور سے لیکر اس دور سے متعلق ہے جس دور میں چاند اور ستاروں پر کمندیں ڈالی جارہی ہیں۔ خلا میں گھوڑے دوڑائے جارہے ہیں۔ ہمالیہ کی برف پوش چوٹیاں سر کی جارہی ہیں۔ گھنے جنگلات کی تسخیر سرانجام دی جارہی ہے اور گہرے سمندروں کی گہرائیوں کی پیمائش سرانجام دی جارہی ہے۔

اور یہ انسانی جرأت اور بہادری ہے جو سب کچھ سرانجام دے رہی ہے اور نہ صرف اس کائنات بلکہ خلا کی تسخیر سرانجام دینے پر بھی بنی نوع انسان کو اکسا رہی ہے۔

جرأت اور بہادری کے کئی ایک رنگ اور روپ ہیں۔ یہ جسمانی جرأت کے روپ میں بھی جلوہ گر ہوتی ہے اور اخلاقی جرأت کے روپ میں بھی منظر عام پر آتی ہے۔ زیر نظر کتاب میں آپ جرأت اور بہادری کے ہر ایک روپ سے آشنا ہوں گے۔

جرأت اور بہادری کا مظاہرہ انفرادی طور پر بھی ممکن ہے اور اجتماعی طور پر بھی عین ممکن ہے۔ یہ جرأت اور بہادری ہی ہے جو بنی نوع انسان کو کامیابیوں سے ہمکنار کرتی ہے اور اس سے وہ کارنامے سرانجام دلواتی ہے جسے جان کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ زیر نظر کتاب میں جرأت اور بہادری کی داستانیں پڑھ کر آپ نہ صرف ان سے لطف اندوز ہوں گے بلکہ از حد متاثر بھی ہوں گے اور یہ داستانیں آپ کو بھی یہ تحریک دلائیں گی کہ آپ بھی میدان عمل میں کود پڑیں اور اپنی جرأت اور بہادری کی داستان سنہرے حروف میں رقم کریں۔

تعارف

بہت سے لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مہم جوئی محض تاش کی کھیل......اکاؤنٹینسی......اورڈاک کی ٹکٹیں اکٹھی کرنے میں پنہاں ہے۔ عین ممکن ہے کہ ان کا خیال درست ہو......لیکن یہ ان کا خیال ہے اوران کی اپنی ذات کی حد تک درست ہوسکتا ہے لیکن میرے نزدیک یہ خیال ہرگز درست نہیں ہے۔ میرے نزدیک کوئی بھی واقعہ اس وقت تک اس مہم کے عنوان کا حامل نہیں بن سکتا جو رگوں میں دوڑنے والے خون کی گردش تیز تر کردیتا ہے......دل کی دھڑکن بند کرنے کا سبب بنتی ہے جب تک اس میں دو اجزائے ترکیبی موجود نہ ہوں......جگہ (سپیس) اور نامعلوم کو معلوم کرنے کا شعور۔

سپیس سے میری مراد خلا نہیں ہے۔ بے شک وہ لوگ جو مجھ سے بڑھ کر سائنسی اور فنی ذہن کے حامل ہیں وہ خلا میں گھوڑے دوڑاتے ہیں......خلا کے سفر سرانجام دیتے ہیں اور یہ سفر بھی کسی مہم سے کم نہیں ہوتے۔ میں جس سپیس (جگہ) کی بات کررہا ہوں وہ جگہ اسی زمین پر موجود ہے اور اس لئے وسیع اور کشادہ ہے کہ یہ دیگر بنی نوع انسانوں سے محروم ہے۔ تبت......عربیہ......ہمالیہ......قطب جنوبی......افریقہ وغیرہ۔ وغیرہ......میرے نزدیک مہم جوئی کے لئے یہ مناسب جگہیں ہیں۔ یہاں پر انسان اپنے وسائل کے سہارے روبہ عمل رہتا ہے۔ یہاں پر روزمرہ کی سرگرمیاں مثلاً کھانا......پینا......چہل قدمی کرنا......سونا وغیرہ ایک لمحے کے نوٹس پر کسی بھی خطرناک مہم میں تبدیل ہوسکتا ہے۔

جہاں تک نامعلوم کا تعلق ہے یہ وہ خصوصیت ہے جس نے گُرٹو کی داستان کو خصوصی پذیرائی بخشی جو ایک نئی دنیا میں داخل ہوا......ھورڈ کارٹر جب وہ ٹیٹوٹن خامن کے مقبرے میں داخل ہوا......سان فرانس جب اس نے لہاسا کے بند شہر کے معمے میں گھوڑے دوڑائے۔

یہ دونوں اجزائے ترکیبی ایک کامل مہم کے میرے آئیڈیا کا حصہ ہونے کے علاوہ کچھ اور بھی قدر مشترک کے حامل ہیں۔ یہ دونوں چونکا دینے والے بنتے جارہے ہیں۔ ہر سال دنیا کی خالی جگہیں سڑکوں......ہوائی اڈوں اور پٹرول اسٹیشنوں سے بھر رہی ہیں۔ یہ امر خلاف قیاس دکھائی نہیں دیتا کہ کوئی بھی شخص دوبارہ کسی ایسی نہ معلوم تہذیب کو دریافت کرے جو اسی اہمیت کی حامل ہو جس اہمیت کی حامل ڈاکٹر آرتھر ایونیز نے محض ساٹھ برس بیشتر کریٹ میں دریافت کی تھی۔ لہاسا بھی کبھی نہ معلوم شہر تھا۔ اور قطب جنوبی کی برف تلے امریکنوں نے ایک قصبہ آباد کردیا ہے۔

ماضی کو ایک سنہری دور تصور کرنا محض بے وقوفی ہی نہیں بلکہ ایک جذباتی امر بھی ہے اور انتہائی غلط تصور بھی ہے۔ ایک صدی بیشتر کسی عام شخص کی سنسان اور ویران مگر دلچسپی سے بھرپور مقامات تک رسائی ممکن نہ تھی جبکہ آج لاکھوں لوگ 14 دنوں کی چھٹیوں پر وسطی افریقہ روانہ ہوسکتے ہیں اور ایک ناراض ہاتھی چھٹیاں گزارنے والوں کے لئے ایک متاثر کن اور مہماتی کہانی مہیا کرسکتا ہے جیسی اس نے لونگ اسٹون کے لئے مہیا کی تھی۔ شاید مریخ اور چاند کی صحرائیں آنے والے برسوں میں نئی مہمات کی راہ ہموار کریں۔

ڈیوڈ ایٹ بروگ

عرض ایڈیٹر

لفظ ''مہم'' کی دلبربائی اور دلکشی شاید اس وجہ سے برقرار ہے کہ بہت سے لوگ اس نکتہ نظر کے حامل ہیں کہ یہ ایک ایسی حالت ہے...... ایک ایسی صورت حال ہے جس کے تحت زندگی عام زندگی کے مقابلے میں زیادہ سختی...... شدت اور تندہی کے ساتھ گزاری جاتی ہے۔

درست ہے...... جسمانی صورت حال جس کے تحت ایک مہم جو روبہ عمل ہوتا ہے عام طور پر اس صورت حال سے بڑھ کر برانگیختہ...... متلاطم...... اور پُر ہنگامہ ہوتی ہے جس صورت حال کے تحت اکثر لوگ زندگی گزارتے ہیں۔ اور وہ اکثر برداشت...... بردباری...... ثابت قدمی...... صبر اور حوصلے سے کام لیتا ہے۔ لیکن سب سے بڑھ کر اہم اس کی ذہنی اور اخلاقی صلاحیتیں ہوتی ہیں جو اس قدر وسعت اختیار کر جاتی ہیں کہ عام زندگی میں اس قدر وسعت کا حصول ناممکن ہوتا ہے۔ اور اس امر کا یہ پہلو میرے تجسس کو ابھارنے والا پہلو ہے۔

وہ خصوصیات کیا ہیں؟ سب سے اہم خصوصیت کے بارے میں میں یہ کہوں گا کہ وہ جرأت اور دلیری ہے...... ریاضت ہے' ذہن ہے اور جب ان خصوصیات کا تجزیہ سرانجام دیا جائے تو یہ انسانی جذبے اور روح کے تقریباً تمام تر اعلیٰ اوصاف کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ آپ ذرا غور فرمائیں کہ محض ریاضت ہی کیا کچھ عطا کرتی ہے...... صبر و تحمل...... بے غرضی...... سنجیدگی...... کریم النفسی...... برداشت اور تحمل وغیرہ۔ وغیرہ۔

میں نے زیر نظر کتاب میں انسانی زندگی کی ایک سو عظیم مہمات پیش کی ہیں۔ قارئین کرام کا موڈ کیسا ہی کیوں نہ ہو لیکن مجھے یقین ہے ان مہمات میں ان کیلئے دلچسپی کا سامان ضرور موجود ہے۔ میں انسانی جذبے کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اپنے اظہار خیال کو اختتام پذیر کرنا پسند کروں گا۔

جان کیٹنگ

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکہ معظمہ سے ہجرت

یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام تھے جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبردار کیا تھا۔ سازشی گھر کے دروازے تک آن پہنچے تھے۔ وہ آپس میں صلاح مشورہ کر رہے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سوتے میں قتل کریں (نعوذ باللہ) یا پھر ان کے جاگنے کا انتظار کیا جائے تاکہ حالت بیداری میں ان کو قتل کیا جائے (نعوذ باللہ) تاکہ وہ موت کو اپنے سامنے رقص کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں اور موت کو گلے لگانے سے پیشتر خوف و ہراس کا شکار ہو سکیں۔

لیکن حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کفار کے ارادوں سے باخبر کر دیا تھا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے جانثار صحابی حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر سلا دیں۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کمبل اوڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر پڑے سوئے رہیں تو کفار انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ حضرت علیؓ کو اللہ تعالیٰ کفار کے ہاتھوں شہید ہونے سے بچالے گا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کمرے کی پچھلی کھڑکی سے نکلتے ہوئے مکہ معظمہ کی جانب ہجرت کر جائیں۔

کفار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواب گاہ میں داخل ہو چکے تھے اور اس لمحے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر دراز ہستی بھی بیدار ہو چکی تھی۔ حضرت علیؓ بیدار ہونے کے بعد کفار کی جانب بڑھے۔ کفار نے سوال کیا کہ:۔

''لیکن محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہاں ہیں''؟

حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ:۔

''میں نہیں جانتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہاں ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی حضرت علیؓ نے کفار کو آہستگی مگر مضبوطی کے ساتھ پیچھے کی جانب دھکیل دیا اور بذات خود گھر سے باہر تشریف لے گئے اور چند لمحوں میں کفار کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

کفار مدینہ اپنی سازش کی ناکامی پر غم و غصے اور خوف و ہراس میں مبتلا ہو چکے تھے۔ انہوں نے جلد از جلد ایک بڑے انعام کا اعلان کر دیا۔ ایک گھنٹہ بعد مکہ شریف کی ہر ایک دیوار پر انعام کا اعلان جلی حروف کے ساتھ لکھا نظر آ رہا تھا کہ:۔

''100 اونٹ...... 100 اونٹ سے ایک اونٹ بھی کم نہ ہوگا...... اس مرد، عورت یا بچے کو انعام کے طور پر دیے جائیں گے جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زندہ یا مردہ پکڑ کر لائے گا''

اس قدر بڑے انعام کا اعلان کیوں کیا گیا؟

اس ہستی کو گرفتار کرنے کی جدوجہد کیوں سرانجام دی گئی جس ہستی نے ایک نیا دین...... دین اسلام متعارف کروایا تھا؟

وہ ہستی کفار کو کیا نقصان پہنچا سکتی تھی؟

کفار مدینہ جو سازشوں میں مصروف تھے ان کے پاس ان سوالات کے جواب میں معقول وجوہات موجود تھیں۔ نیا مذہب...... اسلام ...... اس مذہب کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ یہ مذہب ایسے نظریات کا درس دیتا تھا جو جلد ہی انسانی تصورات پر چھا جاتے تھے اور یہی نظریات کفار کو نقصان دہ دکھائی دیتے تھے کیونکہ یہ انسانی عمل ورآمد...... چال ڈھال...... اور اخلاق کی تربیت سرانجام دیتے تھے اور انسان کو صحیح معنوں میں انسانیت کے عظیم مرتبے پر فائز کرتے تھے۔

لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ کفار کو اس نئے مذہب کو متعارف کروانے والی ہستی پر اعتراض تھا۔ یہ نوجوان ہستی روزانہ ہی کئی ایک لوگوں کو حلقہ اسلام میں داخل کر رہی تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چھ برس کی عمر میں یتیم ہو گئے تھے۔ نوجوان ہونے پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت خدیجہؓ کا سامان تجارت مکہ تشریف سے دیگر مقامات تک لے جانے لگے۔ حضرت خدیجہؓ کو وراثت میں ایک وسیع کاروبار ملا تھا جو آج کل کے درآمدی برآمدی کاروبار کی طرز کا حامل تھا۔ وہ بڑی باقاعدگی کے ساتھ بڑے بڑے قافلے تجارتی سامان کے ہمراہ مدینہ شریف سے عرب کے دور دراز علاقوں اور شام وغیرہ روانہ کرتی تھیں۔ ان کو ایک ذہین، قابل اور ایماندار نوجوان کی ضرورت تھی جو سامان تجارت کے حامل قافلے کی رہنمائی سرانجام دے سکے اور کاروباری امور دیانت داری اور خوش اسلوبی کے ساتھ چلا سکے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت خدیجہؓ کی ایک دوسرے کیلئے قدر و منزلت اور عزت اس حد تک بڑھی کہ دونوں برگزیدہ ہستیاں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئیں حالانکہ حضرت خدیجہؓ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عمر میں پندرہ برس بڑی تھیں۔

شادی سے کچھ ہی عرصہ بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرما رہا ہے کہ:۔

"اللہ ایک ہے...... وہی حقیقی خدا ہے"

اور اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بھی فرما رہا ہے کہ:۔

"نئے دین...... دین اسلام کو تمام تر عرب میں پھیلا دیں...... نیا دین...... سچا دین...... اور بت پرستی کا خاتمہ فرما دیں"۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی نازل ہونے شروع ہو گئی۔ یہ وحی حضرت جبرائیل علیہ السلام لے کر آتے تھے۔ یہودی اور عیسائی دونوں مذاہب کے لوگ بھی حضرت جبرائیل علیہ السلام کے بارے میں جانتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کے پاس آتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تھی تب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نیم بے ہوشی جیسی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور مابعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حالت سنبھل جاتی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ سب کچھ فرما دیتے تھے جو وحی کے ذریعے آپ صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم تک پہنچا ہوتا تھا۔

خواتین میں حضرت خدیجہؓ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سب سے پہلے ایمان لائی تھیں۔ اسلام کی اشاعت کا آغاز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر سے ہوا تھا۔ اس وقت تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھلم کھلا اسلام کی تبلیغ کا آغاز نہیں فرمایا تھا۔ اسلام اپنے پیروکاروں پر عیش و عشرت اور حرام کاری کے دروازے بند کر دیتا تھا۔ اسلام محض غریبوں پر ہی شراب نوشی پر پابندی عائد نہیں کرتا تھا کہ وہ اپنی غربت کے باعث شراب خریدنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے بلکہ امیروں پر بھی شراب نوشی پر پابندی عائد کرتا تھا اور مکہ شریف کے امیروں کو یہ بات قابل قبول نہ تھی۔ مکہ شریف تاجروں اور امراء کا شہر تھا۔ لہٰذا کفار مکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ہو گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان لینے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلام کی تبلیغ میں مصروف رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو پیغام بھی موصول ہوتا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے حرف بہ حرف لوگوں تک پہنچا دیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ:۔

"اللہ ایک ہے جس نے اپنے بندوں کیلئے زندگی گزارنے کی راہیں متعین کر دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کیلئے کئی ایک پیغمبر اور رسول بھیجے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اللہ کے رسول تھے اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اللہ کے آخری رسول ہیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کو لاحق خطرہ دن بہ دن بڑھتا چلا جا رہا تھا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ شریف کو چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔ البتہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ کرامؓ کو مکہ شریف چھوڑنے کی اجازت فراہم کر دی اور یہ ذمہ داری بھی عائد کی کہ مکہ شریف کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی لوگوں کو دین اسلام کی دعوت پیش کریں۔

لہٰذا کچھ صحابہ کرامؓ 275 میل کا سفر طے کرتے ہوئے مکہ سے مدینہ جا پہنچے۔

حتیٰ کہ وہ وقت بھی آن پہنچا کہ کفار مکہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل (نعوذ باللہ) کرنا چاہتے تھے۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ محسوس کیا کہ انہیں اب مکہ شریف سے ہجرت فرما لینی چاہئے اور مدینہ شریف میں اللہ تعالیٰ کے دین کی تبلیغ جاری رکھنی چاہئے۔

یہ سب کچھ کہنا آسان تھا لیکن اس پر عملی طور پر عمل درآمد کرنا انتہائی مشکل تھا۔ کفار مکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کسی طور پر یہ اجازت فراہم کرنے پر آمادہ نہ تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ شریف سے ہجرت کرتے ہوئے مدینہ شریف جا پہنچیں اور دین اسلام کو تقویت پہنچائیں اور قوت وطاقت حاصل کرتے ہوئے مکہ شریف واپس پہنچ کر ان پر غلبہ حاصل کر لیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس امر سے بخوبی واقف تھے اور حضرت علیؓ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر دراز کفار مکہ کو ان کے بد ارادوں سمیت روکے ہوئے تھے اس دوران آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی ایسی مخفی جگہ کی تلاش میں تھے جہاں سے وہ مدینہ شریف کے سفر کا آغاز کر سکیں۔

انہوں نے اپنے ایک اور جان نثار صحابی حضرت ابوبکرؓ کے گھر کا انتخاب کیا اور یہاں پر انہوں نے سفر کی تیاری کا اہتمام کیا۔ پہلے انہوں نے ایک غار میں قیام فرمایا...... غار ثور...... یہ غار مکہ شریف سے پیدل ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع تھی اور اس وقت تک غار میں قیام پذیر رہے حتیٰ کہ وہ بحفاظت مدینہ شریف کے سفر کا آغاز کر سکیں۔

انہوں نے ستاروں بھری رات میں مکہ شریف کو خیر باد کہا۔ وہ غار تک پہنچے اور بڑی دقت سے اپنے آپ کو اس غار میں چھپایا۔ انہوں نے غار کے اندر کفار مکہ کی آوازیں سنیں جو غار تک پہنچ چکے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ نے کانپنا شروع کر دیا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سرگوشی کے انداز میں فرمایا کہ:۔

''حوصلہ رکھو...... حوصلہ رکھو''

حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ:۔

''آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کفار مکہ کی آوازیں سنیں۔ وہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں اور ہم محض دو ہیں''

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:۔

''نہیں...... ہم دو نہیں ہیں بلکہ تین ہیں کیونکہ ہمارا خدا بھی ہمارے ساتھ ہے''۔

اس دوران اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک مکڑی نے غار کے منہ پر اپنا جالا بُن دیا۔

کفار مکہ غار کے منہ تک پہنچ چکے تھے۔

ایک شخص نے با آواز بلند کہا کہ:۔

''میرا خیال ہے کہ وہ اس غار میں چھپے ہوئے ہیں''

دوسری آواز سنائی دی کہ:۔

''دیکھو...... غار کے اندر دیکھو۔ وہ یہیں موجود ہیں۔''

اس کے بعد ملی جلی آوازیں بلند ہوئیں کہ:۔

''دیکھو...... غار کے منہ پر مکڑی نے جالا بُن رکھا ہے۔ اگر وہ غار میں داخل ہوتے تو لازماً یہ جالا ٹوٹ جاتا...... لیکن یہ جالا صحیح سالم موجود ہے...... لہٰذا وہ کیسے اس غار کے اندر موجود ہو سکتے ہیں''۔

لہٰذا کفار مکہ واپس لوٹ گئے اور ان کے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی جو وہ واپسی کے لئے اٹھا رہے تھے۔ اگلے روز ابوبکرؓ کے بچے غار کے مکینوں کے لئے کھانا لے کر آن پہنچے...... اس سے اگلے روز اور اس سے بھی اگلے روز وہ برابر کھانا پہنچاتے رہے۔ وہ روزانہ مختلف راستوں سے غار تک پہنچتے تاکہ کفار مکہ کو ان کے سفر کی خبر نہ ہو سکے۔

تیسری شب حضرت ابوبکرؓ کا خادم دو اونٹوں کے ہمراہ آن پہنچا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اونٹوں پر سوار ہو کر مدینہ

شریف کی جانب چل دیے۔ انہوں نے مدینہ شریف کی جانب جانے والے عام راستے سے ہٹ کر سفر کا آغاز کیا۔ انہوں نے جس راستے کا انتخاب کیا اس راستے پر بہت کم لوگ سفر طے کرتے تھے۔

لیکن ایک گھنٹے بعد انہوں نے اپنے پیچھے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنی۔

حضرت ابوبکرؓ نے گھبراتے ہوئے کہا کہ:۔

''یہ کیا ہے؟''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:۔

''یہ گھوڑ سوار ہے......لیکن گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ:۔

''یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم پکڑے جائیں گے۔ ہمارے مقدر ہار چکے ہیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:۔

''پریشان مت ہو......میں تمہیں دوبارہ فرمارہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔''

اس دوران گھوڑ سوار ان تک پہنچ چکا تھا۔ اس گھوڑ سوار کا نام سراقہ تھا۔ جوں ہی گھوڑ سوار ان کے نزدیک پہنچا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:۔

''خدا ہمارے ساتھ ہے۔''

اس کے ساتھ ہی سراقہ کے گھوڑے میں زبردست جنبش ہوئی اور اس نے اپنے سوار کو دور پھینک دیا۔

گھوڑے کے اس عمل سے سراقہ معاملے کی سنگینی کو سمجھ چکا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ وہ جو کچھ کرنے جارہا تھا یہ اس کے اس بدارادے کی سزا کی ابتداء تھی اور خدا کی جانب سے اظہار ناراضگی تھا۔ لہٰذا وہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معافی کا طلب گار ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سراقہ کو معاف فرمادیا اور وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واپس لوٹ گیا۔

باقی ماندہ سفر کے دوران کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ چند دنوں کے بعد وہ مدینہ شریف سے دو میل کے فاصلے تک پہنچ چکے تھے۔ یہاں پہنچنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اونٹ نے آگے جانے سے معذوری ظاہر کردی اور اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس اشارے کو سمجھ گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چار روز تک اسی مقام پر قیام فرمایا جبکہ مدینہ شریف کے لوگوں نے جب ان کی آمد کی خبر سنی تو وہ ان کو خوش آمدید کہنے کے لئے گھروں سے چل نکلے۔

چوتھے روز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبا کے مقام تک پہنچ چکے تھے۔ اس مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ نماز ادا کی اور خطبہ ارشاد فرمایا اور دوبارہ اسلام کے ان ستونوں کی نشاندہی فرمائی جن پر اسلام کی عمارت قائم تھی اور مابعد مدینہ شریف کی جانب سفر

جاری رکھا۔

مدینہ شریف کے ایک گھر کے سامنے پہنچ کر اونٹ رک گیا اور نیچے بیٹھ گیا۔ اس گھر کا مکین خوشی سے دیوانہ ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کا مہمان بن رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس گھر میں تشریف لے گئے۔

چند روز بعد حضرت علیؓ بھی مدینہ شریف پہنچ گئے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ حضرت عائشہؓ بھی مدینہ شریف پہنچ گئیں اور بچے بھی مدینہ شریف آن پہنچے۔ اسلامی قوانین کے تحت اگر مرد چاہے تو وہ چار شادیاں کر سکتا ہے (عربوں کے بت پرستوں میں اس سلسلے میں کوئی حد مقرر نہ تھی) لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ کی زندگی مبارک میں دوسری شادی نہ کی تھی۔

لہٰذا تاریخ کی ایک قسط اپنے اختتام کو پہنچی ...... اور نئے دور کا آغاز ہوا ...... عیسوی کیلنڈر کے مطابق یہ 622 بعد از مسیح کا دور تھا اور اسی تاریخ سے ہجرت کے کیلنڈر کا آغاز ہوا اور مسلمان سن ہجری کے حساب سے اپنا کیلنڈر تیار کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسے دور کا آغاز تھا جو مختلف واقعات سے بھرا پڑا تھا ...... چند برسوں کے دوران محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ شریف فتح کر لیا اور یہ شہر بھی آپ کے زیر سایہ چلا آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شہر کو مذہب کے ایک روحانی مرکز کا درجہ دیا (جبکہ مدینہ شریف کو ایک سیاسی مرکز کا درجہ حاصل تھا) ...... وہ مذہب جو جلد ہی آدھی دنیا پر چھا گیا۔

موسیٰ علیہ السلام اور وعدہ کردہ سرزمین

بائبل کی پہلی پانچ کتب ...... پینٹا ٹک (ایک نام جو یہودیوں کی تورات کیلئے استعمال ہوتا تھا...... پرانی انجیل کی پہلی پانچ کتب) موسیٰ علیہ اسلام کی کتب کہلاتی ہیں۔ ان کے بارے میں ایک خوش کن مگر غلط تصور قائم کیا گیا ہے کہ یہ کتب موسیٰ علیہ اسلام نے تحریر کی تھیں...... انہوں نے یہ کتب تحریر نہیں کی تھیں...... لیکن ان تمام میں ان کا ذکر موجود ہے ماسوائے پہلی کتاب۔ انہوں نے ایک طویل زندگی گزاری...... شاید انہوں نے ایک صد بیس برس زندگی پائی تھی...... اور اپنی پیدائش کے لمحے سے لے کر موت کو گلے لگانے تک...... وہ اس سرزمین کی جھلک دیکھتے رہے تھے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔ یہ اس مہم کی داستان ہے اس قسم کی جوش' جذبے اور ولولے سے بھرپور داستان شاید ہی دیکھنے میں آئی ہو۔ یہاں پر ہمارا تعلق ان کی عظیم کامیابی سے ہے...... اسرائیلیوں کو مصر سے نکالنا اور وعدہ کردہ سرزمین تک ان کی رہنمائی سرانجام دینا...... لیکن جن حالات میں ان کی پیدائش ہوئی اس کو بھی مدنظر رکھنا انتہائی ضروری ہے کیونکہ یہ حالات ان کی تمام تر زندگی پر اثرانداز ہوئے تھے۔

انہوں نے مصر میں ایک اسرائیلی کے طور پر جنم لیا تھا جہاں پر اسرائیلی کئی نسلوں بیشتر ہجرت کر کے آباد ہوئے تھے...... کیونکہ ان کی آبائی سرزمین کنعان قحط کا شکار ہو چکی تھی...... جو اب اسرائیل ہے۔ پہلے پہلے انہیں مصر میں خوش آمدید کہا گیا اور شاہ مصر فرعون نے ان کو پذیرائی بخشی اور ان کو اپنی سرزمین پر شرف قبولیت بخشا کیونکہ یہ لوگ جفاکش اور محنتی تھے اور گراں قدر مہاجر ثابت ہو سکتے تھے۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا...... برسوں پر برس بیتتے چلے گئے اور اسرائیلی نہ صرف خوشحالی کی منزل کی جانب گامزن ہو گئے بلکہ ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بالالفاظ دیگر ان کی آبادی بڑھتی چلی گئی اور دوسری جانب مصریوں کا جوش' جذبہ اور ولولہ ماند پڑتا چلا گیا۔ جیسا کہ بائبل فرعون کے منہ سے نکلے ہوئے اسرائیلیوں کے بارے میں الفاظ کو کچھ یوں بیان کرتی ہے کہ:۔

> ''خبردار...... اسرائیلی نہ صرف تعداد میں ہم سے بڑھ کر ہیں بلکہ طاقت اور قوت میں بھی ہم سے بڑھ کر ہیں۔ آؤ ہم دانش مندی کے ساتھ ان سے نپٹیں۔ بیشتر اس کے کہ وہ تعداد میں مزید بڑھ جائیں اور ہم سے برسرپیکار ہو جائیں یا پھر ہمارے دشمنوں سے جا ملیں اور ہمارے خلاف صف آرا ہو جائیں ہمیں ان سے احسن طریقے سے نپٹ لینا چاہئے''

لہٰذا فرعون نے ان پر نگران مقرر کر دیئے کہ:۔

> ''وہ انہیں ایذا دیں...... ان پر غضب نازل کریں...... انہیں مصیبت میں ڈالیں...... لیکن انہوں نے جتنا انہیں مصیبت میں ڈالا اتنا ہی وہ پھلتے پھولتے رہے اور ان کی تعداد مائل بہ اضافہ رہی اور وہ اسرائیلیوں سے عاجز آ چکے تھے''۔

لہٰذا جلد ہی فرعون نے یہ مناسب سمجھا کہ وہ اسرائیلیوں کے خلاف ایک قانون پاس کرے اور اس نے یہ قانون پاس کیا کہ:۔

''اسرائیلیوں کے ہاں جولڑکا بھی جنم لے گا اسے دریا میں بہادیا جائے گا اور جولڑکی جنم لے گی اسے زندہ رکھا جائے گا۔''

اور یہ صورت حال جاری تھی جبکہ موسیٰ علیہ السلام نے جنم لیا۔ان کی والدہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ انہیں دریا کے حوالے کرے۔لہٰذا انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کوایک ٹوکری میں ڈالا اوراس ٹوکری کو دریائے نیل کے کنارے رکھ دیا اس امید کے ساتھ کہ کسی رحم دل شخص کی نظران پر پڑ جائے اوروہ بچے پر رحم کھائے اوراس کے علم میں یہ بات نہ آئے کہ یہ بچہ ایک اسرائیلی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی خواہش پوری ہوئی۔فرعون کی بیٹیوں میں سے ایک بیٹی دریا پر نہا رہی تھی۔اس کی نظر اس ٹوکری پر جا پڑی جس کے اندر ایک بچہ موجود تھا۔اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ٹوکری میں موجود بچہ ایک مصری بچہ نہ تھا بلکہ ایک اسرائیلی بچہ تھا۔فرعون کی بیٹی ہونے کے ناطے وہ جو چاہے کر سکتی تھی......لہٰذا اس نے بچے کو اٹھایا اوراسے اپنے گھر لے آئی......اسے اپنا بیٹا بنالیا اوراس کا نام موسیٰ (علیہ السلام) رکھا۔

لہٰذا موسیٰ علیہ السلام بحفاظت پرورش پانے لگے اوروہ بھی فرعون کے محل میں......وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ وہ ایک اسرائیلی ہیں اوران کوانفرادی طور پر خوشنودی حاصل ہے۔لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ اسرائیلیوں کیلئے جو کچھ بھی کرسکیں ضرور کریں۔ایک روز وہ دریا کے کنارے چہل قدمی کر رہے تھے جہاں پر اسرائیلی مصری محافظوں کے زیر سایہ کام میں مصروف تھے۔انہوں نے دیکھا کہ ایک مصری نگران ایک اسرائیلی کو ایک چھڑی کی مدد سے زدوکوب کر رہا تھا......مار پیٹ رہا تھا۔

یہ دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام فوری طور پر مشتعل ہو گئے۔وہ اس مصری کے پاس گئے اوراسے ایک زوردار گھونسہ رسید کیا۔وہ مصری گھونسے کی تاب نہ لاتے ہوئے جاں بحق ہو گیا۔موسیٰ علیہ السلام نے اس کی لاش کو ریت میں دفن کیا اور وہاں سے چل دیے۔

لیکن وہ مشاہدے میں آ چکے تھے اوران کی اس حرکت کے بارے میں فرعون کو بھی مطلع کر دیا گیا تھا۔لہٰذا موسیٰ علیہ السلام کو اپنی جان بچانے کی فکر لاحق ہوئی اور مدائن جیسے دور دراز علاقے کی جانب چل دیے۔اس علاقے میں پہنچنے کے بعد انہوں نے اس علاقے کی ایک بزرگ ہستی کی بیٹی سے شادی کر لی اور بھیڑ بکریاں چرانے لگے اور سالہا سال تک اسی مقام پر قیام پذیر رہے۔

ایک روز جبکہ وہ اپنی بکریوں کو چرا رہے تھے وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کے سامنے ایک چھوٹی سی جھاڑی میں اچانک آگ بھڑک اٹھی تھی۔انہوں نے حیرانگی کے ساتھ اس آگ کی جانب دیکھا اور جوں ہی انہوں نے اس آگ کی جانب دیکھا آگ مزید بھڑکنے لگی۔اگرچہ جھاڑی آگ کی لپیٹ میں تھی لیکن آگ اسے کوئی نقصان نہ پہنچا رہی تھی۔وہ اس جھاڑی کے مزید قریب چلے آئے تاکہ اس حیران کن منظر کو بخوبی دیکھ سکیں۔

اچانک جھاڑی کے عین درمیان سے ایک آواز سنائی دی کہ:۔

''موسیٰ (علیہ السلام)......موسیٰ (علیہ السلام)''

موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ:۔

''میں یہاں موجود ہوں......''

یہ آواز اللہ تعالیٰ کی آواز تھی...... موسیٰ علیہ السلام کو بتایا گیا کہ اب وقت آن پہنچا تھا کہ اسرائیلی...... موسیٰ علیہ السلام کے اپنے لوگ...... موسیٰ علیہ السلام کی امت کو مصر سے نکالا جائے اور انہیں موسیٰ علیہ السلام کی وساطت سے وہاں سے نکالا جائے جوان کی رہنمائی سرانجام دیتے ہوئے انہیں اس سرزمین کی جانب لے جائیں جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اب کیا تھا۔

''ایک اچھی سرزمین...... ایک وسیع وعریض سرزمین...... ایک ایسی سرزمین جہاں پر دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہوں۔''

حقیقت یہ تھی کہ کنعان جس کو اسرائیلی چھوڑ آئے تھے...... سالہا سال بیشتر چھوڑ آئے تھے اب اس سرزمین پر قحط سالی ہرگز نہ تھی۔ اب وہاں پر ہر اچھی چیز کی فراوانی تھی اور اب اللہ تعالیٰ نے اسرائیلیوں سے اس سرزمین کا وعدہ فرمایا تھا۔

موسیٰ علیہ السلام حسب ہدایت مصر واپس لوٹ آئے۔ وہ کافی برس مصر سے باہر گزار کر آئے تھے...... ان کا جرم محو کیا جا چکا تھا اور اس دور کے دوران جس روز میں موسیٰ علیہ السلام سے جرم سرزد ہوا تھا جس فرعون کی حکومت تھی وہ بھی موت سے ہمکنار ہو چکا تھا۔ اب جس فرعون کی حکومت تھی موسیٰ علیہ السلام نے اس تک رسائی حاصل کی اور اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اسرائیلیوں کو مصر سے جانے کی اجازت فراہم کی جائے۔ یہ سن کر فرعون ناراض ہوا اور اس نے اجازت فراہم کرنے سے انکار کر دیا۔ فرعون اس قدر مشتعل ہوا کہ اس نے اسرائیلیوں کے ساتھ پہلے سے بھی بدتر سلوک روا رکھنا شروع کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ہدایت فرمائی کہ وہ فرعون کو خبردار کریں کہ اگر اس نے اسرائیلیوں کو مصر سے نکل جانے کی اجازت فراہم نہ کی تو اس کا ملک طاعون کی وبا کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ اس کے علاوہ اس کا ملک یکے بعد دیگرے کئی ایک وباؤں کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ لہٰذا یکے بعد دیگرے کئی ایک وباؤں نے فرعون کے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا لیکن وہ بضد رہا اور اسرائیلیوں کو مصر سے نکل جانے کی اجازت فراہم کرنے سے انکاری رہا...... کیونکہ وہ غلام تھے...... وہ ان کے مقاصد کی تکمیل سرانجام دیتے تھے لہٰذا انہیں مصر میں ہی مقیم رکھنا ضروری تھا۔

لیکن اس کا ملک جب دسویں وبا کی لپیٹ میں آیا جو ایک خطرناک ترین وبا تھی تب وہ اجازت دینے پر آمادہ ہو گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے خبردار کیا کہ رات کے دوران اللہ تعالیٰ مصر کی سرزمین پر غذاب نازل کرے گا اور اس سرزمین کے ذی روح اور درندے ہلاک کر دیئے جائیں گے مگر اسرائیلی اس عذاب سے محفوظ رہیں گے۔

موسیٰ علیہ السلام کی پیشن گوئی درست ثابت ہوئی۔ اسرائیلیوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا لیکن مصریوں کو عظیم نقصان سے دوچار ہونا پڑا:۔

''مصر میں چیخ وپکار کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں...... مصر کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جس سے کوئی نہ کوئی موت سے ہمکنار نہ ہوا ہو''

فرعون نے غم وغصے اور صدمے سے دوچار ہو کر موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ وہ اسرائیلیوں کو مصر سے نکل جانے کی اجازت فراہم کر دے گا کیونکہ اب اس اجازت کے فراہم کرنے کا وقت آن پہنچا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو اس سرزمین پر لے جانا چاہتے تھے جس سرزمین کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا...... کنعان کی سرزمین...... جس میں دودھ اور شہد کی بہتات تھی۔

اس سرزمین پر اہل کنعان اور دیگر اقوام کی بھی بہتات تھی جو نئے آنے والوں کو خوش آمدید کہنے کو تیار نہ تھے۔

بہر کیف موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو اکٹھا کرتے ہوئے اس روٹ پر سفر کرنے کیلئے تیار ہوئے جس روٹ کی نشاندہی اللہ تعالیٰ نے کی تھی۔

اس دوران فرعون کا ذہن بھی تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ اسرائیلیوں کے تعاقب میں اپنی رتھ دوڑا رہا تھا۔ وہ جس قدر تیز اپنی رتھ کو دوڑا سکتا تھا اسی قدر تیز اس کو دوڑا رہا تھا تا کہ جلد از جلد اسرائیلیوں تک جا پہنچے اور انہیں دوبارہ گرفتار کرے۔ وہ اکیلا نہ تھا بلکہ چھ صد منتخب افراد اس کے ہمراہ تھے۔

فرعون کو اپنے تعاقب میں آتا دیکھ کر اسرائیلی گھبرا گئے اور وہ موسیٰ علیہ السلام کو بُرا بھلا کہنے لگے اور کہنے لگے کہ:-

''ہمارے لئے یہ بہتر تھا کہ ہم اہل مصر کی خدمات سرانجام دیتے رہتے بجائے اس کے کہ اب ان کے ہاتھوں لقمہ اجل بنیں''۔

لیکن موسیٰ علیہ السلام پُرسکون تھے۔ انہوں نے سمندر پر اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔ ان کی قوم کے پاس سمندر عبور کرنے کی کوئی کارگر تدبیر نہ تھی۔ وہ فرعون اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ لگنے سے بچ نہیں سکتے تھے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور منظور تھا۔ اللہ کے حکم سے سمندر کا پانی دو حصوں میں منقسم ہو گیا اور درمیان میں خشک راستہ نمودار ہو گیا۔ اسرائیلیوں نے اس راستے پر چلتے ہوئے سمندر کو بخوبی عبور کر لیا۔ پانی ان کے دائیں اور بائیں دیوار کی صورت میں کھڑا تھا۔

اہل مصر اتنے خوش قسمت نہ تھے جتنے خوش قسمت اسرائیلی واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی اسرائیلیوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس خشک راستے سے سمندر عبور کرنے کی کوشش کی۔ لیکن پانی آپس میں مل گیا اور فرعون کی گاڑیاں اور گھوڑ سوار سمندر میں ڈوب گئے۔

سالہا سال کی قید کے بعد اب اسرائیلی آزاد تھے۔

لیکن انہوں نے شکر کا کلمہ نہیں پڑھا تھا۔ وہ بیابان، صحرا اور جنگل کے سفر پر اعتراض کرتے تھے جس کو وہ اب سرانجام دے رہے تھے۔

انجیل کی پرانی کتاب پڑھتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام کی عظمت اور اپنی قوم کے لئے رحمدلی کا احساس بڑھ چڑھ کر ہوتا ہے۔

وہ کئی برس تک سفر طے کرتے رہے۔ یہ سفر وہ کنعان کی اس سرزمین میں داخل ہونے کے لئے سرانجام دے رہے تھے جس سرزمین کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔

سالہا سال کے بعد...... بقول بائبل 40 برس بعد...... اسرائیلی اس قابل ہوئے کہ وہ اس سرزمین میں مشرق کی جانب سے داخل ہو سکیں جس سرزمین کا ان کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کی عمر اس وقت 120 برس کو پہنچ چکی تھی...... اللہ تعالیٰ انہیں ایک پہاڑی پر لے گیا۔ جہاں سے وہ نہ صرف کنعان کو دیکھ سکتے تھے بلکہ اپنی قوم کو بھی دریائے اردن عبور کرتے اور شہر میں داخل ہوتے دیکھ سکتے تھے۔

موسیٰ علیہ السلام کا مشن مکمل ہو چکا تھا۔ لہٰذا ان کا وقت بھی پورا ہو گیا اور وہ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔

موسیٰ علیہ السلام کی زندگی مہم جوئی کی ایک لمبی داستان تھی۔

......❁......

اسسی کے سینٹ فرانسس نے بھیڑیئے پر غلبہ حاصل کر لیا

گھاس پر خون بکھرا پڑا تھا...... ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے کسی نے جان بوجھ کر خون سے بھری ہوئی بالٹی گھاس پر بکھیر دی ہو...... اس نے مزید قریب جا کر دیکھا...... خون میں رنگے ہوئے کپڑے کا ٹکڑا بھی پڑا تھا...... اس نے دوبارہ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی...... اسے ایک اور خون آلود کپڑے کا ٹکڑا دکھائی دیا...... یہ کسی عورت کے اسکرٹ کے کپڑے کا ٹکڑا دکھائی دے رہا تھا۔

''نہیں فادر...... آپ کو آگے نہیں جانا چاہیئے۔ یہ یقیناً موت کی واردات ہے...... اس جائے حادثہ کے نزدیک جانا عین حماقت اور پاگل پن ہے۔''

جواب میں فرانسس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور آگے کی جانب بڑھ گیا۔ ایک عورت کی فریاد سنائی دی...... اس عورت کی فریاد جو قصبے کے ان لوگوں میں شامل تھی جو اتنی دور تک اس کے ہمراہ چلے آئے تھے اور ایک اور آواز سنائی دی کہ:۔

''خدا کے لیے...... خدا کے نام پر...... آپ آگے مت جائیں۔''

ہجوم نے اپنے شہر کی دیواروں کی جانب واپس پلٹنا شروع کر دیا۔ وہ اس حد تک آنے کیلئے ہی تیار ہوئے تھے...... وہ اس حد سے آگے بڑھنے کے لئے آمادہ نہ تھے...... اس حد تک آنے کے لئے بھی وہ محض اس لئے تیار ہوئے تھے کہ وہ اس بہادر نوجوان کے اعتماد سے متاثر ہوئے تھے۔ اگر اس نے کہا کہ وہ بھیڑیئے کو روک دے گا...... وہ نہ صرف بھیڑیئے کو اہل گبو کے مویشی ہڑپ کرنے سے روک دے گا بلکہ اس کے شہریوں کو بھی ہڑپ کرنے سے روک دے گا تو قصبہ اس کی بہادری اور جرأت کی داد دے گا اور اس کے ساتھ اس مقام تک پہنچنے کی حامی بھر لے گا جس مقام پر اس نے اس کارہائے نمایاں کو سرانجام دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

لیکن کچھ زیادہ دور نہیں...... حتیٰ کہ ایک گز کے فاصلے پر بھی نہیں بلکہ ان کے پاؤں کے عین قریب اس ہلاکت کے شواہد موجود تھے جو بھیڑیئے کی اس وقت تک کی آخری ہلاکت تھی۔ ایک شام بیشتر ایک نوجوان لڑکی اپنی حماقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس مقام پر چہل قدمی کے لئے چلی آئی تھی...... کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اپنے محبوب سے ملنے کے لئے چلی آئی تھی۔ چند منٹ کے بعد...... اس کے چیخنے چلانے کی خوفناک آوازیں سنائی دینے لگیں...... اور اب تک...... اس صبح کی آمد تک...... کسی نے بھی یہ جرأت نہ کی تھی کہ وہ گھر سے باہر نکلے اور چھان بین کرے کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔

یہ مہینہ اہل گبو کے لئے ایک خوفناک اور نقصان دہ مہینہ ثابت ہوا تھا۔ پہلے پہل بھیڑ، بکریاں اور مویشی غائب ہونے شروع ہوئے تھے اور جب بھیڑیئے کی جانب سے مویشیوں کی پہلی ہلاکت کے شواہد ملے تب لوگ از حد ناراض ہوئے اور غم و غصے کا شکار ہوئے۔ بھیڑیا وقتاً فوقتاً آتا

اور اپنا شکار حاصل کر کے واپس لوٹ جاتا۔

اس نے فی الحال کسی انسان پر حملہ نہ کیا تھا۔ ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے اہل گیو اور بھیڑیئے کے درمیان غیر تحریری معاہدہ طے پا چکا تھا کہ بھیڑیا اکثر و بیشتر آئے گا...... ان کے مویشیوں کو لقمہ اجل بنائے گا...... اپنا شکار بنائے گا...... اور محض مویشیوں تک ہی محدود رہے گا...... کسی انسانی جان کو اپنا شکار نہیں بنائے گا...... اور اب تک اسی غیر تحریری معاہدے پر عمل درآمد ہوتا چلا آ رہا تھا۔ لیکن اب اس ماہ سب کچھ تبدیل ہو چکا تھا۔ غیر تحریری معاہدے کی دھجیاں بکھر چکی تھیں۔ ایک بوڑھا شخص...... لوگ کہتے تھے کہ وہ ایک سیدھا سادا شخص تھا...... وہ اپنے مویشیوں کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ یہ اس کا معمول تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں مقیم تھا جو قصبے کے ایک کنارے پر واقع تھی۔ لہٰذا اس شخص کی غیر موجودگی کسی بھی فرد نے محسوس نہ کی۔

اور کوئی شور شرابہ بھی وقوع پذیر نہ ہوا تھا۔ بھیڑیئے نے غالباً ایک ہی وار میں اسے چاروں شانے چت کر دیا تھا اور کئی دنوں بعد ایک بھا دریا بے وقوف شخص کو بھیڑیئے کے اس بوڑھے شکار کی باقیات نظر آئیں...... اس کے جسم کے گوشت کے کچھ بچے کچے حصے...... اس کی بچی کچی ہڈیاں اور اس کے کپڑے وغیرہ اس کے مشاہدے میں آئے۔

اسی لمحے فضا مزید دہشت زدہ ہو گئی...... خوف و ہراس کے سائے مزید لہرانے لگیں۔ ایک ہفتے کے اندر اندر بھیڑیئے نے ایک اور انسانی جان کو اپنا نوالہ بنا ڈالا...... ابھی تک گیو کے کچھ لوگ بھیڑیئے کی پہلی انسانی ہلاکت سے بھی باخبر نہ ہوئے تھے...... اس مرتبہ بھیڑیئے نے ایک بچے کو...... ایک چھوٹے لڑکے کو اپنا لقمہ بنایا تھا...... بھیڑیا آدم خور بھیڑیئے کا روپ دھار چکا تھا...... اس کے منہ کو انسانی گوشت اور خون کا چسکا لگ چکا تھا۔

اور تب لوگوں کے ایک گروہ نے اس جنگلی درندے کو دیکھا اور واپس بھاگ آئے...... وہ دہشت زدہ تھے...... انہوں نے خوف و ہراس کے عالم میں وہ سب کچھ بیان کیا جو سب کچھ انہوں نے دیکھا تھا۔ ان کے بقول وہ بھیڑیا عام بھیڑیئے سے دوگنا زائد جسامت کا حامل تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کے دانت چاقو کی دھار کے موافق تیز تھے۔

یہی وہ لمحہ تھا جبکہ فرانسس برنارڈن کو اس عجیب الخلقت درندے کے بارے میں بتایا گیا تھا۔

اس نے انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ لوگوں کی بات سنی۔ اس شریف النفس انسان کا تعلق اسی سے تھا۔ وہ گفتگو سننے کے درمیان وقتاً فوقتاً اپنے سر کو جنبش دیتا رہا۔ قصبے کے مکین خوف و ہراس کے عالم میں اسے سب کچھ بتا رہے تھے۔ وہ ہیسٹریائی انداز اپنائے ہوئے تھے۔ وہ اس دہشت کا شکار تھے جو اہل گیو کا مقدر بن چکی تھی۔ ان میں سے ایک شخص ایسا بھی تھا جس کے بیٹے کو بھیڑیا اپنا لقمہ بنا چکا تھا اور جوں ہی وہ بات کرتا اس کے آنسو اس کے رخساروں پر بہنا شروع کر دیتے۔

فرانسس پوری داستان سننے کے بعد یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا کہ:۔

”مجھے اس عجیب الخلقت درندے کے پاس لے چلو۔“

اس کی بات سن کر لوگوں پر خاموشی طاری ہو گئی جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔

فرانسس نے دوبارہ لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"آؤ...... مجھے بتاؤ کہ وہ کہاں ہے؟...... وہ کہاں رہتا ہے...... اس درندے کا مسکن کہاں ہے؟ میں آپ کے ہمراہ چلوں گا اور تحقیق کروں گا......"

لوگوں نے جواب میں کہا کہ:۔

"سوچ لیں فادر...... یہ درندہ آپ کو بھی اپنا لقمہ بنا سکتا ہے۔"

یہ لوگ جب فرانسس سے مشورہ کرنے کے لئے آئے تھے تب ان کے ذہن میں ہرگز نہ تھا کہ فرانسس ان کو اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہے گا تا کہ وہ اس درندے کا تعاقب کر سکے اور اسے کیفر کردار تک پہنچا سکے...... وہ محض اپنا غبار نکال کر کچھ سکون حاصل کرنا چاہتے تھے یا پھر یہ مشورہ حاصل کرنا چاہتے تھے کہ وہ کیسے اس درندے کو اپنے جال میں پھنسا سکتے تھے یا کم از کم اسے خوفزدہ کرتے ہوئے اس مقام سے کوچ کرنے پر کیسے مجبور کر سکتے تھے۔ اور اب یہ نیک اور مہربان شخص ان کو یہ تلقین کر رہا تھا کہ وہ مسیح علیہ السلام کے نقش قدم پر چلیں اور وہ ان کی ہمراہی میں بھیڑیئے کو دیکھنے کی تمنا کر رہا تھا...... ان کے نزدیک یہ شخص ایک پاگل شخص تھا۔

لیکن فرانسس نے ان لوگوں پر دوبارہ زور دیا کہ وہ اس کی رہنمائی کرتے ہوئے اسے بھیڑیئے کی غار تک لے جائیں یا پھر اس مقام تک لے جائیں جس مقام پر اس نے آخری ہلاکت سرانجام دی تھی اور آپس میں کچھ دیر تک صلاح مشورہ سرانجام دینے کے بعد ان لوگوں نے فرانسس کی بات ماننے کی حامی بھر لی تھی۔

انہوں نے محض اس حد تک اس کا ساتھ دیا تھا...... اب وہ تن تنہا کھڑا تھا...... اس کے تین نزدیکی ساتھی اس سے چند گز پیچھے کھڑے تھے ......اور پچاس کے لگ بھگ دہشت زدہ اور خوفزدہ لوگ ان کے بہت پیچھے کھڑے تھے۔

فرانسس آگے بڑھتا چلا گیا حتیٰ کہ لوگوں کے مجمعے کی آوازیں اس کی سماعت سے ٹکرانی بند ہو گئیں۔ سورج انتہائی تیزی کے ساتھ بلند ہو رہا تھا اور تقریباً اس کے کندھوں کی اونچائی تک پہنچ چکا تھا۔ چھوٹے درختوں کے سائے لہرا رہے تھے۔ وقتاً فوقتاً اسے سایہ حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیتا اور وہ ایک لمحے کے لئے رک جاتا...... لیکن یہ محض ہوا تھی جو درخت کی شاخوں کو ہلا رہی ہوتی تھی۔

اور تب بالکل ہی اچانک...... ایک لمحے کے اندر اندر وہ اس کے بالمقابل تھا...... بھیڑیئے کے بالمقابل کھڑا تھا۔

وہ رک گیا...... اس کا ایمان اور اس کی بہادری اس کے گلے کو خشک ہونے اور اس کے چہرے پر خوف و ہراس کے سائے کو نمودار ہونے سے نہ روک سکی۔ بھیڑیا اس سے شاید بیس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ وہ اپنی غار سے نمودار ہو رہا تھا اور یہی غار اس کا مسکن تھا۔

اس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور اسی لمحے بھیڑیئے نے چھلانگ لگائی۔

قابل غور حد تک دوری پر کھڑے قصبے کے دو اشخاص ایک درخت پر چڑھ چکے تھے تا کہ وہ اس راہب کی کارروائی کو بخوبی دیکھ سکے۔ پہلے انہوں نے بھیڑیئے کو چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے بعد اس وقت ان کی حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی کہ بھیڑیا بجائے اس کے کہ دوبارہ فرانسس کی جانب چھلانگ لگا کر اس پر حملہ آور ہوتا...... اس کے عین سامنے دراز ہو گیا...... ایک پالتو کتے کی طرح اس کے سامنے لیٹ گیا۔

اگر چہ اہل گبو سن نہ سکے کیونکہ وہ کافی دوری پر کھڑے تھے لیکن فرانسس نے بھیڑیئے سے کہا کہ:۔

''ادھر آؤ......میرے بھیڑیئے بھائی......ادھر آؤ''

اور یہ الفاظ سن کر بھیڑیا سر جھکائے فرانسس کی جانب بڑھا۔

فرانسس نے دوبارہ بھیڑیئے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:۔

''ادھر آؤ......بھیڑیئے بھائی ادھر آؤ......حضرت مسیح علیہ السلام کے نام پر میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ مجھ پر بھی حملہ آور نہ ہونا اور نہ ہی کسی اور شخص پر حملہ آور ہونا۔''

اور بھیڑیا آہستہ آہستہ فرانسس کی جانب بڑھا اور فرانسس کو اپنا ایک پنجہ تھما دیا......اس راہب نے اس کے پنجے کو ایک لمحے کے لئے تھامے رکھا۔

فرانسس نے ایک مرتبہ پھر بھیڑیئے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:۔

''بھیڑیئے بھائی......تم نے اس علاقے میں کافی زیادہ اودھم مچائے رکھا ہے......کافی زیادہ نقصان کیا ہے......تم نے ظالمانہ حرکتیں سرانجام دی ہیں......یہ حقیقت ہے کہ تمہیں اپنی خوراک کے حصول کے لئے شکار کرنا پڑتا ہے......لیکن تم نے انتہائی دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے انسانی جانوں کو ہلاک کرنا شروع کر دیا تھا......ان انسانوں کو ہلاک کرنا شروع کر دیا تھا جو اللہ تعالیٰ سے مشابہت رکھتے ہیں۔تمہارے جرائم کی پاداش میں تمہیں ایک قاتل کے طور پر پھانسی پر لٹکا دینا چاہیئے۔اہل گبو تمہارے جرائم کے خلاف سراپا احتجاج بن گئے تھے......وہ تمہارے خون کا مطالبہ کر رہے ہیں......''

بھیڑیا اس کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہونے لگا اور فرانسس نے اپنا کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ:۔

''بھیڑیئے بھائی......میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے اور ان کے درمیان امن قائم کر دوں اور اگر تم یہ وعدہ کرو کہ تم ان کے خلاف مزید جرائم سرانجام دینے سے کنارہ کشی اختیار کر لو گے......تب وہ تمہیں معاف کرنے پر تیار ہو جائیں گے اور تمہارے ماضی کے جرائم معاف کر دیں گے اور کوئی شخص......کوئی شکاری تمہارا شکار نہیں کرے گا......کبھی بھی نہیں کرے گا''

بھیڑیا اسی کے قدموں میں پڑا رہا۔لیکن فرانسس جانتا تھا کہ وہ اس کی گفتگو کو حرف بہ حرف سمجھ چکا تھا اور نہ صرف سمجھ چکا تھا بلکہ قبول بھی کر چکا تھا۔

فرانسس نے ایک بار پھر بھیڑیئے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:۔

بھیڑیئے بھائی......میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے وعدہ کی توثیق سرانجام دو کیونکہ اس کے بغیر میں تم پر......اور تمہارے وعدے پر اعتبار نہیں کر سکتا''

اور جب فرانسس نے اپنا ہاتھ بھیڑیئے کی جانب بڑھایا تب بھیڑیئے نے دوبارہ اپنا پنجہ فرانسس کی جانب بڑھایا اور اس کے ہاتھ میں

دے دیا۔

فرانسس نے کہا کہ:۔

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس شہر کے لوگ اس وقت تک تمہیں تمہاری خوراک مہیا کرتے رہیں گے جب تک تم زندہ سلامت رہو گے..... کیونکہ میں بخوبی جانتا ہوں کہ تم نے یہ تمام تر جرائم محض اپنی بھوک مٹانے کے لئے کئے تھے۔''

بھیڑیا اور پادری دونوں آہستہ آہستہ گبو کی جانب روانہ ہوئے۔ جونہی وہ شہر کے قریب پہنچے تو قصبے کے حیران و پریشان اور خوف کے مارے ہوئے لوگ اپنی پناہ گاہوں سے باہر نکل آئے جہاں پر وہ چھپے ہوئے تھے۔ پادری اور بھیڑیا شہر کے دروازے کی جانب بڑھ گئے بالکل اسی طرح جس طرح کوئی شخص اپنے پرانے اور وفادار کتے کے ہمراہ چلتا ہے۔

اور تب جیسا کہ لوگ ان کے اردگرد کھڑے تھے.....لیکن ان کے نزدیک تر نہ کھڑے تھے بلکہ کچھ فاصلے پر کھڑے تھے.....اسی کے فرانسس نے لوگوں کو ان شرائط سے آگاہ کیا جو اس کے اور بھیڑیئے کے درمیان طے پائی تھیں۔ اس نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:۔

''سنو میرے بھائیو.....بھیڑیئے بھائی.....''

''بھیڑیا بھائی''.....یہ پادری کہیں اپنے حواس تو نہیں کھو چکا.....لوگ اسی قسم کی سوچ میں مبتلا تھے۔

پادری نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ:۔

''بھیڑیا بھائی.....جو آپ کے سامنے کھڑا ہے.....اس نے یہ وعدہ کیا ہے.....اور میرے ساتھ یہ عہد کیا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ امن اور سلامتی کے ساتھ رہے گا بشرطیکہ تم بھی یہ وعدہ کرو کہ تم اسے وہ خوراک مہیا کرتے رہو گے جس کی ضرورت اسے درپیش ہوگی.....اسے روزانہ اپنی روزمرہ کی خوراک کی ضرورت درپیش ہوگی.....اور میں اس کی جانب سے آپ کو یقین دہانی کرواتا ہوں کہ یہ آپ کو اور آپ کے مویشیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔''

چند لمحوں تک لوگ حیرانگی اور پریشانی کے عالم میں خاموش کھڑے رہے اور مابعد انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ روزانہ بھیڑیئے کو اس کی خوراک مہیا کرتے رہیں گے۔

اور یہ معاملہ بخوبی چلتا رہا۔ بالکل اسی طرح چلتا رہا جس طرح پادری اور بھیڑیئے کے درمیان طے پایا تھا۔ بھیڑیا ایک بوڑھا بھیڑیا تھا.....اور وہ اس معاہدے کے بعد محض دو برس تک زندہ رہا۔ لیکن ان دو برسوں کے دوران اسے اجازت تھی کہ وہ لوگوں کے گھروں میں داخل ہو جاتا تھا.....اور لوگ انتہائی خوشی کے ساتھ اس کا پیٹ بھرنے کا بندوبست کر دیتے تھے۔ کچھ لوگ دیگر لوگوں سے بڑھ کر بہادر تھے۔ وہ بھیڑیئے کے سر پر تھپکی بھی دیتے تھے۔ کتے بھی بھیڑیئے کو دیکھ کر بھونکنے سے باز آ چکے تھے اور بالآخر جب یہ بوڑھا بھیڑیا موت سے ہمکنار ہوا.....تب قصبے کے لوگوں کو ازحد صدمہ ہوا۔

☆☆☆

ایک سادہ سی قرون وسطیٰ کے دور کی کہانی؟ایک فرضی کہانی؟

شاید آپ درست سوچ رہے ہوں......لیکن اس واقعہ کے پیچھے دو حقائق کارفرما ہیں۔ یہ واقعہ ریکارڈ پر موجود ہے......ایک ناقابل تردید ریکارڈ پر موجود ہے کہ گبو اور اس کے ہمسائے میں واقع علاقے بھوکے بھیڑیوں کے خطرے سے دوچار تھے......اور اس وقت اس خطرے سے دوچار تھے جب فرانسس نے اس علاقے کا دورہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک بہت بڑے بھیڑیئے کی کھوپڑی بھی سان فرانسسکو کے پرانے گرجا گھر کی دیواروں کے نیچے سے برآمد ہوئی ہے۔ یہ کھوپڑی جان بوجھ کر وہاں پر دبائی گئی تھی۔ سینٹ فرانسس کی مختصر زندگی کو ایک طویل مہم کہنا بے جا نہ ہوگا۔ لیکن وہ کون تھا؟ وہ کس قسم کا شخص تھا؟

حیران کن امر یہ ہے کہ......شاید......ہم نے پہلی بار اس کے بارے میں سنا تھا کہ وہ اپنے وسطیٰ اٹلی کے شہر اسسی کا ایک منتشر اور پراگندہ نوجوان تھا۔ اس کا باپ ...... پیٹرو برنارڈن ...... کپڑے کا ایک مصروف بیوپاری تھا اور 12 ویں صدی کے آخری دورانیے کے ان دنوں میں (فرانسس نے 1182ء میں جنم لیا تھا) کوئی بھی نوجوان خواہ وہ کتنا ہی امیر کیوں نہ ہو محض معمولی تعلیم ہی حاصل کرتا تھا۔ فرانسس نے بھی پادری بننے کا منصوبہ بنایا۔ وہ پیشہ سپاہ گری سے بھی محبت کرتا تھا۔

اس نے پیشہ سپاہ گری بھی اپنایا اور اس جنگ میں بھی شریک ہوا جو اس کے اپنے شہر اسسی اور اس کے ہمسایہ میں واقع پروگیا کے درمیان لڑی گئی تھی اور اس دوران گرفتار بھی ہوا۔ قید و بند کا ایک برس گزارنے کے بعد وہ گھر واپس آن پہنچا......وہ ایک بیمار شخص دکھائی دیتا تھا اور عجیب و غریب حد تک مشاہدہ نفس اور مطالعہ باطن سرانجام دینے کی جانب بھی مائل ہو چکا تھا۔ اس کے دوست اسے مذاق کرتے تھے اور جلد ہی وہ ایک نرم اور مہربان دل کے حامل انسان کے روپ میں ڈھل چکا تھا خواہ یہ تبدیلی اس میں سطحی طور پر ہی رونما ہوئی تھی۔ سسلی میں ایک فوجی مہم سرانجام دینے کی منصوبہ بندی سرانجام دی گئی اور وہ بھی اس مہم میں شریک ہوگیا۔

چند روز بعد ہی وہ اسسی واپس لوٹ آیا......اپنے اسلحے کو خیر باد کہا اور اپنے والد کے کاروبار میں شریک ہوگیا۔ اسے خدا کی جانب سے ایک پیغام موصول ہو چکا تھا اور وہ اگلے پیغام کے انتظار میں تھا۔ خدا نہیں چاہتا تھا کہ وہ ایک سپاہی کے طور پر اپنی خدمات سرانجام دے......اسے کسی اور ذریعے سے خدا کی خدمت سرانجام دینی تھی۔

اسے خدا کی جانب سے اگلا پیغام اس وقت موصول ہوا جبکہ وہ سینٹ ڈیمن کے خانہ گرجا میں مصروف عبادت تھا۔ اس نے اچانک ایک ندا سنی:۔

"فرانسس جاؤ......میرا گرجا تعمیر کرو......کیونکہ وہ زمین بوس ہو رہا ہے۔"

فرانسس نے اردگرد دیکھا اور اسے محسوس ہوا کہ واقعی گرجا گھر خستہ حالی کا شکار تھا اور اس کی مرمت ناگزیر تھی۔ لہٰذا وہ بھاگم بھاگ گھر پہنچا......اپنا تمام مال و اسباب اکٹھا کیا......اس کے علاوہ اپنے باپ کے کپڑے کے کچھ تھان بھی سمیٹے اور یہ سب کچھ سمیٹ کر مارکیٹ کا رخ کیا۔ اس نے مال کو فروخت کیا اور مابعد اپنا گھوڑا بھی فروخت کر ڈالا......اس کے بعد وہ خوش خوش واپس گھر کی جانب روانہ ہوا تاکہ یہ رقم خانہ گرجا کے پادری

کے حوالے کر سکے۔

چونکہ پادری فرانسس کے والد سے بخوبی واقف تھا۔ وہ جانتا تھا بوڑھا مگر طاقت وقوت کا حامل پیٹرو برنارڈن اعتراض کر سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے رقم وصول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور جلد ہی فرانسس کے والد نے اپنے بیٹے کو اپنی جائیداد سے عاق کر دیا۔ لیکن یہ لمحہ فرانسس کے لئے ایک انمول لمحہ ثابت ہوا...... اس نے بذات خود مزید رقم اکٹھی کرنی شروع کی اور سینٹ ڈیمن کے خانہ گرجا کی تعمیر پر خرچ کرنی شروع کر دی۔ اس کے علاوہ اس گرجے کی تعمیر کیلئے اس نے بذات خود بھی محنت مزدوری سرانجام دی۔ اس نے اپنا تمام مال واسباب حتیٰ کہ اپنے کپڑے بھی فروخت کر کے گرجے کی تعمیر پر لگا دیے اور بشپ کا عطا کردہ ایک لمبا کوٹ پہن کر گزارہ کرنے لگا...... اس کے بعد اس نے ایک اور چرچ کی مرمت کی ذمہ داری سنبھالی ...... اور مابعد تیسرے چرچ کی مرمت کی ذمہ داری سنبھالی...... آہستہ آہستہ دیگر لوگ بھی اس کار خیر میں اس کا ہاتھ بٹانے لگے...... وہ نہ صرف گرجا گھروں کی تعمیر اور مرمت میں اس کا ہاتھ بٹانے لگے بلکہ ایک کامل زندگی گزارنے کی جدوجہد میں بھی مصروف ہو گئے...... وہ اس زندگی کو اپنانے کی جدوجہد کرنے لگی جو زندگی حضرت مسیح علیہ السلام نے بسر کی تھی اور ان کی طرح لوگوں کو بچانے میں بھی مصروف ہو گئے۔ اس تحریک کی ابتداء غربت کے ماحول سے ہوئی تھی...... اس تحریک کے ہر ایک کے رکن کے لئے ضروری تھا کہ وہ ''لیڈی غربت سے شادی'' کرے۔

وہ پوپ III کے پاس چلے آئے اور اس کی اجازت طلب کی اور پہلا ردعمل حوصلہ افزا نہ تھا...... ان کا طرز زندگی اس قدر سخت تھا کہ یہ تحریک ممکن حد تک پھیل نہ سکی...... وسعت اختیار نہ کر سکی۔ لیکن اس نے عارضی اشک شوئی کر دی...... اور یہ تحریک مزید بڑھنے لگی جلد ہی ایک متوازی تحریک بھی چل نکلی جو سینٹ ڈیمن کے اس خانہ گرجا پر بنیاد کرتی تھی جس کی تعمیر نو فرانسس نے سرانجام دی تھی۔ اس کی سربراہ ایک نوجوان خاتون تھی جس نے فرانسس کی قائم کردہ مثال کی پیروی سرانجام دی اور اپنے تمام تر دنیاوی مال واسباب سے کنارہ کشی اور دست برداری اختیار کر لی اور مابعد ایک اور تحریک سامنے آئی...... یہ تحریک عام لوگوں سے متعلق تھی جنہوں نے اگرچہ اپنے دنیاوی مال واسباب سے دست برداری اختیار کر لی تھی لیکن اتنا مال واسباب ضرور اپنے پاس رکھا تھا جس سے ان کا گزارہ بخوبی چل سکتا ہو۔

فرانسس نے بے تحاشہ سفر سرانجام دیے...... اکثر اپنے آپ کو مشقت میں ڈالے رکھتا اور اپنے وضع کردہ طرز زندگی اور افکار کو پھیلانے کی کوشش میں معروف رہا...... وہ نہ صرف براعظم یورپ تک محدود رہا بلکہ مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں بھی اپنے افکار اور طرز زندگی کو پھیلانے میں مصروف رہا۔ شمالی افریقہ کے تیز سورج نے اس کی آنکھوں کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ لہٰذا اس نے اپنی زندگی کے بقایا ایام اندھے پن میں گزارے۔ اس نے مصر کے سلطان تک بھی رسائی حاصل کی اور اسے بھی اپنے دین پر لانے کی کوشش سرانجام دی۔ اگرچہ اس نے عیسائیت قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن وہ اس پادری کی جرأت اور دلیری پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا جس نے جان کی بازی لگاتے ہوئے اس کے دربار میں آنے اور اسے عیسائیت کی جانب راغب کرنے کی کوشش سرانجام دی۔

اپنی زندگی کے آخری ایام میں فرانسس ایک اور تجربے سے دوچار ہوا...... ایک ''مہم'' ...... وہ دلبرداشتہ تھا کہ اس کے کچھ پیروکار ان قوانین سے روگردانی کے مرتکب پائے جا رہے تھے یا وہ ان قوانین پر عمل درآمد کرنے سے قاصر دکھائی دیتے تھے جو قوانین اس تحریک کے لئے وضع کئے گئے

تھے اور اپنے ایک یا دو قابل اعتماد اور وفاداری ساتھیوں کے ہمراہ لاورنا کی پہاڑی پر عبادت کے لئے چل دیا۔

ایک رات میلوں دور چرواہے یہ دیکھ کر از حد حیران ہوئے کہ آسمان روشن ہو رہا تھا اور ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے لاورنا کی پوری پہاڑی آتشزدگی کی زد میں ہو اور اسی آتشزدگی کے سبب آسمان بھی روشنی کے حلقے میں ہو۔ کچھ خچر ڈرائیور جو ایک سرائے میں محوخواب تھے وہ بیدار ہو گئے ...... وہ سمجھ رہے تھے کہ دوپہر کا وقت ہو چکا تھا اور وہ اپنے جانوروں کے ہمراہ اپنے کام کاج پر جانے کے لئے مصروف ہو گئے۔ لیکن جلد ہی شعلے دم توڑ گئے اور سب کچھ معمول پر آ گیا۔

یہ مظہر اس سے بھی بڑے مظہر کے ظہور پذیر ہونے کا باعث بنا۔ فرانسس کی عبادت میں ایک فرشتے کی وجہ سے خلل اندازی واقع ہوئی ...... اس فرشتے کے چھ عدد پر تھے۔ دو پر اس کے سر پر پھیلے ہوئے تھے ...... دو پر اس کے اڑنے کے لئے مخصوص تھے جبکہ دیگر دو پروں نے اس کے جسم کو چھپا رکھا تھا۔ فرانسس حیران تھا ...... وہ حضرت مسیح علیہ السلام کا چہرہ پہنچان چکا تھا۔

فرشتہ ...... جو حضرت مسیح علیہ السلام کی شکل اپنائے ہوئے تھا کافی دیر تک فرانسس سے محوکلام رہا۔ فرانسس اس کے کلام کو سمجھ نہ سکا ماسوائے اس کے کلام کے آخری الفاظ کو جو کچھ اس قسم کے تھے کہ:

''میں نے تمہیں زخم کا نشان دیا ہے ...... جو ہمدردی کے نشان ہیں تاکہ تم میرے معیاری حامل ثابت ہو''۔

اور فرانسس کے ہاتھوں اور پاؤں پر ناخنوں کے نشان تھے اور اس کے ایک جانب زخم بھی تھا جس سے خون رستا تھا ...... یہ زخم ...... زخم کا یہ نشان اس کے ہمراہ ہی رہا اور اس کے نزدیکی احباب اس کو بخوبی دیکھ سکتے تھے اگرچہ فرانسس اس نشان کو چھپانے کی پوری کوشش کرتا تھا۔

اس نے 44 برس کی عمر میں وفات پائی تھی۔ اس نے 1226ء میں وفات پائی تھی۔

دو برس بعد پوپ گریگوری IX نے اسے اولیا کی فہرست میں شامل کر لیا تھا۔

رچرڈ......میں اور تیسری صلیبی جنگ

آج ہم انہیں صلیبی جنگوں کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اس لفظ میں کشش بھی موجود ہے اور وہ جذبات بھی پنہاں ہیں جو آج کل مفقود ہیں...... سینے میں بھڑکتے ہوئے مذہبی اعتقاد کے شعلے...... جنگ کی درندگی اور بے رحمی...... نجات کے حصول کی خاطر جھیلی جانے والی مشکلات...... صلیبی جنگوں میں حصہ لینے والے قدر کی نگاہ سے دیکھتے جاتے تھے اور لوگ انہیں اس روحانی سفر کی علامت سفر کرتے تھے جو یروشلم پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ تمام طبقوں سے متعلق لوگ ان جنگوں میں حصہ لیتے تھے...... بادشاہ سے لیکر رعایا تک...... اپنے چوغے پر وہ رنگین کپڑے کی صلیب پہنتے تھے۔ ان کی غیر حاضری میں ان کی جائیداد...... بشرطیکہ موجود ہو...... کی دیکھ بھال چرچ سرانجام دیتا تھا اور ان تمام لوگوں کے گناہوں کی معافی کا وعدہ کیا جاتا تھا جو یروشلم اور دیگر مقدس مقامات کو مسلمانوں کے قبضے سے نجات دلانے کا عہد کرتے تھے۔

چوتھی صدی تک...... جب عیسائیت کو سلطنت روم کے سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل ہوئی مقدس قبرستان کے عظیم گرجے کو تمام تر اقوام کے زائرین کے لئے کھول دیا گیا تھا۔ حقیقی صلیب بھی برآمد کرلی گئی تھی اور بیت اللحم میں گرجا گھر قائم کر دیا گیا تھا۔ لیکن 614ء میں پارسیوں نے یروشلم پر قبضہ کرلیا اور اس کے رہائشیوں کو یا تو قتل کر دیا یا پھر انہیں غلام بنا ڈالا اور وہ حقیقی صلیب بھی لے گئے۔ آنے والے برسوں میں یروشلم کو آزاد کروایا گیا اور حقیقی صلیب پر بھی دوبارہ قبضہ کیا گیا...... لیکن اس دوران مسلمان عرب دنیا پر چھا گئے...... مسلمانوں نے فتوحات کیلئے جنگیں شروع کر دیں اور آہستہ آہستہ تقریباً تمام تر مشرق قریب پر قابض ہوتے چلے گئے اور 638ء میں یروشلم بھی ان کی حکمرانی میں شامل ہو گیا۔ زائرین کو اب بھی شہر میں داخل ہونے کی اجازت تھی اور عیسائیوں کو بھی اس شہر کی چار دیواری کے اندر رہائش اختیار کرنے کی اجازت تھی۔

تب 1004ء میں بینہ طور پر قاہرہ کے خلیفہ حاکم نے مقامی قبرستان کے چرچ کو نیست و نابود کر دیا۔ مابعد چرچ کی تعمیر نو سرانجام دے دی گئی لیکن تمام تر 11 ویں صدی کے دوران زائرین جو یروشلم جاتے تھے وہ مشکلات کا ایک سمندر عبور کرتے ہوئے جاتے تھے۔ ایشیا مائیز میں ترک سلجوکوں کے گھس آنے سے ان کے لئے مشکلات پیدا ہو چکی تھیں۔ سٹپ (یورپ اور ایشیا کے جنوب' مشرق کے میدانوں میں سے ایک میدان جس پر کاشت کاری سرانجام نہیں دی جاتی تھی) کے خانہ بدوش جنہوں نے اسلام قبول کرلیا تھا انہوں نے بازنطینی شہنشاہ کی فوج کا صفایا کر کے رکھ دیا تھا اور امریکہ کی پہلی عیسائی ریاست بھی چھین لی تھی...... اور انٹی اوک پر بھی قبضہ جما لیا تھا اور عربوں نے مغرب کی جانب سے زائرین کا یروشلم تک رسائی حاصل کرنا مشکل بنا بلکہ ناممکن بنا دیا تھا۔

لہٰذا 1095ء میں شہنشاہ نے یورپ سے اپیل کی کہ وہ اس کی مدد کو آن پہنچیں۔ چنانچہ فرانس، جرمن، اٹلی وغیرہ کی افواج ایشیا مائیز میں اکٹھی ہوئیں اور شدید جنگ کے بعد پہلی صلیبی جنگ فتح پر ختم ہوئی...... یروشلم پر قبضہ کرلیا گیا اور فلسطین اور شام میں کئی ایک عیسائی آبادیاں منظر عام پر آئیں۔

اگلی صدی میں مسلم دنیا میں گھری ہوئی یہ ریاستیں محض اس لئے اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے میں کامیاب ہوئیں کہ ان کے دشمن عدم اتفاق کا شکار ہو کر رہ گئے تھے۔ یروشلم پر جس بادشاہ کی حکمرانی تھی وہ کاؤنٹ بولونج کا پوتا تھا۔ لیکن سراسن (قرون وسطٰی کے لکھاری شام اور فلسطین کے مسلمانوں کیلئے عام طور پر یہ لفظ استعمال کرتے تھے یا پھر شمالی افریقہ کی عرب بربر نسل کے لئے یہ لفظ استعمال کرتے تھے جنہوں نے اسپین اور سسلی فتح کیا اور فرانس پر حملہ آور ہوئے تھے) نے انٹی اوک کی ریاست پر تقریباً قبضہ جما لیا تھا...... یروشلم کی فوج کئی ایک خونی معرکوں کی سرانجام دہی میں مصروف تھی اور بادشاہ کی وفات کے بعد اس کے جانشین کے مسئلے پر اختلاف رائے کا شکار ہونے کے باعث عیسائی بھی عدم اتفاق کا شکار ہو گئے تھے اور شام کا شہر ادیسہ بھی مسلمانوں کے قبضے میں آ چکا تھا۔ یروشلم کی ملکہ میلاسنڈ نے پوپ سے امداد کی درخواست کی۔ فرانس کا نوجوان لوئی VII دیار غیر میں فرانسیسی فوج بھیجنے پر آمادہ تھا اور جوش' جذبے اور ولولے سے بھرپور رضا کار بھی دوسری صلیبی جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے لیکن یہ عمل درآمد ایک سانحہ ثابت ہوا۔ مقصد یہ تھا کہ افواج کو دیار غیر کے عیسائی علاقوں تک پہنچانا تھا لیکن حصول مقصد سے بیشتر ہی بہت سی فرانسیسی اور جرمن فوج سے ہاتھ دھونے پڑے۔ دمشق پر قبضہ کرنے کی کوشش بھی ناکامی کا شکار ہوئی۔ لہٰذا دوسری صلیبی جنگ کے لئے آئے ہوئے لوگ گھروں کو واپس چلے گئے اور غیر ارادی طور پر مخالف ترک رہنماؤں کو آپس میں مصالحت سرانجام دینے کا موقع فراہم کر گئے۔

یروشلم پر تسلط حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ دشمن پر کڑی نظر رکھی جائے اور اگر ممکن ہو سکے تو عیسائی علاقوں کی حدود میں اضافہ کیا جائے۔ لیکن اس پالیسی کا دوسرا حصہ ناکامی کا شکار ہو کر رہ گیا۔ مسلمانوں کا ایک رہنما منظر عام پر آیا۔ اس کا نام صلاح الدین تھا جو ایک کُرد تھا۔ 1174ء میں اس نے دمشق فتح کر لیا۔ چار برس بعد صلاح الدین ایوبی نے عیسائیوں کو عبرت ناک شکست سے دوچار کیا اور حقیقی صلیب پر بھی قبضہ کر لیا اور عیسائیوں کے قبضے میں جو ساحلی علاقے موجود تھے ان سے بھی عیسائیوں کو ہاتھ دھونے پڑے اور بالآخر اکتوبر میں یروشلم سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ ایک برس کے اندر اندر سمندر پار بچے کھچے عیسائی علاقے بھی خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ گئے۔

اس عظیم ناکامی پر یورپ تلملا اٹھا اور مدد کیلئے پکارنے لگا تا کہ دشمن کو فوری جواب پیش کیا جا سکے۔ فرانس کا فلپ اور انگلستان کا ہنری دوئم مشترکہ صلیبی جنگ لڑنے پر آمادہ ہو گئے اور جرمنی میں ایک طاقتور لشکر شہنشاہ فریڈرک بار باروسا کی کمان میں جمع ہو گیا۔

اس دوران ہنری موت سے ہمکنار ہو گیا اور صلیبی جنگ کی ذمہ داری اس کے بیٹے رچرڈ کے کندھوں پر آن پڑی۔

فریڈرک بار باروسا نے ہنگری کے ذریعہ ایشیا مائنر تک پیش قدمی کی لیکن وہ ڈوب کر موت سے ہمکنار ہو گیا اور اس کی فوج کا ایک مختصر حصہ ہی میدان جنگ میں پہنچ سکا۔ اس دوران رچرڈ نے اپنی ریاست میں بھاری ٹیکس عائد کرنے کے علاوہ دیگر کئی ایک ذرائع سے بھی مقدس جنگ کے لئے رقوم اکٹھی کرنا شروع کر دی تھیں۔ دس ہزار گھوڑے اکٹھے کئے گئے تھے اور ایک سو بحری جہاز بھی اکٹھے کئے گئے تھے۔ تمام تر اشیاء بشمول خورد و نوش کی اشیاء جمع کی گئی تھیں۔ 1190ء میں ایسٹر کے تہوار کے فوراً بعد یہ بحری قافلہ روانہ ہوا۔ اس قافلے کی منزل مارسلیس تھی جہاں پر بادشاہ نے اپنی فوج کے ساتھ بری سفر طے کرتے ہوئے اس قافلے کے ساتھ آن ملنا تھا۔ ویزے کے مقام پر ماہ جولائی میں فرانس اور انگلستان کی افواج آپس میں آن ملی تھیں۔ یہ نوجوانوں کی ایک ایسی تعداد تھی جو اس سے بیشتر کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ ایک دوسرے کی جانب عدم اعتماد کی حامل نظروں سے

دیکھتے ہوئے..... فلپ اور رچرڈ نے قسم کھائی کہ وہ شانے سے شانہ ملاتے ہوئے اکٹھے برسرپیکار ہوں گے اور مال غنیمت میں برابر کے حصہ دار ہوں گے۔ جوں ہی افواج اکٹھی پیش قدمی کر رہی تھیں گاؤں کی عورتیں اپنے بچوں کو لاتیں اور سپاہ سے کہتیں کہ ان کے سروں پر بھی دست شفقت پھیریں کیونکہ یہ سپاہ ایک مقدس مشن کی تکمیل کے لئے روانہ ہو رہی تھی۔

جب رچرڈ مارسیلس پہنچا اس وقت تک بحری بیڑہ نہیں پہنچا تھا۔ لہٰذا اس نے کرایے پر بحری بیڑہ حاصل کیا اور سمندر میں اتر گیا۔ وہ اپنے فوجی رہنماؤں کے ہمراہ سسلی کی جانب عازم سفر ہوا جہاں پر وہ سردیوں کا موسم گزارنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس دوران اس کا بحری بیڑہ اس کی فوج کو لے کر آن پہنچا تھا اور ایک تاریخ دان کچھ یوں رقم طراز ہے کہ:۔

''شہری از حد حیران ہوئے..... وہ جہازوں کی شان و شوکت..... اسلحے کی وافر مقدار دیکھ کر حیران ہوئے''۔

صلیبی جنگ لڑنے والوں کی سپلائی لائن بحال رکھنے کے لئے قبرص کی فتح ضروری تھی۔ لہٰذا انتہائی برق رفتاری کے ساتھ قبرص فتح کیا گیا۔ رچرڈ کو یہ خبر موصول ہوئی کہ ایکڑ جو کہ صلاح الدین ایوبی کا ایک مضبوط گڑھ تھا اور گذشتہ دو برسوں سے محاصرے میں تھا وہ عنقریب عیسائیوں کے قبضے میں آنے والا تھا۔ اس کی آمد کے پانچ ہفتوں کے اندر اندر ایکڑ واقعی فتح ہو چکا تھا اور رچرڈ کی واہ واہ ہو رہی تھی۔

فلپ حالت بیماری میں واپس جا چکا تھا۔ فرانس میں حالات بھی کچھ بہتر نہ تھے اور اب رچرڈ اکلوتا کمانڈر تھا اور اسے ہی یہ فیصلہ سرانجام دینا تھا کہ یروشلم کو کیسے آزاد کروایا جائے۔ رچرڈ نے قدرے بہتر حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے جنوب کی جانب سے ساحل کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کا آغاز کیا۔ اس کی فوج میں مختلف اقوام کی ایک لاکھ نفری موجود تھی۔ خون ریز معرکے کا آغاز ہو چکا تھا۔ رچرڈ طوفان بن کر ترکوں پر ٹوٹ رہا تھا۔ جب دشمن حملہ آور نہ ہوتا تب اس کے دستے ریت پر پیش قدمی کرتے۔ ان کے سروں پر سورج کسی تنور کی طرح جل رہا ہوتا تھا۔ اس کے بہت سے فوجی ہیٹ اسٹروک کی وجہ سے لقمۂ اجل بن چکے تھے۔ رات کو آسمان تلے لیٹنے سے بیشتر صلیبی سپاہ بڑے جذباتی انداز میں دعا کرتی کہ:۔

''ہماری مدد فرما..... اوہ مقدس قبرستان!''

انہوں نے سیزاریا کی جانب پیش قدمی شروع کی لیکن وہ ابھی تک عربوں کے خوف میں مبتلا تھے۔ قصبے کے پار پہاڑیوں سے صلاح الدین ایوبی اپنی فوج سمیت فیصلہ کن معرکے کے لئے آن پہنچا تھا۔ چار گھنٹے تک شدید لڑائی جاری رہی حتیٰ کہ رچرڈ نے اپنے بہادر ترین نائٹوں کے ہمراہ دشمن کے گھوڑسواروں کو ساحل کی جانب دھکیل دیا اور ان کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا۔ رچرڈ کی فوج پسینے میں شرابور پیش قدمی کرتی رہی...... 20,000 ترک ایک مرتبہ پھر رچرڈ کی فوج پر حملہ آور ہوئے۔ ان پر جوابی حملہ کیا گیا اور پہاڑیوں میں خون ریز معرکہ ہوا اور رچرڈ کی فوج نے حملہ پسپا کر دیا اور یہ ایک اہم فتح تھی۔

حکمت عملی سرانجام دینے کے بارے میں رچرڈ انتہائی محتاط تھا۔ خشک اور جھلسا دینے والی پہاڑیاں اس کی فوج کو صلاح الدین ایوبی سے زیادہ آسانی کے ساتھ موت کی نیند سلا سکتی تھیں۔ لہٰذا اس نے جافا کا رُخ کیا اور مابعد اسکالن کا رُخ کیا تاکہ سپلائی لائن برقرار رہ سکے۔ رچرڈ کو اپنا مستقبل شک و شبہات میں گھرا ہوا دکھائی دینے لگا۔ اس کے کئی ایک فوجی دستے تھکے ماندے جافا میں ہی رک گئے تھے اور کچھ فوجی دستے ایکڑ واپس

جا چکے تھے۔ فرانسیسی بھی سرد مہری کا مظاہرہ کرنے لگے تھے۔ باقی ماندہ فوج کیلئے بیماری کا اندیشہ ایک خطرے کی تلوار بن کر لٹک رہا تھا اور بحری سفر بھی مشکلات کا حامل دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن بادشاہ مایوس نہ ہوا۔ یروشلم تک پہنچنا اب بھی ممکن تھا۔

جنوری 1192ء میں اس نے شہر کے اندر بارہ میل پیش قدمی سرانجام دی۔ لیکن اس دوران بہت سے نائٹ یہ دھمکی دے رہے تھے کہ وہ مقدس قبرستان میں عبادت سرانجام دینے کے بعد فوراً اپنے گھروں کی راہ لیں گے۔ اس ماہ کے آخر تک فوج واپس اسکالن پہنچ چکی تھی کیونکہ موسم از حد خراب تھا۔ فوج نیم فاقہ کشی کا شکار تھی اور کسی قسم کے جذبے سے عاری دکھائی دیتی تھی اور رچرڈ بذات خود بھی ایسے صدمے سے دوچار تھا جسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ اسکالن کی تعمیر نو سرانجام دی گئی تھی اور بادشاہ مثال قائم کرنے کی خاطر بذات خود پتھر اٹھاتا رہا۔

اگلے برس کے آغاز میں تمام تر موسم برسات کے دوران رچرڈ اسکالن میں ہی قیام پذیر رہا۔ اس کی فوج بھی اس کے ہمراہ قیام پذیر رہی اور جس وقت مہم جوئی ممکن ہوئی دوبارہ بہت سے فرانسیسی ساتھ چھوڑ کر واپس پلٹ گئے۔ اس دوران انگلستان سے بھی چونکا دینے والی خبریں موصول ہو رہی تھیں جہاں پر اس کا بھائی جان اس کے خلاف سازش میں مصروف تھا اور رچرڈ کو محسوس ہو رہا تھا کہ اسے جلد واپس جانا ہوگا۔

جون 1193ء میں اس نے اپنی بچی کھچی فوج کو ایک مرتبہ پھر یروشلم کی راہ پر ڈالا اور ایک صبح سویرے پہاڑی کی چوٹی سے مقدس شہر کا بخوبی نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ شہر کچھ اس طرح چمک رہا تھا جیسے دور فاصلے پر پڑا ایک ہیرا چمک رہا ہو۔ رچرڈ نے اس مقدس شہر کا نظارہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اس وقت اس شہر کا نظارہ کرنا چاہتا تھا جب خدا یہ شہر اسے بخش دیتا اور اس نے دوبارہ یہ محسوس کیا کہ ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔ صلاح الدین کی گھوڑ سوار فوج اس کے پیچھے اور سامنے دونوں طرف موجود تھی۔ اسے بے آب پہاڑیاں ہنوز عبور کرنی تھیں۔ یروشلم پر تسلط قائم کرنے کا خواب شرمندہ تعبیر ہونا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا اس کی فوج نے ساحل کی جانب پسپائی اختیار کی اور چند ہفتوں کے بعد وہ اسی مقام پر واپس پہنچ چکا تھا جہاں سے اس نے آغاز کیا تھا...... یعنی ایکڑ کے مقام پر...... وہ اپنی خرابی قسمت پر افسردہ تھا کیونکہ خدا ابھی اس کی حمایت پر آمادہ نہ تھا۔

لیکن رچرڈ کو ابھی ایک اور کارنمایاں سرانجام دینا تھا۔ وہ ہنوز ایکڑ میں قیام پذیر تھا اور بیروت پر حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتا تھا جبکہ اس کے علم میں یہ بات آئی کہ صلاح الدین جافا کا محاصرہ کر رہا تھا۔ رچرڈ کو ایک اور کارروائی سرانجام دینے کا موقع میسر آ رہا تھا۔ اگلے روز وہ اپنے نائٹوں کے ہمراہ بذریعہ بحری سفر روانہ ہوا۔ اس کی فوج سست روی کے ساتھ ساحل کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کر رہی تھی۔ جافا کے شہر کی حفاظت کرنے والے قلعہ پر اسے خوش آمدید کہا گیا...... یہ وہ واحد حصہ تھا جس سے ہنوز دست برداری اختیار نہ کی گئی تھی۔ 80 نائٹوں اور کچھ فوجیوں کے ہمراہ وہ قصبے میں گھس گیا اور مسلمانوں کے ساتھ برسر پیکار ہو گیا۔ اگلے روز جوابی حملہ بھی پسپا کر دیا گیا اور ایک ماہ کے اندر اندر صلاح الدین ایوبی کے ساتھ امن معاہدہ طے پا گیا۔ صلیبیوں کے زیر تسلط جو کچھ بھی تھا وہ اس پر اپنا تسلط برقرار رکھ سکتے تھے ماسوائے اسکالن اور غیر مسلح زائرین مقدس قبرستان کی زیارت کر سکتے تھے۔

بہت سے صلیبی فوراً یروشلم عبادت سرانجام دینے کے لئے روانہ ہو گئے لیکن رچرڈ ایسا نہ کر سکا کیونکہ وہ بستر علالت پر دراز تھا اور وہ صلاح الدین سے وہ کچھ قبول کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہا تھا جو کچھ خدا نے اس سے چھین لیا تھا۔ وہ خوشی خوشی انگلستان واپس لوٹ آیا اور 1199ء میں

موت سے ہمکنار ہو گیا۔

سمندر کے پار علاقوں میں اس کی معرکہ آرائی کی بدولت عیسائی مزید ایک سو برس تک آباد رہے۔ اگرچہ وہ ایک ساحلی پٹی تک ہی محدود تھے لیکن انہیں سمندر تک آزادانہ رسائی حاصل تھی اور مصر میں ایک بہترین اڈے تک بھی رسائی حاصل تھی۔ ماسوائے عارضی طور پر...... یروشلم کبھی واگزار نہ ہو سکا اور قرونِ وسطیٰ کے آخری دور کے دوران صلیبی تحریک کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کے خلاف "مقدس جنگ" یورپ میں ترکوں کے خلاف ایک دفاعی جنگ میں تبدیل ہو گئی جو 17 ویں صدی کے اختتام تک جاری رہی۔

......❁......

جان آف آرک اور اورلینز کا محاصرہ

مئی 1428ء کے ایک دن ایک کسان کی سولہ سالہ بیٹی ایک غیر معیاری کپڑے کا سرخ اسکرٹ پہنے لورن کے قلعے میں کھڑی گورنر سے مخاطب تھی۔ وہ گورنر رابرٹ ڈی بودری کورٹ کو کچھ حیران کن باتیں بتا رہی تھی۔ اس کو اس کے آقا نے بھیجا تھا کہ وہ ڈوفن آف فرانس کو مطلع کرے کہ وہ انگریزوں کے خلاف جنگ میں مدد سے نوازا جائے گا۔ اس لڑکی نے وضاحت کی کہ ریاست اس سے متعلق نہیں بلکہ اس کے آقا سے متعلق ہے لیکن وہ چاہتا ہے کہ تاج تمہارے سر پر رکھا جائے اور وہ اس رسم تاجپوشی کی رہنمائی سرانجام دے گی۔ گورنر نے پوچھا کہ تمہارا آقا کون ہے؟ لڑکی نے جواب دیا کہ:۔

''آسمان کا بادشاہ''

یہ سب کچھ ڈی بودری کورٹ کی سمجھ سے باہر تھا۔ لڑکی کے ساتھ اس کا چچا آیا تھا۔ اس کے چچا کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ اس لڑکی کو واپس گھر اس کے والد کے پاس لے جائے وگرنہ گورنر اسے اپنی سپاہ کے حوالے کر دے گا۔ گورنر کا خیال تھا کہ لڑکی دوبارہ نہیں آئے گی لیکن اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔ آٹھ ماہ بعد وہ دوبارہ آن پہنچی۔ اس مرتبہ وہ اپنا گھر ہمیشہ کیلئے چھوڑ آئی تھی جو کہ بارہ میل کی مسافت پر واقع تھا۔

گذشتہ پانچ برسوں سے وہ فرشتوں کی آوازیں سن رہی تھی۔ وہ اسے یہ باور کروا رہے تھے کہ خدا نے اسے ایک غیر معمولی مشن کی انجام دہی کے لئے منتخب کیا تھا۔ فرانس اس وقت ایک قابل افسوس حالت کا شکار تھا۔

اسے ہتھیار اٹھانے تھے اور اورلینز کا محاصرہ سرانجام دینا تھا (جو ہنوز شروع نہ ہوا تھا) اور ریمس میں ڈوفن کو تاج پہنانا تھا۔ پہلے پہل وہ خوف زدہ ہوگئی تھی اور ان آوازوں کے ساتھ دلائل بازی میں مصروف ہوگئی تھی۔ لیکن سینٹ مچل اس کے سامنے ظاہر ہوا تھا اور اسے تلقین کی تھی کہ وہ ان آواز پر اعتبار کرے اور ان آوازوں کی ہدایات پر اپنے عمل درآمد کو ممکن بنائے۔ لہٰذا مشرقی میدان میں واقع اپنے گاؤں ڈوم رنی میں وہ کھیتی باڑی کا کام سرانجام دیتی رہی اور گھریلو کام کاج میں اپنی والدہ کا ہاتھ بٹاتی رہی اور آوازوں والا راز اس کے سینے میں دفن رہا۔ اس کے والدین سادہ لوح افراد تھے اور فطری طور پر یہ چاہتے تھے کہ وہ بھی کسی کسان کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جائے۔ وہ اکیلی جانتی تھی کہ اس کی قسمت میں یہ سب کچھ نہیں لکھا ہوا تھا۔ مابعد جب اس سے یہ پوچھا گیا کہ کیا وہ اسے ایک گناہ تصور کرتی ہے کہ وہ اپنے والدین کو چھوڑ چکی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ:۔

''چونکہ خدا نے مجھے ایسا کرنے کا حکم دیا تھا۔ لہٰذا مجھے یہ حکم بجا لانا تھا...... اگر میرے ایک سو باپ اور ایک سو مائیں بھی ہوتیں ...... اگر میں کسی بادشاہ کی بیٹی بھی ہوتی ...... مجھے ان کو چھوڑنا ہی تھا...... دست برداری اختیار کرنا تھی۔''

لہٰذا جنوری 1429ء میں وہ ڈی بودری کورٹ کے پاس واپس لوٹ آئی۔ قلعے کے نواحی قصبے میں دو افسران اس کی باتوں سے قائل ہو گئے اور ان میں سے ایک نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے قسم اٹھائی کہ خدا ان کی مدد کر رہا ہے...... وہ اسے ڈوفن کے پاس ضرور لے جائے گا۔ اس نے اس سے یہ بھی دریافت کیا کہ:۔

"وہ کب روانہ ہونا چاہتی ہے؟"

لڑکی نے جواب دیا کہ:۔

"کل کی بجائے آج اور ابھی......اور پرسوں کی بجائے کل۔"

انہوں نے اسے ایک سپاہی کی وردی زیب تن کروائی اور اس کو اس کے سرخ اسکرٹ سے ہمیشہ کیلئے نجات دلا دی۔ ڈی بودری کوٹ ہنوز شکست وشبہے کا شکار تھا کہ کیا وہ خدا سے احکامات موصول کر رہی تھی یا شیطان سے احکامات موصول کر رہی تھی۔ اس نے ایک پادری کو طلب کیا تھا جو لڑکی سے سوال جواب کر سکے۔ اس پادری کی یقین دہانی کے بعد وہ اسے ڈوفن کے پاس روانہ کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ وہ اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ 23 فروری بروز بدھ کی دوپہر کو روانہ ہوئی۔ کچھ شہریوں نے اسے ایک گھوڑا بھی پیش کیا اور جب وہ اسے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے وہ یہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ وہ گھوڑا بھی تاریخ میں اپنی جگہ بنا لے گا۔

اگرچہ لڑکی کے الفاظ میں اعتماد اور یقین کی جھلک نمایاں تھی لیکن یہ لوگ اس کی مدد کرنے کے لئے محض اس لئے رضامند ہوئے تھے کہ ان کے پیش نظر مایوس کن فوجی صورت حال تھی۔ انگریز فرانسیسیوں کے خلاف لڑ رہے تھے اور فرانسیسی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ لڑ رہے تھے۔ انگریز بادشاہوں نے فرانس کے ایک بڑے حصے پر اپنا عملی تسلط قائم کر رکھا تھا اور ایڈورڈ سوم کے 1377ء میں فرانسیسی تخت کے لئے جنگ کرنے کے بعد ان علاقوں کے رقبے میں مزید اضافہ ہوا تھا۔ ہنری پنجم کی فوج کے کارہائے نمایاں...... جس نے 1415ء میں ملک پر حملہ کیا تھا کی بدولت ایک معاہدے کے ذریعے اسے قائم مقام بادشاہ اور فرانس کے وارث کا خطاب ملا تھا اور شاہ چارلس VI کی بیٹی کیتھرائن سے شادی کی نوید بھی ملی تھی۔ اس معاہدے کے تحت یہ اعلان بھی کیا گیا تھا کہ "نام نہاد" ڈوفن ایک احمق تھا اور مستقبل کے سیاسی افق پر اس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔

کیا ڈوفن چارلس VI کا بیٹا تھا...... یہ بات ابھی تک شک وشبہے سے بالاتر نہ تھی۔ یہ مسئلہ اپنی جگہ قائم رہا حتیٰ کہ 1422ء میں چارلس اور ہنری V دونوں انتقال کر گئے...... فرانس ناامیدی کا شکار رہا اور ڈوفن اور ہینری VI کے نابالغ بیٹے کے حامیوں میں بٹا رہا۔ دو فریق...... برگنڈین اور ارماگناس (یا اورلینسٹ) پہلے ہی چارلس VI کے تخت کے گرد برسرپیکار تھے۔ 1422ء سے اورلینسٹ ڈوفن کی حمائت کر رہے تھے جو نیشنلسٹ فرانس کا لیڈر بن چکا تھا جبکہ انگریز...... ڈیوک آف برگنڈی کے اتحاد کے تحت اپنا بادشاہ مسلط کرنا چاہتے تھے۔ اس رسہ کشی کے خاتمے کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ محب وطن فرانسیسی مایوسی کی حالت میں تھے اور یہ کسان کی لڑکی آسمانی مدد کا اعلان کر رہی تھی۔

لیکن چنن کا سفر...... 350 میل کی مسافت...... دشمن کے علاقے سے گزرتے ہوئے طے کرنی تھی...... اس لڑکی کے دونوں ساتھی اس کے آفاقی مشن کے قائل ہو چکے تھے۔ اس لڑکی کی اندرونی قوت نے انہیں متاثر کیا تھا۔ اس لڑکی کو کسی قسم کا کوئی خوف وہراس لاحق نہ تھا اور جب ان

دونوں کا حوصلہ اور اعتماد متزلزل ہونے لگتا تب وہ لڑکی ان کا حوصلہ بڑھاتی۔

6 مارچ بروز اتوار یہ پارٹی چنن جا پہنچی۔ اس شہر کا قلعہ پُر شکوہ انداز میں سر اٹھائے کھڑا تھا۔ ان کو قلعے کے بڑے ہال میں داخل ہونے کی اجازت فراہم کر دی گئی جہاں پر پچاس ٹارچیں روشن تھیں اور تین صد درباری جمع تھے...... جان سیدھی ڈوفن کی جانب بڑھی جہاں پر وہ مجمعے میں گھرا ہوا تھا اور کہا کہ:۔

''ڈوفن...... میرا نام جان کنواری ہے۔ آسمان کے بادشاہ نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے اور اس پیغام کے ساتھ بھیجا ہے کہ تمہیں ریمس کے شہر میں تاج پہنایا جائے گا اور تم آسمان کے بادشاہ کے معاون ہو گے جو فرانس کا بھی بادشاہ ہے''

ڈوفن اس کی باتوں سے قائل نہ ہو سکا اور اس نے اسے پروفیسروں اور مذہبی رہنماؤں کے حوالے کر دیا تاکہ وہ اس سے سوال جواب کر سکیں۔ اس نے ان کے سوالات کے جواب دینے کے بعد ان کو ایک خط تحریر کروایا جو انگریزوں کے نام لکھوایا گیا تھا:۔

''انگلستان کے بادشاہ اور تم...... ڈیوک آف بیڈفورڈ...... چلے جاؤ...... خدا کیلئے واپس اپنے ملک چلے جاؤ ورنہ تم عظیم نقصان سے دوچار ہو گے......''

پروفیسروں نے اس لڑکی کے حق میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ ڈوفن اس لڑکی کو بخوبی استعمال کر سکتا ہے اور اس کو کسی نقصان سے دوچار ہونے کا کوئی خدشہ نہیں ہے۔ چارلس اور اس کی کونسل بھی متفق ہو گئی۔ لڑکی کو فوجی ذمہ داریاں سونپ دی گئیں اور اسے ڈوفن کے کمانڈروں کے مساوی حیثیت سے نوازا گیا...... ان سے برتر حیثیت عطا نہ کی گئی۔ چار ہفتوں کے بعد وہ اورلینز کی جانب محوِ سفر تھی۔ تین تا چار ہزار سپاہ پر مشتمل فوج بھی اس کے ہمراہ تھی۔ اگرچہ وہ برتر حیثیت کی حامل نہ تھی مگر اس کے باوجود بھی جان ایک ایسا ماحول تخلیق کر رہی تھی جو روحانیت سے بھرپور تھا اور صلیبی جنگوں کے جذبے کا حامل تھا۔ مردوں پر یہ زور دیا جاتا کہ وہ اکثر و بیشتر اعتراف گناہ کے لئے جائیں۔

اس کے اورلینز پہنچنے کی خبر اس سے بیشتر ہی پہنچ چکی تھی اور لوگ پُر امید تھے۔ تقریباً چھ ماہ سے شہر زیرِ محاصرہ تھا۔ طرفین کی عزت اور وقار داؤ پر لگا ہوا تھا۔ جنوب کی جانب دریائے لور شہر کا تحفظ سر انجام دے رہا تھا۔ مغرب اور شمال کی جانب شہر تک رسائی حاصل کرنے کی راہیں اس وجہ سے مسدود تھیں کہ پانچ قلعے جو ایک دوسرے سے قریبی فاصلے پر واقع تھے انہوں نے یہ راہیں مسدود کر رکھی تھیں۔ لیکن مشرق کی جانب محض دو قلعے تھے جن کے درمیان تقریباً تین میل کا فاصلہ تھا جس کے ذریعے کبھی کبھار فوج اور خوراک شہر میں پہنچائی جا سکتی تھی۔ محاصرہ سر انجام دینے والے تعداد میں قلیل تھے۔ شہری اگرچہ کچھ خوراک کے حصول میں کامیاب ہو رہے تھے لیکن وہ ان کے لئے ازحد ناکافی تھی۔ یہ صورت حال تھی جب جان اس مقام پر پہنچی تھی۔

28 اپریل کو بلوس سے آئی ہوئی فوج اورلینز سے ایک میل مشرق میں کیمپ نشین ہو گئی...... لیکن جنوبی کنارے پر...... ان کے اور شہر کے درمیان دریا حائل تھا۔ جان اس منصوبے سے بے خبر تھی یا اسے بے خبر رکھا گیا تھا۔ وہ اس منصوبے پر سیخ پا ہو گئی۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ انگریزوں پر یک دم حملہ آور ہوا جائے۔ اس کو اس منصوبے کا جو مقصد بیان کیا گیا وہ یہ تھا کہ پہلے مویشی شہر میں داخل کئے جائیں۔ ان کو دریائے لور کے پار پہنچایا

جائے اور مابعد شمالی کنارے سے مغرب کی جانب داخل ہوا جائے ...... محفوظ ترین راستہ ...... لیکن جان مویشیوں میں دلچسپی نہ رکھتی تھی اور جب ڈونس ...... اولینز کا احمق ڈیوک ...... ڈوفن کا چچازاد بھائی اور فوجی کمانڈر دریا عبور کرتے ہوئے اسے خوش آمدید کہنے کے لئے آئے تو وہ ان سے الجھ پڑی:۔

''کیا یہ آپ تھے جنہوں نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ مجھے دریا کے اس کنارے کے ذریعے یہاں پر لائیں بجائے اس کے کہ مجھے سیدھا تالبوٹ کے پاس بھیجا جاتا''

ہاں ...... کیونکہ یہ بہترین اور دانش وارانہ عمل درآمد تھا۔

جان نے جواب دیا کہ:۔

''ہمارے آقا کا مشورہ تمہارے مشورے سے بہتر اور دانش وارانہ ہے۔''

تب ایک معجزہ رونما ہوا۔

مویشیوں سے لادی ہوئی کشتیاں پانی کے بہاؤ کے مخالف رُخ سفر طے کر رہی تھیں۔ چونکہ ہوا ان کے مخالف سمت کی جانب چل رہی تھی لہٰذا وہ آگے بڑھنے اور سفر جاری رکھنے سے قاصر تھیں۔ جان نے ڈونس سے کہا کہ وہ انتظار کرے اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اور اچانک ہوا کا رخ تبدیل ہو گیا۔

ڈونس کے بقول:۔

اس لمحے مجھے اس سے بڑی اُمیدیں وابستہ ہو گئیں ...... میں نے اتنی امیدیں اس کے ساتھ وابستہ کر لیں تھیں کہ اس سے پیشتر میں نے اس کے ساتھ اتنی امیدیں وابستہ نہ کی تھیں اور تب میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ دریا عبور کرتے ہوئے اورلینز کے قصبے میں داخل ہو جائے کیونکہ وہ قصبے میں داخل ہونے کی عظیم خواہش کی حامل تھی۔''

لیکن جان نے اس منصوبے پر اعتراض کیا۔ فوج تعداد میں اس قدر قلیل تھی کہ محاصرہ سرانجام دینے کے لئے ناکافی دکھائی دیتی تھی اور اسے واپس بلوس بھیجا جا رہا تھا۔ کسی نہ کسی وجہ کے تحت وہ اس کے ہمراہ روانہ ہونا چاہتی تھی اور ڈونس اس کو اس کے اس ارادے سے باز نہ رکھ سکا۔ بالآخر ڈونس نے دریا عبور کیا اور مشرقی دروازے سے اورلینز میں ان کا داخلہ فتح و کامرانی کی نوید ثابت ہوا۔ جوں ہی اندھیرا چھا گیا شہری اور سپاہ ہاتھوں میں ٹارچیں پکڑے جان کے گرد جمع تھے جو ایک سفید گھوڑے پر سوار تھی۔ ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے خدا بذات خود ان کے درمیان اتر آیا ہو۔ لوگ اسے چھو لینے کے لئے بے قرار تھے اور اس رات کھانا کھانے کے بعد وہ ڈیوک آف آرلینز کے خزانچی جیکوئس بوچر کے ہاں قیام پذیر ہوئی۔

اگلے روز ڈیوک کے ساتھ تلخ کلامی تک نوبت آن پہنچی۔ جان انگریزوں پر بلہ بولنا چاہتی تھی لیکن ڈیوک کا فیصلہ اس کے برعکس تھا۔ جان نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ خدا کے نام پر یہاں سے نکل جائیں وگرنہ وہ خود انہیں نکال باہر کرے گی۔ انہوں نے چلاتے ہوئے جواب دیا کہ:۔

''اے گائے نما لڑکی ...... اگر تم ہمارے قابو آ گئی تو ہم تمہیں زندہ جلا دیں گے۔''

اگلی صبح اورلینز کے جرنیل شہر سے روانہ ہوئے تاکہ بلوس سے مزید فوج لائی جا سکے۔ تین روز تک جان سڑکوں پر گشت کرتی رہی اور

جلوسوں میں حصہ لیتی رہی۔ تب 4 مئی کو وہ تازہ دم فوجی دستوں سے ملنے کے لئے چلی آئی جو ابھی پہنچ رہے تھے۔ انہوں نے اورلینز کی جانب پیش قدمی کی اور انگریزوں نے بالکل بھی حرکت نہ کی۔ کیا یہ اس امر کا مزید ثبوت تھا کہ آفاقی مدد اس کے شامل حال تھی؟ اس روز شام تک اورلینز کے لوگ لازمی طور پر ایسا ہی سوچ رہے ہوں گے۔ سہ پہر کے وقت فوج نے بھی ہلہ بول دیا تھا اور محاصرہ شروع ہونے کے بعد ان کی پہلی کامیابی منظر عام پر آئی تھی۔ انہوں نے ایک انگریزی قلعے پر قبضہ کر لیا تھا...... اس قلعے کا نام باسٹل ڈی سینٹ لوپ تھا جو شہر سے دو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ جان منصوبے سے بے خبر اپنے گھر میں محو خواب تھی جبکہ اس کی آوازوں نے اچانک اسے بیدار کر دیا اور اسے خبردار کیا کہ فرانسیسی خون بہہ رہا تھا۔ لہٰذا وہ مشرقی دروازے کی جانب روانہ ہوئی:۔

''جوں ہی فرانسیسیوں نے جان کو دیکھا انہوں نے تالیاں بجانا شروع کر دیں اور سینٹ لوپ کا قلعہ اور برج فتح کر لیا گیا۔''

تین روز بعد اس کامیابی کو پھر دہرایا گیا۔ چھ ماہ سے فرانسیسیوں نے کوئی بھی فیصلہ کن امور سرانجام نہ دیا تھا۔ اب جان سے متاثر ہوتے ہوئے افواج نے دریا کا جنوبی کنارا عبور کیا اور قلعے پر حملہ آور ہوئے۔ اس قلعے کا نام باسٹل ڈی سینٹ جین لی بلانک تھا۔ قلعے کے دفاع پر مامور فوجی فرار ہو کر ایک اور قلعے میں پناہ گزین ہو گئے جو مغرب کی جانب آدھ میل کے فاصلے پر واقع تھا...... جہاں سے وہ بڑے پل کی جانب جانے والے ان راستوں پر نظر رکھے ہوئے تھے جو شہر کی جانب جاتے تھے۔ اس قلعے سے...... باسٹل ڈی اگسٹن کے قلعے سے انگریز افواج نمودار ہوئیں اور دیگر لوگوں کی مدد سے تعاقب کرنے والے فرانسیسیوں پر حملہ آور ہوئیں اور ان کو مجبور کیا کہ وہ واپس اپنی کشتیوں کی جانب بھاگ نکلیں۔ لیکن اس لمحے جان جنوبی کنارے پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے انگریز فوج کو دوبارہ ان کی چوکیوں کی جانب واپس دھکیل دیا۔ انتہائی جدوجہد کے بعد فرانسیسی کامیاب و کامران ہوئے۔

اس رات جان نے مردوں کے ساتھ ہی ایک کیمپ میں قیام کیا۔ اورلینز کے لوگ اس فتح کے معانی سے بخوبی واقف تھے۔ وہ جنگجوؤں کے لئے ڈبل روٹی اور شراب لائے تھے۔ لیکن اعلیٰ افسران ہنوز بزدلی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ جوں ہی جان کھانا کھا رہی تھی ان میں سے ایک افسر اسے یہ بتانے کے لئے آیا کہ انہوں نے آنے والے کل کیلئے کیا فیصلہ سرانجام دیا تھا...... کوئی تازہ حملہ نہیں کیا جائے گا۔ کوئی ہلہ نہیں بولا جائے گا...... کیونکہ فوج قلیل تعداد میں تھی اور مزید کمک درکار تھی۔

جان نے جواب دیا کہ:۔

''تم اپنے فیصلے سرانجام دے رہے ہو اور میں اپنے فیصلے کے تحت روبہ عمل ہوں گی اور میں جانتی ہوں کہ میرے آقا کا فیصلہ ہی بہتر فیصلہ ہوگا۔''

7 مئی بروز ہفتہ 7 بجے صبح سے ایک بڑا حملہ جاری تھا...... یہ حملہ مرکزی پل کے جنوبی سرے کے خلاف تھا...... یہاں پر کئی ایک رکاوٹیں موجود تھیں۔ پہلے ایک گہری کھائی تھی۔ اس کے بعد مٹی کی ایک پہاڑی نما رکاوٹ تھی۔ تمام دن جنگ جاری رہی۔ جان کھائی عبور کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ دوپہر کے قریب جان کو بائیں چھاتی سے کچھ اوپر ایک تیر آن لگا تھا جو چھ انچ تک اندر گھس گیا تھا۔ اس نے بذات خود ہی اس تیر کو کھینچ کر اپنے

جسم سے باہر نکالا......زخم کی مرہم پٹی کی گئی اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ دوبارہ واپس آن پہنچی تھی۔

باقی رکاوٹیں عبور کرنا ایک مشکل امر دکھائی دیتا تھا اور رات 8 بجے تک 13 گھنٹوں کی جنگ لڑنے کے بعد سپاہ تھک چکی تھی اور جرنیلوں نے پسپا ہونے کے احکامات صادر کر دیے۔ لیکن بیشتر اس کے کہ پسپا ہونے کا اعلان ہوتا جان نے یہ مشورہ دیا کہ کچھ دیر تک انتظار کر لیا جائے۔ انگوروں کے ایک باغ میں عبادت سرانجام دینے کے بعد اس نے سپاہ کی رہنمائی کرتے ہوئے ایک اور حملہ کیا۔ یہ حملہ کامیاب رہا اور انگریز مشکل حالات کا شکار ہو گئے۔ ان میں سے کچھ پل کی جانب بھاگے۔ فرانسیسیوں نے پل کو نشانہ بنایا۔ پل مسمار ہو گیا اور کئی ایک انگریز دریا میں ڈوب گئے۔ جان نے ان کے کمانڈر کو مشورہ دیا کہ:۔

''ہتھیار پھینک دیے جائیں''

اور کچھ ہی دیر بعد پل پر موجود ہر ایک انگریز یا تو موت سے ہمکنار ہو چکا تھا یا پھر جنگی قیدی بنایا جا چکا تھا۔ اس رات اورلینز کی گھنٹیاں اظہار خوشی کے لئے بجائی جا رہی تھیں۔ جان نے اپنے زخم کی مرہم پٹی کروائی تھی اور اس نے پورے اطمینان کے ساتھ رات کے کھانے میں ڈبل روٹی اور شراب سے لطف اٹھایا۔

دونوں طرف کے لوگ اس نکتہ نظر کے حامل ہو چکے تھے کہ جان مافوق الفطرت قوتوں کی حامل ہے۔ فرق محض اتنا تھا کہ انگریز اسے ایک جادوگر اور ساحرہ کہتے تھے جبکہ فرانسیسی اسے ایک درویش کہتے تھے۔

اب کامیابی انگریزوں سے کوسوں دور تھی جبکہ فرانسیسی ایک نئی امید اور ولولے کے ساتھ برسرپیکار تھے۔ بالآخر فرانس حملہ آوروں سے نجات حاصل کر چکا تھا۔ جان کی شہرت بھی دور دور تک پھیل چکی تھی اور چارلس VII بھی پُرامید تھا...... جان نے اسے تاج پہنانا تھا جیسا کہ اس نے وعدہ کر رکھا تھا اور ریمس کے مقام پر تاج پہنانا تھا۔

ہندوستان کی تلاش میں

15ویں صدی میں اس دنیا کے بارے میں انسانی علم محدود تھا جس میں وہ رہائش پذیر تھا۔ مختلف ممالک کے کھوج لگانے والے (دریافت کنندگان) اور تاجر حضرات ہندوستان...... چین اور افریقہ تک رسائی حاصل کر چکے تھے اور ملاح امریکہ تک رسائی حاصل کر چکے تھے...... اگرچہ ایک علیحدہ براعظم کے طور پر اس کی حقیقت ہنوز آشکارا نہیں ہوئی تھی۔

عظیم براعظم افریقہ ایک معمہ بھی تھا اور ایک مسئلہ بھی تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ جنوب کی جانب اس کی وسعت کتنی ہے...... اس کی شکل و صورت کیا تھی...... اور کیا یہ ہندوستان کے ساتھ ملحق تھا۔ اس وقت عام طور پر یہ نکتہ نظر رائج تھا کہ زمین ہموار ہے لہٰذا دنیا کے کنارے تک بحری سفر ممکن ہے اور یہ کہانیاں بھی عام تھیں کہ دیو پیکر عجیب الخلقت جانور موجود ہے جو پورا بحری جہاز نگل جاتا ہے اور مراکو کے بارے میں بھی کوئی نہیں جانتا تھا اور بحر اوقیانوس کے افریقی ساحل کے بارے میں بھی بہت کم معلومات حاصل تھیں جس کے جنوب میں آج کل مراکو واقع ہے۔

لیکن تاریک دور گزرنے اور روشن خیالی کا دور شروع ہونے پر کئی ایک اعتقادات اپنی موت آپ مر گئے۔ پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ لوگ قدیم یونانیوں کے کاموں سے آشنا ہونے کے علاوہ رومی فلاسفروں اور سائنس دانوں کے کاموں سے بھی آشنا ہوئے اور اس حقیقت کو بھی تسلیم کر لیا گیا کہ زمین ہموار ہونے کی بجائے گول ہے۔

جو کچھ عرصہ تک بیشتر کام سرانجام دیا جا چکا تھا وہ سب کچھ 15ویں صدی میں بھی دہرایا جا سکتا تھا۔ شاید اس نظریے کا سب سے بڑا حامی پرتگال کا شہزادہ ہنری تھا جو ایک "جہاز ران" کے طور پر مشہور تھا۔ اس نے پرتگال میں جہاز رانی کے بارے میں ایک اسکول بھی قائم کر رکھا تھا۔ اس اسکول میں اس نے جہاز بنانے والے...... ڈیزائنر...... ریاضی دان...... نقشہ نویس...... ماہر فلکیات اور ملاح وغیرہ اکٹھے کر رکھے تھے۔ اس اسکول میں سائنس دان نقشے اور ساز و سامان تیار کرتے جبکہ جہاز بنانے والے نئے جہازوں کا ڈیزائن تیار کرتے اور نئے جہاز بھی تیار کرتے تھے جو کہ پہلے سے موجود جہازوں سے بہتر صورت کے حامل ہوتے تھے اور ناموافق حالات کا بخوبی مقابلہ کر سکتے تھے۔ آہستہ آہستہ نئے اور بہتر جہازوں کی بدولت دریافت کنندگان اور مہم جُو جنوب کی جانب مزید آگے پیش رفت کرنے کے قابل ہوئے اور نئے علاقے دریافت کرنے کے بھی قابل ہوئے۔

عرصہ دراز سے راس (جیسے راس امید) بُجادر...... افریقی سرزمین پر واقع...... کینری جزیروں کے جنوب میں 150 میل کی دوری پر واقع...... ایک بڑی رکاوٹ تصور کی جاتی تھی جس کو عبور کرنے کی کسی نے بھی کوشش سرانجام نہ دی تھی...... اس کے آگے تازہ پانی موجود نہ تھا...... گھاس موجود نہ تھی۔ لیکن بالآخر یہ رکاوٹ بھی دور ہوگئی اور جنوب کی جانب واقع سرزمین شمال کی جانب واقع سرزمین جیسی ہی پائی گئی۔ بہت سے مہم جُو جنوب کی جانب پہلے سے زیادہ دور تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے لیکن کوئی بھی مہم جُو بہت زیادہ آگے تک رسائی حال کرنے میں

کامیاب نہ ہو سکا۔حتیٰ کہ دریافت کنندگان سونے اور چاندی کے ساتھ واپس لوٹنا شروع ہو گئے اور امیر ہو گئے۔ان امیر لوگوں نے دیگر مہم جوؤں کو جنوب میں مزید آگے تک جانے پر اکسایا۔

جہاز ران شہزادہ ہنری موت سے ہمکنار ہو چکا تھا۔اس کی وفات کے بعد واسکوڈے گاما منظر عام پر آیا۔واسکوڈے گاما 1406ء میں پرتگال میں پیدا ہوا تھا۔اس کا باپ الم مجو صوبے کا گورنر تھا۔وہ ایک شریف النفس شخص تھا اور ایک سپاہی اور ایک جہاز ران دونوں حیثیتوں میں نمایاں تھا۔جب وہ اپنی عمر کے 47ویں برس میں داخل ہوا تو اس نے تاریخ میں اپنا نام روشن کیا۔اس نے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کیا۔

اس بحری سفر کے لئے اسے جدید ڈیزائن کے حامل تین بحری جہاز دیے گئے تھے......دو 120 ٹن وزن کے حامل تھے جبکہ ایک 50 ٹن وزن کا حامل تھا۔اگرچہ آج کل کے معیار کے مطابق یہ چھوٹے جہاز کہلاتے تھے لیکن اس وقت کے معیار کے مطابق یہ بڑے جہاز تھے۔واسکوڈے گاما ایک جہاز کی کمان کے فرائض سرانجام دے رہا تھا جبکہ اس کا بھائی پال دوسرے جہاز کی کمان کے فرائض سرانجام دے رہا تھا اور اس کا ایک دوست نکولا کولہو تیسرے جہاز کی کمان کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔اس کے علاوہ ایک چھوٹا جہاز بھی شامل تھا جس پر اشیائے خوردونوش کا وافر ذخیرہ موجود تھا۔

اس سفر کی تیاری خاصی سوچ بچار اور تفصیلات طے کرنے کے بعد سرانجام دی گئی تھی۔وافر مقدار میں اشیائے خوردونوش جہاز رانوں کے ہمراہ تھیں۔یہ اشیائے خوردونوش دو برس تک کے لئے کافی تھیں۔ایسے لمبے سفر کیلئے اشیائے خوردونوش بسکٹ......گوشت اور شراب......چاول......مچھلی اور پنیر پر مشتمل ہوتی تھیں۔تجارتی سامان بھی غیر ممالک میں لایا جاتا تھا۔

جب روانگی کی تمام تر تیاریاں مکمل ہو گئیں تب بادشاہ نے ایک تقریب کے دوران اپنے کپتانوں سے ملاقات کی۔اس تقریب کے دوران اس نے دو خط واسکوڈے گاما کے حوالے کئے......ایک خط کالی کٹ کے بادشاہ کے نام تھا(ہندوستان کے مالابار کے ساحل پر واقع ایک مقام)اور دوسرا خط پریسٹر جان کے نام تھا......ایک روایتی عیسائی بادشاہ جس کے بارے میں یہ قیاس کیا جاتا تھا کہ وہ افریقہ کے کسی مقام پر قیام پذیر تھا۔

ہندوستان کی جانب واسکوڈے گاما کی مہم جوئی کا آغاز 8 جولائی 1497ء کو لزبن سے ہوا۔

تین ہفتوں کے اندر اندر بحری جہازوں کا یہ ایک چھوٹا سا بیڑہ راس وردی جزیروں تک جا پہنچا جو افریقہ میں واقع تھے۔یہ جزیرے پرتگالیوں نے 20 برس بیشتر دریافت کئے تھے اور اس مقام پر واسکوڈے گاما اور دیگر مہم جو 3 اگست تک قیام پذیر رہے۔دوبارہ روانگی پر واسکوڈے گاما تین ماہ کا سفر طے کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ تقریباً راس امید کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔اگرچہ یہ ایک اندازہ تھا لیکن اس کا اندازہ درست ثابت ہوا اور انہوں نے جس پہلی خشکی پر قدم رکھا وہ سینٹ ہیلینا تھی جو راس امید سے 50 میل دور شمال کی جانب واقع تھی۔

اس موقع پر کوئی بھی اس سرزمین کو شناخت نہ کر سکا لیکن ایک خلیج موجود تھی جہاں پر جہاز لنگر انداز کئے جا سکتے تھے اور سمندر میں لاتعداد مہینے گزارنے کے بعد یہ ضروری تھا کہ جہازوں کو لنگر انداز کیا جائے......جہازوں کی صفائی سرانجام دی جائے اور تازہ پانی اور جلانے والی لکڑی ذخیرہ کی جائے۔لہٰذا 10 نومبر 1497ء کو جہاز لنگر انداز کر دیے گئے اور یہ سفر اس دور کا طویل ترین سفر تھا جو ان جہازوں نے طے کیا تھا۔

یہ بحری بیڑہ نوروز تک خلیج ہیلینا میں لنگر انداز رہا۔ اس دوران جہاز ران مقامی باشندوں سے بھی ملے جو کہ دوستانہ انداز اپنائے ہوئے تھے۔

واسکوڈے گاما اور دیگر مہم جو دوبارہ عازم سفر ہوئے لیکن اس مرتبہ ان کی تقدیر بدل چکی تھی۔ 18 نومبر کو انہوں نے راس امید دیکھی لیکن تند و تیز ہواؤں نے انہیں پریشان کر کے رکھ دیا۔ موسم میں ٹھہراؤ پیدا ہونے کے بعد انہیں محسوس ہوا کہ وہ ہندوستان کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔

خلیج سان براس میں انہوں نے پانی پر توقف اختیار کیا اور اس دوران انہوں نے سامان کے ذخیرے والا چھوٹا جہاز بھی توڑ ڈالا کیونکہ اس کی اب ضرورت باقی نہ رہی تھی اور اس جہاز کا سامان انہوں نے دیگر جہازوں میں بھر لیا۔ دوبارہ طوفانوں سے بالمقابل ہوتے ہوئے وہ ڈیاز جا پہنچے۔ اس وقت تک ان کو سمندر میں سفر طے کرتے ہوئے چھ ماہ ہو چکے تھے۔ ان تین جہازوں کا عملہ 150 سے زائد افراد پر مشتمل تھا۔ عملے کے ارکان وٹامن کی کمی کی وجہ سے علالت کا شکار ہو چکے تھے۔ لیکن واسکوڈے گاما اپنی دھن کا پکا تھا وہ ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کئے بغیر چین سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

تند و تیز ہواؤں نے انہیں دریائے زمبیزی کی کھاڑی میں پہنچا دیا جہاں کے باشندے زیادہ مہذب تھے اور دوستانہ رویے کے بھی حامل تھے اور جہاں پر تازہ پھل بھی دستیاب تھے۔ اگرچہ انہیں محسوس نہ ہوا...... لیکن ان پھلوں نے انہیں درکار وٹامن سی فراہم کیا اور وہ بیماری سے صحت یاب ہو گئے۔ یہاں پر وہ کچھ دیر کے لئے رکے تاکہ اپنے جہازوں کی صفائی وغیرہ سرانجام دے سکیں۔ اور ان کی مرمت وغیرہ بھی سرانجام دے سکیں اور یہاں پر وہ پہلی مرتبہ بربر باشندوں سے بھی بالمقابل ہوئے۔ ان کے بہتر ملبوسات اور بہتر رویے اس امر کا اظہار کرتے تھے کہ عربی تاجر اس مقام تک رسائی رکھتے تھے۔

واسکوڈے گاما خوش بھی تھا اور پُر امید بھی۔ وہ ساحل کے ساتھ ساتھ شمال کی جانب روانہ ہوا اور موزمبیق جا پہنچا۔ یہاں پر عربی بولنے والے مسلمان آباد تھے اور عربوں کے بحری جہاز قیمتی دھاتوں...... قیمتی پتھروں اور مصالحہ جات سے لدے ہوئے تھے۔ لیکن یہاں پر ایک مسئلہ درپیش تھا...... پرتگالی اور مسلمان (یا موزر جیسا کہ وہ جانے جاتے تھے) روایتی دشمن تھے۔ پہلے پہل پرتگالیوں کو ترک تصور کیا گیا اور اسی بنا پر ان کا استقبال بھی کیا گیا لیکن جلد ہی حقیقت آشکارا ہو گئی اور مسلح مسلمانوں نے چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں ان کا راستہ روک لیا۔ واسکوڈے گاما نے چھوٹی توپوں کو آگ اگلنے کے احکامات جاری کر دیئے۔ مسلمان فرار ہو گئے لیکن واسکوڈے گاما نے جہازوں کے لنگر اٹھانے میں دیر نہ کی۔

پرتگالی بحری بیڑہ تند و تیز لہروں کی زد میں آ گیا۔ واسکوڈے گاما سازگار ہوا چلنے کے انتظار میں تھا۔ اس دوران اس کے جہاز ممباسا پہنچ چکے تھے جو کہ آج کل کینیا کہلاتا ہے۔ ممباسا کے شاہ نے پرتگالی مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ اس نے ان کے لئے تحائف بھی بھیجے۔ ان تحائف میں کثیر تعداد میں مالٹے اور لیموں بھی شامل تھے اور جہازوں کو ممباسا کی بندرگاہ میں داخل ہونے کی اجازت بھی فراہم کر دی۔

دو روز بعد واسکوڈے گاما کا بحری بیڑہ دوبارہ عازم سفر ہوا۔ اس کے عملے کی صحت اب بہتر ہو چکی تھی۔ اس موقع پر اسے ایک تجربہ کار رہنما کی ضرورت درپیش تھی۔ لہٰذا اس نے ایک چھوٹے سے مسلمان جہاز پر قبضہ کیا اور اس کے مسافروں سے سوال جواب کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ مالنڈی میں شمال کی جانب ایک بندرگاہ پہلے ہی سے موجود تھی جہاں پر ہندوستان سے آئے ہوئے عیسائی جہاز موجود تھے۔ یہ اچھی خبر تھی۔ پرتگالیوں

نے قصبے سے باہر ہی لنگر ڈال دیے اور مسلمان قیدیوں کو ایک لمبی کشتی میں ساحل تک لے آئے۔ انہوں نے بادشاہ کو یہ پیغام ارسال کیا کہ سفید مہمان نیک ارادوں اور امن وسلامتی کے پیغام کے ساتھ آئے ہیں۔ بادشاہ کا جواب حوصلہ افزا تھا۔ اس نے واسکوڈے گاما کے لئے تحائف ارسال کئے اور اسے ساحل پر آنے کی دعوت دی۔ جواب میں واسکوڈے گاما نے بھی بادشاہ کو تحائف ارسال کئے لیکن مبادا سا کی صورت حال ذہن میں رکھتے ہوئے ساحل پر آنے سے معذوری ظاہر کی۔ تاہم بادشاہ کا رویہ دوستانہ تھا۔ اگرچہ واسکوڈے گاما نے مالنڈی کی سرزمین پر قدم رکھنے سے انکار کر دیا تھا لیکن بالآخر وہ بادشاہ سے ملاقات کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اسے نو روز تک شاہی مہمان رکھا گیا۔ بادشاہ نے واسکوڈے گاما کو ایک رہنما بھی مہیا کر دیا جو ہندوستان تک اس کی رہنمائی سرانجام دے سکے۔ 24 اپریل 1498ء کو پرتگالی بحری بیڑہ اپنے سفر کی آخری منزل طے کرنے کیلئے روانہ ہوا۔

ہندوستان پہنچنے تک مزید ایک ماہ صرف ہوا جب جہازوں نے کالی کٹ کے مقام پر لنگر ڈالے تب واسکوڈے گاما کا مشن اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا...... وہ ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کر چکا تھا۔ پرتگالیوں کے استقبال میں جوش، جذبہ اور ولولہ مفقود تھا۔ مقامی عرب تاجروں نے انہیں قدر کی نگاہ سے نہ دیکھا۔ ان دنوں میں بھی کاروبار میں مقابلہ جاتی رجحان اسی طرح موجود تھا جس طرح آج کل موجود ہے۔ اگرچہ راجہ کا رویہ دوستانہ تھا لیکن عربوں نے ہندوؤں کو خبردار کیا کہ پرتگالی تجارت کی غرض سے ہندوستان میں وارد نہیں ہوئے بلکہ یہ ہندوستان فتح کرنے کے ارادے سے ہندوستان میں وارد ہوئے ہیں۔

اگرچہ واسکوڈے گاما نے سفارتی جدوجہد جاری رکھی لیکن اس کے باوجود بھی پرتگالیوں اور ہندوؤں کے درمیان لڑائی شروع ہو گئی۔ واسکوڈے گاما کو بھی اغوا کر لیا گیا اور عین ممکن تھا کہ اس کو لقمہ اجل بنا دیا جاتا کہ اس کے بھائی کی بروقت کارروائی کی بدولت اس کی جان بچ گئی جس نے کالی کٹ کے کچھ نامور شہریوں کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور ان کو اس وقت تک یرغمالی بنائے رکھا جب تک واسکوڈے گاما بحفاظت واپس نہ آ گیا۔ لیکن ان پرتگالیوں کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ کالی کٹ میں مزید قیام کر سکیں۔ لہٰذا وہ کانامور کے ساحل کی جانب روانہ ہو گئے جہاں پر انہوں نے دوستانہ تجارتی روابط استوار کر لئے۔ اسی برس ماہ نومبر میں پرتگالیوں کے جہاز مصالحہ جات سے لدے ہوئے واپسی کے طویل سفر پر روانہ ہوئے۔

جہاز کا عملہ خوشی سے لبریز تھا لیکن ان کے مصائب فی الحال ختم نہ ہوئے تھے۔ عملہ میں ایک مرتبہ پھر بیماری پھوٹ پڑی تھی اور عملے کے ارکان ہلاک ہونا شروع ہو گئے تھے۔ جنوری 1499ء میں وہ جنوب کی جانب راس امید کی جانب روانہ ہوئے۔ اگرچہ وہ راستے میں کسی بھی بندرگاہ پر نہ رکے تھے اور ہوائیں تیز تھیں لیکن ان کے حق میں تھیں۔

بحراوقیانوس طوفانوں کی زد میں تھا۔ جہاز ہچکولے کھا رہے تھے اور عملہ تھکا ماندہ اور بیماریوں کے باعث کمزوریوں کا بھی شکار تھا۔ لہٰذا عملے نے مکھیوں کی طرح مرنا شروع کر دیا۔ اس دوران جہاز ازورس تک جا پہنچے تھے اور عملے کے محض چند ارکان ہی زندہ بچے تھے جو کہ جہازوں کو رواں دواں رکھ سکیں۔ جہاز کے عملے کے ارکان کا محض ایک تہائی حصہ ہی بخیریت واپس پرتگال پہنچ سکا تھا۔ حتیٰ کہ واسکوڈے گاما کا بھائی بھی ازورس میں لقمہ اجل بن چکا تھا۔ وہ کئی ماہ تک علیل رہنے کے بعد موت سے ہمکنار ہوا تھا۔ ان کے پرتگال پہنچنے کی خبر ان سے پہلے ہی پرتگال پہنچ چکی تھی اور جب وہ بالآخر لزبن آن پہنچے...... یہ ماہ ستمبر تھا...... ایک شاندار استقبال ان کا منتظر تھا۔ تمام ملک خوشی سے ناچ رہا تھا اور واسکوڈے گاما پر اعزازات

کی بارش کردی گئی تھی۔ بالآخر ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کرلیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا مشرقی سامانِ تجارت کم لاگت کے تحت مغرب پہنچ سکتا تھا......اب پرتگال کے امیر ہونے کی آس بندھ چکی تھی۔

......❁......

میکسیکو کی فتح

اسپین کے باشندے ہرنن کورٹس کی قابل ذکر مہمات سرانجام دینے کے بعد میکسیکو میں آمد......اور اس کا میکسیکو کو فتح کرنا......تاریخ کی چونکا دینے والی اور نا قابل یقین مہمات میں سے ایک مہم تھی۔

اس کی کامیابی ایک حادثاتی کامیابی تھی۔ اگر کورٹس کو یہ اندازہ ہوتا کہ اسے کس قدر قوت وطاقت کا سامنا کرنا ہوگا تو عین ممکن تھا کہ وہ میکسیکو کا کبھی رخ ہی نہ کرتا۔ وہ اس امر کو ترجیح دیتا کہ کیوبا میں ہی مقیم رہے......ایک امیر ترین اسپینی نو آبادکار کے طور پر کیوبا میں ہی لطف اندوز ہوتا۔

لیکن کورٹس کے پاس یہ یقین کر لینے کی کوئی وجہ موجود نہ تھی کہ میکسیکو ایک ترقی یافتہ ریاست تھی اور اس کے پاس ایک بڑی اور بہترین تربیت یافتہ فوج بھی موجود تھی۔ وہ کیوبا سے 10 فروری 1519ء کو روانہ ہوا۔ اگرچہ اس کی روانگی کیوبا کے گورنر ویلاس کوئز کی جانب سے تھی......لیکن اس کی خفیہ نیت یہ تھی کہ وہ کیوبا کے ساتھ اپنے تعلقات منقطع کرے اور بذات خود اس نئی سرزمین کے گورنر کا عہدہ سنبھال لے اور براہ راست شاہ اسپین کی اطاعت قبول کرے۔ وہ جس وقت عازم سفر ہوا اس وقت ویلاس کوئز اس کے ارادے اور نیت سے بخوبی واقف تھا......لیکن اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔

اور سینکڑوں میل دور......ایک عظیم سمندر کے پار......شہنشاہ مونٹی زوما بھی کورٹس کی آمد سے باخبر تھا۔ اس کی اپنی مذہبی کتب نے اسے خبردار کیا تھا اور کورٹس کے بارے میں تفصیلاً بیان کیا تھا......حتیٰ کہ اس لمحے کی بھی نشاندہی کی تھی جس لمحے کورٹس کو اپنا سفر مکمل کرتے ہوئے میکسیکو آن پہنچنا تھا۔ مونٹی زوما یہ بھی جانتا تھا کہ کورٹس ایک مختصر فوج کے ہمراہ پہنچے گا اور اس کی فوج سے نپٹنے کیلئے اس کی اپنی عظیم فوج کا محض ایک مختصر حصہ ہی کافی ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود اس پر کپکپی طاری تھی۔ وہ سر سے لے کر پاؤں تک کانپ رہا تھا۔

یہ جاننے کیلئے کہ وہ کیوں سر سے لے کر پاؤں تک کانپ رہا تھا......ہمیں 16 ویں صدی کے میکسیکو اور اس کے حکمران کا ایک جائزہ لینا ہوگا۔

اہل میکسیکو نے وسطی امریکہ کی آتش فشاں پہاڑیوں پر آباد ہونے کو ترجیح دی تھی۔ اس علاقے میں آدھ درجن کے قریب دیگر تہذیبیں بھی موجود تھیں۔ یہ تہذیبیں یا تو نیست و نابود ہو چکی تھیں یا پھر ان کی باقیات ہنوز موجود تھیں۔ لیکن ان تہذیبوں میں وہ ذہانت مفقود تھی جو ذہانت اہل میکسیکو کے حصے میں آئی تھی۔ اپنی ذہانت کے توسط سے اہل میکسیکو نے کئی ایک شعبوں میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے تھے......ہتھیاروں کی تیاری......خوبصورت زیورات کی تیاری......عمدہ کاٹن کی تیاری کے علاوہ ربڑ......تمباکو اور چاکلیٹ کی کاشت وغیرہ میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ ان لوگوں نے اپنا دارالحکومت ایک ایسے جزیرے کو بنایا تھا جو ایک جھیل میں واقع تھا اور یہ جزیرہ سطح سمندر سے تقریباً سات ہزار فٹ کی بلندی پر واقع تھا۔ یہ محلات کا شہر تھا۔

ایک تنگ راستے کے ذریعے اس تک رسائی حاصل کرنا ممکن تھی اور رسائی حاصل کرنے کے اس ذریعے کو جزوی یا مکمل طور پر کسی بھی لمحے

نیست و نابود کیا جا سکتا تھا۔

لیکن میکسیکو کے مذہب نے میکسیکو کو شکست سے دوچار کیا اور اس کو اس قابل بنا دیا کہ چند مہم جو اس پر غلبہ کرنے میں کامیاب ہوسکیں۔ یہ ایک عجیب و غریب نوعیت کا حامل ایک ظالم مذہب تھا۔ یہ مذہب کئی ایک دیوتاؤں کا حامل تھا۔ اگر ان دیوتاؤں کو خوش نہ کیا جاتا...... باقاعدگی کے ساتھ ان کی خوشی کا سامان نہ کیا جاتا...... تب سورج نکلنا بند ہو جاتا...... فصلیں اگنی بند ہو جاتیں...... اور میکسیکو اپنی موت آپ مر جاتا۔

یہ دیوتا کس قسم کا تحفہ درکار رکھتے تھے؟

وہ جو تحفہ مانگتے تھے...... جو نذرانہ مانگتے تھے وہ انسانی دل تھا...... وہ انسانی دل تھا...... انسان کے سینے میں دھڑکنے والا دل انسانی چھاتی سے نکال کر قربان گاہ میں پیش کیا جاتا تھا۔ میکسیکو کی فوج اکثر دیگر قبیلوں کے ساتھ آمادہ جنگ رہتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ فوج انسانی جنگی قیدی درکار رکھتی تھی تاکہ ان کی قربانی اپنے دیوتاؤں کے حضور پیش کر سکیں۔ جب قربانی پیش کرنے کی نوبت آتی اس وقت ان مظلوم جنگی قیدیوں کو ایک ایک کر کے قربان گاہ میں لٹایا جاتا...... پانچ آدمیوں کی مدد سے پادری ان کے دل ان کے سینوں سے نکالتا اور یہ انسانی دل دیوتاؤں کے حضور قربانی کے لئے پیش کر دیے جاتے۔

لیکن میکسیکو کے دیوتاؤں کے مندر کا ایک دیوتا کوئٹزل کوٹل برسوں قبل اپنے ساتھی دیوتاؤں کے ہاتھوں جلاوطن ہونے پر مجبور ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس نے انسانی قربانی قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لہٰذا اس کے ساتھی دیوتاؤں نے اسے جلاوطن کر دیا تھا۔ جوں ہی وہ اپنی جادو کی کشتی میں غصے کے عالم میں مشرق کی جانب روانہ ہوا اس نے یہ اعلان کیا کہ وہ "ایک ریڈ کے سال" واپس آئے گا اور ضرور انتقام لے گا۔

میکسیکو کے کیلنڈر کا ایک ریڈ سال ہمارے ایک لیپ کے سال کی طرح ہوتا تھا۔ کسی نے بھی کوئٹزل کوٹل کی دھمکی کی پرواہ نہ کی حتیٰ کہ برس 1519ء آن پہنچا...... جو ریڈ کا سال تھا۔ اس وقت شہنشاہ مونٹی زوما نے اپنے دانش وروں سے مشورہ کیا...... اپنی مذہبی کتب پر نگاہ ڈالی...... اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ برس وہی برس تھا جس کے بارے میں جلاوطن ہونے والے دیوتا نے دھمکی دی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ دیوتا کی واپسی کے صحیح دن کی بھی پیشن گوئی کی جاسکتی تھی...... میکسیکو کے کیلنڈر کے مطابق یہ وہ دن تھا جو ہمارے کیلنڈ کے حساب سے 22 اپریل بنتا ہے۔ اس دن وہ دیوتا جو مشرق کی جانب جلاوطن ہوا تھا...... اس نے واپس آنا تھا۔ بے شک اس دیوتا نے اپنی تصاویر کی مانند ہونا تھا...... اونچا لمبا...... عجیب و غریب سفید چہرے کا حامل...... کالی داڑھی کا حامل...... سیاہ لباس میں ملبوس۔

22 اپریل 1519ء کو اسی حلیے کا حامل وسطی امریکہ کے ساحل پر اترا۔ کورٹس عام حالات میں سیاہ لباس زیب تن نہیں کرتا تھا...... لیکن یہ گڈ فرائی ڈے تھا...... اس کے ہمراہ 533 افراد تھے اور اس کے علاوہ گھوڑے اور توپیں بھی تھیں...... وہ گیارہ بحری جہازوں پر سوار ہو کر آئے تھے۔

مونٹی زوما دیوتا کی واپسی سے خوفزدہ تھا۔ کوئی شخص بھی یہ قیاس نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کس قسم کا بدلہ لے گا۔ میکسیکو کے لوگ اس دوران دیگر دیوتاؤں کی پرستش جاری رکھے ہوئے تھے۔ کوئٹزل کوٹل کی مزاحمت بیکار تھی...... اس کا مقابلہ کرنا فضول تھا۔

کوئٹزل کوٹل ساحل سمندر پر اتر چکا تھا اور شہنشاہ مونٹی زوما کے جاسوسوں نے اس حقیقت کی اطلاع بہم پہنچا دی تھی۔ اس خوفناک حقیقت سے باخبر ہونے کے بعد شہنشاہ نے ایک استقبالیہ کمیٹی ساحل سمندر کی جانب روانہ کی۔ اس کمیٹی میں ایک دیوہیکل مگر غمگین موٹا آدمی بھی شامل تھا

جس کے بارے میں کورٹس نے پہلے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ اس کمیٹی کا سربراہ ہو سکتا تھا۔

موٹا آدمی اس لئے غمگین تھا کہ کئی روز پیشتر سے اسے کھلا پلا کر اس لئے موٹا تازہ کیا جا رہا تھا کہ عین ممکن تھا کہ دیوتا کوئٹزل کوٹل اس کی قربانی قبول کرے۔ یہ حقیقت تھی کہ ایک موقع پر یہی دیوتا انسانی قربانی کے خلاف تھا لیکن یہ کافی عرصہ پرانی بات تھی اور عین ممکن تھا کہ اس نے اب اپنا ذہن تبدیل کر لیا ہو۔

کورٹس کو جب حقیقت کا علم ہوا تو اس نے اس تحفے کو مسترد کر دیا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ خوفزدہ بھی ہوا۔ اس کے اس عمل درآمد کی وجہ سے وہ موٹا آدمی اس کا بے دام غلام بن گیا۔ اس نے اس اجنبی باشندے کو پھل اور کھانے پینے کی دیگر اشیاء فراہم کیں۔

اور اب شہنشاہ کو پہلے سے بھی بڑھ کر یہ یقین ہو چکا تھا کہ آنے والا مہمان دیوتا کوئٹزل کوٹل کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ اب محض ایک ہی امید باقی تھی کہ دیوتا کے حضور قیمتی تحائف پیش کئے جائیں اور اسے راغب کیا جائے کہ وہ پہاڑیوں کے درمیان واقع طویل سڑک پر گامزن ہو جائے۔

کورٹس کو جب یہ پیغام موصول ہوا تو اس نے واضح مگر نرم لہجے میں اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ہر حال میں دارالخلافہ جانا چاہتا تھا اور عظیم شہنشاہ مونٹی زوما سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ درحقیقت اسے کچھ وقت درکار تھا تاکہ وہ ساحل پر اپنا ایک محفوظ اڈا قائم کر سکے...... اس نے اس جگہ کا نام ویرا کروز رکھا...... اور 15 اگست کو وہ دارالخلافہ کی جانب روانہ ہوا۔

اسے اور اس کے ساتھیوں کو تحائف سے نوازا گیا۔ ان تحائف میں بیس نوجوان لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ ان لڑکیوں میں ''ڈونا مارنیا'' نامی لڑکی بھی شامل تھی جو نہ صرف مایان زبان بخوبی بول سکتی تھی جو کہ اس کی ہسپانوی زبانوں میں سے ایک تھی بلکہ میکسیکو کی زبان بھی بخوبی بول سکتی تھی۔ لہٰذا اسے دوران سفر لوگوں کے ساتھ باہم روابط رہنے میں آسانی میسر آ گئی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر وہ ایک خونخوار قبیلے سے بالمقابل ہوا۔ اس قبیلے کا نام ٹلاکس کلان تھا اور یہ قبیلہ ایک غیر۔ میکسیکو قبیلہ تھا۔ اس قبیلے نے اس کے 400 افراد پر حملہ کر دیا (کچھ افراد وہ ساحل پر ہی چھوڑ آیا تھا۔) حملہ آوروں کی تعداد 6,000 تھی۔ بہتر حکمت عملی اپناتے ہوئے...... گھوڑوں کی خوفناک شکل وصورت کی بدولت...... ان حیوانوں کی بدولت جن کو وسطی امریکہ میں کبھی دیکھا نہیں گیا تھا...... اپنے ساتھیوں کے حلیوں کی وجہ سے کورٹس اس قبیلے کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے محض 14 ساتھی زخمی ہوئے اور ایک ساتھی ہلاک ہوا۔ مغرور ٹلاکس کلان قبیلے نے اطاعت قبول کر لی اور اس کے اتحادی بن گئے۔

شہنشاہ مونٹی زوما نے جب یہ خبر سنی تو وہ دہشت کے مارے کانپنے لگا۔ اس نے مزید قاصد روانہ کئے...... مزید سونا...... مزید ہیرے جواہرات اور عمدہ کاٹن روانہ کی۔ اس کے ساتھ اس نے یہ درخواست بھی کی کہ کورٹس کو جس چیز کی بھی ضرورت درپیش ہو گی وہ اسے فوری طور پر وہ چیز مہیا کرے گا لیکن دیوتا کو چاہئے کہ وہ جہاں سے آیا تھا وہیں پر واپس چلا جائے۔

لیکن کورٹس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ حملہ آوروں نے پیش قدمی جاری رکھی۔

چند روز بعد وہ جھیل تک جا پہنچے تھے۔ وہ پانچ میل لمبے تنگ رستے پر چل رہے تھے جو کہ اس جزیرے تک جاتا تھا جو جزیرہ میکسیکو کا دارالحکومت تھا۔ ابھی انہوں نے نصف راستہ ہی طے کیا تھا کہ ان کے علم میں یہ بات آئی کہ شہنشاہ بذات خود ان کے استقبال کے لئے آ رہا تھا۔ ایک میل کی مزید مسافت طے کرنے کے بعد کورٹس کی ملاقات شہنشاہ سے ہو گئی جو ان کے استقبال کے لئے آگے بڑھ رہا تھا...... حقیقی شہنشاہ اور نام نہاد

دیوتا کی ملاقات...... بادشاہ حسب معمول اپنی سواری پر سوار تھا لیکن اس نے جب کورٹس کو دیکھا تو حکم دیا کہ سواری روک دی جائے تاکہ وہ پیدل چلتے ہوئے دیوتا کا استقبال کرے۔ اس کے عملے نے حکم کی تعمیل کی اور اس کے پاؤں تلے قالین بچھا دی اور شہنشاہ کورٹس کی جانب بڑھ گیا۔ کورٹس نے بعد میں تحریر کیا تھا کہ:۔

"جوں ہی ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب پہنچے تو میں اپنی سواری سے نیچے اترا اور قریب تھا کہ شہنشاہ سے بغل گیر ہو جاتا لیکن اس کے عملے کے دو ارکان نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا تاکہ میں اسے چھو نہ سکوں"۔

یہ مہمان ایک دیوتا تھا...... حتیٰ کہ ایک دیوتا بھی میکسیکو کے شہنشاہ کو چھو نہیں سکتا تھا۔

دونوں افراد نے ایک دوسرے کو خوش آمدید کہا۔ ڈونا مارینا نے مترجم کے فرائض سرانجام دیئے۔

مہمانوں کے ساتھ انتہائی فیاضی کا برتاؤ کیا گیا۔ انہیں قیمتی تحائف سے نوازا گیا۔ ان کو اس قدر بڑے محل میں ٹھہرایا گیا کہ ہر ایک آدمی کے حصے علیحدہ علیحدہ کمرہ آیا۔

اس دوران یہ خبر بھی موصول ہوئی کہ کورٹس ساحل پر اپنے جو ساتھی چھوڑ آیا تھا اہل میکسیکو ان پر حملہ آور ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ خبر درست تھی لیکن یہ حملہ ایک غلطی کی بنا پر کیا گیا تھا اور شہنشاہ مونٹی زوما اس حملے سے بے خبر تھا۔ لیکن کورٹس چاہتا تھا کہ وہ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرے۔ اس نے ساحل پر حملہ آور ہونے والوں کے کرتا دھرتا کو بلا بھیجا اور شہر میکسیکو میں انہیں زندہ جلا دیا۔ شہنشاہ مونٹی زوما مجبور تھا کہ وہ یہ تماشا دیکھے۔ اس کے بعد کورٹس نے شہنشاہ سے کہا کہ وہ اپنا محل چھوڑ دے اور اس محل میں قیام کرے جہاں پر ہسپانوی قیام پذیر تھے۔ وہ اپنے ملازمین اور خادمین اپنے ہمراہ لا سکتا تھا لیکن اس کی حیثیت ایک قیدی جیسی تھی۔

شہنشاہ مونٹی زوما اور میکسیکو کی تمام تر قوم اس اقدام پر ناگواری کا اظہار کر رہی تھی لیکن سر تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اب حالات نے جلد از جلد کروٹ لینی شروع کر دی تھی...... کیوبا کے گورنر نے تادیبی کارروائی کرتے ہوئے کورٹس کو واپس لانے کے لئے ایک دستہ روانہ کیا تھا۔ لہٰذا کورٹس اس امر پر مجبور تھا کہ ساحل کی جانب روانہ ہو اور اس دستے کے عملے کو رشوت کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملانے پر مجبور کرے کیونکہ اب کثیر دولت اس کے رحم و کرم پر تھی۔ لیکن اس کارروائی کی سرانجام دہی بدولت کورٹس کو کئی ایک ہفتوں تک میکسیکو شہر سے باہر رہنا پڑا...... اور ان ہفتوں کے دوران حالات دن بہ دن بگڑتے چلے گئے۔ اس دوران کورٹس کے ساتھیوں اور میکسیکو کی سپاہ کے درمیان ایک معرکہ آرائی بھی ہوئی جو اپنے شہنشاہ کو قید سے نجات دلانا چاہتے تھے۔

کورٹس بروقت واپس پہنچ چکا تھا اور ایک مکمل جنگ میں حصہ لے سکتا تھا۔ شہنشاہ مونٹی زوما ہنوز اس کا قیدی تھا۔ کورٹس نے اسے محل کی کھڑکی میں نمودار ہونے اور محل کا محاصرہ سرانجام دینے والے افراد کو اس محاصرے سے باز رکھنے کی تلقین کرنے کو کہا۔ جونہی شہنشاہ کھڑکی سے جلوہ گر ہوا توں ہی خاموشی چھا گئی...... میکسیکو کے کچھ لوگوں نے رونا بھی شروع کر دیا۔

کسی جانب سے ایک پتھر پھینکا گیا۔ شہنشاہ مونٹی زوما نیچے جھک گیا وگرنہ اس کا زخمی ہونا لازم تھا۔

کورٹس نے فیصلہ کیا کہ وہ میکسیکو شہر سے پسپائی اختیار کر جائے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اسی تنگ سڑک سے گزرتے ہوئے واپسی کی

راہ اختیار کرے جس تنگ سڑک کے راستے وہ دارالحکومت میں داخل ہوا تھا۔ اہل میکسیکو اس کے اس ارادے کو بھانپ چکے تھے۔ لہٰذا انہوں نے پُل مسمار کر دیے۔

کورٹس کسی نہ کسی طرح دارالحکومت سے نکلنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس کے کچھ ساتھی بھی اس کے ہمراہ آنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اس کے جو ساتھی اس کے ہمراہ آنے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے ان تمام کے تمام افراد کو قربانی کی بھینٹ چڑھا دیا گیا تھا۔ ان کے زندہ جسموں سے ان کے دل نکال کر دیوتاؤں کے حضور پیش کیے گئے تھے۔ اگلے روز پانچ میل کی دوری پر کھڑا کورٹس ان کی دلخراش چیخیں بخوبی سن سکتا تھا۔

ہسپانویوں نے آہستہ آہستہ اور تکالیف برداشت کرتے ہوئے ساحل کی راہ لی...... انہوں نے ٹلاکس کلان قبیلے کی سرزمین سے گزرتے ہوئے ساحل کا رخ کیا۔ اور یہ ٹلاکس کلان قبیلہ ہی تھا جو ان کی مدد اور تعاون کو آن پہنچا تھا اور یہی وہ قبیلہ تھا جس نے میکسیکو کی فتح کو ممکن بنایا تھا۔ انہوں نے ہسپانویوں پر زور دیا کہ وہ جب تک چاہئیں ان کے ہاں قیام کر سکتے ہیں اور واپس جانے سے پیشتر میکسیکو کو ضرور فتح کریں...... ٹلاکس کلان قبیلے کی مدد سے اہل میکسیکو کو شکست سے دوچار کریں۔

کورٹس کو اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ درحقیقت وہ ایک بھی گولی چلائے بغیر پہلے ہی میکسیکو لے چکا تھا لیکن وہ اپنی حماقت کی بدولت اب اسے کھو چکا تھا۔ اب اسے ٹلاکس کلان قبیلے کی جانب سے امداد اور تعاون کی پیشکش ہوئی تھی اور اس دوران میکسیکو میں چیچک کی وبا پھوٹ پڑی اور اس بیماری نے میکسیکو کے دفاع پر مامور نصف سے زائد افراد کا صفایا کر دیا۔ اہل میکسیکو اس بیماری سے متعارف نہ تھے...... کورٹس کے ساتھی اس بیماری کو اپنے ہمراہ لائے تھے۔

قسمت کورٹس کی یاوری کر رہی تھی۔ احمق گورنر ویلاس کوئز نے کورٹس کو واپس لانے کیلئے جو دستہ روانہ کیا تھا اس دستے کو مزید کمک پہنچانے کیلئے وہ جہاز پر جہاز روانہ کر رہا تھا اور وہ دستہ پہلے ہی کورٹس کے ساتھ مل چکا تھا۔ لہٰذا ان جہازوں کے ذریعے آنے والے کمک اور فوجی ساز و سامان بھی کورٹس کے ہتھے چڑھ رہا تھا۔ لہٰذا کورٹس مکمل فوجی تیاری کے ساتھ حملہ آور ہو سکتا تھا اور اسے ٹلاکس کلان قبیلے سے لاکھوں اتحادی بھی میسر تھے۔

اگست 1521ء میں میکسیکو فتح ہو چکا تھا۔ کورٹس نے شاہ اسپین کی جانب سے اس علاقے کا کنٹرول سنبھال لیا تھا اور عیسائیت کو متعارف کروایا تھا۔ لوگوں کی نظروں میں کورٹس کوئٹزل کوٹل دیوتا تھا جو جلاوطن ہو گیا تھا اور اب اس نے میکسیکو کو فتح کر لیا تھا۔ لہٰذا وہ اس کا مذہب قبول کرنے سے کیسے انکار کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عیسائیت انتہائی برق رفتاری کے ساتھ اس علاقے میں پھیل گئی۔

اور آج بھی میکسیکو کے کچھ مضافاتی علاقوں میں ایسے کسان موجود ہیں جو مقدس تثلیث کے علاوہ دیوتا کوئٹزل کوٹل کی بھی پرستش کرتے ہیں۔

پزاروا ور اتاہلپا

جنوبی امریکہ کے براعظم کا شمالی۔مغربی ساحلی ملک بہت سے تضادات کا حامل ہے۔اس کے مختلف علاقوں کی آب وہوا بھی مختلف واقع ہوئی ہے۔

نشیبی علاقے بشمول ساحلی علاقے گرم علاقے ہیں۔ان علاقوں میں خوب بارش ہوتی ہے اور آب وہوا مرطوب ہے......نم آلود ہے۔ یہاں پر گھنے جنگلات میں موجود ہیں جن میں لاتعداد بندر،سانپ اور دیگر حشرات الارض پائے جاتے ہیں۔حتیٰ کہ آج کل بھی ساحل کے کئی علاقے غیر محفوظ تصور کیے جاتے ہیں لیکن 16 ویں صدی میں یہ علاقے بالخصوص اہل یورپ کیلئے موت کی وادی ثابت ہوتے تھے۔

1526ء کے اختتامی دورانیے کے دوران اہسپانوی سپاہیوں کی ایک جماعت تھکی ماندی اور قابل رحم حالت کا شکار یہاں پر پناہ گزین ہوئی تھی۔ہزاروں مچھروں نے ان پر ہلہ بول دیا۔ان میں سے بہت سے افراد بھوک کی وجہ سے اس قدر کمزور ہو چکے تھے کہ مچھروں کو مارنے سے قاصر تھے۔

بھوک کی شدت سے مجبور ہو کر کچھ سپاہی زہریلی بیڑیاں کھانے پر مجبور ہو کر لقمہ اجل بن گئے۔بقایا سپاہیوں نے گائے کے چمڑے کے ٹکڑے چباتے ہوئے گزارا کیا۔

یہ سپاہی ایک مہم جو فرانسسکو پزارو کی مہم جوئی کا ایک حصہ تھے۔فرانسسکو پزارو ایک ہسپانوی تھا۔وہ ایک غیر تعلیم یافتہ مہم جُو تھا۔اس نے کولمبس سے چند برس بعد نئی دنیا کا رُخ کیا تھا۔

نئی دنیا میں سالہا سال تک بطور ایک سپاہی خدمات سرانجام دینے کے بعد پزارو نے ایک پادری...... ہرناڈو ڈی لیوک اور ایک اور سپاہی ڈیگو ڈی المیگر و کے ساتھ شراکت داری قائم کی تھی۔انہوں نے یہ شراکت داری اس لئے استوار کی تھی کہ جنوبی امریکہ کے اس علاقے کی تحقیق وتفتیش سرانجام دے سکیں۔اس وقت ان تینوں افراد کی عمریں 50 برس سے تجاوز کر رہی تھیں۔

اس قسم کی مہم جوئی اس وقت سے پزارو کا ایک خواب تھی جب سے بالبو نے اسے یہ بتایا تھا کہ:۔

”جنوب کی جانب پہاڑوں کے اس پار ایک ایسا ملک واقع ہے جہاں پر سونے کی بہتات ہے اور اس ملک میں سونا اس قدر عام ہے جس قدر عام اسپین میں لوہا ہے۔“

نومبر 1524ء کو مہم جو پانامہ سے روانہ ہوئے اور ساحل کے ساتھ ساتھ سفر طے کرتے رہے۔وہ آہستہ آہستہ جنوب کی جانب بڑھ رہے تھے۔جب ان کے پاس خوراک کی کمی واقع ہو جاتی تب پزارو المیگر و کو واپس جزیروں کی جانب روانہ کر دیتا تھا اور وہ خوراک کے ذخیرے کے ہمراہ

واپس لوٹ آتا تھا۔ جہاز کبھی بھی واپس آنے میں ناکام نہ رہا تھا۔

ان کا چھوٹا سا جہاز دس روز تک طوفان کے رحم وکرم پر رہا تھا۔ خوراک کا ذخیرہ ختم ہونے کو تھا۔ ایک جماعت کو ساحل کی جانب روانہ کر دیا گیا تھا تاکہ وہ خوراک کا بندوبست سرانجام دے سکے۔ لیکن وہ جماعت محض تازہ پانی اور جلانے والی لکڑی کے ہمراہ واپس لوٹ آئی تھی۔

سپاہی آمادہ بغاوت دکھائی دیتے تھے۔ پزارو نے یہ فیصلہ کیا کہ نصف نفری کے ساتھ ایک جہاز جزیرہ پرلس روانہ کیا جائے تاکہ وہ تازہ خوراک کا بندوبست کر سکیں اور بقایا نصف نفری اسی مرطوب اور دلدلی سرزمین پر موجود رہے اور جیسے تیسے گزارہ کرے اور جہاز کی واپسی تک اس ملک کی جتنی بھی تحقیق وتفتیش سرانجام دے سکے اسے سرانجام دے۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے چلے گئے...... 20 افراد لقمہ اجل بن چکے تھے۔ بقایا افراد کو یہ یقین تھا کہ ان کے جو ساتھی خوراک کا بندوبست کرنے گئے تھے وہ انہیں چھوڑ کر جا چکے تھے۔ پزارو انہیں برابر یقین دہانیاں کرواتا رہتا تھا اور انہیں سونے کی عظیم دولت کی یاد دہانی بھی کرواتا رہتا تھا جو کہ جنوب میں بکھری پڑی تھی اور جلد ہی ان کے قبضے میں آنے والی تھی۔ ایک روز ایک سپاہی جنگل میں گھوم پھر کر واپس آیا تو اس نے یہ نوید سنائی کہ اس نے درختوں کے درمیان میں سے جھلکتی ہوئی آگ کی روشنی دیکھی تھی۔

پزارو نے فوری طور پر ان افراد کو اپنے ہمراہ لیا جو اپنے پاؤں پر چلنے کے قابل تھے اور متذکرہ مقام تک جا پہنچا۔ جنگل میں راستہ بناتے ہوئے وہ اچانک ایک کھلی جگہ تک جا پہنچے۔ یہ ایک انڈین گاؤں تھا۔

اچانک سفید فام افراد کو اپنے سامنے دیکھ کر وہاں کے باشندے خوف وہراس کا شکار ہوتے ہوئے جنگل میں غائب ہو گئے۔ ہسپانویوں نے ان کی خالی جھونپڑیوں کی جانب دوڑ لگا دی تھی اور کھانے پینے کی جو اشیاء بھی وہاں موجود تھیں ان پر یک دم ٹوٹ پڑے۔ دیہاتیوں نے جب یہ محسوس کیا کہ یہ لوگ ان کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے کا ارادہ نہ رکھتے تھے تب وہ بھی واپس لوٹ آئے۔

پزارو کے جسم میں کپکپی کی ایک لہر دوڑ گئی جب اس نے یہ دیکھا کہ ان دیہاتیوں نے خالص سونے کے زیورات پہن رکھے تھے۔ دیہاتیوں سے اشاروں کی مدد سے یہ دریافت کیا گیا کہ یہ سونا کہاں سے آیا تھا تو معلوم ہوا کہ یہ سونا اس ملک سے آیا تھا جو جنوب میں کافی زیادہ دوری پر واقع تھا۔

پزارو اور اس کے ساتھی واپس ساحل کی جانب چلے آئے۔ وہ اب ہشاش بشاش اور تر وتازہ تھے اور ان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ بالآخر ان کا وہ جہاز بھی واپس آ چکا تھا جس کو انہوں نے خوراک کے حصول کے لئے روانہ کیا تھا۔ یہ جماعت جہاز میں سوار ہو گئی اور اپنا رخ جنوب کی جانب موڑ لیا۔

پزارو نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ چند افراد کے ہمراہ راوڈی سان جان کا رخ کرے جبکہ جہاز کا کپتان بارتھولومی ریوز باقی افراد کے ہمراہ جنوب کا رخ کرے۔

چنانچہ ریوز عازم سفر ہوا۔ اس ویران سمندر کے عین وسط میں اس نے دور ایک جہاز رواں دواں دیکھا۔ اس کے قریب پہنچنے پر اسے معلوم ہوا کہ جسے وہ جہاز سمجھ رہا تھا وہ ایک کشتی تھی جو کہ درخت کے لاتعداد تنوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی اور ان کو رسوں کی مدد سے باندھا گیا تھا۔

اس کشتی کے قریب پہنچے پر ریوز نے دیکھا کہ اس کشتی پر دس انڈین سوار تھے۔ان میں کچھ خواتین بھی شامل تھیں۔اس کشتی میں ظروف ......یعنی مٹی کے برتن......اونی کپڑے......سونے کے پیالے اور سونے کے ناپ تول کے پیمانے اور ترازو وغیرہ لدے ہوئے تھے۔ یہ سامان ساحل کے ساتھ ساتھ تجارت سرانجام دینے کی غرض سے لے جایا جارہا تھا۔

ریوز کے علم میں یہ بات آئی کہ کشتی جس بندرگاہ سے روانہ ہوئی تھی وہ اس مقام سے زیادہ دور نہ تھی۔اس کا نام تمبس تھا۔انڈین کے بقول ان کا حکمران جاپانہ کا پاک تھا اور دارالخلافہ سُوزکو میں واقع اس کے محل میں سونا اور چاندی اس قدر عام تھا جس قدر عام لکڑی ہوتی ہے۔ریوز نے سان جوآن میں اپنے کمانڈر تک یہ اطلاع پہنچانے میں دیر نہ کی۔اس نے کئی ایک انڈین اپنے ہمراہ لئے ان میں ایک ایسا نوجوان میں شامل تھا جو ہسپانویوں کا پہلا ترجمان ثابت ہوا۔اس کا نام فلی پلو تھا۔

پزارو اور اس کے ساتھی ایک بدترین صورت حال کا شکار تھے جبکہ ریوز ان کے پاس جا پہنچا۔ان کے 14 افراد انڈین کے اچانک حملہ آور ہونے کی وجہ سے ہلاک ہو چکے تھے......بہت سے افراد بیماری کی لپیٹ میں تھے۔لیکن جہاز کے کپتان کی لائی ہوئی حیران کن خبر نے ان کو نئی تازگی بخشی۔انہوں نے جنوب کی جانب پیش قدمی کرنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہ کی۔وہ ایک انڈین قصبے میں جا پہنچے جسے انہوں نے ٹاکومز کا نام دیا۔ اس مقام پر 2000 سے زائد مکانات موجود تھے اور ان مکانات کے مکینوں نے اپنے مکانوں کو سونے اور قیمتی پتھروں سے سجا رکھا تھا۔

پزارو کے کچھ گھوڑ سوار لوٹ مار کے لئے تیار تھے لیکن دس ہزار جوانوں نے جنہوں نے کبھی گھوڑے نہ دیکھے تھے......وہ اس امر پر یقین رکھتے تھے کہ انسان اور گھوڑے دونوں ایک ہی چار ٹانگوں کی حامل مخلوق ہیں......تیروں اور پتھروں کی بوچھاڑ سے ہسپانویوں کا استقبال کیا۔ان کا حملہ اس قدر شدید اور زبردست تھا کہ گھوڑ سواروں کو یہ امر ناممکن نظر آتا تھا کہ وہ بحفاظت اپنے جہاز تک پہنچ پائیں گے۔لیکن اس دوران ایک سپاہی گھوڑے سے نیچے آن گرا۔یہ دیکھ کر انڈین ازحد حیران ہوئے۔وہ گھوڑے اور گھوڑ سوار کو ایک ہی مخلوق تصور کرتے تھے۔وہ حیران تھے کہ یہ سپاہی کس طرح گھوڑے سے علیحدہ ہو کر زمین پر آن گرا تھا۔وہ گھوڑے سے اس کی علیحدگی پر نہ صرف پریشان تھے بلکہ خوفزدہ بھی تھے۔لہٰذا انہوں نے راستہ چھوڑ دیا اور یہی وجہ تھی کہ اہسپانوی بحفاظت اپنے جہاز تک جا پہنچے تھے۔

اس مخالفانہ مظاہرے اور عددی برتری کے حامل انڈین کو دیکھتے ہوئے پزارو کی جماعت کے کچھ ارکان پانامہ واپس لوٹ جانے کے لئے پر تول رہے تھے۔لیکن پزارو جو ایک عظیم سلطنت کی دہلیز پر کھڑا تھا وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا اور فتح کے حصول کا خواہش مند تھا......ضرورت پڑنے پر وہ اکیلا ہی اپنے ارادے کی تکمیل کرنے کو تیار تھا۔محض 13 افراد جن میں ریوز بھی شامل تھا پزارو کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے تھے اور باقی ماندہ افراد واپس پانامہ کی جانب روانہ ہو گئے تھے۔لیکن انہوں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کے لئے کمک ضرور بھیجیں گے۔کپتان اور اس کے مٹھی بھر رضاکاروں نے ایک چھوٹے سے جزیرے پر پناہ حاصل کر لی اور انتظار کرنے لگے۔

آخرکار ایک جہاز پہنچ چکا تھا۔اس میں اشیائے خوردونوش تو موجود تھیں مگر فاضل لوگ موجود نہ تھے۔ یہ بے خوف اور دلیر چھوٹی سی جماعت اس جہاز پر سوار ہوئی......ان کے ہمراہ وہ انڈین بھی تھے جن کو ریوز نے کشتی سے گرفتار کیا تھا......اور جنوب کی جانب روانہ ہو گئے۔

بیس روز کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو ایک نشیبی ریتلے ساحل کے ساتھ محوسفر پایا۔اس ساحل کے قریب کاشتکاری کے کھیت بھی تھے۔ سینکڑوں لوگ ساحل کے قریب کھڑے جہاز کورواں دواں دیکھ رہے تھے۔فلی پلو......انڈین ترجمان نے بتایا کہ تمبس ایک دن سے بھی کم سفر پرواقع تھا۔جلد ہی پزارو کی پہلی نظر شہر کے سفید مکانات اوراونچی عمارات پر پڑی جوایک سرسبز میدان میں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔

پزارو نے ایک قاصد قصبے کے انڈین گورنر کے پاس روانہ کیا اوراسے رات کے کھانے کی دعوت پیش کی۔گورنر نے دعوت قبول کرلی اور تحفے کے طور پر اس نے اہسپانویوں کواشیاءخوردونوش کاذخیرہ اورلاتعدادلاما بھیجے۔یہ پہلا موقع تھا کہ کسی یورپی نے اس عجیب وغریب پہاڑی جانور کودیکھا تھا۔پزارو نے گورنر کوشراب پیش کی اور جب دونوں نے اکٹھی شراب نوشی کی تب پرازدو نے یہ اعلان کیا کہ:۔

''میں دنیا کے اس عظیم ترین حکمران کا ایک وفادار خادم ہوں جس کی قانونی حکومت اس ملک پر قائم ہے۔مزید یہ کہ یہ میرا ایک مشن ہے کہ آپ کوآپ کے ہم وطنوں کوعدم یقینی کی ان تاریکیوں سے نکال باہر کروں جس میں آپ سب اس وقت بھٹک رہے ہیں۔''

انڈین نے اس حیران کن بیان کا کوئی جواب نہ دیا۔لیکن اس نے رخصت ہونے کی اجازت طلب کی۔اگلے روز پزارو نے الونزوڈی مولینا کوایک سوراور چندمرغیوں کے ہمراہ روانہ کیا تا کہ وہ بطورتحفہ گورنر کوپیش کرے۔وہ ہسپانوی اس خبر کے ساتھ واپس لوٹا کہ گورنر کامحل سونے سے بھراپڑا تھا۔اس کے محل کچھ ایسی خوبصورت عورتیں بھی موجود تھیں جیسی خوبصورت عورتیں اس نے اس سے پیشتر کبھی نہ دیکھی تھیں۔

پزارو پیرو کی امارت کاسن کرخوشی سے دیوانہ ہوگیا۔لیکن اس نے چھاپہ مارنے کی جرأت نہ کی۔وہ کوئی خطرہ مول لینانہیں چاہتا تھا کیونکہ اس کے ہمراہ محض چندافراد تھے۔اس کی بجائے اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ساحل کے نشیب میں کچھ اور چھان بین کی جائے اور مابعد پانامہ واپس روانہ ہوا جائے۔تا کہ پانامہ جا کر وہ مہم جوؤں کا ایک اور قافلہ تیار کر سکے اور کافی تعداد میں سپاہ کا بھی بندوبست کر سکے اور حصول فتح میں کامیاب اور کامران ہوسکے۔

واپسی کے سفر کے دوران جہاز دوبارتمبس پہنچا۔جہاز کے عملے کے کافی ارکان وہاں کے حسن اورخوبصورتی کے دیوانے ہوگئے اورانہوں نے اسی مقام پرقیام پذیر ہونے اورسکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا تا کہ پزارو جب واپس آئے تواس کوایسے افراددستیاب ہوسکیں جومقامی زبان اوررسم ورواج سے واقف ہوں۔

1527ءمیں پزاروواپس پانامہ پہنچ چکا تھا۔وہ 18 ماہ تک پانامہ سے دوررہا تھا۔اسی اثنا میں پیرو کے فاتحین کاپیدا کردہ بگاڑ سامنے آنے لگا تھا......انکاس کی سرزمین۔

1527ءمیں انکاس پر پیرو کے ایک قبیلے کی حکومت تھی۔انکاس کا دارالخلافہ کوزکوتھا......ایک عظیم شہر......یہ ریاست چارچھوٹے صوبوں میں منقسم تھی جوحکمران کے نزدیکی رشتہ داروں کے زیرحکومت تھے۔

جب پزارو نے پہلی مرتبہ پیرو میں قدم رکھے تھے اس وقت 11 ویں شہزادے حایانہ کاپاک کی حکومت تھی۔جوں ہی حایانہ کی موت کالمحہ

قریب آیا تو اس نے یہ وصیت کی کہ سلطنت کا جنوبی حصہ اتاہلپا کے حوالے کر دیا جائے اور اس کے قانونی وارث حاسکار کو ملک کے باقی حصے کا حکمران تسلیم کر لیا جائے۔اس نے اپنے دانش وروں......امراء اور صوبائی حکمرانوں کو باہم اکٹھا کرتے ہوئے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:۔

''ہمارے باپ سورج نے مجھ پر یہ انکشاف کیا تھا کہ 12 انکاس کی حکمرانی کے بعد ہمارے ملک میں انجانے آدمیوں کی نسل ظہور پذیر ہوگی جو ہماری سلطنت کو محکوم بنالے گی۔ یہ نسل ان لوگوں کی ہو سکتی ہے جن کے قاصد ہمارے ساحلوں پر نمودار ہو چکے ہیں......لیکن تم یقین کرو کہ غیر ملکی اس سرزمین پر ضرور پہنچیں گے اور یہ پیشن گوئی پوری ہو کر رہے گی''۔

فرانسسکو پزارو کو کچھ علم نہ تھا کہ تمبس میں اس کی آمد نے ایسا اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ وہ جو کچھ جانتا تھا وہ یہ تھا کہ اپنے آپ کو پیرو کی سلطنت کا آقا تسلیم کروانے کا وقت آن پہنچا تھا۔لہٰذہ وہ اسپین کے بحری سفر پر روانہ ہو گیا تاکہ بادشاہ سے کچھ رقم اور اعزازات وصول کر سکے تاکہ وہ اپنی مہم جاری رکھ سکے۔اس نے بادشاہ کو اس امر پر راغب کیا کہ وہ ایک دستاویز پر اپنے دستخط ثبت کرے جس کی رُو سے وہ پیرو کا تاحیات گورنر اور کیپٹن جنرل قرار پائے۔لہٰذا ایک اسپانوی کرنل کا غیر قانونی بیٹا...... جو مرتے دم تک نہ لکھ سکتا تھا اور نہ ہی پڑھ سکتا تھا......اپنے لئے ایک سلطنت کے حصول میں کامیاب ہو گیا......ایک ایسی سلطنت جس پر اس نے بمشکل ہی کبھی قدم رکھے تھے اور اس سلطنت کی نوعیت سے وہ قطعاً لاعلم تھا۔

وہ امریکہ واپس لوٹ آیا اور 28 دسمبر 1530ء کو وہ تین بحری جہازوں...... 180 جوانوں اور 27 گھوڑوں کے ہمراہ پانامہ سے روانہ ہوا......ایک مرتبہ پھر وہ تمبس کی جانب گامزن تھا۔

شہر انکا پہنچنے کے بعد پزارو نے دو مکانوں کو اپنے تصرف میں لے لیا۔الونزو ڈی مولینا اور دیگر اہسپانوی جو اسی مقام پر قیام پذیر ہو چکے تھے وہ سپاہیوں کو ملنے کیلئے آن پہنچے۔ان کے پاس کچھ دلچسپ خبریں بھی تھیں۔جس سرزمین کو فتح کرنے کیلئے ہسپانوی منصوبے بنا رہے تھے وہ سرزمین خانہ جنگی کا شکار ہو چکی تھی۔دو بھائیوں کے درمیان حصول اقتدار کیلئے جنگ جاری تھی۔وہ آنجہانی حیانا کے بیٹے تھے۔

پزارو کے علم میں آیا کہ اتاہلپا اس لمحے جس کیمپ میں مقیم تھا وہ تمبس سے دس یا بارہ روز کی مسافت پر واقع تھا۔یہ جاننے کے بعد پزارو نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اس کے ساتھ ملاقات کا اہتمام کرے گا۔شاید اس کے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ اس قسم کی تدبیر کی بدولت اس کے ساتھی فاتح کورٹس نے میکسیکو فتح کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔بہرکیف یہ ایک جرأت مندانہ فیصلہ تھا۔محض دو صد افراد کی نفری کے ساتھ وہ ایک پوری قوم کو فتح کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

انکا بھائیوں کی افواج کے درمیان ایک زبردست جنگ لڑی گئی۔فتح اتاہلپا کے حصے میں آئی۔اس کے فوجی دستوں نے حاسکار کو گرفتار کر لیا تھا......اس کی فوج کو نیست و نابود کر دیا تھا اور اس کے کئی ایک رشتے داروں کو بھی ہلاک کر دیا تھا۔اس کے بعد اتاہلپا کاجامارکا کے قصبے میں جا پہنچا تھا جو کُوزکو سے کچھ دوری پر واقع تھا۔اس کی فتح کے لمحے کے دوران ہی اس کے آدمی یہ خبر لے کر آئے تھے سفید فام اجنبی واپس آ چکے تھے۔

اتاہلپا نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ کیا اسے ان اجنبیوں کے خلاف فوج کا استعمال کرنا چاہیے؟ لیکن اگر وہ دیوتا ہوئے تب کیا بنے گا؟ بہتر ہے کہ انتظار کیا جائے اور اس دوران ان سفید فاموں کی قوت اور ان کے ارادوں کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ معلوم ہو جائے گا۔

ساحلی میدان میں جاسوس روانہ کردیے گئے تھے۔ پزارو اور اس کے ساتھیوں کی ایک ایک حرکت پر کڑی نظر رکھی جارہی تھی اور ان کے بارے میں رپورٹ پیش کی جاتی تھی۔ اتاہلپا نے ایک وفد پزارو کے پاس روانہ کیا اور اس وفد کے ہمراہ سونے اور چاندی کے تحائف بھی روانہ گئے۔ یہ وفد ہسپانویوں کو اپنے آقا کی عظمت باور کروانا چاہتا تھا...... اس نے بہت سی فتوحات حاصل کر رکھی تھیں اور وہ ازحد طاقت ور حکمران تھا۔ سفید فام لیڈر ان باتوں سے متاثر نہ ہوا اور نہ ہی کسی بے چینی کا شکار ہوا۔ اس نے جواب دیا کہ اس کا آقا تمام تر دنیا کا حکمران تھا اور اس کے جرنیلوں نے اتاہلپا اور حاسکار سے بھی طاقتور بادشاہوں پر فتوحات حاصل کی تھیں۔ اس نے انکا کو دوستی یا جنگ دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنے کی پیشکش کی۔

اتاہلپا نے حملہ آوروں کی نگرانی جاری رکھی۔ دوسری جانب ہسپانویوں نے جن انڈین کو اپنا جاسوس بنا کر بھیجا تھا انہوں نے یہ اطلاع بہم پہنچائی کہ اتاہلپا شہر سے کچھ ہی دوری پر کیمپ نشین تھا اور اس کے اردگرد ایک مضبوط فوج بھی موجود تھی۔ پزارو اس قسم کی اطلاع پا کر خوف و ہراس کا شکار ہو گیا لیکن اس نے اپنے خوف و ہراس کو قطعاً ظاہر نہ ہونے دیا۔ اس نے کہا کہ:۔

"ہمارے پاس کوئی متبادل راستہ موجود نہیں ہے۔ ہمارے پاس محض واحد راستہ موجود ہے کہ ہم پیش قدمی کریں۔ تم میں سے ہر ایک فرد اپنا حوصلہ بلند رکھے اور ایک اچھے سپاہی کی طرح پیش قدمی کرے۔ آپ کی عددی کمی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی"۔

15 نومبر 1532ء کو پزارو کی مختصر فوج کا جامارکا کے میدان کی جانب پیش قدمی شروع کی۔ پزارو کے پاس دوصد افراد کی نفری موجود تھی جو شہر کی جانب پیش قدمی کر سکتی تھی۔

پزارو نے ڈی سوٹو کو حکم دیا کہ وہ بیس گھوڑ سواروں کے ہمراہ اتاہلپا کے کیمپ جائے اور اسے دعوت دے کہ وہ ہسپانویوں سے ملاقات کرے۔

ڈی سوٹو اتاہلپا کے کیمپ پہنچ چکا تھا۔ وہ تخت نشین تھا لیکن اس کی نگاہیں زمین پر مرکوز تھیں۔ اس نے نگاہ اٹھا کر ڈی سوٹو کی جانب بھی نہ دیکھا تھا۔ ڈی سوٹو نے اس کے قریب پہنچتے ہوئے اسے ہسپانوی کے پیغام سے مطلع کیا۔ اس نے خاموشی کے ساتھ پیغام سنا اور اس دوران بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ بالآخر اس نے جواب میں کہا کہ ہسپانویوں نے اس کے صوبوں کے سربراہوں کے ساتھ ناروا سلوک کیا تھا۔ ڈی سوٹو نے جواب دیا کہ عیسائی اپنے دوستوں کو امن و سلامتی کی پیشکش کرتے ہیں اور باغیوں کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔ یہ جواب سن کر انکا نے ہسپانویوں کو یہ دعوت دی کہ وہ اس کے ساتھ مل کر ایک نافرمان سردار کے خلاف جنگ لڑیں:۔

"محض دس عیسائی گھوڑ سوار اس کی سرکوبی کیلئے کافی ہوں گے"

اگلی صبح اتاہلپا کی جانب سے ایک وفد کا جامارکا آن پہنچا۔ اس نے یہ اطلاع بہم پہنچائی کہ اتاہلپا مسلح آدمیوں کی معیت میں پزارو سے ملاقات کرنے کیلئے تیار تھا۔ پزارو نے جواب دیا کہ انکا کا استقبال ایک دوست کی حیثیت سے کیا جائے گا۔ اس کی مرضی ہے کہ وہ مسلح ہو کر آئے یا غیر مسلح ہو کر آئے۔ نیک خواہشات کے اظہار کی خاطر اتاہلپا غیر مسلح آدمیوں کی معیت میں ملاقات کرنے پر رضامند ہو گیا۔

دوپہر کے وقت اہل پیرو آتے دکھائی دیے۔ انکا کے ہمراہ ہزاروں غیر مسلح افراد تھے۔

جب یہ جلوس شہر میں داخل ہوا اس وقت ایک بھی ہسپانوی سپاہی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ محض پزارو ہی انکا کے استقبال کا منتظر تھا۔ وہ ایک ٹیرس پر کھڑا تھا اور ایک بے سوٹ پادری اس کے ایک جانب کھڑا تھا۔ اس پادری کا نام فادر ولوردی تھا۔ پزارو نے پادری کو آگے بڑھایا۔ وہ ایک ہاتھ میں بائبل اور دوسرے ہاتھ میں صلیب پکڑے آگے بڑھا اور انکا تک جا پہنچا۔ اس نے انکا کو بتایا کہ وہ خدا کا ایک پادری تھا اور انکا کو یہ بتانے آیا تھا کہ اس مقدس کتاب میں کیا کچھ تحریر تھا۔ اتاہلپا نے پادری کے ہاتھ سے بائبل پکڑی اور اسے کھولنے لگا۔ لیکن اس دوران بائبل زمین پر گر گئی۔

پزارو نے چھپے ہوئے پیڈرو ڈی کینڈیا کو اشارہ دیا۔ ایک بندوق کی گرج سنائی دی۔ پیدل سپاہ بھی گھروں سے برآمد ہو چکی تھی۔ ملحقہ گلیوں سے گھوڑ سوار بھی برآمد ہو چکے تھے۔ قصبے سے باہر توپ خانہ بھی ان انڈین پر گولہ باری شروع کر چکا تھا جو شہر کو گھیرے ہوئے تھے۔ خوف زدہ انڈین نے شہر کے تنگ دروازوں سے بھاگ نکلنے کی کوشش کی لیکن ہسپانوی سپاہیوں کی تلواروں نے انہیں خون میں نہلا دیا۔

جلد ہی قتل و غارت کا کھیل ختم ہو چکا تھا۔ دو ہزار انڈین مارے جا چکے تھے جبکہ گھوڑ سوار ہزاروں انڈین کا پیچھا کر رہے تھے۔ پزارو اتاہلپا کو محل لے جا چکا تھا اور اس کے ساتھ بہتر سلوک کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس شب پزارو نے اپنے شہنشاہ کے حکم کے مطابق گورنر...... کیپٹن جنرل اور سپریم جج کا عہدہ سنبھال لیا۔

اتاہلپا کے ساتھ اس کے شایان شان سلوک روا رکھا گیا۔ پزارو تقریباً روزانہ اس سے ملاقات کرنے کی غرض سے آتا تھا۔ فلی پلو ترجمان کی وساطت سے وہ دونوں کئی ایک امور کے بارے میں بات چیت کرتے تھے۔ پزارو نے انکا کی تاریخ سے آشنائی حاصل کی...... ان کے قوانین سے آشنائی حاصل کی...... ان کے اداروں سے آشنائی حاصل کی۔ اتاہلپا اس امر سے باخبر تھا کہ ہسپانوی سونے کا حریص ہے۔ لہٰذا اتاہلپا نے پزارو سے کہا کہ اگرچہ اب وہ ایک قیدی تھا لیکن اس کے منہ سے نکلے ہوئے ایک حکم پر اس کی رعایا اس کی سلطنت کے تمام خزانے اس کے قدموں میں ڈھیر کر دے گی۔ بالآخر پزارو مان گیا کہ اگر انکا وہ کمرہ جس میں وہ قیام پذیر ہے سونے کے ساتھ بھر دے تو اسے آزاد کر دیا جائے گا۔

قاصد انکا کے پیغام کے ساتھ اس کی سلطنت کے دور دراز علاقوں تک جا پہنچے۔ جلد ہی سونے کے ڈھیر کا جامار کا پہنچنے لگے۔ یہ ڈھیر انڈین اپنے کندھوں پر لاد کر لاتے رہے اور کمرہ سونے سے بھرنا شروع ہو گیا۔

فادر ولوردی جو انکا کو مذہبی تعلیم دینے پر مامور کیا گیا تھا اس نے اتاہلپا سے دریافت کیا کہ کیا اس کا شاہی شاگرد عیسائی نہیں بنایا جائے گا اور آزاد کر دیا جائے گا کیونکہ اس کا تاوان ادا کیا جا چکا تھا۔ یہ سن کر اتاہلپا سکتے میں آ گیا۔ اگر وہ انکا کو آزاد کر دیتا تو عین ممکن تھا کہ وہ اپنے لوگوں کی رہنمائی سرانجام دیتے ہوئے حملہ آوروں کے خلاف بغاوت کر دیتا۔ ڈی سوٹو نے یہ مشورہ دیا کہ اتاہلپا کو اسپین کی عدالت کے حوالے کر دیا جائے۔ لیکن یہ مسئلہ فلی پلو...... ترجمان نے حل کر دیا۔ اس نے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے پزارو کو یہ بتایا کہ اتاہلپا خفیہ طور پر ایک سازش تیار کر رہا تھا...... آزادی کی ایک عظیم فوج تیار کر رہا تھا۔ اس نے مزید کہا کہ یہ فوج کوایٹو کے قریب اکٹھی ہو رہی تھی۔

پزارو کے ساتھی فوری کارروائی کا مطالبہ کرنے لگے۔ کچھ بادشاہ کو ہلاک کرنے کے حق میں تھے...... کچھ بادشاہ کو آزاد کرنے کے حق میں تھے۔ سازش کی خبر نے پزارو کے خطرات کو ہوا دی۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ڈی سوٹو کو بھیجا جائے اور وہ چھان بین کر کے بتائے کہ کیا واقعی آزادی کی

فوج کی تیاری کی خبر سچی تھی۔ اس دوران اس کے سیاسی مشیر انکا پر مقدمہ چلانے اور اسے سزا سنانے پر زور دے رہے تھے۔ پزارو اب بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس نے انصاف کی ایک عدالت قائم کر دی جو پادری ولوردی...... ایک وکیل اور چار گھوڑ سوار کپتانوں پر مشتمل تھی۔

انکا پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ یہ مقدمہ ایک قرارداد منظور کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا کیونکہ انکا کو عدالت میں پیش نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی اسے اپنے دفاع کا موقع فراہم کیا گیا تھا۔ سزا سنادی گئی تھی...... انکا کو زندہ جلانے کی سزا سنائی گئی تھی۔

پہلی مرتبہ اتاہلپا نے اپنی زندگی کے لئے وکالت کی۔ اس نے کہا کہ اگر اسے زندہ جلایا گیا تو اس کی رعایا اپنے خزانے چھپا لے گی اور فاتحین کو مزید سونا اور چاندی نہیں دے گی۔ لیکن پزارو عدالت کا فیصلہ بدل نہیں سکتا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتا تھا وہ یہ تھا کہ وہ انکا کو ایک سہل موت کی پیش کش کر سکتا تھا بشرطیکہ وہ عیسائیت قبول کرے۔

1533ء کے اگست کی ایک شام سورج غروب ہونے کے دو گھنٹے بعد ہسپانوی فوج ٹارچوں کی روشنی میں ایک وسیع میدان میں بادشاہ کی سزا پر عمل درآمد ہوتے دیکھنے کے لئے جمع تھی۔ بادشاہ کو میدان میں لایا گیا۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں میں زنجیریں پہنائی گئی تھیں۔ اس کو عیسائی بنا لیا گیا تھا۔

جوں ہی بادشاہ نمودار ہوا اس میدان میں جمع انڈین اس کے سامنے سجدے میں گر پڑے۔ وہ اپنے بادشاہ کو بچانے کے لئے میدان میں ہرگز نہ کودے کیونکہ وہ ایسی روحوں کے حامل نہ تھے جو ان کی اپنی تھیں۔ وہ محض اس کی موت کو قبول کر سکتے تھے اور اس کے ساتھ ہی اپنی قوم کی موت کو بھی قبول کر سکتے تھے۔ ایک ہسپانوی نے بگل بجایا۔ میدان پر مکمل سناٹا چھا گیا۔ انکا نے پزارو سے کہا کہ:۔

"میرے بچوں کی نگہداشت کرنا"۔

پادری نے اس کی روح کے لئے دعا کی اور انکا کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

اگلے روز ڈی سوٹو اپنے مشن سے واپس لوٹ آیا۔ وہ انکا کی موت کی خبر سن کر خوفزدہ ہو گیا اور کہنے لگا کہ:۔

"تمہیں ہماری واپسی تک تو انتظار کر لینا چاہئے تھا"

اس نے پزارو کو مزید بتایا کہ:۔

"ملک بھر میں بغاوت کے آثار کہیں بھی نظر نہیں آتے ہم جہاں بھی گئے ہمارے ساتھ دوستانہ برتاؤ کیا گیا اور ہماری خاطر تواضع کی گئی"۔

تاریخ دان پریس کاٹ نے بالکل درست تحریر کیا تھا کہ:۔

"اتاہلپا کے ساتھ روا رکھا گیا سلوک...... اول تا آخر...... ہسپانوی نوآبادیاتی تاریخ کا ایک سیاہ ترین باب ہے"۔

پہلی مرتبہ جنوبی امریکہ کے اس پار

دریائے امازن دنیا کا بہت بڑا دریا ہے...... یہ حجم میں بڑا ہے نہ کہ لمبائی میں بڑا ہے۔ یہ دریا بحراوقیانوس میں گرنے سے بیشتر 3900 میل پیرو اور برازیل میں بہتا ہے۔

فرانسسکو اوری لانا اس دریا میں جہاز رانی کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ وہ فرانسس پزارو کا رشتے دار تھا جس نے پیرو فتح کیا تھا۔ اس نے کئی ایک مہمات میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ 1540ء میں گونزالو پزارو صوبہ کوائیٹو کا گورنر بنا۔ اسے اسپین سے یہ احکامات موصول ہوئے کہ افسانوی ایل ڈوراڈو اور دار چینی کی سرزمین کی تحقیق و تفتیش سرانجام دے۔ اوری لانا نے یہ پیشکش کی کہ وہ بھی اس کے ہمراہ جائے گا۔ انہوں نے اپنی مہم کا آغاز 200 ہسپانیوں...... 400 متاثر کن پیرو کے انڈین...... گھوڑوں اور ہزاروں کتوں کے ساتھ کیا۔ اس مہم کے شرکاء نے دریائے ناپو کے ساتھ ساتھ مشرق کی جانب ابھی تقریباً پچاس لیگ کا سفر طے کیا تھا جبکہ انہیں دار چینی کے کچھ درخت دکھائی دیے۔

پزارو نے سوچا کہ یہ درخت چونکہ تعداد میں قلیل تھے لہٰذا یہ اتنی وافر مقدار میں دار چینی مہیا نہیں کر سکتے تھے جن سے اس کی قسمت کا ستارہ چمک سکے۔ لہٰذا اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنی تلاش مزید جاری رکھے گا۔ اس نے کچھ انڈین سے یہ دریافت کیا کہ کیا پہاڑوں سے آگے کی سرزمین زرخیز تھی اور گھوڑوں کیلئے موزوں تھی۔ وہ لوگ اس بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ پزارو نے سوچا کہ یہ لوگ ضدی اور ہٹ دھرم واقع ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کچھ نہیں بتا رہے تھے۔ لہٰذا اس نے کچھ انڈین کو اپنے کتوں کے سامنے ڈال دیا جنہوں نے ان کے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور دیگر انڈین کو زندہ جلا دیا۔ لیکن اس کے باوجود بھی زندہ بچ جانے والے انڈین نے اسے کچھ نہ بتایا۔ لہٰذا وہ آگے کی جانب بڑھ گیا۔

اس کے بعد ایک بڑے دریا کے قریب انہیں انڈین کا ایک اور گروہ دکھائی دیا۔ پزارو نے ان کے سردار سے کچھ سوال کیے۔ اس سردار کا نام ڈیلی کولا تھا۔ عین ممکن تھا کہ ڈیلی کولا کو ان انڈین کے بارے میں اطلاع موصول ہو چکی تھی جن کو کتوں کے سامنے ڈالا گیا تھا یا زندہ جلایا گیا تھا۔ بہر کیف اس نے زرخیز زمینوں کی حقیقی نشاندہی کی اور مشرق کی جانب آبادی کے بارے میں بھی بتایا۔ پزارو نے ڈیلی کولا کو یہ انعام دیا کہ اسے اپنا غلام بنا لیا اور مہم جوئی کے اس قافلے کی رہنمائی کے فرائض سونپ دیے۔ یہ بڑی جماعت اندرون علاقہ کی جانب محوِ سفر ہوئی۔ چونکہ بہت سے لوگ کھانے والے تھے لہٰذا جلد ہی ان کا راشن جواب دے گیا۔

جاسوسی سرانجام دینے والی جماعتوں نے یہ رپورٹ پیش کی کہ انہوں نے ایک بڑا دریا دریافت کیا ہے جس کے کناروں میں لباسوں میں ملبوس مہذب انڈین آباد ہیں۔ پزارو فوری طور پر اس دریا کی جانب چل دیا۔ لیکن انڈین دیگر قبائل کے ساتھ اس کے ناروا سلوک روا رکھنے کے بارے میں سن چکے تھے لہٰذا وہ وہاں سے فرار ہو چکے تھے۔ ہسپانوی اس گاؤں سے جو کچھ حاصل کر سکے وہ چند چھوٹی کشتیاں تھیں۔

ہسپانوی کو ایٹو سے جو انڈین غلام اپنے ہمراہ لائے تھے وہ سب کے سب موت سے ہمکنار ہو چکے تھے اور ان کی اموات کی بدولت ہسپانویوں کے لئے ایک مصیبت کھڑی ہو چکی تھی۔ ان کو آب وہوا راس نہ آئی تھی لہٰذا وہ موت سے ہمکنار ہو گئے تھے۔

انہیں مزید غلام دستیاب نہ تھے لہٰذا پزارو نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک بڑی کشتی بنائی جائے جس میں اشیائے خوردونوش کو محفوظ رکھا جا سکے۔ جب کشتی کی تیاری مکمل ہو چکی تب اس جماعت نے دریا میں 43 مرتبہ کاوش سرانجام دی۔ دریا کے کنارے پر موجود گھوڑے اشیائے خوردونوش کی حامل کشتی اور دیگر چھوٹی کشتیوں کے ہمراہ دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ اب ان کے پاس اس خوراک کا آخری ذرہ تک ختم ہو چکا تھا جو وہ کوایٹو سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ وہ سب کچھ کھا چکے تھے۔

اوری لانا نے یہ تجویز پیش کی کہ وہ بڑی کشتی کے علاوہ چھوٹی کشتیوں اور 60 آدمیوں کو اپنے ہمراہ لے جاتے ہوئے خوراک کے حصول کے لئے نکل جائے۔ پزارو نے اس تجویز سے اتفاق کیا لیکن یہ پابندی بھی عائد کر دی کہ اوری لانا کو خوراک دستیاب ہو یا نہ دستیاب ہو اس کو بارہ دنوں کے اندر اندر ہر صورت میں واپس آنا ہوگا۔

اس کے بعد جو کچھ بھی وقوع پذیر ہوا وہ واضح نہیں ہے۔ البتہ پزارو نے بادشاہ کو جو خط تحریر کیا اس میں اس نے اوری لانا پر یہ الزام عائد کیا کہ وہ جان بوجھ کر کشتیاں اپنے ہمراہ لے گیا تھا اور باقی جماعت کو قسمت کے رحم وکرم پر چھوڑ گیا تھا۔ لیکن راہب گاسپرڈی کارواجل جو اوری لانا کی جماعت کا ایک رکن تھا وہ ایک مختلف داستان سناتا ہے۔ اس کے بقول اوری لانا کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ متذکرہ بارہ دنوں کے اندر اندر واپس آئے کیونکہ اس میں کچھ تو موسم کا عمل دخل تھا اور دوسری بات یہ تھی کہ وہ خوراک کی تلاش میں بہت دور نکل گئے تھے اور اس دوران اوری لانا نے یہ خیال کیا کہ پزارو واپس جا چکا ہوگا۔

اس راہب نے اس روئیداد پر ایک مکمل کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب میں اس نے دریا کا ذکر "اوری لانا" کے نام سے کیا تھا۔ ہم مناسب جگہ پر اظہار خیال کریں گے کہ اس دریا کو دریائے امازن کے نام سے کیوں پکارا جانے لگا تھا۔

راہب نے مزید لکھا تھا کہ پزارو سے رخصت ہونے کے بعد اوری لانا نے 200 لیگ (تقریباً 750 میل) کا سفر طے کیا لیکن اسے کہیں بھی آبادی کے آثار دکھائی نہ دیے اور یہ جماعت بھی فاقہ کشی کا شکار ہوگئی۔

واپس پلٹنا وہ بھی تند وتیز لہروں کو چیرتے ہوئے اور ایک مرتبہ پھر بنجر علاقے کو عبور کرنا ایک فضول امر تھا۔ اب محض ایک ہی امید باقی رہ گئی تھی کہ دریا ان کو بہاتا ہوا کسی ایسے ملک میں لے جائے جہاں پر انہیں اشیائے خوردونوش دستیاب ہو سکیں۔

8 جنوری 1542ء کی شام انہوں نے ڈھول بجنے کی ہلکی سی آواز سنی۔ اگلی صبح چار کشتیاں جو انڈین سے بھری ہوئی تھیں ان کی جانب بڑھتی دکھائی دیں:۔

"جب انہوں نے ہمیں دیکھا تب انہوں نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ انہوں نے کچھ ایسا اشارہ دیا کہ چوتھائی گھنٹے سے بھی کم وقت کے بعد ہم نے مختلف دیہاتوں سے ڈھول پیٹنے کی آوازیں سنیں۔ وہ لوگوں کو مسلح ہونے کے لئے کہہ رہے تھے۔

کپتان نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ پوری رفتار سے کشتی کو چلائیں تا کہ ہم انڈین کے باہم اکٹھا ہونے سے بیشتر گاؤں میں پہنچ جائیں"۔

ہم گاؤں پہنچ چکے تھے۔ ہسپانوی اپنی کشتیوں سے باہر نکلے۔ وہ لڑائی کے لئے تیار تھے لیکن انڈین نے راہ فرار اختیار کر لی اور گاؤں ویران ہو گیا۔ ہسپانویوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہیں گاؤں میں کافی مقدار میں اشیائے خوردونوش ہاتھ لگیں۔ انہوں نے پیٹ بھر کر کھایا پیا۔ دوپہر تک وہ کھا پی کر فارغ ہو چکے تھے اور آرام بھی کر چکے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ انڈین دریا پر کھڑے انہیں دیکھ رہے تھے۔

"......ان کی موجودگی کا مشاہدہ کپتان نے کیا تھا۔ وہ دریا کے کنارے جا پہنچا اور ان کی زبان میں (کسی حد تک وہ ان کی زبان سمجھ سکتا تھا) ان کے ساتھ گفتگو کرنے لگا اور انہیں بتانے لگا کہ انہیں گھبرانے یا فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں...... لہٰذا دو انڈین کپتان کے قریب چلے آئے۔ کپتان نے ان کے خوف و ہراس کو دور کیا اور انہیں کچھ کھانے پینے کے لیے دیا۔"

انڈین کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار ہو چکے تھے بلکہ اس پورے قبیلے کے ساتھ دوستانہ روابط استوار ہو چکے تھے۔ انہوں نے ہسپانویوں کو خوراک مہیا کرنی شروع کر دی جس میں دیگر اشیائے خوردونوش کے علاوہ گوشت اور کئی اقسام کی مچھلیاں بھی شامل تھیں۔ اوری لانا نے یہ محسوس کیا کہ ان کی بقا پزارو کے وحشی پن کی مرہون منت نہ تھی بلکہ انڈین کے ساتھ اچھے تعلقات کی مرہون منت تھی۔ لہٰذا وہ ان کے دل جیتنے میں مصروف رہا۔ اس نے اپنے لوگوں کو سختی کے ساتھ منع کر دیا کہ وہ انڈین کی کسی چیز پر قبضہ نہ کریں اور نہ ہی اس سونے اور زیورات کی طرف حریصانہ نظروں سے دیکھیں جو انہوں نے پہن رکھے تھے۔

وہ اس دوستانہ فضا کے حامل گاؤں میں بیس روز تک قیام پذیر رہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی کشتی خوراک سے بھری۔ جس قدر خوراک کشتی میں سما سکتی تھی انہوں نے ذخیرہ کر لی۔ اس کے بعد ایک مرتبہ پھر یہ جماعت عازم بحری سفر ہوئی۔

ایک مرتبہ پھر 200 لیگ کا سفر بنجر علاقے سے گزرتے ہوئے طے کیا گیا اور دوبارہ اس جماعت کے لوگ فاقہ کشی کا شکار ہو گئے۔ سات افراد بھوک کی تاب نہ لاتے ہوئے موت سے ہمکنار ہو گئے۔ اس کے بعد غیبی مدد آن پہنچی۔ بقول راہب انڈین چار یا پانچ کشتیوں کے ہمراہ دریا میں نمودار ہوئے جو خوراک سے لادی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اپنے سردار اپاریا کے گاؤں تک ہسپانیوں کی رہنمائی بھی سرانجام دی۔ سردار نے انتہائی مہربانی اور محبت کے ساتھ ہسپانویوں کا خیر مقدم کیا اور انہیں خوش آمدید کہا۔

چونکہ انڈین دوستانہ رویے کے حامل تھے لہٰذا اوری لانا نے بادشاہ کے نام پر اس علاقے کا قبضہ حاصل کر لیا۔ اس قبضے کی یادگار کے طور پر اس نے حکم دیا کہ:۔

"ایک بڑی صلیب اس علاقے میں نصب کی جائے...... انڈین نے اس صلیب کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔"

"......جب کپتان کو آسودگی میسر آئی اور اس علاقے کے وسائل میسر آئے۔ اس کے علاوہ انڈین کا دوستانہ رویہ میسر آیا...... اس نے اپنے تمام ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ سب باہم اکٹھے ہوں اور ان کو بتایا کہ چونکہ اس علاقے میں نہ صرف وسائل میسر

تھے بلکہ انڈین کا دوستانہ رویہ بھی میسر تھا لہٰذا انہیں ایک اور بڑی کشتی تیار کرنی چاہیے۔ لہٰذا کشتی کی تیاری کا کام شروع ہو گیا
......35 دنوں کے بعد کشتی نہ صرف تیار ہو گئی بلکہ دریا میں بھی اتار دی گئی''

لیکن جب انڈین کو یہ خبر ہوئی کہ اسپانوی یہاں سے دریا کی نچلی جانب جانے کا ارادہ رکھتے تھے تب وہ از حد حیران ہوئے اور اوری لانا کو خبردار کرتے ہوئے کہنے لگے کہ:۔

انہوں نے کپتان کو بتایا کہ اگر ہم ''گرینڈ مسٹرس'' سے ملنے جا رہے تھے تو ہمیں خبردار رہنا چاہئے کہ ہم کیا کرنے جا رہے تھے...... کیونکہ ہم تعداد میں کم تھے اور وہ تعداد میں زیادہ تھے......اور یہ کہ وہ ہمیں ہلاک کر دیں گے''۔

ہسپانوی ''گرینڈ مسٹرس'' نامی اس قبیلے کے بارے میں مزید جاننا چاہتے تھے۔ لیکن وہ اس قبیلے کے بارے میں انڈین سے جو کچھ معلوم کر سکے وہ یہ تھا کہ مسٹرس بہت غضب ناک تھے اور اگر ان کو موقع میسر آیا تو وہ ہسپانویوں کو ہلاک کر دیں گے۔

ان کی نئی کشتی تیار ہو چکی تھی...... پرانی کشتیاں مرمت ہو چکی تھیں اور خوراک بھی کشتیوں پر لادی جا چکی تھی۔ لہٰذا یہ جماعت ایک مرتبہ پھر عازم سفر ہوئی۔ 12 مئی کو وہ ماچھی پارو جا پہنچے۔

''ابھی ہم نے دو لیگ کا فاصلہ طے کیا تھا کہ ہمیں دیہات دکھائی دینے لگے۔ ابھی ہم زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ ہم نے کئی ایک کشتیاں اپنی طرف بڑھتی ہوئی دیکھیں۔ ان کشتیوں میں لڑائی کا ساز و سامان موجود تھا۔ وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ ہماری جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ ڈھول پیٹ رہے تھے اور ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے وہ ہمیں صفحۂ ہستی سے مٹانے کا عزم کیے ہوئے ہوں''

اوری لانا نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ تیار رہیں۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو یہ حکم بھی دیا کہ جب تک انڈین قریب نہ آن پہنچیں اس وقت تک ان کو نشانہ نہ بنایا جائے۔ اوری لانا کے ساتھیوں کے تیر نشانے پر گر رہے تھے اور انڈین اپنے جانی نقصان کے باوجود بھی جوابی حملے کر رہے تھے۔

کشتیاں ساحل پر پہنچ چکی تھیں اور ساحل پر گھمسان کی جنگ ہوئی۔ آدھے ہسپانوی دریا میں ہی مقیم رہے تاکہ انڈین کو دست بدست لڑائی میں الجھائے رکھیں جبکہ باقی اسپانوی ساحل پر برسرپیکار رہے۔ ہسپانوی تھک ہار چکے تھے اور وہ سوچ رہے تھے کہ تھکاوٹ کی وجہ سے وہ مات کھا جائیں گے کہ اس دوران انڈین نے راہ فرار اختیار کر لی۔

اوری لانا اور اس کے 25 ساتھیوں نے انڈین کے گاؤں کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ وہ خوراک تلاش کر رہے تھے۔ انہیں کافی مقدار میں گوشت۔ مچھلی اور روٹی دستیاب ہوئی۔ جس دوران وہ خوراک اکٹھی کر رہے تھے اس دوران انہیں اپنی کشتیوں سے شور شرابے کی آواز سنائی دی...... دراصل انہیں خبردار کیا جا رہا تھا کہ 2,000 کے قریب انڈین دوبارہ حملہ آور ہونے کے لئے آ رہے تھے۔

خوراک اور زخمیوں کو انتہائی دقت کے ساتھ کشتیوں پر سوار کیا گیا اور کشتیاں عازم سفر ہوئیں۔ جونہی وہ دریا کی نچلی جانب پہنچے انڈین ان

موصول ہو چکی تھی لہٰذا وہ ان پر ہنسنے لگے اور انہیں اپنے مذاق کا نشانہ بنانے لگے۔ انہوں نے ہسپانویوں کو بتایا کہ وہ اپنا سفر جاری رکھیں اور کچھ ہی دور مزید انڈین انہیں گرفتار کرنے اور امازن لے جانے کیلئے تیار بیٹھے تھے۔

اوری لانا نے انڈین کی خرافات کی پرواہ نہ کی اور خشکی پر اترنے کا فیصلہ کر لیا۔ کارواجل اس لڑائی کا مکمل نقشہ کھینچتا ہے:۔

''قریب تھا کہ ہم سب صفحۂ ہستی سے مٹ جاتے کیونکہ بہت زیادہ تیر ہماری جانب بڑھ رہے تھے۔ ہمارے ساتھی پانی میں کود گئے۔ یہ پانی ان کے سینے تک تھا۔ انڈین ہمارے ہسپانویوں کے مابین باہم مل گئے تھے۔ یہ لڑائی ایک گھنٹے سے زائد دورانیے تک جاری رہی لیکن انڈین نے حوصلہ نہ ہارا بلکہ یہ دکھائی دے رہا تھا کہ ان کے حوصلہ میں دوگنا اضافہ ہو چکا تھا۔ اگرچہ انہوں نے اپنے بہت سے ساتھیوں کو ہلاک ہوتے بھی دیکھا تھا لیکن انہوں نے پسپائی اختیار کرنے کے بارے میں سوچا تک نہ تھا۔

''وہ امازن کے باجگزار تھے اور رعایا تھے اور ان کو ہماری آمد کی اطلاع پہنچ چکی تھی...... وہ ان کے پاس مدد حاصل کرنے کے لئے گئے تھے۔

''ہم نے ان خواتین کو بذات خود اپنی آنکھوں سے ان انڈین کے شانہ بشانہ لڑتے دیکھا اور یہ خواتین اس جرأت اور بہادری کے ساتھ لڑیں کہ انڈین نے میدان چھوڑ کر بھاگنے کی جرأت نہ کی۔ اگر کسی انڈین نے میدان چھوڑ کر بھاگنے کی کوشش کی تو انہوں نے اسے ہماری آنکھوں کے سامنے موقع پر ہی ہلاک کر دیا۔

''یہ خواتین سفید رنگت کی حامل تھیں اور لمبے قد کی مالک تھیں۔ ان کے بال خوب دراز تھے۔ وہ تقریباً برہنہ تھیں۔ انہوں نے محض اپنے مخصوص اعضا چھپا رکھے تھے...... ان کے ہاتھوں میں تیر اور کمان تھی...... وہ ایک ایک خاتون دس مردوں پر بھاری دکھائی دیتی تھی۔''

یہ پہلی شہادت تھی جو کارواجل یا کسی دوسرے ہسپانوی نے دریائے اوری لانا کے ساتھ خواتین کے قبیلے کے بارے میں پیش کی۔ ان ''امازن'' کی کہانیاں اہل یورپ پر کچھ اس انداز میں اثر انداز ہوئیں کہ اوری لانا کی کامیابیاں خواتین کے اس قبیلے کے رومانوی تصور تلے دب کر رہ گئیں جو ایک ایسی سلطنت پر حکمرانی کر رہی تھیں جہاں پر مردوں کو غلاموں سے بڑھ کر حیثیت حاصل نہ تھی۔ لہٰذا اس عظیم دریا کا نام ہسپانوی کپتان کے راہب نے اہسپانوی کپتان کے نام پر رکھا...... دریائے امازن۔

امازن کی اس سرزمین کے بارے میں راہب کارواجل نے جو معلومات فراہم کی تھیں وہ معلومات انڈین قیدیوں سے حاصل کی گئی تھیں اور یہ انڈین قیدی...... نقادوں نے مابعد یہ انکشاف کیا...... یہ محسوس کرتے تھے کہ اہسپانوی خوبصورت داستانوں کو سننے کا مشتاق تھا...... یہ داستانیں سونے اور خواتین کے بارے میں تھیں۔ لہٰذا انہوں نے اپنی داستانیں اسی نکتہ نظر کے تحت تخلیق کیں اور اسے سنا ڈالیں درج ذیل میں کچھ تفصیل بیان کی جا رہی ہے جو راہب کارواجل نے پیش کی تھی۔

پر حملہ آور ہوئے اور وہ ان کے ساتھ بر سر پیکار ہو گئے۔

انڈین تمام رات ان کا پیچھا کرتے رہے۔ جب صبح ہوئی تب ہسپانویوں نے اپنے آپ کو ایک نئی آبادی کے وسط میں پایا۔ اس آبادی سے نئے انڈین برآمد ہوئے اور پرانے انڈین کی جگہ سنبھال لی۔

''انہوں نے تین مرتبہ ہم پر حملہ کیا اور ہمیں مصیبت میں مبتلا کئے رکھا''

بالآخر تعاقب کرنے والے پیچھے رہ گئے اور ہسپانویوں کو تین روز تک کسی حملے کا سامنا نہ کرنا پڑا اور انہوں نے خوب آرام کیا اور اپنی تھکن اتاری۔ دوران سفر وہ کئی ایک آبادیوں سے گزرے جو بڑی بڑی آبادیاں تھیں۔ اس کے علاوہ وہ خوبصورت وادیاں ہونے کے ساتھ ساتھ زرخیز اور ثمر آور وادیاں بھی تھیں۔ ایک شام بالائی کنارے پر واقع ایک گاؤں تک جا پہنچے:۔

''......جوں ہی یہ گاؤں سامنے آیا کپتان نے ہمیں حکم دیا کہ اس پر قبضہ کر لیں۔ یہ گاؤں اس قدر خوبصورت تھا کہ ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے یہ اس سرزمین کے سرداروں کا تفریحی مقام ہو......انڈین نے ایک گھنٹے سے زائد عرصے تک اپنی مزاحمت جاری رکھی اور گاؤں کا دفاع کرتے رہے لیکن بالآخر شکست ان کا مقدر بنی اور ہم اس گاؤں کے مالک بن چکے تھے۔ یہاں پر ہمیں کثیر تعداد میں خوراک بھی میسر آئی۔''

''اس گاؤں میں ایک مضافاتی مکان ایسا بھی تھا جہاں پر مختلف اقسام کے ظروف رکھے تھے۔ ان میں مرتبان......پانی کے گھڑے بھی شامل تھے جو بہت بڑے بڑے تھے......اور دیگر برتن بھی موجود تھے مثلاً پلیٹیں......پیالے وغیرہ۔ وغیرہ۔ ان پر رنگ و روغن کیا گیا تھا اور یہ اس قدر چمکدار تھے کہ ان کو دیکھ کر وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔''

اس گاؤں سے باہر جانے کے لئے کئی ایک بہترین سڑکیں بھی موجود تھیں۔ اوری لانا کی خواہش تھی کہ وہ یہ معلوم کرے کہ یہ سڑکیں کس مقام کی جانب جاتی تھیں...... چند میل کا سفر سرانجام دینے کے بعد سڑکیں زیادہ چوڑائی کی حامل ہو گئی تھیں اور شاہی شاہراہ کا روپ اختیار کر گئی تھیں......اس نے فیصلہ کیا کہ یہی بہتر ہو گا کہ واپس پلٹا جائے اور ایک مرتبہ پھر پانی میں اپنا سفر جاری رکھا جائے۔

دوران سفر انہیں ہمیشہ خوشگوار مناظر سے واسطہ پڑا تھا۔ ایک مرتبہ وہ ایک ایسے دیہات سے گزرے جہاں پر سات پھانسی گھر تھے اور ان میں لاشیں لٹک رہی تھیں۔

ہسپانوی ایک پرامن اور پرسکون جگہ کی تلاش میں مصروف تھے تاکہ سینٹ جان کا تہوار منا سکیں۔ اچانک وہ ایک بہترین سرزمین تک جا پہنچے تھے۔

دریا کی نچلی جانب سفر طے کرتے ہوئے ہسپانوی خواتین کے قبیلے کے بارے میں داستانیں سنتے چلے آئے تھے۔ اس قبیلے کی اجارہ داری ایک وسیع رقبے پر قائم تھی اور اس کی رعایا میں کئی اور قبیلے بھی شامل تھے۔ اب ان داستانوں کی تصدیق ہو رہی تھی۔ بہت سے انڈین ان سے ملاقات کرنے کی غرض سے آن پہنچے تھے۔ اوری لانا نے ان سے بات چیت کرنے کی کوشش کی۔ چونکہ ان لوگوں کو ہسپانویوں کی آمد کی خبر پہلے ہی

امازن ملک کے اندرونی حصوں میں آباد تھے۔ یہ علاقہ ساحل سے سات دن کی مسافت پر واقع تھا۔ وہ ایسے دیہاتوں میں رہائش پذیر تھے جو پتھروں سے بنائے گئے تھے۔ یہ دیہات بہتر تعمیر کردہ سڑکوں کی وساطت سے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے اوران سڑکوں پر محافظ کھڑے ہوتے تھے تاکہ کوئی بھی فرد ٹیکس ادا کئے بغیر سفر طے نہ کر سکے۔

وہ خواتین شادی نہیں کرتی تھیں اوران کے درمیان مرد آباد نہ تھے۔ انہیں جب مرد کی تمنا ہوتی وہ اپنے قبیلے کو اکٹھا کرتیں اور نزدیکی دیہات کے مردوں کے ساتھ جنگ شروع کر دیتیں تھیں۔ وہ مرد قیدیوں کو بحفاظت اپنے ملک میں لے آتیں تھیں اور انہیں کوئی نقصان نہ پہنچاتی تھیں۔ اگر امازن لڑکوں کو جنم دیتی تو وہ ان کو قتل کر کے اس کی لاشیں ان کے والدوں کو بھجوا دیتی تھیں اور لڑکیوں کی بخوشی پرورش کی جاتی تھی اوران کی ہرممکن دیکھ بھال اور نگہداشت کی جاتی تھیں۔ جوں ہی وہ جوان ہوتیں انہیں جنگ وجدل کی تربیت دی جاتی تھی۔

ان خواتین میں ان کی ایک خاتون حکمران بھی تھی۔ اس کا نام کونوری تھا۔ یہ امازن کافی مالدار تھے۔ ان کے کھانے کے برتن سونے اور چاندی سے بنائے گئے تھے اور یہ برتن مسٹرسوں کیلئے مخصوص تھے جبکہ عام خواتین لکڑی سے بنائے گئے برتن استعمال کرتی تھیں۔

امازن کے ملک سے نکلنے کے بعد اہسپانوی ایک نئی آبادی میں آن پہنچے تھے۔ یہ ایک خوشگوار اور چمکدار علاقے میں واقع تھی۔ یہ آبادی دریا کے کنارے کسی مقام پر واقع تھی۔ یہ علاقہ گنجان آبادی کا حامل تھا۔ اس علاقے میں اونچی پہاڑیاں اور وادیاں موجود تھیں۔ لیکن یہاں کے مکین انڈین جو ہسپانویوں کو ملنے کے آئے تھے وہ اس قدر خوشگوار واقع نہ ہوئے تھے۔ انہوں نے کئی مرتبہ حملے کئے لیکن بہت کم نقصان پہنچا سکے۔

اوری لانا اس غیر دوستانہ علاقے کو چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اگلے گاؤں میں اپنے آپ کو ایک اور لڑائی میں مصروف کرنا چاہتا تھا۔ یہاں پر ایک ہسپانوی اینٹونیوڈی کارانزا ایک زہر آلود تیر لگنے سے ہلاک ہو گیا تھا۔

کارواجل تحریر کرتا ہے کہ:۔

''جب ہم نے اس زہر کے اثر کو دیکھا تو ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم ماسوائے انتہائی ضرورت اس سرزمین پر ایک قدم بھی رکھنا گوارا نہیں کریں گے۔ لہٰذا ہم مزید محتاط ہو گئے۔ ہم اتنی احتیاط کا مظاہرہ کرنے لگے جتنی احتیاط کا مظاہرہ ہم نے آج تک نہ کیا تھا۔''

وہ اسی وقت خشکی پر قدم رکھتے جس وقت انہیں خوراک پر قبضہ کرنا درکار ہوتا۔ وہ ایک زرخیز علاقے میں جا پہنچے جس کے بارے میں کارواجل بیان کرتا ہے کہ:۔

''یہ علاقہ اتنا زرخیز تھا جتنا زرخیز ہمارا اپنا اسپین تھا''۔

بالآخر بالائی ملک پیچھے رہ گیا تھا اور اب اس جماعت نے اپنے آپ کو نشیبی ملک میں پایا...... اس کے کئی ایک جزیرے تھے:۔

''ہمیں یہ اندازہ تھا کہ ہم سمندر سے زیادہ دور نہیں تھے کیونکہ ہم جس مقام پر تھے وہاں پر لہروں کا بہاؤ وسعت پذیر تھا۔ ہم یہ جان کر از خوش ہوئے۔''

دریا اتنی چوڑائی کا حامل تھا اور جزیروں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ کوئی بھی بڑی کشتی بڑی سرزمین پر نہیں پہنچ سکتی تھی حتیٰ کہ وہ حقیقی طور پر سمندر سے گزرتی ہوئی ساحل سمندر کی جانب مڑتی۔

جزیرے جس فاصلے پر محیط تھے اس فاصلے کا تخمینہ کارواجل نے تقریباً 700 میل لگایا تھا۔ چونکہ لاتعداد جزیرے موجود تھے اور ان کے درمیان تنگ نالے/کھاڑیاں موجود تھیں لہٰذا اس مقام پر دریا کی لہریں تیز رفتاری کی حامل تھیں۔

دونوں کشتیاں بُری حالت کا شکار تھیں۔ اوری لانا نے ان جزیروں میں سے ایک جزیرے پر دو ہفتے کشتیوں کی مرمت میں گزارے۔ آدھی نفری کشتیوں کی مرمت کا کام سرانجام دیتی تھی جبکہ بقایا آدھی نفری خوراک کی تلاش میں مصروف رہتی تھی۔

8 اگست کو وہ دوبارہ عازم سفر ہوئے۔ جب لہریں اوپر اٹھتیں اس وقت وہ ان کی کشتی کو پیچھے کی جانب دھکیل دیتی تھیں۔ ان کے پاس لنگر بھی موجود نہ تھے۔ وہ لنگر کی جگہ پتھر استعمال میں لاتے تھے۔

لیکن آہستہ آہستہ وہ ایک دیہات تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اردگرد کے دیہاتوں کے انڈین دوستانہ رویے کے حامل تھے۔ انہوں نے ہسپانویوں کیلئے خوراک کا بندوبست کیا اور انہیں بتایا کہ وہ اس سے بیشتر بھی عیسائیوں سے مل چکے تھے۔ یہ خبر اوری لانا اور اس کے ساتھیوں کے لئے حوصلہ افزا اور امید افزا تھی۔ اس کے ساتھیوں نے کھلے سمندر میں پہنچنے کے لئے اپنی کوششیں دوگنی کر دیں۔ بالآخر 26 اگست 1542ء کو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن ان کی آزمائش ابھی ختم نہ ہوئی تھی۔

ان کے پاس کمپاس بھی موجود نہ تھی اور نہ ہی جہاز رانوں کا چارٹ موجود تھا۔ ان کو یہ علم نہ تھا کہ انہوں نے کس سمت کی جانب سفر طے کرنا تھا۔ دریا اس قدر چوڑائی کا حامل تھا کہ اکثر زمین مکمل طور پر ان کی نظروں سے اوجھل رہتی تھی:۔

"ایک بڑی کشتی ہم سے بچھڑ چکی تھی۔ اس کے بچھڑنے کے ہم دوبارہ اس کو کبھی دیکھ نہ پائے تھے۔ ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اس کشتی پر سوار افراد ڈوب چکے تھے۔

"نو دنوں کے بعد بالآخر ہم سمندر میں داخل ہو چکے تھے۔ اس سے نکلنا اس قدر وقت طلب تھا کہ ہمیں سات دن اس سے باہر نکلنے میں درکار ہوئے تھے اور ان سات دنوں کے دوران ہمارے ساتھیوں نے ایک لمحے کے لئے بھی چپو اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑے تھے۔

"بالآخر ہم اس قید خانے سے باہر نکل آئے تھے۔ دو روز تک ہم آگے بڑھتے رہے ہم ساحل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ ہم یہ قطعاً نہیں جانتے تھے کہ ہم کس مقام پر تھے۔ بالآخر ہم نے کیوباگا کے جزیرے تک رسائی حاصل کر لی جو نیو کاڈز شہر میں واقع تھا۔

"وہاں ہماری ملاقات ہمارے دیگر ساتھیوں اور چھوٹی کشتی سے ہوئی جو دو روز بیشتر اس مقام پر پہنچے تھے۔ ہمیں جس قدر خوشی محسوس ہوئی اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔"

اس طرح اوری لانا کا تاریخی سفر اپنے اختتام کو پہنچا۔ انہوں نے نو ماہ تک نامساعد حالات اور ایک ناموافق سرزمین پر اپنی جدوجہد جاری رکھی تھی۔ ان کے ساتھیوں کا پانچواں حصہ یا تو انڈین کی تیروں کا نشانہ بننے کی وجہ سے ہلاک ہو گیا تھا یا فاقہ کشی کی وجہ سے ہلاک ہو گیا تھا۔ اوری لانا کا حوصلہ، جرأت، بہادری اور رہنمائی قابل دید تھی۔ ایک لڑائی کے دوران وہ بذات خود اپنی ایک آنکھ سے محروم ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود بھی اس نے ہمت نہ ہاری تھی اور اپنے ساتھیوں کے حوصلے بھی بڑھاتا رہا تھا اور کامیابی و کامرانی نے اس کے قدم چومے تھے۔

......❁......

بھوتوں کا جزیرہ

فرانس I نے سینئر (یہ ایک خطاب تھا......نواب وغیرہ کی طرز کا خطاب) ڈی روبروال کو کینیڈا کا پہلا فرانسیسی وائسرائے مقرر کیا۔ اپریل 1542ء کو وہ اوٹاوا کے بحری سفر کیلئے روانہ ہوا تاکہ جیکوئس کارٹیئر سے جا ملے جو ایک فرانسیسی جہاز ران تھا جس نے ایک فرانسیسی نوآبادی بھی دریافت کر رکھی تھی۔

سینئر ڈی روبروال نے اپنی 17 سالہ بھتیجی کو بھی اپنے ہمراہ لے لیا۔ اس کا نام مارگریٹ ڈی روبروال تھا۔ وہ ایک پُرکشش اور زندہ دل لڑکی تھی۔ وہ روبروال کے اکلوتے بھائی کی بیٹی تھی۔ روبروال بذات خود رنڈوا تھا اور بے اولاد بھی تھا۔ لہٰذا مارگریٹ ہی اس کی وراثت کی حقدار تھی۔

یہی وجہ تھی کہ وہ مکمل طور پر باخبر تھی کہ جب وہ پیری کی محبت میں گرفتار ہوئی تھی جو ایک قلاش نوجوان تھا اور جنگی سوار تھا تب اس نے اپنے چچا کی ناگواری کو دعوت دی تھی۔ اس کا چچا پوری شدت کے ساتھ اس محبت کے خلاف تھا اور اس نوجوان کو یکسر مسترد کر چکا تھا۔ اس کا چچا اس کو ایک حقیقی اور اچھی شادی کی اہمیت سے کئی مرتبہ آگاہ کر چکا تھا۔ وہ اسے اپنی بیٹی کی طرح چاہتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اس کی شادی کسی بہتر نوجوان کے ساتھ کرنا چاہتا تھا۔

لیکن وہ پیری کی محبت میں گرفتار ہو چکی تھی جو کہ اس کے چچا کے معیار کے لحاظ سے اس کے لئے ایک انتہائی نامعقول اور بے جوڑ نوجوان تھا۔ لیکن وہ اس کی محبت میں اس قدر آگے نکل چکی تھی کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

ہر رات دونوں خفیہ طور پر جہاز کے عرشے پر ملاقات کرتے تھے......وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے اردگرد خطرہ منڈلا رہا ہوتا تھا...... حتیٰ کہ موت تک کا خطرہ موجود ہوتا تھا۔

مارگریٹ بحری جہاز پر ہی رہائش پذیر تھی......وہ اپنے چھوٹے سے کیبن میں سوتی تھی......چاندی کی پلیٹ میں کھانا کھاتی تھی......اس کی خدمت کیلئے ایک وفادار بوڑھی آیا بھی موجود تھی جس کا نام کیتھرائن تھا اور وہ اس کی ضروریات کی تکمیل کے لئے مستعد رہتی تھی۔

لیکن مارگریٹ خوش نہ تھی۔ اس کا چچا انتہائی سخت گیر واقع ہوا تھا۔ وہ اس سے خوف زدہ رہتی تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح جہاز کے دیگر لوگ اس سے خوفزدہ رہتے تھے۔ اس کی زندگی کی واحد خوشی پیری تھا۔ پیری نے اس کی قربت اختیار کرنے کی خاطر جہاز پر ملازمت اختیار کر لی تھی۔

کیتھرائن......مارگریٹ کی آیا......محض وہ ہی ایک ایسی ہستی تھی جو ان کی محبت کی رازدان تھی۔ رات کے اندھیرے میں جب دونوں پیار کرنے والے جہاز کے عرشے پر خفیہ ملاقات کرتے تھے تب وہ کھڑی پہرہ دیتی تھی۔ بحراوقیانوس کی ہواؤں سے بھرپور راتوں کو وہ ان کی نگرانی سرانجام دیتی رہتی تھی۔ وہ تمام وقت اس خوف میں مبتلا رہتے تھے کہ کہیں مارگریٹ کا چچا ان کو دیکھ نہ لے۔

ایک مرتبہ پیری نے مارگریٹ سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ وہ اسے یہ اجازت فراہم کرے کہ وہ اس کے چچا سے اس کا ہاتھ شادی کے لئے مانگ لے۔وہ انتہائی امید کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہتا کہ:۔

''ہم جس دنیا میں جارہے ہیں شاید وہاں پر حالات اس سے مختلف ہوں۔''

یہ سن کر مارگریٹ اپنا سر ہلا دیتی اور کہتی کہ:۔

''تم نے اپنے آپ کو ایک عظیم خطرے سے دوچار کرلیا ہے۔میرے چچا نے یہ قسم کھا رکھی ہے کہ میرا ہونے والا خاوند دولت مند اور بڑے عہدے کا حامل ہوگا۔اس کا ذہن دنیا کی کوئی طاقت تبدیل نہیں کرسکتی۔لہٰذا تمہارا اس سے ملاقات کرنا اور شادی کے لئے میرا ہاتھ مانگنا تمہارے لئے سودمند ہونے کی بجائے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوگا۔''

تب ایک روز جبکہ ان کا الزبتھ نامی جہاز نیوفاؤنڈ لینڈ کی بندرگاہ کے قریب تھا اس کے چچا کے کیبن سے اس کیلئے بلاوا آیا۔اس کے چچا نے اسے طلب کیا تھا۔وہاں پر روتی ہوئی کیتھرائن نے اپنے آپ کو اپنی نوجوان مالکن کے قدموں میں گرادیا۔

سینئر ڈی روبروال غصے کی شدت سے لال پیلا ہو رہا تھا۔جہاز کے ایک ملازم نے اسے اطلاع دی تھی کہ مارگریٹ جہاز کے عرشے پر اپنے محبوب کے ساتھ محو گفتگو تھی۔بوڑھی کیتھرائن کی جواب طلبی کی گئی۔اس نے بھی ملازم کی اطلاع کی تصدیق کردی۔لیکن اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اس نوجوان کے نام سے واقف نہ تھی جو مارگریٹ سے ملاقات کرتا تھا۔

روبروال نے ناراضگی سے بھرپور آنکھوں کے ساتھ اپنی بھتیجی کی جانب دیکھا اور پوچھا کہ:۔

''ٹھیک ہے...... مجھے بتاؤ کہ وہ کون ہے؟''

اس نے مزید پوچھا کہ:۔

''اس کا نام کیا ہے؟''

مارگریٹ نے جواب دیا کہ:۔

''میں آپ کو کچھ نہیں بتاسکتی۔''

روبروال مارگریٹ کو اپنے کیبن سے باہر لے آیا اور ایک ویران جزیرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا کہ:۔

''لوگ اس جگہ کو بھوتوں کا جزیرہ کہتے ہیں۔کیونکہ یہ جزیرہ بھوتوں کی روحوں کا مسکن ہے''

اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا کہ:۔

''اگر تم مجھے اس بدمعاش کا نام نہیں بتاؤ گی جس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی تب میں تمہیں اس ویران جزیرے پر اتار دوں گا جو بھوتوں کا مسکن ہے اور تمہیں تمہاری قسمت کے رحم وکرم پر چھوڑ دوں گا''

مارگریٹ چچا کے قدموں میں گر پڑی اور فریاد کرنے لگی کہ:۔

''چچا رحم کھائیں...... میں اس سے محبت کرتی ہوں۔''

روبروال نے دل کھول کر قہقہہ لگایا اور کہنے لگا کہ:۔

''تب ہم دیکھیں گے کہ تم اپنی محبت میں کس قدر ثابت قدم ہو۔''

مارگریٹ سخت پتھر بن گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے پیری کا نام لے دیا تو اس کا چچا اسے اذیتوں میں مبتلا کر دے گا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اسے ہلاک کر دیتا۔ روبروال بھی سخت پتھر بن گیا تھا۔ اس نے حکم صادر کیا کہ ایک کشتی نکالی جائے اور الزبتھ کو بھوتوں کے جزیرے پر پہنچا دیا جائے۔

مارگریٹ اگرچہ خوفزدہ تھی لیکن اس نے ہونٹ نہ کھولے تھے...... زبان نہ کھولی تھی...... اسے کشتی میں سوار کیا جانے لگا...... کیتھرائن نے بھی التجا کی کہ اسے بھی اس کی مالکن کے ساتھ بھیجا جائے۔ روبروال نے اس کو اجازت فراہم کر دی۔

ان دونوں کو معمولی سی اشیائے خورد و نوش دی گئیں۔ لیکن ملاح جو انہیں سمندر کے کنارے تک پہنچانے پر مامور کیے گئے تھے وہ روبروال سے اس قدر خوفزدہ تھے کہ وہ انہیں کچھ مزید دینے پر آمادہ نہ تھے۔ ہاں البتہ انہوں نے انہیں ایک چاقو اور جو چند اوزار ان کے پاس تھے وہ دے دیے۔

بوڑھی عورت اور نوجوان لڑکی دونوں ویران کنارے پر بیٹھی تھیں۔ وہ دونوں رو رہی تھیں اور ایک دوسرے کو تھامے ہوئے تھیں اور کشتی واپس جہاز کی جانب روانہ ہو چکی تھی۔ وہ دونوں جانتی تھیں بلکہ جہاز پر موجود ہر شخص جانتا تھا کہ ان دونوں کو موت کے حوالے کر دیا گیا تھا...... ان کو مرنے کیلئے اس مقام پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس جزیرے کا کوئی رخ نہ کرتا تھا کیونکہ اس کے بارے میں مختلف افواہیں گردش کرتی رہتی تھیں۔

جیسے ہی الزبتھ نامی جہاز نے آگے بڑھنا شروع کیا...... ایک نوجوان نے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ اس کی بندوق اور اسلحہ اس کی کمر پر جھول رہا تھا اور ساحل کی جانب بڑھنے لگا...... یہ پیری تھا۔

روبروال اپنا شکار ہاتھ سے نکل جانے پر تلملا اٹھا۔ وہ اسے واپس لانا چاہتا تھا لیکن ہوا برق رفتاری کے ساتھ چلنا شروع ہو چکی تھی اور سمندر کی لہریں بھی جہاز کو ہچکولے کھانے پر مجبور کر رہی تھیں۔ لہٰذا اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ جہاز کو آگے بڑھنے دیتا۔

روبروال کیوبک کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس نے جو حرکت سرانجام دی تھی اس حرکت کی وجہ سے جہاز پر موجود ہر ایک شخص اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگا تھا۔ نہ صرف انڈین اس سے نفرت کرنے لگے تھے بلکہ اس کے اپنے ہم وطن بھی اس سے نفرت کرنے لگے تھے۔

تین نفوس جو بھوتوں کے جزیرے کے مکین بنے تھے ان کیلئے روح اور جسم کا رشتہ برقرار رکھنا ایک مشکل امر دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن پیری پُر امید تھا اور مارگریٹ...... اگرچہ وہ ایک پُر آسائش زندگی کی عادی تھی اور اسی ماحول میں پلی بڑھی تھی لیکن اس کے باوجود بھی وہ کسی بھی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کر رہی تھی۔ ان کے ذہن کافی عرصہ بعد تند و تیز ہواؤں کے زور و شور کے عادی ہوئے تھے۔

انہوں نے ایک طرح کی جھونپڑی کھڑی کر لی تھی۔ پیری جانوروں کا شکار کرنے کے علاوہ مچھلیاں پکڑنے کی بھی کوشش کرتا تھا۔ اس جزیرے پر لکڑی وافر مقدار میں موجود تھی۔ انہوں نے آنے والے موسم سرما کیلئے کافی مقدار میں ایندھن اکٹھا کر لیا تھا۔ ان کو یہ علم تھا کہ موسم سرما نہ صرف ایک طویل دورانیے پر مشتمل ہوگا بلکہ شدت کی سردی کا بھی حامل ہوگا۔ سردیوں کا موسم انہوں نے آگ کے گرد بیٹھتے ہوئے گزارا جبکہ باہر

برف باری اپنے پورے جوبن پر ہوتی تھی۔

پیری اور مارگریٹ ازدواجی بندھن میں بندھنا چاہتے تھے اور کچھ پس وپیش کے بعد بوڑھی آیا نے انہیں اپنی دعاؤں سے نوازا اور ایک عجیب وغریب شادی کی تقریب میں دونوں پیار کرنے والے ایک دوسرے کے جیون ساتھی بن گئے۔ اگرچہ یہ ایک غیر روائتی شادی تھی لیکن یہ ایک ایسی شادی تھی جس کا دولہا اور دلہن دونوں ایک دوسرے سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے اور بے غرض محبت کرتے تھے۔

موسم بہار کی گرم اور چمکدار دھوپ میں مارگریٹ کو یہ علم ہوا کہ وہ ماں بننے والی تھی اور موسم گرما میں بچے کی پیدائش عمل میں آئی۔

لیکن پیری اب پہلے جیسا توانا اور مضبوط نہ رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو زندہ رکھنے کی خاطر سخت جدوجہد سرانجام دیتا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بچے کی بھی بہتر نگہداشت سرانجام دیتا تھا۔ اس کی صحت جلد ہی شکست وریخت کا شکار ہونی شروع ہوگئی تھی۔ اگرچہ اسے ادویات میسر نہ تھیں لیکن مارگریٹ اس کی ازحد خدمت کرتی تھی لیکن وہ موسم گرما کے آخر میں موت سے ہمکنار ہوگیا۔ اور دل شکستہ مارگریٹ نے اپنے ننگے ہاتھوں سے اس کی قبر کھودی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس نے اپنا سب کچھ اس پر قربان کردیا تھا۔

سانحہ کے بعد سانحہ درپیش آتا رہا۔ بچہ دوسرے موسم سرما کی شدت کی سردی برداشت نہ کرسکا اور وہ بھی موت سے ہمکنار ہوگیا۔ مارگریٹ نے اسے بھی اپنے ہاتھوں برف میں دفن کیا۔ اس کے بعد وفادار کیتھرائن بھی بیمار پڑ گئی اور موت سے ہمکنار ہوگئی۔

لہٰذا مارگریٹ اب تنہا تھی۔ وہ بھی یہ دعا کرتی تھی کہ وہ بھی جلد از جلد پیری کے ساتھ جا ملے لیکن اس کی دعا کو شرف قبولیت حاصل نہ ہوسکا۔ مزید 18 ماہ تک وہ تن تنہا اس جزیرے میں قیام پذیر رہی اور اس کی یادیں اس کو ڈستی رہتی تھیں۔

کئی مرتبہ اس نے کافی فاصلے پر جہاز کو جاتے دیکھا لیکن جہاز ران بھوتوں کے اس جزیرے کے قریب پھٹکنے سے بھی گریز کرتے تھے۔

چوتھا موسم سرما شروع ہونے والا تھا جب مارگریٹ نے سمندر میں مشرق کی جانب ایک جہاز دیکھا۔ مارگریٹ اب ایک فیصلہ کرچکی تھی۔ اس نے جہاز کے عملے کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانے کی غرض سے سردیاں گزارنے کیلئے اکٹھا کیا گیا تمام تر ایندھن داؤ پر لگاتے ہوئے اسے جلا ڈالا۔

لیکن اسے اپنے اس فعل پر کوئی دکھ نہ ہوا۔ اس نے سوچا کہ اگر جہاز اس کی جانب متوجہ نہ ہوا تب وہ سردی کی شدت کے ساتھ مرنے کیلئے بالکل تیار ہوگی کیونکہ بھوتوں کے جزیرے پر اس کو زندہ رہنے کی کوئی خواہش نہ تھی۔

اس جہاز کا کپتان الزبتھ نامی جہاز میں ایک افسر کے عہدے پر فائز رہ چکا تھا اور جوں ہی اس نے بھوتوں کے جزیرے سے دھواں اٹھتا دیکھا وہ جان گیا کہ ان تین بدقسمت انسانوں میں سے ضرور کوئی نہ کوئی ہنوز زندہ ہوگا۔

اس کے باوجود بھی وہ حیران تھا۔ اسے یہ امید نہ تھی کہ وہ پہلے موسم سرما کی شدت کی تاب برداشت کرسکیں گے۔ جہاز کے کپتان نے اپنے جہاز کا رخ اس جزیرے کی جانب کیا اور ایک کشتی ساحل کی جانب روانہ کی۔

کشتی مارگریٹ کو لے کر جہاز تک پہنچ چکی تھی جس کو تین برس بیشتر اس جزیرے کی زینت بنایا گیا تھا۔

مارگریٹ بھی جہاز کے کپتان کو پہنچان چکی تھی کیونکہ وہ الزبتھ نامی جہاز پر افسر رہ چکا تھا۔ وہ مارگریٹ کو دیکھ کر شرمندہ ہوگیا اور کہنے لگا کہ:۔

''آپ میرا یقین کریں ہم میں سے کوئی بھی فرد آپ کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ آپ کا چچا ایک ظالم و جابر اور دہشت ناک شخص تھا''

مارگریٹ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جہاز کے عرشے پر کھڑی جزیرے کو گھورتی رہی جبکہ آہستہ آہستہ اپنی منزل کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس جزیرے پر تین چھوٹی چھوٹی صلیبیں تھیں جہاں پر وہ ہستیاں محو آرام تھیں جن سے وہ اس دنیا میں ٹوٹ کر محبت کرتی تھی۔

لہٰذا اس نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ:۔

''کپتان کیا آپ دیکھ رہے ہیں؟ وہاں پر تین صلیبیں موجود ہیں......اور میرا دل بھی وہیں پر ان کے ساتھ مدفون ہے''۔

کپتان نے اپنے سر کو جنبش دی......وہ اس کی بات سمجھ چکا تھا۔

کپتان نے مارگریٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:۔

''اس ظالمانہ فعل کی سرانجام دہی کے بعد تمہارے چچا کے حصے میں لعن طعن کے سوا کچھ نہ آیا......وہ واپس اپنے گھر فرانس روانہ ہوگیا تاکہ تنہائی میں موت کو گلے لگا سکے''۔

مارگریٹ بھی فرانس واپس پہنچ گئی جہاں وہ اپنے چچا کی دولت کی وارث ٹھہری اور ایک مرتبہ پھر وہ پُر آسائش زندگی گزارنے لگی۔

لیکن مارگریٹ جوان تھی۔ اس مہم کی سرانجام دہی کے بعد اس کے جذبے بکھرنے کی بجائے مزید مضبوطی کے حامل ہوئے تھے۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد اس نے دوبارہ شادی کرلی......اس کی ایک مکمل فیملی تھی اور وہ تادیر زندہ بھی رہی۔ لیکن اس کا ایک حصہ ہمیشہ بھوتوں کے تنہا......ویران......اور طوفانی جزیرے میں ہی رہا......وہ اس شخص کی وفاداری رہی جس نے اس کے ساتھ بے لوث اور بے غرض محبت کی تھی۔

سر فرانسس ڈریک کی کاڈز کی بندرگاہ کی جانب روانگی

28 جولائی 1587ء کو بحری جہازوں کا ایک اسکواڈرن پورٹ ماؤتھ کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ ان جہازوں کا کمانڈر...... سر فرانسس ڈریک دوبارہ اپنے گھر پہنچ چکا تھا۔ وہ اپنے بحری گشت کے نتائج سے انتہائی خوش اور مسرور تھا۔ محض ایک سال سے کچھ زائد عرصے کے دوران اس نے جنوبی امریکہ میں سات ہسپانوی قصبوں پر حملہ کیا اور انہیں اپنی لوٹ کھسوٹ کا نشانہ بنایا تھا...... خوب مال غنیمت اکٹھا کیا تھا۔ اس کے صندوق لوٹ مار کے مال سے بھرے ہوئے تھے۔ اس مال غنیمت کی قیمت 60,000 پاؤنڈ تھی۔ انگلستان لوٹنے سے پیشتر وہ ورجینا کے ساحل کی جانب بھی روانہ ہوا تھا۔ وہاں پر اسے کچھ لوگ میسر آئے جنہیں سر والٹر ریلے نے وہاں چھوڑا تھا۔ وہ ان کو بھی اپنے ساتھ گھر لے آیا اور ان میں سے ایک شخص رالف لین کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ پہلا شخص تھا جو تمباکو کا پودا انگلستان لایا تھا۔ ڈریک کی کامیابی کی خبر نے اس کے ایک ساتھی ڈی ووٹمین تھامس کاونڈش کی بھی حوصلہ افزائی کی کہ وہ بھی اسی قسم کی مہم سرانجام دے۔

ڈریک کی کامیابی اس کے اپنے ملک میں از حد مقبول ہوئی جبکہ اسپین میں...... جس کے ساتھ انگلستان فنی طور پر حالت امن میں تھا...... ان خبروں پر اظہار ناراضگی کیا گیا اور یہ خبریں جب بادشاہ فلپ II کے کانوں تک پہنچیں تو وہ بھی غم وغصے کا شکار ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ پہلی خبر ملنے پر اس نے انگلستان کے خلاف چارہ جوئی کرنے کا فیصلہ سرانجام دیا اور دوسری خبر نے اس کے اس فیصلے کو تقویت بخشی۔

اسپین کی بندرگاہیں بحری جہازوں سے بھرنے لگیں...... فوجی دستوں کو تربیت مہیا کی جانے لگی اور راشن اور اسلحہ ذخیرہ کیا جانے لگا۔

تاہم ایک انگریز اس بڑے بحری بیڑے کے انتظار کے حق میں نہ تھا جسے پہلے ہی عظیم جنگی جہازوں کے بیڑے کا خطاب دیا جا چکا تھا۔ سر فرانسس ڈریک اس نکتہ نظر کا حامل تھا کہ ہسپانوی بندرگاہوں پر اچانک حملوں کا ایک تسلسل نہ صرف اس بحری بیڑے کی روانگی میں تاخیر کا باعث ثابت ہوگا بلکہ عین ممکن ہے کہ وہ اس کی روانگی کو یکسر رکوانے میں بھی معاون ثابت ہو۔ وہ اپنی ملکہ الزبتھ کے پاس چلا آیا اور اسے اپنے منصوبوں سے آگاہ کیا اور اسے قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس نے اپنا بحری بیڑہ تیار کیا۔ بروگ کو ملکہ نے وائس ایڈمرل مقرر کیا تھا۔ اس کی ذمہ داریوں میں یہ امر بھی شامل تھا کہ وہ ڈریک پر بھی نظر رکھے۔ لیکن ڈریک ایک ایسا فرد نہ تھا جو کسی کو یہ موقع فراہم کرے کہ وہ اس پر نظر رکھے یا اس کی نگرانی سرانجام دے۔ اس کے بہت سے افسران اور دیگر افراد اس سے پیشتر بھی اس کے ساتھ بحری سفر سرانجام دے چکے تھے اور وہ بخوبی جانتا تھا کہ وہ اس کے حکم پر اس کی پیروی کرتے ہوئے پوری دنیا کے گرد بھی چکر لگا سکتے تھے۔

بہرکیف ڈریک کے اپنے مخصوص مقاصد تھے اور یہ افواہ بھی گشت کر رہی تھی کہ اس منصوبے کا علم اسپین کو بھی ہو چکا تھا کیونکہ دونوں

ممالک نے جاسوسی کا ایک پیچیدہ نظام قائم کر دیا تھا اور دونوں ممالک کے جاسوس ایک دوسرے کے ملک میں موجود تھے۔ لیکن اس کے باوجود بھی ڈریک دلبرداشتہ نہ ہوا اور نہ ہی اپنی مہم ترک کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ کاڈز کی بندرگاہ جہازوں سے بھری ہوئی تھی اور یہ جہاز انگلستان کے خلاف کسی بھی کارروائی کی سرانجام دہی کیلئے تیار کھڑے تھے اور ڈریک جانتا تھا کہ اس مخصوص لمحے یہاں پر کسی معمولی سی کارروائی کی سرانجام دہی کی بدولت فلپ کے بحری بیڑہ کی روانگی کئی ماہ تک ملتوی ہو سکتی تھی۔

وہ اس حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ تھا کہ ملکہ اپنے درباریوں کے دباؤ میں آتے ہوئے اپنا ارادہ تبدیل کر سکتی تھی اور اس کے مشن کو منسوخ کرنے کے احکامات صادر کر سکتی تھی۔ ہر ایک لمحہ قیمتی تھا۔ اگرچہ اس کے کچھ جہاز ابھی تیار نہ تھے لیکن وہ زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ کئی ایک دیگر مواقع پر ملکہ کو اپنی رائے بدلتے دیکھ چکا تھا۔ جہاز کے ایک بڑے کیبن میں بیٹھتے ہوئے اس نے اپنے دوست اور اپنے حمایتی سر فرانسس ولنگھم کو حتمی خط تحریر کیا...... وہ پرنسپل سیکرٹری آف اسٹیٹ کے عہدے پر فائز تھا۔

کچھ دنوں کے بعد اس کے بحری بیڑے نے بندرگاہ چھوڑ دی اور سمندر کی راہ لی۔

اس دوران لندن سے ملکہ کے احکامات موصول ہوئے جن کے تحت ڈریک کو فلپ کی کسی بھی بندرگاہ میں داخل ہونے سے منع کیا گیا تھا۔ اس کے کسی بھی قصبے کے خلاف کارروائی سرانجام دینے سے منع کیا گیا تھا یا اس کی بندرگاہوں پر کھڑے کسی بھی جہاز کے خلاف کارروائی کرنے سے منع کیا گیا تھا۔ جس وقت ملکہ کا قاصد پلے ماؤتھ پہنچا اس وقت ڈریک کا بحری بیڑہ خلیج لبیسکے کی جانب بڑھ رہا تھا۔

جب لسبن کی چٹان دکھائی دی...... ڈریک نے اپنے کپتانوں کو طلب کیا۔ اس دوران ڈریک کو مطلع کیا گیا کہ اسپین کا بحری بیڑہ بندرگاہ پر اکٹھا ہو رہا تھا اور وہ جلد ہی بڑے بحری بیڑے میں شامل ہونے کے لئے روانہ ہو جائے گا جو لسبن میں اکٹھا ہو رہا تھا۔

ڈریک مطمئن تھا کہ اس کا ہدف درست تھا۔ ڈریک نے اپنے حملے کا منصوبہ طے کرنا شروع کر دیا۔ اگرچہ بروگ انتظار کرنے کے حق میں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اگلی صبح تک انتظار کیا جائے۔ اسے اس کے ایڈمرل نے انتہائی پُرسکون انداز میں بتایا کہ کسی قسم کا کوئی انتظار نہیں کیا جائے گا...... وہ یک دم حملہ کریں گے۔

اس کے بحری بیڑے نے 29 اپریل 1587ء بروز بدھ دوپہر بھر کے دوران ایک ایسی بندرگاہ کی جانب اپنا سفر جاری رکھا جو دو حصوں میں منقسم تھی...... اندرونی اور بیرونی بندرگاہ۔

جلد ہی اس کا جہاز بندرگاہ میں داخل ہو رہا تھا اور ڈریک نے اپنے سامنے کاڈز شہر کی سرخ چھتیں اور سفید دیواریں دیکھیں جو دوپہر کے وقت سورج کی روشنی اور چمک کی بدولت بذات خود بھی چمک رہی تھیں۔ لیکن ڈریک کی حیرانگی کی انتہا نہ رہی جب اس نے یہ دیکھا کہ کم از کم 70 جہاز بندرگاہ پر کھڑے تھے۔

ان جہازوں کے کمانڈر ڈون پیڈرو ڈی اکونا نے جب ڈریک کے جہازوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو اس نے اپنے جنگی جہازوں کو ایک قطار میں کھڑے ہونے کا حکم صادر کیا۔ اگلے ہی لمحے شہر گولہ باری کی گھن گرج اور دھوئیں کے بادلوں سے چونک اٹھا۔ یہ گولہ باری انگلستان کے

جہازوں کی توپوں سے کی گئی تھی۔

یہ لڑائی......اگر اس کو لڑائی کہنا ممکن ہو......مختصر دورانیے پر محیط تھی۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے گولہ باری جاری رہی اور رات پڑنے تک تباہی و بربادی کا کافی کام مکمل کیا جا چکا تھا۔ لیکن ڈریک لنگر انداز رہا اور طلوع فجر کے انتظار میں مصروف رہا۔ مشرق کی جانب سے جب روشنی کی پہلی کرن نمودار ہوئی تب جہازوں نے خونریزی دوبارہ شروع کر دی اور رات گئے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ڈریک نے شہر کی جانب ایک نظر دوڑائی اور دیکھا کہ شہر سے دھویں کے بادل ہنوز اٹھ رہے تھے۔ وہ مسکرا دیا۔ وہ 37 ہسپانوی جہاز تباہی سے ہمکنار کر چکا تھا۔ ان میں سے کچھ جہاز ڈوب کر تباہی سے ہمکنار ہوئے تھے اور کچھ جل کر تباہی سے ہمکنار ہوئے تھے۔

اس کے بعد ڈریک اپنے جہاز الزبتھ اور اپنے بحری بیڑے کے کچھ حصے کے ہمراہ ازورس جا پہنچا۔ وہاں پر اسے ایک پرتگالی جہاز دکھائی دیا۔ دونوں کے درمیان گولہ باری کا تبادلہ ہوا اور پرتگالی جہاز کے کپتان نے ہتھیار ڈال دیے۔ ڈریک فتح یاب ہو کر پلے ماؤتھ واپس آن پہنچا۔ اس کے ہمراہ وہ عظیم خزانہ بھی تھا جس پر اس نے قبضہ کیا تھا کیونکہ پرتگالی جہاز میں سونا' چاندی' ہیرے جواہرات' سلک اور مصالحہ جات لدے ہوئے تھے۔ خزانہ اس خزانے سے تین گنا زائد تھا جو اس نے کاڈز سے حاصل کیا تھا۔

یہ اس مہم کی حتمی کامیابی تھی جو دو ماہ سے زائد عرصے تک جاری رہی تھی اور اسپین اپنے حملے کے منصوبوں کو ایک برس تک پس پشت ڈالنے پر بھی مجبور ہو گیا تھا۔

جاپان میں پہلا انگریز

ولیم آدم نے 1560 میں جنم لیا تھا۔ اس کی جائے پیدائش ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جس کا نام گلنگ ہام...... کینٹ تھا۔ یہ تقریباً ناگزیر تھا کہ سمندر اس کا کیریئر بنے اور اس وقت اس کی عمر محض بارہ برس تھی جبکہ وہ جہاز تیار کرنے والے ایک ادارے میں بطور اپرینٹس بھرتی ہو گیا تھا۔ مابعد وہ بحریہ میں چلا گیا تھا۔ بحریہ میں اس نے ماسٹرز اور پائلٹ سرٹیفکیٹ حاصل کیا اور اس کے بعد اس نے تقریباً بارہ برس تک ایک مرچنٹ کمپنی میں خدمات سرانجام دیں۔

ایک بڑی مہم جو اسے انگلستان سے ہمیشہ کیلئے جدا کرنے کا باعث بنی۔ نہ صرف اسے بلکہ اس کے بیوی بچوں کو بھی ہمیشہ کیلئے انگلستان سے جدا کرنے کا باعث ثابت ہوئی 1598ء میں شروع ہوئی جبکہ اس نے پانچ بحری جہازوں کے ایک بیڑے میں بطور پائلٹ میجر شرکت کی۔ یہ جہاز ایک ایسی تجارتی کمپنی کی ملکیت تھے جو ہندوستان کے ساتھ تجارت سرانجام دیتی تھی۔ اس نے 160 ٹن وزنی جہاز میں اپنی خدمات سرانجام دیں۔ اس جہاز میں عملے کے 110 ارکان شامل تھے۔ یہ بحری سفر جس کا آغاز 24 جون کو ٹیکسل سے ہوا ایک بدقسمت بحری سفر ثابت ہوا۔ کیونکہ جہاز کے عملے میں بیماری پھوٹ پڑی تھی اور یہ بیماری اس قدر شدت اختیار کر چکی تھی کہ دو ماہ بعد جب یہ بحری بیڑہ مغربی افریقہ پہنچا تو اسے وہاں پر تین ہفتوں تک قیام پذیر ہونا پڑا۔ اس قیام کے دوران اس بحری بیڑے کا کمانڈر موت سے ہمکنار ہو گیا۔

ان کا اگلا سفر انہیں گنی کے ساحل پر لے گیا جہاں پر ایک مرتبہ پھر انہیں رکنا پڑا تاکہ جہاز کا عملہ بیماری سے صحت یاب ہو سکے...... جہاز کا عملہ بخار کے ہاتھوں پریشان تھا۔ جہاز کے افسران ایک صحت مند ماحول کی تلاش میں تھے لہٰذا انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ برازیل کا رخ کیا جائے۔ اس وقت تک وہ افریقہ کے ساحل پر دو ماہ کا عرصہ بیکار میں ضائع کر چکے تھے۔ قسمت ابھی بھی ان کی یاوری نہیں کر رہی تھی۔ وہ ہنوز بدقسمتی کا شکار تھے۔ نومبر کے وسط سے لیکر اپریل 1599ء کے آغاز تک ان کے جہاز جنوبی بحر اوقیانوس میں ہچکولے کھاتے رہے اور ان کے سفر کی رفتار سست رہی۔ بالآخر وہ آبنائے میگ لان میں داخل ہوئے اور یہاں پر وہ سردی کا شکار ہو گئے لہٰذا وہ وہاں پر قیام کرنے پر مجبور ہو گئے حتیٰ کہ ماہ ستمبر میں موسم میں کچھ بہتری کے آثار نمودار ہو گئے۔

ان کا بحری بیڑہ بمشکل ہی آبنائے میگ لان سے باہر نکلا تھا کہ وہ شدید طوفان میں گھر گیا۔ اس طوفان نے دو جہاز واپس آبنائے کی جانب دھکیل دیے اور نتیجے کے طور پر وہ واپس ہالینڈ پلٹنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ دل شکستہ اور دل برداشتہ تھے۔ ایک اور جہاز پر ہسپانوی جہازوں نے قبضہ کر لیا اور بقایا دو جہاز...... چیریٹی اور ایڈمرل کا جہاز ہوپ...... بالآخر دوبارہ چلی کے ساحل پر ایک دوسرے سے آن ملے......لیکن یہاں پر بھی ان کی قسمت نے پلٹا نہ کھایا اور وہ گردش کا شکار رہی۔ ان دونوں جہازوں کے کمانڈر اور بہت سا عملہ ساحل پر مقامی لوگوں کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا۔ ان

تھے۔ تاہم لی یاسا ایک انصاف پسند شخص واقع ہوا تھا اور وہ آدم کو سزا دینے سے ہچکچا رہا تھا کیونکہ آدم سے کوئی جرم سرزد نہ ہوا تھا اس لیے نہ صرف اس نے نہ صرف آدم کو رہا کر دیا بلکہ اس کے لئے اور اس کے ساتھیوں کیلئے روزانہ چاولوں کا راشن اور معمولی پینشن کی بھی منظوری عطا کر دی۔ لیکن اس نے ان کے جہاز کو واگزار کرنے سے انکار کر دیا۔

ولیم آدم نے ایک اجنبی آسمان تلے ایک نئے پیشے کا آغاز کیا۔ پہلے اس نے لی یاسا کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کی اور جلد ہی وہ اس کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے اب اس حکمران کی زیر سرپرستی 80 ٹن وزن کا حامل ایک جہاز بنانا شروع کیا اور جب وہ اس جہاز کی تیاری میں کامیاب ہو گیا تب اس نے لی یاسا کو ابتدائی جیومیٹری اور ریاضی سکھانی شروع کر دی۔ اس طرح اسے شہنشاہ کی خوشنودی حاصل ہو گئی۔

آدم کامیابی سے ہمکنار ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اب وہ اثر ورسوخ کا حامل بھی بن چکا تھا اور اس اثر ورسوخ کی بدولت وہ نہ صرف قوت اور طاقت کے حصول میں کامیاب ہو چکا تھا بلکہ جائیداد کے حصول میں بھی کامیاب ہو چکا تھا۔ انعام کے طور پر شہنشاہ نے اسے ایک بڑی ریاست عطا کر دی تھی۔ اس ریاست میں کافی مکانات اور کھیت شامل تھے۔ مزارعین اس کے ملازم اور غلام تھے اور اس کو ان مزارعین پر زندگی اور موت دونوں کا اختیار حاصل تھا۔

اگر چہ لی یاسا نے آدم پر اپنی عنایات جاری رکھیں لیکن وہ اس انگریز کی جانب سے بار بار پیش کردہ درخواستوں کو رد کرتا رہا جس کے تحت وہ اپنے وطن واپس جانا چاہتا تھا اور اپنے بیوی بچوں سے ملاقات کا متمنی تھا۔ اگر چہ آدم شہنشاہ کا منظور نظر تھا لیکن اس کے باوجود وہ ایک قیدی بھی تھا۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا...... سال پر سال گزرتے رہے اور اب آدم جاپان کی سرزمین کا ایک حصہ بن چکا تھا۔ 1609ء میں...... اس وقت آدم کو جاپان کی سرزمین پر قدم رکھے دس برس کا عرصہ بیت چکا تھا...... آدم کے علم میں یہ بات آئی کہ ولندیزی تجارتی جہازوں کا ایک بیڑہ جاپان پہنچ چکا تھا اور وہ جاپان میں ایک فیکٹری اور تجارتی چوکی قائم کرنے کی اجازت کے حصول کا متمنی تھا۔ وہ مجوزہ فیکٹری اور تجارتی چوکی جزیرے کے انتہائی مغرب میں قائم کرنا چاہتا تھا۔ آدم نے ان کو مطلوبہ اجازت کے حصول میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ تب دو برس مزید گزر گئے اور دو برس گزرنے کے بعد ایک اور تجارتی مشن جاپان آن پہنچا اور آدم کی کاوشوں کی وساطت سے یہ تجارتی مشن بھی قابل غور تجارتی مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جاپان آہستہ آہستہ اپنی سرحدیں اہل مغرب کے لئے کھول رہا تھا اور یہ ایک واحد انگریز تھا جس نے اس سیاسی اور معاشی آزادی میں ایک بہت بڑا کردار سرانجام دیا تھا۔

اہل یورپ کے ساتھ ان نئے روابط کی وساطت سے آدم کے علم میں یہ بات آئی کہ انگریز اب مشرق میں بھی تجارتی سرگرمیوں میں مصروف تھے بالخصوص ایک بہت بڑی ایسٹ انڈیا کمپنی کی وساطت سے وہ اپنی سیاسی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ اس موقع پر آدم کے دل میں اس خواہش نے جنم لیا کہ اس کے لئے دوبارہ آبادکاری کا ایک موقع فراہم ہو رہا تھا۔ اس نے ایک خوش بیان خط تحریر کیا جس کا آغاز اس نے کچھ اس طرح کیا کہ:۔

''میرے انجانے دوستو اور ہم وطنو''

ہلاک شدگان میں تھامس آدم...... ولیم کا بھائی بھی شامل تھا۔

اب عملہ کی تعداد کافی حد تک کم ہو چکی تھی اور انہیں خطرہ تھا کہ وہ مقامی لوگوں کے مزید حملوں کی تاب نہ لا سکیں گے۔ لہٰذا انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ لنگر اٹھالئے جائیں اور جاپان کا رخ کیا جائے۔ تجارتی جہازوں کے ضمن میں یہ فیصلہ اس دور کا ایک انقلابی فیصلہ تھا کیونکہ جاپان ہنوز ایک پراسرار سرزمین تھی اور ایک کاروباری مرکز کہلانے کی حامل نہ تھی اور دونوں جہاز چیریٹی اور ہوپ اپنے اونی کپڑوں کی فروخت کیلئے منڈی کی تلاش میں تھے۔ جاپان کی تن تنہا رہنے کی پالیسی غیر ملکی سیاحوں اور تاجروں کی حوصلہ شکنی کا باعث ثابت ہوئی تھی۔ اگرچہ ملک پر ایک شہنشاہ کی حکومت قائم تھی لیکن جاگیردار قبیلوں کے بااثر سردار اس کے اختیارات پر اثر انداز ہوتے تھے۔

بہر کیف چیریٹی اور ہوپ ماہ نومبر کے آخر میں چلی سے روانہ ہوئے اور شمال مغرب کی جانب مسلسل تین ماہ تک سفر طے کرتے رہے۔ اس دوران ان کے ساتھ کوئی سانحہ پیش نہ آیا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ خرابی موسم کا شکار ہو گئے اور دونوں جہاز ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ ہوپ نامی جہاز ایسا غائب ہوا کہ اس کے بارے میں دوبارہ کوئی خبر نہ ہو سکی۔ اب پانچ جہازوں کے بحری بیڑے میں سے محض ایک ہی جہاز چیریٹی باقی بچا تھا۔ اس جہاز کے عملے کے کافی زیادہ ارکان بیماری کا شکار تھے اور موت سے بھی ہمکنار ہو رہے تھے۔ محض آدھ درجن عملہ ایسا تھا جو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل تھا۔ جاپان کی آمد کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ لہٰذا اپریل 1600ء میں چیریٹی نامی جہاز نے بنگو کی بندرگاہ پر لنگر ڈال دیے۔ یہ بندرگاہ جزیرہ کویوشو میں واقع تھی۔ یہ جزیرہ جاپان کے انتہائی جنوبی جانب واقع تھا۔ اس وقت اس جہاز کو روٹرڈیم سے نکلے دو برس کا عرصہ بیت چکا تھا۔

یہ ان بدقسمت جہاز رانوں کے لئے مقام خوشی تھا کہ جاپان کی سرزمین پر ان کے ساتھ بہتر سلوک روا رکھا گیا۔ اہل جاپان ان کے ساتھ مہربانی کے ساتھ پیش آئے اور ان کا خیر مقدم کیا۔ ان کی آمد کی خبر جلد ہی ادھر اُدھر پھیل گئی اور جلد ہی اس شہر کے دارالحکومت اوساکا سے ولیم آدم کیلئے یہ احکامات موصول ہوئے کہ وہ اپنے آپ کو لی یاسو نامی شخص کے سامنے پیش کرے جو درحقیقت ڈپٹی شہنشاہ کے عہدے پر فائز تھا۔ جاپان کے سیاسی حالات غیر مستحکم صورت حال کے حامل تھے۔ جاپان اس وقت خانہ جنگی کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ شہنشاہ موت سے ہمکنار ہو چکا تھا۔ اس کا ایک نابالغ بیٹا تھا جو لی یاسو کے رحم و کرم پر تھا جو کہ شہنشاہ کا دیرینہ دوست تھا۔ لیکن لی یاسو کی کافی مخالفت موجود تھی۔ اس کے ان گنت مخالف تھے جو اس کی طاقت اور قوت سے خائف تھے اور حسد بھی کرتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ اس کو عہدے سے سبکدوش کر دیا جائے۔ لیکن مخالفین اور حاسدوں کو منہ کی کھانی پڑی اور ان کی منفی جدوجہد ناکامی کا شکار ہو کر رہ گئی کیونکہ ایک فیصلہ کن فتح کے بعد لی یاسو ملک کا حقیقی حکمران بن گیا۔

لی یاسو نے آدم میں گہری دلچسپی لی اور اس سے اس کے ملک کے بارے میں کئی ایک سوالات کئے اور جاپان تک رسائی حاصل کرنے کے اس کے مقصد کے بارے میں بھی اس سے دریافت کیا۔ یہ انٹرویو حوصلہ افزا نہ تھا کیونکہ اس انٹرویو کے بعد آدم کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ اگرچہ جیل میں اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا گیا لیکن مسلسل اس خدشے کا شکار رہا کہ اسے کہیں موت سے ہمکنار نہ کر دیا جائے۔ حالات کو بدتر بنانے میں پرتگالی تاجروں کا ہاتھ کارفرما تھا۔ انہوں نے ناگاساکی میں کاروباری مرکز قائم کر رکھا تھا اور ان کو اپنی کاروباری اجارہ داری خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنے اس ولندیزی حریف کو موت سے ہمکنار کروانے کیلئے ایک فعال مہم چلا رہے تھے اور یہ واویلا مچا رہے تھے کہ ولندیزی تاجر بحری ڈاکو

اس خط میں اس نے اپنی کامیابی کی داستان بیان کی اور اپنے ساتھ پیش آنے والے المیے کا بھی ذکر کیا اور مدد کی درخواست کی۔ لیکن بیچارہ آدم اپنا وقت ضائع کر رہا تھا...... وہ دوبارہ کبھی انگلستان کی شکل نہ دیکھ سکا تھا۔ اس کا تحریر کردہ خط فضول اور بے اثر ثابت ہوا کیونکہ انگریز پہلے ہی آدم کے بارے میں سن چکے تھے۔ ان کو ولندیزی تاجروں کی وساطت سے اس کے بارے میں معلومات حاصل ہو چکی تھیں اور جونہی وہ یہ خط تحریر کر رہا تھا اس دوران ایسٹ انڈیا کمپنی کے تین جہازوں کا ایک بحری بیڑہ جاپان کے ساتھ اپنے تجارتی روابط استوار کرنے کی غرض سے محوِ سفر تھا۔

یہ جہاز 1613ء کے موسم گرما میں فرانڈو آن پہنچے تھے اور ہمیشہ کی طرح اثر و رسوخ کے حامل ولیم آدم کو تجارتی شرائط طے کرنے کا اختیار سونپا گیا تھا۔ تیرہ برس سے زائد عرصے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنے آپ کو ایک مرتبہ پھر اپنے ہم وطنوں کے درمیان پایا تھا۔ لیکن یہ ملاپ سودمند ہونے کی بجائے محض ایک جذباتی ملاپ تھا۔ آدم ایسٹ انڈیا کمپنی کے کمانڈر جس کا نام سارس تھا کو لے کر لی یاسو کے ہیڈ کوارٹر پہنچا تا کہ تجارتی سرگرمیوں کے علاوہ تجارتی مراعات کے حصول پر بات چیت کی جا سکے۔ آدم نے یہ مشورہ پیش کیا کہ انگریزوں کو اپنی تجارتی چوکی کسی ایسی جگہ قائم کرنی چاہیے جہاں پر ولندیزی ہنوز اپنے پاؤں نہ جما سکے ہوں۔ لیکن اس کے مشورے کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اس کے مشورے کو اس نکتہ نظر کے تحت رد کر دیا گیا تھا کہ جس مقام پر پہلے سے ہی تجارتی سرگرمیاں جاری تھیں وہاں پر تجارتی مقابلہ جاتی رجحان پیدا ہونے کے یقینی امکانات موجود تھے۔ لہٰذا ایسٹ انڈیا کمپنی نے فرانڈو میں اپنا تجارتی مرکز قائم کیا۔ یہ مرکز رچرڈ کاکس نامی شخص کے زیرِ انتظام قائم کیا گیا تھا اور ولیم آدم کو اس کمپنی میں شمولیت کی دعوت پیش کی گئی تھی کیونکہ وہ نہ صرف جاپان کے بارے میں وسیع علم رکھتا تھا بلکہ جاپانی تجارت اور کامرس کے بارے میں بھی وسیع تجربے کا حامل تھا۔

آدم کو چونکہ اب یقین ہو چکا تھا کہ وہ دوبارہ اپنے وطن واپس نہیں جا سکتا تھا لہٰذا اس نے جاپان میں ایک جاپانی عورت سے شادی کر لی تھی اور اب اس کے دو بچے بھی تھے...... اس کے اس عمل در آمد سے یہ بات واضح ہوتی تھی کہ وہ اپنی زندگی کے بقایا ایام جاپان میں ہی بسر کرنے پر ذہنی طور پر آمادہ ہو چکا تھا۔

ایک موقع پر آدم...... سارس اور لی یاسو کے مابین ایک کاروباری گفت و شنید جاری تھی کہ ایک انہونی بات ہو گئی...... شہنشاہ نے غیر متوقع طور پر اسے سارس کے ہمراہ جاپان چھوڑنے کی اجازت فراہم کر دی بشرطیکہ وہ جاپان سے جانے کی خواہش کا حامل ہو۔ لیکن چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر آدم نے وطن واپس جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

اس کی بجائے اس نے ایک تجارتی کمپنی کی ملازمت اختیار کر لی۔ اس کا معاوضہ 100 پونڈ سالانہ تھا۔ یہ ایک ایسی ملازمت تھی جس کی سرانجام دہی کے دوران اسے چین اور دیگر ہمسایہ جزیروں کا بحری سفر طے کرنا پڑتا تھا۔ لہٰذا وہ مختصر دورانیے کے لئے جاپان سے باہر وقت گزارتا تھا۔ لی یاسو کے ساتھ اس کے روابط برقرار رہے اور جب کبھی بھی انگریز تاجر لی یاسو کے دربار میں پیش ہوتے آدم بھی اس موقع پر موجود ہوتا۔

1616ء میں لی یاسو موت سے ہمکنار ہو گیا اور اس کا بیٹا اس کا جانشین بنا۔ اس کا نام ہائیڈ تاداتھا۔ وہ غیر ملکیوں کے خلاف تھا۔ آدم نے اس کی خوشنودی بھی حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اب وہ پہلے والے اثر و رسوخ کا حامل نہ رہا تھا۔ لہٰذا ولندیزیوں اور برطانویوں کی تجارتی مراعات

میں کمی کر دی گئی اور عیسائیوں کی پوچھ گچھ بھی شروع ہوگئی (جاپان میں عیسائیت کے بیج سینٹ فرانسس ایکس ایویر نے بوئے تھے جس نے 1549ء میں ایک مشنری کے طور پر جاپان کا دورہ کیا تھا)۔ ولندیزیوں نے انگلستان پر جنگ مسلط کر دی جس کے نتیجے میں انگریزوں کے جہازوں اور تجارتی چوکیوں کو بھی نشانہ بنایا جانے لگا اور اسی طرح ولندیزی جہازوں اور تجارتی چوکیوں کو بھی نشانہ بنایا جانے لگا۔

ولیم آدم کی عمر تقریباً 60 برس ہو چکی تھی۔ اس نے مرنے سے پیشتر اپنے وطن واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ ان دنوں ایک عمر رسیدہ شخص کیلئے بحری سفر سرانجام دینا بھی ایک مشکل امر تھا بالخصوص زمانہ جنگ کے دوران یہ ایک زیادہ مشکل امر تھا۔ 1620ء جبکہ بمشکل ہی امن و امان قائم ہو سکا تھا وہ موت سے ہمکنار ہو گیا۔ اس نے اپنے ترکے میں 500 پاؤنڈ چھوڑے تھے جو انگلستان میں مقیم اس کی بیوی اور بیٹی کے علاوہ اس کی جاپانی بیوی...... اس کے بیٹے اور بیٹی میں تقسیم ہونے تھے۔ اس کو اس کی اپنی ریاست میں ہی دفن کیا گیا تھا۔

ولیم آدم کو ابھی تک جاپان میں یاد رکھا گیا ہے...... جاپان جیسے ملک میں کسی غیر ملکی کے لئے یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے کیونکہ جاپان ایک ایسا ملک تھا جو عرصہ دراز تک غیر ملکی اثر و رسوخ کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ شہر کی ایک گلی کا نام اس کے نام پر رکھا گیا ہے اور اس کے اعزاز میں ایک سالانہ تقریب بھی منعقد کی جاتی ہے...... وہ ایک ایسا شخص تھا جس نے دو جاپانی شہنشاہوں کا دور دیکھا تھا اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوا تھا...... یہ ایک ایسا اعزاز تھا جو کسی اور عیسائی کے حصے میں نہیں آیا تھا۔

مذہبی علیحدگی پسندوں کا بحری سفر

وہ متعصب لوگ تھے...... بمشکل ہی انہیں کوئی پسند کرتا تھا...... وہ تعداد میں قلیل تھے...... ماسوائے ایک نیم پڑھے لکھے کسان کا ایک بیٹا ...... ولیم براڈ مورڈ...... جس نے اپنے آپ کو نہ صرف انگریزی پڑھنا سکھایا بلکہ یونانی...... لاطینی...... اور عبرانی پڑھنا بھی سکھایا...... وہ انتظامی صلاحیتوں سے بھی مالا مال تھا...... اس کے علاوہ ان میں کوئی بھی شخص کسی قابل ذکر صلاحیت کا حامل نہ تھا (لیکن انہوں نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے براڈفورڈ کو اپنا لیڈر (رہنما) منتخب کیا تھا)

وہ امریکی زندگی یا امریکی تاریخ پر کسی بھی اثر ونفوذ کے حامل نہ تھے۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہ زائرین فادر امریکہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھتے جاتے تھے۔

لیکن کیوں؟

اپنی تمام تر خرابیوں کے باوجود...... اور ان میں بہت سی خرابیاں پائی جاتی تھیں...... یہ زائرین فادر تاریخ میں جرأت منداور باحوصلہ افراد کے طور پر جگہ پانے کے بجا طور پر مستحق ٹھہرتے ہیں۔ ایک جرأت جس کا ہم جب مشاہدہ سرانجام دیتے ہیں...... وہ واقعات جو اس جرأت کو منظر عام پر لانے کا باعث ثابت ہوئے...... جرأت اور بہادری کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دیگر کئی ایک نعم البدل کی موجودگی...... یہ سب کچھ ناقابل یقین دکھائی دیتا ہے۔

انگلستان سے ایذا رسانی اور ظلم وجبر سے تنگ آ کر فرار حاصل کرنا...... سرزمین ہالینڈ کی جانب ہجرت کرنا جس سرزمین کے بارے میں مطلق خبر نہ تھی...... اور پھر سمندری سفر طے کرنا جو قابل غور حد تک خوفناک ہو...... وہ بھی شمالی امریکہ کے ایک ایسے حصے کی جانب سفر کرنا جس کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو...... ایسی سرزمین...... ایک ظالم سرزمین پر ان کا آباد ہونا...... ایک ایسی جرات جس کی قیمت ان کو پہلی ہی خوفناک سردی کی وجہ سے اپنی نصف سے زائد اراکین کی موت کی صورت میں ادا کرنا پڑی...... یہ سب کچھ جرأت مندی اور مہم جوئی کی ایک کہانی تخلیق کرنے کے لئے کافی ہے۔

ان کا تعلق تین کونٹی جات سے تھا...... نوٹنگ ہام...... لنکن...... اور یارک...... یہ مرد اور عورتیں درمیانے اور نچلے طبقے سے متعلق تھیں جو نہ صرف انگلستان کے چرچ کے اعتقادات کے خلاف تھے بلکہ اس کے مسلک کے بھی خلاف تھے۔ ان کے نکتہ نظر کے تحت پادری کو عبادت گزاروں کے ووٹ کے ذریعے منتخب ہونا چاہئے تھا نہ کہ کسی اور ذریعے سے منتخب ہونا چاہئے تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ انسان کی گناہ گار فطرت سے بھی خائف تھے...... ان کا خدا انتقامی جذبے کا حامل ایک خدا تھا...... ان کی بائبل ایک وعدہ نہ تھی بلکہ ایک انتباہ تھی۔ انہوں نے گرجے میں حاضری

دینے سے انکار کر دیا تھا اور اپنے لئے مصائب کا ایک پہاڑ کھڑا کر لیا تھا۔ وہ پیوریٹن (انگلستانی پروٹسٹنٹ فرقے کا رکن جو غیر صحیفی اور تحریف شدہ رسوم کی تنسیخ کا طالب تھا...... اخلاق اور مذہب میں سخت محتاط) نہ تھے جیسا کہ اکثر ان کو سمجھا جاتا ہے بلکہ علیحدگی پسند یا براؤنسٹ (کیونکہ ان کا پہلا لیڈر رابرٹ براؤن تھا) تھے۔ وہ اپنے دلوں میں یہ جانتے تھے کہ انگلستان کا قائم شدہ چرچ نجات دلانے کا باعث ثابت نہیں ہو سکتا تھا اور ان کو ''اوپر'' سے یہ حکم موصول ہوا تھا کہ وہ اپنا دوسرا چرچ قائم کریں۔

1606ء میں علیحدگی پسندوں کی پہلی جماعت لنکن شائر سے ہالینڈ کی جانب روانہ ہوئی۔ ہالینڈ کے بارے میں انہوں نے یہ سن رکھا تھا کہ وہاں پر تمام اقسام کے مذاہب کو برداشت کیا جاتا تھا اور مذہبی رواداری اور برداشت کا رجحان موجود تھا۔ وہ انتہائی حوصلہ مندی کے ساتھ چوری چھپے روانہ ہوئے کیونکہ اس دور میں ملک چھوڑنے کے لئے اجازت نامہ حاصل کرنا ضروری تھا اور ان افراد کو یہ اجازت نامہ جاری نہیں کیا جاتا تھا جو قائم شدہ چرچ سے فرار حاصل کرنے کی خاطر ملک چھوڑ کر جا رہے تھے۔ پہلی جماعت بخوبی ملک سے نکل گئی اور لی ڈن میں آباد ہوگئی۔ بارہ ماہ بعد دوسری جماعت اس قدر خوش قسمتی کی حامل نہ تھی...... انہوں نے ایک بحری جہاز کے کپتان کو رشوت پیش کی کہ وہ انہیں لنکن شائر سے نکال کر بوسٹن کی بندرگاہ تک پہنچا دے۔ کپتان نے رشوت اپنی جیب میں ڈال لی اور جماعت کے ارکان کو قانون کے حوالے کر دیا۔ جیل ان کا مقدر ٹھہری۔

ایک اور جماعت کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کا واقعہ پیش آیا جنہوں نے گرمسبے سے عازم سفر ہونے کی کوشش کی تھی لیکن اس وقت مقامی ارباب اختیار...... جو ان دنوں اپنے قیدیوں کی دیکھ بھال کے ذمہ دار تھے...... وہ قیدیوں کے بڑھتے ہوئے بوجھ سے نالاں تھے۔ لہٰذا انہوں نے نہ صرف علیحدگی پسندوں کو رہا کر دیا بلکہ ان کے ملک چھوڑنے پر آمادگی بھی ظاہر کر دی۔ اگست 1608ء تک ان لوگوں کی ایک بڑی تعداد ہالینڈ میں آباد ہو چکی تھی۔

وقت گزرتا گیا...... شمال مشرقی انگلستان کے مہاجرین کیلئے ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ وہ مسئلہ یہ تھا کہ ان مہاجرین کے بچے ولندیزیوں کی طرح پرورش پا رہے تھے۔ وہ چھوٹے ولندیزیوں کے روپ میں ابھر کر سامنے آ رہے تھے۔ ولندیزی اگرچہ ہر قسم کی مذہب کی پیروی کی اجازت فراہم کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ دیگر تمام تر اشیاء کی بھی اجازت فراہم کرتے دکھائی دیتے تھے اور وہ اخلاقی لحاظ سے اس قدر کم تر واقع ہوئے تھے جس قدر سخت تر علیحدگی پسند واقع ہوئے تھے۔ ان کے بچے نہ صرف ولندیزیوں کی طرح پل بڑھ کر جوان ہو رہے تھے بلکہ ظالم بھی بنتے جا رہے تھے...... اور بہت سے لوگوں کی نظروں میں یہ دونوں دنیا ایک دوسرے کے مترادف نہ تھیں۔ اب کدھر کا رخ کیا جائے؟

انتخاب محدود تھا...... نئی دنیا میں کسی جانب جانا موزوں دکھائی دیتا تھا جہاں پر یہ لوگ اپنی ایک علیحدہ برادری کی حیثیت سے آباد ہو سکتے تھے...... ایک ایسی برادری جو غیر ملکی زبان اور غیر ملکی شیطانی افکار سے یکسر پاک ہو۔ گیانا جانے کی تجویز زیر غور آئی...... لیکن اس تجویز کو محض اس لئے نظر انداز کر دیا گیا کہ اس کا سونا نقصان کا باعث ثابت ہو سکتا تھا۔ ورجینیا...... شمالی امریکہ کے مشرقی ساحل کی ایک انگریز نوآبادی...... وہاں جانا زیادہ سودمند تصور کیا گیا۔ اس کی آبادی بھی کم تھی اور ان کو امید تھی کہ اس مقام پر وہ اپنے انداز میں خدا کی پرستش کر سکیں گے۔

اس سلسلے میں 1617ء میں ہالینڈ سے ایک وفد لندن روانہ ہوا تا کہ نیو ''ورجینیا کمپنی'' سے اس نوآبادی میں آباد ہونے کی اجازت طلب

کر سکے۔ بہت سے لوگوں کی جانب سے اس سلسلے میں اعتراضات اٹھائے گئے ...... اعتراضات اٹھانے والوں میں چرچ بھی شامل تھا ...... اس طرح دو برس کا عرصہ بیت گیا ...... اور بالآخر مطلوبہ اجازت فراہم کر دی گئی۔ لیکن اگلا مسئلہ ...... ایک اہم ترین مسئلہ ...... رقم اکٹھی کرنے کا مسئلہ تھا ...... کسی بھی زائرین فادر کے پاس اتنی رقم نہ تھی۔ ورجینیا ہجرت کرنے کے لئے ایک کثیر رقم درکار تھی۔

لندن کے 70 تاجروں نے 70,000 پونڈ کی خطیر رقم اس مقصد کیلئے اکٹھی کی۔ اگرچہ یہ رقم پُر امید زائرین کی نئی دنیا میں منتقلی کے لئے ناکافی تھی لیکن کچھ افراد کو وہاں بھیجنا ممکن تھا۔ لہٰذا یہی فیصلہ ہوا کہ جتنے جا سکتے تھے ان کو بھیج دیا جائے اور اگر وہ وہاں پر مناسب طور پر آباد ہونے میں کامیاب ہو گئے تب بقایا لوگوں کو بھی وہاں بھیج دیا جائے گا۔

بہت سے افراد جنہوں نے ورجینیا روانہ ہونے کو ترجیح دی تھی انہوں نے انگلستان کی جانب بحری سفر ایک چھوٹے سے جہاز میں کیا جس کا نام "اسپیڈ ویل" تھا جس کو انہوں نے ہالینڈ سے خریدا تھا اور متعلقہ ساز و سامان سے لیس کیا تھا۔ ساؤتھ ہیمپٹن میں ان مسافروں کی بڑی تعداد "مے فلاور" نامی ایک بڑے جہاز میں منتقل ہو گئی جو ان کے انتظار میں کھڑا تھا اور اس پر پہلے ہی قلیل تعداد میں دیگر علیحدگی پسند سوار تھے۔ یہ لوگ انگلستان سے ہالینڈ جانے پر آمادہ نہ ہوئے تھے لیکن اب امریکہ جانے پر رضا کارانہ طور پر آمادہ تھے۔ دو جہاز ...... اسپیڈ ویل ...... اور مے فلاور ...... اگست 1620ء میں نئی دنیا کی جانب عازم سفر ہوئے۔

آٹھ روز کے بعد یہ قافلہ اپنے گھر کی جانب واپس لوٹ رہا تھا۔ اسپیڈ ویل کے کپتان نے یہ اعلان کیا تھا کہ جہاز میں سوراخ ہو چکا تھا۔

سوراخ کی مرمت بندرگاہ پر سرانجام دی گئی اور دوسری مرتبہ یہ جہاز عازم سفر ہوا۔ ایک مرتبہ پھر اسپیڈ ویل کے کپتان ...... جو کہ یک دم شمالی بحر اوقیانوس میں اس قدر چھوٹا جہاز لے جانے سے خوفزدہ ہو چکا تھا ...... اسے جہاز میں کوئی اور خرابی دکھائی دی اور یہ قافلہ دوسری مرتبہ پلے ماؤتھ واپس چلا آیا۔ جو لوگ اس جہاز پر سوار تھے وہ بھی مے فلاور نامی جہاز میں سوار ہو گئے۔ اس طرح اس جہاز میں سواریوں کی تعداد معمول کی تعداد سے کہیں زیادہ ہو گئی ...... اس جہاز پر اب مسافروں کی تعداد 102 تھی اور عملے کی تعداد اس تعداد کے علاوہ تھی اور مسافر بے آرامی کی حالت میں محو سفر تھے۔ اس جہاز میں کیبن دستیاب نہ تھے اور مسافر اس جہاز کے دو عرشوں پر سفر طے کرنے پر مجبور تھے۔ جہاں پر وہ کھانا پکانے کے لئے آگ بھی جلاتے تھے۔ لہٰذا چاروں طرف دھواں پھیل جاتا تھا اور لوگ الٹیاں کرنے لگ جاتے تھے۔ مسافروں کی زیادہ تر خوراک بسکٹوں ...... ڈبل روٹی اور نمکین گوشت پر مشتمل تھی ...... وہ انتہائی غیر موزوں حالت میں کھانا کھانے پر مجبور تھے۔

مزے کی بات یہ تھی کہ اس تیرتے ہوئے جہنم میں آٹھ ہفتوں کے دوران محض ایک ہی موت واقع ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ایک صحت مند بچے نے بھی جنم لیا تھا۔

ماہ نومبر کے وسط میں خشکی دکھائی دی اور لوگوں کے دل مسرت سے لبریز ہو گئے لیکن وہ غلط مقام پر آن پہنچے تھے۔ جہاز رانی کی ایک غلطی انہیں کئی میل شمال کی جانب لے گئی تھی۔ بہرکیف جہاز کو لنگر انداز کر دیا گیا۔ جہاز کو اب آئندہ اپریل 1621ء تک اسی مقام پر ٹھہرنا تھا۔ پہلے پانچ ہفتوں کے دوران جماعتیں چھوٹی کشتیوں میں ساحل پر جاتی رہیں تاکہ آبادکاری کے لئے مناسب جگہ تلاش کر سکیں لیکن ہر رات وہ دلبرداشتہ ہو کر

ے فلاور جہاز پر واپس پلٹ آتی تھیں۔ موسم دن بدن بد سے بدتر ہوتا چلا جا رہا تھا۔

اچھی اور مناسب جگہ دستیاب نہ ہونے کی بنا پر انہوں نے اپنے آپ کو اس مقام پر آباد کرنے کا فیصلہ کیا جہاں پر آج کل پلے ماؤتھ کا ایک قصبہ واقع ہے۔ 1620ء کے کرسمس کے روز انہوں نے پہلی جھونپڑی تیار کرنی شروع کی۔ ماہ جنوری کے وسط تک تقریباً تمام زائرین ساحل پر آباد ہو چکے تھے۔

پہلا موسم سرما...... اگرچہ یہ مقابلتاً کم سرد تھا ان لوگوں کے لئے کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ چھ ماہ کے اندر اندر ان کی نصف تعداد موت سے ہمکنار ہو چکی تھی۔ ہلاک ہونے والوں میں وہ شخص بھی شامل تھے جسے انہوں نے سفر پر روانہ ہونے سے قبل اپنا گورنر منتخب کیا تھا۔ اس کا نام جان کارور تھا۔ اس کا عہدہ ولیم براڈ فورڈ نے سنبھال لیا تھا۔

انڈین کے ساتھ ابتدائی روابط خوش کن تھے اگرچہ وہ یہ خبر سن کر چونک اٹھے تھے کہ جس قبیلے کے ساتھ ان کے ابتدائی روابط استوار ہوئے اس قبیلے کی نصف تعداد طاعون کے مرض میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو چکی تھی۔ یہ ان لوگوں کی خوش قسمتی تھی کہ یہ لوگ طاعون کی زد میں نہ آئے تھے مگر موسم کی شدت اور نیم فاقہ کشی کی حالت کی وجہ سے ان لوگوں کی کثیر تعداد موت کے منہ میں جا چکی تھی۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ ایک انڈین جس کا نام اسکوانٹو تھا اس نے ان لوگوں کو یہ باور کروا دیا تھا کہ مقامی مکئی کس طرح کاشت کرنی تھی اور جنگلی جانوروں کو کس طرح گھیرنا تھا۔ اگرچہ کچھ آباد کار کاشت کاری کی شد بد رکھتے تھے لیکن ان میں سے کسی نے بھی کبھی بندوق کی گولی نہ چلائی تھی۔

1621ء کا موسم گرما بہتر ثابت ہوا۔ مکئی کی فصل تیار ہو چکی تھی اور غذائی قلت پر کسی حد تک قابو پا لیا گیا تھا۔ اسی برس ماہ نومبر میں ایک چھوٹا جہاز بھی آن پہنچا تھا۔ اس جہاز میں ایک اور جماعت بھی آئی تھی۔ ہم اسے کمک کہہ سکتے ہیں۔ ان کا سربراہ رابرٹ کش مین تھا۔ آباد کار خدا کا شکر ادا کرتے نہ تھکتے تھے کہ اس نے ان پر مہربانی فرمائی تھی کیونکہ موسم گرما ان کے بہتر ثابت ہوا تھا اور ان کی فصل بھی اچھی ہوئی تھی۔ ان کے علم میں یہ بات بھی آئی کہ نئے آنے والے لوگ بھی اپنے ساتھ خوراک کا ذخیرہ نہ لائے تھے۔ جب جہاز واپس انگلستان روانہ ہوا...... کپتان کو واضح ہدایات دی گئیں کہ ان لوگوں پر جو اپنے گھروں میں موجود ہیں زور دیا جائے کہ خوراک سے لدے ہوئے جہازوں کی ضرورت درپیش تھی تاکہ اگلی فصل تیار ہونے تک مہاجرین کی غذائی ضروریات کی تکمیل ممکن ہو سکے۔ مہاجرین کی ایک اور جماعت 1622ء کے موسم بہار میں آن پہنچی لیکن اس جماعت کے پاس بھی خوراک کا ذخیرہ موجود نہ تھا۔

یہ لوگ اپنا زیادہ وقت اپنی مذہبی رسومات کی ادائیگی میں صرف کرتے تھے۔ ان کا طرز زندگی ان کے مذہب سے نزدیک تر تھا۔ ان کی ذاتی زندگی کوئی خاص نہ تھی۔ مرد ایک مخصوص طرز کے حامل بال کٹواتے تھے۔ خواتین مخصوص طرز کے لباس زیب تن کرتی تھیں۔

جھوٹ بولنے والوں کو اور شراب نوشی کرنے والوں کو سزائیں دی جاتی تھیں۔ یوم تشکر ایک بڑا امریکی تہوار تھا۔ اس تہوار کو منایا جاتا تھا۔

اس کے علاوہ کرسمس اور ایسٹر کے تہواروں کے موقع پر روزمرہ کا کام کاج جاری رکھا جاتا تھا۔

گورنر براڈ فورڈ ایک ذہین شخص تھا۔ اس نے ہر ایک فرد کو یہ اجازت فراہم کر دی کہ وہ اپنی زمین خود کاشت کرے...... اپنا شکار خود کرے

......اور جو کچھ اسے سودمند دکھائی دو وہی کچھ سرانجام دے۔

1630ء میں مزید مہاجر آنا شروع ہوئے......اب پیوریٹن نے چند میل کی دوری پر آباد ہونا شروع کر دیا تھا۔ ان کا رہنما جان ون تھروپ تھا۔ نئے آنے والے مہاجر تعداد میں زیادہ تھے اور خوشحال بھی تھے۔ ان کی پہلی جماعت جو ہجرت کر کے یہاں پہنچی تھی وہ گیارہ جہازوں پر سوار ہو کر آئی تھی اور ان کی تعداد نو صد کے قریب تھی۔

1691ء میں پلے ماؤتھ کالونی...... 70 برس پیشتر ہجرت کر کے آنے والے زائرین فادروں کی اولاد......انہوں نے اپنے آپ کو ماسا چونس کی نئی برادری میں مدغم کر لیا تھا۔ لیکن ان لوگوں کے نام ابھی تک یاد رکھے گئے ہیں......کارور......براڈفورڈ......ونسلو...... بریسٹر وغیرہ۔ وغیرہ......ان لوگوں نے اپنے آپ کو ایک نئی سرزمین پر آباد کیا......سفر کی تکالیف برداشت کیں۔

لاطینی امریکہ میں جے سوٹ مشنریوں کی آمد

16 ویں صدی کے اختتام تک...... اسپین جنوبی امریکہ میں اپنی نو آبادی کی ایک بہت بڑی سلطنت قائم کر چکا تھا۔ فرانسسکو پزارو کے 1532ء میں پیرو فتح کرنے کے بعد ہسپانویوں نے شمال کی جانب کولمبیا، وینزویلا، جنوب کی جانب بولیویا...... چلی...... پراگے اور ارجنٹینا میں اپنی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔

1537ء میں ایک ہسپانوی نو آبادی سانتا ماریا ڈی بینس ایریز بحر اوقیانوس کے ساحل پر راوڈی لا پلاٹا کے منہ پر قائم کی گئی۔ یہاں سے ایک جماعت دریائے پراگے کی جانب روانہ ہوئی اور اسنکن گاؤں دریافت کیا۔ اس دوران شمال' مغرب کے فاتحین جنوب' مشرق کے فاتحین سے آن ملے۔ 16 ویں صدی کے اختتام تک اسپین ایک بہت بڑی نو آبادیاتی سلطنت قائم کر چکا تھا جو شمال میں چلی کے جنگلات تک پھیلی ہوئی تھی اور جنوب میں ارجنٹینا تک پھیلی ہوئی تھی۔

برازیل پرتگالیوں کے زیر تسلط تھا۔ نئی دنیا کے اس حصے میں وہ اسپین کا واحد حریف تھا۔ الوارس ڈی کالبرل نے 1500ء میں برازیل کے ساحل پر قدم رکھا تھا۔ اس نے کئی تجارتی چوکیاں بھی قائم کی تھیں۔

پرتگالی تاجروں کے لئے انڈین سب سے بڑا مسئلہ تھے۔ گورانی...... کبھی کبھار انہیں ٹیوپی انڈین کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے جو برازیل میں آباد تھے...... وہ باہمت اور باحوصلہ تھے۔ یہ لوگ آدم خور بھی تھے اور اکثر حیران ہوتے تھے کہ پرتگالی جو اکثر لوگوں کو ہلاک کرتے رہتے تھے وہ ان لوگوں کو کھاتے کیوں نہ تھے۔

1534ء تک یہاں پر محض ایک درجن تجارتی چوکیاں باقی رہ گئی تھیں اور وہ بھی اپنی بقا کی جنگ میں مصروف تھیں۔ ان میں سے ایک سو پالو تھی جو برازیل کے ساحل پر واقع تھی...... ہسپانوی نو آبادی اسنکن سے 700 میل مشرق کی جانب واقع تھی۔

سو پالو پرتگالی اور ہسپانوی مہم جو حضرات کا مرکز تھا۔ اس کے علاوہ یہاں پر تارکین وطن بھی آباد تھے جو انڈین کے ساتھ شادیاں بھی رچاتے تھے۔ لاطینی سپاہیوں اور گورانی آدم خوروں کے باہمی ملاپ سے جو نسل پیدا ہوئی وہ سخت جان ہونے کے علاوہ خونی ذہن کے حامل۔ سرکش۔ سورش پسند اور غارت گر تھی۔ وہ لوگ پالسٹس کے نام سے جانے جاتے تھے...... ایک ایسا نام جو لاطینی امریکہ کے لئے دہشت کا نشان بن گیا تھا۔

بینس ایریز اور اسنکن میں ہسپانویوں کی دولت...... اور برازیل میں پرتگالیوں کی دولت سونے پر منحصر نہ تھی جس طرح پیرو اور میکسیکو میں تھی بلکہ زراعت پر منحصر تھی۔ دولت کی پیدائش چینی...... تمباکو...... برازیلی لکڑی...... اور مٹی سے کی جاتی تھی۔ لیکن کامیاب کاشتکاری محنتی مزارعین درکار رکھتی ہے اور یہ مزارعین انڈین غلاموں کی شکل میں دستیاب ہو جاتے تھے۔ پالسٹس بھی اس امر سے بخوبی واقف تھے۔

پالسٹس بذات خود کھیتوں میں کام نہیں کرتے تھے۔ وہ مہم جوؤں کی رہنمائی کرتے ہوئے انہیں جنگل کے دل میں لے جانا پسند کرتے تھے تاکہ وہ انڈین کو قابو کرسکیں۔ وہ شکار کرتے تھے۔ اکثر وہ سالہا سال اندرون برازیل میں گزار دیتے تھے۔ اس دوران وہ سونے کی کانیں تلاش کرتے تھے۔ اور انڈین کے دیہاتوں پر چھاپے مارتے تھے۔ وہ شکار کرتے تھے...... مچھلیاں پکڑتے تھے اور مختلف قبیلوں کے ہاں چوریاں کرتے تھے۔

کوئی بھی انڈین جو سوپالو کی معیشت کے لئے کارآمد ثابت نہ ہوتا تھا اس کو برازیلی ساحل کے ساتھ دیگر نوآبادیوں کے کاشت کاروں کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا تھا۔ زمینوں کے مالکان پر جلد ہی یہ حقیقت آشکار ہو چکی تھی افریقہ سے نیگرو غلام درآمد کرنے کی بجائے ان انڈین کو استعمال کرنا زیادہ سستا پڑتا تھا۔

پالسٹس خوف کی علامت بنے ہوئے تھے۔ ان کی نامعقول حرکتوں کے خلاف کوئی بھی آواز نہ اٹھاتا تھا ماسوائے جے سوٹ مشنریاں۔

مشنریاں...... بالخصوص جے سوٹ مشنریاں ہسپانوی اور پرتگالی فاتحین کے ہر ایک معرکے میں ان کی شریک کار ہوتی تھیں۔

پراگے میں اسنکسن کے مقام پر اہسپانوی آبادکار بالخصوص خوشی سے دوچار ہوئے تھے جبکہ 1587ء میں ان کے علاقوں میں جے سوٹ مشنریاں منظر عام پر آئی تھیں۔ اس مقام پر...... جیسے برازیل میں سوپالو کے مقام پر...... خوش قسمتی گنے...... مکئی اور دیگر فصلوں میں پنہاں تھی۔ زمینوں کے مالکان یہ تصور کرتے تھے کہ مشنریوں کی آمد کی بدولت انڈین زیادہ اطاعت شعار بن جائیں گے اور کھیتوں میں مزید بہتر خدمات سرانجام دیں گے۔ زمینداروں کو اس وقت دھچکا لگا جب انہیں یہ محسوس ہوا کہ جے سوٹ ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتے جس کے تحت وہ انڈین کو در غلائیں یا ان کے ساتھ ظالمانہ سلوک روا رکھیں۔ اس وقت سے تمام تریورپی آبادکار جے سوٹ مشنریوں سے عداوت رکھنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ عداوت اور نفرت اس حد تک بڑھی کہ اس پر قابو پانا مشکل نظر آنے لگا۔ دیگر برائیوں سے باز رکھنے کے علاوہ جے سوٹ مشنریوں نے کھلم کھلا الفاظ میں غلامی کے خلاف تعلیم دینا شروع کر دی اور بالآخر وہ ہسپانوی اور پرتگالی نوآبادیوں میں انڈین غلامی کو خلاف قانون قرار دلوانے میں کامیاب ہو گئے۔ تاہم ابھی بھی ان غلاموں کو رکھنے کی اجازت فراہم تھی جو تاوان میں ہاتھ لگے ہوں...... یہ ایک قانونی خلا تھا جس سے پالسٹس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

1610ء تک جے سوٹ دریائے پراناپا پسما جو کہ صوبہ گیرا میں واقع تھا پر اپنا مشن پورے زور و شور سے جاری کر چکے تھے۔ یہ صوبہ سوپالو اور اسنکسن کے درمیان واقع تھا۔ گورانی انڈین ہسپانیوں اور پالسٹس سے محفوظ رہنے کی خاطر پادریوں کا رخ کرتے تھے۔ پادری بجائے اس کے کہ انڈین کو یہ تلقین کرتے کہ وہ زمینداروں کے لئے اپنی خدمات سرانجام دیں...... پادری ہر ممکن یہ کوشش کرتے کہ وہ ان کو سفید فام آبادکاروں کی دسترس سے دور رکھیں۔

یہ مشنریاں اپنی مدد آپ کے اصول کے تحت روبہ عمل تھیں۔ ان کو جو کچھ بھی میسر آتا اسے وہ ایک مشترکہ اسٹور میں ذخیرہ کرتی تھیں اور ضرورت کے مطابق اسے اپنے استعمال لاتی تھیں۔ جے سوٹ فادر اگرچہ عیسائیت کی تبلیغ میں مصروف تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ دنیاوی کام سرانجام دینے سے بھی نہیں ہچکچاتے تھے۔ انہوں نے انڈین کو دستکاری سکھائی...... زراعت سکھائی اور دیگر امور بھی سکھائے۔

سفید فام آبادکار غصے سے لال پیلے ہو جاتے تھے جب وہ یہ دیکھتے تھے کہ جے سوٹ انڈین کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا اور اپنے لئے کام

دھندا سرانجام دینا سکھا رہے تھے۔ پالستس نے یہ افواہ پھیلا دی کہ جے سوٹ فادروں کے ہاتھ سونے کی خفیہ کانیں لگ چکی تھیں اور انڈین کی قیمت پر وہ اپنے آپ کو امیر کر رہے تھے۔ انہوں نے یہ افواہ بھی پھیلا دی کہ اسپین سے آزادی حاصل کرنے کی سازش بھی کی جا رہی تھی۔

ایک طرف یہ سب کچھ جاری تھا تو دوسری طرف جے سوٹ فادر اپنا تبلیغی مشن جاری رکھے ہوئے تھے اور اپنی ذمہ داری زور شور سے نبھا رہے تھے۔ وہ پیدل ہی جنگل کی جانب نکل جاتے تھے اور انڈین کو تلاش کرتے تھے تاکہ انہیں اپنے مشن کی دعوت دے سکیں۔ سانپ ان پر حملہ آور ہوتے تھے...... جنگلی درندے انہیں اپنا نشانہ بناتے تھے...... مچھر اور دیگر حشرات الارض انہیں کاٹتے تھے...... ایک پادری کی ٹانگیں مچھروں اور دیگر حشرات الارض کے کاٹنے سے اس قدر متاثر ہوئی تھیں کہ اس کی اپنی جلد کا ایک انچ حصہ بھی نظر نہ آتا تھا۔

زبان ایک بہت بڑا مسئلہ تھی۔ جنوبی افریقہ میں تقریباً 85 اقسام کی زبانیں بولی جاتی تھیں۔ اگر ایک فادر کسی گاؤں کے ایک درجن افراد میں تبلیغ سرانجام دینا چاہتا تھا تو اس کے لئے ایک درجن زبانوں پر عبور حاصل کرنا ضروری تھا۔ عام طور پر فادر کسی ترجمان کی خدمات حاصل کرنے پر مجبور تھے۔

مابعد پادریوں نے ان لوگوں کو اسپانوی زبان سکھا دی تھی جو عیسائیت قبول کر چکے تھے۔

فادر اس امر پر سختی سے یقین رکھتے تھے کہ خدا ان کی کاوش اور جدوجہد کو دیکھ رہا تھا۔ ان ڈائریوں میں کئی ایسی داستانیں رقم ہیں جو کسی معجزے سے کم نہیں ہیں۔ انہوں نے خدا سے بارش کی دعا کی...... خدا نے بارش برسا دی...... انہوں نے خدا سے بارش روکنے کی دعا کی...... خدا نے بارش روک دی...... جنگلی جانور سدھائے گئے...... دعا کی بدولت ان کے زخم ٹھیک ہوئے اور ان پر حملہ آور بیماریاں رفع ہوئیں۔ برازیل کے پالستس کو جب یہ احساس ہوا کہ گورانی غلامی کے میدان سے غائب ہو رہے تھے اور مشنریوں کے تحفظ میں آ رہے تھے تو وہ انتہائی مشتعل ہوئے۔ تقریباً 1630ء سے پولستس نے مقدس آبادیوں پر حملے کرنے شروع کر دیے۔ وہ پادریوں کو ہلاک کر دیتے اور عبادت کرنے والوں کو اٹھا کر لے جاتے تھے۔ کبھی کبھار وہ پادریوں کا حلیہ اختیار کر لیتے تھے اور دھوکے کے ساتھ انڈین کو گرفتار کر کے لے جاتے تھے۔

پولستس نے انڈین کے درمیان یہ افواہ بھی پھیلا دی تھی کہ جے سوٹ ان انڈین کو دھوکہ دیتے تھے جو عیسائیت قبول کر چکے تھے اور ان کو دھوکہ دہی کی بنا پر پولستس کے ہاتھ فروخت کر دیتے تھے اور پولستس سے رقم وصول کرتے تھے۔ کبھی کبھار انڈین ان افواہوں پر یقین کر لیتے تھے اور فادروں پر حملہ آور ہونے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے اور کئی مرتبہ پادری ان کے ہاتھوں ہلاک بھی ہو جاتے تھے۔

مونٹویا...... جوان پادریوں کا سربراہ تھا اس نے ہسپانوی گورنر سے مدد کی درخواست کی۔ گورنر نے جواب دیا کہ وہ پولستس کی سرکوبی نہیں کر سکتا تھا...... وہ اس سلسلے میں بے اختیار تھا۔ لہٰذا مونٹویا نے بذات خود ہی کوئی نہ کوئی کارروائی سرانجام دینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ پانچ صد میل کا سفر طے کرتے ہوئے جدید ارجنٹینا کے علاقے کا رخ کیا جائے۔

اس نے سات صد چھوٹی کشتیوں میں اپنے سفر کا آغاز کیا جن میں 12000 افراد سوار تھے۔ دریا کچھ گھنے جنگلات سے بھی ہو کر گزرتا تھا۔ پہلے 90 میل کا سفر بخوبی طے کر لیا گیا لیکن اس کے بعد سانحہ پیش آ گیا۔ پانی بپھر چکا تھا اور کئی ایک خاندان پانی میں بہہ چکے تھے۔ نقصان عظیم

تھا لیکن لوگوں کی اکثریت اس سانحہ کے اثرات سے محفوظ رہی۔ اس کے بعد مونٹویا اور اس کا قافلہ بخوبی سفر سرانجام دیتا رہا حتیٰ کہ وہ جنوب کے مشنریوں کے پاس جا پہنچے۔

یہاں پر بھی زندگی سہل نہ تھی۔ مشنریوں جو پہلے سے ہی یہاں پر روبہ عمل تھیں ان کے پاس خوراک کا اتنا ذخیرہ موجود نہ تھا کہ وہ کسی کا پیٹ بھر سکتے اور بہت سے لوگ فاقہ کشی کے ہاتھوں موت کا شکار ہو گئے۔ اس کے بعد کافی زیادہ زمین پر کاشتکاری سرانجام دی گئی تا کہ اس قسم کا سانحہ دوبارہ پیش نہ آئے۔

اسی دوران...... کرسمس کا تہوار شروع ہو چکا تھا...... پولسٹس نے شمالی مشنریوں کے انڈین کے ایک گروپ کو گرفتار کر لیا جو اس لئے اکٹھے ہوئے تھے کہ وہ بھی جنوب کی جانب رخت سفر باندھ سکیں۔

مونٹویا نے اب شاہ فلپ II سے درخواست کی جو اسپین اور پرتگال کا حکمران تھا کہ انہیں تحفظ فراہم کیا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ مونٹویا کا خط لسبن کے نزدیک جے سوٹ کے کسی دشمن کے ہتھے چڑھ گیا تھا اور اس نے اس خط کو ضائع کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا تھا اور خط بحفاظت بادشاہ تک پہنچ گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جے سوٹ کو آتشین اسلحہ رکھنے کی اجازت فراہم کر دی گئی۔

وہ جے سوٹ جو مشنریوں میں خدمات سرانجام دینے سے پیشتر فوجی سپاہی رہ چکے تھے ان کو پراگے روانہ کیا گیا تا کہ وہ اپنے بھائیوں کو اسلحے کے استعمال کی تربیت فراہم کر سکیں اور مشنریوں کو فوجی بنیادوں پر استوار کر سکیں۔ تمام تر انڈین مردوں کو جنگی تربیت فراہم کی گئی۔ یہ تربیت روزانہ فراہم کی جاتی تھی۔ کچھ مشنریوں کو توپ خانہ بھی فراہم کیا گیا تھا۔

جلد ہی جے سوٹ کی رضا کار فوج تیار ہو گئی...... یہ اس علاقے کی واحد ملٹری فورس تھی۔ وہ اس قدر موثر ثابت ہوئی کہ ہسپانوی گورنر سفید فاموں کے جھگڑے نپٹانے کیلئے اکثر مشنری کی اس فوج کی خدمات حاصل کرتا تھا۔

پولسٹس نے اس نئی تیار کردہ رضا کار فوج پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی لیکن ان کو منہ کی کھانی پڑی اور عظیم نقصان سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ اس کے بعد انہیں حملہ آور ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ انہوں نے اپنی تمام تر توجہ شمال برازیل کی جانب مبذول کروائی جہاں پر مشنریاں مکمل طور پر تحفظ کی چھتری تلے نہ تھیں۔

اب چونکہ مشنریاں حملہ آوروں سے محفوظ تھی لہٰذا ان کی آبادیاں خوب پھلی پھولیں۔ جے سوٹ فادروں کے علاوہ ان کی آبادیوں سے سفید فاموں کو خارج کر دیا گیا۔

انڈین کو دستکاری کے میدانوں میں تربیت فراہم کی گئی اور وہ اپنی روزی خود کمانے کے قابل ہوئے۔ وہ مخصوص قسم کے درختوں کے پتے اکٹھے کرتے...... ان کو سگریٹ نوشی کے لئے خود بھی استعمال کرتے...... ان کو خشک کرتے اور برآمد کیلئے پیک بھی کرتے۔ پراگے کی چائے براعظم کے تمام تر جنوبی حصے میں ایک عالمگیر مشروب کی حیثیت اختیار کر گئی۔ یہ لوگ کشتیاں بھی تیار کرنے لگے جو فاضل سامان بذریعہ دریا دیگر قصبوں تک پہنچاتیں اور اس طرح تجارتی سرگرمیاں بھی شروع ہو گئیں۔ لوہے کے بدلے سامان کا تبادلہ ہوتا تھا۔

جے سوٹ نے انڈین کو مصوری کے علاوہ آلات موسیقی تیار کرنا بھی سکھائے۔ گرجا گھروں کو بھی خوبصورت بنایا گیا۔ پتھر اور لکڑی تراش کران کو گرجا گھروں کی زینت بنایا گیا اور ان کو خوبصورتی سے نوازا گیا۔

جے سوٹ مشنریاں اب کامیابی کے ساتھ روبہ عمل تھیں۔ پولسٹس جنوبی مشنریوں کی قوت سے خائف تھے لہٰذا انہوں نے اب اپنی توجہ شمالی علاقہ جات کی جانب مبذول کروالی تھی۔ پرتگالی ہسپانوی علاقوں میں مشنریوں پر حملہ آور ہوتے تھے۔ اہسپانویوں اور پرتگالیوں کے درمیان تناؤ اور کھچاؤ کی صورت حال بڑھتی چلی جارہی تھی۔

گوریلا جنگ شروع ہوچکی تھی۔ ہسپانوی اور پرتگالی انڈین مشنریوں کے خلاف اپنے آپ کو متحد کر رہے تھے۔ جلد ہی انڈین شکست سے دوچار ہوگئے۔

اس دوران جے سوٹ رہنما 1750ء میں معاہدوں کو ختم کروانے کے لئے کام سرانجام دے رہے تھے۔ 1761ء میں وہ کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ سات تباہ حال مشنریاں اسپین واپس چلی گئیں۔ لیکن نام نہاد "جے سوٹ جنگ" مشنریوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوئی۔ جے سوٹ دشمن یہ ثابت کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے کہ مشنریاں تاج کے ساتھ بے وفائی کا مرتکب پائی جارہی تھیں۔ فادروں پر کئی اقسام کے الزامات عائد کئے جارہے تھے۔ حتیٰ کہ ان پر یہ الزام بھی عائد کیا گیا کہ وہ ایک آزاد ریاست کے قیام کی سازش میں ملوث تھے۔ شاہ چارلس III پہلے ہی مشنریوں کی قوت اور دولت سے خائف تھا۔ لہٰذا اس نے مشنریوں کے خلاف زہریلے پراپیگنڈے کو انتہائی ہمدردی کے ساتھ سنا جس کا پرچار اس کے دربار میں کیا گیا۔

1767ء میں اس بالآخراس نے کارروائی سرانجام دے ڈالی۔ شاہی احکامات کے تحت جے سوٹ کو اسپین سے بے دخل کردیا گیا۔ جنوبی امریکہ میں فادروں کے ساتھ مجرموں جیسا سلوک کیا گیا اور ان کو فوری طور پر نکل جانے کے احکامات سنائے گئے۔ لہٰذا وہ اپنا ساز وسامان بھی اپنے ہمراہ نہ لے جاسکے۔

عام پادریوں نے جے سوٹ فادروں کی جگہ لینے اور چرچ کے امور کی سرانجام دہی کی کوشش کی لیکن وہ بری طرح ناکام ہوئے۔ انڈین کی حالت غلاموں سے قدرے بہتر ہوچکی تھی لیکن پولسٹس جلد ہی ان پر دوبارہ حاوی ہوگئے۔

کچھ گورانی دوبارہ جنگلوں کی جانب چلے گئے اور اپنی پہلی زندگی کی جانب لوٹ گئے۔ کچھ گورانی تباہ حال مشنریوں کی باقیات کو گلے لگائے رہے لیکن وہ بھی مایوسی کا شکار ہوئے۔ آج بھی انڈین ان فادروں کی بات کرتے ہیں اور ان کا نام عزت واحترام اور پیار ومحبت سے لیتے ہیں۔ وہ آج بھی ان کی واپسی کی امید رکھتے ہیں۔

شیطان کی شاہراہ

1533ء میں نشیبی کیلی فورنیا کی دریافت ہوئی۔ اس کی دریافت کے 160 سے زائد برس بعد تک یہی یقین کیا جاتا رہا کہ نشیبی کیلی فورنیا ایک ایسا جزیرہ تھا جو میکسیکو کے مغربی ساحل سے پرے واقع تھا۔ بہت سی کوششیں سرانجام دی گئیں کہ نشیبی کیلی فورنیا میں ایک یورپی نوآبادی قائم کی جائے لیکن کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ حتیٰ کہ 1681ء میں لاپاز کے مقام پر ڈون ازی ڈورو اٹون ڈو وائے اینٹیلن نے ایک بستی قائم کی۔

ڈون اٹون ڈو کی جماعت کا ایک رکن ایک جے سوٹ پادری تھا جس کا نام ایوز بائیو فرانسسکو کینو تھا۔ وہ بطور ایک مشنری اور شاہی کاسمو گرافر (کائنات کے عام خدوخال اور نقشے بنانے والا) کی حیثیت سے اس مہم میں شامل تھا۔ فادر کینو کا تعلق اٹلی سے تھا۔ وہ 1645ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا نام چینی تھا کبھی کبھار وہ چینو کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا جو امریکہ میں بالآخر کینو بن گیا۔

برسوں پیشتر جبکہ ابھی ایک طالب علم تھا کینو سخت علیل ہو گیا تھا۔ اس نے یہ عہد کیا تھا کہ اگر وہ صحت یاب ہو گیا اور اس کی زندگی بچ گئی تب وہ سوسائٹی آف جیسس میں شمولیت اختیار کرے گا اور نئی دنیا میں انڈین مشن میں شمولیت اختیار کرے گا۔ اس نے 20 نومبر 1665ء کو جے سوئس میں شمولیت اختیار کر لی لیکن 13 برس پیشتر اس نے اپنی خواہش کو محسوس کیا اور اسے نیو اسپین انڈین کے درمیان خدمات کی سرانجام دہی کے لئے روانہ کر دیا گیا۔

یہ قافلہ کیم اپریل 1682ء کو نشیبی کیلی فورنیا کے مشرقی ساحل پر جا پہنچا۔ کینو نے اپنی یادداشتوں میں تحریر کیا کہ ہمارا پہلا اقدام یہ تھا کہ ہم ایک بڑی صلیب تیار کریں اور اسے پہاڑ کی چوٹی پر نصب کریں۔ لہٰذا ایک بڑی صلیب تیار کی گئی اور پہاڑ کی چوٹی پر نصب بھی کی گئی۔ اس کے بعد وہ سونے کیلئے اپنے بحری جہاز کی جانب روانہ ہو گئے۔

6 اپریل سے اس جماعت نے ساحل پر ہی رہائش اختیار کر لی اور وہیں پر سونا بھی شروع کر دیا۔ ایک روز وہ لکڑیاں کاٹ رہے تھے کہ اسپانوی اچانک انڈین کی ایک جنگجو جماعت کو دیکھ کر حیران رہ گئے جو ان کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ان کے ارادے خطرناک تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تیر کمان اور دیگر ہتھیار بھی موجود تھے۔

اسپانوی بھی ان لوگوں پر فائر کھولنا چاہتے تھے لیکن فادر کینو اور ایک دوسرے پادری فادر گونی نے ان کو منع کیا اور فائر کھولنے سے روکا۔ اس کے بعد غیر مسلح دو جے سوٹ انڈین کی جانب بڑھے۔ ان کے ہاتھوں میں انڈین کے لئے تحائف تھے جو مکئی اور بسکٹوں پر مشتمل تھے۔ پہلے پہل انڈین نے جارحانہ رویے کا مظاہرہ کیا اور جنگلی درندوں جیسا رویہ اپنائے رکھا جیسے وہ سفید فام لوگوں کے ہاتھوں سے کچھ بھی وصول کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔ تاہم جب اشیائے خورد و نوش زمین پر رکھ دی گئی اور انہوں نے اسے اٹھایا اور ان کا ذائقہ چکھا تب ان کا خوف و ہراس دور ہو گیا اور انہوں نے

بھی پادریوں کو جوابی تحائف سے نوازا۔

اگلے چند دنوں کے دوران کئی ایک مزید انڈین ہسپانوی کیمپ آتے رہے۔ اب وہ دوستانہ رویے کے حامل بن چکے تھے اور ان سے مکئی کے تحفے کے حصول کی درخواست کرتے رہے جس کو وہ بقول فادر کینو اس طرح خوشی کے ساتھ کھاتے تھے جیسے مٹھائی کھائی جاتی ہے۔ ان کو مکئی دینے کے بعد اس نے انہیں صلیب کا نشان بنانے کا طریقہ سمجھایا۔

17 اپریل کو فادر کینو نے اپنی یادداشت میں تحریر کیا کہ:۔

''یہ ایک اچھی سرزمین ہے۔ اس کا درجہ حرارت بھی خوشگوار ہے۔ یہاں پر مچھلی...... ہرنوں...... پرندوں...... خرگوشوں اور جنگلات وغیرہ کی بہتات ہے۔ ہم نے مکئی اور خربوزے کی فصل کاشت کر لی ہے اور مجھے یقین ہے کہ چند ماہ کے اندر اندر ہم انڈین کو عیسائی بنانے کا کام بھی شروع کر دیں گے۔''

امریکہ آنے کی کینو کی خواہش اور انڈین کے درمیان رہ کر خدمات سرانجام دینے کی خواہش پوری ہو چکی تھی۔ اس نے نشیبی کیلی فورنیا کے انڈین کے ساتھ پہلی ہی ملاقات کے دوران ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کرنے کا بندوبست سرانجام دیا تھا۔ اس نے ان کی زبان سیکھنے جیسا مشکل ترین عمل بھی شروع کر دیا تھا اور آہستہ آہستہ ان کا اعتماد اور محبت جیتنا چاہتا تھا۔

اس کے بعد کچھ ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے فادر کینو کے خوابوں کو بکھیر کر رکھ دیا۔ سپاہی انڈین پر اعتماد نہ کرتے تھے۔ ایک ملاح کیمپ سے کچھ دور چہل قدمی کے لئے نکلا تھا اور مابعد وہ مردہ پایا گیا تھا۔ اس سپاہی کو کسی انڈین نے اپنے تیر کا نشانہ بنا ڈالا تھا۔ اس انڈین کو قیدی بنا لیا گیا تھا اور ایک جہاز پر اس کو محصور کر دیا گیا تھا۔

جلد ہی انڈین کا ایک گروپ کیمپ آن پہنچا۔ ان کے بارے میں یہی قیاس کیا جا رہا تھا کہ وہ اپنے انڈین قیدی کو چھڑوانے کیلئے آئے تھے۔ یقیناً انہوں نے کسی جارحانہ رویے کا مظاہرہ نہ کیا اور خوش مزاجی اور دوستانہ ماحول میں آبادی کی جانب بڑھے۔

ہسپانوی ایڈمرل نے حکم جاری کیا کہ انڈین کو خوش آمدید کہا جائے...... ان کا خیر مقدم کیا جائے اور انہیں ہسپانوی کھانے کھانے کی دعوت دی جائے جسے وہ ازحد پسند کرتے تھے۔ جوں ہی وہ انڈین اپنی اپنی نشست پر بیٹھ گئے اور کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے اور کھانے سے لطف اندوز ہونے لگے اس دوران کسی نے بھی ان سے ان کے آنے کا مدعا دریافت کرنے کی زحمت گوارا نہ کی بلکہ سپاہ کو حکم دیا گیا کہ وہ ہلکے توپ خانے کے ساتھ ان پر گولہ باری کرے۔ دس انڈین ہلاک ہو گئے جبکہ وہ انڈین جنہوں نے فرار ہونے کی کوشش کی وہ شدید زخمی ہوئے۔

اس فوجی کارروائی کی بدولت پادریوں کی تمام تر محنت اکارت ہو گئی۔ انہوں نے کئی ماہ تک صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے...... مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جو کامیابی حاصل کی تھی وہ ایک لمحہ میں اکارت ہو گئی۔ انڈین آمادہ بغاوت ہو گئے۔ اور کچھ ہی عرصے کے بعد لاپاز اس مشن سے دست بردار ہو گیا۔

لیکن فادر کینو اور اس کی ساتھی مشنریاں اپنے مشن سے دست بردار ہونے کیلئے تیار نہ تھیں۔ ایک اور مشن...... سینٹ برونو ساحل کے

ساتھ قائم کیا گیا جو شمال کی جانب واقع تھا اور ایک آبادی بسانے کی دوبارہ کوشش کی گئی۔

ایک مرتبہ پھر فادر کینو نے انڈین کے ساتھ دوستانہ مراسم استوار کئے۔ ان کو زمین کو کاشت کاری کے لئے تیار کرنا سکھایا اور مختلف فصلوں کو کاشت کرنے کے طریقے بھی سمجھائے۔

ایک برس کے اندر اندر اس نے ایک مشن سکول بھی قائم کر لیا تھا۔ انڈین کے بچے اندرون علاقے سے لمبا سفر طے کرتے ہوئے اس اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آتے تھے۔ فادر کینو نے بذات خود بھی دور دراز کے علاقوں کے سفر طے کئے اور ان علاقوں کے مکینوں کو انجیل کی تعلیم دی۔ وہ جس انڈین سے بھی ملتا اس سے دوستی استوار کرنے کی کوشش کرتا بالخصوص بچوں کے ساتھ دوستی کا رشتہ استوار کرتا۔ ایک چھوٹا بچہ جس کی عمر محض تین برس تھی اس نے فادر کینو کے ہمراہ ہر ایک مقام کا سفر طے کیا اور اس کے ساتھ اس کے ہسپانوی گھوڑے پر سواری کی۔

جلد ہی فادر کینو اس نکتہ نظر کا حامل ہو گیا کہ انڈین عیسائیت کی جانب راغب ہو سکتے تھے۔ اس کے بعد ایک اور دھچکا فادر کینو کا منتظر تھا ......حکام بالا سے یہ اطلاع موصول ہوئی کہ نشیبی کیلی فورنیا کی تمام تر مشنریاں اپنی خدمات کی سے دست بردار ہو جائیں۔

پادریوں کو اس خبر پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ لہٰذا فادر کینو فوری طور پر میکسیکو کی جانب روانہ ہوا تاکہ حقیقت سے باخبر ہو سکے اور اگر ضروری ہو تو وائسرائے کو اس امر کیلئے راغب کرے کہ وہ اسے کیلیفورنیا کے انڈین کو عیسائی بنانے کے کام کو جاری رکھنے کی اجازت فراہم کرے۔ لیکن جب فادر کینو میکسیکو پہنچا تو ایک پروانہ اس کا منتظر تھا جو شاہ اسپین کی جانب سے تھا۔ اس کے حکم کے تحت فادر کینو کی ٹرانسفر براعظم میں کر دی گئی تھی جہاں پر اسے میکسیکو کے سیری اور گیاما انڈین کے درمیان نئی مشنریاں قائم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔

فادر کینو کے پاس کوئی چارہ نہ تھا ماسوائے بادشاہ کے احکامات کی تعمیل کرنے کے جس کے بارے میں وہ یہ یقین رکھتا تھا کہ وہ مغربی دنیا پر عوام اور خدا کی جانب سے حکومت کر رہا تھا۔ لیکن انڈین کے لئے اس کی محبت جسے وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا ابھی تک انتہائی مضبوطی کے ساتھ اس کے دل میں موجزن تھی اور اسے امید تھی کہ کسی نہ کسی روز اسے وہاں واپس جانے کی اجازت فراہم کر دی جائے گی اور وہ اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ضرور کامیاب ہو گا جس کا آغاز اس نے کر رکھا تھا۔

فادر کینو کو پیمر یا آلٹا کا ریکٹر (حلقے کا پادری/ناظم) مقرر کر دیا گیا...... یہ بالائی پیما انڈین کی سرزمین تھی۔ یہ پیما لوگ ایک ایسے علاقے میں آباد تھے جو آج مغربی میکسیکو کہلاتا ہے اور جو آج جنوبی اری زونا کہلاتا ہے۔ یہ ایک وسیع اور خشک ملک تھا۔ اس میں پہاڑی علاقے بھی تھے اور صحرا بھی تھے۔ انتہائی جنوب اور مشرق میں دریائے سان میگوئل واقع تھا۔ شمال' مشرق کی جانب ڈریگون پہاڑیاں اور سان پیڈرو تھا۔ شمال کی جانب دریائے گیلا واقع تھا۔ انتہائی مغرب کی جانب سمندر واقع تھا جو کیلی فورنیا کے بڑے سمندر کا حصہ تھا۔

پہلے بھی مشنریاں پیمر یا آلٹا کا دورہ کر چکی تھیں اور اس کے نتیجے میں ہزاروں انڈین عیسائیت قبول کر چکے تھے اور کئی ایک مشن بھی قائم ہو چکے تھے۔

سان میگوئل کے کناروں پر...... کیوکیورپ سے تقریباً پندرہ میل شمال کی جانب میں بسنے والے انڈین کچھ عرصہ سے یہ خواہش کر رہے

تھے کہ ان کے درمیان ایک فادر موجود ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ اس وقت ہسپانوی تسلط کے انتہائی شمال میں واقع تھا۔ بہرکیف فادر کینو نے اپنا ہیڈ کوارٹر کوساری میں قائم کیا جہاں پر نیوسٹرا سینورا ڈی لاس ڈولورس کا مشن قائم کیا۔

اس ہیڈ کوارٹر سے اس نے مختلف قبیلوں کو عیسائی بنانے کا کام جاری رکھا۔

فادر کینو منظم طریقے سے اپنی خدمات سرانجام دیتا تھا۔ وہ آبادی کے لوگوں کو اکٹھا کرتا...... ان کو عیسائی نظریات سے روشناس کرواتا...... اور چرچ کی تعمیر کو ممکن بناتا۔ اس کے علاوہ اس نے انڈین کو بھیڑ' بکریاں' گھوڑے اور دیگر مویشی پالنے کی بھی ترغیب دی۔ اس کے علاوہ اس نے دور دراز علاقوں کے ان گنت سفر طے کئے۔ وہ یہ سفر گھوڑے پر سوار ہو کر سرانجام دیتا تھا کیونکہ اسے ان علاقوں میں آباد قبائل کی جانب سے علاقے کا دورہ کرنے کی درخواستیں موصول ہوتی تھیں جنہوں نے اس مہربان دل کے فادر کے بارے میں سن رکھا تھا اور وہ اسے دورہ کرنے کی دعوت دیتے رہتے تھے اور اس کے جواب میں فادر کینو کو دور دراز کے علاقوں کے دورے کرنے پڑتے تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نے بخوبی کامیابی حاصل کی تھی۔

مابعد دسمبر 1690ء میں ایک اور فادر کینو کی معاونت کے لئے آن پہنچا۔ اس فادر کا نام جان ماریا سلواتیرا تھا۔ دونوں نے باہم مل کر ڈولورس کے شمال اور جنوب کا رخ کیا۔

سارک کے مقام پر جو آج کل کے اری زونا کی سرحد سے زیادہ دور نہ تھا...... کینو اور سلواتیرا کا خیر مقدم انڈین قاصدوں نے کیا جو شمال کے دور دراز کے علاقوں سے آئے تھے۔ انہوں نے اپنی تیار کردہ صلیبیں اٹھا رکھی تھیں۔ انہوں نے فادروں سے درخواست کی کہ وہ ان کے علاقوں کا دورہ کریں اور انہیں زندگی کی نئی طرز سے روشناس کروائیں۔

فادر کینو سارک کے مقام سے دور جانا پسند نہیں کرتا تھا لیکن فادر سلواتیرا ان لوگوں کے ہاتھوں میں صلیبیں دیکھ کر اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے فادر سارک سے درخواست کی کہ ان انڈین کے ہمراہ جانا چاہئے۔ تیوماکاکوری کے مقام پر دریائے سانتا کروز سے آئے ہوئے قبیلے کا سرداران کے انتظار میں مصروف تھا۔ اس مقام پر پہلی عیسائی سروس اری زونا کی سرزمین پر منعقد ہوئی۔ فادر کینو نے اس سرزمین پر جو مشن قائم کیا تھا اس کے کھنڈرات آج بھی بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں۔

شمالی انڈین کے ساتھ ملاقات بہت اہم اثرات کی حامل ثابت ہوئی۔ سوبائی پریز...... جن کا سردار ایل کورو تھا...... وہ فادر کینو کا ایک وفادار پیروکار ثابت ہوا۔ اس نے پیا قوم کے ایک حصے کی بنیاد رکھی۔ وہ دریائے سان پیڈرو اور سانتا کروز کے ساتھ واقع دیہاتوں میں مقیم رہے۔ انہوں نے اپنے دشمنوں اپاچیوں کے خلاف اپنے گھروں کو مضبوط تر بنا رکھا تھا۔

فروری 1698ء میں اپاچیوں نے کاکوس پیرا کے مقام پر مشن پر حملہ کیا اور نہ صرف چرچ کی عمارت جلا ڈالی بلکہ فادر کا مکان بھی جلا ڈالا۔ اسپین کے علاقائی کمانڈر نے اپاچیوں کے خلاف کارروائی کا فیصلہ کیا اور فادر کینو سے کہا کہ وہ ایل کورو اور شمال کے دیگر پیا کو راغب کرے کہ وہ مشترکہ دشمن پر حملہ آور ہونے میں معاونت کریں۔

اس کے فوراً بعد اپاچی سانتا کروز پر حملہ آور ہوئے (جواب فیئر بنیک کہلاتا ہے)۔ یہ ایل کورو کا اپنا ایک مضبوط گڑھ تھا۔ جوں ہی اپاچی

اپنی فتح کا جشن منا رہے تھے...... ایل کورو اور اس کے بہادروں نے ان پر حملہ کر دیا۔

اپاچیوں پر بھرپور انداز میں حملہ آور ہونے کی بجائے ایل کورو نے مذاکرات اور صلح صفائی کی تجویز پیش کی۔ ایل کا پوٹ کاری...... اپاچی نے ایل کورو اور اس کے ساتھیوں کا مذاق اڑایا کیونکہ وہ آمادہ جنگ نہ تھے۔ اپاچی سردار نے تب ایک تجویز پیش کی کہ عام لڑائی کی بجائے طرفین سے دس دس بہادر اشخاص منتخب کیے جائیں جو آپس میں جنگ کریں۔

ایل کورو نے اس تجویز کو قبول کر لیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اپاچی جارحانہ جنگجو تھے اور تیر کمان اور نیزوں کے ساتھ جنگ لڑنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے لیکن وہ دفاعی جنگ میں ماہر نہ تھے۔ اس کے اپنے آدمی جارحانہ اور مدافعانہ دونوں جنگوں میں ماہر تھے۔ کاپوٹ کاری کی مایوسی کی انتہا نہ رہی جب اس کے نو پیروکار مغلوب ہو گئے۔ وہ بذات خود لڑائی میں اس قدر مہارت رکھتا تھا کہ وہ دشمن کے ان تیروں کو اپنے ہاتھ سے پکڑ لیتا تھا جو دشمن نے اس کی جانب چلائے ہوتے تھے۔ لیکن ایل کورو اپاچی کی جانب بھاگا اور اس کے ساتھ الجھ پڑا۔ اس نے اسے زمین پر پھینک دیا اور ایک پتھر مار کر اسے ہلاک کر دیا۔

یہ دیکھ کر دیگر اپاچی بھاگ کھڑے ہوئے۔ ایل کورو کے آدمیوں نے ان کا پیچھا کیا اور ان میں سے تین سو کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

سان جوآن میں ہسپانوی حکام اس لڑائی کی تفصیلات یا نتائج پر یقین کرنے کو تیار نہ تھے حتیٰ کہ فادر کینو بذات خود ہسپانوی حکام کے پاس پہنچا اور اپاچیوں کی ہلاکت کے بارے میں حکام کو مطلع کیا۔ ہسپانوی حکام کے بقول فادر کینو اکیلا فوج کے پورے ایک ڈویژن کے برابر تھا۔

فادر کینو فادر سلواتیرا کو دوران سفر برابر یہ باور کرواتا رہتا تھا کہ وہ کس طرح کیلی فورنیا کے انڈین کو چھوڑ کر آنے پر مجبور ہوا تھا۔ فادر کینو نے اپنے جیسا جوش۔ جذبہ اور ولولہ اپنے ساتھی فادر کے اندر بھی سمو دیا تھا۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اس جزیرے پر واپس چلے جائیں اور وہاں پر اکٹھے فادر کینو کے کام کو آگے بڑھائیں۔

انہوں نے ایک چھوٹی کشتی تیار کی جو انہیں کیلی فورنیا پہنچا سکے۔ اس دوران فادر کینو نے چرچ اور فوجی حکام سے درخواست کی کہ انہیں نہ صرف اس سفر کی اجازت فراہم کی جائے بلکہ کیلی فورنیا کے انڈین کو عیسائی بنانے کی اجازت بھی فراہم کی جائے۔ اجازت نامہ موصول ہو چکا تھا۔ لیکن یہ اجازت نامہ فادر کینو کے لیے مایوسی کا باعث ثابت ہوا کیونکہ محض فادر سلواتیرا کو ہی کیلی فورنیا جانے کی اجازت فراہم کی گئی تھی اور فادر کینو کی پمیر یا آلٹا میں موجودگی کو اہم قرار دیا گیا تھا کیونکہ اس مقام پر اس کی موجودگی اتنی اہم تھی کہ حکام نہیں چاہتے تھے کہ وہ اس مقام سے کوچ کرے۔

سواتیرا اسی کشتی میں مغرب کی جانب روانہ ہوا جو کشتی فادر کینو نے اپنے لیے تیار کی تھی اور 1697ء میں کیلی فورنیا کی بندرگاہ پر جا پہنچا۔ اس کا پہلا اقدام لوریٹو کے مقام پر ایک مشن قائم کرنا تھا۔ سلواتیرا کیلی فورنیا میں فادر کینو سے بڑھ کر خوش قسمت اور کامیاب ثابت ہوا۔ لوریٹو جلد ہی مشن کے نظام کا ایک اڈا ثابت ہوا جو ساحل کے کنارے دونوں جانب پھیل گیا اور صاف ظاہر ہے کہ بالائی کیلی فورنیا تک بھی جا پہنچا...... یہ ملک کا وہ حصہ تھا جو آج امریکہ کا حصہ ہے۔

فادر کینو بھی پہلے سے بڑھ کر جانفشانی کے ساتھ اپنی خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ انڈین خوش تھے۔ فادر کینو نے انہیں کاشت کاری کی

تربیت دی تھی۔اب وہ کاشت کاری کرتے تھے اور پورا برس پیٹ بھر کر روٹی کھاتے تھے۔اس نے انہیں مویشی چرانے بھی سکھا دیے تھے اور وہ ہسپانوی انداز میں مویشی بھی چراتے تھے۔

فادر کینو جہاں بھی جاتا اس کے وفادار آبائی پیروکار اس کے ہمراہ ہوتے۔تقریباً ایک صد پیروکاروں نے ڈولورس تا ٹیپ سفر میں اس کی ہمراہی اختیار کی۔جوں ہی وہ کسی دیہات سے گزرتا انڈین اس کا خیر مقدم کرتے اور اسے خوش آمدید کہتے۔انہوں نے اپنے ہاتھوں میں صلیبیں اٹھا رکھی ہوتی تھیں۔فادر کینو بھی پمیریا آلٹا کے تمام انڈین کو اپنی اولاد تصور کرتا تھا۔وہ اسے پادری سیٹو...... چھوٹا باپ کہہ کر پکارتے تھے۔

درج ذیل واقعہ سے انڈین کیلئے فادر کینو کی محبت کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ایک مرتبہ جبکہ فادر کینو توما کا کوری کے مقام پر قیام پذیر تھا اس کو یہ اطلاع موصول ہوئی کہ سان اگناشیو میں ایک انڈین کو ملٹری حکام نے پکڑ لیا تھا...... یہ مقام 68 میل کی دوری پر جنوب کی سمت واقع تھا اور 4 مئی کو اسے سزائے موت دی جانی تھی۔فادر کینو کو 3 مئی کو صبح سویرے یہ پیغام موصول ہوا تھا۔اس نے اپنی سروس کو اختتام تک پہنچایا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہوا۔اس نے کھانے پینے کی بھی پرواہ نہ کی اور عازم سفر ہوا۔آدھی شب تک وہ انورس کے مقام تک پہنچ چکا تھا جو توما کا کوری کے جنوب میں 62 میل کی دوری پر واقع تھا۔وہ سورج طلوع ہونے سے پیشتر دوبارہ بیدار ہوا اور گھوڑے پر سوار ہو کر چل نکلا اور منزل مقصود تک جا پہنچا۔ادر کینو نے اس امر کی کوئی تفصیل نہیں چھوڑی کہ اس نے کس طرح یہ سفر طے کیا اور ملٹری حکام سے کیا کہا۔اس کی ڈائری میں محض یہ تحریر ہے کہ:۔

"میں بروقت منزل مقصود تک جا پہنچا اور ہم قیدی کو سزائے موت سے بچانے میں کامیاب ہو گئے۔"

یہ خبر کہ فادر کینو نے ایک انڈین بھائی کی جان بچائی تھی ایک قبیلے سے دیگر قبیلوں تک پھیل چکی تھی۔یہ خبر کوکوماری سیپا قبیلے کے سردار تک بھی جا پہنچی جو پمیریا آلٹا کے انتہائی شمال۔مغرب میں دریائے کولوراڈو کے پاس رہتا تھا۔وہ چاہتا تھا کہ فادر کینو اس کے قبیلے کے لوگوں سے بھی ملاقات کرے۔اس نے اس پادری کو مقدس صلیب کا ایک تحفہ بھی بھیجا۔

21 اپریل 1700ء کو فادر کینو نے ڈولورس کو خیر باد کہا۔اس کے ہمراہ دس انڈین تھے اور دریائے سانتا کروز کی جانب روانہ ہوا۔اس کے راستے میں جو بھی چرچ آئے وہ ان میں تبلیغ کے فرائض سرانجام دیتا رہا اور لوگوں کو عیسائی بناتا رہا۔منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد اس نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ پیا کوکوماری کوپا اور یوما انڈین کے تمام رہنماؤں کا ایک اجلاس بلانا چاہتا تھا۔ان تمام قبائل کی جانب قاصد روانہ کر دیے گئے۔اس دوران فادر کینو نے اپنے آپ کو دیگر مصروفیات میں مصروف رکھا۔

ماہ مئی کے آخر میں قبیلوں کے سردار پہنچنا شروع ہو گئے۔رات کے وقت وہ چاند کی روشنی میں آگ کے ارد گرد بیٹھ جاتے اور فادر کینو کے خیالات سنتے۔فادر کینو کی ڈائری بتاتی ہے کہ:۔

"......ہم نے پہلے مرحلے میں عیسائی عقیدے......امن وسکون......خوشی اور راحت کی بات کی جو عیسائیوں کو میسر تھی......اور وہ اس امر پر متفق ہوئے کہ وہ عیسائی عقائد کے بارے میں دیگر لوگوں اور دور دراز کے قبائل کو بھی آگاہ کریں گے......"

24 ستمبر 1700ء کو پادری کینو نے دس انڈین ملازمین کے ہمراہ اری زونا کے وسط سے سفر کا آغاز کیا اور دریائے گیلا پہنچنے کے بعد یوما

کی سرزمین کا رخ کیا۔

پہاڑی کی چوٹی سے ایک طاقت ور ٹیلی اسکوپ کے ذریعے اس یوما کی وادی کا نظارہ کیا۔ اس کے علاوہ اس نے کولوراڈو اور کیلی فورنیا کا بھی نظارہ کیا۔

"کیمپ میں واپس جا کر ہم نے رات کا کھانا۔ ہم نے کچھ میٹھا بھی کھایا کیونکہ خدا نے ہم پر مہربانی فرماتے ہوئے ہمیں کیلی فورنیا کی سرزمین دیکھنے کے قابل بنایا تھا اور راستے میں کوئی سمندر حائل نہ تھا جو اس سرزمین کو اس سے جدا کرتا"۔

اس کے بعد فادر کینو ڈولورس واپس لوٹ آیا اور فوری طور پر فادر سلواتیرا کو خط تحریر کیا۔ اس کو یقین تھا کہ پمیریا آلٹا سے کیلیفورنیا تک کیلئے خشکی کا راستہ دستیاب تھا۔ خط کے جواب میں فادر سلواتیرا فروری 1701ء کو ڈولورس آن پہنچا۔

چرچ اور فوجی حکام فادر کینو کے انکشاف پر مسرور تھے۔ لہٰذا یہ فیصلہ کیا گیا کہ دونوں فادر کپتان مینجی اور دس سپاہیوں کے ہمراہ کیلی فورنیا کیلئے خشکی کا راستہ دریافت کرنے کی مہم پر روانہ ہوں۔

فادر کینو نے اپنی مہم کی منصوبہ بندی انتہائی مہارت کے ساتھ سرانجام دی۔ اس نے اشیائے خورد و نوش جن میں آٹا، بسکٹیں، خشک گوشت وغیرہ شامل تھا وافر مقدار میں اپنے ہمراہ رکھیں۔ 80 گھوڑے اور خچریں بھی اس جماعت کے ہمراہ تھیں۔ اس مہم کے لئے انڈین انتہائی کارآمد ثابت ہو سکتے تھے کیونکہ وہ سپاہیوں سے بڑھ کر موسم کی شدت برداشت کرنے کے عادی تھے۔ سپاہی بھی حیران تھے کہ فادروں نے کبھی گرمی یا تھکن کی شکایت نہ کی تھی۔

یہ جماعت سنوتا پہنچ چکی تھی۔ اس مقام پر کوئی کوما انڈین کے پیغامات ان کے منتظر تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ فادر کینو ان سے بھی ملاقات کرے۔ فادر کینو ان کو مایوس نہ کرنا چاہتا تھا لہٰذا اس نے اپنے مجوزہ روٹ سے ہٹتے ہوئے ایک دوسرا روٹ اختیار کیا تاکہ کوما انڈین سے ملاقات کر سکے۔ اس نئے روٹ کو اختیار کرنے کی وجہ سے ان کے سفر میں تقریباً ساٹھ لیگ کی کمی واقع ہوئی۔ انڈین گائیڈوں نے انہیں بتایا کہ براہ راست روٹ ایک سخت ترین روٹ ہوگا۔ اس دوران گہری ریت میں سفر طے کرنا ہوگا اور پانی اور گھاس بھی بمشکل ہی نظر آئے گی۔ بہرکیف فادر کینو یہی روٹ اختیار کرنا چاہتا تھا۔

یہ پہلا موقع تھا جبکہ سفید فام اس علاقے کو پار کرنے کی کوشش میں مصروف تھے جو مابعد ایلی کمینو ڈل ڈیابلو (شیطان کی شاہراہ) کے نام سے جانا جانے لگا اور جس کو دو صدیوں بعد ایک سیاح نے خاموشی کی سرزمین...... تنہائی کی سرزمین...... چمکتے سورج کی سرزمین قرار دیا تھا۔

جوں ہی پادری سفر طے کرتے گئے ان کے پاس پانی کی قلت ہوتی چلی گئی۔ کبھی کبھار انہیں اپنے ہاتھوں سے کنوئیں کھودنے یا چوڑے کرنے پڑتے تھے تاکہ تمام جماعت پانی کی پیاس بجھا سکے۔

بروز اتوار وہ اس مقام تک جا پہنچے جہاں پر پانی موجود تھا اور پہاڑی کی چوٹی پر چڑھتے ہوئے انہیں مغرب اور جنوب مغرب کی جانب کیلی فورنیا دکھائی دیا۔ اب جب کہ کامیابی اس کی دسترس میں تھی تب فادر کینو کو اپنی مہم کو خیرباد کہنا پڑا۔ لدے ہوئے جانور پہاڑی پر چڑھ کر پانی کے

مقام تک پہنچنے سے قاصر تھے۔ اس کے علاوہ وہ تھکن سے اس قدر بے حال تھے کہ فادر کینو کو واپس لوٹنا پڑا۔

لیکن یہ پہلی کاوش سرانجام دینے کے بعد بھی فادر کینو مزید جدوجہد سے باز نہ آیا۔ اس نے تین مرتبہ شیطان کی شاہراہ پر سفر سرانجام دیا۔ نومبر 1701ء میں وہ کولوراڈو جا پہنچا۔ 1702ء میں وہ اس مقام تک جا پہنچا جس مقام پر کولوراڈو سمندر میں گرتا ہے۔ اس برس فادر کینو نے اپنی ڈائری میں تحریر کیا کہ:۔

''کیلیفورنیا کیلئے خشکی کا راستہ موجود ہے۔''

اپنی تمام تر جدوجہد کے باوجود بھی فادر کینو خشکی کے راستے کیلیفورنیا تک نہ پہنچ سکا لیکن وہ دوسروں کے لئے راستہ کھول گیا۔ اس کے نقشے......ڈائریاں اور رپورٹیں مابعد آنے والے مہم جو حضرات کے کام آئیں اور انہوں نے ان سے استفادہ حاصل کیا۔

فادر کینو 1711ء میں موت سے ہمکنار ہو گیا۔ اس نے 24 مشن قائم کئے تھے اور 50 سے زائد طویل سفر سرانجام دیے تھے۔ اس کے قائم کردہ بہت سے مشن اب کھنڈرات میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ بہت سے انڈین قبائل جو ان میں عبادت سرانجام دیتے تھے وہ صفحۂ ہستی سے مٹ چکے ہیں۔ بہت سے مراکز اس وقت تباہی سے ہمکنار ہوئے جب جےسوٹ حکومتی خوشنودی سے محروم ہوئے اور نئی دنیا سے نکال دیے گئے۔ دیگر مراکز 19ویں صدی میں دوران جنگ تباہی سے ہمکنار ہوئے۔

روبنسن کروزو کا پہلا نمونہ

الیگزینڈر سل کرک نے ایک ایسی غیر معمولی مہم سرانجام دی جس نے اسے نہ صرف شہرت بخشی بلکہ ڈینئل ڈیفو کو یہ تحریک دلائی کہ وہ مشہور زمانہ کتاب روبنسن کروزو تحریر کرے۔

سل کرک نے 1676ء میں جنم لیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جبکہ انگریز اور فرانسیسی جہاز ران محض اس لئے سفر سرانجام دیتے تھے کہ نئی دنیا کے خزانوں میں سے کسی قدر خزانوں پر قبضہ جماسکیں جن کو ہسپانوی محض اپنے لئے مخصوص کئے بیٹھے تھے۔ یہ بوکانیر (17ویں صدی کے مہم جو) کا دور تھا۔ یہ لوگ اپنے ہم عصروں میں مہم جو ہونے کی بنا پر مشہور تھے۔ اس میں حیرانگی کی کوئی بات نہیں کہ سل کرک جب جوانی کی حدود کو پہنچا تو اس نے ان لوگوں کے ساتھ شمولیت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

لارگو...... اسکاٹ لینڈ کا ایک دیہات جہاں اس نے جنم لیا تھا وہ جگہ اس کی فطرت کے حامل لڑکے کے لئے ایک مختصری دنیا تھی۔ وہ ایک جفت ساز کا ساتواں بیٹا تھا۔ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ لڑائی جھگڑا کرنے اور اہل دیہات کو تنگ کرنے سے کبھی باز نہ آیا تھا۔ دیہات میں اس کا جارحانہ رویہ اس کے لئے ایک روز مسئلہ بن گیا کیونکہ اس کے ہمسایوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ لہٰذا اسے یہ حکم ملا کہ وہ دیہات کے بزرگوں کی عدالت میں پیش ہو۔ سل کرک فوری طور پر دیہات سے غائب ہو گیا اور ایسا غائب ہوا کہ اگلے چھ برس تک دیہات میں بالکل نظر نہ آیا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں چلا گیا تھا...... لیکن شاید وہ سمندر کی جانب بھاگا تھا جہاں پر اس نے بوکانیر کے ساتھ خدمات سرانجام دینا شروع کر دی تھیں۔

بالآخر وہ 1701ء میں اپنے دیہات واپس آن پہنچا۔ اس وقت وہ پہلے سے بھی زیادہ مضبوط اور زیادہ جارحانہ رویے کا حامل بن چکا تھا۔ اگرچہ بدقسمت بھائیوں اور ہمسایوں نے الیگزینڈر کی جانب سے منہ پھیرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس کی تلوار اور پستول سے خائف تھے جو ہر وقت گولی اگلنے کے لئے تیار رہتی تھی۔ اسے دوبارہ گاؤں کے بزرگوں کی عدالت میں پیش ہونے کی ہدایت کی گئی اور اس مرتبہ اس نے اپنے بہت سے جرائم کی معافی طلب کر لی...... لیکن اس عمل درآمد کے کچھ ہی عرصہ بعد اسے دوبارہ اسکاٹ لینڈ سے راہ فرار اختیار کرنے کا موقع میسر آ گیا۔

اس کے علم میں یہ بات آئی کہ کیپٹن ولیم ڈیمپیئر...... اپنے وقت کا مشہور بوکانیر...... جنوبی سمندروں کی مہم پر روانہ ہو رہا تھا۔ اس نے اس مہم میں شامل دو جہازوں میں سے ایک جہاز پر بطور "سیلنگ ماسٹر" ملازمت حاصل کر لی۔ یہ 90 ٹن وزنی جہاز تھا جس میں 16 توپیں اور 63 مرد سوار تھے۔ اس مہم کا مقصد یہ تھا کہ سپین کے ان تین جہازوں پر قبضہ کیا جائے جن پر خزانہ لدا تھا اور جو بیونس آئرس کی بندرگاہ پر کھڑے تھے۔ اگر وہ اس مشن میں ناکام ہو جاتے تب انہوں نے ان ہسپانوی جہازوں کا تعاقب کرنا تھا جو سونا لے کر جا رہے تھے...... اور سپین کے ساحلی قصبوں پر بھی حملہ آور ہونا تھا جن کے بارے میں یہ قیاس کیا جاتا تھا کہ وہ قابل قدر خزانوں کے حامل تھے...... اور اگر وہ اس منصوبے میں بھی ناکام ہو جاتے تب انہوں نے بحری جہاز "منیلا" کو نشانہ بنانا تھا جس کے بارے میں یہ قیاس تھا کہ اس کے ذریعے اکاپلکو کی کانوں سے سونا نکال کر منیلا پہنچایا جاتا ہے

اور یہ جہاز ایک برس میں ایک مرتبہ سونے کی نقل وحرکت سرانجام دیتا تھا۔

ستمبر 1703ء میں دو جہاز کن سیل سے عازم سفر ہوئے اور یہ طویل سفر اپنے آغاز میں ہی مشکلات کا شکار ہو گیا۔ جہاز کا کپتان ڈیمپیئر اپنے نائب کپتان سے الجھ پڑا...... وہ خلیج وردی جزیروں پر جہاز سے اتر گیا...... اس کے بعد وہ اپنے نئے نائب کپتان سے بھی الجھ پڑا...... وہ بھی عملے کے سات ارکان کے ساتھ اس وقت جہاز سے اتر گیا جب جہاز بی گرینڈ پہنچا...... لی گرینڈ ایک جزیرہ تھا جو برازیل کے ساحل سے پرے واقع تھا۔ اس دوران سن کیو نامی جہاز کا کپتان موت سے ہمکنار ہو گیا۔ اس کا نائب کپتان جس کا نام سٹراڈلنگ تھا اس نے اس کا عہدہ سنبھال لیا۔ یہ شخص ڈیمپیئر سے بھی بڑھ کر جھگڑالو واقع ہوا تھا۔

جب جہاز چلی کے قریب پہنچے سٹراڈلنگ کے جہاز میں فساد برپا ہو گیا اور تقریباً دو تہائی عملہ ساحل سمندر پر جہاز سے اتر گیا۔ لیکن ولیم ڈیمپیئر نے صلح صفائی کروانے کی کوشش کی۔ لہٰذا عملہ جہاز پر واپس آ گیا۔ اس دوران ایک بڑا فرانسیسی جہاز منظر عام پر آیا۔ لہٰذا یہ لوگ اس جہاز کے تعاقب میں روانہ ہو گئے...... لیکن یہ کاروائی ناکامی سے ہمکنار ہوئی...... انگریزی جہاز جان فرینڈس کی جانب واپس پلٹے تاکہ ان نصف درجن لوگوں اور سامان کو واپس جہاز پر لادا جائے جس کو وہ فرانسیسی جہاز کے تعاقب کی جلدی میں اس مقام پر چھوڑ آئے تھے۔ لیکن وہ اپنے اس مقصد میں بھی کامیاب نہ ہو سکے کیونکہ برتر فرانسیسی بحری بیڑہ منظر عام پر آ چکا تھا۔ ڈیمپیئر نے اپنے لوگوں اور سامان کو واپس جہاز پر لادنے کا ارادہ ترک کیا اور فی الفور پیرو کے ساحل کے شمال کی جانب عازم سفر ہوا۔

آئندہ مہینوں کے دوران دونوں جہاز جنوبی امریکہ کے ساحل کے اردگرد منڈلاتے رہے...... اگرچہ چھوٹا موٹا مال غنیمت ان کے ہاتھ لگتا رہا۔ لیکن مجموعی طور پر یہ مہم کسی بڑی خوش قسمتی کی ضامن ثابت نہ ہو سکی۔

ڈیمپیئر اور سٹراڈلنگ جیسے فوری مشتعل ہونے والے کپتانوں کے ہمراہ لڑائی جھگڑا ناگزیر تھا۔ جب جہاز ٹوباگو کے قریب تھے تب دونوں کپتان مال غنیمت کی تقسیم پر آپس میں الجھ پڑے۔ دونوں جہازوں میں عدم اطمینانی اپنے عروج پر تھی اور دباؤ، کھچاؤ اور تناؤ کا ماحول کسی ''سول وار'' (خانہ جنگی) کا نقشہ پیش کرتا تھا۔ ہر ایک جہاز پر سوار کچھ لوگ دوسرے جہاز میں منتقل ہونا چاہتے تھے۔ ایک موقع پر سل کرک نے بھی یہ سوچا تھا کہ وہ سٹراڈلنگ کا جہاز چھوڑ کر ڈیمپیئر کے جہاز میں منتقل ہو جائے۔ لیکن اس نے یہ سوچ کر اپنا ارادہ ترک کر دیا کہ دونوں کپتانوں میں رتی برابر بھی فرق نہ تھا۔

سن کیو نامی جہاز 19 مئی 1704ء کو دوبارہ عازم سفر ہوا اور تین ماہ تک میکسیکو کی بندرگاہ کے ساتھ ساتھ شکار کی تلاش میں بحری گشت سرانجام دیتا رہا۔ لیکن ازحد کم کامیابی اس کے حصے میں آئی۔ سل کرک کی اب ترقی ہو چکی تھی اور اسے نائب کپتان کے عہدے پر فائز کر دیا گیا تھا۔ وہ اگرچہ سٹراڈلنگ کے ساتھ الجھنے سے بچتا رہا لیکن اس نے قسم کھائی کہ آئندہ وہ اس کی ماتحتی میں کبھی بحری سفر سرانجام نہ دے گا۔ جب ماہ ستمبر میں سٹراڈلنگ نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ جان فرینڈس واپس جا کر ان چھ افراد اور سامان کو واپس لانے کا ارادہ رکھتا تھا جس کو وہ تین ماہ قبل ساحل سمندر پر چھوڑ آئے تھے تب سل کرک انتہائی خوش ہوا...... کیونکہ اسے جہاز سے راہ فرار اختیار کرنے کا ایک موقع میسر آ رہا تھا...... اس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ سٹراڈلنگ کو اب مزید برداشت نہ کر سکتا تھا۔ لہٰذا وہ یہ مطالبہ کرے گا کہ اسے ساحل سمندر پر ہی چھوڑ دیا جائے۔

لہٰذا سل کرک نے سٹراڈ لنگ کو بتایا کہ وہ ساحل سمندر پر ہی جہاز سے اترنا چاہتا تھا۔ لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ سٹراڈ لنگ نے اس سے اتفاق کیا...... دراصل وہ بھی اپنے اس باغی نائب کپتان سے پیچھا چھڑانے کا متمنی تھا۔ سل کرک نے اپنا سامان اپنے ہمراہ لیا جس میں کپڑے...... بستر...... کتابیں...... ریاضی کا سازوسامان...... ایک چاقو...... ایک کلہاڑی...... کچھ اوزار وغیرہ شامل تھے...... لیکن خوراک کی انتہائی قلیل مقدار اس کے حصے میں آئی کیونکہ جہاز میں خوراک کی قلت تھی۔

سل کرک کا سازوسامان اور سل کرک کو بذات خود ایک کشتی میں سوار کیا گیا اور ساحل کی جانب روانہ کر دیا گیا۔ سل کرک اب ایک اور سوچ کا شکار تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ سٹراڈ لنگ فی الفور عازم سفر ہونا چاہتا تھا اور اب جبکہ اس کا سامان ساحل سمندر پر اتارا جا رہا تھا تب اس کا دل بوجھل ہو چکا تھا۔ جب کشتی اسے ساحل پر اتار کر واپس جہاز کی جانب بڑھنے لگی...... سل کرک نے اسے پکارا اور پانی میں اس کے پیچھے کود پڑا اور چلایا کہ اس نے اپنا ذہن بدل دیا تھا۔ لیکن اس کا واویلا فضول تھا۔ سٹراڈ لنگ نے اسے نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ مایوس ہو کر ساحل پر بیٹھ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر اب وہ دوبارہ جہاز کو واپس بلانے کا کوئی چارہ کرے گا تو سوائے ذلت کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

اس نے قریب ہی بہنے والے ایک چشمے سے تازہ پانی پیا اور یہ فیصلہ کیا کہ پتھروں سے تعمیر کردہ اس جھونپڑی میں پناہ حاصل کی جائے جسے ایک انڈین نے تعمیر کیا تھا جس نے بیس یا تیس برس پیشتر اس جزیرے پر تین برس گزارے تھے۔ وہ اپنے سامان کے ہمراہ اس جھونپڑی میں جا پہنچا۔ اپنے لئے ایک بستر تیار کیا۔ دروازے کو بند کیا کیونکہ اس کو خطرہ تھا کہ اس کے علاوہ بھی جزیرے پر کوئی موجود ہو سکتا تھا اور دوران نیند اس پر حملہ آور بھی ہو سکتا تھا۔

اگلے روز سل کرک نے اپنی قلیل خوراک میں سے تھوڑا بہت کھایا اور اس کے بعد جزیرے کا جائزہ لینے کے لئے چل نکلا تاکہ حصول خوراک کا کوئی ذریعہ تلاش کر سکے۔ وہاں پر کافی تعداد میں بکریاں بھی موجود تھیں مگر وہ کسی کے ریوڑ کا حصہ تھیں اور اس کے پاس گن پاؤڈر کی بھی انتہائی قلت تھی۔ ساحل پر اسے کئی ایک دریائی بچھڑے دکھائی دیے۔ اس نے اپنے چاقو کے ساتھ ایک چھوٹے دریائی بچھڑے کو ہلاک کر ڈالا۔ اسے کچھ ایسی مچھلیاں بھی نظر آئیں جو بہ آسانی پکڑی جا سکتی تھیں اور کھانے میں ازحد لذیذ ثابت ہوتی تھیں۔ اگرچہ اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا لیکن اسے احساس تھا کہ حالات بد سے بدتر بھی ہو سکتے تھے۔ لہٰذا وہ ازحد مایوسی کا شکار رہا۔

اس نے اپنا معمول بنا لیا تھا کہ وہ جزیرے کی کسی اونچی جگہ پر کھڑا ہو جاتا جہاں پر وہ گھنٹوں گزار دیتا۔ وہ کسی جہاز کی آمد کا منتظر رہتا تھا۔ اگرچہ وہ جانتا تھا کہ اس جزیرے کے قریب سے جہاز اکثر گزرتے رہتے ہیں لیکن اسے ابھی تک کوئی جہاز نظر نہ آیا تھا۔ وہ اس سوچ میں غرق رہتا کہ کیا وقوع پذیر ہوگا اگر:۔

وہ بیمار پڑ گیا۔

وہ کسی حادثے کا شکار ہو گیا۔

اور یوں ہی دن آہستہ آہستہ گزر رہے تھے اس کی مایوسی میں بھی اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ وہ گھنٹوں خاموش بیٹھا اپنی قسمت پر غور کرتا رہتا تھا اور محض اسی وقت حرکت کرتا تھا جب اسے خوراک کی ضرورت ہوتی تھی۔

اکثر وہ کسی پرندے یا بکری کو اپنی گولی کا نشانہ بناتا رہتا تھا اور اکثر یہ بھی سوچتا رہتا تھا کہ اس کے لئے یہ امر کتنا آسان ہو گا جب وہ اپنی بندوق کا رخ اپنی جانب موڑ لے گا۔ اگر ان ابتدائی مہینوں کے دوران سل کرک اپنے ہاتھوں اپنی جان لینے سے باز رہا تھا تو اس میں اس کی مذہبی تربیت کا اثر کارفرما تھا...... جب وہ خودکشی کے بارے میں سوچتا تو اسے اس بارے میں بائبل کا کچھ مواد یاد آ جاتا جو خودکشی سے منع کرتا تھا۔ وہ کئی گھنٹوں تک باآواز بلند بائبل پڑھتا رہتا تھا تا کہ اس کی سوچوں کو سکون میسر آئے۔ آہستہ آہستہ اسے دوبارہ ذہنی سکون میسر آنے لگا۔ اب اس کی سوچوں میں ناامیدی کا عنصر شامل نہ رہا تھا۔ وہ اپنے گھربار اور دوستوں کے بارے میں بھی ناامیدی کا شکار نہ رہا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ہنس مکھ ہوتا چلا جا رہا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سکون کی دولت سے بھی مالا مال ہو چکا تھا۔ الیگزینڈر سل کرک اپنے آپ کو اپنے ماحول کا عادی بنا چکا تھا۔

اسے اس جزیرے پر قیام پذیر ہوئے اٹھارہ ماہ بیت چکے تھے۔ اب وہ مایوسی کے خول سے باہر نکل چکا تھا۔ موسم سرما کا دوسرا دورانیہ شروع ہونے کو تھا اور اس کے ساتھ ساتھ بارشوں کا موسم بھی شروع ہونے والا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس دوران وہ اپنی اس چھوٹی پتھروں کی جھونپڑی میں گزارا نہیں کر سکتا تھا۔ بارش کے دوران اس جھونپڑی کا خشک رہنا محال تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے لئے دو نئی جھونپڑیاں تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا...... ایک جھونپڑی رہائش کیلئے اور دوسری جھونپڑی بطور کچن استعمال کرنے کیلئے...... جو پہاڑیوں پر کسی اونچے مقام پر واقع ہو اور درختوں میں گھری ہوئی ہو اور سمندر سے چھپی ہوئی بھی ہو کیونکہ وہ مسلسل اس خطرے کا شکار رہتا تھا کہ اسے کوئی ہسپانوی جہاز نہ لے جائے۔

پہلی مرتبہ اس نے جزیرے کا مناسب جائزہ لیا۔ اس کے علم میں یہ بات آئی کہ یہ جزیرہ تقریباً ایک تکونی شکل کا حامل تھا۔ اس کی پیمائش تقریباً 18 میل × 12 میل تھی اور اس کے ایک میل کے فاصلہ پر ایک اور چھوٹا جزیرہ واقع تھا۔ جزیرے کا جنوبی حصہ نشیبی تھا اور چٹانوں کا حامل تھا لیکن بکریوں سے بھرا پڑا تھا اور باقی حصہ جنگل پر مشتمل تھا۔

سل کرک اب محسوس کر رہا تھا کہ وہ بھی کتنا بے وقوف تھا کہ وہ عرصہ دراز تک مایوسیوں کے سمندر میں غوطہ زن رہا تھا۔ اب ایک نئے جذبے، ولولے اور جوش کے ساتھ اس نے اپنے نئے گھر کی تعمیر کا آغاز کر دیا تھا۔ اس نے درخت کے تنوں کو دیواروں کے لئے استعمال کیا تھا اور خشک گھاس چھت پر بچھائی تھی۔ اس نے ایک کھڑکی اور دروازہ بھی بنایا اور فرش کی سطح کو کوٹ کر سخت کیا۔ اس کے بعد اس نے سخت محنت اومشقت سے اپنا تمام تر سامان اپنی نئی جھونپڑی میں منتقل کیا۔ یہ سامان اس نے اپنی پرانی پتھروں سے بنی ہوئی جھونپڑی سے نئی جھونپڑی میں منتقل کیا۔

اس کا کچن مکمل ہونے تک موسم سرما کا آغاز ہو چکا تھا۔ لیکن اب اس کے پاس کافی جگہ موجود تھی اور وہ نہ تھمنے والی بارش کے لمبے دن بخوبی گزار سکتا تھا۔ اس نے کچھ فرنیچر بھی تیار کیا اور خشک موسم کے دوران ہی اپنے کچن کی تعمیر کا کام مکمل کرنے کی کوشش کی۔ نم آلود ہوا اور بارش کی بدولت اس کی جھونپڑی کی دیواریں نم آلود ہو چکی تھیں لہٰذا اس نے یہ فیصلہ کیا کہ بکری کی کھالیں حاصل کی جائیں اور تمام تر جھونپڑی کی دیواروں پر اس کی لائننگ کی جائے۔ لیکن اس کا اسلحہ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ اب اس کے پاس کوئی ایسا ذریعہ موجود نہ تھا۔ جس کے تحت وہ بکریوں کا شکار کر سکے۔ لہٰذا اس نے اسلحہ کے استعمال کے بغیر شکار کرنے کے طریقہ کی مشق سرانجام دی۔ اس نے چھپ کر شکار کرنے کا طریقہ سیکھا۔ وہ کسی مناسب جگہ پر چھپ جاتا اور قریب سے گزرنے والے بکری کے بچوں پر جھپٹ پڑتا اور اس طرح وہ بہ آسانی شکار کر سکتا تھا۔ وہ اس طریقہ میں بالآخر اتنی مہارت حاصل کر چکا تھا کہ کسی بھی بکری کو قابو کر سکتا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی جھونپڑی مکمل طور پر تیار ہو چکی تھی اور اس قدر آرام دہ بھی بن چکی تھی کہ سل کرک اب صحیح معنوں میں اس جزیرے پر اپنی زندگی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ بکری کے کچھ بچوں کو سدھانے میں بھی کامیاب ہو چکا تھا اور ان کو دو ٹانگوں پر کھڑے ہو کر رقص کرنا بھی سکھا چکا تھا۔

اب سل کرک اپنے ماحول سے اس قدر مانوس ہو چکا تھا کہ دن پر لگا کر اڑ رہے تھے۔ اس نے بکری کی کھال سے اپنے لئے نئے کپڑے بنانے کے کام میں مصروف کر رکھا تھا کیونکہ اس کے پرانے کپڑے پھٹ چکے تھے۔ اس دوران وہ بکریوں کے ایک بڑے ریوڑ کو سدھا چکا تھا لیکن وہ ان کو اپنا شکار بنانے پر آمادہ نہ تھا۔ لہٰذا وہ غیر سدھائی ہوئی بکریوں کا شکار کرتا تھا۔ وہ ذہنی طور پر اس امر کے لئے تیار ہو چکا تھا کہ اس کی باقی ماندہ زندگی اسی جزیرے پر تنہائی میں ہی بسر ہو گی۔

وہ دو حادثات کا بھی شکار ہوا۔ پہلا حادثہ اسے اس وقت پیش آیا جبکہ وہ ایک تیز رفتار۔ توانا بکرے کا شکار کر رہا تھا۔ وہ اس کے تعاقب میں اس قدر محو تھا کہ اس نے یہ محسوس ہی نہ کیا کہ جانور ایک کھڑی چٹان کے کنارے تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے جب اس کے سینگوں کو اپنی گرفت میں لیا تب وہ اور جانور دونوں چٹان سے نیچے آن گرے۔ جب وہ ہوش میں آیا اس نے اپنے آپ کو بکرے کے مردہ جسم کے اوپر پڑے ہوئے پایا۔

اگرچہ اس کے جسم میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں لیکن اس کی ہڈیاں وغیرہ سلامت تھیں اور کسی ہڈی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ اس کے باوجود بھی وہ کئی گھنٹوں تک رینگتا ہوا اپنی جھونپڑی میں واپس پہنچا اور جھونپڑی میں واپس پہنچ کر وہ نڈھال ہو کر لیٹ گیا...... دس روز تک وہ ہلنے جلنے کے قابل نہ تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس نے خوراک کا کچھ ذخیرہ کر رکھا تھا تاکہ کسی ہنگامی ضرورت کے تحت کام آ سکے۔ لہٰذا وہ اسی خوراک پر گزارہ کرتا رہا۔ بالآخر وہ روبصحت ہو گیا۔

دوسرے حادثے میں وہ اپنے ہی ساتھی انسانوں کے ہتھے چڑھنے سے بال بال بچا تھا۔ موسم گرما میں روزانہ اس کی یہ عادت رہی تھی کہ وہ جزیرے کے بلند ترین مقام پر کھڑا ہو کر سمندر کا معائنہ سرانجام دیتا تھا۔ کبھی کبھار سمندر میں جہاز محو سفر نظر آتے تھے لیکن وہ ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ وہ اس سے اس قدر دور ہوتے تھے کہ ان کی شناخت ممکن نہ تھی کہ ان جہازوں کا تعلق کس قوم یا کس ملک سے تھا۔ وہ ہسپانویوں کے ہتھے چڑھنے سے گھبراتا تھا جو انگریزوں کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ تاہم ایک صبح اس نے ایک جہاز دیکھا جس کے بارے میں اس کا قیاس تھا کہ وہ فرانسیسی جہاز تھا۔ یہ جہاز جزیرے پر لنگر انداز ہوا۔ وہ بھاگم بھاگ ساحل پر جا پہنچا کیونکہ اس جہاز کی کشتی خشکی کی جانب بڑھ رہی تھی۔ لیکن اس کی نظر اچانک ان لوگوں کے لباس پر پڑی اور وہ پہچان چکا تھا کہ وہ ہسپانوی تھے۔ وہ واپس مڑا اور راہ فرار اختیار کی۔

ہسپانوی اس پر چلاتے رہے۔ وہ خشکی پر پہنچ چکے تھے اور اس کے تعاقب میں تھے۔ لیکن بھاگ کر بکریوں کا شکار کرنے کی عادت نے اس کو اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ تیز سے تیز تر دوڑ سکتا تھا۔ لہٰذا وہ آسانی سے ان کی پہنچ سے دور نکل چکا تھا۔ جوں ہی وہ جزیرے میں اس کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے وہ انتہائی اطمینان کے ساتھ ایک درخت میں چھپا بیٹھا تھا اور تین روز تک وہ اسی مقام پر چھپا رہا حتیٰ کہ جہاز اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد وہ مزید محتاط ہو گیا اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ وہ اس وقت تک اپنی موجودگی ظاہر نہیں کرے گا جب تک اسے اہل

جہاز کی قومیت کے بارے میں پختہ یقین نہ ہو جائے۔

جب سل کرک جان فرنینڈس کے جزیرے پر چار سال اور چار ماہ گزار چکا تب ایک شام اس کی نظر دو جہازوں پر پڑی۔ان جہازوں کی وہ بخوبی شناخت کر چکا تھا کہ یہ جہاز انگریزوں کے تھے۔اس کے اندر یک دم یہ خواہش جنم لینے لگی کہ وہ فی الفور انسانی معاشرے کا رکن بن جائے۔ چونکہ جہاز اس سے اس قدر فاصلے پر تھے کہ وہ نہ تو اسے دیکھ سکتے تھے اور نہ ہی اس کی آواز سن سکتے تھے لہٰذا وہ ایک چٹان پر چڑھ گیا اور خشک پتوں سے آگ کا ایک بڑا الاؤ روشن کر دیا جو کئی گھنٹوں تک جلتا رہا۔

یہ دونوں جہاز ''ڈیوک'' اور ''ڈوچس'' نامی جہاز تھے۔ان کی کمان کپتان ڈوور اور کپتان ووڈز راجرز سرانجام دے رہا تھا۔وہ آگ دیکھ چکا تھا۔لیکن ابھی تذبذب کا شکار تھا۔وہ سوچ رہا کہ شاید ہسپانویوں نے اس جزیرے پر کوئی فوجی اڈا قائم کر رکھا تھا۔بہرکیف انگریزی جہازوں کو تازہ پانی کی ضرورت درپیش تھی لہٰذا انہوں نے مناسب تیاری کے ساتھ ایک کشتی ساحل کی جانب روانہ کی جس میں چھ مسلح افراد سوار تھے۔انہوں نے ساحل پر جو کچھ دیکھا وہ ایک غیر مسلح انگریز کے سوا کچھ بھی نہ تھا جس نے بکری کی کھال کا لباس زیب تن کر رکھا تھا اور وہ ایک سفید کپڑا بطور جھنڈا لہرا رہا تھا۔

وہ لوگ سل کرک کے ساتھ انتہائی مہربانی کے ساتھ پیش آئے اور اسے جہاز پر سوار ہونے کی دعوت دی۔اس نے جب اپنی داستان سنائی تو سب لوگ از حد متاثر ہوئے۔یہ محض اتفاق تھا کہ سابقہ بری شہرت کا حامل ولیم ڈیمپیئر اب جہازوں میں سے ایک جہاز کا پائلٹ تھا اور اس نے سل کرک کے بارے میں کیپٹن راجرز کو بتایا اور اس کی تعریف کی۔کیپٹن راجرز نے سل کرک کو فوری طور ڈیوک نامی جہاز کا نائب کپتان مقرر کر دیا۔

کیپٹن راجرز کے جہاز میں کئی ایک علیل افراد موجود تھے اس نے ان افراد کو اس جزیرے پر اتارا جس پر سل کرک مقیم رہا تھا اور سل کرک نے ان لوگوں کو وہ جھونپڑیاں استعمال کرنے کی اجازت فراہم کر دی جن میں وہ بذات خود رہائش پذیر رہا تھا۔جہاز دو ہفتوں تک اس جزیرے پر رکا رہا۔جب علیل افراد صحت مند ہو گئے تب ان کو دوبارہ جہاز میں سوار کیا گیا اور جہاز عازم سفر ہوا۔

اس وقت فروری 1709ء کا دورانیہ تھا لیکن اکتوبر 1711ء تک سل کرک اپنی آبائی سرزمین دوبارہ دیکھنے کے قابل نہ ہو سکا۔کپتان راجرز کا چھوٹا سا بحری بیڑہ کئی ماہ تک جنوبی سمندروں میں محو سفر رہا اور بحری لوٹ مار میں مصروف رہا۔جب بالآخر وہ انگلستان واپس پہنچے اس وقت سل کرک کے حصے میں مال غنیمت سے 800 پونڈ آئے اور اس کے ساتھ ہی اس کی شہرت ملک کے کونے کونے میں پھیل گئی۔

یہ قیاس کیا جاتا تھا کہ اس کے بعد وہ واپس اسکاٹ لینڈ جا پہنچا تھا اور تنہائی کا طلب گار تھا کیونکہ وہ تنہائی کا مزہ بخوبی چکھ چکا تھا۔صاف ظاہر تھا کہ اس نے شادی بھی کی لیکن اس کے بعد کوئی نہیں جانتا کہ اس کے ساتھ کیا وقوع پذیر ہوا...... کیا معاملہ ہوا...... اگرچہ یہ بھی قیاس کیا جاتا تھا کہ اس نے بحری فوج میں شرکت اختیار کر لی تھی۔رو بنسن کروزو کے پہلے نمونے نے اپنی بقایا زندگی گمنامی میں گزار دی۔

حقیقی ڈک ٹرپن

''اوہ ٹرپن عجیب وغریب ہیرو......اوہ عجیب وغریب ٹرپن اوہ''

وہ 1739ء میں اس کا گیت گا رہے تھے......اس کی ہلاکت کا برس۔ تقریباً ایک صدی بعد ہیری سن انیز ورتھ کے ناول ''روک وڈ'' نے سیل کے تمام ریکارڈ توڑ دیے......اس ناول کا مرکزی خیال ٹرپن کی لندن تا یارک سواری تھی جو اس نے اپنی گھوڑی بلیک بس پر سرانجام دی تھی۔ وکٹورین دور کی شاعرہ الیزا کک نے اس سواری کو اپنی ایک نظم میں قلمبند کیا تھا۔

درحقیقت وہ پہلا فرد نہ تھا جس نے یہ کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ یہ کارنامہ پہلے 1606ء میں ایک شخص جان لپٹن کے ساتھ منسوب کیا گیا تھا۔ مابعد یہ کارنامہ ایک ڈاکو سوفٹ نک نیوسن کے ساتھ منسوب کیا گیا تھا۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ہیری سن انیز ورتھ ٹرپن کے ساتھ اس واقعہ کی کڑیاں بذات خود ملائیں ہیں۔ ایک ایک کر کے روایات ماند پڑتی چلی گئیں۔ لہٰذا ڈک ٹرپن کا تاریخ میں کیا مقام تھا؟

وہ ہمپ سٹڈ کے گاؤں ایسکس میں 1705ء میں پیدا ہوا۔ وہ جان ٹرپن نامی ایک شخص کا بیٹا تھا جو ایک قصاب تھا۔ جان ٹرپن بل ان کا ایک زمیندار بن چکا تھا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں پر رچرڈ نے جنم لیا تھا۔ ٹرپن خاندان ایک باعزت گھرانہ تھا۔ رچرڈ نے اس دور کے تقاضوں کے عین مطابق تعلیم حاصل کی۔ اس نے جیمز اسمتھ نامی ایک شخص سے تعلیم حاصل کی۔ استاد اور شاگرد دونوں اس حقیقت سے ناواقف تھے کہ برسوں بعد قسمت کس طرح ان دونوں کو اکٹھا کر دے گی۔

جیمز اسمتھ کے والد کی ایک خادمہ تھی جس کا نام بٹی ملنگٹن تھا۔ وہ رچرڈ کے دل میں سما چکی تھی اور اس کی محبوبہ کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ 1728ء میں اس نے بٹی کے ساتھ شادی کر لی۔ اس وقت تک وہ قصاب کی تربیت حاصل کرنے میں پانچ برس صرف کر چکا تھا۔ اس نے تھاکس ٹڈ۔ ایسکس کے مقام پر اپنی قصاب کی دوکان کھول لی تھی۔ جلد ہی یہ سرگوشیاں ہونے لگیں کہ ڈک نے اسراف بے جا شروع کر رکھا تھا اور بری صحبت اختیار کر رکھی تھی اور چھوٹی موٹی ڈکیتی کی وارداتیں سرانجام دے کر اپنے اخراجات کی تکمیل سرانجام دیتا تھا۔ وہ یا تو بدقسمت تھا یا پھر ایک غریب دوکان دار تھا۔ تھاکس ٹڈ کی دوکان ناکامی سے دوچار ہو چکی تھی اور وہ اینڈ فیلڈ کی جانب روانہ ہو گیا...... مابعد سیوارڈ اسٹون کی جانب روانہ ہو گیا۔ غیر ادا شدہ بلوں کا ایک ڈھیر واجب الادا تھا۔

1733ء میں مسٹر گائلز کے کچھ بیل گم ہو گئے تھے۔ ان پر مخصوص نشان لگے ہوئے تھے۔ اس نے ان بیلوں کو برآمد کرنے والے کے لئے انعام مقرر کر رکھا تھا۔ ٹرپن کے ذبح خانے میں جانوروں کے دو ایسے ڈھانچے ملے تھے جو گم شدہ جانوروں سے مشابہت رکھتے تھے۔ لیکن کچھ ثابت نہ ہو سکا تھا۔ لیکن دو افراد جو انعام کے لالچ میں اپنی جدوجہد میں مصروف تھے انہوں نے کچھ ایسے ثبوت اور شواہد اکٹھے کئے جو انہیں اس چرم ساز کے

پاس لے گئے جس کے ہاتھ ٹرپن نے کھالیں فروخت کی تھیں۔ لہٰذا مسٹر گائلز نے قانون کا دروازہ کھٹکھٹایا اور رچرڈ ٹرپن کی گرفتاری کے لئے احکامات جاری کر دیے گئے۔ لیکن ٹرپن فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ سمگلروں کے ایک گروہ کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے گرے گوری کے گروہ میں شمولیت اختیار کر لی۔ یہ چوروں کا ایک گروہ تھا جو بیرون لندن اپنی کارروائیاں سرانجام دیتا تھا۔ جب سے ٹرپن اس گروہ کا رکن بنا تھا اس وقت سے اس گروہ کی کامیابی عروج پر تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹرپن ایک دلیر فرد واقع ہوا تھا۔ اس گروہ کا طریقہ واردات کچھ اس طرز کا حامل تھا کہ وہ کسی گھر کے دروازے پر دستک دیتے تھے اور جب دروازہ کھلتا تھا تب وہ فوراً گھر کے اندر داخل ہو جاتے تھے۔ ایک روز ان کا یہ طریقہ واردات ناکامی سے ہمکنار ہو گیا۔ انہوں نے بارکنگ کے نزدیک ایک کسان کے گھر کے دروازے پر دستک دی لیکن انہیں کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ ٹرپن کی سربراہی میں انہوں نے دروازے کو توڑ ڈالا۔ کسان اور اس کے اہل خانہ کو باندھ دیا اور گھر کو لوٹ لیا۔ اس گھر سے ان کو 700 پونڈ نقد ہاتھ لگے اور اس کے علاوہ کچھ قیمتی ساز وسامان بھی ہاتھ لگا۔ ٹرپن خوشی سے چلا اٹھا۔

اس کے بعد وہ دیگر وارداتیں بھی کرتے رہے اور ٹرپن پر آسائش زندگی بسر کرنے لگا۔ انہوں نے مسٹر میسن کے گھر کارروائی سرانجام دینے کا فیصلہ کیا۔ مسٹر میسن ان کی ناجائز سرگرمیوں سے واقف ہو چکا تھا اور وہ اسے عبرت ناک سبق سکھانا چاہتے تھے اور ایک اخباری اطلاع کے مطابق کہ:۔

"گھر میں داخل ہونے کے بعد انہوں نے مسٹر میسن پر انتہائی تشدد کیا......اس کی ایک چھوٹی لڑکی نے گھر سے بھاگ کر اپنی جان بچائی"

فرنیچر کی ہر ایک لکڑی مسٹر میسن پر توڑنے کے بعد وہ اس کا مال واسباب لوٹ کر فرار ہو گئے۔

مسٹر سنڈرز ایک امیر اور خوشحال کسان تھا۔ 11 جنوری 1735ء کو ٹرپن اور اس کا گروہ اس کے گھر پر ٹوٹ پڑا۔ انہوں نے اس کے گھر سے 100 پونڈ اور اس کی تمام تر چاندی پر قبضہ کر لیا۔

تین ہفتے بعد وہ ایک بوڑھی بیوہ شیلے کے گھر میں جا گھسے۔ انہوں نے اپنی پستولوں کے ساتھ اسے زدوکوب کیا کیونکہ وہ اپنی دولت کے بارے میں انہیں نہیں بتا رہی تھی کہ اس نے کہاں چھپا رکھی تھی۔ انہوں نے اسے حکم دیا کہ وہ اپنی دولت کے بارے میں انہیں بتائے۔ لیکن اس نے بڑی بہادری کے ساتھ انکار کر دیا۔ انہوں نے اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے فوری طور پر انہیں اپنی دولت کے بارے میں نہ بتایا کہ اس نے اسے کہاں چھپا رکھی تھی تو وہ اسے آگ میں جھونک دیں گے۔ وہ بوڑھی عورت اپنے بیٹے کی وجہ سے قسمت کی ستم ظریفی کا شکار ہونے سے بچ گئی۔ اس کے بیٹے نے وعدہ کیا کہ اگر وہ اس کی ماں کی جان بخشی کر دیں تو وہ اسے اس بارے میں بتا سکتا تھا کہ انہوں نے دولت کہاں چھپا رکھی تھی۔ ٹرپن کی سوانح عمری تحریر کرنے والے کچھ لکھاریوں نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ٹرپن نے اس بوڑھی عورت کو واقعی آگ کی نذر کر دیا تھا۔ لیکن اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ یہ ٹرپن یا رڈرسٹ یا جوزف روز یا جان فیلڈر یا کوئی اور ہو سکتا تھا جس نے مسٹر لارنس اور اس کے اہل خانہ پر از حد تشدد کیا تھا۔ ان کو باندھنے کے بعد ان کو یہ دھمکی دی گئی تھی کہ اگر وہ اپنی دولت کے بارے میں نہیں بتائیں گے تو انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا......اس طرح وہ تمام تر مال و

اسباب لوٹنے میں کامیاب ہو گئے تھے...... اس کے بعد انہوں نے اس بوڑھے شخص کا سر بھی پھوڑ دیا تھا۔ اس پر ابلتے ہوئے پانی کی ایک کیتلی بھی انڈیل دی تھی۔ یہ واردات ڈروتھی اسٹریٹ میں سرانجام دی گئی تھی۔

اب حکام کے کانوں پر بھی جُوں رینگ چکی تھی اور وہ بھی چوکنے ہو چکے تھے۔ ماہ فروری میں ایک اعلان جاری کیا گیا کہ ہر اس گروہ کو عام معافی سے نوازا جائے گا جو اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دے گا ماسوائے اس گروہ کے جس نے ڈورتھی اسٹریٹ میں واردات سرانجام دی تھی۔ اس گروہ کے ہر ایک فرد کی گرفتاری میں مدد دینے والے کے لئے 50 پونڈ فی فرد کے حساب سے انعام بھی مقرر کیا گیا تھا اور اس گروہ میں شامل ملزمان کا ملتا جلتا حلیہ بھی شائع کیا گیا تھا۔ ٹرپن کے حلیہ میں اسے ''درمیانے سائز کا حامل شخص'' قرار دیا گیا تھا۔ چار روز بعد اس گروہ کے تین ارکان گرفتار کئے جا چکے تھے۔ فیلڈر...... روز...... اور ویلر...... ٹرپن کی گرفتاری ہنوز درکار تھی اور اس کو اشتہاری قرار دے دیا گیا تھا۔ 13 مارچ تک گرے گری گروہ کے اکثر ارکان گرفتار کئے جا چکے تھے۔ ٹرپن کی گرفتاری ہنوز باقی تھی۔ وہ اب ایک عام چور نہ رہا تھا بلکہ اس نے شاہراہوں پر لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔

10 جولائی کی شام اس نے اور اس کے ایک اور ساتھی روڈن نے دو افراد کو وینڈز ورتھ اور بارنس کامن کے دوران اپنی ڈکیتی کا نشانہ بنایا۔ 24 جولائی کو ایک شخص نے ''ٹرپن قصاب'' کو اسی مقام پر پہچان لیا تھا۔ ٹرپن اسے اپنی گولی کا نشانہ بنانا چاہتا تھا لیکن روڈن نے اس سے پستول چھین لی۔ تمام تر موسم گرما کے دوران ڈاکوؤں کے اس جوڑے نے اس شاہراہ پر ڈکیتی کی وارداتیں جاری رکھیں۔ وہ گاڑیوں کے علاوہ اِکا دُکا مسافروں کو بھی لوٹ لیتے تھے۔ ماہ اکتوبر تک وہ اس قدر رنڈر ہو چکے تھے کہ ماسک پہنے بغیر دوپہر کے وقت لندن شہر میں سواری پر گھومتے پھرتے تھے اور کسی کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ انہیں چیلنج کر سکے۔ پورٹ ماؤتھ روڈ کے مسافر اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ شاہراہ کے ان دونوں لٹیروں سے محفوظ تھے جو کہ وارداتیں قبل ایسکس میں موجود تھے...... لیکن وہ وہاں پر موجود نہ تھے...... وہ دونوں مکمل پیشہ ور ڈاکوؤں کا روپ دھار چکے تھے۔ ڈروری لین میں ایک بدقسمت کریانہ فروش کو لوٹنے کے بعد وہ دونوں گھوڑوں پر سوار واپس مڑے اور انتہائی فخر کے ساتھ اپنے شکار کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے کہ:۔

''اگر تمہیں کوئی پوچھے کہ تمہیں کس نے لوٹا ہے...... بے شک اسے بتا دینا کہ مجھے ٹرپن نے لوٹا ہے''

اس مظلوم کریانہ فروش نے یہ سب کچھ لوگوں کو بتایا اور ٹرپن کے چرچے دور دور تک ہونے لگے۔ یہ خبر بھی عام ہو چکی تھی کہ ٹرپن کے گروہ میں ایک اور ڈاکو کا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ شخص بھی شاہراہوں پر ڈاکہ زنی کی وارداتیں سرانجام دینے میں ماہر تھا۔ اس کا نام ''ٹام'' کنگ تھا (اس کا حقیقی نام رابرٹ یا باب تھا)۔ اس نے ٹرپن سے کہا تھا کہ:۔

''آؤ...... آؤ...... بھائی ٹرپن...... اگر تم مجھے نہیں جانتے...... لیکن میں تمہیں جانتا ہوں۔ مجھے تمہاری رفاقت میں خوشی حاصل ہو گی۔''

1736ء کے موسم خزاں کے دوران وہ دونوں اکٹھے دیکھے گئے تھے...... ایک متاثر کن جوڑے کے روپ میں...... ٹرپن ایک بہترین

گھوڑے پر سوار تھا (وہ سیاہ گھوڑی ہرگز نہ تھی)۔ اس نے براؤن رنگ کا کوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔

ٹرپن خواتین کیلئے باعث کشش تھا۔ اگر چہ اپنی شادی کے ابتدائی ایام کے دوران وہ اپنی بیوی کے ساتھ بہت کم وقت گزار پایا تھا لیکن اس کے باوجود بھی وہ اس کی وفادار رہی تھی اور جب کبھی وہ مشکلات میں گرفتار ہوتا تھا وہ اس کی مدد کرنے پر آمادہ رہتی تھی۔ بروگ۔ یارک شائر میں اس نے ایک داشتہ بھی رکھی ہوئی تھی۔ وہ ایک شادی شدہ عورت تھی۔ اس عورت کے ساتھ اس کے تعلقات مرتے دم تک انتہائی بہتر رہے تھے۔

ٹرپن کا قول تھا کہ:۔

''عورتوں اور شراب کو زندگی میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔''

ٹرپن اور کنگ نے بہت سے خطرات مول لئے تھے۔ 1737ء کے آغاز میں حالات انتہائی خطرناک رخ اختیار کر چکے تھے۔ اس جوڑے نے اپینگ کے جنگلات میں ڈیرے لگا لئے تھے۔ ٹرپن کی وفادار خادمہ ان کے لئے اشیائے خوردونوش کی خریداری کرتی تھی۔ وہ یہ خریداری نزدیکی دیہات میں سرانجام دیتی تھی اور حکام کے ہتھے چڑھنے سے خبردار رہتی تھی۔

مئی 1737ء میں ان کے ساتھ ایک سانحہ پیش آیا۔ اس سانحہ کے بارے میں ''جنٹلمین میگزین'' نے کچھ رپورٹ پیش کی تھی کہ:۔

''شاہراہوں کے دو ڈاکو جو کہ ٹرپن کے ساتھی تھے درج ذیل طریقے سے قانون کی گرفت میں آ گئے......

انہوں نے ایک گھوڑی ریڈ لائن سرائے...... وائٹ چیپل کے باہر باندھی تھی جو کہ ایک مسروقہ گھوڑی تھی۔ اتفاقاً اس گھوڑی کا مالک بھی اس سرائے میں آ گیا۔ وہ صبح چار بجے تک انتظار میں مصروف رہا جبکہ میتھیو کنگ اس گھوڑی کو لینے کیلئے آن پہنچا ...... اس کو روک لیا گیا اور اس نے یہ اعتراف کیا کہ اس کا بھائی رابرٹ کنگ گلوسٹر اسٹریٹ میں ٹرپن کے ہمراہ موجود تھا۔ ٹرپن گھوڑے پر سوار تھا جبکہ اس کا بھائی پیدل تھا۔ رابرٹ کنگ کو بھی پکڑ لیا گیا لیکن ٹرپن گھوڑے پر سوار بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہاتھا پائی کے دوران میتھیو کنگ کو گولی لگ گئی جس کے زخم کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ چل بسا۔ لیکن ٹرپن اپینگ کے جنگلات میں ہی مقیم رہا اور اس نے ایک محنت کش کو ہلاک کر ڈالا جس نے اس پر قابو پانے کی کوشش کی تھی۔''

وہ محنت کش جنگل کے ایک نگران کا ملازم تھا۔ اس نگران نے ٹرپن کو جنگل میں تلاش کیا اور وہ اس کے ہتھے بھی چڑھ گیا۔ ٹرپن کے پاس بندوق موجود تھی۔ اس نے اپنے حملہ آور کے معدے میں گولی پیوست کرتے ہوئے اسے فوراً موت کی نیند سلا دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس ڈاکو پر قتل کا الزام بھی عائد کیا جا سکتا تھا جو اس سے پیشتر محض ایک خطرناک ڈاکو تھا۔

ٹرپن فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس کی قیام گاہ ایک غار تھی جس میں گھاس پھوس کا ایک بستر۔ ڈبل روٹی۔ شراب اور بیٹی کی لائی ہوئی صاف ستھری قمیض موجود تھی۔ اس نے گھوڑے تبدیل کرتے ہوئے اپنا تعاقب کرنے والوں کو دھوکہ دیا اور کامیابی کے ساتھ اپنے آپ کو قانون کے ہاتھوں بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ اگلے چند ماہ تک اس کے بارے میں یہ افواہیں گردش کرتی رہیں کہ اسے یہاں دیکھا گیا تھا' وہاں دیکھا گیا تھا۔ شاید اس کو گرفتار کرنے کی قابل ذکر جدوجہد سرانجام نہ دی گئی تھی۔ اس کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا گیا تھا کہ وہ زندہ گرفتاری پیش کرنے کی

بجائے اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دے گا۔ رابرٹ کنگ بھی گڈمین کے کھیتوں میں ہاتھا پائی کے دوران زخمی ہو چکا تھا اور نیو گیٹ میں اس کی حالت از حد خراب تھی...... اس کا زخم اس لئے زیادہ بگڑ گیا تھا کہ پولیس نے اس پر تشدد کیا تھا۔ وہ اس سے ٹرپن کے بارے میں دریافت کرنا چاہتے تھے۔ 19 مئی کو وہ موت سے ہمکنار ہو گیا۔ اس کے بھائی کو تائے برن میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

یہ افواہ گشت کر رہی تھی کہ ٹرپن بھی گرفتار کیا جا چکا تھا...... لوگ شرطیں باندھ رہے تھے...... یہ بھی افواہ تھی کہ اسے ہرٹ فورڈ یا واٹ فورڈ میں رکھا گیا تھا...... اسے ایک افسر نے گولی مار دی تھی...... لیکن ان میں سے کوئی خبر بھی درست نہ تھی۔ اگرچہ وہ ہرٹ فورڈ میں موجود تھا لیکن وہ محض اس لئے اس مقام پر موجود تھا کہ بیٹی سے ایک سرائے میں ملاقات کر سکے۔ یہاں پر اس کے ایک دیرینہ دشمن کی نظر اس پر پڑ گئی۔ وہ اس پر کود پڑا۔ لیکن جب قانون کے رکھوالے نمودار ہوئے اس وقت تک ٹرپن راہ فرار اختیار کر چکا تھا۔ اس نے کھڑکی سے چھلانگ لگا دی تھی اور سرپٹ گھوڑا دوڑاتے ہوئے غائب ہو چکا تھا۔

ماہ جون تک اپنگ کے جنگل میں فائرنگ کرنے والے ملزم کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے پر 200 پونڈ کا انعام مقرر کیا گیا۔ وہ اس شخص کو گرفتار کرنا چاہتے تھے جو ایک ماہ سے بھی کم عرصہ بعد ٹوٹن ہام ہائی کراس پر ایک ملازم لڑکے کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ کیا وہ ''لڑکا'' حقیقت میں لڑکی تھی ...... یعنی بیٹی تھی جو ہنوز نوجوان تھی اور ایک نوجوان لڑکے کا روپ دھار سکتی تھی۔ وہی لڑکا اس کے ساتھ مانچسٹر ریس پر بھی دیکھا گیا تھا۔ اب ایسا دکھائی دیتا تھا کہ وہ بروگ کے ہمسایہ میں واقع ویلٹن میں آباد ہو چکا تھا...... جان پالمر کے نام کے تحت...... اس کے پاس کافی دولت موجود تھی اور وہ ایک قابل عزت گھوڑوں کا ڈیلر بن چکا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنی فیملی سے ملاقات کا خطرہ مول لیا جو ایسکس میں قیام پذیر تھی۔ حکام نظر رکھے ہوئے تھے...... ٹرپن پر نہیں بلکہ اس کے باپ پر...... جس نے ستمبر 1738ء میں ایک گھوڑا چوری کیا تھا۔ ٹرپن سے ایک غلطی سرزد ہو گئی۔ اس نے قلیل مقدار میں شراب پی رکھی تھی۔ گلی سے گزرتے ہوئے اس نے ایک مرغ کو اپنی گولی کا نشانہ بنا ڈالا۔ اس نے بڑی سہولت کے ساتھ اپنی بندوق اٹھائی اس کا نشانہ لے ڈالا۔

اس کا ساتھی مسٹر ہال اس کے اس غیر متوقع عمل درآمد کی بدولت سخت صدمے سے دوچار ہوا اور اسے سخت برا بھلا کہا۔ ٹرپن نے اسے دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ اگر ہال محض اتنا انتظار کرے کہ وہ اپنی بندوق دوبارہ چارج کر سکے تو وہ اسے بھی گولی سے اڑا دے گا۔ ہال غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ اس نے اس واقعہ کے بارے میں پرندے کے مالک کو بتایا اور ساتھ ٹرپن کی دھمکی کے بارے میں بھی بتایا۔ وہ شخص ٹرپن کا مالک مکان تھا۔ اس نے ایک کانسٹیبل کو اس واقعہ کی اطلاع دی اور 3 اکتوبر کو ''جان پالمر'' گرفتار کر لیا گیا اور جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس کی ضمانت دینے والا بھی کوئی نہ تھا۔ حکام نے ''پالمر'' کو ایک ''انتہائی خطرناک ملزم'' قرار دیا اور اس کے خلاف چھان بین شروع کر دی۔ 16 اکتوبر تک ٹرپن گول میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس وقت تک اس کی اس حیثیت میں شناخت نہیں ہو سکی تھی جس حیثیت کا وہ حامل تھا۔ اس کو محض ایک بے ایمان گھوڑوں کا ڈیلر تصور کیا جا رہا تھا۔ اس نے پالمر کے نام کے تحت ہمپس ٹیڈ میں اپنے برادر نسبتی کو خط لکھا اور اس سے مدد کی درخواست کی۔

اب اس کی قسمت نے ایک اور پلٹا کھایا۔ ٹرپن کے برادر نسبتی نے اس کے خط کی ٹکٹ کی قیمت ادا کرنے سے انکار کیا اور خط کی وصولی

سے بھی انکار کیا۔لہٰذا یہ خط واپس ہمپس ٹیڈ پوسٹ آفس بھیج دیا گیا جہاں پر جیمز اسمتھ کی نظر اس خط پر پڑی۔ وہ ٹرپن کے اسکول کا استاد رہ چکا تھا۔ وہ اپنے پرانے شاگرد کی لکھائی بخوبی پہچانتا تھا۔ کچھ انعام کے حصول کا لالچ بھی اس کے زیر نظر تھا۔لہٰذا وہ خط لے کر مجسٹریٹ کے پاس چلا آیا۔اس مجسٹریٹ نے خط کھول لیا۔

سچ منظر عام پر آچکا تھا۔ 22 مارچ 1739ء میں یارک قلعہ میں مقدمے کی مختصر کارروائی سرانجام دی گئی۔ ملک بھر سے لوگ اسے دیکھنے کے لئے آنے لگے۔ یہ لوگ اس کے مداح تھے اوران لوگوں نے اس پر شراب' خوراک اور دیگر اشیاء کی بارش کردی۔لیکن 22 مارچ کو وہ اکیلا کھڑا تھا۔ جیوری نے اسے قصوروار پایا تھا اوراسے موت کی سزا سنائی تھی۔ اس نے اپنی سزائے موت پرعمل درآمد سے پیشتر کئی ایک ہفتے شراب پیتے ہوئے......کھانا کھاتے ہوئے اور اپنے ملاقاتیوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے ہوئے گزارے۔ 7 اپریل بروز ہفتہ اسے پھانسی گھر لایا گیا۔ایک رپورٹر نے اس واقعہ کی تفصیل کچھ یوں بیان کی کہ:۔

''ٹرپن نے انتہائی دلیری کا مظاہرہ کیا۔ جوں ہی وہ سیڑھی چڑھنے لگا اس کی دائیں ٹانگ میں ہلکی سی لرزش ہوئی۔لیکن اس نے جلد ہی اس لرزش پر قابو پالیا......اس کے منہ سے کچھ الفاظ بھی ادا ہوئے......اس کے بعد پھانسی کی کارروائی مکمل کی گئی اور پانچ منٹ کے اندر اندر وہ موت کو گلے لگا چکا تھا''۔

انہوں نے اسے سینٹ جارج کے قبرستان میں دفن کردیا۔اس کی قبر پر ان الفاظ کا کتبہ لگایا گیا کہ:۔

''آر۔ٹی......عمر 28 برس''

اس کے بعد یہ افواہ بھی سننے میں آئی کہ لاش چوروں نے اس کی لاش چرالی تھی۔لوگوں نے اس کی لاش ان لوگوں سے واپس لی اور دوبارہ قبر کے حوالے کردی۔ وہ گنگناتے رہے تھے:۔

اوہ ٹرپن عجیب وغریب ہیرو......اوہ عجیب وغریب ٹرپن اوہ......

کیپٹن واڈ اور میڈیم لاکوٹر

یہ ایک خاموش مگر خطرناک شام تھی جبکہ جارج رائٹ نے اپنی کشتی فلوریڈا کے ساحل کے ایک ویران حصے پر روکی اور یہاں پر ایک مرد اور ایک خاتون کو انتہائی مایوسی کے عالم میں پایا۔

یہ دونوں فرانسیسی تھے۔ وہ مرد کیپٹن پیری واڈ تھا۔ وہ اپنی عمر کے 30 ویں برس میں تھا لیکن اس قدر کمزور اور علیل تھا کہ چلنے پھرنے سے عاجز تھا اور وہ خاتون جس کا نام میڈم لاکوٹر تھا وہ بھی اپنی عمر کے 30 ویں برس میں تھی لیکن وہ جسمانی لحاظ سے ایک بہتر صورت حال کی حامل تھی۔ اس کی جسمانی صورت حال اپنے ساتھی کے مقابلے میں بہتر دکھائی دے رہی تھی۔ اگرچہ اس کے چہرے پر تکلیف اور کرب کے آثار نمایاں تھے...... وہ کرب اور تکلیف جو اس نے جھیلی تھی ...... برداشت کی تھی۔ انگریزوں کی جان بچانے والی اس جماعت پر یہ امر واضح تھا کہ وہ ایک غیر معمولی کشش کی حامل نوجوان خاتون تھی۔

6 مئی 1766ء کی اس شب تنہائی کے مارے ویران ساحل پر کیمپ کی آگ کے اردگرد بیٹھتے ہوئے واڈ نے اپنی مہمات کی دلچسپ اور حیرت انگیز داستان انگریز سپاہیوں کو سنائی۔ اس کہانی نے ان انگریز سپاہیوں کو جگائے رکھا جس طرح اس خطرناک طوفان نے انہیں جگائے رکھا تھا جو اسی شب منظر عام پر آیا تھا اور جس کے دوران کیپٹن واڈ اور میڈم لاکوٹر معصوم بچوں کی مانند سوئے تھے۔ وہ کیسے اس انداز سے سو سکے تھے...... انہوں نے کیا کچھ سرانجام دیا تھا...... یہ سب کچھ ان کی برطانوی جان بچانے والی جماعت کے فہم و ادراک کی زینت بنا تھا۔

کیپٹن واڈ کی داستان سرکاری طور پر لیفٹیننٹ جارج سوئٹن ہام نے بیان کی تھی جو فلوریڈا میں سینٹ مارک کے قلعے کا فوجی کمانڈر تھا...... اور اسی کے احکامات کے تحت این سائن رائٹ...... چار سپاہی اور ایک ترجمان نے فلوریڈا کے ساحل پر ان لوگوں کی تلاش کی ذمہ داری سرانجام دی تھی جن کے بارے میں قیاس کیا جاتا تھا کہ وہ جہاز کی تباہی کے بعد اس ساحل پر موجود ہو سکتے تھے۔

پیری واڈ فرانسیسی بحریہ میں کیپٹن کے عہدے پر فائز تھا جس کے پاس تجارتی بحری جہازوں کی کمان بھی تھی۔ وہ رپورٹ جس کی تصدیق لیفٹیننٹ سویٹ ہام نے کی تھی...... وہ محض اس لئے تحریر کی گئی تھی کہ اس کے رشتہ داروں اور دیگر احباب کو ان خدشات سے نجات دلائی جا سکے جس کے تحت وہ یہ تصور کرنے پر مجبور تھے کہ کیپٹن واڈ اپنے آخری بحری سفر میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ یہ رپورٹ بعد میں شائع بھی ہوئی تھی اور 18 ویں صدی کے فرانس میں اس کی بڑھ چڑھ کر فروخت ہوئی تھی۔

1765ء میں واڈ بورڈیکس سے ویسٹ انڈیز کے بحری سفر پر روانہ ہوا تھا۔ اس کے جہاز کا نام ''ایل۔ ایمی ایبل سوزٹ'' تھا۔ اس دوران وہ علیل ہو گیا تھا۔ اس کی صحت یابی کے عمل کے دوران اس کی دوستی ایک تاجر سے ہو گئی جس کا نام ڈسکلا تھا۔ اس نے اسے دعوت دی کہ وہ ایک تجارتی

مہم میں شمولیت اختیار کرے۔ واڈ نے اس کی دعوت قبول کر لی اور دونوں 2 جنوری 1766ء کو لی ٹائیگر نامی جہاز میں عازم سفر ہوئے۔ اس جہاز کی کمان کیپٹن لاکوٹر کے ذمہ تھی۔

اس جہاز میں سوار 16 افراد میں سے چھ مسافر تھے......واڈ......ڈ سکلا......کیپٹن کی اہلیہ میڈیم لاکوٹر......ان کا تیرہ سالہ بیٹا پیری لاکوٹر...... اور ایک نیگرو غلام۔

جہاز کی تباہی کی وجہ محض کیپٹن لاکوٹر کی ناقص جہاز رانی تھی۔ واڈ نے اس کی جہاز رانی کی صلاحیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

''وہ جہاز ران نہ تھا''

لی ٹائیگر ایک حادثے کا شکار ہو کر ایک چھوٹے سے جزیرے کے ساحل کی جانب بڑھ گیا تھا۔ دو راتوں تک جہاز کے ساتھ جدوجہد میں مصروف رہنے کے بعد جہاز میں سوار افراد نے اس جزیرے تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یہاں پر ان کا سامنا کچھ انڈین سے ہوا جنہوں نے انہیں یہ یقین دہانی کروائی کہ وہ سینٹ مارک کے قلعے تک ان کی رہنمائی کا کام سرانجام دیں گے۔ لیکن وہ انڈین غدار ثابت ہوئے۔ وہ محض انہیں اپنی لوٹ مار کا نشانہ بنانا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ تباہ شدہ جہاز کے ملبے کو بھی اپنی لوٹ مار کا نشانہ بنانا چاہتے تھے۔

تحفظ کے نظریے کے تحت یہ جماعت مختلف حصوں میں بکھر گئی۔ ان میں سے چھ افراد انڈین کے ہمراہ ایک چھوٹی کشتی میں سوار ہو کر اپنی دانست میں سینٹ مارک کے قلعے کی جانب روانہ ہوئے لیکن انڈین نے انہیں ایک اور جزیرے پر اتار دیا۔ ان کے پاس جو کچھ موجود تھا وہ سب کچھ لوٹ لیا اور ان کو ان کی قسمت کے حوالے کر کے چلے گئے۔ ان چھ افراد کے نام درج ذیل تھے:۔

☆ واڈ

☆ ڈ سکلا

☆ لاکوٹر

☆ میڈیم لاکوٹر

☆ ان کا بیٹا پیری

☆ واڈ کا نیگرو غلام

اس جزیرے پر خوراک کا نام و نشان تک نہ تھا۔ حتیٰ کہ اس جزیرے میں شیل۔ مچھلی بھی نہ پائی جاتی تھی اور ان کو تازہ پانی بھی دستیاب نہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے ایک اور جزیرے کا رخ کیا۔ اگرچہ اس جزیرے پر انہیں پانی میسر آ گیا لیکن وہ قابل رحم زندگی گزارنے پر مجبور رہے۔ بالآخر انہوں نے اس امید سے ایک کشتی تیار کی کہ مدد کے حصول کے لئے کسی نزدیکی سرزمین کا رخ کر سکیں۔ لیکن اس کشتی میں محض تین افراد کے بیٹھنے کی گنجائش موجود تھی۔

نوجوان پیری لاکوٹر اب علیل تھا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ اسے اور اس کی والدہ کو نیگرو غلام کے ہمراہ جزیرے پر ہی چھوڑا جائے جبکہ واڈ لاکوٹر

اور ڈسکلا حصول مدد کی کوشش کے لئے چل نکلے۔

میڈیم لاکوٹرا اکیلے رہنے کے خوف میں مبتلا تھی۔ وہ اس نکتہ نظر کی حامل تھی کہ وہ بچھڑنے والوں کو دوبارہ نہ دیکھ سکے گی۔ ان تینوں افراد نے تمام رات اسے اس جزیرے پر مقیم رہنے کیلئے آمادہ کرنے پر گزار دی۔ بالآخر اس کے پاس کوئی چارہ کار باقی نہ تھا ماسوائے اس جزیرے پر مقیم رہنے کے بارے میں اپنی رضامندی ظاہر کرنے کے...... لہٰذا بقایا تین افراد صبح سویرے اس جزیرے سے نکل کھڑے ہوئے۔ اس وقت تک وہ اس کا خوف وہراس دور کرنے کے لئے جو کچھ بھی کر سکتے وہ سب کچھ وہ کر چکے تھے۔ لیکن جب واڈ دیگر دو ساتھیوں کے ہمراہ کشتی پر سوار ہونے لگا تب اس نے محسوس کیا کہ یہ کشتی تین افراد کا بوجھ برداشت نہ کر سکے گی۔ لہٰذا اس نے عازم سفر ہونے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور دیگر دو افراد اس کے بغیر ہی عازم سفر ہوئے۔

وہ تحریر کرتا ہے کہ:۔

''میں نے دیکھا کہ انہوں نے انتہائی دقت کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کیا۔ وہ ایک چھوٹے سے جزیرے کی جانب مڑ گئے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے...... اور میں انہیں دوبارہ کبھی نہ دیکھ سکا۔''

اور نہ ہی کوئی اور انہیں دوبارہ دیکھ سکا۔

وہ اپنی بیوی اور بچے کی جانب واپس پلٹ آیا۔ وہ زاروقطار رو رہی تھی۔ اس کے قریب ہی اس کے بیٹے کا بے حس وحرکت جسم پڑا تھا۔

اگرچہ واڈ اپنی داستان میں اپنے آپ کو ایک ہیرو کے روپ میں پیش کرتا ہے لیکن اس مہم کے حقیقی ہیرو میڈیم لاکوٹرا اور اس کا بیٹا تھے جس کے کمزور جسم میں ایک بہت بہادر روح سمائی ہوئی تھی۔ کیپٹن لاکوٹرا اور نہ ہی ڈسکلا نے صحیح معنوں میں انسانیت کا مظاہرہ کیا اور اس خاتون اور اس کے بیٹے کو جزیرے پر تنہا چھوڑ دیا...... کیونکہ وہ اپنے آپ کو بچانے کیلئے کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے تھے...... اور حقیقت یہ تھی کہ واڈ بھی ان کے ہمراہ جانے پر آمادہ تھا لیکن کشتی کی کمزوری کی بنا پر وہ کشتی میں سوار نہ ہو سکا کیونکہ کشتی تین سواروں کا بوجھ نہیں سہار سکتی تھی۔

ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ کسی بھی جانب سے کوئی مدد نہیں آئی تھی۔ خوراک کی بھی قلت واقع ہو چکی تھی۔ اب شل مچھلی بھی دستیاب نہ تھی۔ وہ جنگلی بوٹیاں وغیرہ کھا کر گزارا کر رہے تھے جس کی بنا پر ان کے معدے جواب دے گئے تھے۔ انہوں نے ایک کشتی تیار کی لیکن جب وہ وہاں سے روانہ ہونے کے لئے تیار ہوئے تب ان کا بیٹا پیری لاکوٹرا اس قدر شدید علیل ہو گیا کہ اس کی شدید علالت کے باعث وہ روانہ نہ ہو سکے۔ اس کی والدہ اور واڈ پر یہ واضح ہو چکا تھا کہ یہ لڑکا موت کے منہ میں جا رہا تھا۔

نوجوان پیری نے اس موقع پر اس جرأت کا مظاہرہ کیا جس جرأت کا مظاہرہ اس مہم میں شامل اس کے تمام ساتھیوں نے اکٹھے مل کر بھی نہ کیا تھا۔ واڈ کے بقول...... جس کے الفاظ ہمیں تسلیم کرنے چاہئیں...... اس نے اس امر پر اصرار کیا کہ وہ اسے جزیرے پر چھوڑ بذات خود وہاں سے روانہ ہو جائیں اور اپنی جانیں بچا لیں اور یہ واڈ اور لڑکے کے درمیان ایک سازش کا نتیجہ تھا کہ اس کی ماں اس یقین کی حامل ہو گئی کہ اس کا بیٹا موت کو گلے لگا چکا تھا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس کے بیٹے میں ہنوز سانس کی رمق باقی تھی تو وہ کبھی بھی اسے چھوڑ کر نہ جاتی۔ واڈ کو کوئی تامل نہ تھا۔ لڑکے کے

بارے میں یہ کہا گیا کہ وہ موت سے ہمکنار ہو چکا تھا۔

اور واڈ...... میڈم لاکوٹر اور نیگرو غلام اپنی ہی تیار کردہ کشتی میں عازم سفر ہوئے۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ پانی ساکت تھا اور وہ دلدل اور جنگل سے بھرے ہوئے ایک جزیرے پر جا پہنچے۔

اس جزیرے پر انہیں جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا وہ مصائب ان مصائب سے کسی قدر بڑھ چکے تھے جس کا سامنا انہوں نے گذشتہ جزیرے پر کیا تھا۔ یہ جگہ خطرناک درندوں اور سانپوں کا مسکن تھی۔

تاہم بھوک ان کا ایک بڑا دشمن تھی۔ انہیں کھانے کیلئے کچھ بھی دستیاب نہ تھا حتیٰ کہ ساحلوں پر دستیاب روائتی پھل بھی مفقود تھے۔ بھوک کی شدت سے بے تاب ہو کر انہوں نے درختوں کے پتے کھائے جس کی بنا پر وہ بیماری سے ہمکنار ہو گئے۔

انہوں نے نیم فاقہ کشی کی حالت میں اپنی جدوجہد جاری رکھی اور ایک شام جب انہیں یہ محسوس ہوا کہ ان کی بھوک ان کی برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی اور ان کی مایوسی بھی حد سے بڑھ چکی تھی تب واڈ کے ذہن میں ایک خوفناک خیال آیا۔

اس نے اپنے نیگرو غلام کی جانب دیکھا...... وہ مخلوق جسے وہ اپنے ہمراہ لایا تھا اور جس کا جسم اس کی ملکیت تھا۔ اس نے تحریر کیا کہ:۔

''کیا میں اس اعتراف کی جرأت کر سکتا ہوں؟''

''میں جو کچھ آپ کو بتانے جا رہا ہوں یہ سن کر آپ کی رگوں میں دوڑنے والا خون سرد پڑ جائے گا۔ لیکن اس کے باوجود بھی آپ کا خوف اس خوف سے بڑھ کر نہ ہوگا جس خوف سے میں بذات خود دوچار تھا۔ میں نے میڈیم لاکوٹر سے آنکھیں چار کیں جو نیم مردہ حالت میں زمین پر پڑی تھی اور ان میں جھانکا...... اور ان میں بھی میں نے اپنے غیر انسانی خیال کی جھلک دیکھی۔ اس نے میری وساطت سے نیگرو کی جانب دیکھا اور اس کی آنکھوں نے بھی اس کی خواہش کا اظہار کر دیا اور اس شدت کے ساتھ کیا کہ الفاظ کے تحت اتنی شدت کے ساتھ یہ اظہار ممکن نہ تھا۔''

جہاں تک بدقسمت نیگرو کا تعلق تھا:۔

''وہ میری جائیداد کی مانند تھا۔ وہ میرے دائرہ اختیار میں تھا اور میرے استعمال کے لئے تھا۔ وہ اس بڑھ کر میری کیا خدمت کر سکتا تھا جس خدمت کی انجام دہی کا موقع میں اسے فراہم کر رہا تھا''۔

ان دنوں غلاموں کے ساتھ بدتر سلوک روا رکھا جاتا تھا اور اس لحاظ سے واڈ کو اپنے اس خیال میں کوئی قباحت نظر نہ آئی تھی۔ نیگرو غلام کو ہلاک کرنا تاکہ وہ اس کا گوشت کھا سکیں ایک خوفناک فعل تھا۔ اگرچہ انہوں نے اپنی زندگیاں بچا لیں۔ اس نیگرو غلام کا گوشت پکا کر کھاتے ہوئے لیکن ان کا ضمیر ان کو کچوکے لگاتا رہا اور ان کے اس عمل در آمد پر انہیں لعن طعن کرتا رہا۔

واڈ نے اپنی یادداشتوں میں تحریر کیا تھا کہ:۔

''میرا خیال ہے کہ اس وقت ہم دونوں پاگل ہو رہے تھے''

اس کے باوجود بھی بھوک مٹانا ان کے لئے مسئلہ ہی بنا رہا اور انہوں نے اس جزیرے پر کسمپرسی کے عالم میں دن گزارے۔

ایک روز انہوں نے ایک تالاب کے کنارے ایک بڑا مگرمچھ دیکھا۔ یہ ان کی کئی دنوں کی خوراک کیلئے کافی ہوسکتا تھا...... بشرطیکہ وہ اسے ہلاک کر سکتے۔ واڈ نے اسے اپنے بھاری ڈنڈے کے ساتھ ہلاک کرنے کی کوشش کی لیکن وہ درندہ انتہائی غصے کے عالم میں اس پر حملہ آور ہونے کے لئے پر تولنے لگا۔ جوں ہی اس نے ان پر حملہ آور ہونے کے لئے جبڑے کھولے...... اس نے اپنے ڈنڈے کا نوکدار سرا مگرمچھ کے منہ میں پوری قوت سے دے مارا اور مگرمچھ زمین پر گر پڑا۔

میڈم ڈی کوترا اپنے ساتھی کی مدد کو آن پہنچی تھی۔ اس کے ہاتھ میں درخت کی ایک مضبوط شاخ تھی۔ ان دونوں نے مل کر بالآخر مگرمچھ کو ہلاک کر ڈالا۔ انہوں نے مستقبل کے استعمال کے لئے اس کا گوشت خشک کر لیا اور اس کی کھال سے جوتے اور جرابیں تیار کر لیں۔

روز بہ روز ان کی ناامیدی اور مایوسی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ہر رات جنگلی درندے ان کی کیمپ کی آگ کے نزدیک تر کھڑے ہو کر ان پر غراتے تھے۔ دن بہ دن ان کی خوراک کا ذخیرہ بھی اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا۔

ایک دوپہر واڈ کے علم میں یہ بات آئی کہ وہ اپنا چقماق کھو بیٹھا تھا جس کے ذریعے وہ آگ روشن کرتے تھے اور اس آگ پر وہ اپنا کھانا تیار کرتے تھے اور رات کے وقت یہی آگ جنگلی درندوں کو ان سے دور رکھنے میں معاون ثابت ہوتی تھی۔ یہ ایک ایسا سانحہ تھا جو ان کے لئے جان لیوا بھی ثابت ہوسکتا تھا۔ چقماق کو کسی بھی قیمت پر ڈھونڈنا تھا۔

لہٰذا اس نے گذشتہ رات آگ جلانے کے بعد جس جگہ کا بھی رخ کیا تھا اس جگہ کا ایک ایک قدم چھان مارا۔ میڈم لاکوترمیں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اس کاوش میں اس کا ساتھ دیتی۔ لہٰذا وہ اسے اکیلا چھوڑ کر اپنی جدوجہد میں مصروف رہا۔

وہ تمام دن چقماق کو تلاش کرتا رہا۔ بالآخر اس کی جدوجہد رنگ لائی اور رات طاری ہونے سے پیشتر وہ چقماق ڈھونڈ چکا تھا۔ وہ اس خیال سے خوفزدہ تھا کہ وہ اپنی ساتھی کو اکیلا چھوڑ آیا تھا اور اس کے قریب آگ بھی روشن نہ تھی جو جنگلی درندوں کو اس سے دور رکھنے میں معاون ثابت ہوتی...... لہٰذا اندھیرے میں ہی اس نے واپسی کی راہ لی۔ اسے دیکھ کر اس کی ساتھی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اور وہ پُرسکون ہوگئی۔

وہ چلا اٹھی کہ:۔

''خدا کا شکر ہے کہ تم بخیریت ہو۔ اگر تم واپس نہ آتے تو میں یہاں کسمپرسی کی حالت میں موت کا شکار ہو جاتی''۔

اگلی صبح انہوں نے اپنی تیار کردہ کشتی میں سوار ہو کر دریا کو عبور کیا۔ دریا کے وسط میں پہنچ کر کشتی تباہ ہوگئی اور انہیں اپنی جانیں بچانے کی خاطر تیرنا پڑا۔ واڈ نے اپنی ساتھی کو لمبے اور گھنے بالوں سے تھامے رکھا تاکہ اس کو ڈوبنے سے بچا سکے۔ وہ مخالف کنارے تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ان کے جسم برہنہ تھے۔ ان کے پاس کپڑوں کے نام پر جو چیتھڑے تھے انہوں نے ان کو دھوپ میں بکھیر دیا تاکہ وہ خشک ہوسکیں۔

واڈ کو کمزوری لاحق ہو چکی تھی۔ وہ دن بہ دن کمزور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اُسے یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی تھی کہ اس کی ساتھی اس کا حوصلہ اور قوت بڑھانے میں پیش پیش تھی۔ جب وہ ساحل پر پہنچے اس وقت واڈ کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ اس نے اپنی ساتھی سے کہا کہ اسے تنہا چھوڑ دیا جائے۔

اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور اس کی سیاہ آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور وہ کہنے لگی کہ:۔

''تم نے میرے لئے جو کچھ کیا ہے...... میں تمہیں کبھی تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔''

اس نے انتہائی توجہ سے اس کی تیمارداری کی۔ اگرچہ وہ یہ جانتی تھی کہ اگر وہ ایسا نہیں کرے گی تب دونوں کی ہلاکت یقینی تھی۔

تب ایک شام جب وہ خوراک کی تلاش میں اس سے دور نکل گئی تھی اور واڈ ریت پر دراز اپنے آپ کو موت کے قریب تر محسوس کر رہا تھا ......اس نے سمندر میں ایک کشتی دیکھی جس میں انگریز سپاہ سوار تھی۔ اس نے سوچا کہ شاید وہ ھذیانی کیفیت کا شکار تھا۔ لیکن کشتی وہاں موجود تھی یہ این سائن رائٹ اور اس کی امدادی جماعت تھی جو سینٹ مارک سے آئے تھے۔ اس نے میڈم لاکوٹر کو یہ غمناک خبر سنائی کہ اس کے خاوند کی لاش آبائی لوگوں کی ایک جماعت نے دریافت کی تھی جس کو مگرمچھ جزوی طور پر کھا چکے تھے اور اس لاش کی دریافت کے بعد لیفٹیننٹ سوئین ہام نے اس امدادی جماعت کو روانہ کیا تھا۔

سپاہی انہیں واپس اسی جزیرے پر لے گئے جہاں پر انہوں نے 19 روز پیشتر پیری لاکوٹر کو چھوڑا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اس نوجوان کو عزت واحترام کے ساتھ دفن کریں۔

انہوں نے اس نوجوان کو ریت پر پڑا پایا۔ سپاہیوں نے اس کے لئے قبر کھود رکھی تھی جبکہ ایک سپاہی کو یہ محسوس ہوا کہ پیری کی سانس ہنوز چل رہی تھی۔

لہٰذا وہ اسے اپنے ساتھ سینٹ مارک واپس لے آئے اور آہستہ آہستہ وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو گیا۔

اور ان افراد کے بارے میں کیا خیال ہے جنہوں نے اس خوفناک مہم میں شرکت کی تھی۔ اس مہم کی تکالیف کو برداشت کیا تھا؟

واڈ نے کہا کہ:۔

''ہم انتہائی غمناک حالت میں اور بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ ہماری اس مہم......اور اس مہم کی تکالیف نے ہمیں ایک دوسرے کے انتہائی قریب کر دیا تھا اور ہم ایک دوسرے کے گہرے دوست بن چکے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک فرد یہ محسوس کرتا تھا کہ جب ہم ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہوتے تھے تو یہ تصور کرتے تھے کہ ہماری کوئی انمول شے ہم سے کھو چکی ہے۔ ہم نے یہ وعدہ کیا کہ ہم کبھی ایک دوسرے کو نہ بھولیں گے۔''

میڈم لاکوٹر اپنے بیٹے کے ہمراہ واپس لیوسیانہ چلی گئی اس کے بعد اس نے ایک فرانسیسی نو آبادی کا رخ کیا جہاں کے وہ آبائی رہائشی تھے۔ فروری 1767ء کو کیپٹن واڈ نیو یارک سے فرانس کے لئے روانہ ہوا۔ یہ جہاز اس کی کمان میں تھا اور یہ اس کا وہ آخری سفر تھا جس کے بارے میں علم ہے۔

کوئی بھی فرد یہ سوچ سکتا ہے کہ وہ...... میڈم لاکوٹر اور لڑکا جنہوں نے اس ناقابل فراموش مہم میں اکٹھے بقا پائی تھی......کیا وہ دوبارہ آپس میں مل سکے تھے......لیکن اس بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔

......✿......

ایک ہٹ دھرم اور ضدی اسکاٹ

17 ویں صدی کے دوران.....ایبے سینیا میں پرتگالی جے سوئٹس کا کام.....اور وہ رپورٹیں جو انہوں نے یورپ میں اپنے افسران بالا کو تحریر کیں.....اس ملک کو اندرون افریقہ کے ایک جانے پہنچانے حصے کے طور پر اجاگر کیا۔ ان مشنریوں نے نقشے بنائے تھے ان میں موجودہ صدی کے آغاز تک کوئی قابل ذکر تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ ان مہم جو جے سوئٹس میں سے ایک انتہائی مہم جو جے سوٹ پیڈرو پاز تھا۔ جس نے حقیقی طور پر ایبے سینیا کے شہنشاہ کے دربار میں شمولیت اختیار کر لی تھی اور اس کے ہمراہ ملک کا سفر سرانجام دیا تھا.....اس کی تاریخ کا مطالعہ سرانجام دیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی جغرافیائی صورت حال کا بھی مطالعہ سرانجام دیا تھا۔ 1613ء میں اس نے بلیو نیل کے سرچشمے کا بھی معائنہ کیا تھا بشمول الاٹا کی آبشاریں.....جن کی گھن گرج نے نزدیک رہنے والے تمام افراد کو بالکل بہرہ بنا دیا تھا.....اس کا تذکرہ ایک جلد میں کیا گیا تھا جس کا نام ''ہسٹوریا ڈی اتھوپیا اے آ ٹا'' تھا۔ یہ ایک مسودہ تھا اور 1905ء تک اس کی اشاعت کا بندوبست نہیں کیا گیا تھا.....اس کو برطانوی عجائب گھر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

تقریباً ڈیڑھ صدی تک کسی اور یورپی نے اس دور دراز اور الگ تھلگ مقام پر مہم سرانجام نہ دی تھی۔ 18 ویں صدی کا دورانیہ وہ دورانیہ تھا جب افریقہ میں جغرافیائی دریافتیں ہو رہی تھیں حتیٰ کہ اس صدی کے اختتامی برسوں کے دوران اس علاقے میں دلچسپی بڑھنے کے آثار انتہائی نمایاں ہونے لگے اور اس کے بعد ایک لمبے دورانیے تک یہاں پر تحقیق وتفتیش کا کام سرانجام دیا گیا۔ اس دوران جیمز بروس نے افریقہ کی ایک مہم سرانجام دی۔ اس کا تعلق اسکاٹ لینڈ سے تھا۔

1758ء تک بروس شراب کی تجارت سے وابستہ رہا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے باپ کی ریاست کا جانشین بن گیا۔ اب اس کے پاس وقت اور دولت کی کوئی کمی نہ تھی۔ لہٰذا اس نے اس عظیم مہم کی تیاری کا آغاز کر دیا۔ وہ بچپن سے ہی سفر میں دلچسپی رکھتا تھا اور اس کے علاوہ اسے تحقیق وتفتیش میں بھی دلچسپی تھی۔ اپنے دوستوں کے ساتھ نیل کے سرچشمے کے معمے اور بھید پر بحث ومباحثہ سرانجام دینے کے بعد اس نے افریقہ روانہ ہونے کا فیصلہ کر لیا اور اس معمے کو حل کرنے کی جدوجہد سرانجام دینے کی ٹھانی۔ فیصلہ سرانجام دینے کے بعد اس نے اپنے آپ کو فلکیات اور سروے سرانجام دینے کے علوم سے روشناس کروانے کی کوشش شروع کر دی۔ اس کے علاوہ ادویات کا بنیادی علم بھی حاصل کیا جو مابعد اس کے سفر کے دوران اس کے لئے انتہائی مفید ثابت ہوا۔ زبان پر عبور حاصل کرنے کی غرض سے اس نے 1763ء میں الجیریا میں کونسل جنرل کا عہدہ قبول کر لیا اور اپنے ہمراہ سائنسی آلات کا ایک کثیر ذخیرہ بھی رکھ لیا۔

جب بروس کچھ وقت الجیریا میں گزار چکا تب اس نے شمالی افریقہ کے دیگر علاقوں کا دورہ بھی شروع کر دیا تاکہ پرانے آثاروں کی باقیات کا معائنہ کر سکے اور ایک مرتبہ اس کا جہاز تباہی سے ہمکنار ہو گیا اور وہ ڈوبتے ڈوبتے بچا۔ تب اس نے ایشیا مائنر تا شام کا سفر طے کیا جہاں پر اس نے

پالمائرہ اور بالبک کے کھنڈررات دیکھے اور بالآخر مصر جا پہنچا۔ اس نے محسوس کیا کہ اب وہ اپنے کام کی سرانجام دہی کے لئے بالکل تیار تھا...... نیل تک کا بحری سفر سرانجام دے اور اس کے دو معاونوں میں سے ایک معاون کا سرچشمہ دریافت کرے...... بلیونیل ...... قاہرہ میں اس نے بالائی مصر کے حکام کے لئے سفارشی خطوط حاصل کئے اور لیے سینیا میں رہائش پذیر یونانی عیسائیوں کے لئے بھی یونانی سردار سے سفارشی خط حاصل کیا۔ اس نے ایک کشتی کرائے پر حاصل کی اور آبائی باشندوں کی ایک مختصر جماعت کو اپنے ہمراہ لیا اور 12 دسمبر 1768ء کو دریا میں رواں دواں ہوگیا۔

سفر کا یہ حصہ پرمسرت اور دلچسپی سے بھرپور تھا۔ روزانہ نئے نئے خوش کن مناظر دیکھنے میں آتے تھے بالخصوص وہ ان بڑی بڑی عبادت گاہوں کو دیکھ کر از حد مسرور ہوتا تھا جو قدیم دریا کے کناروں پر سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ اس نے اپنے سفر کے بقایا حصے کیلئے بذریعہ صحرا سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے جس قافلے میں شمولیت اختیار کی وہ ایک بڑا قافلہ تھا۔ وہ غیر منظم بھی تھا لیکن اس کے باوجود بھی وہ بخوبی منزل مقصود تک پہنچ گیا۔ اس کے بعد اس نے بحری سفر سرانجام دینے کیلئے ایک اور جہاز کرایہ پر حاصل کیا۔

اس کا چھوٹا سا بحری جہاز جدہ پہنچ چکا تھا...... مکہ شریف کی بندرگاہ...... جہاں پر لاتعداد انگریزی تجارتی جہاز لنگر انداز تھے اور زائرین کے ساتھ اپنا کاروبار سرانجام دینے میں مصروف تھے۔ بروس نے متوقع ڈاکوؤں اور لٹیروں کو اپنے سے دور رکھنے کی غرض سے اپنا پرانا ترین لباس زیب تن کیا۔ اس کا حلیہ دیکھ تجارتی جہازوں کے کپتانوں نے اسے کوئی اہمیت نہ دی۔ لیکن جلد ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور اس کی روانگی کے موقع پر بندرگاہ پر کھڑے ہر ایک برطانوی جہاز نے اسے سلوٹ مارا۔

جدہ میں اپنے قیام کے دوران اس نے مزید سفارشی خطوط حاصل کئے۔ یہ خطوط اس نے شریف مکہ سے حاصل کئے۔ جدہ سے روانہ ہونے کے بعد اس نے جنوب کی جانب اپنا سفر جاری رکھا...... آبنائے باب المندیب ...... اری ٹیریا کا ساحل تا مساوا۔ اس سفر کے دوران دو سانحات منظر عام پر آئے۔ آبنائے کو چھوڑنے کے فوراً بعد اس کے عملے کے ارکان کسی ایسی چیز کے ظاہر ہونے سے خوفزدہ ہوگئے جسے وہ بھوت تصور کرتے تھے اور کشتی کو ریت پر چڑھا دیا۔ خوش قسمتی سے یہ ریت سے نکل آئی اور زیادہ نقصان سے دوچار نہ ہوئی اور مساوا...... اندرونی علاقے کے اس تکلیف دہ سفر کا مقام آغاز...... 19 ستمبر 1769ء کو وہ اس مقام تک جا پہنچا تھا۔

بروس کی مشکلات اور تکالیف کا آغاز اب ہوا تھا۔ مساوا کا سردار ایک لالچی شخص تھا۔ اس نے بروس کی اس مہم کو تباہی و بربادی سے ہمکنار کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ بروس بذات خود ضدی اور سرکش تھا لیکن وہ سردار کی قوت وطاقت سے بھی بخوبی واقف تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے آپ پر قابو رکھا اور بالآخر اپنے ساز وسامان کے ہمراہ اس مقام سے کوچ کرنے کا بندوبست کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

اب اس کی اگلی منزل گوندر تھی۔ اسے مزید پیچیدگی کا سامنا کرنا پڑا۔ جس ملک سے انہوں نے گزرنا تھا وہ ملک خانہ جنگی کی لپیٹ میں تھا۔ خانہ جنگی اپنے عروج پر تھی۔ یہ خانہ جنگی جنرل رائس مچل...... جو نوجوان بادشاہ ٹیکلا ہامانات کی جانب سے مقرر کردہ تھا اور باغیوں کی ایک فوج کے درمیان جاری تھا جس کا سربراہ فیصل نامی ایک شخص تھا۔ بروس بحفاظت گوندر پہنچ چکا تھا۔ تاہم پھر اس کی ملاقات مادر ملکہ سے ہوئی جہاں اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ مادر ملکہ نے اسے بتایا کہ شاہی خاندان کے کئی افراد بخار کی وجہ سے بستر علالت پر دراز تھے۔ اس نے ادویات کے میدان میں جو علم

حاصل کیا تھا اس علم نے اسے اس قابل کیا کہ وہ ان مریضوں کا علاج کر سکے اور نوجوان بادشاہ کی واپسی تک تمام مریض روبصحت ہو چکے تھے۔ اس طرح اس کو بادشاہ کی خوشنودی بھی حاصل ہوگئی...... بادشاہ کو جب اس کے سفر کی وجہ کا علم ہوا تب اس نے اسے صوبہ راس الفل کا گورنر مقرر کر دیا جو بلیو نیل کے سرچشمے کا حامل تھا۔

بروس اس شاہی نوازش پر از حد خوش تھا۔ اس نے گوندر سے روانہ ہونے کی تیاری شروع کر دی لیکن سفر کے دوران تھکاوٹ کی بنا پر وہ بیمار پڑ گیا اور اسے ایمفراس جانا پڑا...... یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو ایک پہاڑی پر واقع تھا تا کہ وہ روبصحت ہو سکے۔

جب وہ روبصحت ہو گیا تو اسے یہ دعوت دی گئی کہ وہ بادشاہ اور اس کی فوج میں فیصل کے خلاف مہم میں شرکت کرے...... لیکن تمام تر معاملات سے برے طریقے سے نپٹا گیا تھا اور شاہی فوج کو بدنظمی کے عالم میں پسپائی اختیار کرنی پڑی۔ اس لمحے فیصل نے امن بحال کرنے کی خواہش کا اظہار کر دیا اور ملک ایک مستحکم صورت سے دوچار ہو گیا۔ بروس نے سوچا کہ اب وقت آن پہنچا ہے کہ وہ اپنی مہم پر روانہ ہو۔ اگر ملک میں امن و بحال نہ ہوتا تب بروس کیلئے اپنی مہم کی سرانجام دہی میں مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں کیونکہ نیل کے سرچشمے کے اردگرد کا علاقہ باغیوں کے قبضے میں تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اپنا سامان اکٹھا کیا اور فیصل کے ہیڈ کوارٹر کی جانب روانہ ہوا۔ اس نے مزید سفارشی خطوط بھی حاصل کر لئے تھے۔ منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد اس کے ساتھ بہتر سلوک روانہ رکھا گیا۔ وہ فیصل کے سامنے کھڑا پُرسکون انداز میں اس کے سوالات کے جواب دیتا رہا۔

جلد ہی ماحول تبدیل ہو چکا تھا...... فیصل اس ضدی اور سرکش غیر ملکی سے متاثر ہو چکا تھا...... وہ اپنے تخت سے نیچے اترا...... گرمجوشی سے اترا...... گرمجوشی کے ساتھ اس کے ساتھ بغل گیر ہوا اور اسے رات کے کھانے کی دعوت پیش کی...... کھانے کے دوران اس نے یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ بروس کی ہر ممکن مدد سرانجام دے گا۔ حتیٰ کہ بروس کو سواری کیلئے اپنا ذاتی گھوڑا بھی عطا کرے گا جو اس کی دلچسپی اور تحفظ کی ضمانت ہو گا۔

بروس دوبارہ عازم سفر ہوا۔ اس نے نیل کے ساتھ ساتھ اپنا سفر جاری رکھا حتیٰ کہ وہ اس مقام تک جا پہنچا جہاں سے وہ جھیل ٹانا میں داخل ہوتا تھا...... جہاں پر وہ تیزی کے ساتھ بہتا ہوا دریا تھا...... اور اس کی چوڑائی ایک صد فٹ تھی۔ وہ مزید دور تک چلا آیا حتیٰ کہ وہ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھ گیا...... اس نے کئی ایک ندیاں ایک چھوٹی سی پہاڑیاں سے نکلتی دیکھیں۔ یہ ندیاں بلیو نیل کے آغاز کا باعث بن رہی تھیں۔ نزدیک کئی ایک آبائی باشندے موجود تھے۔ ان سے یہ علم ہوا کہ تمام تر علاقہ مقدس گردانا جاتا تھا۔ بروس نے اپنے جوتے اتار دیئے اور پہاڑی سے نیچے کی جانب بھاگا اور اس مقام پر جا کھڑا ہوا جہاں سے سب سے بڑی ندی نکل رہی تھی۔ وہ کافی دیر تک اس مقام پر موجود رہا۔ وہ خوش تھا کہ بالآخر وہ اس مقام تک پہنچ چکا تھا جس کا تصور عرصہ دراز سے اس کے ذہن میں موجود تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ پہلا یورپی تھا جس نے اس الگ تھلگ واقع سرچشمے کو دیکھا تھا۔

وہ خوشی کے احساس سے مالا مال تھا اور خوشی کے اسی احساس کے ہمراہ وہ گوندر واپس چلا آیا اور جلد واپسی کا منصوبہ بنانے لگا۔ لیکن خانہ جنگی دوبارہ شروع ہو چکی تھی اور صورت حال پہلے سے بھی بڑھ کر خراب ہو چکی تھی۔ ایک برس پیشتر صورت حال جتنی خراب تھی اس مرتبہ اس سے بھی زیادہ خراب ہو چکی تھی۔ لہٰذا ان حالات میں اس نے خشکی کے راستے مصر جانے کا فیصلہ کیا۔ دوران سفر ایک گھنے جنگل کا حامل ایک ملک منظر عام پر

آیا۔اس ملک کے شہزادے نے شکار کا ایک وسیع پروگرام بنا رکھا تھا۔اس نے بروس کو بھی دعوت دی کہ وہ بھی شکار میں حصہ لے اور ہاتھی کا شکار ہوتا دیکھے۔یہ شکار ان عربیوں نے کرنا تھا جو تلوار چلانے کے دھنی تھے اور اس مقصد کیلئے انہیں خصوصی تربیت فراہم کی گئی تھی۔اس کے بعد وہ ایک چھوٹے سے قصبے میں چلا آیا جس کا نام سینار تھا۔یہاں پر ایک مرتبہ پھر مقامی سردار اس کی مخالفت پر کمربستہ ہوگیا۔

بالآخر اس نے اس قصبے سے نکل جانے کا بندوبست کرلیا اور اس صحرا کو عبور کرنے کی ٹھانی جس کو عبور کرنے کی اجازت نہ تھی۔اس کے سفر کا یہ حصہ انتہائی مشکل...... تکلیف دہ اور خطرناک تھا۔اس کی مختصری جماعت جدوجہد میں مصروف رہی۔وہ گرمی سے بری طرح متاثر ہوئے تھے ......صحرا میں چلنے والی ہواؤں کی زد میں بھی آتے رہے اور صحرائی طوفانوں سے بھی بالمقابل ہوئے۔ان کے پانی کا ذخیرہ بھی ختم ہوچکا تھا۔وہ پیاس سے بدحال موت کے قریب تر تھے۔اس دوران انہیں خانہ بدوشوں کا ایک گروہ نظر آیا جنہوں نے انہیں ایک نخلستان کی راہ دکھائی اور اس طرح وہ پیاس کی حالت میں موت کو گلے لگانے سے بچ چکے۔

وہ پانی پی کر تازہ دم ہوچکے تھے۔انہوں نے پانی کا ذخیرہ بھی کرلیا تھا۔لہٰذا وہ دوبارہ عازم سفر ہوئے لیکن اس دوران وہ ایک مرتبہ پھر اسی قسم کی پریشانی اور تکلیف دہ صورت حال کا شکار ہوگئے جس کی وجہ سے بروس اپنے زیادہ تر ساز وسامان سے دست بردار ہونے پر مجبور ہوگیا۔دو روز بعد وہ اسوان پہنچ چکے تھے اور بروس نے ایک جماعت واپس روانہ کی تاکہ وہ ان ناقابل تلافی نوٹس اور مشاہدات کو ڈھونڈ کر واپس لائیں جو اس نے اس لمبے اور تکلیف دہ سفر کے دوران تحریر کئے تھے۔

ایک کشتی اسے نیل تا قاہرہ لے گئی جہاں پر وہ 10 جنوری 1773ء کو پہنچا۔اور جلد ہی وہ اسکاٹ لینڈ واپس پہنچ گیا۔وہ ایک ایسی طمانیت سے دوچار تھا جو ایک طویل اور کامیاب جدوجہد کے بعد حاصل ہوتی ہے۔اس کے بعد اس نے اپنے تجربات تحریر کرنے کا کام شروع کیا اور یہ داستان پانچ بڑی بڑی جلدوں میں قلمبند ہے اور یہ تحقیق وتفتیش کی ایک ایسی داستان ہے جو اس سے پیشتر کبھی شائع نہ ہوئی تھی۔یہ تاریخ پر مکمل معلومات فراہم کرتی ہے اور اہل ایبے سینیا کے طور طریقوں کی مکمل نشاندہی کرتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ اس ملک کے جغرافیائی حالات پر بھی روشنی ڈالتی ہے اور اس علاقے میں مابعد تحقیق وتفتیش سرانجام دینے والے افراد کیلئے یہ انتہائی کارآمد ثابت ہوئی تھی۔

اگرچہ بروس کو یقین کامل تھا کہ وہ پہلا یورپی تھا جس نے بلیو نیل کا سرچشمہ دیکھا تھا حالانکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔اور اس کے علاوہ اس نے وائٹ نیل کے سرچشمے کو بھی بے نقاب نہیں کیا تھا۔لیکن اس کے باوجود بھی اس نے گراں قدر کارنامہ اور گراں قدر خدمت سرانجام دی تھی بالخصوص اپنی اس تفصیل کے ذریعے جو اس نے نیل کے نظام کے ایک حصے کے بارے میں پیش کی تھی جو دریا میں مثالی طغیانی لانے میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔

جیمز بروس مطمئن تھا۔اس نے اپنی ایک امنگ کو بخوبی پورا کیا تھا اور اپنی جرأت۔حوصلہ اور نیک نیتی کی بنا پر کامیابی سے ہمکنار ہوا تھا ......اپنی ہٹ دھرمی اور ضدی پن کی وجہ سے کامیابی سے ہمسار ہوا تھا۔

......❀......

فضا میں اڑنے والے پہلے افراد

سوال یہ نہیں تھا کہ چمنی کو کس نے اڑایا تھا؟

سوال یہ تھا کہ چمنی کیوں اڑی تھی؟

یہ جو کچھ بھی تھا...... اس نے مونٹ گولفر خاندان کے آتش دان میں ہوا کے گزرنے سے جنم لیا تھا...... جو گرم ہوا سے بھر گیا تھا...... اور اس نے چمنی کو اڑا کر نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ جوزف مونٹ گولفر نے یہ سب کچھ رونما ہوتے ہوئے دیکھا تھا...... وہ حیران تھا کہ یہ کیسے اور کیونکر ممکن ہوا...... لہٰذا چند برسوں کے اندر اندر...... انسان پہلی مرتبہ ہوا میں اڑنے کے قابل ہوا۔

جوزف مونٹ گولفر ''ہوا سے ہلکا'' جہاز بنانا چاہتا تھا...... یہ خیال اسے 1776ء میں ایک تحریر پڑھنے سے آیا تھا۔ یہ تحریر ایک فرانسیسی ترجمے پر مبنی تھی۔ اس کا عنوان تھا ''مختلف اقسام کی ہوا پر تجربات اور مشاہدات''...... یہ انگریز سائنس دان جوزف پرسٹلے کی کاوش تھی۔ اس تحریر میں دس برس قبل کی اس دریافت کا ذکر تھا جو ہیری کیون ڈش کی کاوش تھی...... یہ ایک گیس کی دریافت تھی جس کو اس نے فلوجسٹن کا نام دیا تھا...... بعد میں اس کو ہائیڈروجن کا نام دیا گیا تھا۔ اس گیس کا وزن عام ہوا کے وزن کا 1/13 تھا۔ فرانسیسی کاغذ تیار کنندگان جوزف مونٹ گولفر کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اگر کسی چیز کے اندر...... مثال کے طور پر کسی کنٹینر کے اندر موجود گیس کو اس ہلکی گیس کے ساتھ تبدیل کر دیا جائے تب وہ کنٹینر کشش ثقل سے آزاد ہو گا اور موسمی دباؤ سے بھی آزاد ہو گا اور اس کو ہوا میں بلند ہونا چاہیے۔

اس نے ہائیڈروجن گیس تیار کرنے کا طریقہ سیکھا۔ اس کے بعد مونٹ گولفر نے کاغذ کے ایک غبارے کو اس گیس سے بھر دیا اور اس کے ہوا میں بلند ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن یہ ہوا بلند نہ ہوا کیونکہ گیس کاغذ کے مساموں سے خارج ہو چکی تھی۔ اب اس نے ریشمی کپڑے کا ایک غبارہ بنایا لیکن اب بھی وہی کچھ وقوع پذیر ہوا۔ اس کے مساموں سے گیس خارج ہو گئی اور یہ بھی فضا میں بلند ہونے سے قاصر رہا۔

1782ء میں برطانیہ...... فرانس اور سپین کے ساتھ برسرِ پیکار تھا۔ ان ممالک میں کشیدگی پائی جاتی تھی۔ جبرالٹر میں برطانوی افواج نے ان دونوں متحدہ قوتوں کا ہر حربہ ناکام بنا کر رکھ دیا تھا اور ستمبر 1782ء میں اس نے ان دونوں متحدہ قوتوں کے مشترکہ حملے کو ناکام بنا کے رکھ دیا تھا۔ ان کے تمام بحری جہاز ناکارہ بنا دیے تھے اور ان کے ہزاروں افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ جب جوزف مونٹ گولفر نے یہ خبر سنی...... اس نے یہ اعلان کیا' وہ تمام تر حملہ آور فوج کو ایسی ایسی تدبیر مہیا کرے گا جس کے ذریعے وہ پہاڑی کا دفاع سرانجام دینے والی فوج کے عین وسط میں حملہ آور ہونے کے قابل ہو جائے گی...... فضائی ذرائع سے...... لہٰذا اس نے اپنا تمام تر سرگرمیاں اور دلچسپیاں موقوف کر دیں۔ اس نے جلد از جلد بہترین ریشم کا ایک ماڈل غبارہ تیار کیا۔ اس کے پیندے میں ایک سوراخ رکھا...... اس کے نیچے جلتے ہوئے کاغذ کا ایک ٹکڑا رکھا...... اور اپنے اعتقاد کی تصدیق

جاتی۔ گرم ہوا نے غبارے کی جلد کو پھلایا اور اس کو سیدھا فضا میں اوپر اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

اس نے یہ مظاہرہ اپنے بھائی کے سامنے بھی سرانجام دیا جس کا نام اٹینی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کاوش میں اس کا بھائی بھی مکمل جوش، جذبے اور ولولے کے ساتھ شامل ہو جائے تا کہ وہ دونوں مل کر بڑے غباروں پر کام شروع کر سکیں۔

اپریل 1783ء تک انہوں نے ایک ایسا غبارہ تیار کیا جس کا قطر 35 فٹ تھا...... وہ 450 پونڈ وزن اٹھانے کی اہلیت کا حامل تھا۔ ان کا یہ تجربہ بھی کامیاب رہا۔ اب دونوں بھائیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب وہ وقت آن پہنچا تھا کہ وہ اپنی اس کاوش کا عوامی مظاہرہ سرانجام دیں۔

اس مقصد کے لئے انہوں نے جو غبارہ تیار کیا وہ کپڑے سے بنایا گیا تھا۔ اس کے اندر کاغذ کی لائننگ کی گئی تھی۔ یہ بیضوی شکل کا حامل تھا۔ اس کا محیط 110 فٹ تھا۔ بٹن اور بٹنوں کے سوراخ اس کے مختلف ٹکڑوں کو باہم جوڑتے تھے۔ لکڑی کے ایک فریم کی وساطت سے اس کے پیندے کا سوراخ مستقل طور پر کھلا رہتا تھا۔ اس کا کل وزن 500 پونڈ تھا۔ یہ 490 پونڈ وزن اٹھانے کی اہلیت کا حامل تھا۔ آٹھ افراد اس کو زمین پر برقرار رکھنے کیلئے اس وقت درکار ہوتے تھے جبکہ اس میں گرم ہوا بھر دی جاتی تھی۔ جب 5 جون 1783ء کو جوزف مونٹ گولفر نے یہ سگنل دیا کہ اس غبارے کو فضا میں بلند ہونے دیا جائے تب وہ آٹھ افراد...... ان کے علاوہ اہلکاروں کا ایک ہجوم...... شرفا اور امراء اور ان کی خواتین...... اور کسان حیران رہ گئے۔ یہ تمام لوگ لیونز کے نزدیک مونٹ گولفر کے آبائی قصبے میں اکٹھے ہوئے تھے...... وہ اس ''ہوائی مشین'' کو دیکھنے کیلئے اکٹھے ہوئے تھے...... غبارہ پُرسکون انداز میں کسی قسم کا شور کئے بنا فضا میں بلند ہوا اور کئی ہزار فٹ کی بلندی پر ان کے سروں کے اوپر محوِ پرواز رہا اور آہستہ آہستہ ان سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر زمین پر آن پہنچا...... اس نے محض دس منٹ تک فضائی اڑان سرانجام دی تھی۔ اٹینی اور مونٹ گولفر نے وضاحت پیش کی کہ یہ اس سے زیادہ فضائی اڑان بھی سرانجام دے سکتا تھا اگر گیس اس کے بٹنوں کے سوراخوں سے خارج نہ ہو جاتی۔ اس نے یہ محسوس نہ کیا تھا کہ ہوا جب گرم ہوتی ہے تب وہ پھیلتی ہے...... لہٰذا اس کا وزن فی مکعب فٹ کم ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا غبارہ ہوا سے بھر گیا تھا اور یہ انتہائی اطمینان کے ساتھ زمین سے فضا میں بلند ہو گیا تھا۔ لیکن جب وہ آگ اس کو گرم رکھنے کے لئے اس میں موجود نہ رہی جو جلائی گئی تھی...... تب ہوا یکدم ٹھنڈی پڑ گئی اور اپنے سابقہ وزن کی حامل بن گئی اور غبارہ زمین پر واپس آن گرا۔ وہ ''گیس'' جس کے بارے میں مونٹ گولفر کا قیاس تھا کہ اس نے غبارے کو فضا میں اڑنے کے قابل بنایا تھا...... اس گیس کا کوئی وجود نہ تھا۔

بہرکیف اس چھوٹے سے قصبے میں اس روز کے مظاہرے نے فضا میں پرواز کرنے کی جدوجہد کا حقیقی آغاز کر دیا تھا۔ کچھ لوگوں نے ایسی مشینری ایجاد کرنے کی کوشش کی تھی جو پرندوں کی اڑان پر بنیاد کرتی تھی۔ لیکن علم طبیعیات کے بنیادی اصولوں سے لاعلمی کی بنیاد پر یہ کوششیں ناکامی سے دوچار ہو چکی تھیں اور کچھ لوگ ان تجربات کی بھینٹ بھی چڑھ چکے تھے اور اپنی گردنیں بھی تڑوا چکے تھے۔ لیکن جوزف مونٹ گولفر نے اس کاوش کو ایک نیا موڑ عطا کیا تھا۔

اس کے اس تجربے کی خبر جلد ہی پیرس کی اکیڈیمی آف سائنسز تک جا پہنچی تھی۔ اس خبر نے اس اکیڈیمی کے فاضل پروفیسروں کو مشتعل کر دیا تھا۔ غبارے کو فضا میں اڑانے کا خیال ان کے ذہن میں بھی موجود تھا لیکن وہ ابھی کسی حتمی نتیجے تک نہ پہنچ پائے تھے اور یہ خیال ابھی ڈرائنگ بورڈ کی

زینت بنا ہوا تھا۔ مونٹ گولفر کے تجربے نے ان کے لئے ایک بنیاد فراہم کر دی تھی...... پروفیسر نئی ہائیڈروجن گیس کے استعمال کے لئے تیار تھے۔

فوراً ہدایات جاری کر دی گئی کہ پہلا ہائیڈروجن غبارہ تیار کیا جائے......اس غبارے کی تیاری کے عمل کی نگرانی ایک نوجوان ماہر طبعیات چارلس کے ذمہ تھی۔ اس کی معاونت کیلئے دو کرافٹس مین بھی موجود تھے...... برادرز رابرٹ۔ ایک عوامی فنڈ قائم کیا گیا تھا تا کہ اس کام کے لئے درکار رقم اکٹھی کی جا سکے اور جلد ہی مطلوبہ غبارہ تیار ہو گیا۔ یہ مونٹ گولفر کے غبارے سے کافی چھوٹا تھا۔ اس کا قطر 12 فٹ تھا اور اس کا وزن 25 پونڈ تھا۔ اس کو 900 مکعب فٹ ہائیڈروجن درکار تھی۔

26 اگست 1783ء کو اس کو فضا میں اڑانے کا مظاہرہ کیا گیا۔ لوگوں کا ایک جم غفیر اس مظاہرے کو دیکھنے کے لئے اکٹھا ہوا تھا۔ وہ لوگ غبارے کو فضا میں چھوڑنے والے مقام سے قریب تر ہونے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ فوجی دستوں نے انہیں اس مقام سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن بے سود اور یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ لوگوں کا یہ ہجوم کہیں غبارے کو تباہی و بربادی سے ہمکنار کر کے نہ رکھ دے۔ لہٰذا رات طاری ہونے کا انتظار کیا گیا اور رات ڈھلنے پر جب ہجوم اپنے اپنے گھروں کو واپس پلٹ گیا تب اس غبارے کو اس مقام پر منتقل کیا گیا جہاں پر آج کل ایفل ٹاور کھڑا ہے۔

اگلی شام لوگوں کا ایک ہجوم ایک مرتبہ پھر اکٹھا ہو چکا تھا۔ وہ ہجوم غبارے کو فضا میں پرواز کرتے دیکھنے کا متمنی تھا۔ غبارے نے تین ہزار فٹ کی بلندی پر فضا میں پرواز کی۔ وہ بادلوں میں سے بھی گزرا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ پیرس کی فضا لوگوں کے شور و غل سے گونج اٹھی۔ لیکن جلد ہی گونس کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں بھی شور و غل بلند ہوا......لیکن اس شور و غل کی نوعیت مختلف تھی...... یہ دیہات پندرہ میل کی دوری پر واقع تھا......اس شور و غل میں خوف و ہراس اور ناراضگی کا عنصر شامل تھا...... کیونکہ غبارہ 45 منٹ فضا میں رہنے کے بعد اس مقام پر زمین پر آن گرا تھا۔ دیہاتی ڈر گئے تھے کہ جانے فضا سے کیا افتاد ان پر آن گری تھی۔ انہوں نے کلہاڑیوں کے وار کر کے اس غبار کو پھاڑ کر رکھ دیا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس غبارے کی فضا میں کامیاب پرواز کے موقع پر ایٹنی مونٹ گولفر بھی پیرس میں موجود تھا۔ اس نے چارلس اور رابرٹ سے اپنا تعارف بھی کروایا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ بے التفاتی برتی گئی تھی...... بے مروتی برتی گئی تھی۔ لیکن ایسا دکھائی دیتا تھا کہ گرم ہوا اور ہائیڈروجن کی وکالت کرنے والوں کے خلاف مخالفت دوستانہ تھی کیونکہ دونوں کامیابی سے ہمکنار ہوئے تھے۔ مختصراً اڑان کو ممکن بنا دیا گیا تھا اور لمبی اڑان کے لئے دروازے کھل چکے تھے۔ ان کا مشترکہ مقصد یہ تھا کہ بنی نوع انسان فضا میں پرواز کر سکے۔

مونٹ گولفر برادران جلد ہی اپنی کوششوں میں مزید آگے بڑھ گئے۔ وہ پیرس میں قیام پذیر ہو گئے۔ پیرس میں ان کا ایک دوست بھی رہائش پذیر تھا جس کا نام ری ولن تھا...... وہ ان کے خاندانی کاروبار میں ان کا شریک کار تھا...... وہ کاغذ تیار کرنے کے کام سے منسلک تھے۔ فوبورگ سینٹ انٹونی میں واقع اس فیکٹری میں کام سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ ان دونوں بھائیوں نے ایک عجیب و غریب شکل کا حامل ایک غبارہ تیار کیا۔ یہ غبارہ کاغذ کی تہوں اور لینن کلاتھ کی تہوں سے بنایا گیا تھا۔ چوٹی سے پیندے تک اس کی پیمائش 74 فٹ تھی اور اس کا وزن ایک ہزار پونڈ تھا۔ اس کی آرائش و زیبائش قابل دید تھی۔ اس پر نیلا اور سنہری رنگ کیا گیا تھا۔

اس بڑے غبارے کو کھلی فضا میں ماہ ستمبر کے آغاز میں باہم جوڑا گیا اور فضا میں اڑانے کیلئے تیار کیا گیا۔ اس گڑھے کی طرفین پر مستول لگائے گئے جس میں آگ جلنا تھی۔ 14 ستمبر کو آگ روشن کر دی گئی اور غبارے نے اطمینان بخش انداز میں فضا میں اوپر کی جانب اٹھنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد مونٹ گولفر برادران نے پہلے سانحہ کا ذائقہ چکھا۔ اچانک تیز ہوا چلنے لگی اور بارش بھی برسنے لگی۔ غبارہ ہچکولے کھانے لگا۔ مونٹ گولفر برادران آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ کیا وہ غبارے کو نیچے کھینچ لیں یا فضا میں ہی رہنے دیں۔ اس پرواز کا مظاہرہ پانچ روز بعد شاہ لوئس XVI اور میری انٹونٹی کے سامنے کیا جانا تھا۔ لہٰذا انہوں نے غبارے کو بچانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ایسا ممکن نہ تھا۔ اس کی کاغذ کی جلد پہلے ہی بارش کی وجہ سے نقصان سے دوچار ہو چکی تھی اور پھٹنی شروع ہو چکی تھی۔ گرم ہوا بھی انتہائی تیزی کے ساتھ باہر نکلی اور رہی سہی کسر اس نے پوری کر دی۔ چند لمحے پہلے تک غبارے کی شکل کی حامل تدبیر اب کاغذ اور کپڑے کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہو چکی تھی۔

لیکن مونٹ گولفر برادران نے ہمت نہ ہاری۔ انہوں نے دن رات کام کیا اور ایک اور غبارہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ غبارہ پہلے غبارے سے چھوٹا تھا لیکن اس سے مضبوط تر تھا۔ یہ سوتی کپڑے سے بنایا گیا تھا۔ اس کے محض اندرونی جانب کاغذ سے مضبوطی فراہم کی گئی تھی۔ اس کی اونچائی 57 فٹ تھی۔ اس کا حجم 37,500 مکعب فٹ تھا۔ شکل کے اعتبار سے یہ بیضوی تھا۔ اس کو بھی خوب سجایا گیا تھا۔ مظاہرہ سرانجام دینے سے ایک روز قبل یہ اپنی تکمیل کے مراحل طے کر چکا تھا۔

اگر شاہ لوئس اپنی کارروائی سرانجام نہ دیتا تب 19 ستمبر 1783ء وہ یادگار دن کے طور پر یاد رکھا جاتا جس دن پہلے انسان نے فضا میں پرواز سرانجام دی تھی۔ بادشاہ کو یہ اطلاع موصول ہو چکی تھی کہ غبارے کے ہمراہ ایک انسان بھی فضا میں پرواز کرے گا۔ لہٰذا اس نے فوری طور پر کارروائی سرانجام دیتے ہوئے غبارے کے ہمراہ کسی انسانی پرواز پر پابندی عائد کر دی۔ اس نے یہ احکامات جاری کئے کہ غبارے کے ساتھ کسی بھیڑ..... مرغ...... یا بطخ کا پنجرہ باندھ دیا جائے۔

بادشاہ اور ملکہ مظاہرہ دیکھنے کے لئے پہنچ چکے تھے۔ غبارہ فضا میں بلند ہو چکا تھا۔ یہ غبارہ محض 1700 فٹ کی بلندی تک پہنچ سکا تھا اور محض بیس منٹ تک فضا میں رہا تھا۔ اس کے بعد ایک جنگل میں آن گرا تھا۔ اس میں سوار جانوروں کو کوئی نقصان نہ پہنچا تھا۔

اب مونٹ گولفر برادران انسان کو فضا میں اڑانے کے متمنی تھے اور انہیں امید تھی کہ اس کی اجازت فراہم ہو جائے گی۔ یہ قیاس کیا جاتا تھا کہ مجرموں میں سے کسی ایک مجرم کو غبارے کے ہمراہ فضا میں بھیجا جائے گا لیکن جب یہ خبر پلاٹر ڈی روزر تک پہنچی تو اس نے رضا کارانہ طور پر اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ فضائی سفر کرنے والے پہلے انسان کا اعزاز کسی مجرم کے حصے میں آئے۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے بذات خود اس مہم پر روانہ ہونا چاہیے...... لہٰذا اس نے غبارے کے ہمراہ فضا میں پرواز کرنے کا اعلان کر دیا۔ بادشاہ پہلے تو اسے اجازت دینے سے ہچکچایا مگر مابعد اس نے اسے اجازت فراہم کر دی۔

نئے غبارے کی تیاری میں ہر ایک احتیاط کو مدنظر رکھا گیا۔ ڈی روزر بذات خود اکیڈمی آف سائنس کا ایک نوجوان رکن تھا۔ وہ بھی اس غبارے کی تیاری میں مونٹ گولفر برادران کا ہاتھ بٹاتا رہا۔ 15 اکتوبر تک یہ غبارہ پہلی آزمائش کیلئے تیار تھا۔ یہ 75 فٹ اونچائی کا حامل تھا اور اس کا

قطر 49 فٹ تھا۔

پہلے انسان کی فضا میں پرواز کیلئے 20 نومبر کا دن منتخب کیا گیا تھا۔ اس روز موسم طوفانی موسم کی صورت اختیار کر گیا تھا لہٰذا پروگرام اگلی صبح تک ملتوی کرنا پڑا۔ دوبارہ تند و تیز ہوا چلنے لگی اور بادل چھا گئے اور بارش کا واضح امکان نظر آنے لگا۔ ایک بہت بڑا ہجوم اس مظاہرے کو دیکھنے کے لئے جمع تھا اور ہجوم مایوسی کی حالت میں واپس جانے کا متمنی نہ تھا۔ اس دوران ایک خصوصی مہمان نے غبارے کو ایک جانب دھکیلا اور اس کو کافی زیادہ نقصان سے دوچار کر دیا۔ یہ ایک ایسا سانحہ تھا جس نے مجمعے کو مشتعل کر کے رکھ دیا۔ دو گھنٹوں تک عورتوں کی ایک ٹیم رضا کارانہ طور پر سوئی دھاگے کے ساتھ غبارے کے کپڑے کی سلائی سرانجام دیتی رہی۔ غبارے کی مرمت مکمل ہونے تک دوپہر کے دو بج چکے تھے اور موسم بھی خوشگوار ہو چکا تھا۔ ڈی روزر اور مارکوئس ڈی آرلینڈس غبارے میں سوار ہوئے اور غبارہ فضا میں بلند ہونا شروع ہو گیا۔

280 فٹ کی بلندی سے غبارے کے دونوں مسافروں نے نیچے کھڑے مجمعے کو اپنے ہیٹ ہلا کر خوش آمدید کہا۔ وہ بلندی کی جس انتہا تک پہنچے وہ تین ہزار فٹ تھی۔ اپنے نکتہ آغاز سے نو ہزار گز کا سفر طے کرنے کے بعد...... غبارہ آہستہ آہستہ زمین کی جانب بڑھنے لگا۔ لوگ گھوڑوں پر سوار اس غبارے کے مسافروں کو مبارکباد دینے کے لئے دوڑ پڑے۔

یہ مظاہرہ کامیابی سے ہمکنار ہو چکا تھا۔ اس کے بعد مزید تجربے ہوتے رہے اور مزید فنی اصول متعارف کروائے جاتے رہے اور انسان کی فضا میں پرواز کرنے کی خواہش اپنی تکمیل کی منازل طے کرتی رہی۔

بونٹی نامی بحری جہاز پر بغاوت

لیفٹیننٹ ولیم بلیگ کی عمر اس وقت 33 برس تھی جبکہ 1787ء میں اسے شاہی مسلح جہاز بونٹی کی کمان سونپی گئی تھی۔ اسے راس حون کا چکر لگانا تھا اور تاہیٰی کے مقام سے بریڈفروٹ کے پودے اکٹھے کرنے تھے اور انہیں ویسٹ انڈیز پہنچانا تھا جہاں پر کاشت کار اسے کاشت کرنا چاہتے تھے۔ وہ اسے اپنے غلاموں کی خوراک کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔ بلیگ ایک تجربہ کار اور محنتی افسر تھا۔ وہ سمارٹ تھا اور خوش شکل بھی تھا۔ اس کا رنگ زردی مائل تھا۔ بال سیاہ تھے اور آنکھیں نیلی اور چمک دار تھیں۔

اس نے پلے ماؤتھ میں جنم لیا تھا اور اوائل عمری میں ہی اس نے سمندر کو اپنے پیشے کے طور پر چن لیا تھا۔ اس نے آغاز میں پانچ برس تک بطور مڈشپ مین سمندر میں خدمات سرانجام دی تھیں۔ اس کے بعد اسے ایک جہاز ران کے عہدے پر فائز کر دیا گیا تھا۔ یہ جہاز کیپٹن کک کی زیر نگرانی ایک نئے بحری سفر پر روانہ ہو رہا تھا جس کا مقصد جنوبی سمندروں کی دریافت تھا۔ کک اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا لیکن بلیگ 1782ء میں ولندیزیوں کے خلاف جنگ دیکھنے کے لئے واپس پلٹ آیا تھا۔ جنگ اختتام پذیر ہو چکی تھی۔ اسے نصف تنخواہ پر ملازم رکھا گیا تھا لیکن وہ ایک مرچنٹ افسر کے طور پر ویسٹ انڈیز کے ساتھ تجارت کی غرض سے دوبارہ سمندر کی جانب لوٹ آیا تھا۔ چار برس بعد اسے یہ دعوت موصول ہوئی کہ وہ بونٹی نامی جہاز کی کمان کے فرائض سرانجام دے۔ اس کو یہ عہدہ دلوانے میں سر جوزف بینک کا کافی عمل دخل تھا جو کہ جارج III کا چیف سائنٹفک ایڈوائزر تھا۔

بلیگ جانتا تھا کہ اس پراجیکٹ میں بادشاہ دلچسپی کا حامل تھا۔ لہٰذا بلیگ نے اس موقع کو اپنے لئے ایک گراں قدر موقع تصور کیا اور اس سے بھرپور استفادہ حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ جہاز کا چارج حاصل کرنے کی غرض سے فوری طور پر ڈیٹ فورڈ کی جانب روانہ ہوا۔

بلیگ نے اپنے عملے کا انتخاب کیا اور عازم سفر ہوا۔ وہ اپنے عملے سے اپنے بچوں کی طرح سلوک روا رکھنے کے نکتہ نظر کا حامل تھا۔ وہ انہیں اپنا غلام تصور نہیں کرتا تھا۔ اسے ان کی حفاظت سرانجام دینا تھی۔ ان کی خوراک کا خیال رکھنا تھا۔ ان کی تفریح کا خیال رکھنا تھا اور اس کے جواب میں وہ ان سے بہترین خدمات کی سرانجام دہی کی توقع رکھتا تھا۔ یقیناً وہ اپنے عملے میں سے سب سے بڑھ کر تجربہ کار تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے عملے کے کام کی نگرانی بخوبی سرانجام دے سکتا تھا۔

بونٹی نامی جہاز کرسمس سے پیشتر ہی عام سفر ہوا۔ سمندر طوفان سے دوچار تھا۔ جہاز کا عملہ جان چکا تھا کہ ان کے لئے مستقبل کے مصائب کے بیج بوئے جا چکے تھے۔ اس دوران جہاز ٹینی رائف کی جانب روانہ ہوا جہاں پر شراب اور تازہ خوراک جہاز میں ذخیرہ کی گئی۔ اس کے بعد جہاز جنوبی امریکہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ جب وہ ٹیرا ڈل فیوگر پہنچے اس وقت ماہ مارچ شروع ہو چکا تھا اور سردی کا موسم اپنے خوفناک طوفانوں کے ہمراہ

شروع ہونے والا تھا۔ تین ہفتوں تک سخت سردی کے موسم میں بونٹی بحرالکاہل میں پہنچنے کی جدوجہد میں آگے اور پیچھے ہچکولے کھاتا رہا حتیٰ کہ اس میں سوراخ ہو گیا۔ عملہ تھکن کا شکار ہو چکا تھا اور سمندری ہواؤں نے بلیگ کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ مشرقی روٹ سے جنوبی افریقہ...... آسٹریلیا...... تاہٹی کی جانب سفر کرے۔

راس ٹاؤن میں وہ حصول خوراک اور جہاز کی مرمت وغیرہ کیلئے رکے اور ماہ اگست کے وسط تک وہ تسمانیہ پہنچ چکے تھے۔ اس وقت تک محض چھوٹے موٹے واقعات ہی رونما ہوئے تھے اور جہاز کے عملے میں بغاوت کے کوئی آثار نمایاں نہ تھے۔ لیکن بلیگ اس غم و غصے سے بے خبر تھا جو اس کے خلاف جہاز کے عملے کے دلوں میں موجزن تھا۔ اکتوبر 1788ء میں جہاز جزیرے میں پہنچ چکا تھا اور وہاں کے آبائی باشندے جو کیپٹن کک کو جانتے تھے وہ اپنی کشتوں میں سوار جہاز تک پہنچ چکے تھے۔ بلیگ ان کے سرداروں کے ساتھ پُرتپاک طریقے سے ملا اور ان کو تحائف سے بھی نوازا۔

بریڈ فروٹ کے پودے اکٹھے کرنے میں تین ہفتے صرف ہوئے اور ویسٹ انڈیز تک کا واپسی کا سفر طے کرنا ابھی باقی تھا۔ لیکن چونکہ وہ دیر سے اس مقام تک پہنچے تھے لہٰذا بلیگ کو پانچ ماہ تک انتظار کرنا تھا تاکہ موسم سازگار ہو سکے۔

ماہ اپریل میں بونٹی نومیوکا میں لنگر انداز ہوا جہاں پر بلیگ مغرب کی جانب عازم سفر ہونے سے پیشتر پانی کا ذخیرہ کرنا چاہتا تھا اور چار روز بعد ایک واقعہ رونما ہوا جو کہ ایک معمولی سا واقعہ تھا۔ اس واقعہ نے فلیچر کرسچین کے غم و غصے کو بغاوت میں تبدیل کر دیا۔ اس سفر کے دوران اسے سیکنڈ۔ ان۔ کمانڈ کے عہدے پر ترقی عطا کی گئی تھی۔ نومیوکا سے عملے کے ارکان نے کافی مقدار میں ناریل خریدے تھے اور 27 تاریخ کی شب کے دوران بلیگ نے ڈیوٹی پر مامور چوکیداروں کو حکم دیا تھا کہ وہ اس کے ناریل پر کڑی نگاہ رکھیں۔

اگلی صبح ناریل کے ڈھیر میں کمی واقع ہو چکی تھی اور پہلے کی نسبت چھوٹا دکھائی دے رہا تھا۔ کسی نہ کسی وجوہات کی بنا پر بلیگ نے اس چوری کا الزام کرسچین پر لگایا:۔

"لعنت ہو تم پر...... تم نے میرے ناریل چرائے ہیں۔"

کرسچین نے کہا کہ اس نے محض ایک ناریل لیا تھا۔

بلیگ نے جواب دیا کہ:۔

"تم جھوٹ بکتے ہو...... تم بدمعاش ہو...... تم نے ناریل کا آدھا ڈھیر چرایا ہے"

بلیگ نے نہ صرف کرسچین پر الزام لگایا بلکہ پورے عملے کو شک کی نگاہ سے دیکھا اور وہ کسی کو بھی صحیح معنوں میں قصوروار نہ پا سکا تو اس نے ان لوگوں کے راشن میں تخفیف کر دی اور ان کے ناریل بھی ضبط کر لئے۔ اسی روز بعد میں اس نے ایک مرتبہ پھر کرسچین کے ساتھ ناروا سلوک کا مظاہرہ کیا۔ اس کے بعد نوجوان کرسچین نے اپنی آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ ترکھان پُرسل سے کہا کہ:۔

"میں ایسا سلوک برداشت کرنے کی بجائے دس ہزار مرتبہ مر جانے کو ترجیح دوں گا۔"

اس رات کرسچین انتہائی دلبرداشتہ تھا اور مایوسی کا شکار بھی تھا۔ اگر وہ بلیگ کو ترکی بہ ترکی جواب دیتا تو اسے خدشہ تھا کہ بلیگ اسے چابک

مارے گا۔اس نے پرسل کو بتایا کہ:۔

''اگر میں نے اسے ترکی بہ ترکی جواب دیا تو میرا یہ عمل درآمد ہم دونوں کی موت کا سبب بنے گا۔مجھے یقین ہے کہ میں اسے اپنے بازوؤں میں بھر کر سمندر میں چھلانگ لگا دوں گا''۔

اس نے پہلے یہ منصوبہ بنایا کہ وہ ایک آدمی کی سواری کیلئے کشتی بنائے اور رات کے اندھیرے میں اس میں بیٹھ کر راہ فرار اختیار کرے۔ اس کے ایک دوست جو کہ مڈشپ مین نے اس کی اس تجویز کی مخالفت کی۔اس کے بعد کرسچین کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ وہ جہاز کا کنٹرول سنبھال لے۔اسے بتایا گیا کہ عملے کے ارکان کچھ بھی کر گزرنے کیلئے تیار تھے۔

تقریباً4 بجے صبح کرسچین جہاز کے عرشے پر چلا آیا اور عملے کو اس ترتیب کے ساتھ کھڑا کیا کہ وہ عملے کے ہر ایک رکن سے بات چیت سرانجام دے سکے۔اس نے جس پہلے شخص سے بات کی اسے بغاوت کے ساتھ کوئی سروکار نہ تھا۔دوسرا شخص آمادہ بغاوت تھا اور اس سلسلے میں پرجوش دکھائی دیتا تھا۔وہ شخص نیچے چلا آیا اور دیگر لوگوں کو بھی آمادہ بغاوت کرنے لگا اور جلد ہی دیگر لوگ بھی آمادہ بغاوت ہو گئے۔کرسچین نے اپنے لوگوں کو اکٹھا کیا اور جہاز میں موجود اسلحہ کے ذخیرے پر قبضہ کر لیا۔اس نے اپنے آدمیوں میں اسلحہ بھی تقسیم کیا اور ان چند افراد کو گرفتار بھی کیا جن کے بارے میں یہ شک کیا جا سکتا تھا کہ وہ بلیگ کے وفادار تھے۔اس وقت تک صبح کے ساڑھے پانچ بج چکے تھے اور دن کی روشنی بھی نمودار ہو چکی تھی اور دیگر لوگ بھی اپنی اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے آن پہنچے تھے۔کچھ لوگوں کو پستول کے زور پر اپنے منہ بند رکھنے پر مجبور کیا گیا اور کچھ لوگ بہ آسانی آمادہ بغاوت ہو گئے۔کسی بھی شخص نے الارم نہ بجایا۔

بلیگ بڑے اطمینان کے ساتھ اپنے کیبن میں محو خواب تھا۔کرسچین اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ اس کے کیبن میں داخل ہوا اور چلا کر کہنے لگا کہ:۔

''بلیگ ......تم میرے قیدی ہو''

بلیگ نے باآواز بلند عملے کے دیگر ارکان کو پکارنا شروع کیا لیکن عملے کا کوئی رکن بھی اس کی مدد کیلئے نہ آیا اور چند لمحوں کے اندر اندر وہ اس کے ہاتھ مضبوطی کے ساتھ اس کی پشت پر باندھ چکے تھے۔وہ اس کو لے کر جہاز کے عرشے تک پہنچ چکے تھے اور کرسچین اس پر اسلحہ تانے کھڑا تھا۔ جہاز پر محض 18 باغی ارکان تھے جبکہ 25 ارکان وفادار تھے۔لیکن باغی اچانک آمادہ بغاوت ہوئے تھے اور مکمل طور پر اسلحہ سے لیس تھے لہٰذا وہ دیگر افراد کو جیسے چاہتے ویسے ہی ہانک سکتے تھے۔

اب مسئلہ یہ درپیش تھا کہ بلیگ کا کیا کیا جائے اور ان افراد کا کیا کیا جائے جنہوں نے بغاوت میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ان کے ذہن میں یہی تجویز آئی کہ ان لوگوں کو ایک کشتی پر سوار کر کے روانہ کر دیا جائے'اس دوران بلیگ دھاڑتا رہا اور ان کو دھمکیاں دیتا رہا کہ گھر واپس پہنچنے کے بعد ان سب کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔لہٰذا کرسچین نے یہ محسوس کیا کہ ان کے خلاف جلد از جلد کارروائی سرانجام دینا انتہائی ضروری تھا۔

بالآخر سب سے بڑی کشتی سمندر میں اتاری گئی۔اس کی لمبائی 23 فٹ تھی۔اس کشتی پر 18 افراد کو سوار کیا گیا۔ان سب افراد کا سامان بھی

ان کے ہمراہ تھا۔ ان افراد میں دو مڈشپ مین بھی شامل تھے۔ آخری لمحات کے دوران بلیگ نے کرسچین سے درخواست کی لیکن کرسچین نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے کہا کہ اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس نے مزید کہا کہ:۔

''گذشتہ دو ہفتوں کے دوران میں جہنم میں زندگی گزار رہا تھا۔ اب میں مزید اس جہنم کو برداشت نہیں کر سکتا۔''

اس نے بلیگ کو بھی جلد از جلد کشتی میں سوار کروا دیا۔ اس کشتی میں خوراک کا مناسب ذخیرہ بھی رکھ دیا گیا تھا۔

بلیگ کے اندرونی احساسات خواہ کچھ ہی کیوں نہ تھے لیکن بظاہر وہ ثابت قدم رہا۔ اس نے یک دم فیصلہ کیا کہ وہ تین ہزار پانچ صد میل کی دوری پر واقع ڈچ تیمور کا رخ کرے گا۔ اگرچہ اس مقام تک پہنچنے کی کوئی خاص امید نہ تھی لیکن اس نے کسی سمندری جزیرے پر رکنے اور کسی جہاز کے گزرنے کا انتظار کرنے پر اپنے اس فیصلے کو ترجیح دی۔

پہلے وہ ٹوفا کی جانب روانہ ہوا تاکہ بریڈ فروٹ کے پودے اور پانی حاصل کر سکے۔ وہاں پر پانی موجود تھا لیکن محض چند ایک ناریل ہی اکٹھے کئے جا سکے۔ وہاں کے آبائی باشندے مخالفانہ رویے کے حامل تھے۔ انہوں نے بلیگ کے ایک ساتھی کو ہلاک کر دیا۔ اس کا نام نارٹن تھا۔ بلیگ نے دوبارہ کشتی میں سوار ہونے کی کوشش کی۔ مقامی باشندوں نے اپنی کشتیوں میں اس کا تعاقب کیا اور ان پر بھاری پتھر برسائے۔

اس تجربے کے بعد جبکہ وہ بمشکل اپنی زندگیاں بچانے میں کامیاب ہوئے تھے...... تمام افراد ایسٹ انڈیز کی جانب براہ راست سفر کرنے کے خواہاں تھے اور جب بلیگ نے ان سے دریافت کیا کہ:۔

''کیا وہ روزانہ ایک اونس ڈبل روٹی اور ایک گلاس پانی پر گزارہ کر سکتے تھے؟''

تو سب افراد نے ''ہاں'' میں جواب دیا۔

کشتی کے سوار نیم فاقہ کشی کی حالت کا شکار تھے۔ اس دوران ان کی کشتی سمندری طوفان کی زد میں آ گئی اور سمندری لہروں کے رحم و کرم پر تھی۔

اس کے بعد ان کے مصائب میں مزید اضافہ ہوا کیونکہ اب بارش بھی نازل ہو چکی تھی۔ بلیگ نے مساوی مقدار میں راشن ان افراد میں تقسیم کر دیا تھا۔ وہ دن بھر میں محض ایک مرتبہ برائے نام کھانا کھاتے تھے۔ بلیگ کی یہ کوشش تھی کہ وہ ان افراد کو مصروف رکھے اور وہ ان کو مصروف رکھنے کی خاطر ان جزیروں کے بارے میں معلومات فراہم کرتا رہتا تھا جن جزیروں سے وہ گزرتے تھے۔ لیکن کشتی میں چونکہ گنجائش سے زائد افراد سوار تھے لہٰذا نہ ہی کوئی سکون کے ساتھ لیٹ سکتا تھا اور نہ ہی اپنے آپ کو گیلا ہونے سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔ سردی بھی شدت کے ساتھ پڑ رہی تھی اور مایوسی کے عالم میں کشتی میں سوار افراد نے اپنے کپڑے سمندر کے پانی میں ڈبونے شروع کر دیے کیونکہ یہ پانی بارش کے پانی سے قدرے گرم تھا۔ کشتی میں اتنی گنجائش نہ تھی کہ کوئی بھی فرد دراز ہو کر سو سکے۔ لہٰذا وہ اونگھتے ہوئے نیند کی کمی پوری کرتے تھے۔

وہ ایک بہتر رفتار سے سفر طے کر رہے تھے۔ وہ 24 گھنٹوں میں تقریباً ایک صد میل کا سفر طے کر لیتے تھے۔ وہ شمال۔ مغرب کی جانب سفر کر رہے تھے تاکہ شمالی جزیروں سے آگے بڑھ سکیں۔ لیکن تین ہفتوں کے بعد یہ لوگ شدید مشکلات کا شکار ہو چکے تھے۔ 23 مئی کو بلیگ نے تحریر کیا کہ:۔

''ہم جن مصائب کا شکار تھے اس روز ان کی شدت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا...... رات خوفناک تھی''۔

بپھرا ہوا سمندر...... خوف...... بھوک...... فاقہ کشی...... سردی اور بہت سے دیگر مصائب ان پر سوار تھے:۔

''25 مئی...... بہتر موسم...... پُرسکون سمندر...... تمام لوگ ہنوز زندہ تھے۔ ایک پرندہ قابو آ گیا تھا جس کا سائز ایک چھوٹے کبوتر کے مساوی تھا۔ ان کو 18 حصوں میں تقسیم کیا گیا اور کھایا گیا۔ اس کی ہڈیاں بھی چبالی گئیں۔ ان افراد کو اب ایک پاؤنڈ کا 25 واں حصہ بسکٹ دی گئیں...... دن میں دو مرتبہ...... یہی ان کا ناشتہ تھا...... دوپہر کا کھانا تھا...... اور رات کا کھانا تھا۔''

29 مئی تا 2 جون...... بلیگ انتہائی مہارت کے ساتھ ایک جزیرے پر اترا۔ یہ جزیرہ غیر آباد تھا۔ یہاں پر جنگلی بیریاں دستیاب تھیں جن کو پیٹ بھر کر کھایا گیا۔ اس کے بعد وہ تازہ دم اور مزید پُر اعتماد ہو کر دوبارہ عازم سفر ہوئے۔

2 جون تا 14 جون...... ہوا سازگار تھی جس نے انہیں چار ناٹ کا سفر طے کرنے میں معاونت سرانجام دی لیکن بڑھتی ہوئی امید کے ساتھ ساتھ جلد ہی سردی اور نمی نے انہیں تھکاوٹ کے احساس سے دوچار کر دیا۔ لوگ انتہائی لاغر اور کمزور ہو چکے تھے اور نیم بے ہوشی کے عالم میں تھے۔ اس دوران وہ تیمور پہنچ چکے تھے۔

13 تاریخ کو تیمور ان کی نگاہوں کے عین سامنے تھا۔ لیکن ابھی انہیں آخری چند میل کا سفر سرانجام دینا تھا۔

ساحل پر پہنچنے تک وہ لوگ اس قدر کمزور ہو چکے تھے کہ چلنے سے عاجز تھے۔ پہلا شخص جس سے ان کی ملاقات ہوئی تھی وہ ایک انگریز ملاح تھا۔ وہ ان لوگوں کو اپنے کپتان کے پاس لے گیا۔ جلد ہی یہ لوگ کپتان کے ذاتی گھر میں کپتان کی میز کے اردگرد براجمان تھے اور ایک انگریزی ناشتہ ان کے سامنے رکھا تھا۔ بلیگ نے میز پر ایک نگاہ دوڑائی...... اپنے میزبان پر بھی ایک نگاہ دوڑائی جو مہربان نظروں کے ساتھ اپنے ان مہمانوں کو دیکھ رہا تھا جن کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو رواں تھے اور ان کی آنکھوں سے تشکر کا اظہار بھی ہو رہا تھا۔ ان کے جسم ماسوائے کھال اور ہڈیوں کچھ بھی نہ تھے۔ ان کے کپڑے پھٹ چکے تھے۔

وہ تیمور سے گھر تک بحری سفر سرانجام دینے کے قابل نہ تھے۔ لیکن انہوں نے بٹاوا سے روانہ ہونا تھا۔ ان جزیروں کے درمیان باقاعدہ رابطہ بھی استوار نہ تھا۔ لہٰذا دو ماہ بعد وہ دوبارہ عازم سفر ہوئے۔ نارٹن پہلے ہی ہلاک کیا جا چکا تھا۔ ایک اور شخص تیمور میں موت سے ہمکنار ہو چکا تھا۔ دو اشخاص بٹاوا میں بخار کی لپیٹ میں آ چکے تھے اور بخار کے عالم میں موت سے ہمکنار ہو چکے تھے۔ پانچواں شخص انگلستان کی جانب سفر کے دوران موت سے ہمکنار ہوا تھا۔ چھٹا شخص ڈوب کر ہلاک ہوا تھا۔ لہٰذا کشتی پر سوار 19 افراد میں سے 13 افراد پورٹ ماؤتھ پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

بلیگ پر بونٹی نامی جہاز کے نقصان کا الزام عائد کیا گیا۔ اس کے فوراً بعد وہ دوبارہ تاہٹی سے بریڈ فروٹ اکٹھا کرنے کے سفر پر روانہ ہوا۔ لیکن اس مرتبہ اس کے ساتھ کوئی سانحہ پیش نہ آیا۔ اس کے بعد اس نے فرانس کے خلاف جنگ میں بہترین خدمات سرانجام دیں اور مابعد 1806ء میں اسے ساؤتھ ویلز کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اس کا یہ دورانیہ بھی کسی سانحہ سے کم نہ تھا۔ وہ من مانی کرنے کا عادی تھا۔ لہٰذا اسے ایک نئی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا اور تین برس بعد اسے واپس اس کے گھر رخصت کر دیا گیا۔ لیکن یہ عمل در آمد بھی اس کی ترقی کی راہیں مسدود نہ کر سکا اور وہ وائس ایڈمرل کے عہدے پر فائز ہو گیا...... اگرچہ اس کا فعال کیریئر اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا...... اور 1817ء میں لندن میں اس کا انتقال ہو گیا۔

☆☆☆

بونٹی نامی جہاز پر قبضہ کرنے کے بعد کرسچیئن نے اپنے آدمیوں کو اکٹھا کیا...... ان میں 16 باغی افراد کے علاوہ سات بلیگ کے وفادار افراد بھی شامل تھے...... ان میں سے کچھ افراد کو ان کی مرضی کے برعکس روکا گیا تھا...... کرسچیئن نے ان افراد سے کہا کہ وہ اپنا ایک لیڈر منتخب کر لیں۔ ان افراد نے متفقہ طور پر کرسچیئن کو اپنا لیڈر منتخب کر لیا۔ اب ان کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ وہ کس مقام کا رخ کریں۔ تاہٹی جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ بالآخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک چھوٹے سے جزیرے توبائی کا رخ کیا جائے جو کہ 1000 میل کے فاصلے پر مشرق کی سمت پر واقع تھا۔ ایک ماہ کے بحری سفر کے بعد وہ توبائی پہنچ چکے تھے۔ لیکن اس مقام پر سفید فام لوگوں کے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا اور کچھ لڑائی جھگڑا بھی ہوا۔ تب وہ تاہٹی کی جانب روانہ ہو گئے تاکہ کچھ مویشی اکٹھے کر سکیں اور کچھ آبائی باشندوں اور خواتین کے ہمراہ واپس لوٹ آئے جنہوں نے اہل توبائی کو اس امر پر راغب کیا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ پرامن برتاؤ کریں۔ تاہم یہ امن امان تادیر برقرار نہ رہ سکا۔ اس جزیرے پر تین سرداروں کی حکومت تھی اور کرسچیئن سے یہ غلطی سرزد ہوئی کہ اس نے کمزور ترین سردار کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا۔ سفید فام یہاں پر قابل رحم زندگی گزار رہے تھے لہٰذا وہ کرسچیئن پر دباؤ ڈالتے رہے کہ واپس تاہٹی کا رخ کیا جائے۔ اس جزیرے کو چھوڑنے سے قبل ایک سردار اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ان کی ایک اور لڑائی بھی ہوئی۔ لیکن اس لڑائی میں کوئی سفید فام زخمی نہ ہوا اور ماہ ستمبر میں وہ تمام کے تمام تاہٹی واپس پہنچ چکے تھے۔ تمام تر وفاداروں اور نصف باغیوں نے اس مقام پر ہی قیام کرنے کا ارادہ کیا۔

بقایا آٹھ افراد بمع کرسچیئن نے کچھ تاہٹی خواتین کو اغوا کیا اور ان کے ہمراہ عازم سفر ہوئے۔ ان کے اس سفر میں تین مرد آبائی باشندے بھی شامل تھے...... وہ کسی ایسے الگ تھلگ جزیرے کی تلاش میں تھے جہاں پر وہ اپنی زندگی کے بقایا ایام گزار سکیں اور ان کو اپنے تلاش کیے جانے کا کوئی خدشہ نہ ہو۔ وہ چار ماہ تک ایسے جزیرے کی تلاش میں رہے اور اس دوران انہوں نے ہزاروں میل کا سفر طے کیا اور وہ پٹکارن پہنچ گئے۔ یہ جگہ ان کو ایک مثالی جگہ دکھائی دی۔ یہ جگہ غیر آباد تھی۔ یہاں پر بریڈ فروٹ...... کیلوں اور دیگر اشیائے خورد و نوش کی فراوانی تھی اور پانی کی بھی بہتات تھی۔ وہ لوگ جب بونٹی نامی جہاز سے اپنا ساز و سامان اتار چکے تو کرسچیئن نے جہاز کو آگ لگا دی۔ اس کے ساتھیوں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ اچانک ان کے اندر انگلستان جانے کی خواہش بیدار ہونے لگی اور وہ اپنی تمام تر مہم پر ماتم کرنے لگے۔ اس کے بعد 18 برس تک وہ تاریخ کی نظروں سے اوجھل رہے۔

1808ء میں اس وقت جزوی طور پر پردہ اٹھا جبکہ ایک امریکی اس جزیرے پر جا پہنچا۔ اس وقت باغیوں میں سے محض ایک ہی فرد زندہ تھا۔ اس کا نام ایلک اسمتھ تھا۔ لیکن 1814ء تک مکمل داستان منظر عام پر نہ آ سکی تھی...... وہ لوگ بہت سے مصائب کا شکار رہے تھے...... انہوں نے پٹکارن پہنچنے سے پیشتر مختلف جزیروں سے تین مزید آبائی باشندے پکڑے تھے اور آغاز ہی سے ان کے پاس تین عورتوں کی کمی پائی جاتی تھی اور جب پانچ میں تین موت کا شکار ہو گئیں تب سفید فاموں نے آبائی باشندوں کی بیویوں کو چرا لیا۔ دو مقامی باشندوں نے بدلہ لینے کی کوشش کی مگر وہ ہلاکت کا شکار ہو گئے۔ بقایا چار کے ساتھ غلاموں جیسا سلوک روا رکھا گیا۔ انہوں نے بھی بدلہ لینے کی کوشش کی اور ایک روز انہوں نے پانچ سفید فاموں کو ہلاک کر دیا۔ یہ واقعہ ستمبر 1793ء کو پیش آیا تھا۔ ان سفید فام مردوں کی بیویوں نے دو مقامی باشندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تب کچھ

برسوں تک امن وامان رہا کیونکہ ان سفید فاموں کے پاس اب عورتوں کی تعداد مردوں کی نسبت زیادہ تھی حتیٰ کہ ایک باغی نے ٹی پلانٹ سے الکحول کشید کرنے کا طریقہ دریافت کرلیا۔ اس نے ڈی۔ ٹی تیار کی اور خودکشی کرلی۔ اب اس جزیرے پر ان سفید فاموں کے بیس بچے آباد تھے اور باغیوں میں سے محض اسمتھ نامی باغی زندہ بچا تھا۔

جہاں تک تاہٹی کے لوگوں کا تعلق تھا...... اپنی آمد کے اٹھارہ ماہ بعد انہوں نے اپنے آپ کو ''پنڈورا'' نامی بحری جہاز کے حوالے کر دیا تھا جو انگلستان سے ان کی تلاش کے لئے آیا تھا۔ واپسی کے سفر کے دوران یہ جہاز ایک حادثے کا شکار ہو گیا تھا اور اس حادثے کے نتیجے میں بونٹی نامی جہاز کے چھ افراد ڈوب گئے تھے اور محض دس افراد بالآخر پورٹ ماؤتھ پہنچے تھے۔ ان کا کورٹ مارشل کیا گیا اور تین افراد کو بغاوت کے جرم میں سزائے موت سنائی گئی اور باقی ماندہ افراد کو بری کر دیا گیا یا معاف کر دیا گیا۔

آج...... پٹکارن پر باغیوں کی اولاد آباد ہے۔ حیرانگی کی بات یہ ہے کہ کیا وہ کرسچین یا ولیم بلیگ کے بارے میں سوچتے ہوں گے...... جن کے آپس میں کے جھگڑے کی وجہ سے وہ اس دنیا میں آنے اور اس جزیرے پر آباد ہونے پر مجبور ہوئے؟

روزیٹا اسٹون (پتھر) کی بازیابی

وادی نیل کی سیاحت سرانجام دینے والا کوئی بھی سیاح آج بھی قدیم مصری تہذیب کی شان و شوکت سے بخوبی آگاہ ہو سکتا ہے۔ فرعونوں نے بڑے بڑے اور بھاری پتھر استعمال کئے تھے......اور چونکہ آب و ہوا بھی خشک تھی......لہٰذا مجسمے اور عمارات قابل غور حد تک حوادث زمانہ سے محفوظ رہیں۔

تب 1798ء میں نپولین بونا پاٹ نے مصر پر حملہ کیا۔ یہ ایک ایسی کارروائی تھی جس نے نہ صرف یورپی حکومتوں کو چوکنا کر دیا بلکہ خوفزدہ بھی کر دیا۔ کیونکہ نپولین بونا پارٹ کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہا تھا۔ بونا پاٹ کے حملے کا اگلا نشانہ برطانیہ کو تصور کیا جا رہا تھا......لیکن بونا پارٹ نے یہ وضاحت کی تھی کہ برطانیہ کو تباہی و بربادی سے ہمکنار کرنے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ اس کے تجارتی راستے منقطع کر دیے جائیں۔ اس کے علاوہ فرانس کے لئے یہ ایک موزوں وقت تھا کہ وہ آرٹ اور ثقافت کے میدان میں ایک مرتبہ پھر رہنمائی سرانجام دیتے ہوئے اپنی سابقہ حیثیت کو برقرار کرے......اور وادی نیل سے جو بھی خزانے حاصل کئے جائیں وہ ایک بہترین کاوش تصور کی جائے گی۔ لہٰذا مصر پر حملے سے فرانس کے دو مقاصد کی تکمیل ممکن ہوتی تھی:۔

(1) دنیا پر یہ ثابت کیا جائے کہ فرانس رو بہ وسعت تھا۔

(2) برطانیہ کے مشرقی وسطیٰ کے ساتھ تجارتی راستے منقطع کئے جائیں۔

البتہ بونا پاٹ نے اپنے اس ذاتی خواب کو منظر عام پر لانے کی جسارت نہ کی تھی جس کے تحت اسکندر اعظم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایک بہت بڑی سلطنت کی تخلیق چاہتا تھا۔

اسکندریہ تک کا سفر بخوبی طے پا گیا تھا اور کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا تھا اور دریائے نیل کے ڈیلٹا (دھانے) پر کیمپ لگا لئے گئے تھے۔ فرانسیسی سوچ کے ہمراہ مصر کی قدیم تہذیب کے معروف 175 ماہرین بھی لائے گئے تھے اور ان لوگوں نے فوری طور پر اپنا کام سرانجام دینا شروع کر دیا تھا اور آرٹ کے پرانے نمونے اکٹھے کر کے ان کی فرانس روانگی کا بندوبست کر دیا تھا۔ انہوں نے اسکندریہ کے علاوہ دیگر مصری شہروں کو بھی حیران کن اشیاء کے ساتھ بھرا ہوا پایا اور انہوں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ ان اشیاء پر قبضہ جما لیا۔ بدنصیب اور مصیبت زدہ مالکان ان مغرور اور طاقت ور لوگوں کے سامنے بزدلی کا مظاہرہ کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے تھے کیونکہ حملہ آور واضح طاقت اور قوت کے حامل تھے۔

فرانسیسی فوجی دستے اپنے کیمپوں کے نزدیک مختصر آرام سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ روزیٹا کے مقام پر......جو کہ ایک ساحلی قصبہ تھا......وہ اسکندریہ سے 30 میل کے فاصلے پر واقع تھا......ایک نوجوان انجینئر افسر جس کا نام بوسارڈ تھا اس نے اس مقام کے نزدیک ایک پرانے قلعے کا معائنہ کیا اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ قلعہ ایک بہترین فوجی چوکی کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ مناسب احتیاط بھی لازم تھی

تا کہ مزید تحفظ کو ممکن بنایا جا سکے۔ لہٰذا اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اس قلعے کے سامنے کچھ فاصلے پر ایک خندق کھودی جائے۔ وہ اپنے خیمے میں پڑا اونگھ رہا تھا کہ ایک سارجنٹ نے آ کر اسے جگایا اور یہ خبر بہم پہنچائی کہ خندق کی کھدائی کے دوران انہیں پتھر سے بنائی گئی دیوار کا ایک حصہ نظر آیا تھا۔ بوسارڈ اس دیوار کو دیکھنے کے لئے فوراً اس سارجنٹ کے ہمراہ چل دیا...... اس نے اس دیوار کو گرانے کے احکامات صادر کر دیے...... اس دوران اسے کوئی عجیب وغریب چیز نظر آئی۔ وہ فوری طور پر خندق میں کود گیا تا کہ مزید قریب سے اس چیز کا مشاہدہ کر سکے۔ دیوار کا یہ حصہ تقریباً چھ فٹ اونچا تھا اور آٹھ یا نو فٹ لمبا تھا۔ اس کے درمیان میں پتھر کی ایک سل نصب تھی جس کی پیمائش تقریباً تین مربع فٹ تھی۔ اس سل کے معائنے سے یہ انکشاف ہوا کہ اس کو عین مہارت کے ساتھ دیوار میں بنایا گیا تھا اور جب بوسارڈ نے اس کی سطح پر سے ریت کو صاف کیا تو اس کو یہ دیکھ کر ازحد حیرانگی ہوئی کہ اس کی سطح بہترین پالش کی حامل تھی اور قدیم مصری تحریر سے ڈھکی ہوئی تھی جو بجائے حروف کے تصویر کے ذریعے لکھی جاتی تھی (خط تصویری)

اگر چہ وہ قدیم مصری تہذیب کا ماہر نہ تھا اور نہ ہی وہ کسی مخصوص ذہانت کا حامل نوجوان تھا لیکن فرانسیسی افسران کو ماہرین سے یہ تربیت دلوائی گئی تھی کہ وہ کسی بھی غیر معمولی نوعیت کی حامل چیز کی اہمیت سے واقف ہو سکیں اور ایسی غیر معمولی چیز کی فوری طور پر رپورٹ افسران بالا کو پیش کریں۔ پتھر کی یہ سل بھی غیر معمولی نوعیت کی حامل تھی۔ لہٰذا بوسارڈ نے دیوار گرانے میں اپنے آدمیوں کی مدد کی حالانکہ یہ کوئی آسان امر نہ تھا کیونکہ اس دیوار کے تعمیر کنندگان بھی اپنے فن کے استاد تھے۔ وہ گرم اور لمبی دوپہر اسی کام میں مصروف رہے۔ بالآخر وہ پتھر کی سل نکالنے میں کامیاب ہو گئے اور سارجنٹ کی مدد سے بوسارڈ اس سل کو اپنے خیمے میں لے آیا۔

یہ محض ایک اتفاق تھا کہ انہوں نے روزیٹا اسٹون دریافت کر لیا تھا۔ یہ سل ایک ایسا خزانہ تھی جسے سے بڑھ کر کوئی خزانہ مصر سے دریافت نہ ہوا تھا کیونکہ یہ سل وہ چابی مہیا کرتی تھی جو فرعونوں کے ملک کی تاریخ کے دروازے کھولتی تھی۔ یہ سل تحریر کی حامل تھی اور یہ تحریر تین مختلف اقسام سے متعلق تھی۔ اس کی نچلی سطح پر یونانی زبان میں تحریر تھی۔ درمیان میں قدیم مصری زبان میں تحریر تھی اور بالائی سطح پر خط تصویری تھا (قدیم مصری تحریر جو بجائے حروف کے تصویر کے ذریعے لکھی جاتی تھی)

بوسارڈ نے اس پتھر کی بازیابی کی رپورٹ فوری طور پر اپنے افسران بالا کو دی اور ان کے جواب کا انتظار کرنے لگا کیونکہ اس کے ساتھی افسران نے اسے بتایا تھا کہ اس قسم کی دریافت پر بھاری انعام واکرام دیا جاتا تھا۔ لیکن حکام بالا نے اپنے ردعمل کے اظہار میں کافی سستی سے کام لیا۔ اس کی گئی ایک جوہات تھیں۔ بوناپارٹ نے جو 175 ماہرین مخصوص کیے تھے ان میں سے ایک تہائی معروف ماہر آثار قدیمہ تھے۔ وہ اپنے کئی ایک پراجیکٹ کے سلسلے میں مصروف تھے۔ وہ یا تو کسی دریافت کی خبر کو محو کر دیتے تھے یا اس کی اہمیت کو نظر انداز کر جاتے تھے جبکہ بقایا دو تہائی ماہرین ادھر اُدھر منڑگشت کرتے رہتے تھے اور جلد از جلد خزانے سمیٹنے میں مصروف رہتے تھے۔ بہت سے یورپی ممالک میں مصری قدیم اشیاء ازحد مقبول تھیں اور ان کی خرید کے لئے بھاری قیمت ادا کی جاتی تھی۔

بالآخر بوسارڈ کو یہ احکامات موصول ہوئے کہ وہ اپنی دریافت کے ہمراہ اسکندریہ پہنچے۔ اس نے خوشی خوشی ان احکامات کی تعمیل کی۔ شہر پہنچنے کے بعد اسے ایک کے بعد دوسرے افسر کے پاس بھیجا جاتا رہا لیکن کوئی بھی اس کی دریافت سے متاثر ہوتا دکھائی نہ دیتا تھا حتیٰ کہ ایک عمر رسیدہ کوتاہ قد شخص نے یہ انکشاف کیا کہ پتھر کی اس سل پر رقم تحریر عظیم اہمیت کی حامل ہو سکتی تھی۔ اس شخص نے بوسارڈ کو اپنے پیچھے پیچھے چلنے کی تلقین کی اور بوسارڈ پتھر کی سل کو

اپنے سینے کے ساتھ لگائے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا حتیٰ کہ وہ ایک ایسے ہال میں پہنچ گئے جہاں پر کمانڈر انچیف براجمان تھا۔ اس عمر رسیدہ کوتاہ قد شخص نے ایک میز سامنے کی جانب کھینچی اور بوسارڈ کو اشارہ کیا کہ وہ پتھر کی اس سل کو اس میز پر رکھ دے۔ اس کے بعد اس شخص نے نپولین کو اس سل کی ممکنہ اہمیت کے بارے میں انتہائی وضاحت کے ساتھ بتایا۔ وہ عظیم شخص اپنے سر کو جنبش دیتا رہا۔ مابعد اس نے حکم دیا کہ:۔

''اس پر رقم تحریر کی نقول یورپ کے ہر ایک مفکر کو بھجوا دی جائے۔''

اس کے بعد اس نے بوسارڈ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ:۔

''نوجوان...... تم نے ایک بہتر کارنامہ سرانجام دیا ہے...... جب تمہاری اس دریافت کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ لگا لیا جائے گا تب تمہیں گراں قدر انعام سے نوازا جائے گا۔''

اور یہ آخری کلام تھا جو بوسارڈ نے روزیٹا اسٹون کے بارے میں سنا تھا...... وہ پتھر جس کے ساتھ اس نے کافی زیادہ امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ اس کے بعد اس کو ہدایت کی گئی کہ وہ پتھر کی اس سل کو وہیں پڑا رہنے دے جہاں پر یہ رکھی گئی تھی اور بذات خود فوری طور پر اپنی یونٹ میں واپس چلا جائے۔ جوں ہی بوسارڈ روزیٹا واپس پہنچا توں ہی ہر کوئی جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ یہ جنگ غزہ کے مقام پر لڑی گئی اور اس جنگ میں نپولین نے مملوکوں کی قوت کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔

نپولین کی اس کامیابی سے فرانسیسی عوام اگرچہ خوشی سے ہمکنار ہوئی لیکن تمام ترلی وانت (بحر روم کا مشرقی حصہ اور اس کا ساحل اور جزائر وغیرہ) میں یہ صدائیں گشت کرنے لگیں کہ قدیم لوگوں کی آزادی کو بحال کیا جائے اور ان پر جبر و استبداد کے دروازے بند کئے جائیں۔

یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ یہ لڑائی جولائی 1798ء کو لڑی گئی تھی لیکن ایک ماہ بعد نیلسن کے بحری جہازوں نے خلیج ابو بکر سے فرانسیسی بحریہ کو اپنا نشانہ بنایا۔ وہ بحری بیڑہ جو نپولین کی فتح یاب فوج کو مصر لایا تھا۔ چونکہ یہ حملہ اچانک ہوا تھا لہٰذا فرانسیسی تھوڑی بہت مزاحمت ہی کر سکے اور ان کی بحری قوت ایک حد تک خاتمہ پذیر ہو چکی تھی اور اس طرح برطانیہ کو بالا دستی حاصل ہو گئی۔ اپنے گھر میں بھی نیلسن کی فتح کے دور رس نتائج نکلے۔ اس فتح نے برطانیہ' آسٹریلیا اور روس کے اتحاد کی راہیں کھول دیں تا کہ فرانس کی حکومت کا خاتمہ کیا جا سکے اور ان کو ان کی پرانی سرحدوں کے اندر مقید کیا جا سکے۔

نپولین فرانس کیلئے روانہ ہوا۔ مصر اور شام کے فاتح کے طور پر اس کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ اس کو اپنے ملک کا نجات دہندہ بھی قرار دیا گیا۔ فرانس کے لوگ یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ کافی جنگ و جدل سرانجام دے چکے تھے۔ فرانس کے معاشی حالات بدتر ہو چکے تھے۔ ملک میں بدامنی کا بھی دور دورہ تھا۔ سڑکیں ہجوم سے خالی تھیں اور ویران پڑی تھیں۔ اسکولوں میں معقول تعداد میں اساتذہ موجود نہ تھے۔ اہسپتالوں میں معقول تعداد میں ڈاکٹر اور نرسیں موجود نہ تھیں۔ صنعت کا بھی بُرا حال تھا اور زراعت بھی ابتر حالت کا شکار تھی۔

وہ لوگ جو شام کی مہم کے لئے منتخب نہ ہو سکے تھے اب نیل کے ڈیلٹا میں تقریباً دو برس سے برسرپیکار تھے۔ بوسارڈ کی یونٹ بھی ان میں سے ایک تھی۔ وہ بیچارا نوجوان انعام کے حصول کی تمام امیدیں ختم کر چکا تھا۔

روزیٹا میں بوسارڈ محو انتظار ہی رہا...... خالی ہاتھ...... اور خالی دل۔ ان دنوں تار کا نظام موجود نہ تھا اور مواصلاتی نظام سست روی کا شکار تھا

......لہٰذا نہ ہی بوسارڈ اور نہ ہی ماہرین یہ جانتے تھے کہ روزیٹا اسٹون کی تحریر کی جو نقول انہوں نے یورپی ماہرین کو بھجوائی تھیں ان کا کیا بنا تھا۔ حالانکہ ان تحریروں نے یورپی مفکرین کی دلچسپی کو ابھارا تھا۔ کچھ ماہرین اس نکتہ نظر کے حامل تھے کہ یہ روزیٹا اسٹون مصری تاریخ کی چابی تھی۔

نئی صدی کی عمر بمشکل ایک برس تھی کہ برطانیہ نے نیل کے ڈیلٹا پر چڑھائی کی تھی۔ انہوں نے فرانسیسی فوج کو قیدی بنا لیا تھا اور فرانس کے غلبے کے آخری نشانات کو بھی مٹا دیا تھا۔ ان قیدیوں میں بوسارڈ بھی شامل تھا...... اسے اس وقت شہرت کی چند گھڑیاں نصیب ہوئیں جب انگلستان پہنچنے کے بعد اس سے روزیٹا اسٹون کی دریافت کے بارے میں سوالات کئے گئے۔ اس نے ان سوالات کے صحیح جواب دیے اور اس کے جواب سچائی پر مبنی تھے اور اس کے بعد اسے واپس جیل میں ڈال دیا گیا اور وہ ایک لمبے دورانیے تک جیل میں ہی رہا۔ برطانیہ نے ان تمام خزانوں اور نوادرات پر قبضہ کر لیا جو فرانس نے مصر میں اکٹھے کئے تھے۔ وہ روزیٹا اسٹون میں گہری دلچسپی لے رہے تھے جس کو اب برطانوی عجائب گھر کی زینت بنا دیا گیا تھا اور تھامس ینگ اس کا مطالعہ سرانجام دے رہا تھا۔

روزیٹا اسٹون پر کام ایک مشکل اور دست روی کا حامل کام ثابت ہوا۔ 1822ء میں ایک فرانسیسی ماہر لسانیات جین فران کوئس اس قابل ہوا کہ وہ اس پتھر پر رقم تحریر کا ترجمہ پیش کر سکے۔ اگلے دس برسوں کے دوران اس نے مصری گرائمر اور ڈکشنری تیار کی۔ لہٰذا ایک ہزار سے زائد برس بعد قدیم مصریوں کے الفاظ دوبارہ پڑھے گئے اور دنیا کے عظیم ترین لوگوں کی تاریخ کا انکشاف ہوا۔

......❀......

لی وس اور کلارک

1803ء میں صدر امریکہ تھامس جیفرسن نے جیمز مونرو کو نیو آرلیز کی خریداری کے لئے بھیجا اور اس کے ساتھ قصبے کے مشرق کی جانب اتنی زمین کی خریداری کی ہدائت بھی کی جتنی زمین وہ فرانسیسیوں کو 10,000,000 ڈالر کے عوض بیچنے پر آمادہ کر سکے۔ وہ اور اس کی حکومت حیران رہ گئی کہ وہ نہ صرف نیو آرلیز کی بندرگاہ بلکہ لوسیانہ کا پورا علاقہ 15,000,000 ڈالر میں خریدنے میں کامیاب ہو گیا۔ خون خرابہ کئے بغیر امریکہ نے اپنی علاقائی ملکیت کی حدود دوگنی کر لی اور دنیا کی زرخیز ترین وادی حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔

اس نئے رقبے نے امریکیوں کے لئے مہمات سرانجام دینے اور تحقیق و تفتیش کے نئے دروازے کھول دیے۔ ان مہمات میں سے اہم ترین مہم لی وس اور کلارک کی تھی جو انہوں نے دریائے کولمبیا کے دہانے پر سرانجام دی۔

تھامس جیفرسن اس مہم کی اہمیت سے بخوبی واقف تھا۔ اگر نئی امریکی سلطنت کو کامیابی کے ساتھ آباد کرنا تھا اور اس کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنا تھا تو یہ ضروری تھا کہ اس سرزمین کی تحقیق و تفتیش سرانجام دی جائے اور اس خطے کی نوعیت...... آب وہوا...... سبزیوں اور حیوانات کی زندگی کے بارے میں بخوبی جانا جائے۔

جیفرسن نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کیپٹن میری ویدر لی وس کا انتخاب کیا کہ وہ اس مہم کی سربراہی سرانجام دے۔ ولیم کلارک (امریکی فوج کا لیفٹیننٹ) کو سیکنڈ۔ ان۔ کمان مقرر کیا گیا۔ دیگر جماعت کا انتخاب سرحدی فوج سے کیا گیا...... اس جماعت کیلئے اچھی صحت...... اچھے مزاج اور اچھے اخلاق کے حامل افراد کا انتخاب کیا گیا۔ چند ایک شہریوں کو بھی اس جماعت میں شامل کیا گیا جو رضا کارانہ طور پر شامل ہوئے تھے۔

لی وس نے دریاؤں کی گزرگاہوں کا مشاہدہ سرانجام دینا تھا...... تمام ترجزیروں کے نقشے مرتب کرنے تھے اور علاقے کا نقشہ بھی بنانا تھا اور غیر معمولی لینڈ مارک کی جانب خصوصی توجہ دینی تھی۔ زمین کی زرخیزی کا مشاہدہ سرانجام دینا تھا...... موسمی صورت حال اور موسموں کے تغیر و تبدل کا مشاہدہ سرانجام دینا تھا...... حیوانی۔ نباتاتی اور حشرات الارض کی زندگی کا مشاہدہ سرانجام دینا تھا...... انڈین قبائل...... ان کے رہائشی مقامات...... ان کے طور طریقے اور رسم ورواج وغیرہ کا مشاہدہ سرانجام دینا تھا...... تجارت کی ممکنات کا جائزہ لینا تھا اور انڈین میں چیچک کے خلاف مدافعتی ٹیکے متعارف کروانے تھے۔

اس جماعت نے جو فاصلہ طے کرنا تھا وہ تقریباً چار ہزار میل کے لگ بھگ تھا اور اس فاصلے کو دو برس کی مدت میں طے کرنا تھا۔

یہ جماعت 43 ارکان پر مشتمل تھی۔ ان میں سے 14 افراد حاضر سپاہی تھے...... دو افراد فرانسیسی تھے اور ایک نیگرو غلام بھی شامل تھا۔

1804ء کے موسم بہار تک یہ جماعت مہم کی سرانجام دہی کے لئے تیار تھی۔ کشتیوں پر سامان تجارت لاد دیا گیا تھا۔ اس سامان میں دیگر اشیاء کے علاوہ

آٹا...... نمک...... سور کا گوشت...... بندوقیں...... اسلحہ اور اوزار وغیرہ شامل تھے۔

5 مئی کو یہ جماعت اپنے تاریخی سفر پر روانہ ہوئی۔

سفر کا پہلا حصہ ماہ مئی اور ماہ اکتوبر کے درمیان طے کیا گیا۔ یہ سفر 1600 میل پر محیط تھا اور یہ سفر طے کرنے کے بعد یہ جماعت ان انڈین دیہاتوں میں پہنچ گئی جو آج کل کے بسمارک کے شمال میں پچاس میل کی دوری پر واقع تھے۔

مسوری تک جہازرانی آسان نہ تھی اور کئی ایک مشکلات درپیش تھیں۔ لہٰذا روزانہ اوسطاً 12 اور 15 میل کا سفر طے کیا جاتا تھا۔ کبھی کبھار یہ سفر محض چھ میل فی دن تک محدود ہو کر رہ جاتا تھا۔

لی وس...... کلارک اور جماعت کے دیگر ارکان جو مشاہدہ کرتے تھے یا جو کچھ سرانجام دیتے تھے اس کو تحریر میں محفوظ کر لیتے تھے۔ انہوں نے علاقے کے نقشے بھی بنائے تھے۔

''ہم جس علاقے سے گزرے وہ یکساں صورت حال کا حامل تھا...... زرخیز...... دریا کے نزدیک نشیبی زمینیں...... وسیع میدان ......اور لکڑی کی بہتات۔''

23 اگست 1804ء کو انہوں نے پہلی بھینس ہلاک کی (حقیقی نام امریکی ارنا بھینسا)۔ یہ ان دنوں میدانوں میں خال خال ہی پائی جاتی ہے۔ کسی دور میں یہ امریکہ کے تمام تر میدانوں میں پائی جاتی تھی...... کینیڈا تا میکسیکو...... ان کے غول کی تعداد کافی بڑی ہوتی تھی۔ بھینس انڈین معیشت کا واحد ذریعہ تھی۔

''...... مویشی نہ صرف انڈین کی غذائی ضروریات پوری کرتے ہیں بلکہ ان کے لباس کی ضروریات بھی پوری کرتے ہیں...... ان کے بستر۔ رسے۔ بیگ وغیرہ بھی انہیں کی کھالوں سے بنائے جاتے ہیں۔''

''...... اس بھینس کا گوشت اس قدر لذیز ہے کہ میں نے ایسا لذیز گوشت پہلے کبھی نہیں کھایا تھا...... اس کی زبان اس کے جسم کا بہترین حصہ ہے۔''

''ہمیں آگ جلانے کیلئے لکڑی درکار تھی جو ہمیں دستیاب نہ تھی۔ ہم نے لکڑی کے نعم البدل کے طور پر بھینس کا گوبر جلا کر اپنا ناشتہ تیار کیا۔''

اس جماعت کو دیگر بہترین غذائیں بھی دستیاب تھیں۔ جانوروں کی کھالوں کی تجارتی قدر و قیمت بھی بیان کی گئی تھی۔

اس علاقے کے جانوروں...... حیوانوں...... حشرات الارض...... نباتات کو بھی مکمل طور پر بیان کیا گیا تھا۔ دریا کے کناروں سے دور درختوں سے بے نیاز وسیع میدان تھے اور سرسبز اور زرخیز وادیاں بھی موجود تھیں جو مختلف اقسام کے درختوں کی حامل تھیں۔

میدانوں میں آباد انڈین اونٹوں کے ذریعے تجارتی سرگرمیاں سرانجام دیتے تھے۔ لی وس ان کے ساتھ بہتر سلوک کرتا تھا اور ان کی عزت کرتا تھا۔ وہ انہیں تحائف پیش کرتا تھا اور ان کی مقامی زبانوں کا موازنہ کرتا تھا۔

وہ انڈین قبائل کے ساتھ مشاورت سرانجام دیتا تھا اور ان کی آپس کی قبیلوں کی جنگوں میں ثالث کے فرائض بھی سرانجام دیتا تھا۔ اس نے کئی ایک قبائل کو آپس کی جنگیں بند کرنے پر بھی آمادہ کیا تھا۔

21 اکتوبر کو یہ جماعت مینڈین کے نو دیہاتوں میں پہنچی۔

26 اکتوبر کو موسم سخت سرد تھا اور جماعت کے دو ارکان سردی کی شدت کی وجہ سے علیل ہو گئے تھے۔ لی وس نے فیصلہ کیا کہ اب وقت آن پہنچا تھا کہ ایک مستقل کیمپ بنایا جائے۔ اس نے اپنی جماعت کے ارکان کو حکم دیا کہ وہ کیمپ تیار کریں تا کہ اس میں موسم سرما بخوبی گزارا جا سکے۔ ایک ماہ کے اندر اندر یہ کام مکمل ہو گیا اور اس کا نام فورٹ مینڈین رکھا گیا۔

29 تاریخ کو برف باری ہوئی اور ایک فٹ سے زائد برف پڑی۔ 12 دسمبر کو دریا کا پانی بھی جم گیا۔ سردی علاقے کو اپنی گرفت میں لے چکی تھی اور پانچ ماہ تک سردی کی شدت جاری رہی۔

موسم کی شدت کے باوجود جماعت کے ارکان نہ تو بور ہوئے اور نہ ہی فارغ بیٹھے رہے۔ گذشتہ مہینوں کے دوران انہوں نے دریا کے کناروں سے جو ہڈیاں...... چٹانوں کے ٹکڑے...... سینگ وغیرہ اکٹھے کئے تھے ان کا معائنہ سرانجام دیتے رہے...... ان کی رپورٹ تحریر کرتے اور ان کو صندوقوں میں بند کر دیتے تا کہ ان کو واپس مشرق کی جانب روانہ کیا جا سکے جبکہ موسم بہار میں برف پگھل جائے۔ برطانوی اور فرانسیسی فر کے تاجر...... شمال۔ مغربی فر کمپنی کے ملازمین تجارت کی غرض سے ان دیہاتوں کا دورہ کرتے تھے۔

اس دوران دوستانہ ماحول کے حامل مینڈین انڈین اپنے دیہاتوں میں سفید فام ملاقاتیوں کا استقبال کرتے...... ان کو کھانا کھلاتے اور ان کی تفریح کا سامان مہیا کرتے تھے جو مختلف رقص کی صورت میں ہوتا تھا اور ان کو اپنی سماجی زندگی میں جھانکنے کا موقع فراہم کرتے تھے۔

سفید فام مہم جو بھی جوش' جذبے اور ولولے کا مظاہرہ کرتے تھے اور اپنے میزبانوں کے ساتھ گھل مل جاتے تھے۔

جب موسم سازگار ہوا تب نمونہ جات کے صندوق کشتی پر لادے گئے اور 13 افراد پر مشتمل عملہ واپس گھر کی جانب روانہ ہوا کہ اس جماعت کی اب تک کی کارروائی کی رپورٹ حکام کو پیش کر سکے۔ باقی جماعت نئی کشتیوں پر سوار ہوئی اور انہوں نے اہل مینڈین کو خدا حافظ کہا اور مغرب کی سمت روانہ ہو گئی۔

اگرچہ سینٹ لوئس اور میڈین کے درمیان دریا سے آشنائی حاصل تھی لیکن اس مقام سے یہ جماعت اس ملک کا سفر سرانجام دے رہی تھی جس کے بارے میں تحقیق و تفتیش کے مراحل ہنوز طے پانے تھے۔

پہلے چند ہفتوں کے دوران وہ ایسے میدانوں سے گزرتے رہے جو درختوں سے بے نیاز تھے۔ وہ نمونے اکٹھے کرتے رہے...... نقشے بناتے رہے۔ 26 مئی کو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب:۔

"کیپٹن لی وس نے چٹانی پہاڑیوں کا ایک دور دراز کا منظر دیکھا...... ہماری امیدوں کا مرکز اور ہماری کاوشوں کا انعام۔"

یہ کسی کا عجیب و غریب تبصرہ ہے جس کا مقصد حقیقت میں دریائے کولمبیا تھا جو اونچے پہاڑی سلسلے سے دور بہتا ہے۔ لی وس اور کلارک کو

حقیقی اندازہ نہ تھا کہ ان چٹانوں کے پیچھے کیا ہے۔ انہیں جو بھی معلومات حاصل ہوئی تھیں وہ انڈین سے حاصل ہوئی تھیں جن کا فاصلے کے بارے میں قیاس اور فاصلے کو طے کرنے کے لئے درکار وقت سفید فاموں کے قیاس سے مطابقت نہ رکھتا تھا۔

13 جون 1805ء کو وہ مسوری کی عظیم آبشاروں تک جا پہنچے۔ لیوس آبشاروں کے عین وسط میں کسی چٹان پر براجمان ہو گیا اور اس نظارے میں کھو گیا جو نظارہ اپنی تخلیق سے لے کر اب تک لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھا۔

آبشاروں سے گزرنے کے بعد جماعت نے بار برداری کا کام سرانجام دینا تھا...... تمام کشتیاں اور ساز وسامان اپنی پشت پر لادنا تھا اور تقریباً 18 میل کا سفر طے کرنا تھا۔ لی وس نے آبشاروں کا تذکرہ تحریر کیا جبکہ کلارک نے ایک بہترین نقشہ تیار کیا۔

ایک ماہ بعد آبشاریں بہت پیچھے رہ چکی تھیں۔ بالآخر 20 جولائی کو وہ چٹانی پہاڑیوں تک جا پہنچے تھے۔ یہاں پہنچنے پر یہ انکشاف ہوا کہ مسوری تین شاخوں میں منقسم ہو چکا تھا۔ ان کے نام تین سیاست دانوں کے ناموں پر رکھے گئے:۔

☆ جیفرسن

☆ میڈی سن

☆ گلاٹن

بیور ہیڈ پہنچنے کے بعد کشتیوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی گئی۔ جماعت پیدل عازم سفر ہوئی اور بالآخر لمحی پاس کے مقام پر دریا کے سرچشمے تک جا پہنچی جو سطح سمندر سے 5,000 فٹ بلند تھا۔

12 اگست کو ان پر یہ انکشاف ہوا کہ تمام ندیاں اب مغرب کی سمت سمندر کی جانب بہہ رہی تھیں۔ اسی روز انڈین نے لی وس اور اس کی جماعت کی ضیافت کی اور سامن مچھلی اس ضیافت میں پیش کی گئی۔

"یہ پہلی سامن مچھلی تھی جو لی وس نے دیکھی تھی۔ اس امر سے وہ انتہائی مطمئن ہوا کہ وہ اب بحرالکاہل کے پانیوں تک پہنچ چکا تھا"

لیکن لی وس کی خوشی اس وقت کافور ہو گئی جب انڈین نے اسے بتایا کہ لمحی وادی کے ساتھ اس کا سفر سرانجام دینا بے کار ثابت ہوگا۔ انڈین نے امریکیوں کو پیش کش بھی کی کہ وہ انہیں سفر کے صحیح راستے پر گامزن کرنے کیلئے ان کی ہمراہی کیلئے بھی تیار ہے۔

اب سفر کا سخت ترین حصہ شروع ہوا تھا۔ پہاڑوں میں ایک لمبا پیدل سفر طے کرنا تھا۔ اس سفر کے دوران انڈین کے پاس جو خوراک تھی وہ بیریاں اور خشک مچھلی پر مشتمل تھی۔

اگرچہ یہ اگست کا مہینہ تھا لیکن موسم سرد ہو چکا تھا اور رات کو پن میں سیاہی جم جاتی تھی۔

4 ستمبر تک وہ نز پرسس پہنچ چکے تھے۔

برف باری شروع ہو چکی تھی۔ جماعت تھکاوٹ کا شکار ہو چکی تھی اور سردی سے بدحال ہو رہی تھی۔

''ان پہاڑوں پر کوئی ذی روح موجود نہ تھا''

17 اکتوبر کو انہیں دریا کی جنوبی شاخ نظر آئی۔ جماعت نے کچھ روز کشتیوں کی تیاری میں گزارے تاکہ وہ سنیک کے مقام تک پہنچ سکیں۔

10 اکتوبر کو وہ سنیک جا پہنچے۔ انہوں نے چار ماہ کا عرصہ اونچے پہاڑوں کے درمیان گزارا تھا۔

سینک کی جانب سفر کے دوران امریکی جماعت کی ملاقات کئی ایک انڈین سے ہوئی۔

''ہم ان کے ساتھ مہربانی کے ساتھ پیش آئے...... ہم نے ہر ایک سردار کو تحائف پیش کئے...... سرداروں نے بھی اس جماعت کے اراکین کو مختلف تحائف پیش کئے اور آدھا ہرن بھی تحفے کے طور پر پیش کیا''

آدھے ہرن کا تحفہ ایک بیش قیمت تحفہ تھا کیونکہ خوراک ابھی تک ان کے لئے اہمیت کی حامل تھی۔ محض چار روز پیشتر لی وس نے یہ تحریر کیا تھا کہ:۔

''ہم نے کھانا تیار کرنے کیلئے ایک کتا خریدا تھا۔ لیکن ہمیں اسے پکانے کے لئے لکڑی خریدنے میں انتہائی دقت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔''

انڈین بہتر کاروباری لوگ تھے۔ اس علاقے کے بہت سے قبائل جنوب کے انڈین کے ساتھ تجارت کرتے تھے۔ تجارت کی بڑی جنس مچھلی تھی...... خشک سامن مچھلی...... مچھلی دیکھ کر لی وس اور اس کی پارٹی کی بھوک بھی چمک اٹھی تھی۔ لیکن انڈین کسی قیمت پر مچھلی بیچنے پر آمادہ نہ ہوئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ مچھلی انہوں نے جنوب کی منڈی کے لئے مخصوص کر رکھی تھی۔ لہٰذا سفید فاموں کو کتے کے گوشت پر ہی گزارا کرنا پڑا۔

''کتے کا گوشت اگرچہ ایک پسندیدہ کھانا نہ تھا لیکن اس کو ایک قابل قبول کھانا ضرور تصور کیا جاتا تھا۔''

16 اکتوبر 1805ء کو یہ جماعت کولمبیا پہنچ چکی تھی۔ 19 اکتوبر کا دن ان کے لئے خوشیوں بھرا دن تھا جب ان کو مونٹ سینٹ ہیلن کی چوٹی نظر آئی تھی۔ یہ چوٹی شمال، مغرب کی جانب واقع تھی۔ 23 تاریخ کو وہ کولمبیا کی گریٹ آبشاروں تک جا پہنچے تھے (اب سلیلو آبشاروں کے نام سے جانی جاتی ہیں)۔ 25 اکتوبر کو جماعت نے اس جگہ کیمپ لگایا جو جگہ آج کل ڈالس قصبے کے نام سے جانی جاتی ہے۔

اس مہم کے پہلے حصے کے دوران لی وس اور کلارک نے مسوری کے عظیم میدانی علاقے کی کشادہ جگہوں کے درمیان سفر طے کیا تھا۔ دریائے سنیک پر پہنچنے کے بعد انہوں نے سرد پہاڑوں کے درمیان سفر طے کیا تھا۔ اب پہاڑوں کی سرزمین سے نکلنے کے بعد انہیں محسوس ہوا کہ وہ ایک دوسری نوعیت کے حامل علاقے میں داخل ہو چکے تھے...... یہ شمال مغربی ساحل سمندر کے جنگل پر مشتمل علاقہ تھا۔

''2 نومبر 1805ء...... دریا کا پاٹ تقریباً ایک میل چوڑا تھا...... نشیبی میدان بھی زیادہ چوڑائی کے حامل تھے اور یہ میدان اور ان کے اطراف میں پھیلے ہوئے پہاڑ درختوں سے بھرے پڑے تھے۔ مناظر کی یہ تبدیلی آنکھوں کو بھلی لگتی تھی اور یہ ہمیں ایندھن فراہم کرنے میں بھی معاون ثابت ہو سکتی تھی۔''

آب و ہوا بھی بہت مختلف تھی۔ میدانوں کی گرمی یا سردی کی بجائے وہ اب ایک ایسے علاقے سے گزر رہے تھے جو گہری دھند کی لپیٹ

میں تھا اور جہاں پر شدید بارش ہوتی تھی۔ دھند کی وجہ سے جماعت کی کارکردگی متاثر ہوئی تھی اور ان کو دریائے ولامٹ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ قطعی طور پر ان کی نظروں سے اوجھل تھا۔ لیکن 7 تاریخ کو اگلی کشتی میں سوار لوگ خوشی سے بے حال ہو گئے جب ان کی پہلی نظر بحرالکاہل پر پڑی۔

بالآخر جب وہ کھاڑی تک جا پہنچے تو ان کی کشتیاں طوفان کی زد میں آ گئیں۔ بارش بھی زوروں پر تھی۔ وہ دریا کی شمالی جانب جا پہنچے۔

جنوبی کنارے پر قیام کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ لی وس نے پہلے شمالی جانب قیام کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن اس مقام پر گھنے جنگلات تھے اور شکار مفقود تھا اور محض خشک مچھلی پر گزارا کرنا تھا۔ لہٰذا یہ فیصلہ کیا گیا کہ دریا کو پار کیا جائے اور جنوبی کنارے کا رخ کیا جائے۔

قیام کیلئے جو جگہ منتخب کی گئی۔ وہ اب لی وس اور کلارک دریا کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ لی وس سمندر کے ساتھ نزدیکی روابط سے دور رہنے پر خوش تھا۔

24 دسمبر کو ان کی قیام گاہ مکمل ہو چکی تھی۔ اس قیام گاہ کا نام انہوں نے فورٹ کلاٹ سوپ رکھا تھا۔ یہ نام انڈین کے ایک مقامی قبیلے کے نام پر تھا۔

انہوں نے فورٹ کلاٹ سوپ میں جو موسم سرما گزارا وہ ایک برس پیشتر مینڈین دیہات میں گزارے گئے موسم سرما سے یکسر مختلف واقع ہوا تھا۔ چار ماہ تک وہ مسلسل بارشوں کی زد میں رہے تھے۔ ان حالات میں ان کے پاس کرنے کے لئے کوئی کام کاج نہ تھا۔ اس موسم کے دوران جماعت کے ہر ایک فرد نے کسی قدر وقت بیماری کی نذر کیا اور وہ فلو کا شکار رہے۔

لی وس اور کلارک نے فرصت کے یہ دن اپنے مشاہدات قلمبند کرنے میں گزارے۔ انہوں نے ابھی تک جو کچھ دیکھا تھا...... جو کچھ محسوس کیا تھا...... وہ سب کچھ وہ ضبط تحریر میں لاتے رہے۔ کلارک نے ایک بڑا نقشہ بنایا۔

دیگر تفصیلات ان انڈین نے فراہم کیں جو ان سے ملاقات کیلئے آئے تھے۔ یہ انڈین لکڑی سے بنائے گئے گھروں میں رہتے تھے۔ وہ کشتیاں تیار کرنے میں ماہر تھے۔ ان کا زیادہ تر گزارا مچھلی پر ہوتا تھا۔ یہ لوگ چور بھی واقع ہوئے تھے اور کوئی بھی چیز فروخت کرنے پر آمادہ رہتے تھے۔

> ''ایک بوڑھی عورت...... چینوک سردار کی بیوی...... چھ نوجوان عورتوں کے ہمراہ...... ان عورتوں میں اس کی بیٹیاں اور بھتیجیاں وغیرہ شامل تھیں...... جان بوجھ کر ہمارے قریب رہائش پذیر ہو گئی تاکہ ہمارے مردوں اور اس کی نوجوان عورتوں کے درمیان روابط استوار ہو سکیں''۔

مارچ 1806ء کو بارہ سنگھے جو کہ گوشت کے حصول کا واحد ذریعہ تھے...... پہاڑیوں کی جانب ہجرت کر رہے تھے...... لہٰذا لی وس نے یہ فیصلہ کیا کہ انہیں بھی جلد گھر کی راہ لینی چاہیے۔

دریا کا سفر چھ کشتیوں کے ساتھ شروع کیا گیا لیکن پچاس میل کا سفر طے کرنے کے بعد جب جماعت ڈیلس کے مقام پر پہنچی تب انہوں نے کشتیوں کی بجائے گھوڑوں پر سفر طے کرنا شروع کیا۔ اب جماعت نے خشکی کا سفر شروع کیا۔ یہ سفر انہوں نے دریا کی شمالی جانب طے کیا۔

29 اپریل کو انہوں نے کولمبیا کو عبور کیا۔ انہوں نے والا والا کے مقام پر اسے عبور کیا۔ وہ کچھ دیر تک کے لئے والا والا انڈین کے مہمان

رہے اور انہوں نے ان انڈین کو ان تمام انڈین سے زیادہ مہربان پایا جن سے وہ اب تک ملاقات کر چکے تھے۔

7 مئی تک پہاڑیاں ابھی تک برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ انڈین نے جماعت کو بتایا کہ برف کی تہہ اس قدر موٹی تھی کہ وہ یکم جون تک اپنے سفر کا آغاز نہیں کر سکتے تھے۔

جماعت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ان دونوں حصوں نے علیحدہ علیحدہ روٹ سے سفر کرتے ہوئے۔ ییلو اسٹون اور مسوری کے سنگھم پر ایک دوسرے سے ملنا تھا...... یہ مقام مینڈین دیہات سے تقریباً دو صد میل کے فاصلے پر مغرب کی سمت پر واقع تھا۔ 12 اگست کو دونوں جماعتیں آپس میں مل چکی تھیں۔

ییلو اسٹون کے بالائی پانیوں کی کلارک کی تحقیق و تفتیش انتہائی کامیاب رہی تھی اور اس نے اس کو تفصیل کے ساتھ بیان بھی کیا تھا۔

سینٹ لوئس کی جانب بقایا سفر انتہائی سرعت کے ساتھ طے کیا گیا اور اس دوران کوئی ناخوشگوار واقعہ بھی پیش نہ آیا۔ 23 ستمبر 1806ء کو وہ سینٹ لوئس پہنچ چکے تھے۔ وہ دو برس اور چار ماہ پیشتر اس مقام سے روانہ ہوئے تھے۔

سینٹ لوئس کے مقام پر جماعت بکھر گئی لیکن جان کولٹر جس نے کلارک کی ہمراہی اختیار کی تھی اس نے دریا کی جانب واپس پلٹنا تھا تاکہ ییلو اسٹون پارک کے ذریعے اپنے مشہور سفر کی تکمیل سرانجام دے سکے۔ لی وس اور کلارک واشنگٹن کی جانب روانہ ہوئے تاکہ حکام کو اپنی رپورٹ پیش کر سکیں لیکن وہ فروری 1807ء تک دارالحکومت پہنچنے سے قاصر رہے۔

اگرچہ لی وس اور کلارک کی مہم ایک عام مہم دکھائی دیتی تھی اور یہ ایک ایسی حیران کن مہم نہ تھی جس کی توقع انڈین علاقوں کی مہم سرانجام دینے والی جماعت سے کی جا سکتی تھی لیکن اس مہم کے نتائج اہم ترین تھے اور دوررس نتائج کے حامل بھی تھے۔ اب امریکی حکام کے پاس شمال مغربی وسیع تر علاقے کے بارے میں معلومات دستیاب تھیں...... وہ معلومات جو پراسراریت کی چادر تلے چھپی ہوئی تھیں۔

مسوری اور کولمبیا وادیوں کی تحقیق و تفتیش سرانجام دی جا چکی تھی۔ شمال مغرب کی جانب ایک نیا روٹ اب منظر عام پر آ چکا تھا اور امریکہ کی فر (سمور) کی تجارت وسعت اختیار کر چکی تھی۔ بہت سے انڈین قبائل کا مقام سکونت...... ان کے طور طریقے اور رسم و رواج کی وضاحت سرانجام دی گئی تھی۔

اس کامیاب مہم کے انعام کے طور پر کیپٹن کلارک کو لوسیانہ ملیشیا کا جنرل بنا دیا گیا تھا۔ 1813ء میں اسے مسوری کا گورنر بنا دیا گیا۔ وہ انڈین امور کے سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر بھی فائز رہا۔

ستمبر 1838ء میں وہ موت سے ہمکنار ہو گیا تھا۔

لی وس کا خاتمہ ایک المیے پر ہوا تھا۔ اسے لوسیانہ کا گورنر مقرر کیا گیا تھا اور اس نے سینٹ لوئس میں رہائش اختیار کی تھی۔ 1809ء میں جبکہ وہ واشنگٹن کے سفر پر روانہ ہوا تھا اس دوران اس کی زندگی اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس نے خودکشی کی تھی یا اسے ہلاک کیا گیا تھا۔

موسیو وڈوک کی زندگی کے مختلف روپ

موسیو فران کوئس ایوجن وڈوک کی زندگی کے مختلف روپ تھے...... دھوکے باز...... دغا باز...... چور...... پولیس مخبر...... مجرموں کی بازیابی میں مہارت کا حامل...... پیرس کا اسکاٹ لینڈ یارڈ

وہ بیکری کے ایک مالک کا بیٹا تھا۔ اس نے 1777ء میں اراس میں جنم لیا تھا۔ 14 برس کی عمر میں اس نے فوج میں شمولیت اختیار کر لی لیکن اس کے مزاج کی تندی اور تیزی نے جلد ہی اس کے لئے مصائب کھڑے کر دیے۔ للی کے مقام پر وہ دھوکا دہی کا مرتکب ٹھہرا۔ اس پر مقدمہ چلایا گیا اور آٹھ برس قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔

اس نے دو مرتبہ جیل سے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن دونوں مرتبہ وہ دوبارہ گرفتار ہوا اور دوبارہ جیل میں بند کر دیا گیا۔ جیل سے اس کا تیسرا فرار ایک کامیاب فرار ثابت ہوا۔ فرار ہونے کے بعد وہ پیرس پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جہاں پر وہ زیرزمین چلا گیا۔

وہ ہر قسم کے مجرموں کی رفاقت میں رہا۔ کئی ایک مجرموں کے ساتھ اس کے قریبی تعلقات بھی استوار ہوئے۔ وہ ان کے ہمراہ مختلف وارداتوں میں بھی شریک ہوا اور اس نے وارداتیں سرانجام دینے کے مختلف طریقے اور تدابیر بھی بخوبی سیکھ لیں۔ اس کے ساتھی مجرم اسے جرائم کی مختلف داستانیں سناتے تھے لہٰذا وہ ہر اقسام کے جرم کا ایک چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا بن چکا تھا اگرچہ اس وقت اس کی عمر محض 20 برس تھی۔

32 برس کی عمر میں اس نے پولیس سے رابطہ کیا اور ان کے ساتھ سودے بازی کی۔ پولیس کو یہ پیش کش کی کہ اگر اس کے ساتھ معافی کا وعدہ کیا جائے تو وہ پولیس کا مخبر بننے کو تیار تھا۔ مزیدار بات یہ تھی کہ وہ دوبارہ پولیس کے ہتھے چڑھ چکا تھا اور اس کو زبردستی پولیس کا مخبر بننے پر مجبور کیا گیا تھا اور اس کے ساتھ یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ اسے نیک چال چلن کے مظاہرے اور ضمانت پر معافی سے نوازا جائے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وڈوک ایک انتہائی کامیاب پولیس مخبر ثابت ہوا۔ اس وقت تک جرائم کی دنیا کے بارے میں وہ اس قدر علم حاصل کر چکا تھا کہ اس کے لئے پولیس کو سیدھی راہ پر ڈالنا قطعاً مشکل نہ تھا۔ اس کی ہر مخبری نتیجہ خیز ثابت ہوتی تھی اور پولیس کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار ہوتی تھی۔ لیکن اس کام میں بھی اس کی دھوکہ دہی شامل تھی۔ وہ بذات خود جرائم کی منصوبہ بندی سرانجام دیتا اور ان منصوبوں کو جرائم کی دنیا کے اپنے زیرزمین ساتھیوں تک پہنچاتا اور انہیں ان منصوبوں پر عمل کرنے کی تحریک و ترغیب دلاتا اور مابعد پولیس کو مخبری کر دیتا۔

چونکہ وڈوک کا کام دھوکہ دہی پر بنیاد کرتا تھا لہٰذا وہ تادیر چل نہ سکا اور بالآخر بطور پولیس مخبر اس کو اپنے اس عہدے سے دستبردار ہونا پڑا اور اس کی زندگی کا یہ دور اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔

اس کی زندگی کا اگلا دور اس کی حقیقی کوشش کا دور تھا جو اس نے اپنے آپ کو سدھارنے اور سیدھی راہ پر چلانے ضمن میں سرانجام دی۔ اس کی والدہ نے اس کی معاونت سرانجام دی اور اس کو کاروبار شروع کروا دیا۔ اس نے کاغذ کی تیاری کے کاروبار کو اپنانا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے یہ

منصوبہ بھی بتایا کہ وہ اپنے مجرم ساتھیوں کو بھی راہ راست پر لانے کی کوشش سرانجام دے گا۔ لیکن دوسری جانب لاتعداد مجرم جن کے بارے میں اس نے پولیس کو مخبری کی تھی اس کے خون کے پیاسے تھے۔ لہٰذا وہ پُرسکون انداز میں کاروبار نہ کرسکا اور کاروبار پر وہ توجہ مرکوز نہ کرسکا جو توجہ کاروبار درکار رکھتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا کاروبار ناکامی کا شکار ہو کر رہ گیا۔

وڈوک نے ایک مرتبہ پھر یہ ارادہ کیا کہ وہ جرائم کی دنیا کے بارے میں اپنے علم کو کیش کروائے۔ اسے مجرمانہ امور کے بارے میں وسیع تر تجربہ اور علم حاصل تھا۔ اس مرتبہ اس کے پاس ایک معقول تجویز تھی اور وہ اپنی اس تجویز کو حکام کے سامنے غوروخوص کے لئے پیش کرسکتا تھا۔ اس کی اس تجویز میں ایک ایسے مرکزی بیورو کا قیام شامل تھا جو خصوصی تحقیق و تفتیش سرانجام دینے کا اہل ہو...... ایک ایسا بیورو جس کے پاس جانے پہنچانے مجرموں کی ایک مکمل فہرست موجود ہو۔ وڈوک سے بہتر کون شخص ہو سکتا تھا جو ایسی فہرست تیار کرے؟ وہ مجرموں کی زیرزمین دنیا کا ایک فرد رہ چکا تھا اور اس دنیا کے بارے میں مکمل معلومات رکھتا تھا۔ وہ نہ صرف بہت سے مجرموں کے ناموں سے آگاہ تھا بلکہ ان کے ٹھکانوں سے بھی آگاہ تھا۔ اس کے علاوہ وہ ان کے طریقہ واردات سے بھی بخوبی آگاہ تھا۔ وہ کسی بھی نئے جرم کی تفصیلات کا مطالعہ کرنے کے بعد فوراً یہ انکشاف کرسکتا تھا کہ یہ جرم کس نے سرانجام دیا تھا اور پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ:۔

"یہ جرم فلاں فلاں مجرم نے سرانجام دیا ہے۔"

اور بطور پولیس مخبر بھی وہ اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکا تھا۔ اس کی مخبری بار بار درست ثابت ہو چکی تھی۔ آج کل ہر ایک سراغ رساں مجرموں کے حالات زندگی کا مطالعہ کرتا ہے لیکن وڈوک اس میدان کا جدامجد تھا۔ مجرموں کی تحقیق و تفتیش کا کام سائنسی بنیادوں پر استوار نہیں کیا گیا تھا اور یہ بھی محسوس نہیں کیا گیا تھا کہ ہر ایک مجرم اپنی طرز پر مجرمانہ سرگرمیاں سرانجام دینے کا عادی ہوتا ہے۔

اس مرتبہ پھر انہونی بات ہوئی تھی...... ایک مرتبہ پھر وڈوک پولیس سروس میں شامل ہو چکا تھا...... اس مرتبہ اس کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ اپنا تجویز کردہ محکمہ استوار کرے۔

اس نے حقیقی جوش' جذبے اور ولولے کے ساتھ اپنے آپ کو اس کام میں لگا دیا۔ اس کو یہ اختیار بھی دیا گیا تھا کہ وہ اپنی معاونت کے لئے اپنے ساتھیوں کا انتخاب کرسکتا تھا۔ اگر وہ مجرموں کو پیرول پر رہا کرواتے ہوئے انہیں اپنی معاونت کیلئے بھرتی کرے گا تو ان کے کنٹرول کی تمام تر ذمہ داری اس پر عائد ہوگی۔

وڈوک کو یہ ذمہ داری سونپنے کے ضمن میں کچھ اہلکار مخالفانہ رویے کے حامل تھے وہ وڈوک کو اس اہم ذمہ داری کے قابل نہ سمجھتے تھے۔ لیکن ایم۔ ہینری...... پیرس پولیس کے فوجداری محکمے کا سربراہ وڈوک کے حق میں تھا۔ وڈوک کے بھرتی کردہ ایجنٹوں کو بھی نتائج کے اعتبار سے ادائیگی کی جاتی تھی...... ہر ایک گرفتاری کے عوض فیس کی ادائیگی۔ اس کے علاوہ انہیں رہائش اور محدود الاؤنس بھی ادا کیا جاتا تھا۔

وڈوک نے منظم انداز میں اپنے کام کا آغاز کیا۔ اس نے مابعد قسم کھاتے ہوئے یہ انکشاف کیا کہ اس نے جان بوجھ کر ان افراد کی بھرتی کی تھی جو انتہائی مجرمانہ ریکارڈ کے حامل تھے اور اکثر ان کے ذمے ایسے کام لگائے تھے جن کی انجام دہی میں کافی زیادہ رقم بھی ملوث ہوتی تھی۔

"لیکن کسی بھی فرد نے...... کسی بھی فرد واحد نے...... میرے اعتماد کو دھوکا نہ دیا تھا۔"

مزید برآں نیا محکمہ کامیابی سے ہمکنار ہوا تھا۔ ایک رات وڈوک نے 31 مطلوب ملزمان کو گرفتار کیا اور ان کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا۔

ایک مرتبہ وہ بذات خود ایک چور کے گھر چلا آیا تھا تاکہ بہ نفس نفیس اسے گرفتار کر سکے۔ اس کی آمد سے اس شخص کی بیوی چونک اٹھی اور اس صدمے کی بنا پر اس کے ہاں قبل از وقت بچے کی پیدائش کا عمل شروع ہو گیا۔ اس سلسلے میں یہ داستان گردش کرتی رہی تھی کہ وڈوک نے فوراً اپنی آستینیں اوپر چڑھائیں اور مڈوائف کے فرائض سرانجام دینے لگا تاکہ بچے کی پیدائش عمل میں آ سکے۔ اس کے بعد اس نے بچے کو نہلایا اور بچے کی ماں جب پُرسکون حالت میں لوٹ آئی تب اس نے اپنے سرکاری فرائض کی سرانجام دہی کی جانب توجہ کی اور اس عورت کے خاوند کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچایا۔ لیکن اس نے اس معاملے سے ہاتھ نہ کھینچا۔ اس نے یہ وعدہ کیا کہ وہ اس بچے کا منہ بولا باپ ثابت ہوگا۔ جب بچے کو عیسائی بنانے کا وقت قریب آیا تب وڈوک نے اپنی ضمانت پر اس بچے کے باپ کو عارضی رہائی دلائی تاکہ وہ بھی اس تقریب میں شرکت کر سکے۔ اس کے بعد اس نے اس تقریب کے مہمانوں کی خاطر تواضع اپنی جیب سے کی۔ اس طرح یہ تقریب اپنے اختتام کو پہنچی۔ اس بچے کے باپ پر مقدمہ چلا اور اسے پانچ برس کی سزائے قید سنائی گئی۔ اس ملازمت کے دوران وڈوک کے بارے میں بہت سی داستانیں مشہور ہوئی تھیں۔ پولیس کے محکمے میں اپنی اس دوسری ملازمت کے دوران اس نے غیر معمولی جدوجہد سرانجام دی۔ اس کی یہ ملازمت اگرچہ تادیر چلتی رہی لیکن بالآخر یہ بھی اپنے اختتام کو پہنچ گئی اور اس کو ایک مرتبہ پھر اپنے وسائل کا سہارا لینا پڑا۔

لیکن وڈوک زیادہ عرصے تک فارغ نہ رہا۔ اس کے ذہن میں ایک اور خوبصورت تجویز آئی...... اس نے ایک ''پرائیویٹ تفتیشی ایجنٹ'' کے طور پر کام شروع کر دیا۔ اس نے جرائم پر حساس کہانیاں بھی تحریر کیں اور ان کی اشاعت کا بندوبست بھی کیا۔ بے شک یہ کہانیاں اس کے اپنے تجربات پر مبنی تھیں یا ان داستانوں پر بنیاد کرتی تھی جو ان مجرموں نے اسے سنائی تھیں جن سے وہ باہم روابط ہوا تھا۔

اس نے ''پرائیویٹ تفتیش ایجنٹ'' کے طور پر ان تھک محنت کی...... بے انتہا توجہ بخشی۔ اس نے تفتیش سرانجام دینے کے سائنسی طریقہ جات متعارف کروائے...... انگلیوں کے انشانات کی نوعیت کا مطالعہ سرانجام دیا۔ وہ اپنی مہارت کے بل بوتے پر جلد ہی مجرموں کا سراغ لگا لیتا تھا۔

ایک مرتبہ ایک بینکر ڈاکہ زنی کا شکار ہوا۔ وہ بینکر ایک پولیس افسر کا بھائی تھا۔ اس پولیس افسر کا نام ڈی لیسرٹ تھا۔ پولیس ڈکیتی کی اس واردات کا سراغ لگانے میں ناکام رہی۔ لہٰذا پولیس افسر نے یہ سوچا کہ اسے وڈوک کی خدمات حاصل کرنی چاہئیں۔ لہٰذا اس نے فرضی نام کے ساتھ وڈوک کو ایک خط تحریر کیا اور اس میں فرضی پتہ بھی تحریر کر دیا۔ وڈوک نے محتاط انداز میں خط کا مطالعہ سرانجام دیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ خط تحریر کرنے والے نے فرضی نام استعمال کیا تھا۔ لہٰذا کوئی دوسرا کام سرانجام دینے سے بیشتر اس نے خط کی تحقیق و تفتیش کا کام سرانجام دینا شروع کر دیا۔ جلد ہی اس پولیس افسر کی حیرانگی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اسے وڈوک کی جانب سے اپنے خط کا جواب موصول ہوا جو کہ اس کے اصلی نام تھا اور اس کے دفتر میں اسے موصول ہوا تھا۔ ڈی لیسرٹ یہ جان کر از حد حیران ہوا کہ اس نے اپنی شناخت کو چھپانے کی جو کوشش سرانجام دی تھی وڈوک نے کتنی آسانی کے ساتھ اس کا بھید کھول کر رکھ دیا تھا۔ لیکن اس کا بینکر بھائی از حد خوش ہوا کیونکہ وڈوک کے خط میں نہ صرف ڈاکوؤں کے نام تحریر تھے بلکہ یہ تجویز بھی پیش کی گئی تھی ان سے مسروقہ رقم کس طرح برآمد کروائی جا سکتی تھی۔

اس کامیابی اور دیگر کامیابیوں نے وڈوک کی شہرت کو چار چاند لگا دیے۔ وہ بالزک کا دوست بن گیا۔ اس کو وہ ایک کے بعد دوسری داستان سے نوازتا رہا جو مجرموں اوران کے طریقہ واردات سے متعلق ہوتی تھیں۔ بالزک اپنے گھر میں اس کا پرتپاک خیر مقدم کرتا تھا اوراس سے کچھ اس طرح سوال جواب کرتا تھا کہ ان سوال جواب کی بنا پر وہ ایک کہانی تخلیق کرنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ ان سوال جواب کی بدولت وہ اس سے بہت کچھ اگلوالیتا تھا۔ وہ مشہور اور معروف مصنف وڈوک کو مجبور کرتا کہ اسے معمولی سے معمولی تفصیل سے بھی آگاہ کیا جائے۔ وڈوک جس وقت 70 برس کی عمر کا حامل تھا اس وقت بھی وہ اس دور کی دنیا میں اپنے لئے مقام حاصل کرنے میں ناکام نہ رہا۔ اس کے ذہن میں کئی ایک منصوبے ہنوز مچل رہے تھے۔ ان میں سے ایک منصوبہ اس کی سوانح حیات کی اشاعت کا منصوبہ تھا۔ اس سوانح حیات کی چھ جلدیں تھیں۔ درحقیقت وہ اپنی پرائیویٹ تحقیق وتفتیش کے دفتر کی ایک شاخ لندن میں کھولنا چاہتا تھا اور وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس شاخ کے کھلنے سے پیشتر اس کی شہرت انگلستان کے دارالحکومت جا پہنچے۔

اس کا فوری منصوبہ ایک نمائش کا اہتمام تھا۔ یہ ایک عجیب وغریب اور انوکھی نمائش تھی اور اس جیسی نمائش اس سے پیشتر منظر عام پر نہیں آئی تھی۔ اس مقصد کے لئے اس نے ریجنٹ سٹریٹ کی عمارت کا ایک حصہ کرایے پر حاصل کیا۔

وہ ایک سراغ رساں سے ایک نمائش کنندہ بن چکا تھا۔ اس نے فرانس سے کئی ایک نمائشی اشیاء بذریعہ بحری جہاز منگوائیں اور ماہ جون کے آغاز میں اس نے نمائش کے افتتاح کا اہتمام کرلیا۔ کچھ عرصہ پیشتر سے وہ اٹلی...... فرانس اور دیگر ممالک سے مختلف پینٹنگ جات جمع کرر ہا تھا۔

اس نمائش میں جرائم اور مجرموں کی کئی ایک یادگاریں پیش کی گئیں۔ اس نمائش میں مختلف ہتھیار...... ہتھکڑیاں ......اور تشدد کے آلات بھی نمائش کے لئے پیش کئے گئے تھے۔

ان نمائشوں اور ان سے ملتی جلتی نمائشوں کے ساتھ ساتھ اس نے گرم خطوں کے نقلی پھلوں کی نمائش کا بھی اہتمام کیا۔

اس کی نمائش یقیناً کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور دو ماہ تک جاری رہی۔ لوگ اس کی نمائش کو دیکھنے کے لئے کھنچے چلے آتے تھے اور بخوشی پانچ سینٹ داخلہ فیس ادا کرتے تھے۔ وڈوک نے بذات خود بھی عوامی روابط استوار کرر کھے تھے۔ وہ اخبار نویسوں کو ایک علیحدہ کمرے میں مدعو کرتا جہاں پر ان کی تواضع مشروب سے کرتا۔ وہ یہاں پر اپنی موجودگی کے ایک ایک لمحے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

فرانس واپس پہنچنے کے بعد وڈوک اپنے کام میں مصروف رہا۔ اس کے کچھ کارناموں کی بدولت پولیس اس کے خلاف بھی ہوگئی لیکن اس نے اس امر کی قطعاً پرواہ نہ کی۔ لوگ حیران ہوتے تھے کہ وہ اس عمر میں بھی روبہ عمل تھا۔ اس کے جواب میں وہ لوگوں سے کہتا کہ:

''میں ایک سو برس کی عمر تک بھی اسی طرح روبہ عمل رہوں گا۔''

ایسا دکھائی دیتا تھا کہ اس کی پیشن گوئی پوری ہو کر رہے گی۔ لیکن بالآخر اس کی پیشن گوئی غلط ثابت ہوئی کیونکہ 82 برس کی عمر میں وہ موت سے ہمکنار ہوگیا۔

......❁......

اسکوائر واٹرٹن جنوبی امریکہ میں

وہ ایک بے خوف مہم جُو تھا اور کہنہ مشق سیاح بھی تھا۔

اس نے 1782ء میں جنم لیا تھا اور وہ والٹن ہال کا 27 واں لارڈ تھا۔ یہ ایک ایسا عہدہ تھا جس کے ساتھ کوئی خطاب وابستہ نہ تھا۔ وہ زندگی بھر اسکوائر کے نام سے جانا جاتا رہا۔ اس کا تعلق ایک قدیم اور قابل احترام خاندان سے تھا۔ اس کے بزرگ اور آباؤ اجداد یورپ کے شاہی گھرانوں سے متعلق تھے۔ ان میں سے ایک کا حوالہ شیکسپیئر نے اپنے ڈرامے رچرڈ II میں بھی پیش کیا تھا۔ اصلاحات کے بعد واٹرٹن نے نئے مذہب کو اختیار کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ رومن کیتھولک ہی رہا اور اپنی اس حیثیت میں اسے کافی زیادہ جائیداد سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ اس کے علاوہ وہ کئی ایک قانونی پیچیدگیوں کا بھی شکار رہا 18 ویں صدی میں کیتھولک افراد کو دوگنا مالیہ ادا کرنا پڑتا تھا (لینڈ ٹیکس) اور چرچ میں حاضری نہ دینے کی پاداش میں ماہانہ بیس پونڈ بھی ادا کرنے ہوتے تھے۔ ان کی پارلیمنٹ میں شمولیت پر بھی پابندی تھی اور وہ جسٹس آف پیس بھی نہ بن سکتے تھے۔ ایک کیتھولک انگلش یونیورسٹی میں بھی نہیں جا سکتا تھا۔

اسکوائر نے واضح طور پر یہ اعلان کیا تھا کہ:۔

''میں سینٹ ایڈورڈ...... بیڈ......اور کینٹر بری کے سینٹ تھامس کے ساتھ جہنم میں جانا تو پسند کر سکتا ہوں مگر ہینری VIII......ملکہ بیس......اور ڈچ ولیم کے ہمراہ جنت میں جانا کبھی گوارا نہیں کروں گا۔''

تاہم اسکوائر واٹرٹن اصلاحات کی لڑائیاں دوبارہ شروع نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ اس نے زیادہ دلچسپ کام اپنے کرنے کیلئے ڈھونڈ لیا تھا۔ اس کے والدین نے اسے بیرون ملک روانہ کر دیا تھا تاکہ وہ کسی بھی قسم کے ناگوار حالات سے محفوظ رہ سکے۔ وہ اسپین چلا آیا تھا اور مابعد گھانا چلا آیا تاکہ وہاں پر کاشت کاری پر توجہ دے سکے۔ اس نے اس ملک کی نباتات میں زیادہ دلچسپی لی بجائے اس کے کہ اپنی اجناس کی کاشت میں دلچسپی لیتا جس پر نیگرو غلام اپنا پسینہ بہا رہے تھے اور کافی......چینی......اور کپاس کی فصلیں تیار کر رہے تھے۔

کم از کم اس نے اس زندگی میں ہرگز قدم نہ رکھے جس زندگی میں کاشتکاری سرانجام دینے کے نظریے کے تحت آنے والے اکثر نوجوان بخوشی قدم رکھتے تھے۔ وہ عورتوں کے چکر میں پڑنے سے بھی محفوظ رہا بلکہ وہ ننگے پاؤں اور ننگے سر گھانا کے ملیریا سے بھرپور جنگلوں میں پرندوں کا علم جاننے اور نمونہ جات کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔

1805ء میں اس کا باپ وفات پا گیا۔ وہ اس کی آخری رسومات میں شرکت کیلئے انگلستان چلا آیا لیکن جلد ہی گھانا واپس آ گیا جہاں پر چند برسوں تک اس نے اپنے وقت کی تقسیم کچھ اس انداز سے کی کہ کچھ وقت وہ خاندانی کاشت کاری پر صرف کرتا تھا اور کچھ وقت اس گرم خطے کی

حیوانی زندگی کی تحقیق و تفتیش میں صرف کرتا تھا۔

نو آبادی کے حکام بالا کے ساتھ اس کے تعلقات کبھی بھی بہترین نوعیت کے حامل نہ رہے تھے۔ اسکوائر کسی بھی حکام بالا کو خاطر میں نہ لاتا تھا بالخصوص پروٹسٹنٹ مسلک کے حامل حکام بالا کو وہ بالخصوص کبھی خاطر میں نہ لاتا تھا اور نو آبادی کے قانون کی حمائت سے محروم لوگوں کی حمایت پر آمادہ رہتا تھا۔ 1812ء میں گورنر نے اسے یہ اجازت فراہم کی کہ وہ اندرون گھانا کی تحقیق و تفتیش سرانجام دے سکتا تھا جس کے بارے میں ابھی کچھ بھی معلوم نہ تھا۔

اسکوائر کا مقصد کریئر کی تلاش تھا۔ یہ ایک انتہائی طاقتور زہر تھا جو گھانا کے ماکوسی انڈین تیار کرتے تھے۔ وہ اس زہر میں اپنے تیر ڈبوتے تھے اور ان تیروں کو دشمن کی خلاف استعمال کرتے تھے۔

اسکوائر کو یہ زہر سائنسی تحقیقات سرانجام دینے کے لئے درکار تھی۔ وہ اس امر سے واقف نہ تھا کہ یہ زہر میڈیکل سائنس کی ایک اہم ترین دوا بن جائے گی۔ تاہم اس کی کئی ایک خصوصیات سے اس وقت بھی آشنائی حاصل تھی۔

لیکن اسکوائر واٹرٹن کے دور میں یہ محض ایک خطرناک زہر کی حیثیت کی حامل تھا اور اس کے بد اثرات قابل ذکر نوعیت کے حامل تھے اور اسکوائر واٹرٹن کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ اس زہر کا تریاق دریافت کرے۔ اس کے تصور میں بھی یہ بات نہ تھی کہ یہ زہر بذات خود ادویات کے میدان میں ایک اہم معاون ثابت ہوگی۔

اسکوائر واٹرٹن جس ساز و سامان کے ساتھ نامعلوم اور خطرناک جنگلات میں عازم سفر ہوا' آج کل کے جدید معیار کے لحاظ سے اس ساز و سامان کو دیکھ کر ہنسی آتی تھی۔ وہ اپنا زیادہ تر سفر پانی میں طے کرنے کا متمنی تھا۔ لہٰذا اس نے ایک کشتی لی اور کئی ایک انڈین اس کشتی کو چلانے کے لئے اپنے ہمراہ لئے۔ اس کے کپڑے ایک ہیٹ......ہلکی پتلونوں کا ایک جوڑا......ایک واسکٹ اور ایک شرٹ پر مشتمل تھے۔ اس نے بوٹ اور جرابیں بھی اپنے ہمراہ رکھ لیں اگرچہ اس نے کبھی کبھار ہی بوٹ پہننے کی زحمت گوارا کی تھی۔ حتیٰ کہ جنگل میں بھی وہ ننگے پاؤں چلنے کو ترجیح دیتا تھا۔

اس نے اپنے آرام اور تحفظ کا کبھی خیال نہ کیا تھا لہٰذا اس نے موسم برسات میں سفر کے آغاز کا پروگرام بنایا جبکہ تمام ملک دلدل کا شکار تھا۔ اس نے ایک شاٹ گن اور کچھ اسلحہ بھی اپنے ہمراہ لے لیا اور اس کا کچھ ساز و سامان اس نوعیت کا حامل تھا جس کے تحت وہ پرندوں اور حیوانوں کے نمونے محفوظ کر سکتا تھا اور انہیں دیگر مقامات پر منتقل کر سکتا تھا۔ اسکوائر اپنا ڈاکٹر آپ تھا۔

اپریل 1812ء میں وہ جارج ٹاؤن سے روانہ ہوا اور سفر طے کرتا ہوا طغیانی کی لپیٹ میں آئے ہوئے دریائے ڈیمی رارا تک جا پہنچا۔ اس نے شدید بارش کے دوران یہ سفر طے کیا حتیٰ کہ اسے ڈیمی رارا آبشاروں پر رکنا پڑا۔ یہاں پر اس نے کچھ کریئر نامی زہر ایک انڈین سے خریدا۔ اس نے اس زہر کی تصدیق کرنا چاہی کہ واقعی یہ خالص زہر تھا یا اسے بے وقوف بنایا گیا تھا۔ حصول مقصد کی خاطر اس نے ایک تیر اس زہر میں ڈبویا اور کتے کو نشانہ بنایا۔ یہ کتا اس نے اسی مقصد کیلئے خریدا تھا۔ اس نے دیکھا کہ کتا ہلاک ہو چکا تھا۔

وہ اس تجربے سے مطمئن ہو چکا تھا اور اس کی تلاش جاری رکھی۔ اس نے دریائے ڈیمی رارا سے آگے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ اس کے بعد وہ

ننگے پاؤں گھنے جنگل ورگرم اور دلالی علاقے سے گزرتا ہوا برازیل کی سرحد پر جا پہنچا۔اس مقام پر اس نے مزید مطلوبہ زہر خریدا۔اس نے اس زہر کو محفوظ کرلیا تاکہ اس کو تہذیب کی حامل دنیا کو روانہ کر سکے۔اس نے دیکھا کہ انڈین مختلف نباتات سے اس زہر کو اکٹھا کرتے اور تیار کرتے تھے۔

اس نے برازیل کی سرحد کی جانب اپنا سفر جاری رکھا۔جلد ہی وہ ملیریا کی زد میں آ گیا۔بیماری کا حملہ شدید تھا۔اس کی حالت بگڑ چکی تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ اپنی ڈاکٹری آزماتے ہوئے اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیتا کہ پرتگالی سرحد کے ایک کمانڈر نے اس کی معاونت سرانجام دی۔اسے بستر پر لٹایا۔اور اسے مناسب ادویات کھلائیں۔

ایک ہفتے کے آرام......مناسب ادویات......اور مناسب خوراک کی بدولت وہ اس قابل ہو گیا کہ واپسی کا سفر طے کر سکے۔اس نے واپسی کے سفر کیلئے ایک خطرناک راستے کا انتخاب کیا۔یہ راستہ بارشوں کے بعد سیلاب کی زد میں تھا۔

اگر چہ وہ ملیریا کے حملے کے بعد کمزوری کا شکار ہو چکا تھا لیکن اسکوائر نے ہمت نہ ہاری اور اپنا سفر جاری رکھا۔لیکن اس کی بدقسمتی تھی کہ ملیریا اس پر پہلے سے بھی شدت کے ساتھ حملہ آور ہوا۔وہ بیمار تھا......تھکا ماندہ تھا......بخار کی حالت میں تھا......اس نے ایک انڈین کی جھونپڑی میں پناہ حاصل کرنے کی درخواست کی۔اس انڈین نے اس پر رحم کرتے ہوئے اسے پناہ دے دی اور اس کا علاج معالجہ بھی سرانجام دیا۔

جارج ٹاؤن کی جانب اس کی واپسی ایک لحاظ سے اس کی فتح کے مترادف تھی۔اس نے گھانا کے اس حصے کی تحقیق وتفتیش سرانجام دی تھی جس کے بارے میں قطعاً آشنائی حاصل نہ تھی۔اس کے اس سفر نے اسے نئی برطانوی نوآبادی کے بارے میں گراں قدر معلومات فراہم کی تھیں۔

جب اس کی عمر 40 برس تھی اس وقت واٹرٹن نے ایک سترہ برس کی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔اس لڑکی کا نام این ایڈمن اسٹون تھا۔یہ شادی 11 مئی 1829ء کو صبح 4 بجے قرار پائی تھی۔ایک برس بعد این موت سے ہمکنار ہوگئی۔وہ ایک بچے کے جنم دینے کے فوراً بعد موت کی آغوش میں جا پہنچی تھی۔اس کے مرنے کے بعد واٹرٹن نے یہ قسم کھائی کہ وہ دوبارہ کبھی بستر پر نہ سوئے گا۔ لہٰذا اپنی زندگی کے بقایا ایام کے دوران وہ فرش پر ہی سوتا رہا۔

اس کی زندگی کا آخری دور صحیح معنوں میں ایک تارک الدنیا کا دور تھا......ایک راہبانہ دور تھا۔اس کا یہ معمول تھا کہ وہ رات نو بجے سو جاتا تھا اور صبح تین بجے بیدار ہو جاتا تھا۔سفر کے بارے میں اس کی کتابوں نے اسے شہرت بخشی تھی اگر چہ اس کے سفر کی کچھ روئیداد ایسی بھی تھی جس پر بمشکل یقین کیا جا سکتا تھا۔

وہ 83 برس کی عمر تک زندہ رہا۔اس کی توانائی اور صحت آخر دم تک برقرار رہی تھی۔اس نے 1865ء میں وفات پائی تھی۔

الزبتھ فرائی نیو گیٹ میں

1812-13ء کا موسم سرما شدید تر تھا۔ یہ ماہ جنوری تھا۔ اس ماہ کے ایک روز مسز الزبتھ فرائی نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے آسمان پر نگاہ دوڑائی اور اس کے دل میں یہ خواہش مچلنے لگی کہ کاش آج برف باری ہو۔ اس کے بہترین پالش شدہ فرنیچر سے آگ کے شعلے کا چمکدار عکس نمایاں تھا۔ اس نے کوئیکر لباس زیب تن کر رکھا تھا جو کہ اگرچہ سادہ تھا مگر خوبصورت بھی تھا۔ (کوئیکر...... انجمن احباب کا رکن جس کو جارج فاکس نے قائم کیا تھا۔ اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ امن وامان کی تبلیغ کی جائے اور زبان اور لباس کی سادگی پر زور دیا جائے)۔ یہ لباس نرم ترین اور گرم ترین اون سے بنایا گیا تھا۔ بالائی کمرے سے شور شرابے کی آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے آٹھ عدد بچے کسی تکلیف کا شکار نہ تھے بلکہ محض بدنظمی کا شکار تھے۔ لیکن مسز فرائی کی یہ خواہش تھی کہ اس قدر شدید سردی نہیں پڑنی چاہیے کیونکہ جب بھی وہ آسمان کی جانب نگاہ اٹھاتی تھی تو اس کی سوچیں اسے اس کے بچپن کی جانب لے جاتی تھیں جبکہ وہ نارفولک کے ایک گھر کی مکین تھی اور ملک کے درجنوں غریب بچے کس طرح کپڑوں کے نام پر محض چیتھڑے پہنے سردی سے کپکپاتے نظر آتے تھے۔

یہاں لندن میں بھی چیتھڑوں میں ملبوس بچے ہر جگہ نظر آتے تھے لیکن اس کے بچے تھے...... اس کے ارل ہام بچے...... وہ ہمیشہ سوچتی تھی کہ وہ ان سب بچوں کو ان کے نام سے جانتی تھی اور ان کے والدین کو بھی جانتی تھی۔

کوئیکر احباب کبھی کبھار اس کے ساتھ غربت کے مسائل پر بات چیت کرتے تھے یا پھر جرائم کے مسائل کو زیر بحث لاتے تھے لیکن اس کو ان امور سے کچھ زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ سالہا سال سے اسے یہ یقین تھا کہ ایک روز اسے خدا کی خدمت کیلئے پکارا جائے گا اور وہ یہ خدمت کسی نہ کسی لحاظ سے خدا کے بندوں کی خدمت کی وساطت سے سرانجام دے گی۔ لیکن جبکہ وہ اوائل جوانی میں تھی اسے کسی بھی چیز نے اتنا متاثر نہ کیا تھا جتنا متاثر اسے ارل ہام کے ان غربت کے مارے بچوں نے متاثر کیا تھا جو اس کے ہمسائے تھے۔ جرائم اور غربت کے بڑے مسائل ایسے محنتی اور اثر و رسوخ کے حامل افراد درکار رکھتے تھے جیسے فرانسیسی۔ امریکن کوئیکر اسٹفن گریلٹ جو لندن کے دورے پر تھا اور چند روز پیشتر اس کے اپنے گھر میں بھی مدعو تھا۔ وہ محض اس غرض سے لندن آیا تھا کہ جرائم کی تحقیق و تفتیش سرانجام دے سکے اور جب اس کی ملاقات اسٹفن گریلٹ سے ہوئی اس وقت وہ جیب تراشوں...... طوائفوں اور چھوٹے موٹے جرائم سرانجام دینے والوں سے ایک میٹنگ کر چکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ درست کہہ رہا تھا کہ ان لوگوں کے لئے کوئی نہ کوئی راست قدم اٹھانا چاہئے تھا...... احباب کی سوسائٹی کو کوئی عملی اقدام سرانجام دینا چاہیے...... اور ہنوز وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہی تھی اور یہ امید کر رہی تھی کہ اس کا خاوند جوزف اسے بتائے کہ انہیں کیا کرنا چاہئے۔

اس نے کوشش کی کہ اپنی توجہ دوبارہ اپنے روزمرہ کے امور کی سرانجام دہی پر مرکوز کروائے لیکن اس دوران اس کا ملازم کمرے میں داخل

ہوا۔ وہ یہ بتانے کے لئے آیا تھا کہ اس کا کوئی ملاقاتی تشریف لایا تھا...... مسٹر اسٹفن گریلٹ ...... جو امریکہ سے آیا تھا۔

پیشتر اس کے کہ وہ ملازم کو کوئی جواب دیتی...... اس کا ملاقاتی بذات خود اس کے کمرے میں داخل ہو چکا تھا اور اس سے درخواست کر رہا تھا کہ چند لمحے اس کی ملاقات کے لئے وقف کئے جائیں۔ وہ از حد دلبرداشتہ دکھائی دے رہا تھا۔ الزبتھ نے ملازم کو رخصت ہونے کی ہدایت کی اور مسٹر گریلٹ کو خوش آمدید کہا۔

مسٹر گریلٹ نے کرسی پر براجمان ہونے سے انکار کر دیا اور کمرے میں ادھر اُدھر ٹہلنے کو ترجیح دی تا کہ اس کے احساسات زائل ہو سکیں جبکہ اس نے الزبتھ کو یہ وضاحت کی کہ وہ کیوں غیر روائتی انداز میں اس سے ملاقات کیلئے آن وارد ہوا تھا۔ وہ نیوگیٹ جیل کے دورے کے بعد سیدھا الزبتھ کے پاس آ رہا تھا اور اس نے جو کچھ وہاں پر دیکھا تھا وہ سب کچھ دیکھنے کے بعد خوف و ہراس اور دہشت کا شکار تھا۔ قیدیوں کی نگہداشت میں غفلت...... ان کی نگرانی میں غفلت...... سہولیات کی عدم دستیابی...... سب سے بڑھ کر کچھ سوچنے اور کچھ کرنے کی سہولت کا فقدان...... یہ سب کچھ قیدیوں کو انسانیت کے رتبے سے گرانے کے لئے کافی تھا۔ ناقص غذا ...... بیکاری...... ناامیدی...... یہ سب کچھ قیدیوں پر بری طرح اثر انداز ہوا تھا۔ لیکن اسٹفن گریلٹ کو جس امر سے سب سے بڑھ کر دکھ پہنچا تھا وہ چھوٹے بچے تھے جو اپنی ماؤں کے ہمراہ بے گناہ ہی سزا بھگت رہے تھے...... یا وہ بچے تھے جنہوں نے جیل میں ہی جنم لیا تھا اور قیدی ماؤں کے وہ بچے تھے جو بیماری کا شکار تھے۔ ان کے پاس بستر بھی نہ تھے جن پر وہ آرام کر سکیں اور نہ ہی ان کو گرمائش باہم پہنچانے کا کوئی بندوبست سرانجام دیا گیا تھا۔ مسٹر گریلٹ نے کہا کہ اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کیا جانا چاہیے۔ اس نے مزید کہا کہ جو کچھ بھی اس سلسلے میں کیا جانا چاہیئے وہ کسی عورت کی وساطت سے کرنا ممکن ہو سکتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ سیدھا الزبتھ فرائی کے مہربان گھر میں آن پہنچا تھا۔ اس نے سوال کیا کہ:۔

''کیا وہ اس سلسلے میں تعاون کرنے پر تیار تھی؟''

یقیناً وہ آمادہ تعاون تھی۔ کیونکہ اس مرتبہ مسئلہ اس نوعیت کا حامل نہ تھا کہ مرد حضرات کو زحمت دی جاتی...... کمیٹیوں کو زحمت دی جاتی...... یا پارلیمنٹ میں قانون پاس کروایا جاتا...... یہ مسئلہ چند افراد کا مسئلہ تھا...... ایسے افراد جن تک وہ رسائی حاصل کر سکتی تھی اور ان سے ملاقات کر سکتی تھی...... ان سے بات کر سکتی تھی اور ان کے مسائل سے شناسائی حاصل کر سکتی تھی۔ اس نے مسٹر گریلٹ سے کہا کہ یقیناً وہ سب کچھ کرنے پر آمادہ تھی جو سب کچھ وہ نیوگیٹ جیل کی عورتوں اور بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے کر سکتی تھی۔

اس نے جلد از جلد بازار کا رخ کیا اور سینکڑوں گز فلالین خرید لائی اور کئی ایک کوئیکر خواتین کو اکٹھا کیا...... انہیں اپنے گھر بلایا...... اور سلائی کے کام میں لگا دیا۔ وہ خواتین حیران تھیں۔ جب انہیں بتایا گیا کہ انہوں نے یہ کپڑے کس لئے تیار کرنے تھے تب وہ مزید حیران ہوئیں۔ لیکن وہ کپڑے تیار کرنے میں مصروف ہو گئیں اور چند دنوں کے اندر اندر لاتعداد گرم نائٹ گاؤن اور بچوں کے کپڑے سل کر تیار ہو چکے تھے۔ جوں ہی خواتین کپڑوں کی سلائی میں مصروف تھیں اس دوران مسز فرائی نے انہیں وہ تمام معلومات فراہم کیں جو معلومات اسے اسٹفن گریلٹ نے فراہم کی تھیں۔ ان خواتین میں سے ایک خاتون نے یہ پیشکش بھی کی وہ بھی مسز فرائی کے ہمراہ جیل جائے گی اور یہ کپڑے قیدیوں میں تقسیم کرنے میں اس کا ہاتھ بٹائے گی۔

الزبتھ اس خاتون کی شکر گزار تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ نیوگیٹ جیل میں اسے وہ مناظر نظر آئیں گے جو اسے ازحد صدمے سے دوچار کریں گے اور اگر وہ اکیلی نہ ہوئی تو بہتر طور پر اس صدمے کو برداشت کر سکے گی۔ اس کا خیال درست تھا۔ اس نے نیوگیٹ میں جو مناظر دیکھے وہ اس کے لئے اس قدر صدمے کا باعث ثابت ہوئے کہ یہ صدمہ اس کی برداشت سے باہر تھا اور اینا بکسٹن کی ہمراہی سے وہ اس صدمے کو برداشت کرنے کے قابل ہوئی تھی۔ لیکن الزبتھ یہ اندازہ نہ لگا سکی تھی کہ ان کو نہ صرف خوف وہراس اور صدمے کا سامنا کرنا پڑے گا بلکہ خطرے کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔

نیوگیٹ سے باہر جب فرائی کی گاڑی رکی تو دونوں خواتین کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسی مقام پر آن پہنچی تھی جس مقام کا تذکرہ اسٹفن گریلٹ نے کیا تھا کیونکہ یہاں وہ سب کچھ نظر نہ آ رہا تھا جس کا تذکرہ اسٹفن گریلٹ نے کیا تھا۔ عمارت خوبصورت اور پروقار تھی۔

لیکن جب دونوں خواتین عمارت کے اندر داخل ہوئیں تو انہوں نے دیکھا کہ وہ خوبصورتی مفقود تھی جو انہیں عمارت کے بیرونی منظر میں دکھائی دی تھی۔ ان کا استقبال انتہائی سرد مہری کے ساتھ کیا گیا۔ استقبال کرنے والوں نے ان کو بتایا کہ خواتین کے تحفظ کی ذمہ داری بھی ان پر عائد ہوتی تھی اور یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔

تحفظ؟ الزبتھ اور اینا نے حیرانگی کے ساتھ ایک دوسرے کی جانب دیکھا الزبتھ فرائی نے پُر اعتماد لہجے میں کہا کہ:۔

''ہمیں اس دورے کی اجازت فراہم کردی گئی ہے اور ہمیں خواتین کی وارڈ میں فوراً لے جایا جائے''۔

انہیں خواتین کی وارڈ میں پہنچا دیا گیا۔ انہوں نے سلاخوں کے پیچھے وہی ماحول پایا جس کا تذکرہ اسٹفن گریلٹ نے کیا تھا۔ فرائی دروازے پر رک گئی اور قیدی خواتین کو دیکھنے لگی۔ وہ دہشت زدہ ہوگئی تھی اور اسے شرم آ رہی تھی کہ وہ اس کے مصائب دور کرنے کے سلسلے میں کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی۔ وہ پیچھے مڑ گئی اور جیل حکام کے ساتھ اوپر اس کمرے کی جانب بڑھنے لگی جہاں پر بیمار خواتین دراز تھیں۔

چار برس بعد وہ اس خطرے سے حقیقی طور پر دوچار ہوئی جس خطرے سے جیل حکام نے اسے خبردار کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت اس نے اس امر پر اصرار کیا تھا کہ جیل حکام قید خانے کا دروازہ کھول دیں اور اسے قیدی عورتوں میں گھل مل جانے دیں۔ ایک مرتبہ پھر اسے بتایا گیا کہ اس کے تحفظ کی ذمہ داری قبول نہیں کی جائے گی اگر وہ اس مخلوق میں گھل مل جائے گی کیونکہ یہ قیدی خواتین اس کا لباس پھاڑ دیں گی جس طرح وہ ایک دوسرے کے لباس پھاڑتی تھیں اور اس کو ٹھوکریں ماریں گی بالکل اسی طرح جس طرح وہ آپس میں ایک دوسرے کو ٹھوکریں مارتی ہیں اور آپس میں لڑتی جھگڑتی ہیں۔ لیکن اس نے اس امر کی کوئی پرواہ نہ کی اور جیل حکام سے اصرار کیا کہ وہی کچھ کیا جائے جس کی وہ خواہش رکھتی تھی اور اسے تن تنہا عورتوں کی جیل میں داخل ہونے دیا جائے۔

جیل حکام نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی بات مان لی لیکن قیدیوں نے کسی ناروا سلوک کا مظاہرہ نہ کیا بلکہ ان پر خاموشی طاری رہی۔

سالہا سال بعد ایک صاحب ثروت اور اثر ورسوخ کے حامل شخص نے اس ناقابل بیان خصوصیت کو بیان کرنے کی کوشش کی جو الزبتھ فرائی میں موجود تھی اور جس نے اس کو اس عظیم خطرے کے لمحہ سے بخوبی گزرنے میں معاونت سرانجام دی تھی۔ یہ کچھ ایسی چیز تھی جو اسے اچانک اس میں دکھائی دی تھی جس طرح ان قیدی عورتوں کو دکھائی دی تھی۔ اس نے بیان کیا کہ:۔

''وہ ایک اونچی لمبی جسامت کی حامل تھی اور پُرکشش بھی تھی۔ اس کے نین نقش خوبصورت تھے۔ وہ اس لحاظ سے خوبصورت

تھے کہ وہ صحیح تناسب کے حامل تھے...... بالالفاظ دیگر اس کے نین نقش متناسب تھے۔ لیکن وہ خوبصورتی کے عام معیار کے مطابق خوبصورت نہ تھے۔ اس کی آنکھیں بڑی نہ تھیں...... روشن نہ تھیں...... شفاف نہ تھیں۔ وہ محض پُرسکون تھیں اور دانش وری کی حامل تھیں۔ اس کی تمام تر شخصیت سے مٹھاس...... وقار اور قوت جھلکتی تھی۔ اس کی شخصیت سے مرعوب نہ ہونا ناممکن تھا...... اس کی شخصیت ایسی تھی کہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انسان کسی مافوق الفطرت ہستی کے سامنے کھڑا ہو۔"

الزبتھ فرائی نے اس گندی...... ناامید اور قابل رحم مخلوق کو دیکھا اور ان سے بات چیت شروع کر دی۔ اس نے فرداً فرداً ایک ایک عورت سے بات کی۔ اس نے ان عورتوں سے ان کے مصائب اور ان کے جرائم کے بارے میں کوئی بات نہ کی بلکہ ان کے بچوں کے مستقبل کے بارے میں بات کی۔ کیا وہ چور بنیں گے؟ ایسے ماحول میں پروان چڑھتے ہوئے وہ کیا بنیں گے؟ ان کی تعلیم کا بھی کوئی بندوبست نہ تھا جو ان کو ایک بہتر اور روشن مستقبل کی ضمانت مہیا کر سکے۔ وہ نیوگیٹ میں ایک اسکول کھولنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اس نے قیدی عورتوں سے دریافت کیا کہ کیا وہ اس سلسلے میں اس کے ساتھ تعاون کریں گی؟

وہ عورتیں جو بذات خود مصائب کا شکار تھیں وہ بھلا اس کی کیا مدد کر سکتی تھیں لیکن اس کے باوجود بھی وہ اس کی مدد کر سکتی تھیں اور انہوں نے اس کی مدد بھی کی۔ ان میں سے ایک اسکول مسٹرس کا انتخاب کیا گیا۔ اس کو پڑھانے کی ذمہ داری سونپی گئی اور اس کو یہ موقع فراہم کیا گیا کہ وہ پُرسکون اور بہترین ماحول میں روزانہ معمول کی تعلیم دے۔ جیل کے گورنر نے مسز فرائی کو بتایا کہ اس کے پاس کوئی فاضل کمرہ موجود نہ تھا جس میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا جا سکے۔ لیکن اس نے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں ہر ممکن تعاون فراہم کرے گا۔ اس یقین دہانی کے بعد مسز فرائی نے فوری طور پر جیل میں تعلیمی کتب فراہم کر دیں اور بچوں اور استانی کو کام پر لگا دیا۔

اس کی دانش مندی کا ایک ثبوت یہ تھا کہ اس نے جو کارروائی سرانجام دی تھی وہ ایک انتہائی سادہ کارروائی تھی۔ لیکن ایک دوسرا اور اہم ترین ثبوت یہ تھا کہ اس نے انسانی فطرت کی انتہائی ضرورت کا ادراک کیا تھا۔ اگرچہ قیدیوں کی جسمانی صورت حال مصائب کا شکار تھی لیکن اس سے بھی بڑھ کر وہ ناامیدی کا شکار تھے اور انہیں اپنی فلاح و بہبود کی کوئی امید نہ تھی۔ ان کے پاس سرانجام دینے کو کوئی کام نہ تھا۔ وہ بوریت کا شکار تھیں۔ الزبتھ فرائی نے ان کے ساتھ پہلے پہل ان کی فلاح و بہبود اور اصلاح کی کوئی بات نہ کی تھی بلکہ اس کی بجائے اس نے انہیں کچھ کرنے کا موقع فراہم کیا تھا اور ان کو یہ کہتے ہوئے کہ وہ اس کی مدد کریں...... بچوں کی مدد کریں...... اس نے ان کو باور کروایا تھا کہ وہ بھی انسان تھیں اور ان کے ساتھ بھی معقول بات کی جا سکتی تھی اور یہ بات ان سے ان کا ایک ساتھی انسان کر رہا تھا۔

جب الزبتھ فرائی نے اپنی توجہ قیدی عورتوں کی جانب مبذول کروائی تو اس کا بڑا مقصد یہ تھا کہ انہیں کسی قسم کی دستکاری سے روشناس کروایا جائے...... لہٰذا اس نے انہیں سلائی کڑھائی کا ہنر سکھایا...... ان کو متعلقہ ساز و سامان فراہم کیا...... ان کے کام کی فروخت کا بندوبست کیا...... اور ان کو موقع ملا کہ وہ اپنی رہائی تک کچھ نہ کچھ رقم پس انداز کر سکیں۔ کئی برس بعد وہ ساحلی محافظوں کے کام میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ اسے جب یہ محسوس ہوا کہ ان کی بدترین دشمن ان کی تنہائی تھی...... اس نے ان کی تنہائی دور کرنے کی یہ تدبیر کی کہ ملک کے تمام تر ساحلی محافظوں میں کتب تقسیم کیں۔

الزبتھ فرائی کے رفاعی کام کامیابی سے ہمکنار ہونے لگے اور جلد ہی انہیں توقیر بخشی جانے لگی۔ اس سے اس کے کام کو تقویت میسر آئی۔ لیکن اس میں ایک خرابی بھی واقع ہوئی اور وہ خرابی یہ تھی کہ وہ ایک فیشن ایبل دل لگی اور تفریح کا سامان بن چکی تھی۔ جب وہ پہلی مرتبہ جیل کی چار دیواری میں داخل ہوئی تھی اس موقعہ کے تین برس کے اندر اندر صاحب ثروت اور فیشن ایبل لوگوں کا یہ معمول بن گیا تھا کہ وہ لوگ آتے تھے...... اس کے تجربات سنتے تھے...... بہترین ملبوسات زیب تن کرتے ہوئے ان گندے قیدیوں سے ایک فاصلے پر کھڑے ہوتے تھے اور تجسس بھری نظروں سے ان کی جانب تکتے تھے۔ جب وہ کہیں جاتی تھی...... انگلستان میں یا بیرون ملک...... ہر ایک طبقے کے لوگ اسے دیکھنے کے لئے امڈ آتے تھے اور اس کے ساتھ ہاتھ ملانے کی کوشش کرتے تھے۔ غیر ممالک کے بادشاہ اور حکومتیں قیدیوں کی فلاح و بہبود اور اصلاح کیلئے اس سے مشورے کرتے تھے...... سماجی اصلاحات کی کوئی بھی تحریک اس کے نام کو استعمال کرنے کی متمنی رہتی تھی اور حکومت اس کے اثر ورسوخ سے استفادہ حاصل کرنے کی طلب گار رہتی تھی۔ ان سب باتوں کے باوجود وہ وہی کچھ رہی جو کچھ وہ جنوری 1813ء کے یخ بستہ دن تھی...... ایک باحیا اور قدرے شرمیلی خاتون...... ایک ایسی عورت جس کے لاتعداد رشتے دار اور ساتھی کو ئیکر اس کو اس لئے نشانہ تنقید بناتے تھے کہ وہ اپنے بچوں کو نظر انداز کر رہی تھی۔

اگر چہ اس نے عوامی فلاحی کاموں سے دست برداری اختیار کرنے کے بارے میں قطعاً نہ سوچا لیکن اس نے اس بارے میں ضرور سوچا کہ اس کے نقاد اس کے بچوں کے بارے میں جزوی طور پر درست تھے۔ وہ ان کی بخوبی پرورش سرانجام دینے میں ناکام رہی تھی...... اس کے نزدیک اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس نے انہیں نظر انداز کیا تھا...... بلکہ اس کے نزدیک اس کی وجہ یہ تھی کہ اس میں مہارت کی کمی تھی۔ اگر چہ وہ اس امر پر یقین رکھتی تھی کہ لوگوں کی خدمت کرنا ایک لحاظ سے خدا کی خدمت کرنے کے مترادف تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس نے لوگوں کی خدمت کرنے کی تمنا کی تھی لیکن اس کے باوجود مذہب پر عمل پیرا ہونا اس کے لئے ایک مشکل امر تھا۔

ہیسٹر اسٹان ہوپ مشرق کی ملکہ کیسے بنی

1795ء میں جبکہ نپولین کی جنگیں اپنے عروج پر تھیں...... ایک مذہبی جنونی اور قسمت کا حال بتانے والا...... رچرڈ برادرز...... جو اپنے آپ کو "خدا کا بھتیجا" قرار دیتا تھا...... گرفتار کر لیا گیا تھا اور اسے پاگل خانے تک محدود کر دیا گیا تھا کیونکہ اس نے جارج III کی موت کی پیشین گوئی کی تھی اور انگریزی راج کے خاتمے کی بھی پیشن گوئی کی تھی۔ "خدا کے بھتیجے" نے لیڈی ہیسٹر اسٹان ہوپ سے ملاقات کرنے کی درخواست کی تھی جو کہ ولیم پٹ کی بھتیجی تھی...... ولیم پٹ وزیر اعظم کے عہدے پر فائز تھا۔

لیڈی ہیسٹر نے پہلے ملاقات کی درخواست مسترد کر دی لیکن یہ درخواست دوبارہ پیش کی گئی۔ اس مرتبہ اس کے اندر تجسس نے سر ابھارا کہ برادرز سے ملاقات کرنی چاہیئے جس کی پیشین گوئی نے ہلچل پیدا کر رکھی تھی۔ اس کے اندر کی عورت نے اسے یہ باور کروایا کہ وہ مافوق الفطرت قوتوں کا حامل تھا اور عین ممکن تھا کہ وہ اس کے بارے میں بھی کوئی نہ کوئی قابل ذکر پیشین گوئی کرے اور حقیقت میں اس نے اس کے بارے میں پیشین گوئی کردی کہ ایک روز ایسا آئے گا جبکہ وہ یروشلم جائے گی اور منتخب لوگوں کی رہنمائی سرانجام دے گی...... اور یہ کہ اس کو مشرقی ملکہ کا تاج پہنایا جائے گا۔

اس پیشین گوئی کی تکمیل نے ہیسٹر کو ایک عظیم مہم میں ملوث کر دیا جس نے اسے اپنے دور کی ایک قابل ذکر خاتون بنا ڈالا۔

وہ اسٹان ہوپ کے تیسرے نواب کی بڑی صاحبزادی تھی۔ اس نے اس کی پہلی بیوی کے بطن سے جنم لیا تھا جس کا نام لیڈی ہیسٹر پٹ تھا۔ وہ ولیم پٹ دی ایلڈر کی بیٹی تھی جو چاٹ ہام کا پہلا نواب تھا اور ولیم پٹ ینگر کی ہمشیرہ تھی جو بذات خود انگلستان کے عظیم وزرائے اعظم میں سے ایک تھا۔ ہیسٹر اسٹان ہوپ کی والدہ اس کی کم سنی میں ہی موت سے ہمکنار ہو گئی تھی اور اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی تھی۔

لارڈ اسٹان ہوپ نہ صرف امراء اور شرفا کی برادری کا ایک امیر ترین رکن تھا بلکہ وہ ایک سائنس دان...... فلسفی اور موجد بھی تھا۔ وہ ایک جذباتی اعتدال پسند بھی تھا جو فرانسیسی انقلابیوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور ان کی حمایت کرتا تھا اور مذہبی رواداری اور برداشت کا بھی قائل تھا اور اس ضمن میں ان تھک کام کرتا تھا۔ اس نے اپنے بچوں کو معاشرے کے معیار کے عین مطابق تعلیم و تربیت سے بہرہ مند نہ کیا تھا۔ اپنے اعتدال پسند نظریات کے باوجود بھی وہ ایک متعصب باپ تھا۔ اس کی دوسری بیوی لوسیا ایک ساجی تتلی تھی۔

لیکن اسٹان ہوپ نہ ہی احمق تھا اور نہ مردانہ خصوصیات سے عاری تھا۔ اس کی بیٹی ہیسٹر نے اس سے ہمت و جرأت...... حس ظرافت...... اور گھوڑ سواری وراثت میں پائی تھی۔ اس نے اپنے باپ سے انا پرستی بھی وراثت میں پائی تھی۔

وہ شیونگ میں پل کر جوان ہوئی تھی۔ اس کی پرورش ایک ایسے گھرانے میں ہوئی تھی جس پر اس کی مطلق العنان دادی کی حکمرانی تھی۔

18ویں صدی کے اختتام پر ہیسٹر لندن کے معاشرے میں متعارف ہوئی تھی۔ وہ دراز قد کی حامل تھی اور پروقار شخصیت کی بھی حامل تھی۔

اس کا چہرہ اگرچہ ایک کتابی چہرہ نہ تھا مگر ایک مقناطیسی کشش کا حامل چہرہ تھا۔ وہ بے باکی کا مظاہرہ کرتی تھی اور عدم برداشت کا مظاہرہ بھی کرتی تھی اور اپنے دور کے روایتی معاشرے کو صدمے سے دوچار کرتے ہوئے خوشی اور راحت محسوس کرتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو تنقید سے بالاتر تصور کرتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ہر کوئی اس کے سامنے سر جھکائے اور اس کی پرستش کرے۔

بیو برول سے اس کی دوستی ہوگئی تھی۔ وہ اس کی تعریف کرتے نہ تھکتا تھا۔ لیکن اس کی محبت کی زندگی سانحہ کا شکار رہی اور وہ اس کے خاندان سے لڑتی جھگڑتی رہی اور بالآخر اپنے چچا ولیم پٹ کے ہاں منتقل ہوگئی جو کہ غیر شادی شدہ تھا۔ اس نے اس کو دعوت دی کہ وہ اس کے گھر میں مقیم رہے اور اس کی میزبانی کے فرائض بھی سرانجام دے۔ یہاں پر ہیسٹر شاندار کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ پٹ وزیراعظم کے عہدے پر فائز ہوگیا اور ہیسٹر نمبر 10 ڈاؤننگ اسٹریٹ میں منتقل ہوگئی۔ وہ اپنے چچا کی میزبانی بخوبی سرانجام دیتی رہی۔ اس نے اپنے چچا کو اپنی بھرپور توجہ سے نوازا اور اس کے گھریلو امور کو بخوبی چلایا اور اس کی زندگی کے آخری ایام میں پیار۔ محبت اور مہربانی کے ساتھ اس کی خدمت سرانجام دی۔

1806ء میں اس کا چچا موت سے ہمکنار ہوگیا اور اس کی سالانہ 1200 پونڈ پینشن مقرر ہوئی لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کے وہ دن اب بیت چکے تھے جبکہ وہ معاشرے کی سرپرست تھی۔ پینشن کے علاوہ اس کے پاس اپنی کچھ رقم بھی محفوظ تھی۔ جب وہ معاشرے میں اپنا مقام برقرار نہ رکھ سکی تب محض ایک ہی راستہ باقی رہ گیا تھا جسے وہ اختیار کر سکتی تھی اور وہ راستہ یہ تھا کہ وہ انگلستان کو چھوڑ دے۔

10 فروری 1810ء کو وہ پورٹ ماؤتھ سے جبرالٹر کی جانب ایک جنگی بحری جہاز میں روانہ ہوئی۔ اس کی ہمراہی میں اس کا معالج...... ڈاکٹر چارلس میرون...... جس نے سالہا سال سے انتہائی توجہ کے ساتھ اس کی خدمات سرانجام دی تھیں...... جس نے مابعد اس کے بارے میں کتب تحریر کر کے شہرت پائی تھی...... وہ ایک قابل ڈاکٹر بھی تھا...... شامل تھا۔

رخصتی کے وقت ولیم پٹ کی بھتیجی ہونے کی حیثیت سے اسے پرتپاک طریقے سے رخصت کیا گیا اور ان نے مزید دو افراد کو اپنے ہمراہی کے شرف سے نوازا۔ ان کے نام لارڈ سلیگو اور مچل بروس تھے۔ دونوں افراد نوجوان تھے...... صاحب ثروت تھے...... دلکش شخصیت کے حامل تھے...... اور بہادر تھے۔ پہلے وہ یونان جا پہنچے...... اس کے بعد اسکندریہ کی جانب روانہ ہوئے...... راستے میں ان کا جہاز سمندری طوفان کی لپیٹ میں آ گیا۔ ان کا تمام سامان کھو گیا...... انہوں نے بذات خود ایک کشتی میں پناہ حاصل کی اور ایک بنجر چٹان پر پناہ گزین ہوئے۔ جہاز کا عملہ مدد کی تلاش میں روانہ ہو گیا اور بخوبی واپس بھی پلٹ آیا حالانکہ سمندر ہنوز طوفان کی زد میں تھا۔ عملہ اشیائے خورد و نوش کا ایک ذخیرہ بھی اپنے ہمراہ لایا تھا۔ وہ کھاتے پیتے رہے کیونکہ عملہ مزید الکحل بھی اپنے ہمراہ لایا تھا۔ بالآخر لیڈی ہیسٹر مصر جا پہنچی۔

اگرچہ وہ اپنی زندگی میں ایک مردانہ رویے کی حامل تھی لیکن وہ عورتوں جیسی خصلتوں سے قطعی عاری نہ تھی۔ اس نے یقیناً ایک عورت جیسے رویے کا اظہار کیا تھا اور اس نے واضح انداز میں مچل بروس کو اپنے محبوب کے طور پر تسلیم کیا تھا اور ان کی یہ محبت ایک برس تک برقرار رہی تھی۔ وہ یروشلم چلی گئی تھی جہاں پر مقدس شہر میں موجود یورپی سیاحوں نے اسے اس حیرانگی کی نگاہ سے دیکھا کیونکہ اس انگریز عورت کا لباس ایک بُری نوعیت کا حامل تھا اور اس کے ہمراہ اس کا محبوب بھی موجود تھا۔ لیکن ہیسٹر نے ان باتوں کی قطعاً پرواہ نہ کی۔ اس نے مقامی عرب سرداروں کی خوشنودی حاصل

کرنے کو ترجیح دی۔ وہ دمشق بھی جا پہنچی جہاں پر عورتیں نقاب پہنتی تھیں۔ وہ لوگ اسے ایک عورت تصور کرنے پر تیار نہ تھے۔

اس کی عظیم کامیابی اس کا پالمائرہ کی جانب سفر تھا...... ملکہ زنوبیا کا قدیم شہر...... 18ویں صدی کے بہت سے سیاحوں اور تحقیق و تفتیش سرانجام دینے والے حضرات نے یہ کوشش کی تھی کہ وہ پالمائرہ پہنچ سکیں مگر وہ اپنی کوشش میں ناکام رہے تھے بلکہ واپسی کی راہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ کومٹ ڈی وولنی...... مشہور فرانسیسی سیاح نے اپنی کتاب میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ پالمائرہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن ہیسٹر کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ وہ وہاں تک پہنچ نہ پایا تھا بلکہ اس نے دیگر ذرائع سے اس مقام کے بارے میں معلومات اکٹھی کر کے انہیں اپنی کتاب کی زینت بنایا تھا۔

شامی صحرا...... جس سے گزر کر اس نے پالمائرہ پہنچنا تھا وہ مختلف قبائل کے جنگ و جدل کے باعث میدان جنگ کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ لی وینٹ کے کونسل نے جب یہ خبر سنی کہ لیڈی ہیسٹر پالمائرہ کے مجوزہ سفر پر روانہ ہو رہی تھی تو وہ خوفزدہ ہو گیا اور اسے بتایا کہ اس کا یہ فیصلہ پاگل پن کے سوا کچھ نہ تھا۔

ہیسٹر نے کسی قسم کے خطرے کی کوئی پرواہ نہ کی اور کسی بھی خبردار کرنے والے کو کسی خاطر میں نہ لائی بلکہ اپنا منصوبہ ترتیب دیتی رہی۔ وہ اس بات پر ڈٹی رہی کہ پالمائرہ جانا اس کا مقدر تھا۔ کیا اس کو برادرز نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ مشرق کی ملکہ بنے گی اور اس کو یہ یقین تھا کہ پالمائرہ ہی وہ مقام تھا جہاں پر وہ زنوبیا کے عرصہ دراز سے خالی تخت پر بیٹھ سکتی تھی۔

اسے ایک عرب قبیلے کے ایک طاقتور سردار ناصر نے بتایا کہ اس کا باپ اسے ایک دشمن تصور کرے گا اگر اس نے ان دستوں کے تحفظ کی چھتری تلے پالمائرہ کا سفر طے کیا جو رقم کے لالچ میں تحفظ فراہم کرتے تھے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ پالمائرہ تک پہنچنے کا محض ایک ہی راستہ تھا کہ وہ بیڈ ون قبائل (وہ عرب قبیلے جو خیموں میں رہتے تھے اور خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے تھے) کے تحفظ کی چھتری تلے پالمائرہ کا سفر طے کرے جن پر ماحنا کی حکومت تھی۔ اس سردار نے اسے بتایا کہ اگر وہ اس کے مشورے پر عمل کرے گی تو یہ قبیلہ اسے بحفاظت پالمائرہ تک پہنچا دے گا اور اسے بحفاظت واپس بھی لے آئے گا۔ اس سردار نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ یا اس کا باپ اس خدمت کی سرانجام دہی کے لئے کتنی رقم کا مطالبہ کرے گا۔

ناصر پچیس برس کا نوجوان تھا۔ وہ ہوشیار اور چالاک ہونے کے علاوہ غدارانہ مزاج کا بھی حامل تھا۔ وہ عربی وجاہت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اس نے ہیسٹر کو تحائف دیے۔ اس کو صبح کے ستارے کا لقب دیا اور سلطان کی بیٹی کہہ کر پکارا۔ ہیسٹر اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ لیکن جب معاوضہ طے کرنے کا موقع آیا تب وہ ایسے معاملہ طے کرنے لگی جیسے اس کے نئے مشرقی دوست معاملہ طے کرتے تھے اور کسی قدر تکرار کے بعد معاملہ اس قدر رقم پر طے پایا ہوا جو 150 پونڈ کے مساوی تھی اور اس رقم کی عوض ماحنا نے اسے بحفاظت منزل مقصود تک پہنچانا تھا۔ اس نے رقم کا ایک تہائی حصہ پیشگی ادا کرنے کا فیصلہ کیا اور بقایا رقم اس نے اپنی بحفاظت واپسی کے بعد ماحنا کو ادا کرنی تھی۔

1813ء کی موسم بہار میں جب برف پگھل چکی تھی تب ہیسٹر اسٹان ہوپ نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ مچل بروس بھی اس سفر میں اس کے ہمراہ تھا اور وفادار ڈاکٹر میرون بھی اس کے ہمراہ تھا اور اس کی لیڈی خادمہ این فرائی بھی ہمراہ تھی۔ اگرچہ ہیسٹر اور اس کا محبوب ان خطرات سے آگاہ نہیں تھے جو

ان کو درپیش ہو سکتے تھے لیکن باقی یورپی حاشیہ نشین ان خطرات کا ادراک رکھتے تھے۔ انہوں نے یورپی سیاحوں کے مقدر کے بارے میں خوفناک کہانیاں سن رکھی تھیں جنہوں نے شامی صحرا میں سفر سرانجام دیا تھا۔ ان میں سے محض چند ایک ہی پالمائرہ تک پہنچ پائے تھے اگرچہ وہاں پہنچنے کی کوشش ان گنت افراد نے سرانجام دی تھی۔

لیڈی ہیسٹر اسٹان ھوپ صحرا کے سفر پر روانہ ہوئی۔ اس کے قافلے میں 70 عرب اور 40 اونٹ شامل تھے۔ بیڈون سردار کا ایک محافظ بھی اس کی حفاظت کے لئے ہمراہ تھا۔ ہیسٹر نے بذات خود بھی عربوں جیسا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کا کوئی بھی یورپی حاشیہ نشین اس کے قریب نہ تھا۔ شہر کے لوگ اس قافلے کو دیکھنے کے لئے امڈ آئے تھے جس میں ایک ایسی عورت تھی جو نہ عورت تھی اور نہ مرد تھا اور وہ پالمائرہ کے دور دراز کے سفر پر روانہ ہو رہی تھی۔ مچل بروس اور ڈاکٹر اس جلوس کے آخر میں رواں دواں تھے اور وہ اس امر سے غم و غصے کا شکار تھے۔

شامی صحرا کا تمام تر سفر چٹانوں اور ویرانگی کا حامل نہ تھا۔ انہوں نے پہاڑوں سے گزرتے ہوئے سفر طے کیا...... جنگلات سے گزرتے ہوئے سفر طے کیا اور ان کے سفر کے دوران تباہ شدہ قلعے بھی دیکھنے میں آئے۔ پانچ روز بعد موسم میں ڈرامائی تبدیلی عود کر آئی اور موسم بد تر صورتحال اختیار کر گیا۔ اس دوران ناصر اور مچل بروس کے درمیان ایک سرد جنگ جنم لے چکی تھی۔

اس کا یہ دستور تھا کہ وہ ہر شام اس کے خیمے میں جاتا تھا اور اس سے احکامات وصول کرتا تھا لیکن اب اس نے وہاں جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر وہ ایک وزیر کی بیٹی تھی تو وہ بھی ایک شہزادے کا بیٹا تھا۔ بروس لیڈی کی اس بے عزتی پر تلملا اٹھا اور اس نے ناصر کی شدید مخالفت شروع کر دی۔ لیکن ہیسٹر نے انتہائی دانشمندی کا ثبوت دیا...... کیونکہ وہ ناصر کے قبیلے کے لوگوں کے رحم و کرم پر تھے جو کہ نہ صرف ان کی رہنمائی سرانجام دے سکتے تھے بلکہ ان کو صحرا کے خفیہ کنوؤں کی نشاندہی بھی کر سکتے تھے...... وہ اس مسئلے کا اپنا ہی حل چاہتی تھی...... اس حل کے تحت اسے ناصر کے جارحانہ رویے کو نظر انداز کرنا تھا۔ اس کے اس عمل درآمد کی وجہ سے ناصر نہ صرف پریشان ہوا بلکہ غم و غصے سے بھی دوچار ہوا۔ اس نے یہ آس لگا رکھی تھی کہ وہ اسے مزید رقم کی پیش کش کرے گی تاکہ وہ اپنا تعاون جاری رکھے۔ لہٰذا اس نے اسے خوفزدہ کرنے کے اور طریقے آزمانے کی کوشش کی تاکہ وہ اسے مزید رقم کی پیش کش کر سکے۔ جلد ہی کیمپ میں خوف و ہراس اور سراسیمگی پھیل گئی جب ہر کسی کے علم میں یہ بات آئی کہ فدائین عربوں کی ایک جماعت جو کہ ناصر کے قبیلے کی کٹر دشمن تھی...... نزدیک ہی کہیں چھپی ہوئی تھی اور اس انتظار میں تھی کہ موقع ملتے ہی اس قافلے کے ہر ایک فرد کو ذبح کر کے رکھ دے۔ ناصر اور اس کے آدمی رات کے اندھیرے میں کسی جانب چل نکلے اور ہیسٹر اور بروس کو تنہا چھوڑ گئے...... وہ صحرا کے عین وسط میں تنہا تھے اور ان کے اردگرد کپکپاتے ہوئے اور خوف و ہراس کا شکار ملازمین تھے۔ لیکن نہ ہی ہیسٹر اور نہ ہی بروس خوفزدہ تھے۔ وہ اپنے ہاتھوں میں پستولیں تھامے کھڑے تھے اور جو بھی لڑنے کی نیت سے سامنے آتا اس سے لڑنے کیلئے انتہائی چوکس اور تیار تھے۔ گھوڑ سواروں کا ایک ہجوم ان کی جانب بڑھ رہا تھا۔ قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وہ ناصر اور اس کے آدمی تھے جو واپس پلٹ رہے تھے۔ ناصر نے کہا کہ اسے دیکھ کر فدائین حیران رہ گئے تھے اور راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ لیکن ہیسٹر اور بروس دونوں نے اس کی اس کہانی پر یقین نہ کیا تھا۔

ناصر کی نیت خواہ کچھ ہی کیوں نہ رہی ہو لیکن لب لباب یہ تھا کہ لیڈی ہیسٹر نے قابل ذکر جرأت کا مظاہرہ کیا تھا اور عرب لوگ جرأت اور

ہمت کے قدر دان تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ناصر ایک مرتبہ پھر اس کا درباری اور غلام بن چکا تھا۔ لہٰذا ایک نرم اور چمکدار دن وہ اس کو اپنی رہنمائی میں پہاڑی درے کے پار پالمائرہ کے دروازوں پر لے آیا تھا۔

زنوبیا کا افسانوی شہراب محض کھنڈرات کا ایک ڈھیر تھا اور اس میں اس دور کے رہائشیوں کی مٹی کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ وہ ایک یورپی عورت کی اس مقام تک رسائی حاصل کرنے پر حیران بھی تھے اور خوش بھی تھے۔ انہوں نے گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا...... اس کو ایسا استقبالیہ پیش کیا جو زنوبیا کو بھی نصیب نہ ہوا ہو گا۔

خوبصورت عرب لڑکیوں نے اس کا استقبال کیا۔ ان میں سے خوبصورت ترین لڑکی نے رومی پھولوں کا ایک ہار اس کے سر پر رکھا...... بزرگوں نے اس کی شان میں نظمیں پڑھیں...... نوجوان لڑکوں نے اس کے سامنے عربی موسیقی کا مظاہرہ کیا اور پالمائرہ کی تمام تر آبادی جو 1,500 نفوس پر مشتمل تھی نے اسے اپنی ملکہ بننے کے اعزاز سے نوازا۔

یہ ایک بہت بڑی اور دیرپا فتح تھی۔ پیش گوئی پوری ہو چکی تھی۔ اس کو مشرق کی ملکہ کا تاج پہنا دیا گیا تھا اور عربوں میں اس کی ایسی شہرت اور دھاک بیٹھی تھی کہ وہ اس کی تمام تر بقایا زندگی کے دوران اس کا احترام کرتے رہے اور اسے عزت بخشتے رہے۔

وہ کبھی انگلستان واپس نہ پلٹی بلکہ شام میں ہی مقیم رہی جہاں پر اسے غیر معمولی اتھارٹی حاصل تھی۔ اس نے 1839ء میں وفات پائی اور سادہ لوح عربوں نے اس کی موت پر انتہائی غم کا اظہار کیا جو ہمیشہ اس کا احترام کرتے تھے۔

......❁......

شمال۔مغربی راستے کی تلاش

23 مئی 1819ء کو...... ہڈسن بے کمپنی کے ایک جہاز...... دی پرنس آف ویلز نے گریوسینڈ کے مقام پر لنگر اٹھائے...... تھامس کو سمندر کی جانب اتارااور کینیڈا کے قطب شمالی کے علاقہ جات کی جانب اپنے سفر کے پہلے حصے پر روانہ ہوا۔

یہ تحقیق وتفتیش کے ایک اہم ترین سفر کا آغاز تھا...... پرنس آف ویلز نامی جہاز پر مسافروں کے روپ میں سفر طے کرنے والے جان فرینکلن اوراس کے آدمیوں کے علاوہ کوئی اور نہ تھے...... وہ آدمی جو اس کی ہمراہی اختیار کیے ہوئے تھے...... وہ بحرالکاہل کی جانب شمال۔مغربی راستے کی تلاش میں اس کے ساتھی تھے۔

یہ مشرق کی کشش تھی اور چین تک رسائی حاصل کرنے کیلئے ایک مغربی راستے کی تلاش تھی جس نے امریکہ کی دریافت میں رہنمائی سرانجام دی تھی۔حتیٰ کہ کولمبس کی وفات کے بعد بھی زمین کا دور تک پھیلا ہوا سلسلہ مشرق کی دولت کے درمیان حائل ایک دیوار سمجھا جاتا تھا۔اس خیال نے 19ویں صدی میں سرابھارا تھا۔

1576ء میں ملکہ الزبتھ نے مارٹن فروبشر کو یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ وہ شمال۔مغربی راستے کی تلاش کا فریضہ سرانجام دے۔لہٰذا برطانیہ نے قطب شمالی کی تحقیق وتفتیش کی بنیاد رکھ دی تھی۔

فرانس اور انڈین کی جنگوں کے بعد جو کہ 1763ء کو اپنے اختتام کو پہنچی تھیں...... برطانیہ نے سینٹ لارنس پر اپنا تسلط جمالیا تھا اور فر (سمور) کی تجارت پر مکمل کنٹرول حاصل کرلیا تھا۔ہڈسن بے کمپنی کی چوکیاں شمال کی جانب مزید آگے پھیلتی چلی گئیں حتیٰ کہ 1789ء میں سیموئیل ہیئر اور الیگزینڈر میکنزی شمال میں کافی آگے کی جانب پہنچ گئے اور وہ پہلے سفید فام تھے جنہوں نے کینیڈا کے شمالی ساحل سے قطب جنوبی کے سمندر کا نظارہ کیا تھا۔

نپولین کی جنگوں نے تحقیق وتفتیش کے تمام دروازے بند کردیے تھے۔

1800ء میں جان فرینکلن نے بحریہ میں شمولیت اختیار کرلی تھی۔اس وقت اس کی عمر پندرہ برس تھی۔اس نے نیلسن کی ماتحتی میں خدمات سرانجام دی تھیں اور کوپن ہیگ اور ٹرافالگر کی لڑائیوں میں حصہ لیا تھا۔اس نے نیو آرلینز کی لڑائی میں بھی حصہ لیا تھا جو 1812ء میں امریکہ کے ساتھ جنگ کے دوران لڑی گئی تھی۔لیفٹیننٹ فلنڈرز کی ماتحتی میں فرینکلن نے جہاز رانی کی تربیت حاصل کی تھی اور آسٹریلیا کے ساحل کے سروے میں معاونت سرانجام دی تھی۔

بالآخر جب فرانس کے ساتھ جنگیں اپنے اختتام کو پہنچیں تب برطانوی حکومت نے ایک مرتبہ پھر اپنی توجہ مشرق کی جانب پانی کے ذریعے

شمال۔ مغربی راستے کی تلاش کی جانب مرکوز کروائی۔

لہٰذا 1819ء میں جان فرینکلن ...... مابعد وہ قطبی تحقیق وتفتیش کے ضمن میں خدمات کی سرانجام دہی کی بدولت خطاب سے نوازا گیا تھا اور اس کا اس حیثیت میں انتخاب بھی کیا گیا تھا کہ وہ کینیڈا کی تحقیق وتفتیش سرانجام دینے کی غرض سے ایک مہم کی سربراہی بھی سرانجام دے...... اس کی ہمراہی میں ڈاکٹر جان رچرڈسن...... آر۔ این اور ماہر نباتات اور ماہر معدنیات کے علاوہ ایک سرجن ...... دو مڈشپ مین اور لینڈ اسکیپ آرٹسٹ جارج بیک اور رابرٹ ہڈ بھی تھے۔

فرینکلن کے لئے یہ احکامات تھے کہ وہ دریائے کوپر مائین کے مشرق کی جانب شمالی امریکن ساحل کی تحقیق وتفتیش سرانجام دے اور مابعد لیفٹیننٹ ولیم پارے کے ساتھ آن ملے جو فرینکلن سے تین روز پیشتر گریوینڈ سے ان احکامات کے ساتھ عازم بحری سفر ہوا تھا وہ شمال' مغربی راستے کی تلاش لان کاسٹر ساؤنڈ کے ذریعے سرانجام دے۔

آبنائے ہڈسن تک پہنچنے تک بحر اوقیانوس کے پار سفر بخیر وخوبی سرانجام پایا تھا لیکن اس کے بعد تند وتیز لہروں نے جہاز کو ساحل کی جانب دھکیلنا شروع کر دیا اور صاف ظاہر تھا کہ جہاز کئی اقسام کی شکست وریخت کا بھی شکار ہوا تھا۔

دو مرتبہ لہروں نے جہاز کو چٹان پر دے مارا اور دو مرتبہ سمندری لہروں کے اتار چڑھاؤ نے جہاز کو اٹھا کر اس کی درست پوزیشن پر لا کھڑا کیا۔ جہاز کا عملہ محض کسی معجزے کے انتظار میں تھا...... آخری لمحات میں معجزہ رونما ہو گیا اور ''پرنس آف ویلز'' خطرے کی زد سے باہر نکل گیا۔

جہاز کا عملہ اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھا اور ایک دوسرے کو مبارکباد پیش کر رہا تھا کہ اس دوران ہوا کا ایک زوردار ریلا جہاز کو برف کے ایک تودے تک لے گیا۔ جہاز برف کے تودے کے ساتھ جا ٹکرایا۔

فرینکلن نے اپنی یادداشت میں تحریر کیا کہ:۔

''یہ ایک اور معجزہ تھا کہ ہم دوبارہ گہرے پانی میں جانے کے قابل ہوئے تھے''

عملے کے ارکان اور سواریوں نے جانفشانی سے کام کیا۔ ترکھانوں نے جہاز کے سوراخوں کو مرمت کیا اور جہاز نے اپنا سفر جاری رکھا اور اس دوران کوئی اور ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔

''پرنس آف ویلز'' نے 30 اگست 1819ء کو لنگر ڈال دیے۔ شمال کی جانب سفر کا پہلا حصہ کشتیوں کے ایک قافلے کے ذریعے طے کیا گیا۔ یہ سفر دریائے ہیز تا جھیل ونی پگ سرانجام دیا گیا۔ بدقسمتی سے فر (سمور) کے تاجروں کے مابین کاروباری مقابلہ اس قدر سخت تھا کہ ہڈسن بے کمپنی فرینکلن کو ایک سے زیادہ کشتی فراہم نہ کر سکی۔ لہٰذا تحقیق وتفتیش سرانجام دینے والی یہ جماعت اس امر پر مجبور تھی کہ وہ اپنا ساز وسامان اسی مقام پر چھوڑ دے۔ مسٹر ولیم یارک فیکٹری کے گورنر نے یہ وعدہ کیا کہ وہ اس قدر سامان ان کے پیچھے بھجوا دے گا جس قدر سامان وہ بھجوا سکا...... یہ سامان اس نے تاجروں کی کشتیوں کے ذریعے بھجوانا تھا جنہوں نے کمبرلینڈ تک فرینکلن کے پیچھے جانا تھا۔

9 ستمبر کو یہ جماعت عازم سفر ہوئی۔ وہ اپنے باقی ماندہ سفر کی کیفیت کے بارے میں کچھ نہ جانتے تھے۔ فیکٹری سے محض چھ میل دور جانے

کے بعد لہروں میں اس قدر تیزی آ گئی تھی کہ وہ سب لوگ پریشان ہو گئے تھے۔

22 اکتوبر تک یہ جماعت سات صد میل کا سفر طے کر چکی تھی۔ وہ ساس کیچون دریا پر قلعہ کمبر لینڈ پہنچ چکے تھے۔ یہاں پر بھی فرینکلن کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے گائیڈوں اور ترجمانوں کیلئے درخواست کی لیکن اس کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ قطب شمالی کی سردی بڑھ رہی تھی لیکن فرینکلن نے قلعہ چائپ پان کا رخ کرنے کی ٹھانی۔ اس کی جماعت کے دو رکن جان ہپ برن اور جارج بیک اس کے ہمراہ تھے۔ ان کو امید تھی کہ وہاں پر وہ کشتیوں کو منظم کر سکیں گے اور اشیائے خورد و نوش کا بندوبست کر سکیں گے تا کہ باقی ماندہ سفر بخوبی سرانجام دیا جا سکے۔

رچرڈسن...... ہڈ اور بوٹ مین کو قلعہ کمبر لینڈ چھوڑتے ہوئے فرینکلن اور اس کے دو ساتھی برفانی جوتے پہنتے ہوئے پندرہ روز کے راشن کے ہمراہ عازم سفر ہوئے۔ فرینکلن کو برفانی جوتے پہننے سے نفرت تھی۔

اگر چہ سردی شدید ترین تھی اور تھرمامیٹروں کا پارہ جم چکا تھا جو کہ تمام تر سفر کے دوران اسی حالت میں رہا تھا...... یہ جماعت بحفاظت قلعہ چائپ یان پہنچ گئی۔ 26 مارچ کو وہ جھیل اتھباباسکا پہنچ چکے تھے۔ اس طرح وہ 857 میل کا سفر طے کر چکے تھے۔ قلعہ چائپ یان ایک تجارتی چوکی تھا...... یہ شمال۔ مغربی کمپنی کی تجارتی چوکی تھی...... یہ کمپنی ہڈسن بے کمپنی کی حریف کمپنی تھی۔ فرینکلن نے تمام تر موسم سرما اپنے سفر کے اگلے حصے کی تیاری میں صرف کیا۔ اس نے کرایے پر کشتیاں حاصل کیں اور فرانسیسی' کینیڈین بحری مسافروں کا بندوبست کیا۔ اس کے علاوہ انڈین ترجمانوں اور انڈین شکاریوں کا بھی بندوبست کیا۔ اس نے اپنے مجوزہ روٹ کے بارے میں دونوں کمپنیوں کے تاجروں سے اتنی معلومات حاصل کیں جتنی معلومات وہ حاصل کر سکتا تھا۔

13 جولائی کو ڈاکٹر رچرڈسن اور مسٹر ہڈ بھی مزید ساز و سامان اور اشیائے خورد و نوش کے ہمراہ قلعہ کمبر لینڈ سے آن پہنچے تھے۔ فرینکلن نے اب وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ 18 جولائی کو یہ جماعت شمال کی جانب روانہ ہوئی۔ وہ دریائے سلیو کے ساتھ ساتھ گریٹ سلیو جھیل کی جانب روانہ ہوئے۔ 29 تاریخ کو وہ جھیل کے شمالی کنارے پر قلعہ پروویڈنس پہنچ چکے تھے۔

اس مقام سے ان کا سفر انہیں اس ملک لے گیا جس ملک کو کسی یورپی نے اس پہلے نہیں دیکھا تھا۔ گریٹ سلیو جھیل کے شمال کی جانب۔ ییلو نائف دریا پر ان کی ملاقات اکاٹ شو سے ہوئی جو کاپر انڈین کا سردار تھا جو اس امر پر آمادہ ہو گیا کہ وہ اس جماعت کی ہمراہی اختیار کرے گا اور ان کے لئے شکار بھی کرے گا۔ شکار ہی فرینکلن کی خوراک کی واحد سبیل تھی۔

بالآخر وہ جھیل ونٹر تک جا پہنچے۔ یہ 20 اگست کی تاریخ تھی اور درجہ حرارت ہنوز گر رہا تھا۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک مکان تعمیر کیا جائے اور سردی کا موسم اس مکان میں گزارا جائے۔ انہوں نے اس مکان کا نام فورٹ انٹر پرائز رکھا۔ سردیوں کے لمبے دورانیے کے دوران شکاری اور مچھلی کے شکار کی جماعتیں شکار کی غرض سے جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ ارد گرد کے علاقے کا جائزہ لینے کی غرض سے چھوٹے موٹے سفر طے کئے جاتے تھے۔ فرینکلن نے علاقے کے بارے میں مفصل رپورٹیں تحریر کیں...... انڈین کی عادات کے بارے میں اپنے تاثرات قلمبند کئے۔

14 جون 1821ء کو جماعت ایک مرتبہ پھر عازم سفر ہوئی۔ یہ فیصلہ طے پایا کہ مسٹر وینٹ زل...... شمال' مغربی کمپنی کا ایک اہلکار اور انڈین سمندر

تک بڑی جماعت کی ہمراہی اختیار کریں گے اور جس دوران افسران مشرق کی جانب ساحل سمندر کا سروے سرانجام دیں گے اس دوران انڈین اور وینٹ زل دریائے کاپر مائن کے ساتھ ساتھ واپسی کی راہ لیں گے اور جماعت کی واپسی تک گوشت کا بندوبست کریں گے۔ فورٹ انٹر پرائز میں بھی کچھ اشیائے خوردونوش محفوظ پڑی تھیں۔ فرینکلن نے تحریر کیا کہ:۔

"مسٹر وینٹ زل کے مشورے کے تحت فورٹ انٹر پرائز کا کمرہ بند کر دیا گیا تھا...... اور ایک ڈرائنگ جو ایک خنجر کی نمائندگی کرتی تھی...... دھمکی آمیز رویے کے تحت نمائندگی کرتی تھی اس کے دروازے پر بنا دی گئی تھی...... تاکہ کوئی بھی انڈین اس کو توڑنے یا کھولنے کی کوشش نہ کرے۔"

جماعت ساحل کے شمال کی جانب روانہ ہوئی۔ انہیں بہت سی جھیلیں پار کرنا پڑیں۔ کشتیاں اور سازوسامان کو بنجر سرزمین پر کندھوں پر اٹھانا پڑتا اور کبھی کبھار اسے کندھوں پر اٹھاتے ہوئے پہاڑیاں بھی عبور کرنی پڑتیں تھیں۔ پانی کا سفر بھی خطرناک تھا۔ بالآخر یہ جماعت دریائے کاپر مائن کے گندے پانی تک جا پہنچی۔

20 جولائی کو وہ ایک پہاڑی پر چڑھ گئے اور انہوں نے پہلی مرتبہ قطب شمالی کے سمندر کا نظارہ کیا۔ کینیڈین مسافر اس نظارے کو پسند نہ کرتے تھے کیونکہ یہ برف اور جزیروں سے بھرا پڑا تھا۔

"......وہ کشتیوں کے ذریعے ایک برفانی سمندر میں سفر طے کرنے سے خوفزدہ تھے۔ وہ سفر کی طوالت اور سمندری لہروں کی بے ترتیبی سے خائف تھے۔ خوراک کی غیر یقینی صورت حال سے بھی خائف تھے۔ وہ سردی سے بھی خائف تھے جہاں پر ہم ایندھن کے حصول کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتے تھے۔"

21 جولائی کو کشتیاں قطب شمالی کے سمندر میں ڈال دی گئیں اور مشرق کی جانب سروے کا آغاز ہوا۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتے گئے توں توں اہم ترین مقامات...... کھاڑیوں اور خلیجوں اور جزیروں کے نام رکھتے چلے گئے۔

وہ ملولی ساؤنڈ کے شمالی ساحل تک جا پہنچے اور ایک ایسے مقام تک رسائی حاصل کی مابعد جس کا نام انہوں نے پورٹ ٹرناگین رکھا۔

خوراک کی کمی...... موسم سرما کی شدت نے فرینکلن کو مجبور کیا کہ وہ مزید سفر ملتوی کرتے ہوئے اسی مقام پر قیام کرے۔

فرینکلن کو یہ امید تھی کہ اس کی ملاقات اپنے دوست پاری سے بھی ہوگی جو ایک دوسری مہم کی سربراہی سرانجام دے رہا تھا جو سمندر کے راستے اس مقام پر پہنچ رہی تھی۔ لیکن اس کی آمد کے کوئی آثار دکھائی نہ دے رہے تھے۔ اس کے علاوہ اسے ان اسکیموؤں کے بھی کوئی آثار دکھائی نہ دے رہے تھے جن کے بارے میں اسے بتایا گیا تھا وہ انہیں خوراک مہیا کرنے میں معاون ثابت ہوں گے۔

چونکہ خوراک کا ذخیرہ دم توڑتا نظر آرہا تھا لہٰذا اس نے یہ فیصلہ کیا کہ کاپر مائن کے راستے واپس جانے کی بجائے دریائے ہڈ کے راستے واپس لوٹا جائے۔ تاہم دریائے ہڈ مغرب کی جانب بہتا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور 3 ستمبر کو انہوں نے اس دریا کے کناروں کو خیرباد کہا کو اور عازم سفر ہوئے۔ ان کی منزل قلعہ انٹر پرائز تھی۔ باقی ماندہ سفر پیدل طے کرنا تھا اور تمام تر سازوسامان بھی ہمراہ لے جانا تھا۔ فرینکلن نے کشتیوں سے دست

بردار ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دریا یا ندی کو عبور کرنے کی غرض سے ان کی ضرورت درپیش ہو سکتی تھی۔ 5 تاریخ کو ہوا اس قدر تیز تھی کہ وہ کیمپ سے روانہ نہ ہو سکے۔ ان کے پاس کھانے کے لئے بھی کچھ نہ تھا اور آگ جلانے کے لئے لکڑی بھی مفقود تھی۔ لہٰذا وہ بستروں میں پڑے رہے۔ درجہ حرارت 20 ڈگری فارن ہیٹ تھا۔

7 تاریخ کو ہوا کی شدت میں کچھ کمی واقع ہوئی۔ لہٰذا پیدل سفر کا آغاز ہوا۔ اگرچہ ہوا کی شدت میں کمی آ چکی تھی لیکن اس کے باوجود بھی ہوا اس قدر تیز تھی کہ وہ لوگ جنہوں نے کشتیاں اٹھا رکھی تھیں ان کو چلنے میں از حد دشواری پیش آ رہی تھی اور کشتیاں ان کے چہروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ایک کشتی نقصان سے بھی دوچار ہو چکی تھی اور قابل مرمت نہ رہی تھی۔ کچھ دنوں سے وہ خوراک کے طور پر چٹانوں پر اگنے والی نباتات کھا کر گزارہ کر رہے تھے۔

16 تاریخ تک اس جماعت کے لوگ اس قدر تھک چکے تھے کہ انہوں نے اپنی پشت پر جو سامان اٹھا رکھا تھا اس سے انہیں دست بردار ہونا پڑا۔ اس سامان میں کپڑے...... بندوقیں...... اسلحہ اور جہاز رانی کے آلات وغیرہ شامل تھے۔ محض ایک کشتی کو ہمراہ رکھا گیا۔ اس روز بھی انہوں نے نباتات کھا کر گزارہ کیا اور اس سے اگلے روز انہیں کھانے کے لئے کچھ نہ میسر آیا۔ ان کے سفر کے دوران دلدلی علاقہ بھی آیا۔ اس دلدل سے نچلی سطح پر برف جمی ہوئی تھی اور یہ لوگ کسی قدر برف میں دھنس گئے اور جو کشتی انہوں نے اپنے ہمراہ رکھی تھی وہ بھی تباہی سے ہمکنار ہو گئی اور اس سے بھی دست برداری اختیار کرنی پڑی۔ کچھ مزید سفر طے کرنے کے بعد جب وہ دریا پر آن پہنچے...... بعد میں انہیں معلوم ہوا کہ یہ دریا کاپر مائن تھا...... ان کے پاس اس دریا کو عبور کرنے کی کوئی تدبیر موجود نہ تھی۔

صاف ظاہر تھا کہ ایک کشتی تیار کرنی تھی۔ لہٰذا آٹھ دن صرف کرتے ہوئے انہوں نے ایک کشتی تیار کی اور اس کے ذریعے دریا کو عبور کیا۔

ان لوگوں نے سوچا کہ ان کے مصائب اب ختم ہو چکے تھے لیکن حقیقت میں ایسا نہ تھا کیونکہ وہ ابھی بھی فورٹ انٹر پرائز سے 40 میل دور تھے۔

فرینکلن جانتا تھا کہ اس کی جماعت کے کچھ افراد اس قدر نقاہت اور کمزوری کا شکار ہو چکے تھے کہ وہ باقی ماندہ سفر طے کرنے سے قاصر تھے حتیٰ کہ ان کو خوراک میسر آ جائے۔ لہٰذا اسی وقت تین توانا افراد کو آگے روانہ کیا گیا تا کہ وہ قلعہ انٹر پرائز پہنچیں اور وہاں سے خوراک کا ذخیرہ لے کر دوبارہ جماعت سے آن ملیں۔

ہڈ کچھ زیادہ ہی نقاہت اور کمزوری کا شکار تھا۔ نباتات کھا کر اس کا معدہ بھی بگڑ چکا تھا۔ اس نے درخواست کی کہ اسے اسی مقام پر چھوڑ دیا جائے تا کہ وہ باقی لوگوں پر بوجھ نہ بن سکے۔ فرینکلن نے ہڈ کو اسی مقام پر چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور ایک خیمہ بھی اسے دیا تا کہ اسے سائباں میسر آ سکے۔ اس کے علاوہ اس نے ڈاکٹر رچرڈسن اور ہپ برن کو اس کی نگہداشت کیلئے اس کے پاس رہنے دیا۔ لیکن کئی دیگر افراد نے بھی استدعا کی کہ انہیں بھی اسی مقام پر چھوڑ دیا جائے۔ فرینکلن نے جب یہ سفر شروع کیا تھا اس وقت اس کے ہمراہ 19 افراد تھے۔ اب محض پانچ افراد ایسے تھے جو سفر جاری رکھ سکتے تھے۔

انتہائی کوشش اور جدوجہد سرانجام دینے کے بعد تین روز بعد بالآخر وہ فورٹ انٹر پرائز پہنچنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

"......ہمیں یہ دیکھ کراز حد مایوسی ہوئی اور افسوس بھی ہوا کہ ہمارا قلعہ انٹر پرائز پامال کیا جا چکا تھا۔ اس میں خوراک کا ذخیرہ بھی موجود نہ تھا اور انڈین کا بھی کوئی اتہ پتہ نہ تھا...... مسٹر ونٹ زل کی جانب سے بھی کوئی خط موجود نہ تھا۔ اس وقت ہمارے جو احساسات تھے ان کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں...... جماعت کے تمام افراد کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو چکی تھیں۔ نہ صرف ہم بدقسمتی کا شکار ہو چکے تھے بلکہ وہ افراد جن کو ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے وہ بھی بدقسمتی کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔"

تاہم بیک نے ایک مختصر پیغام چھوڑا تھا جس کے ذریعے مطلع کیا گیا تھا کہ اس نے انڈین کی تلاش شروع کر دی تھی۔ اس نے مزید تحریر کیا تھا کہ اگر وہ انڈین کو تلاش نہ کر سکا تب وہ فورٹ پراویڈنس کا رخ کرے گا تاکہ وہاں سے امداد حاصل کر سکے۔

فرینکلن بھی تھوڑی بہت سرگرمی کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔ اس نے بھی فورٹ پراویڈنس پہنچنے کی کوشش کا آغاز کیا۔ وہ اور اس کے ساتھی اس قدر کمزور ہو چکے تھے کہ ان کے سامنے سے قطبی ہرنوں کا ایک غول گزرا اور ان میں سے کوئی فرد بھی اس قابل نہ تھا کہ ان میں سے کسی ایک ہرن کو اپنی گولی کا نشانہ بنا سکتا۔ کوئی فرد بندوق اٹھانے کے بھی قابل نہ رہا تھا۔

29 تاریخ کو ڈاکٹر رچرڈسن اور ہپ برن اچانک قلعہ انٹر پرائز واپس پہنچ گئے۔ وہ المناک خبر لے کر آئے تھے۔ وہ آٹھ افراد جو پچھلے کیمپ میں ہی ٹھہر گئے تھے ان آٹھ افراد میں سے محض یہ افراد ہی زندہ بچے تھے۔ ہڈ کو انڈین نے ہلاک کر ڈالا تھا۔ انہوں نے ایک اور شخص کو ہلاک کر ڈالا تھا اور اس کو چٹ کر گئے تھے۔ رچرڈسن نے اپنا دفاع سرانجام دیتے ہوئے ایک انڈین کو گولی کا نشانہ بنا دیا تھا۔ رچرڈسن بھی قلعہ انٹر پرائز کی حالت زار دیکھ کر از حد صدمے سے دوچار ہوا حالانکہ وہ انتہائی تجربہ کار واقع ہوا تھا۔

یکم نومبر کو جماعت کے مزید دو افراد موت سے ہمکنار ہو گئے اور جماعت کے افراد کی تعداد محض چار رہ گئی۔

7 نومبر کو فرینکلن ڈاکٹر رچرڈسن اور ہپ برن لکڑیاں کاٹنے کے لئے باہر نکلے۔ ابھی انہوں نے بمشکل اپنا کام شروع ہی کیا تھا کہ انہیں تین انڈین اپنی جانب بڑھتے ہوئے دکھائی دیے۔ ان انڈین کو جارج بیک نے بھیجا تھا۔ ان انڈین نے جماعت کے افراد کو کھانا فراہم کیا اور ان لوگوں کی توانائی بحال ہوئی۔ 16 نومبر تک انڈین کی مدد اور تعاون کے باعث وہ فورٹ انٹر پرائز چھوڑنے کے قابل ہوئے۔ 11 دسمبر کو وہ فورٹ پراویڈنس پہنچ چکے تھے اور اکتوبر 1822ء تک وہ انگلستان واپس پہنچ چکے تھے۔

اگرچہ فرینکلن شمال مغربی راستے کو تلاش نہ کر سکا تھا لیکن اس کے باوجود بھی دیگر کئی کامیابیاں اس کے حصے میں آئی تھیں۔

1825ء میں فرینکلن نے دوبارہ اسی مہم پر جانے کی خواہش ظاہر کی۔ اس مرتبہ اس نے بحریہ اور مرچنٹ سروس سے کچھ رضا کار اپنے ہمراہ لئے۔ اس مرتبہ وہ دریائے میکنزی کے ذریعے قطب شمالی سمندر تک پہنچا۔ اس نے دو کشتیاں روانہ کیں تاکہ دریائے میکنزی اور کاپر مائن کے درمیان ساحل کا نقشہ تیار کر سکیں جبکہ بذات خود وہ مغرب کی جانب روانہ ہوا تاکہ اس جانب کا نقشہ بھی تیار کر سکے۔ لیکن دھند اور برف کی وجہ سے اس کا کام متاثر ہوا۔ لیکن اس کے باوجود بھی ساحل کے 340 میل کا نقشہ تیار کیا جا چکا تھا بیشتر اس کے کہ سردی کی شدت اسے واپس پلٹنے پر مجبور کرتی۔ میکنزی اور کاپر مائن کے درمیان 500 میل ساحل کا نقشہ رچرڈسن اور کینڈال نے بخوبی تیار کر لیا تھا۔ مختصر یہ کہ فرینکلن نے اپنی دوسری مہم

کے دوران کینیڈا کے قطب شمالی کے آدھے ساحل کا نقشہ تیار کر لیا تھا۔

کینیڈین قطب شمالی کے شمال۔ مشرقی کنارے نے مہم جو حضرات کیلئے انتہائی مسائل کھڑے کئے تھے۔ اس مقام پر لاتعداد جزیرے موجود تھے۔ اس کے علاوہ برف کے تودے لگاتار رو بہ حرکت رہتے تھے اور موسم کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے تھے اور سال بہ سال بھی تبدیلی عمل میں آتی رہتی تھی۔ تین مہم جو راس 1830ء...... بیک 1834ء...... اور تھامس سمپسن 1839ء مغرب کی جانب راستہ تلاش کئے بغیر چینل میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ کنگ ولیم جزیرہ خشکی کے ذریعہ بوتھیا سے باہم روابط تھا۔

سمندر ایک سال میں محض دو ماہ تک کے لئے جہاز رانی کے قابل تھا اور اس دوران بھی برف کے تودے جہاز کی راہ میں حائل رہتے تھے۔ وہ ہوا جو جہاز کو دھکیلتی تھی وہی ہوا برف کے تودوں کو بھی اس کے اردگرد دھکیلتی تھی۔ سردی بھی ناقابل برداشت تھی۔ اس مقام پر مہم جوئی کیلئے کافی مقدار میں خوراک کا ذخیرہ ہمراہ رکھنا پڑتا تھا۔

1844ء میں رائل جغرافیائی سوسائٹی نے یہ درخواست کی کہ ایک مرتبہ پھر شمال۔ مغربی راستے کے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش سرانجام دی جانی چاہئے۔ لہٰذا دو بحری جہاز اری بس اور ٹیرر اس مہم کے لئے تیار کئے گئے۔ سرجیمز راس نے کمان کے فرائض سرانجام دینے سے معذوری ظاہر کی لہٰذا سر جان فرینکلن کا تقرر کیا گیا...... اس وقت اس کی عمر 60 برس تھی۔ اس نے حکم صادر کیا کہ راس والکر کی جانب سفر طے کیا جائے اور مابعد آبنائے بیرنگ کا رخ کیا جائے۔ اگر آبنائے بارو میں برف رکاوٹ بنے...... تب اسے ولنگٹن چینل تک شمالی روٹ اپنانے کی کوشش کرنی تھی۔

جہازوں پر 36 ماہ کا راشن موجود تھا اور معقول افراد بھی موجود تھے۔ مئی 1845ء میں وہ انگلستان سے روانہ ہوئے۔ اس بارے میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ فرینکلن نے کون سا روٹ اختیار کیا تھا۔ یقیناً اس نے آبنائے بارو سے گزرتے ہوئے ولنگٹن چینل تک رسائی حاصل کی ہو گی۔

لیکن یہ روٹ چونکہ بہتر روٹ ثابت نہ ہوا لہٰذا وہ آبنائے بارو واپس لوٹ آیا اور اس کے بعد بیچنگ جزیرے پر واپس آ گیا تاکہ موسم سرما وہاں گزارا جائے۔

1846ء کے موسم سرما میں بھی صورت حال 1845ء کے موسم سرما جیسی تھی۔ راس والکر کے دائیں جانب سے سفر سرانجام دینے میں ناکام رہنے کے بعد فرینکلن نے بائیں جانب دریافت شدہ ایک چینل میں سفر طے کیا۔

وہ اس چینل سے جنوب کی جانب گزرا جو چینل جزیرہ پرنس آف ویلز اور بوتھیا کو جدا کرتی تھی...... اب آبنائے فرینکلن کہلاتی ہے......

لیکن برف کی وجہ سے اسے جزیرہ کنگ ولیم کے شمال مغرب میں رکنا پڑا۔ اس مقام پر اس جماعت نے 1846ء تا 1847ء کا موسم سرما گزارا۔

فرینکلن ایک اور موسم سرما برف میں مقید رہ کر نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ آبنائے وکٹوریہ سے محض ایک سو میل کے فاصلے پر تھا اور یہ وہی ساحل تھا جسے اس نے بذات خود 24 برس بیشتر اپنی پہلی مہم کے دوران دریافت کیا تھا۔

جب موسم گرما کا آغاز ہوا تو جماعت پر اس کی اپنی صورت واضح ہوئی...... جہاز برف میں دھنس چکے تھے...... راشن بھی کم پڑ چکا تھا......

انہوں نے جہازوں سے کنارہ کشی اختیار کی اور مہذب دنیا کی جانب واپسی کا سفر بذریعہ خشکی طے کرنے کا فیصلہ کیا۔

حکام کو فرینکلن کی جانب سے کوئی خبر موصول نہ ہو رہی تھی۔ پہلے پہل حکام نے کسی تشویش کا اظہار نہ کیا لیکن مابعد حکام اس کی جانب

سے تشویش میں مبتلا ہوئے۔ حکام کو یہ تشویش لاحق ہوئی کہ کہیں فرینکلن بھی اسی مقام پر برف میں مقید نہ ہو گیا ہو جس مقام پر پاری کو مقید ہونا پڑا تھا۔ لہٰذا جلد ہی اس منصوبے پر غور کیا جانے لگا کہ جہازوں کو تیار کیا جائے تا کہ وہ فرینکلن کی مدد کو پہنچیں۔

1848ء سے گم شدہ جہازوں کی بازیابی کیلئے مہم جو روانہ ہوتے رہے۔ اس طرح قطبی تحقیق و تفتیش میں ایک انقلاب برپا ہوا۔ اس وقت تک سی بورن کی مہم نے کافی زیادہ کام سرانجام دیا تھا۔ اگر ایک چینل برف کی وجہ سے بند ہوتی تو وہ دوسری چینل کی راہ لیتے۔ تاہم اب وقت انتہائی قیمتی تھا اور ہر ایک برفانی چینل کی پڑتال ضروری تھی کیونکہ جس چینل میں اس موقع پر برف کی موٹی تہہ جمی تھی عین ممکن تھا کہ اس وقت اس چینل میں برف کی تہہ کی بجائے پانی رواں دواں ہو اور ہو سکتا تھا فرینکلن وہاں پہنچا ہو۔ ساحل سمندر کے ہر ایک میل کی پڑتال ضروری تھی تا کہ کوئی نہ کوئی آثار یا ریکارڈ میسر آ سکے۔ یہ کام محض چھوٹے چھوٹے گروپ سرانجام دے سکتے تھے جن کے پاس راشن اور ضروری ساز و سامان موجود ہو۔

چھ ماہ تک فرینکلن کی تلاش جاری رہی۔ لیکن دونوں جہازوں کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ 1853ء کے موسم خزاں میں ہڈسن بے کمپنی کے ڈاکٹر رے نے وہ آبنائے دریافت کی جس کا نام اس کے نام پر رکھا گیا اور یہ ثابت کیا کہ کنگ ولیم لینڈ ایک جزیرہ تھا۔ اس علاقے کے آبائی باشندوں سے اس کے علم میں یہ بات آئی کہ چھ برس پیشتر 40 یورپی باشندے اس مقام پر دیکھے گئے تھے اور اس سرزمین پر کئی ایک لاشیں بھی دیکھی گئی تھیں۔ اس داستان کی اس وقت تصدیق ہو گئی جبکہ اسکیموؤں نے اس جماعت کی کچھ بچی کھچی اشیاء ڈاکٹر رے کے ہاتھ فروخت کیں۔ مابعد پتھروں کا ایک ڈھیر دیکھا گیا۔ پتھروں کے اس ڈھیر کے نیچے درج ذیل تحریر پڑی تھی:۔

''28 مئی 1847ء...... جہاز اری بس اور ٹیرر برف میں دھنس گئے تھے...... 1845ء اور 1846ء کی سردیاں بیچی آئی لینڈ ...... سر جان فرینکلن مہم کی سربراہی کے فرائض سرانجام دے رہا ہے...... سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ دو افسران اور چھ افراد پر مشتمل جماعت بروز سوموار 24 مئی 1847ء کو جہاز سے روانہ ہوئی''۔

جی ایم مور...... لیفٹیننٹ

ایک اور لکھائی میں درج ذیل تحریر بھی موجود تھی:۔

''25 اپریل 1848ء...... ٹریز اور اری بس نامی جہازوں سے 22 اپریل کو کنارہ کشی اختیار کر لی گئی تھی۔ افسران اور عملہ...... 105 نفوس پر مشتمل...... کیپٹن ایف۔ آر۔ ایم کے زیر کمان اس مقام پر پہنچا۔ سر جان فرینکلن 11 جون 1847ء کو موت سے ہمکنار ہو گیا تھا...... موت کی وجہ سے اب تک پانچ افسران اور عملے کے 15 افراد کا نقصان اٹھانا پڑا ہے۔''

جیمز فرجیمز

کپتان اری بس

جزیرے کے انتہائی مغربی جانب دو ڈھانچے دریافت ہوئے تھے۔ انہوں نے گھڑیاں بھی باندھ رکھی تھیں۔ اس کے علاوہ کوئی قابل ذکر چیز دریافت نہ ہو سکی۔

......❀......

چاٹ موس کی لڑائی

ریلوے کے دور کی داستانوں میں ایک داستان یہ بھی ہے کہ جارج اسٹفن سن نے کس طرح چاٹ موس بوگ کے آر پار ریلوے لائن بنائی جبکہ وہ لیور پول اور مانچسٹر ریلوے لائن بنا رہا تھا۔ اسٹفن سن کے اس منصوبے کا اس دور کے ماہرین نے تمسخر اڑایا جس کے تحت وہ موس کے پار ریلوے لائن بچھانا چاہتا تھا۔

لیور پول اور مانچسٹر ریلوے پہلی ریلوے تھی جو مسافروں کے علاوہ بار برداری کے مقاصد کی تکمیل کیلئے بنائی گئی تھی۔ اگرچہ اس کی تعمیر کا بڑا مقصد مانچسٹر اور لیول پول کے درمیان مال کی نقل وحمل سرانجام دینا تھا۔ 19 ویں صدی کی پہلی چوتھائی کے دوران مانچسٹر میں تیار مال کی پیداوار میں ازحد اضافہ دیکھنے میں آیا تھا بالخصوص کپاس......لیکن سمندری راستے سے مال کی نقل وحمل کا نظام اس قدر بہتر نہ تھا کہ دونوں قصبوں کے طاقت ور کاروباری مفادات ریلوے کے متقاضی تھے۔

جارج اسٹفن سن نے بذات خود ترقی کی منازل طے کی تھی...... بذات خود تعلیم حاصل کی تھی......اور شاک ٹن اور ڈارلنگٹن کی ریلوے کی تعمیر 1821ء میں سرانجام دے چکا تھا اور 1824ء میں اسے لیور پول اور مانچسٹر کے درمیان ریلوے کا سروے سرانجام دینے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی......اس مقصد کیلئے 400,000 پونڈ کی رقم کا تخمینہ لگایا گیا تھا جو کہ بعد میں ناکافی ثابت ہوئی تھی۔

اس ریلوے کی تعمیر کی مخالفت سرانجام دی گئی۔ دو حلقے اس مخالفت کی سرانجام دہی میں پیش پیش تھے...... کینال کمپنیاں اور زمین کے مالکان......زمین کے مالکان زیادہ ناراض تھے۔ اس سروے سے ارل آف ڈربی ...... لارڈ اسٹفن اور ڈیوک آف برج واٹر کی زمینیں متاثر ہوتی تھیں۔ ان افراد نے اسٹفن سن اور اس کے عملے کو اپنی زمینوں پر کام کرنے کی اجازت فراہم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اپنے آدمی اور مزارعین کو یہ تلقین کی تھی کہ وہ ڈنڈے کے زور پر ان لوگوں کو ان کی زمینوں سے دور رکھیں۔ انہوں نے اسٹفن سن کو یہ دھمکی بھی دی کہ اگر اس نے کام جاری رکھا تو اسے تالاب میں ڈبو کر ہلاک کر دیا جائے گا۔ برج واٹر نے کافی دہشت پھیلائی تھی۔ اس نے سروے پارٹی کے سروں کے اوپر سے گولیاں برسائی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس ریلوے لائن کے سروے کا کام خطرے میں پڑتا دکھائی دینے لگا۔

اسٹفن جس نے اس وقت ثبوت پیش کرنے تھے جبکہ لیور پول اور مانچسٹر بل ہاؤس آف کامن کی کمیٹی کے سامنے 1825ء پیش ہونا تھا ......بل کے مخالفین نے اسے اپنے حملے کا نشانہ بنایا۔ اس کے منصوبے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا گیا......اس کے منصوبے کی تضحیک کی گئی اور یہ کہا گیا کہ منصوبہ ایک ناقابل عمل منصوبہ تھا۔

ڈیوک آف برج واٹر کی نمائندگی کرنے والی کونسل نے کہا کہ:۔

"یہ منصوبہ ایک ناقابل عمل منصوبہ تھا.....اس منصوبے کا خالق ایک پاگل شخص کے سوا کچھ نہ تھا۔اسے اس منصوبے کے فنی پہلوؤں کا کوئی علم نہ تھا اور وہ فنی علم سے بے بہرہ تھا۔"

اس بل پر کافی لے دے ہوتی رہی۔ بالآخر کمیٹی نے اس بل کو نظر انداز کر دیا۔لیکن ریلوے لائن کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی رہی۔اس کے بعد اس بل کے حمائتوں نے ایک اور بل پیش کر دیا۔اس مرتبہ انہوں نے یہ دانش مندی کی تھی کہ تعلیم یافتہ سروئیر مقرر کئے تھے اور ساتھ یہ یقین دہانی بھی کروائی تھی کہ اس تعمیر کی وجہ سے مقامی زمینداروں کی زمینیں متاثر نہ ہوں گی اور متبادل راستہ اختیار کیا جائے گا۔کسی قدر مخالفت کا سامنا کرنے کے بعد بالآخر یہ بل منظور ہو گیا۔

اسٹفن سن نے چونکہ یہ کہا تھا کہ وہ اس لائن کی تعمیر سرانجام دے سکتا تھا لہٰذا اس تعمیر کی ذمہ دار کمپنی نے پہلا کام یہ کیا کہ اسٹفن سن کو چیف انجینئر مقرر کیا اور اس کا مشاہرہ 1000 پونڈ سالانہ مقرر کیا گیا۔اسٹفن سن ہی وہ واحد شخص تھا جو اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکتا تھا اگرچہ کمیٹی میں اس پر کافی زیادہ الزامات عائد کئے گئے تھے۔لیکن انگلستان کا کوئی بھی شخص ریلوے کے علم اور تجربے میں اس سے بڑھ کر مہارت کا حامل نہ تھا۔

اسٹفن سن نے اس "ناممکن" کام کو ممکن کر دکھانے کا بیڑہ اٹھایا اور فوری طور پر اپنے کام کا آغاز کر دیا۔

اس نے جون 1826ء میں چاٹ موس کی صفائی کا کام شروع کر دیا۔لوگ بچ بچا کر کام کر رہے تھے کہ کہیں دلدل میں نہ دھنس جائیں کیونکہ یہ دلدلی علاقہ تھا۔

چاٹ موس پر کام اڑھائی برس تک جاری رہا۔ 1828ء میں اس کام کی رپورٹ پیش کی گئی۔ کمپنی کام کی سست رفتاری سے خائف تھی۔ اس دوران اسٹفن سن کا معاون دلبرداشتہ ہو چکا تھا۔لہٰذا کمپنی نے ایک خصوصی اجلاس طلب کیا تا کہ یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ کیا مزید کام جاری رکھا جائے یا ترک کر دیا جائے۔

یہ اجلاس چاٹ موس میں منعقد ہوا۔محض اسٹفن سن ہی ایک ایسا شخص تھا جس کو کامیابی کا یقین تھا۔موجود اسکیم سے دست بردار ہونا اور کسی نئے روٹ کو تلاش کرنا زیادہ نقصان کا باعث ثابت ہو سکتا تھا۔لہٰذا کمپنی کے بورڈ نے یہ فیصلہ کیا کہ کام کو جاری رکھا جائے۔وہ اسٹفن سن کی پُر اعتمادی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے تھے۔

بالآخر اسٹفن سن کی کوششیں رنگ لانے لگیں۔اس دوران یہ افواہیں گردش کرنے لگیں کہ اس تعمیر کے دوران سینکڑوں گھوڑے اور افراد دلدل میں دھنس چکے تھے اور اسٹفن سن بذات خود دلدل میں دھنسنے سے بال بال بچا تھا۔لہٰذا تعمیر کا کام آخری ہچکی لے رہا تھا۔

یہ افوائیں وہ لوگ اڑا رہے تھے جن کا روزگار اس ریلوے لائن کی تعمیر سے متاثر ہو رہا تھا۔ان افواؤں کے جواب میں اسٹفن سن نے یہ اعلان کیا کہ وہ 15 ستمبر 1830ء کو یہ ریلوے لائن ٹریفک کیلئے کھول دے گا۔چاٹ موٹ منصوبے پر جو لوگ کام کر رہے تھے وہ محنتی اور جفاکش لوگ تھے۔یہ لوگ ریلوے لائنوں کی تعمیرات کا کام سرانجام دیتے تھے اور پُرکشش تنخواہوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔یہ لوگ ان دیہاتی آبادی سے خائف رہتے تھے جن دیہاتوں سے یہ ریلوے لائن گزرتی تھی اور اس کی تعمیر کا کام جاری تھا۔

لیور پول اور مانچسٹر ریلوے ایک عظیم کامیابی تھی۔ اس کے بعد بہت سی ریلوے لائنوں کی تعمیر کی منصوبہ بندی سرانجام دی گئی۔ وہ لوگ جنہوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ بھاپ سے چلنے والے انجن کے شور شرابے کی بدولت لوگ خوفزدہ ہو جائیں اور اردگرد کی آبادی چھوڑ چھاڑ کر بھاگ نکلیں گے...... یہ علاقے کے اردگرد پھیلی گھاس کو تباہ و برباد کرنے کا باعث ثابت ہوگا اور زمین تعمیراتی مقاصد کے لئے استعمال ہونے کے قابل نہیں رہے گی وغیرہ۔ وغیرہ...... ان لوگوں کی پشین گوئیاں غلط ثابت ہوئیں اور وہ اپنا منہ لے کر رہ گئے۔ بلکہ اردگرد کی زمینوں کی قیمتوں میں اضافہ دیکھنے میں آیا اور ریلوے لائن سے نزدیک واقع مکانات مہنگے داموں فروخت ہوئے۔

لارڈ ڈربی اور لارڈ اسٹفن جو اپنی زمینوں سے ریلوے لائن گزارنے کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور جنہوں نے اسٹفن کو مجبور کیا تھا کہ وہ اسے چاٹ موس کے بدترین علاقے سے گزارے...... اب وہ اپنا راگ تبدیل کر چکے تھے اور وہ جلد ہی ایک ایسے منصوبے کی حمایت کرتے نظر آ رہے تھے جس کے تحت ایک اور ریلوے لائن مانچسٹر اور لیور پول کے درمیان بچھانے کا ارادہ تھا...... اب ان کی یہ شرط تھی کہ یہ لائن ان کی جائیداد میں سے گزرے۔

وہ جو کیرولین نامی بحری جہاز کی تباہی کے بعد بچ نکلے

کیرولین نامی بحری جہاز کی تباہی کے بعد جو افراد بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے تھے ان کی تعداد گیارہ تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح ساحل پر پہنچنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

بچ نکلنے والے ان افراد میں کیپٹن فریزر اور اس کی بیوی گریس بھی شامل تھی۔ کیرولین نامی بحری جہاز لندن سے سڈنی جا رہا تھا۔ وہ وہاں پر آباد ان آبادکاروں کے لئے راشن اور دیگر سامان لے جا رہا تھا جو قابل سزا ٹھہرائے گئے تھے اور تعزیری قرار دیے گئے تھے۔ ان دنوں کوئینز لینڈ نیو ساؤتھ ویلز کا ایک حصہ تھا...... اس وقت اس علاقے کی تحقیق و تفتیش سرانجام نہیں دی گئی تھی اور اس علاقے میں قدیم وحشی قبائل آباد تھے۔ کیپٹن فریزر یہ جانتا تھا کہ خلیج مورٹن پر تعزیری قرار دیے گئے لوگ آباد تھے جہاں پر آج کل برسبن واقع ہے...... اس نے یہ کبھی نہیں سنا تھا کہ اس آبادی کے قریب تر سفید فاموں کی بھی کوئی آبادی موجود تھی۔

لہٰذا وہ اپنے بچے کھچے لوگوں کے ہمراہ ویران ساحل پر مقیم ہو گیا۔ ان حالات میں ان لوگوں کی بقا اور سلامتی کے روشن مواقع موجود نہ تھے۔ ساحل پر خوراک عدم دستیاب تھی۔ ان کا زیادہ تر گزارہ مچھلی پر ہوتا تھا اور ناریل کا درخت بھی خال خال دکھائی دیتا تھا۔

یہ تکلیف دہ اور تھکا دینے والی پیش قدمی تھی۔ ملاح خشکی کے عادی نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ مسلسل پیش قدمی کے عادی ہوتے ہیں۔ جہاز پر نظم و نسق برقرار رکھنا آسان ہوتا ہے۔ خشکی پر نظم و نسق برقرار رکھنا ایک مختلف معاملہ ہے۔ کپتان فریزر بمشکل ان بچ نکلنے والے افراد میں نظم و نسق برقرار رکھنے میں کامیاب ہوا تھا۔

اسے اپنے نائب کپتان کی معاونت حاصل تھی۔ اس کا نام ناتھن گاڈبولڈ تھا۔ اس کے علاوہ اسے جہاز کے ترکھان سٹینڈش کی معاونت بھی حاصل تھی۔ لیکن چھ ملاح گاور...... اسمتھ ...... اسحاق...... گلبرٹن...... ٹرنر اور روچ اپنی قسمت پر گلہ شکوہ کرتے نظر آتے تھے۔ اس جماعت کا دسواں رکن جو کیرولین پر ایک مسافر کی حیثیت سے سوار تھا اور وہاں پر ایک مصنف کی حیثیت سے گورنر کے دفتر میں شامل ہونے کا متمنی تھا...... وہ اس صورت حال کی سنگینی سے بے خبر تھا جس صورت حال سے وہ سب لوگ دوچار تھے۔ لیکن وہ کیپٹن فریزر کا حکم بجا لاتا تھا اور ہر معاملے میں اس کے حکم کی تعمیل کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

کیپٹن فریزر کی ہمت اور جرأت کو اس کی بیوی کی ہمت اور جرأت نے جلا بخشی تھی۔ گریس فریزر ایک کسان کی دختر تھی اور یارک شائر سے آئی تھی۔ وہ بھیڑ بکریاں چرانے میں اپنے باپ کی مدد سرانجام دیتی تھی۔ وہ کیرولین پر سوار کسی قسم کے خوف و خطرے سے بے نیاز رہی تھی۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی وہ کسی قسم کے خوف سے عاری رہی تھی جب جہاز طوفان کی نذر ہوا تھا۔ ساحل کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے اس جماعت کی پیش قدمی کو

جاری وساری رکھنے میں اس کی ہمت اور جرأت کا بہت بڑا عمل دخل تھا۔ وہ اس دوران ان کو گانے سناتی تھی اور حتیٰ کہ رقص بھی سرانجام دیتی تھی تاکہ ان کے جذبے جوان رہیں۔

لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے ان کے جذبے ماند پڑتے گئے۔ وہ علیل ہو گئے...... خوراک کا حصول مشکل تھا اور طویل اور ویران ساحل پر دور دور تک آبادی کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔

انہوں نے انسانی زندگی کی ایسی علامات دیکھیں جنہوں نے انہیں دہلا کر رکھ دیا...... چٹانوں کے درمیان پڑی ہوئی انسانی کھوپڑی...... کسی آبائی باشندے کا ریت پر پڑا ہوا تیر...... تب ایک رات انہوں نے دور کہیں ڈھول پیٹنے کی آواز بھی سنی۔ وہ جان چکے تھے کہ وحشی قدیم باشندے ان سے زیادہ دوری پر نہ تھے۔

کیپٹن فریزر جانتا تھا کہ اپنے خوف وخطرات اپنے دل برداشتہ اور دل شکستہ ساتھیوں سے چھپانے فضول تھے۔ جب اس نے اس خیال کا اظہار کیا کہ عین ممکن تھا کہ قدیم باشندے ساحل پر ان کی موجودگی سے باخبر ہونے سے قاصر رہیں تب گاڈبولڈ نے اپنے سر کو جنبش دی اور ٹرنر نے کہا کہ وہ ان قدیم باشندوں کو ان سے زیادہ جانتا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق وہ ساحل پر ان کی موجودگی سے بے خبر نہیں رہ سکتے تھے...... بالخصوص وہ اپنے نزدیک سفید فام لوگوں کی موجودگی سے ہرگز بے خبر نہیں رہ سکتے تھے۔

اس کا خیال بالکل درست تھا۔ ڈھول پیٹنے کی آواز زیادہ شدت اختیار کر چکی تھی اور وہ حیران رہ گئے جب سیاہ فام لوگوں کا ایک گروہ چٹانوں کے عقب سے اچانک نمودار ہوا۔ وہ اپنے نیزے ہوا میں لہرا رہے تھے اور دہشت سے دوچار کر دینے والے انداز میں سفید فاموں کی جانب بڑھ رہے تھے۔

ان لوگوں سے بچاؤ ممکن نہ تھا۔ اپنا دفاع سرانجام دینے کی کوئی سبیل موجود نہ تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جو سفید فام بھی ان سیاہ فاموں کے ہاتھوں اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا وہ خوش قسمت ہو گا۔ یہ قدیم باشندے کسی اچھی شہرت کے حامل نہ تھے اور انسانی زندگی کی قدروقیمت سے بھی آگاہ نہ تھے۔

سیاہ فام جس چیز میں حد سے زیادہ دلچسپی لے رہے تھے وہ سفید فاموں کے لباس تھے۔ انہوں نے زبردستی سفید فاموں کے لباس ان کے جسموں سے اتروا لئے۔

لیکن مسز فریزر نے پرزور احتجاج کیا اور کپڑے اتارنے سے انکار کر دیا۔ بالآخر انہوں نے اس کے جسم پر ایک آدھ کپڑا رہنے دیا۔

اس کے بعد سیاہ فام اپنے قیدیوں کو ہانکتے ہوئے اپنے دیہات کی جانب چل دیے۔ یہ ایک لمبی پیش قدمی تھی۔ تھکے ماندے سفید فاموں کو بڑے بے دردی کے ساتھ تیز تیز چلنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔

یہ لوگ دیہات میں پہنچ چکے تھے۔ یہاں پر درخت کی شاخوں اور پتوں سے جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ سفید فاموں کو علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ ان کی نگرانی اس قدر سخت تھی کہ فرار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا...... یہ انکشاف مسز فریزر نے کیا تھا جس نے یہ داستان بیان کی تھی۔

اگلے چند روز تک یہ قدیم باشندے اپنے گیارہ سفید فام قیدیوں پر تشدد کرتے ہوئے اور انہیں ہلاک کرتے ہوئے اپنے آپ کو خوشی سے دو چار کرتے رہے۔ انہوں نے ایک ایک کر کے اپنے گیارہ قیدیوں کو اپنے تشدد کا نشانہ بناتے ہوئے ہلاک کر ڈالا تھا۔

گریس فریزر بھی یہ جانتی تھی کہ اس کی باری بھی اب دور نہ تھی۔ اس جماعت میں وہ واحد عورت تھی۔ وہ اپنے آپ کو کسی بھی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار کر چکی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ ان سیاہ فاموں پر یہ ثابت کر دے کہ وہ کسی خوف کا شکار نہ تھی۔

آخر وہ رات بھی آن پہنچی تھی جس رات گریس فریزر کی باری تھی۔ اس کو اس جھونپڑی سے نکالا گیا جس میں اسے باندھا گیا تھا اور اسے سیاہ فاموں کے ہجوم میں لایا گیا جو دائرہ بنائے کھڑے تھے۔ انہوں نے اپنے چہروں پر سرخ رنگ کیا ہوا تھا۔ ان کے عین درمیان میں ایک کھمبا تھا جس پر ہنوز ایک سفید فام کی لاش جھول رہی تھی۔ وہ پہچان نہ سکی کہ یہ لاش اس کے کس ساتھی کی تھی۔

اس نے بعد میں بتایا کہ:۔

"ایک لمحے کے لئے میرا دل دھڑکنا بھول چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب موت کے منہ میں جانے کی میری باری تھی۔"

اس کے بعد اس کی مایوسی غصے میں تبدیل ہو چکی تھی جب اس نے یہ دیکھا کہ وہ جس شخص کو کھینچ کر لا رہے تھے وہ اس کا خاوند تھا۔

مسز فریزر نے کہا کہ:۔

"وہ اسے کھینچتے ہوئے دائرے میں میرے قریب تر لے آئے...... چار سیاہ فام ہاتھوں میں نیزے لئے اس کے سر پر کھڑے تھے...... اس وقت مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ مجھے اس لئے یہاں پر لائے تھے کہ میں اپنی آنکھوں سے اسے ہلاک ہوتا ہوا دیکھ سکوں۔"

ایک لمحے کے لئے دونوں میاں بیوی کی آنکھیں چار ہوئیں۔ مسز فریزر نے کوشش کی کہ اس کی جانب ایک مسکراہٹ اچھالے تا کہ اس کا حوصلہ بڑھے۔ اس نے اپنے ہاتھ اپنے کانپتے ہوئے ہونٹوں پر رکھے تا کہ اسے اپنا آخری بوسہ روانہ کر سکے۔

مابعد کیپٹن فریزر منہ سے چیخ نکالے بغیر موت سے ہم آغوش ہو گیا اور اس کے اس عمل در آمد کی وجہ سے اس کی بیوی کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔

وہ جانتی تھی کہ یہ لوگ "بہادر" کے لیے کیا الفاظ استعمال کرتے تھے۔ لہٰذا اس نے با آواز بلند اس لفظ کو بار بار دہرایا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے خاوند کی لاش کی جانب بھی اشارہ کرتی رہی۔

کچھ لمحات تک خاموشی طاری رہی۔ یہ جاہل سیاہ فام بہادری کو عظیم خصوصیات میں سے ایک خاصیت تصور کرتے تھے۔ اور وہ اسی خصوصیت یعنی بہادری کو کیپٹن فریزر اور اس کی بیوی میں بخوبی دیکھ چکے تھے جس کو انہوں نے ابھی ابھی بیوہ کیا تھا۔

ان سیاہ فاموں کے سردار نے اچانک اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور چلاتے ہوئے اپنی زبان میں کچھ کہا جس کے جواب میں گریس فریزر کو واپس اس کی تنگ و تاریک جیل میں لے جایا گیا...... مضبوطی کے ساتھ باندھا گیا اور اندھیرے میں اکیلا چھوڑ دیا گیا۔

دن گزرتے گئے...... تجسس بھرے دن...... غموں اور فکروں کے حامل دن...... روتے ہوئے اور مایوسی کی حالت میں گزرتے چلے گئے۔

اسے جب اپنے خاوند کی ہلاکت کا منظر یاد آتا اور وہ منظر بھی اس کی نگاہوں میں گھوم جاتا جس کے تحت اس کے خاوند کو ہلاکت سے دوچار کیا گیا تھا تو وہ بے اختیار رونے لگ جاتی۔ حیرانگی کی بات یہ تھی کہ وہ ان سیاہ فاموں کے بارے میں اس نکتہ نظر کی حامل تھی کہ وہ بے چارے غیر مہذب اور وحشی مخلوق تھے جو اچھائی اور برائی کی تمیز سے عاری تھے اور وہ نفرت کی بجائے رحم دلی کے مستحق تھے۔

ایک دن جب وہ اس کے پاس آئے اس وقت دیہات میں کافی شور برپا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ اس شور شرابے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ تین ملاح کسی نہ کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

ایک مرتبہ پھر وہ اسے اس بڑے دائرے میں گھسیٹ لائے جو رات کے وقت ان سیاہ فاموں نے بنا رکھا تھا۔ دائرے کی صورت میں کھڑے یہ سیاہ فام چیخ چلا رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ ڈھول پیٹے جا رہے تھے۔ سیاہ فاموں کے اس دائرے کے عین وسط میں جو کھمبا نصب تھا اس پر ایک سفید فام کی لاش جھول رہی تھی۔ اس مرتبہ جو لاش مسز فریزر نے دیکھی تھی وہ جارج بک لینڈ کی لاش تھی...... وہ ایک کلرک تھا اور کیرولین میں عازم سفر ہوا تھا تاکہ سڈنی کے گورنر کے دفتر میں اپنے فرائض سرانجام دے سکے۔ وہ مسٹر بک لینڈ کو پسند کرتی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس نے بھی انتہائی بہادری کے ساتھ موت کو گلے لگایا ہوگا۔

اسے بھی اس دائرے کے وسط میں لایا گیا...... اسے یقین ہو چکا تھا کہ موت کو گلے سے لگانے کی اب اس کی باری تھی۔ وحشی موسیقی آہستہ آہستہ دم توڑ چکی تھی اور وہ لمحہ آن پہنچا تھا جبکہ نیزے کا پہلا وار اس کے جسم میں پیوست ہونا تھا۔

اس لمحہ...... جبکہ وہ وحشی خاموش تھے اور دائرے بنائے کھڑے اس کے خون کے انتظار میں تھے...... اس لمحے اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔

وہ آگے کی جانب جھک گئی اور اپنے بازو باہر نکلتے ہوئے اس نے با آواز بلند گانا شروع کر دیا۔

سفید فام عورت کو گاتے سن کر سیاہ فام بالکل خاموش ہو چکے تھے جیسے اس نے پہلے کبھی گانا گایا نہ ہو۔ اس وقت تک وہ جتنے بھی گانے گا چکی تھی وہ تمام کے تمام اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔

اس کے بعد اس نے رقص کرنا شروع کر دیا...... وہ رقص جو وہ اپنی اوائل جوانی میں کرتی تھی جبکہ وہ وحشی خاموش کھڑے اسے دیکھتے جا رہے تھے۔ اس نے گانے گائے اور رقص کیا حتیٰ کہ وہ تھکن سے چور ہوگئی اور دائرے کے عین وسط میں بے حال ہو کر گر پڑی۔

وہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ ابھی نیزہ اس کی پشت میں پیوست ہوگا۔ اگرچہ اس نے ایک بہتر پرفارمنس کا مظاہرہ کیا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ اس کی یہ پرفارمنس اس کی موت کو نہ ٹال سکتی تھی۔

لیکن انہوں نے فی الحال اس کی جان بخشی کر دی تھی۔ اسے دوبارہ اس کی جھونپڑی میں واپس لایا گیا۔ وہ اپنی جھونپڑی میں پڑی یہ سوچتی رہی کہ نہ جانے اس کے ساتھ کیا معاملہ پیش آئے گا۔

اس دوران وہ وحشی ان ملاحوں کو دوبارہ گرفتار نہ کر سکے تھے جو فرار ہونے میں کامیاب ہو چکے تھے...... ان میں سٹان ڈش...... گلبرٹن اور

ٹرز شامل تھا۔ یہ لوگ خلیج مورٹن پہنچنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ جب انہوں نے گریڑن کمانڈر کو اپنی داستان سنائی تو اس نے لیفٹیننٹ اوٹر اور کچھ سپاہ کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ سفید فام قیدیوں کو سیاہ فام وحشیوں کی قید سے رہائی دلائیں اور سیاہ فام وحشیوں کو عبرت ناک سزا دیں۔

ایک روز جبکہ گریس فریزر اپنے قید خانے میں پڑی کانپ رہی تھی...... وہ ابھی تک اپنے مقدر کے بارے میں تجسس کا شکار تھی...... اس نے باہر انتہائی شور شرابے کی آوازیں سنیں۔ کچھ دنوں سے وہ محسوس کر رہی تھی کہ شاید اس کی ذات کے بارے میں ان وحشیوں میں بحث مباحثہ جاری تھا۔ اب جبکہ شور شرابہ شدت اختیار کرتا جا رہا تھا اور اس کی جھونپڑی کے نزدیک تر محسوس ہو رہا تھا...... اس نے سوچا کہ بالآخر فیصلہ کن گھڑی آن پہنچی تھی...... اور اس کے مقدر میں بھی ہلاکت لکھی جا چکی تھی۔

تب ان وحشیوں کی آوازوں کے ساتھ اسے انگریزوں کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ان آوازوں میں سفید فاموں کی بھی آوازیں شامل تھیں وہ با آواز بلند چلائی تا کہ اپنی موجودگی کا احساس دلا سکے۔ کسی نے ٹھوکر مار کر دروازہ کھولا اور جلد ہی وہ ایک برطانوی سپاہی کے مضبوط بازوؤں کی گرفت میں تھی۔

ان کے اس مقام سے روانگی سے قبل...... لیفٹیننٹ اوٹر نے انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اس دیہات کے سردار اور سفید فاموں کی ہلاکت میں حصہ لینے والے دیگر سیاہ فاموں کیلئے سزائے موت تجویز کی جن پر کیپٹن فریزر اور چھ سفید فاموں کی ہلاکت کا الزام تھا۔ اس کے بعد دیہات کو آگ لگا دی گئی اور اس دیہات کی بقایا آبادی جنگل کی جانب بھاگ نکلی۔

فروری 1837ء کو گریس فریزر سڈنی پہنچ چکی تھی۔ اس کا ایک ہیروئن کی طرح استقبال کیا گیا تھا...... اس کے بعد وہ انگلستان کے لئے عازم سفر ہوئی۔ وہ جس جہاز میں سفر طے کر رہی تھی وہ جہاز کیپٹن گرین کی زیر کمان تھا۔ وہ اور گرین ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے اور انہوں نے کیپ ٹاؤن میں شادی رچالی۔

وہ لندن پہنچ چکی تھی...... اس کے پاس اپنی ہمت و جرأت اور اپنی مہم کے بارے میں بتانے کے لئے ایک داستان موجود تھی۔ لیکن بجائے اس کے کہ اس کے آبائی وطن میں اس کی جرأت اور بہادری کی داد دی جاتی اسے محض اس لئے تنقید کا نشانہ بنایا گیا کہ اس نے اپنے خاوند کی ہلاکت کے فوراً بعد دوسری شادی رچالی تھی۔

گریس ڈارلنگ

1815ء اپنے اختتام کو پہنچنے کے قریب تھا...... اس دوران گریس ھور سلے ڈارلنگ ...... ایک ایسی لڑکی 23 برس بعد جس کا نام ایک ہیروازم کی علامت بن گیا تھا نے جنم لیا تھا۔ اس نے اپنی نانی نانا کے گھر میں جنم لیا تھا جو بیم برگ دیہات میں مقیم تھے جو نارتھمبرین ساحل پر واقع تھا جہاں پر اس کا نانا جاب ھور سلے باغبانی کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ ڈارلنگ فیملی کا حقیقی گھر براؤنز مین میں واقع تھا اور اپنی بیٹی کی پیدائش سے کئی ہفتے قبل ولیم ڈارلنگ بھی اسی مقام پر مقیم ہو چکا تھا۔ لہٰذا گریس کا بچپن اسی مقام پر گزرا تھا اور وہ سمندر سے محبت کرتی ہوئی پلی بڑھی تھی۔ سمندر بھی اس پر مہربان تھا اور وہ ڈارلنگ فیملی اور ان کے ہمسایوں کی گزر بسر کے اسباب فراہم کرتا تھا۔ وہ لوگ ماہی گیر تھے اور سخت محنت اور جانفشانی سے کام کرتے تھے اور خطرات سے کھیلتے رہتے تھے۔ یہ لوگ کشتیوں کے ذریعے مچھلیاں پکڑتے تھے۔ وہ اس کام میں اپنی پوری مہارت صرف کرتے تھے۔ اس کے باوجود بھی اگر ان کی کشتی سمندر کی طوفانی لہروں کی زد میں آ جائے یا بادِ مخالف کی زد میں آ جائے یا کسی اور سانحہ کا شکار ہو جائے تب یہ لوگ قسمت کے رحم و کرم پر ہوتے تھے اور اس سانحہ کو خدا کی مرضی تصور کرتے ہوئے صبر و شکر سے کام لیتے تھے۔ ان کی عورتیں بھی خدا کی رضا میں راضی رہنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ اس کے باوجود بھی بہت سے خاندان اپنے پیاروں کے ڈوب جانے کے صدمے سے دوچار تھے۔ لیکن وہ کبھی بھی کسی بھی قسم کا شکوہ اپنی زبان پر نہ لائے تھے۔

گریس ایک خوبصورت بچی تھی۔ وہ اپنے بھائیوں سے قدرے مختلف واقع ہوئی تھی۔ وہ جوں جوں عمر کے مدارج طے کرتی گئی توں توں وہ کھانسی اور نمونیے کے علاوہ سردی سے لگنے والی دیگر بیماریوں کا شکار ہوتی چلی گئی۔ اگرچہ اس کی ماں اسے گھریلو ٹوٹکے استعمال کرواتی رہتی تھی جو کہ آزمودہ بھی تھے اور کارگر بھی تھے۔ اس کے بارے میں یہ قیاس کیا جاتا کہ وہ تپ دق جیسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو چکی تھی...... ایک ایسی بیماری جو جلد ہی اسے موت سے ہمکنار کرنے کے لئے کافی تھی۔ 19 ویں صدی کے ابتدائی دورانیے کے دوران ابھی طب نے اتنی ترقی سرانجام نہیں دی تھی اور طبی علوم سے زیادہ واقفیت حاصل نہ تھی لہٰذا معالج حضرات بیماری کے ابتدائی مدارج میں اس کی تشخیص سرانجام دینے اور مناسب علاج معالجہ سرانجام دینے سے قاصر تھے۔ اس لئے اس وقت یہ بیماری ہلاکت سے دوچار کرنے والی بیماری تصور کی جاتی تھی اور کوئی اس بیماری کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔

چونکہ گریس اکثر سردی لگنے کا شکار رہتی تھی لہٰذا وہ براؤنز مین کے دیگر بچوں کے ہمراہ پرائمری اسکول جانے سے بھی قاصر رہی اور ان کے ہمراہ کھیل کود میں حصہ لینے سے بھی قاصر رہی۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ دس برس کی عمر تک پہنچتے تک وہ ایک خاموش طبع بچی بن چکی تی...... اس کی زندگی میں محض ایک ہی دلچسپی کا عمل دخل تھا...... اور وہ دلچسپی تھی سمندر...... سمندر اس کی دلچسپی کا محور تھا۔ مسز ڈارلنگ ایک بہترین خاتون خانہ تھی۔ لہٰذا

اس نے اپنی بیٹی کو اس کی چھوٹی عمر میں ہی گھریلو کام کاج میں ماہر بنا دیا تھا۔ اسے یہ سکھا دیا تھا کہ صفائی ستھرائی کیسے کرنی تھی..... کھانا کیسے تیار کرنا تھا ..... گھریلو ساز و سامان کی چھوٹی موٹی مرمت کیسے سرانجام دینی تھی ..... اور گھریلو کام کاج میں کس طرح ہاتھ بٹانا تھا۔ اگرچہ گریس گھریلو امور کو سیکھنے اور گھریلو امور سرانجام دینے میں دلچسپی رکھتی تھی لیکن وہ اکثر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوتی تھی اور سمندر کے پانی کو گھورنے لگتی تھی۔

اس کی ماں اسے پکارتے ہوئے کہتی تھی کہ:۔

''گریس..... تم کس خوابوں کی دنیا میں بستی ہو! کیا تم بھول چکی ہو کہ تم نے جلانے کیلئے لکڑی لانی تھی یا انڈے اکٹھے کرنے تھے یا دروازہ بند کرنا تھا۔''

لڑکی جلد ہی اپنے آپ کو قصوروار تصور کرنے لگتی اور اپنی ماں کے حکم کی تعمیل سرانجام دینا شروع کر دیتی۔ لیکن جب کبھی بھی اسے قدرے فرصت نصیب ہوتی وہ فوراً کھڑکی میں بھاگ جاتی اور سمندر کی جانب دیکھنا شروع کر دیتی۔ اگر دن خوشگوار ہوتا تب وہ گرم ملبوسات زیب تن کرتی اور اس جگہ کا رخ کرتی جس جگہ کو چٹانوں کے درمیان اس نے اپنے بیٹھنے کے لئے مخصوص کر رکھا تھا اور اپنی اس مخصوص جگہ سے وہ سمندر کا نظارہ کرتی۔

گریس کا جغرافیے کے بارے میں علم نہ ہونے کے برابر تھا لیکن یہ بڑے بڑے جہاز اسے بھلے دکھائی دیتے تھے اور وہ یہ جاننے کی مشتاق رہتی تھی کہ ان کا رخ کس بندرگاہ کی جانب تھا..... ان کی منزل مقصود کون سی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ان جہازوں نے ان دور دراز کے مقامات پر جانا تھا جن کا ذکر وہ کہانیوں میں سنا کرتی تھی..... ان حیران کن مقامات پر جانا تھا جہاں پر گرما گرم سورج بادلوں سے عاری آسمان سے نیچے جھانکتا تھا۔

جب سمندر بپھرا ہوا ہوتا اور طوفانوں کی زد میں ہوتا تب گریس اپنی کھڑکی سے سمندر کے تیور دیکھتی۔ کبھی کبھار موسم اس قدر خراب ہوتا کہ سمندر میں کوئی کشتی نظر نہ آتی۔ موسم کے تیور بھی بدلتے رہتے تھے۔ کسی لمحے آسمان پر سیاہ بادل چھائے دکھائی دیتے تھے اور دوسرے ہی لمحے سورج بادلوں کی اوٹ سے جھانکنے لگتا تھا اور اپنی سنہری کرنیں زمین پر بکھیرنے لگتا تھا۔ سمندر کا طوفان بھی جس قدر سرعت کے ساتھ آتا تھا اسی قدر سرعت کے ساتھ ختم ہو جاتا تھا۔ وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار آتا تھا اور ہوا کے گھوڑے پر سوار واپس چلا جاتا تھا۔

وقت گزرتا چلا گیا اور مسز ڈارلنگ اپنی بیٹی کی سمندر کے ساتھ انتہائی وابستگی دیکھ کر فکرمند ہوتی رہی۔ وہ اکثر یہ کہا کرتی تھی کہ نوجوانی کی سرحدوں کو چھوتی ہوئی کسی لڑکی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ چٹانوں پر بیٹھ کر یا اپنے گھر کی کھڑکی سے سمندر کا نظارہ کرنے میں اپنا بہت سا قیمتی وقت ضائع کرے۔ مسٹر ڈارلنگ بھی اپنی بیوی کے خیالات سے متفق تھا۔ وہ کتابیں پڑھنے کا شوقین تھا۔ لہٰذا وہ با آواز بلند کتابیں پڑھ کر اپنی بیٹی کو سنانے لگا۔ گریس بھی ذہانت سے بھرپور سوالات کرتی تھی۔ لیکن اسے جب بھی موقع ملتا وہ سمندر..... سمندر کی لہروں کے بارے میں باتیں شروع کر دیتی تھی۔

اس کا باپ اس سے سوال کرتا تھا کہ:۔

''تم ان چیزوں کے بارے میں اتنا کچھ جاننے کا اشتیاق کیوں رکھتی ہو؟''

گریس انتہائی اطمینان کے ساتھ جواب دیتی کہ:۔

''میں نہیں جانتی۔''

وہ اکثر یہ خواہش کرتی کہ کاش وہ ایک لڑکا ہوتی تب سمندر سے اس کے لگاؤ پر کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو پہلے ہی سمندر سے وابستہ پیشے کیلئے تیار کر رہی تھی۔ اس کے والد نے اسے چپو سے کشتی چلانا سکھا دی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے بار بار یہ یاددہانی بھی کروائی جاتی تھی کہ اسے بنیادی طور پر گھر میں مقیم رہنا چاہیے اور گھریلو کام کاج میں دلچسپی لینی چاہیے۔

چند ماہ بعد ولیم ڈارلنگ کو نئے لونگ اسٹون لائٹ ہاؤس کا نگران مقرر کر دیا گیا اور اس کے اہل خانہ اس نئے گھر میں منتقل ہو گئے۔ گریس اس اونچی لمبی عمارت کو پسند کرتی تھی اور ٹاور بیس کے نزدیک رہائشی کمرے کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھی جس کی کھڑکیوں سے وہ اپنے محبوب سمندر کا نظارہ کر سکتی تھی۔ اس کا چھوٹا بھائی ولیم غیر سرکاری معاون نگران کے فرائض سرانجام دیتا تھا...... اس وقت تک اس کی عمر 17 برس ہو چکی تھی۔ وہ اپنے باپ کے کام کاج میں بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگی تھی۔

بچپن میں گریس سمندری طوفانوں کو دیکھ کر خوش ہوتی تھی اور لطف اندوز ہوتی تھی جو کہ یک دم شدت اختیار کر جاتے تھے۔ اب وہ ان طوفانوں کی وجہ سے پریشان ہو جاتی تھی اور سہم جاتی تھی اور خوف وہراس کا شکار ہو جاتی تھی اور وہ ان افراد کے لئے دعا گو ہو جاتی تھی جو سمندر پر موجود ہوتے تھے اور صبح وہ کھڑکی سے جھانکنے سے خوفزدہ رہتی تھی کہ کہیں طوفان کی تباہی کے مناظر اس کی نظروں کے سامنے نہ آ جائیں۔

گریس ہمیشہ اپنے اہل خانہ کیلئے ناشتہ تیار کرتی تھی اور 6 ستمبر کو وہ جب ناشتہ تیار کرنے کیلئے اٹھی تو اس کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ آئندہ چوبیس گھنٹے اس کی زندگی میں کس قدر اہم ہوں گے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ نوجوان ولیم چند دنوں سے سمندر سے نزدیک ایک دیہات میں مقیم تھا۔ لہٰذا دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد مسٹر ڈارلنگ لیمپ روم میں چلا آیا جبکہ گریس اور اس کی ماں اپنے گھریلو امور نپٹا رہی تھیں۔ بعداز دوپہر گریس کپڑے استری کر رہی تھی جبکہ اس کا باپ کمرے میں داخل ہوا اور کہنے لگا کہ ایک بڑے طوفان کی آمد آمد تھی۔

گریس نے سہمی ہوئی نگاہوں کے ساتھ اپنے باپ کی جانب دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ موسم کے بارے میں اس کے باپ کی پیشین گوئی ہمیشہ درست ثابت ہوتی تھی اور اب اگر وہ کسی طوفان کی پیشین گوئی کر رہا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ طوفان ضرور آئے گا۔ اس کے باوجود بھی اس نے یہ محسوس کیا کہ اسے اپنے باپ کے ساتھ اس سلسلے میں کچھ بحث مباحثہ سرانجام دینا چاہیے۔ لہٰذا اس نے اپنے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"ابا جان...... یقیناً طوفان نہیں آئے گا۔ کیونکہ چند لمحے پیشتر سورج نے بادلوں کے پیچھے سے جھانکنے کی کوشش کی تھی۔"

جوں ہی وہ یہ بات مکمل کر سکی اسی دوران اسے بارش کے برسنے کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی اسے تند وتیز ہوا کے چلنے کا شور بھی سنائی دیا۔ مسٹر ڈارلنگ کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی تھی۔ پانچ منٹ کے اندر اندر اس قدر اندھیرا چھا چکا تھا کہ انہیں اپنا تیل کا لیمپ روشن کرنا پڑا اس کا باپ لیمپ روم میں واپس چلا آیا اور گریس کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی لیکن اندھیرا اس قدر بڑھ چکا تھا کہ اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بادل اس قدر جھکے ہوئے تھے کہ اندھیرا چھا چکا تھا اور بارش اس قدر تیز تھی کہ اسے سمندر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

باہر اس اندھیرے میں "فارفار شائر" نامی بحری جہاز طوفان کی زد میں تھا۔ اس جہاز کا کپتان جان ھمبل ایک تجربہ کار کپتان تھا اور اسے اپنے جہاز پر بھی از حد ناز تھا جس میں 90 ہارس پاور کے دو انجن نصب تھے۔ بدقسمتی سے جہاز کا بوائلر کسی نقص کا شکار ہو چکا تھا۔ بندرگاہ سے روانہ

ہونے کے فوراً بعد اس میں کسی قسم کا نقص منظر عام پر آیا تھا اور اب جہاز طوفان کی زد میں بھی آ چکا تھا۔ طوفان جب شدید تر صورت اختیار کر گیا تب سمندر کا پانی جہاز میں گھس آیا اور جہاز کا انجن روم پانی سے بھر گیا۔ اب اسے اپنے جہاز کو آگے دھکیلنے کے لئے بادبان کا سہارا لینا تھا۔ اگرچہ وہ ساحل اور ساحل کے خطرناک مقامات سے بخوبی آگاہ تھا لیکن آدھی رات کے وقت طوفان بادو باراں اس قدر شدید تھا کہ لونگ اسٹون لائٹ اسے نظر نہ آ رہی تھی اور یہ ہی ایک ایسی چیز تھی جو اس کے جہاز کو بچا سکتی تھی۔

جہاز کنٹرول سے باہر نکل چکا تھا۔ اس جہاز میں مسافروں کے علاوہ سامان تجارت بھی لدا ہوا تھا۔ اس جہاز پر کل 63 افراد سوار تھے۔

7 ستمبر کی صبح سوا چار بجے یہ جہاز ایک چٹان سے جا ٹکرایا۔

جہاز پر سوار عورتوں اور مردوں نے اپنی جانیں بچانے کی جدوجہد سرانجام دینی شروع کر دی۔ چٹان اس قدر پھسلن کی حامل تھی کہ لوگوں کی اکثریت اس سے پھسل کر سمندر کے یخ بستہ پانی میں جا گری۔ جہاز پر سوار محض 14 افراد زندہ بچ سکے تھے۔

گریس کو اس سانحے کی خبر ہو چکی تھی۔ اس کو لوگوں کی چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لہٰذا اس نے لیمپ روم کا رخ کیا۔

اس نے اپنے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:۔

''وہاں کچھ لوگ کسی حادثے کا شکار ہو چکے ہیں''

اس کے باپ نے جواب دیا کہ:۔

''تم احمق ہو...... تم تصورات کی دنیا میں آباد ہو...... اگر ایسے طوفان میں جہاز تباہی سے ہمکنار ہو تب کسی کے زندہ بچنے کے کوئی امکان باقی نہیں رہتے''۔

اس نے اصرار کرتے ہوئے کہا:۔

''لیکن میں نے ان کی آوازیں سنی ہیں''

مسٹر ڈارلنگ نے اسے اجازت فراہم کی کہ وہ دن کا اجالا ہونے پر اس کھڑکی میں کھڑے ہو کر باہر دیکھے اور صحیح صورت حال کا اندازہ لگائے۔ جب دن کا اجالا پھیلا تب گریس کو تباہ شدہ جہاز کا اگلا حصہ دکھائی دیا اور اس کے ساتھ چمٹے ہوئے لوگ بھی کسی قدر نظر آئے۔

گریس چلا اٹھی کہ:۔

''بیچارے لوگ...... ابا جان ہمیں ان لوگوں کی مدد کرنی چاہیئے۔''

اس کے باپ نے سادگی سے پوچھا کہ:۔

''کیسے؟ طوفان اس قدر بدتر ہے کہ اتنا بدتر طوفان پہلے کبھی نہ آیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں شمالی سنڈرلینڈ لائف بوٹ سے رابطہ نہیں کر سکتا...... اور اگر میں کسی نہ کسی طرح رابطہ کر بھی لوں تو وہ تباہ شدہ جہاز تک نہیں پہنچ سکتے۔''

گریس نے کہا کہ:۔

''ہمیں ان کی مدد کو ضرور پہنچنا چاہیئے''

اس کے باپ نے جواب دیا کہ:۔

''ہم اس خراب موسم میں کس طرح ان کی مدد کو پہنچ سکتے ہیں''

گریس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں اور وہ کہنے لگی کہ:۔

''ہمیں ضرور ان کی مدد کیلئے روانہ ہونا چاہیئے''

وہ بار بار یہی فقرہ دہراتی رہی۔ اس کا باپ بالآخر رضامند ہوگیا۔ مسز ڈارلنگ بھی ان کی مدد کو تیار ہوگئی۔ انہوں نے اپنی کشتی سمندر میں اتارنے کی تیاری کی اگرچہ یہ کشتی ہوا کی شدت کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔

یہ کشتی چار چپوؤں سے چلائی جاتی تھی۔ ولیم ڈارلنگ دو چپو سنبھال کر کشتی کے درمیان میں بیٹھ گیا جبکہ اس کے عقب میں گریس نے دو چپو سنبھال لئے۔ یہ سفر ایک خطرناک سفر تھا۔ ڈارلنگ ایک مضبوط اور توانا شخص تھا لیکن وہ بھی دقت کا شکار تھا۔ بالآخر وہ منزل مقصود تک جا پہنچے لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ چٹان پر کیسے اترا جائے۔

اس موقع پر بھی گریس نے جرأت اور بہادری کا مظاہرہ کیا اور مسٹر ڈارلنگ کی ہر ممکن مدد کی اور بالآخر تباہ شدہ جہاز کے پانچ افراد اپنی کشتی میں سوار کرنے میں کامیاب ہوچکے تھے۔ کشتی پر اس کی استطاعت سے بڑھ کر بوجھ پڑ چکا تھا۔ لہٰذا انہیں لونگ اسٹون واپس جانا تھا اور اس کے بعد بقایا چار افراد کو لانے لئے دوبارہ واپس پلٹنا تھا۔ خوش قسمتی سے کشتی پر سوار ہونے والے افراد میں سے دو افراد ملاح تھے۔ وہ چپو چلا سکتے تھے اور یہ ایک معجزہ تھا کہ وہ تمام لوگ بخیریت واپس پہنچ چکے تھے۔

مسز ڈارلنگ نے ہر چیز تیار کر رکھی تھی۔ ان لوگوں کو گرم کمبل مہیا کیے گئے......ان کو کھانا کھلایا گیا اور تین روز تک ان کی انتہائی نگہداشت سرانجام دی گئی۔ 4 تاریخ کو طوفان اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا اور مسٹر ڈارلنگ ان زندہ بچ جانے والے خوش قسمت افراد کو لے کر حکام بالا کے سامنے پیش ہوا کیونکہ اسے اس معاملے کی سرکاری رپورٹ بھی پیش کرنا تھی۔ اس رپورٹ میں اس نے گریس کے کارنامے کا کوئی ذکر نہ کیا اور جب وہ رپورٹ پیش کرکے لونگ اسٹون واپس آیا تب اس کے اہل خانہ اپنی روزمرہ زندگی میں مصروف ہوگئے۔ ان کے نزدیک یہ معاملہ اب ختم ہوچکا تھا۔

لیکن زندہ بچ جانے والے خوش قسمت افراد یہ چاہتے تھے کہ ان کے بچ جانے کی تفصیل منظر عام پر آنی چاہیئے۔ جلد ہی یہ خبر دور دور تک پھیل گئی۔ ایک فنڈ کا اجراء کیا گیا اور اس فنڈ میں ملکہ وکٹوریہ نے بھی 50 پونڈ عطیہ دیا۔ رائل سوسائٹی برائے انسانی ہمدردی اور رائل نیشنل لائف بوٹ انسٹی ٹیوٹ نے گریس اور اس کے باپ کو تمغے پیش کیے اور اخبارات کے رپورٹر لونگ اسٹون کی جانب بھاگنے لگے......وہ بالخصوص گریس سے ملنے کے متمنی تھے۔ ڈارلنگ خاندان اپنی اس شہرت سے پریشانی کا شکار تھا......وہ لوگ اس بات پر اصرار کر رہے تھے کہ انہوں نے محض اپنا فرض پورا کیا تھا لیکن لوگوں کی دلچسپی ان میں بڑھ رہی تھی۔ تمام تر دنیا سے لوگ اس مقام کا رخ کر رہے تھے اور گریس کو لاتعداد تحائف وصول ہو رہے تھے اور خطوط بھی موصول ہو رہے تھے جن میں اس کی جرأت کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہوتا تھا جبکہ اس کے کچھ مداح اس سے درخواست کر رہے تھے کہ وہ انہیں

اپنے بالوں کی ایک لٹ روانہ کرے۔

لیکن افسوس کہ گریس اس قدر خوشی برداشت نہ کر سکی اور وہ بستر سے جا لگی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک ہسپتال میں زیر علاج رہی لیکن ڈاکٹر اس کی بیماری کا سراغ نہ لگا سکے۔ لہٰذا وہ واپس بمبرگ آن پہنچی جہاں پر 1842ء میں اس نے اس مکان میں وفات پائی جس میں اب ڈاکخانہ قائم ہے۔ اس وقت اس کی عمر 26 برس تھی۔ جوانی کی موت کسی المیے سے کم نہیں ہوتی۔ اس نے جو شہرت کمائی تھی وہ اس کے بریک ڈاؤن کا باعث ثابت ہوئی۔

مسٹر کراسٹر...... نارتھمبرلینڈ کا لارڈ لیفٹیننٹ...... اس نے لندن کے ایک معروف پارک میں اس کی یاد میں ایک درخت لگایا۔ وہ درخت ہنوز قائم ہے اور لوگ اب بھی گریس ڈارلنگ عجائب گھر کا رخ کرتے ہیں جو 1983ء میں بمبرگ میں قائم کیا گیا تھا۔ لیکن اس بہادر ترین خاتون کی بہترین یادوہ اشتہار تھا جو دی ٹائمز میں شائع ہوا تھا۔ یہ اشتہار کچھ اس طرح تھا کہ:۔

"گریس ڈارلنگ کے بالوں کی ایک لٹ سونے کی ڈبیا میں محفوظ برائے فروخت ہے۔"

سراوک کا سفید راجا

بہت سے یورپی لوگ راجا کے بارے میں یہ تصور رکھتے ہیں کہ کسی ہندوستانی ریاست کا حکمران ...... یا کسی ہندوستانی صوبے کا حکمران ......لیکن یہ ایک ایسا خطاب ہے جو مشرق کے دیگر حصوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس مخصوص صورت حال کے تحت بورنیو سراوک صوبے کے حکمران کی نشاندہی کرتا ہے......ایک انگریز جس کا نام سر جیمز بروک تھا...... جس نے بورنیو کے سلطان کی گراں قدر خدمات سرانجام دی تھیں اور ان خدمات کے اعتراف کے طور پر 1841ء میں اسے اس خطاب سے نوازا گیا تھا۔

جیمز بروک انگریزوں کی اس نسل سے تعلق رکھتا تھا جن کے اندر مہم جوئی کا جذبہ ایک شعلہ بن کے جلتا رہتا ہے۔ اس نے 1803ء میں سمرسٹ کے مقام پر جنم لیا تھا۔ وہ ایک دولت مند زمیندار کا بیٹا اور اس کی جائیداد کا وارث تھا۔ اس کے خاندان کے کئی ایک رکن ایسٹ انڈیا کمپنی میں اپنی خدمات سرانجام دے چکے تھے۔ اسکول کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس کی بھی یہ خواہش تھی کہ وہ اسی کمپنی میں ملازمت کرے۔ لیکن اس نے اپنی فوجی تربیت مکمل کرنے کے بعد فوج کی ایک رجمنٹ میں کمیشن حاصل کر لیا۔ 1825ء میں وہ عازم ہندوستان ہوا اور ہندوستان میں اپنی آمد کے فوراً بعد اسے اپنی رجمنٹ کے ہمراہ وادی برہماپترا روانہ کر دیا گیا تا کہ وہ شاہ برما کے خلاف جنگ میں حصہ لے سکے جس کا نام باگی ڈا تھا۔

بھاگی ڈا کے جد امجد الانگ پایا نے 18 ویں صدی کے وسط میں برمی بادشاہوں کی آخری سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ وہ اور اس کے جانشین ہندوستان میں برطانوی حکومت کیلئے دردسر بنے رہے تھے۔ یہ بادشاہ لالچی تھے...... مغرور تھے اور ہندوستان کے سرحدی صوبوں کو اکثر اپنے حملوں کا نشانہ بناتے رہتے تھے۔ وہ وہاں کی فصلوں پر قبضہ کر لیتے تھے اور قصبوں اور دیہاتوں کی آبادی کو مجبور کرتے تھے کہ وہ ان کے ساتھ برما چلیں جہاں پر ان سے مشقت لی جاتی تھی اور ان کے کاہل مالکان عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اہل برطانیہ نے کافی حد تک صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا تھا اور وہ کئی برسوں تک ان برمی لوگوں کی حرکتوں کو برداشت کرتے رہے تھے لیکن جب شاہ بھاگی ڈا نے 1824ء میں قصداً چاچر کی سرحد عبور کی اور اپنی معمول کی لوٹ مار سرانجام دی تب گورنر جنرل نے ان کے خلاف کارروائی کرنے کے احکامات صادر کر دیے۔

جیمز بروک ایک فطری سپاہی تھا اور برما کے خلاف سخت ترین مہم سے اس نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ اس نے جنگل کی لڑائی کا مشکل ترین فن سیکھا۔ سب سے بڑھ کر یہ وہ ان لوگوں کے ذہنوں کو پڑھنے پر قادر ہو چکا تھا۔ وہ ان مشرقی لوگوں کے ساتھ مکمل طور پر باہم روابط ہو چکا تھا اور وہ اس نکتہ نظر کا حامل بھی بن چکا تھا کہ محتاط رہنمائی سرانجام دیتے ہوئے ان لوگوں کو مفید اور کارآمد زندگی بسر کرنے کے شعور سے نوازا جا سکتا تھا اور وہ اس کام کو سرانجام دینے میں حقیقی لطف محسوس کرتا تھا۔ لیکن وہ محتاط تھا۔ یہی وجہ تھی وہ اپنے اس نکتہ نظر کو اپنے ساتھی افسران کے علم میں نہیں لانا چاہتا تھا کیونکہ وہ لوگ ان آبائی باشندوں کو انسان سے کمتر مخلوق سمجھتے تھے۔

1826ء کے آغاز میں بروک نے رنگ پور کے نزدیک ایک گھمسان کی جنگ میں حصہ لیا تھا۔ اس لڑائی میں وہ اس قدر شدید زخمی ہوا تھا کہ اس کے روبصحت ہونے کے امکانات انتہائی کم تھے۔ وہ ایک مضبوط قوت ارادی کا حامل تھا اور یہ اس کی مضبوط قوت ارادی کا کرشمہ تھا کہ وہ موت کے منہ سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اسے انگلستان واپس بھیج دیا گیا تھا جہاں پر وہ آہستہ آہستہ روبصحت ہو رہا تھا۔ تین برس بعد وہ مکمل صحت یابی سے ہمکنار ہو چکا تھا۔ وہ اس بات پر مصر تھا کہ سمندر کی ہوا اس کا مکمل علاج سرانجام دے گی۔ لہٰذا وہ چین کے بحری سفر پر روانہ ہوگیا۔ اس کا یہ سفر ایک تفریحی سفر کی حیثیت کا حامل تھا اور اس سفر کے دوران اس نے کئی ایک جزیرے دیکھے جہاں پر لوگ آباد تھے۔ لیکن مغربی معیار کے مطابق وہ غیر مہذب اور وحشی تھے۔ بروک ان لوگوں اور ان لوگوں کی طرز زندگی کو جتنے قریب سے دیکھتا تھا اس کے اندر اتنا زیادہ جذبہ سر ابھارتا تھا کہ وہ ان لوگوں کو ان کے غیر مہذب اور وحشی پن سے نجات دلائے اور ان کو یہ باور کروائے کہ وہ اپنے قدرتی تحائف اپنی بہتری کے لئے استعمال میں لائیں۔

وہ اپنے مستقبل کے مکمل منصوبے کے ہمراہ انگلستان واپس لوٹ آیا۔ واپس پہنچنے پر اسے معلوم ہوا کہ اس کے والد کی صحت بگڑ رہی تھی اور اسے اپنی جائیداد کی دیکھ بھال سرانجام دینے کا فریضہ بھی سرانجام دینا تھا۔ بالآخر اس کا باپ انتقال کر گیا اور بروک اس کی جائیداد اور ریاست کا وارث ٹھہرا۔ اس نے ریاست کے مناسب انتظام وانصرام کا بندوبست کیا اور بذات خود 1838ء میں دوبارہ مشرق کیلئے روانہ ہوا۔ بالآخر وہ اپنی عظیم مہم پر روانہ ہو چکا تھا۔

وہ بورینو کے ساحل پر پہنچ چکا تھا جہاں پر راجا مداہاسم جو کہ حکمران سلطان کا چچا تھا...... وہ سراوک کے شمال' مغربی صوبے میں ڈیاک قبیلے کی بغاوت کچلنے میں مصروف تھا۔ یہ علاقہ گوریلا جنگ کے لئے موزوں تھا اور ڈیاک قبیلے کے لوگ گوریلا جنگ میں مصروف تھے۔ یہ علاقہ ایک طویل ساحل کا حامل تھا۔ باغی لوگ چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سوار حملہ آور ہوتے تھے اور پرامن آبادی کو اپنا نشانہ بناتے تھے جو وسطی میدان میں آباد تھے۔ اس میدان کے عقب میں گھنے جنگلات تھے اور اس مقام پر بھی ڈیاک قبیلے کے لوگوں کا پلہ بھاری تھا کیونکہ وہ جنگل میں لڑنے میں انتہائی مہارت کے حامل تھے۔ وہ دبلے پتلے مختصر جسامت کے حامل سخت جان لوگ تھے۔ وہ برق رفتاری کے ساتھ جنگل میں چھپ جاتے تھے۔ ان کا ہتھیار ''کرس'' تھا...... ایک خنجر جس کی دھار انتہائی تیز ہوتی تھی اور ان کو اس خنجر کو چلانے کی انتہائی مہارت بھی حاصل تھی۔ وہ ظالم لوگ تھے اور کسی بھی شخص کی طاقت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاتا تھا کہ اس نے دشمنوں کے کتنے سر قلم کئے تھے۔

مداہاسم اور اس کی سرکاری افواج اس وقت قابل رحم حالت کا شکار تھیں جبکہ جیمز بروک وہاں پہنچا تھا اور اپنے پہنچنے کے فوراً بعد اس نے اپنی خدمات پیش کر دی تھیں۔ اس نے اپنی امداد کی پیش کش اس وقت کی تھی جبکہ اس امداد کی فوری ضرورت محسوس کی جا رہی تھی لہٰذا راجہ نے امداد کی اس پیش کش کو فوراً قبول کر لی۔ اس موقع پر یہ امداد اس کے لئے بالکل ایسے ہی تھی جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا اگرچہ اسے حقیقی طور پر یہ یقین نہ تھا کہ ایک انگریز ڈیاک لوگوں سے نپٹ سکتا تھا۔ لیکن بروک برما کی جنگ میں حاصل کردہ تجربے کو نہیں بھولا تھا اور اس کے علاوہ جب وہ اپنے زخمی ہونے کی وجہ سے تادیر گھر میں پڑا رہا تھا اس وقت بھی وہ اپنے ذہن میں جنگل میں جنگ لڑنے کے مختلف کارگر طریقہ جات کے بارے میں سوچتا رہتا تھا اور غور وفکر

سرانجام دیتا رہا تھا۔ اب اس نے یہی طریقہ جات اتنی مہارت کے ساتھ عملی میدان میں لاگو کیے تھے کہ ایک ماہ کے اندر اندر وہ سرکاری افواج کے ایک بہترین رہنما کے طور پر منظر عام پر آیا تھا۔ مداہاسم اور اس کے کمانڈر بلاخوف وخطر اس کے احکامات کی تعمیل کرتے تھے اور اس بارے میں اس سے کوئی سوال نہ کرتے تھے۔ بروک نے اپنے آپ کے ساتھ بھی کوئی رعائت نہ برتی تھی۔ اس نے بھی وہاں کے آبائی باشندوں جیسا طرز زندگی اپنا لیا تھا۔ موسم گرما...... موسم برسات...... غرضیکہ ہر ایک موسم کے دوران وہ بے تھکان برسر پیکار اور روبہ عمل رہا تھا۔ اس نے اپنی نیند بھی اپنے فرض پر قربان کر رکھی تھی۔ وہ آبائی باشندوں جیسی خوراک کھاتا تھا اور ہر وقت چوکنا اور باخبر رہتا تھا تاکہ ہوشیار چالاک اور عیار دشمن کی ہر ایک چال کا منہ توڑ جواب دے سکے اور اسے ناکام بنا سکے۔ حتیٰ کہ اس نے ڈیاک کو اس پہاڑی علاقے میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا تھا جو بنجر اور ویران علاقہ تھا۔ اب ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ یا تو فاقہ کشی کے ہاتھوں ہلاک ہو جائیں یا پھر اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیں۔ انہوں نے ان دونوں انتخابات میں سے ایک انتخاب کرنا تھا۔ لہٰذا انہوں نے بروک کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا انتخاب کیا۔

اس تمام ترقصے کی غیر معمولی اور انہونی بات یہ تھی کہ انہوں نے اس عجیب وغریب انگریز کے خلاف غم وغصے یا نفرت کا اظہار نہ کیا تھا جس نے انہیں اس طرز جنگ میں شکست سے دوچار کیا تھا جس طرز جنگ میں وہ اپنے آپ کو برتر گردانتے تھے۔ مداہاسم بروک سے اس قدر خوش کہ اس کا شکریہ ادا کرتے نہ تھکتا تھا۔ وہ اس کا انتہائی ممنون تھا۔ اس نے صوبہ سراوک کا کنٹرول بروک کے حوالے کر دیا تھا اور اسے راجہ کے خطاب سے بھی نوازا تھا۔ 1841ء میں بورینو کے سلطان نے بھی اس کی منظوری دے دی تھی۔ اس وقت تک بروک علاقے میں بہتری کے کئی ایک اقدامات سرانجام دے چکا تھا۔ اس نے بالکل نئے قانون مرتب کیے تھے اور انتہائی کٹھن مرحلوں سے گزرتے ہوئے ڈیاک کو امن وامان کے ساتھ رہنے کے گُر سے بھی آشنا کیا تھا۔ پہلے پہلے وہ اپنی کرتوتوں سے باز آنے پر آمادہ نہ تھے لیکن مابعد انہوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ راجہ کا مؤقف درست تھا اور اگر وہ اس کی ہدائت پر عمل کرتے تو ان کی بقاو سلامتی کی ضمانت مہیا ہو سکتی تھی اور ان کی زندگی آرام سے بسر ہو سکتی تھی۔

اس وقت سروک ایک زرعی علاقہ تھا۔ اس علاقے میں چاول کے علاوہ دیگر اناج کی بھرپور فصل ہوتی تھی۔ لیکن ان فصلوں کا بیشتر حصہ ضائع ہو جاتا تھا کیونکہ ان اشیاء کی طلب کوئی خاص زیادہ نہ تھی۔ بروک نے کئی برس کی ان تھک کوشش کے بعد اس صوبے کی برآمدات کیلئے راہ ہموار کی۔ سراوک کی کئی ایک بندرگاہیں تھیں جہاں پر بہترین سہولتیں موجود تھیں اور اب ان بندرگاہوں پر بہت سی تجارتی کمپنیوں کے جہاز ٹھہرنے لگے تھے۔ اس کے نتیجے میں صوبہ کی معاشی حالت میں بہتری آئی تھی اور اناج ضائع ہونے سے بھی بچ گیا تھا۔ اب اس اناج کے بین الاقوامی خریدار دستیاب تھے۔

تجارتی ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ وہ بحری ڈاکو تھے جو جزیرے کی بندرگاہوں کو اپنا نشانہ بناتے تھے اور لوٹ مار کا بازار گرم رکھتے تھے۔ یہاں کے آبائی باشندے انہیں سمندری خانہ بدوشوں کے نام سے پکارتے تھے۔ حقیقت میں وہ چینی لوگ تھے لیکن نسل در نسل انہوں نے اسی مقام پر جنم لیا تھا اور اسی مقام پر رہائش اختیار کیے رکھی تھی اور اسی مقام پر موت سے ہمکنار ہوتے رہے تھے۔ لہٰذا وہ اس امر کو بھول چکے تھے کہ ان کا تعلق کس ملک سے تھا۔ وہ جو کچھ درکار رکھتے تھے وہ خوراک تھی اور وہ حصول مقصد کی خاطر جزیرے کی اجناس پر بلہ بول دیتے تھے۔ وہ رات کے

اندھیرے میں جہازوں کو بھی اپنی لوٹ مار کا نشانہ بناتے تھے۔ بروک کا خیال تھا کہ جب تک ان بحری ڈاکوؤں سے نہ نپٹا جائے اس وقت تک تجارتی ترقی کی راہیں مسدود رہیں گی اور تجارتی سرگرمیاں خاطر خواہ ترقی سے ہمکنار نہ ہو پائیں گی۔ لہٰذا اس نے ان کے خلاف ایک مہم تشکیل دی۔ اس مہم میں کئی ایک برطانوی بحری کمانڈروں کی خدمات بھی حاصل کی گئیں تھیں جن میں سربیری کیپل نمایاں تھا۔ 1845ء تک اس کی کوششیں رنگ لا چکی تھیں اور صورت حال قابو میں تھی۔ بروک ان لوگوں کی ذہنیت سے بخوبی واقف تھا۔ اور اس کی سوچ درست ثابت ہوئی کیونکہ 1847ء میں ان بحری ڈاکوؤں نے ڈیاک سے مدد اور تعاون حاصل کیا...... ان لوگوں نے ڈیاک کو دوبارہ آمادہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے پرانے ہتھکنڈوں پر لوٹ آئیں...... انہوں نے بورنیو کے دارالخلافے کا رخ کیا اور سلطان اور اس کی فوج پر چڑھائی کر دی۔ بروک نے امن وامان بحال رکھنے کے فوری اقدامات سرانجام دیے لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ معاملہ ختم نہ ہوا تھا بلکہ زیر زمین چلا گیا تھا۔

اسی برس اس نے برطانیہ کا ایک مختصر دورہ بھی کیا جہاں پر اس کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ برطانوی حکومت نے لابان کا جزیرہ سلطان سے خرید لیا تھا اور انہوں نے بروک کو اس جزیرے کا گورنر اور کمانڈر انچیف مقرر کر دیا۔ انہوں نے اسے بورنیو میں کونسل جنرل بھی مقرر کر دیا۔ نئے عہدوں کے حصول کے بعد وہ دوبارہ عازم مشرق ہوا۔ ڈیاک کے دو قبیلوں سیرابس اور سکورن نے اودھم مچا رکھا تھا۔ انہوں نے بحری ڈاکوؤں جیسا لائحہ عمل اختیار کر رکھا تھا اور بندرگاہوں اور جزیروں میں لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ بروک نے اپنی پوری قوت کے ساتھ 1849ء میں ان کے خلاف کارروائی کی اور اس دوران اس کی اپنے ہمسایہ سلطان آف سالا سے بھی دوبار ملاقاتیں کیں اور اس کے ساتھ باہمی گفت وشنید سرانجام دینے کے بعد وہ اس کے ساتھ ایک معاہدہ طے کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس معاہدے کے تحت اسے شرپسند قبائل کو اپنی سلطنت سے نکال باہر کرنا تھا اور بحری ڈاکوؤں کے خلاف قرار واقعی کارروائی سرانجام دینی تھی۔

1850ء تک بروک کو اپنی محنت کا صلہ ملنا شروع ہو چکا تھا۔ سراوک اب ایک بہتر ریاست کے طور پر منظر عام پر آئی تھی۔ بحری ڈاکو بھی منظر سے غائب ہو چکے تھے اور ڈیاک بھی مائل بہ بہتری تھے۔ اب مزید ترقی کی راہیں کھل چکی تھیں اور تجارت بڑھانے مواقع بھی میسر آ چکے تھے۔

اس کے بعد ایک غیر متوقع دھچکا لگا۔ 1851ء میں پارلیمنٹ کا ایک رکن جس کا نام جوزف ھیوم تھا اس نے ہاؤس آف کامن میں اپنی ایک تقریر کے دوران سر جیمز بروک پر کچھ الزامات عائد کئے۔ بروک نے دس برس بیشتر ایک قانون متعارف کروایا تھا جس کے تحت ہر ایک بالغ شہری کو حکومت کو سالانہ معمولی سا ٹیکس ادا کرنا ہوتا تھا جسے ہیڈ۔ ٹیکس کا نام دیا گیا تھا۔ یہ عمل درآمد برطانوی نوآبادیوں میں مروج تھا۔ جوزف ھیوم کی پشت پناہی کچھ اور ارکان بھی سرانجام دے رہے تھے...... اگرچہ وہ محتاط رویہ اپنائے ہوئے تھا اور واضح طور پر اور برملا یہ نہیں کہہ رہا تھا کہ بروک نے اس ہیڈ۔ ٹیکس کی رقم کا غبن کیا تھا اور اسے اپنے استعمال کے لیے مخصوص کر رکھا تھا لیکن اس نے اس قسم کے کئی اور الزامات بھی بروک پر عائد کئے۔

بروک اس کی تقریر سے اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ وہ فوری طور پر واپس انگلستان روانہ ہو گیا۔

جب وہ انگلستان واپس پہنچا تو پریس بھی اس ہنگامے میں شامل ہو چکا تھا اور اخبارات میں کئی ایک مضامین اور آرٹیکل چھپنے لگے تھے اور بروک کے حمائتیوں اور مخالفین کے بھی کئی ایک خطوط اخبارات میں شائع ہونے لگے تھے حالانکہ یہ لوگ بورنیو میں بروک کی سرگرمیوں سے مکمل طور پر

آ گاہ نہ تھے اور نہ ہی وہ ذاتی طور پر بروک کو جانتے تھے۔ جب سے اس نے انگلستان کی سرزمین پر قدم رکھا تھا اس وقت سے وہ اخباری نمائندوں کے محاصرے میں تھا جو اس سے انٹرویو کے متمنی تھے۔ لیکن بروک نے انہیں نظرانداز کر رکھا تھا۔ اس کی بجائے اس نے حکام سے رجوع کیا تھا اور ان سے درخواست کی تھی کہ اس معاملے کی غیر جانبدارانہ چھان بین کروائی جائے۔ کابینہ میں بحث مباحثے کے بعد یہ لائحہ عمل مرتب کیا گیا کہ ایک شاہی کمیشن قائم کیا جائے جو معاملے کی چھان بین سرانجام دے۔

متذکرہ کمیشن نے سنگاپور میں اپنی کارروائی کا آغاز کیا۔ بروک نے اپنی صفائی میں تمام شواہد مہیا کیے۔ اس نے سراوک اور لابان میں اپنی انتظامیہ کی مکمل تفصیلات بھی کمیشن کو مہیا کیں۔ اس کے مخالفین اپنے الزامات ثابت کرنے میں ناکام رہے۔

کمیشن نے اپنی رپورٹ میں بیان کیا کہ:۔

''سر جیمز بروک کے خلاف کیس ''ثابت نہیں کیا جاسکا''۔

کمیشن کی اس رپورٹ سے کئی ایک عوامی نمائندوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کمیشن کو بروک کی پاکدامنی پر شبہ تھا لیکن کمیشن اسے اس لئے سزا نہ دے سکا کیونکہ اس کو اس کے جرم کے شواہد مہیا نہ کئے گئے تھے۔ انگلستان میں بھی بروک کے حمائتوں اور مخالفین کے درمیان زبانی کلامی جنگ شروع ہو چکی تھی جس کے نتیجے میں حکام کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ وہ جزیرہ لابان کا نیا گورنر مقرر کر رہے تھے اور دوسری بات یہ کہ ہیڈ۔ ٹیکس بھی ختم کیا جا رہا تھا۔

اس وقت مقدمے کا مکمل سرکاری ریکارڈ معائنے کیلئے دستیاب نہ تھا...... اب اس ریکارڈ کا تسلی کے ساتھ معائنہ اور مطالعہ سرانجام دیا جا سکتا تھا...... لیکن ماہرین کی انتہائی کاوش کے باوجود بھی سر جیمز بروک کے خلاف بددیانتی اور غبن کے الزامات ثابت نہ ہو سکے تھے۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ اس کے خلاف عائد کئے گئے الزامات بے بنیاد تھے۔ وہ زندگی بھر ایمانداری کی راہ پر قائم رہا تھا اور اس نے بطور گورنر صوبے کی ترقی میں بھی نمایاں کردار سرانجام دیا تھا۔ اس کی ذاتی کوششوں کی بدولت غیر مہذب اور وحشی لوگ ایک منظم زندگی کے دھارے میں شامل ہوئے تھے۔

ان حالات میں یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ جوزف ھیوم اور اس کے ساتھیوں نے بروک پر الزامات کیوں عائد کئے تھے؟

اس کا صحیح جواب تو الزام لگانے والے ہی دے سکتے تھے...... لیکن ان الزامات کی بنیادی وجہ یہی نظر آتی تھی کہ کچھ لوگ بروک سے حسد کرتے تھے۔ یہ لوگ بورنیو اور اس کے اردگرد کے جزیروں میں اپنے مفادات کے حامل تھے۔ وہ ایک ایسے مضبوط شخص کو کس طرح برداشت کر سکتے تھے جو اپنے منصوبوں میں کسی مداخلت کو پسند نہ کرتا تھا اور اس کے منصوبے سراوک کی بہتری کی ضمانت تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ان لوگوں کو اپنا دشمن بنا لیا تھا جو ذاتی مفاد کے حصول کے خواہاں تھے۔ ملکہ الزبتھ I کے دور سے ہی برطانوی اچھے منتظم ثابت ہوئے تھے۔ لیکن ہر ایک نسل میں کچھ نہ کچھ ایسے لوگ بھی پائے جاتے تھے جو ذاتی مفاد کے حصول کی جانب جھکاؤ رکھتے تھے۔ بروک ایسے لوگوں کے خلاف سخت رویہ اپنانے کا قائل تھا اور اس نے ایسے افراد کی کھلم کھلا مذمت کرنے سے بھی احتراز نہ کیا تھا۔

جوزف ھیوم کا مقصد کچھ بھی رہا ہو لیکن اس کے عمل درآمد کی بدولت بروک کی صحت نمایاں طور پر متاثر ہوئی تھی۔ کمیشن کے الفاظ کہ:۔

''کیس ثابت نہیں کیا جا سکا''

اس کی روح کو کچو کے لگاتے تھے۔ اگرچہ بظاہر اس میں دباؤ۔ کھچاؤ اور تناؤ کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے لیکن یہ سب کچھ اسے اندر ہی اندر گھائل کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ سانحہ اپنی موت آپ مرچکا تھا اور لوگ اس سانحہ کو بھول چکے تھے...... مشرق بعید کے علاوہ اس کے اپنے وطن میں بھی لوگ اس سانحہ کو بھول چکے تھے اور اس ''سفید راجا'' کے لئے تعریفی کلمات لوگوں کی زبان پر تھے۔

لیکن بحری ڈاوؤں نے نہ تو بروک کو معاف کیا تھا اور نہ ہی وہ اسے بھول پائے تھے کیونکہ بروک نے ان کی عملی سرگرمیوں کو معطل کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ بروک نے ان کو ان کی جائز طرز زندگی سے محروم کر دیا تھا۔ لہٰذا وہ خاموشی کے ساتھ وقت گزارتے رہے...... وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے غم و غصے میں بھی اضافہ ہوتا رہا...... حتیٰ کہ انہوں نے قابل ذکر قوت حاصل کر لی...... اس کے بعد انہوں نے سراوک کے دارالحکومت کیوچنگ پر اچانک حملہ کر دیا...... انہوں نے بروک کا مکان مسمار کر دیا اور اسے جلا کر راکھ کر دیا۔ بروک کو عارضی طور پر راہ فرار اختیار کرنا پڑی لیکن وہ جلد ہی واپس لوٹ آیا۔ اس کے ہمراہ برطانوی بحری قوت تھی۔ اس نے ان بحری ڈاکوؤں کا پیچھا کیا اور ایک مرتبہ پھر انہیں راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ سراوک کے ڈیاک اب اتنے فعال نہ رہے تھے لیکن پہاڑوں میں ہنوز ایک یا دو گروہ ایسے موجود تھے جو آمادہ بغاوت ہوتے رہتے تھے۔ بروک نے اپنی خرابی صحت سے قبل دو مزید بغاوتیں کچلیں تھیں۔ اس کے بعد وہ خرابی صحت کی بنا پر واپس انگلستان روانہ ہو گیا تھا تاکہ اپنا معقول علاج کروا سکے۔

حیرانگی کی بات یہ تھی کہ اس مرتبہ اس کا استقبال ایک ہیرو کی مانند کیا گیا۔ اس استقبال میں عوام نمایاں تھی۔ وہ جلد ہی مغربی علاقے کی جانب روانہ ہو گیا اور اپنے ذاتی امور ترتیب دینے لگا۔ اس نے اپنے کیریئر کا آغاز ایک دولت مند شخص کی حیثیت سے کیا تھا لیکن اس کی دولت کا زیادہ حصہ سراوک کی ترقی کی نذر ہو چکا تھا اور باقی ماندہ حصہ وکلاء کی فیسوں کی نذر ہو چکا تھا جنہوں نے شاہی کمیشن کے روبرو اس کے مقدمے کی پیروی سرانجام دی تھی۔ اس کی مالی حالت کے پیش نظر عوامی چندے کی مہم کا آغاز ہوا اور اس رقم سے ڈیون شائر میں ایک ریاست خرید کر اسے پیش کی گئی لیکن بدقسمتی سے وہ اس تحفے سے استفادہ حاصل نہ کر سکا اور اس پر فالج کا شدید حملہ ہوا اور وہ جلد ہی موت سے ہمکنار ہو گیا۔ اس کے جانشین کے طور اس کا بھتیجا سراوک کا راجہ بنا...... اس کا نام سر چارلس بروک تھا...... اس کے بعد اس کا بیٹا اس کا جانشین بنا...... اس کا نام سر چارلس وائیز بروک تھا۔ سینکڑوں برس تک ان سفید راجوں نے دانش مندی کے ساتھ صوبے پر حکومت کی حتیٰ کہ 1946ء میں ان کے تیسرے آخری جانشین نے سراوک برطانوی حکومت کے حوالے کرنے کے اقدامات سرانجام دیے۔

غیر معمولی زائر

رچرڈ فرانسس برٹن...... برطانوی کونسل...... مہم جُو اور مشرقی امور کا ماہر...... وہ پہلا یورپی نہ تھا جس نے بھیس بدلا اور مسلمانوں کے ہمراہ مدینہ شریف اور مکہ شریف جیسے مقدس شہروں میں مسلمان حجاج کرام کے ساتھ شرکت اختیار کی...... لیکن اس نے 1853ء کے حج کے بارے میں جو کتاب تحریر کی اس میں ناقابل فراموش تفصیل اور مشاہدات شامل کیے گئے تھے۔ یہ مشاہدات عرب رسم و رواج کے بارے میں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ کتاب ایک گراں قدر تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار کر گئی تھی اور اپنی طرز کی ایک مثالی کتاب ثابت ہوئی تھی۔ مکہ شریف کی زیارت کے نتیجے میں اسے لافانی شہرت حاصل ہوئی تھی جبکہ افریقہ میں اس کی اہم ترین مہم میں انتہائی کم تر دلچسپی کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔

برٹن ایک عجیب وغریب شخص واقع ہوا تھا۔ اس کا دادا ایک پادری تھا۔ اسے آئرلینڈ میں پادری مقرر کیا گیا تھا۔ وہ آئرلینڈ کی سرزمین سے اس قدر مانوس ہو گیا تھا کہ وہ آئرش باشندوں سے بڑھ کر آئرش دکھائی دیتا تھا۔ اس کے بیٹے لیفٹیننٹ کرنل جوزف نیٹرولی برٹن میں بھی یہی وصف پایا جاتا تھا۔ اس نے میک گریگر قبیلے کی ایک خاتون سے شادی کرتے ہوئے معاملے کو مزید پیچیدہ تر بنا دیا تھا اور رچرڈ جوان دونوں کی شادی کی نشانی تھا اسے بھی اپنی آبائی سرزمین سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ وہ بھی آئرلینڈ میں دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ اہل آئرلینڈ کے حقوق کا ایک بہت بڑا علمبردار بھی تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ میک گریگر قبیلے کی تاریخ میں بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ اور اس قبیلے کی شجاعت اور بہادری کی لمبی لمبی داستانیں بیان کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا جو شجاعت اور بہادری انہوں نے انگریزوں کے خلاف دکھائی تھی۔

جبکہ اس کا باپ ابھی اپنی ملازمت میں ہی مصروف تھا مسز برٹن نے یورپ کا ایک دورہ کیا۔ اس کے پسندیدہ ممالک میں فرانس اور اٹلی شامل تھے۔ رچرڈ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ روایتی تعلیم وتربیت سے محروم رہا تھا۔ اس نے کافی عرصے تک مختلف اتالیقوں کی خدمات حاصل کی تھیں لیکن وہ ان سے خاطر خواہ استفادہ حاصل نہ کر سکا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے مختلف زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ جب وہ سن بلوغت کو پہنچا تب وہ فرانسیسی...... جرمن، اٹلی اور اسپین کی زبانیں روانی کے ساتھ بول سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں سیاحت کے جراثیم بھی سرایت کر چکے تھے۔

اکتوبر 1841ء میں جبکہ اس کی عمر محض 19 برس تھی اس وقت اس نے ٹرینٹی کالج...... آکسفورڈ میں داخلہ لے لیا۔ وہ ایک روایتی طرز زندگی گزارنا پسند نہ کرتا تھا اور اس کے ساتھی طلباء اسے کسی دوسرے سیارے کی مخلوق تصور کرتے تھے۔ وہ دبلا پتلا اور دراز قد کا حامل تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک نمایاں تھی۔ آکسفورڈ میں اس نے ایک انتہائی مختصر وقت گزارا تھا اور یہ وقت کسی قدر قابل ذکر خصوصیات کا بھی حامل نہ تھا۔ وہ عربی زبان بھی سیکھ رہا تھا۔ کالج کے حکام نے اس کے والدین کو مشورہ دیا کہ وہ اسے لندن روانہ کر دیں تاکہ وہ ہندوستانی زبان سیکھ سکے۔ وہاں پر معروف استاد فوربس موجود تھا اور وہ استاد اس کی برق رفتار ترقی سے از حد خوش اور متاثر ہوا۔

اکتوبر 1842ء میں برٹن ہندوستان کیلئے روانہ ہوا۔ اسے بمبئی 18 ویں رجمنٹ میں کمیشن عطا کیا گیا تھا۔ اس وقت یہ رجمنٹ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر کمان تھی۔ فوج کی زندگی بھی اسے محض اسی قدر راس آئی جس قدر اسے یونیورسٹی کی زندگی راس آئی تھی۔ برودہ میں اپنی تعیناتی کے دوران اسے یہ موقع میسر آیا کہ وہ مشرقی زندگی اور مشرقی زبانوں کا مطالعہ سرانجام دے۔ وہ اپنی میس میں بھی کبھی کبھار ہی نظر آتا تھا اور اپنے دیگر ساتھی افسران کی طرح اپنا فارغ وقت مختلف مشاغل کی نذر نہ کرتا تھا بلکہ وہ اپنے ہر ایک فاضل لمحے سے استفادہ حاصل کرتے ہوئے عربی...... فارسی ...... ہندوستانی...... گجراتی اور مراٹھی زبانیں سیکھنے میں مصروف رہتا تھا۔ کمپنی کو یہ احساس ہونے میں قطعاً دیر نہ لگی کہ یہ نوجوان ان کے لئے کس قدر سودمند ثابت ہوسکتا تھا۔ لہٰذا انہوں نے اسے وادی سندھ اور انڈس کے سروے کیلئے معاون مقرر کر دیا۔ اس دوران اسے لوگوں کے ساتھ باہم روابط ہونے کا موقع میسر آیا اور وہ ان لوگوں میں اس طور گھل مل جاتا تھا کہ اس کے افسران بالا بازاروں میں اسے پہچاننے سے قاصر رہتے تھے حتیٰ کہ وہ اپنے اردلی کو بھی بے وقوف بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ اردلی جب اپنے افسر کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے اپنے افسر کو آبائی لوگوں کے لباس میں پایا اور اس کو دھمکی دی کہ وہ گارڈ کو بلا کر اسے باہر پھنکوا دے گا۔

سات برسوں تک برٹن سندھ کے مسلمانوں کے درمیان ہنسی خوشی رہا اور انتہائی محتاط انداز میں ان کے رسم و رواج کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ اس کے علاوہ ان کی نقالی کرنے کی کوشش بھی سرانجام دیتا رہا۔ ان کی بول چال کی نقالی کرتا اور ان کے ادب آداب اور طور طریقوں کی بھی نقالی سرانجام دیتا تھا۔ اسے مہم جوئی کا ازحد شوق تھا اور یہ شوق اسے چین سے نہ بیٹھنے دیتا تھا۔

رائل جغرافیائی سوسائٹی کافی عرصے سے برٹن کو زیر غور رکھے ہوئے تھی اور یہ سوسائٹی اس کی اس تحقیق سے مطمئن اور خوش تھی جو اس نے وادی سندھ کے مکینوں کے سلسلے میں سرانجام دی تھی۔ لہٰذا انہوں نے اسے وسطی عریبہ کی جانب اس کی مہم کے اخراجات برداشت کرنے کی پیشکش کی۔ برٹن کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھا۔ اس نے اپنے اس طویل سفر کا منصوبہ بنانا شروع کر دیا اور یہ فیصلہ کیا کہ اس کا بہترین لائحہ عمل یہ ہوگا کہ وہ اپنا بھیس بدلے اور وہ بھیس بدلنے پر اس حد تک قادر تھا کہ سندھ کے بازاروں میں بھیس بدل کر پھرتا رہتا تھا اور کوئی اسے پہچان نہ پاتا تھا...... اور مسلمان حاجیوں کے ایسے گروہ میں شامل ہوجائے جو مقدس شہروں کی زیارت کے لئے جا رہا ہو۔ ایک مرتبہ جب وہ مکہ میں داخل ہو جاتا تب اسے اپنے ذرائع پر انحصار کرنا تھا اور اس صحرا کو بذات خود عبور کرنا تھا جس کا نقشہ تک موجود نہ تھا...... اور یہ کام تن تنہا اور بغیر کسی کی مدد لئے سرانجام دینا تھا...... لیکن اس میں خود اعتمادی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ پہلے اس نے اپنی توجہ اس کام کی جانب مبذول کروائی جس کا آغاز وہ کر چکا تھا...... یہ کام ان چار کتب تحریر کرنے کے بارے میں تھا جو وہ لکھنا شروع کر چکا تھا۔ یہ کتابیں سندھ اور سندھ کے لوگوں کے بارے میں تھیں۔ ان میں سے تین کتابیں 1851ء میں شائع ہوئی تھیں جبکہ چوتھی کتاب 1852ء میں شائع ہوئی تھی۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان میں سے کوئی کتاب بھی مقبولیت کا زینہ طے نہ کر سکی حالانکہ ان میں تازہ اور حقیقی معلومات کا ذخیرہ بخوبی موجود تھا۔

1853ء میں برٹن مدینہ شریف اور مکہ شریف کی زیارت کیلئے روانہ ہوا۔ اس نے بھیس بدل رکھا تھا...... اسے زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ اس کے باوجود بھی سفر پر خطر تھا۔ دن اور رات اسے مسلمان زائرین کے ساتھ گزارنے تھے اور وہ ایک لمحے کے لئے بھی آرام کرنے کی جرأت نہیں کر

سکتا تھا۔ اسے مسلمانوں کے قوانین کی پابندی سرانجام دینی تھی۔ اگرچہ برٹن نے بھیس بدل رکھا تھا لیکن اس کے اجنبی خدوخال اور ہاتھ دھوئے بغیر کھانا کھانے کا عمل کسی بھی وقت کسی کو بھی شک وشبے میں مبتلا کرسکتا تھا اور اگر ایسا ممکن ہوجاتا تو اس کی فوری ہلاکت کا خدشہ تھا۔ یہ بھی سنا گیا تھا کہ ایک یا دو حاجیوں نے برٹن پر اپنے شبے کا اظہار بھی کیا تھا لیکن برٹن کو اپنی جان بچانے کی خاطر ان کی جان لینی پڑی تھی۔ لیکن یہ کہانی ایک فرضی کہانی دکھائی دیتی تھی جس نے مابعد جنم لیا تھا۔ کیونکہ اس داستان کا ذکر اس کی تصنیف ''مدینہ اور مکہ شریف کی زیارت'' میں نہیں کیا گیا تھا۔ یہ کتاب 1855ء میں شائع ہوئی تھی اور اس کی اشاعت کے کافی عرصہ بعد اس نے یہ اقرار بھی کیا تھا کہ اس نے اپنی زندگی میں کسی بھی شخص کو ہلاک نہیں کیا تھا۔

برٹن نہ صرف ذہنی طور پر چوکنا رہا بلکہ جسمانی طور پر بھی چوکنا رہا اور اس نے دیگر زائرین کے ہمراہ اپنا سفر بخوبی سرانجام دیا اور کوئی بھی اس اجنبی کی شناخت نہ کرسکا۔ وہ پہلا انگریز تھا جس نے مکہ شریف کی سرزمین پر قدم رکھا تھا لیکن بدقسمتی سے وہ اپنی حقیقی مہم کی سرانجام دہی سے قاصر رہا کیونکہ صحرائی قبیلوں کے درمیان خونریز جنگ چھڑ چکی تھی۔ لہٰذا وہ حجاج کرام کے ساتھ ہی واپس لوٹ آیا...... اس مغربی زندگی کی جانب واپس لوٹ آیا جسے وہ ترک کرچکا تھا...... وہ دلبرداشتہ اور مایوس تھا۔

اس کے زرخیز ذہن نے جلد ہی راہ فرار اختیار کرنے کا منصوبہ بنالیا۔ ہندوستانی حکومت صومالی لینڈ کے بارے میں فکرمند تھی کیونکہ اس ملک کے مخالف قبائلی بندرگاہوں کو مسلسل نشانہ بنارہے تھے۔ یہ بندرگاہیں یورپ اور مشرق کے درمیان تجارت کے ایک بڑے روٹ پر واقع تھیں۔ برٹن کو جب اس مسئلے کا علم ہوا تو اس نے رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کردیں اور اس امر پر آمادگی ظاہر کی کہ وہ ایک جماعت کے ہمراہ اندرون صومالی لینڈ روانہ ہوگا اور یہ دریافت کرے گا کہ وہاں پر کیا کچھ وقوع پذیر ہورہا تھا۔ لہٰذا کیپٹن جے۔ ایچ۔ اسپیک کو اس کا چیف معاون مقرر کیا گیا۔ اس کے علاوہ دو مزید افسر اس کی معاونت کے لئے اس کے ساتھ روانہ کئے گئے۔ وہ 1854ء میں اپنی مہم پر روانہ ہوئے۔ جلد ہی یہ لوگ مشکلات کا شکار ہوگئے۔ اگرچہ اہل صومالیہ ذرائع مواصلات سے بظاہر محروم تھے لیکن ان کی چھٹی حس نے انہیں یہ باور کروادیا کہ کچھ اجنبی ان کی سرزمین پر قدم رکھ رہے تھے اور وہ اجنبیوں سے نفرت کرتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس جماعت کو قدم قدم پر خطرات کا سامنا تھا لہٰذا کیپٹن اسپیک نے جماعت کو محتاط رہنے کا مشورہ دیا۔ اس کے اس مشورے سے برٹن کا پارہ چڑھ گیا اور اس کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔ وہ دن بھر کیپٹن اسپیک کے ساتھ گرماگرم بحث کرتا رہا اور رات کو کسی کو کچھ بتائے بغیر ہی غائب ہوگیا۔ اس نے اپنا کوئی اتہ پتہ نہ چھوڑا کہ وہ کہاں روانہ ہورہا تھا۔ چار ماہ تک اس کے بارے میں کوئی خبر نہ مل سکی...... اس کے بعد وہ اچانک آن ٹپکا۔ اس کے جذبے جوان تھے۔ وہ یہ حیران کن خبر لایا تھا کہ اس نے تن تنہا نہ صرف صحرا کے پار دارالخلافے شہر ہرار کا سفر طے کیا تھا (یہ علاقے اس سے بیشتر کسی غیر ملکی نے نہیں دیکھا تھا بلکہ وہ دس روز تک وہاں پر مقیم بھی رہا تھا جس دوران اس نے بادشاہ کے ساتھ گفتگو بھی کی تھی۔ نیزوں سے مسلح افراد لگاتار اس کے اردگرد موجود رہے تھے اور جب وہ) ملاقات ختم کرنے کے بعد اپنے اونٹ پر بیٹھا تب وہ مسلح افراد اس کے مزید قریب چلے آئے...... وہ نیزوں سے مسلح تیار کھڑے تھے...... اور اس نے ان کی معیت میں اپنا واپسی کا طویل سفر طے کیا۔ وہ مسلح افراد اس وقت غائب ہوئے جب انہوں نے اس جماعت کے کیمپ سے آگ جلنے کا دھواں نمودار ہوتے دیکھا۔

پہلے پہل کیپٹن اسپیک اور دیگر ساتھیوں نے یہ سمجھا کہ برٹن من گھڑت کہانی سنا رہا تھا لیکن ان کی حیرانگی کی اس وقت کوئی انتہا نہ رہی جب

برٹن نے اپنی کہانی کے ثبوت فراہم کئے۔ یہ ثبوت اس یادداشت کی صورت میں تھے جو بادشاہ نے اسے پیش کی تھی جس پر بادشاہ کے دستخط موجود تھے اور اس دستاویز میں یہ اقرار کیا گیا تھا کہ بندرگاہوں پر خوف وہراس پھیلانا موقوف کر دیا جائے گا بشرطیکہ صومالیہ کو کچھ مراعات سے نوازا جائے۔ ہرار تک کا طویل اور تنہا سفر اور مابعد وہاں سے واپسی کا سفر اس مہم سے کہیں بڑھ کر قابل ذکر تھا جو مہم برٹن نے مقدس شہروں کی زیارت کے سلسلے میں سرانجام دی تھی۔ لیکن برٹن ہنوز مطمئن نہ تھا۔ وہ اس امر پر اصرار کر رہا تھا کہ اسپیک اور دیگر دونوں جونیئر افسران بھی اس کے ہمراہ ہرار روانہ ہوں اور وہ سب مل کر دوبارہ اس مقام کا رخ کریں اور اس مرتبہ یہ دورہ ایک سرکاری دورہ ہو اور ان اقدامات کی تصدیق ممکن ہو سکے جو بادشاہ اور اس کے درمیان ذاتی حیثیت میں طے پائے تھے۔ لہٰذا وہ عازم سفر ہوئے۔ لیکن انہوں نے ابھی زیادہ سفر طے نہیں کیا تھا کہ قبائلی ان پر حملہ آور ہو گئے اور دو جونیئر افسران میں سے ایک افسر اس حملے میں ہلاک ہو گیا۔ اسپیک کو گیارہ زخم آئے اور برٹن بھی زخمی ہونے سے نہ بچ سکا۔ اس کے جبڑے زخمی ہوئے تھے۔

برٹن نے اس مہم سے واپسی کی راہ لی۔ شہرت اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ اس کی غیر حاضری میں زیارتوں کے بارے اس کی کتاب بھی چھپ چکی تھی اور نقادوں نے اس کی قابل ذکر تعریف کی تھی۔ اسے انٹرویو...... لیکچر...... بالوں کی لٹ عطا کرنے اور آٹوگراف دینے کی دعوتیں موصول ہو رہی تھیں اور برٹن شہرت کا زینہ طے کر چکا تھا۔

ابھی وہ اپنے زخم سے روبصحت ہو رہا تھا کہ اسے دوبارہ فوج میں طلب کر لیا گیا۔ اسے بیٹ سن کی باشی۔ بازوک کے ساتھ مل کر کرامین کی جنگ میں حصہ لینا تھا۔ اسے اگلے محاذ پر بھیجنے کی نوبت ہی نہ آئی تھی۔ اس وقت اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جبکہ دفتر خارجہ نے یہ درخواست کی کہ برٹن کی خدمات انہیں مستعار دی جائیں تاکہ اسے ایک جماعت کی ہمراہی میں افریقہ روانہ کیا جائے اور وہ وائٹ نیل کا سرچشمہ (منبع) دریافت کر سکے۔ یہ کام اس کی من مرضی کا تھا اور وہ پورے جوش، جذبے اور ولولے کے ساتھ اس مہم کی تیاری میں لگ گیا۔

پہلے اس نے اسپیک سے پوچھا کہ کیا وہ دوبارہ اس کے چیف معاون کے طور پر اس کا ساتھ دینے پر آمادہ تھا۔ اسپیک جانتا تھا کہ برٹن ایک مشکل شخص واقع ہوا تھا۔ لیکن وہ اس کی قابلیت سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ لہٰذا اس نے حامی بھر لی۔ اس مرتبہ یہ جماعت صومالی لینڈ کی مہم سرانجام دینے والی جماعت سے بڑی تھی...... اس جماعت نے نیل تک کا سفر ایک کشتی میں طے کیا...... مصر تا خرطوم...... جہاں پر بلیو نیل ایتھوپیا سے آکر وائٹ نیل کے ساتھ ملتا تھا۔ خرطوم کے جنوب میں ان کے لئے مشکلات کا دور شروع ہوا کیونکہ اس مقام پر پانی میں کثیر تعداد میں نباتات اگے ہوئے تھے اور جہاز رانی تقریباً ناممکن تھی۔ اس مقام پر وہ اپنی کشتیوں سے دست بردار ہو گئے اور خشکی کے ذریعے سفر کا آغاز کیا۔ یہ علاقہ دلدلوں کا حامل تھا۔ موسم بھی انتہائی گرم تھا جس کی وجہ سے وہ جلد تھکاوٹ کا شکار ہو جاتے تھے۔ مزدور بھی غیر ذمہ دار اور ناقابل اعتبار تھے اور مہم میں شامل افراد کو ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا تھا کیونکہ قبائلیوں کی جانب سے یا جنگلی درندوں کی جانب سے حملے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا تھا۔ کئی مرتبہ وہ ہاتھیوں کے حملے سے بال بال بچے...... اس کے علاوہ شیر بھی ان کے لئے مستقل خطرہ بنے رہے۔

ان مشکل ترین حالات میں بھی برٹن نے ہار ماننے سے انکار کر دیا۔ اسپیک نے بھی اس کا ساتھ دیا مگر جماعت کے جونیئر ارکان سراپا

احتجاج بنے رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان میں اس قدر جسمانی قوت باقی نہ رہی تھی کہ وہ اپنا سفر مزید جاری رکھ سکتے۔ لیکن برٹن ان کی مسلسل حوصلہ افزائی کرتا رہا اور انہیں روبہ عمل رکھنے میں کامیاب رہا حتیٰ کہ سورج کی روشنی میں انہیں جھیل البرٹ کا پانی دکھائی دیا۔ وہ اس پانی کو گھورتے رہے...... انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ برٹن ہمیشہ سے اس نکتہ نظر کا حامل تھا کہ نیل کا سرچشمہ منبع کسی انجانی جھیل میں پایا جاتا تھا۔ انہوں نے اس سرچشمے کو پالیا تھا۔ اس کو پانے کیلئے انہوں نے جو سفر طے کیا تھا وہ انہیں زندگی بھر یاد رہنا تھا لہٰذا وہ اس لمحے سے لطف اندوز ہونے سے باز نہیں رہ سکتے تھے۔

اس رات برٹن بخار کا شکار ہو گیا۔ اسپیک انتہائی جانفشانی کے ساتھ اس کی تیمارداری سرانجام دیتا رہا۔ وہ اپنی بیماری کی وجہ سے اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ وہ مزید روبہ عمل نہیں رہ سکتا تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور اب 1858ء کا ماہ فروری آن پہنچا تھا۔ لہٰذا اس نے اسپیک کو آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں ہدایات دیں کہ اسے مزید کیا کرنا تھا۔ انہوں نے ایک جھیل کو تو پالیا تھا لیکن یہ جھیل ان کی مطلوبہ جھیل نہ تھی۔ ان کا خیال تھا کہ نیل کا حقیقی سرچشمہ جنوب' مشرق کی جانب کہیں دور واقع تھا اور اس نے اس روٹ کا بھی پتہ چلا لیا تھا جس روٹ پر سفر کرتے ہوئے اس سرچشمے تک پہنچنا ممکن تھا۔ اسپیک نے اس کی ہدایات پر اپنے عمل درآمد کو ممکن بنانے کا عہد کیا اور برٹن جب پسینے میں شرابور اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا اس کا معاون اپنی جدوجہد میں مصروف تھا حتیٰ کہ اس نے وکٹوریہ نیانزہ کو دریافت کر لیا اور یہی نیل کا حقیقی سرچشمہ تھا۔

جب اسپیک فتح یاب ہو کر واپس پلٹا اور برٹن کو یہ خوشخبری سنائی تب برٹن کے غصے کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ اس امر پر اصرار کر رہا تھا کہ حقیقت میں وہ بذات خود وہ شخص تھا جو اس کامیابی کا سہرا اپنے سر باندھنے کا حقیقی حقدار تھا اور یہ کہ اسپیک اس کا محض ایک شاگرد تھا جس نے اس کی ہدایات پر عمل کیا تھا۔ اس نے اپنے وفادار معاون پر الزامات کی بوچھاڑ کر دی اور ان دونوں افراد میں وہ لڑائی جھگڑا ہوا جس کو دونوں افراد کبھی نہ بھلا سکے۔

برٹن نے کامیابی کا سہرا اپنے سر باندھ لیا اور افریقہ کے مغربی ساحل پر مزید مہمات جاری رکھیں حتیٰ کہ 1861ء میں اس کی 40ویں سالگرہ آن پہنچی۔ اسی برس اس نے ازابیل ازنڈل سے شادی کر لی جو کہ ایک باوفا بیوی ثابت ہوئی۔ اس نے فوجی ملازمت کو خیرباد کہہ ڈالا اور فارن سروس جوائن کر لی اور فرنانڈو پی او میں کونسل کے عہدے پر فائز ہو گیا۔ 1871ء تک وہ اسی حیثیت میں برازیل اور دمشق میں اپنی خدمات سرانجام دیتا رہا۔ اور 1890ء میں اپنی وفات تک اسی عہدے پر کام کرتا رہا۔ اپنے فاضل وقت میں اس نے کئی ایک کتب بھی تحریر کیں۔ ان میں سے کوئی کتاب بھی اس معیار کی حامل نہ تھی جس معیار کی حامل اس کی کتاب ''مکہ شریف کی زیارت'' تھی۔

برٹن کی زندگی کے آخری بیس برس انتہائی ناخوشگوار تھے۔ وہ نظم وضبط سے نفرت کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حکام بالا کے ساتھ اس کے اختلافات منظر عام پر آتے رہتے تھے...... وہ اپنے ساتھی اہلکاروں کے ساتھ بھی جارحانہ رویہ روا رکھتا تھا۔ محض اس کی بیوی اس کے ہیرو ازم پر یقین رکھتی تھی اس نے اس کی سوانح حیات بھی تحریر کی تھی۔

انگ کورواٹ کی بازیابی

دنیا کی تاریخ میں بہت سی سلطنتیں منظر عام پر آئیں اور کئی ایک صدیوں تک اپنی طاقت اور قوت کے جوہر دکھاتی رہیں اور مابعد منظر عام سے ہٹ گئیں۔ کوئی بھی سلطنت اس قدر مکمل طور پر صفحہ ہستی سے نہ مٹی جس قدر مکمل طور پر کمبوڈیا کی سلطنت صفحہ ہستی سے غائب ہوئی۔ یہ سلطنت 9 ویں صدی تا 13 ویں صدی تک قائم رہی اور اس کے بعد اپنا کوئی واضح نشان چھوڑے بغیر صفحہ ہستی سے مٹ گئی۔ اس کی وجوہات سمجھ سے بالاتر نہیں ہیں...... اس کی ایک بڑی وجہ جنگلات کا پھیلاؤ تھا...... ان کی وسعت پذیری تھی...... بنی نوع انسان نے زمین کے جس حصے کو بھی نظر انداز کیا خواہ اسے محض چند ماہ کیلئے ہی کیوں نہ نظر انداز کیا گیا ہو...... جنگلات نے اس جگہ کو بھی ہڑپ کر لیا۔ جنوب مشرقی ایشیا کی جانب جانے والے سیاح جو اس امر میں دلچسپی رکھتے تھے کہ خمیر تہذیب کے کوئی نہ کوئی آثار تلاش کریں انہیں ان جنگلات نے ہی شکست سے دوچار کیا تھا جو اس قدر وسعت اختیار کر چکے تھے کہ وہ کمبوڈیا کے وسطی میدان تک پھیل چکے تھے اور وہ کسی بھی حملہ آور کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ثابت ہو رہے تھے۔ خمیر سلطنت کے عمائدین نے اپنی کامیابیوں کا کوئی تحریری ریکارڈ نہ چھوڑا تھا ماسوائے ان تحریروں کے جو لاتعداد پتھروں پر لکھی گئی تھیں...... اور جنگل ان پتھروں کو بھی ہضم کر چکا تھا...... یہ پتھر بھی جنگل میں دفن ہو چکے تھے۔

کبھی کبھار چینی یا انڈین تاجر کئی اقسام کی داستانیں بیان کرتے رہتے تھے جو یورپی ماہر آثار قدیمہ کے علم میں بھی آتی رہتی تھیں۔ اس کے علاوہ مغربی مفکرین کے علم میں بھی یہ داستانیں آتی رہتی تھیں۔ کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا تھا کہ اس نے بڑے بڑے مینار دیکھے تھے جو جنگل سے بھی اونچے تھے جبکہ دوسرا شخص یہ دعویٰ کرتا تھا کہ اس نے ایک بڑا عبادت خانہ دیکھا تھا جبکہ تیسرا شخص یہ دعویٰ کرتا تھا کہ وہ بدھ مت کے ایسے مذہبی رہنماؤں سے ملا تھا جو ایک خمیر بادشاہ کے مزار پر عبادت سرانجام دیتے تھے اور چوتھا شخص یہ دعویٰ کرتا تھا کہ اس نے ایک ایسی جھیل دیکھی تھی جو عجیب وغریب قسم کی مچھلیوں سے بھری پڑی تھی۔ دانش ور لوگ ان کہانیوں پر یقین نہ رکھتے تھے اور انہیں تصوراتی...... من گھڑت اور فرضی قصے گردانتے تھے۔ لیکن ان میں تجسس کا مادہ ضرور سر ابھارتا تھا اور جب 19 ویں صدی کے پہلے نصف دورانیے کے دوران فرانس نے کمبوڈیا پر تسلط جما لیا تب بہت سے فرانسیسی تاریخ دانوں اور ماہرین آثار قدیمہ نے نوم پن کا سفر طے کیا جو کہ کمبوڈیا کا دارالحکومت تھا۔ کچھ لوگوں نے دریائے میکونگ تک بھی سفر طے کیا۔ اس کے علاوہ کچھ لوگوں نے گھنے جنگل کے ذریعہ بھی سفر سرانجام دیا لیکن جنگل نے انہیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا اور وہ خمیر سلطنت کی شان وشوکت کو اس سے بڑھ نہ جان سکے جتنی وہ اس سے پہلے جانتے تھے۔

تب 1860ء میں ایک ماہر علم حشرات الارض جس کا نام ہینری موہاٹ تھا وہ تتلیوں کی تلاش میں نوم پن آیا۔ وہ براستہ جنگل شمال کی جانب روانہ ہوا۔ لیکن اپنے پیش رووں کے برعکس اس نے کوئی خاص تیاری سرانجام نہ دی اور نہ ہی کوئی مزدور بھرتی کیے۔ اس نے تن تنہا سفر سرانجام دیا۔ اس کی ضرورت کی چند اشیاء ایک بیگ میں پڑی اس کی پشت پر جھول رہی تھیں۔ اس کے پاس جو اسلحہ تھا وہ ایک پستول اور ایک خنجر پر مبنی تھا۔

موہاٹ کے لئے جنگل کوئی اجنبی چیز نہ تھی۔ وہ برس ہا برس سے حشرات الارض کے نمونے اکٹھے کرنے کی غرض سے جنگلات کی خاک چھان رہا تھا۔ وہ جنگلوں میں پائے جانے والے بندروں کے کرتبوں سے بھی لطف اندوز ہوتا تھا جب وہ اس کے سر کے اوپر درخت کی ایک شاخ سے دوسری شاخ پر چھلانگیں لگاتے تھے۔ وہ اپنے خنجر کے ساتھ جنگل میں اُگے ہوئے درختوں کی شاخیں کاٹ کاٹ کر اپنا راستہ بناتا رہتا حتیٰ کہ اسے اپنی جدوجہد کا پھل میسر آ گیا جبکہ اس نے اپنے آپ سے کچھ ہی دور ایک خوبصورت تتلی دیکھی۔ اس نے جلد ہی اپنا جال نکالا لیکن اسے دیر ہو چکی تھی اور تتلی اس کی پہنچ سے دور نکل چکی تھی۔ اس نے تتلی کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ وہ تتلی کے تعاقب میں یہ بھول چکا تھا کہ جنگل گھنا تھا اور وہ ایک ناہموار راستے پر چل رہا تھا۔ اس کے بعد وہ کونے کی جانب مڑا اور کیا دیکھتا ہے کہ پتھروں سے تعمیر شدہ ایک عمارت سر اٹھائے کھڑی تھی۔

یک دم موہاٹ تتلی کے بارے میں بھول چکا تھا۔ وہ کھڑا رہا اور اس عمارت کی جانب گھورتا رہا...... اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ بار بار اپنی آنکھیں جھپک رہا تھا اور عمارت کی جانب دیکھ رہا تھا...... عمارت ہنوز اپنی جگہ پر موجود تھی۔ اس نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی اور اسے یہ محسوس ہوا کہ وہ جس جگہ کھڑا تھا کسی دور میں اس جگہ ایک بڑی عمارت قائم تھی جس کے اطراف میں پتھروں کے بڑے بڑے ستون تھے جن میں سے کئی ایک ستونوں پر کسی عجیب وغریب جانور کا سر تراشا ہوا تھا اور کئی ایک ستونوں پر ''ناگا'' کا سر تراشا ہوا تھا جو کہ ایک افسانوی سانپ تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے کی جانب بڑھتا رہا حتیٰ کہ وہ ایک خندق (کھائی) تک پہنچ گیا۔ اس خندق کے پار ایک بڑی دیوار تھی جو تقریباً آدھ میل تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ دیوار قابل ذکر موٹائی کی حامل تھی۔ اس دیوار کے اندر برآمدے تھے اور محرابیں تھیں جو عمارت کے اندرونی حصے کی جانب لے جاتی تھیں جہاں پر کسی دور میں پادری عبادت کے لئے جھکتے تھے۔ موہاٹ اس عمارت کے وسط میں کھڑا اردگرد دیکھتا رہا۔ اس عمارت کے کونوں میں سانپ رینگ رہے تھے۔ اس کے سر کے اوپر اور عقب میں ایک گیلری تھی۔

موہاٹ اس عمارت کو دیکھتے ہوئے ناقابل بیان احساسات کا شکار ہو رہا تھا اور اس کے ذہن میں وہ داستانیں ابھر رہی تھیں جو تاجروں کی نسلیں بیان کرتی رہتی تھیں۔ لہٰذا وہ داستانیں مبنی برحقیقت تھیں۔ وہ اس مقبرے کو بازیاب کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا جو ان لوگوں نے تعمیر کیا تھا جو 600 برس قبل اس مقام پر رہائش پذیر تھے اور حکمران تھے۔ وہ اپنے گھٹنوں کے بل جھک گیا اور ان کے ان دیکھے خدا سے یہ دعا کرنے لگا کہ وہ اسے بحفاظت واپسی کا سفر طے کرنے کی ہمت عطا کرے تاکہ وہ اپنی اس دریافت کے بارے میں دنیا کو بتا سکے۔ مابعد اس نے یہ تحریر کیا کہ:۔

''رنگ کورواٹ کو دیکھ کر ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اچانک بربریت کی دنیا سے نکل کر مہذب دنیا میں آن بسا ہوا...... اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آن کھڑا ہوا ہو۔''

اس نے اس جگہ کو چھوڑنے سے قبل اس عظیم الشان عمارت کا دوبارہ معائنہ سرانجام دیا۔ انسانی تعمیر کے اس شاہکار کو جنگل نے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ جگہ جگہ جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں...... دیواروں میں خودرو درخت اگے ہوئے تھے اور انہوں نے دیواروں کو توڑ کر رکھ دیا گیا۔ جنگلی پھول جگہ جگہ اگے ہوئے تھے۔ اس کے برآمدوں میں پرندوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ لیکن اس کے باوجود بھی انگ کور انسانی شاہکار کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ موہاٹ جانتا تھا کہ یہ عمارت ماہرین آثار قدیمہ اور تاریخ دانوں کیلئے ایک گراں قدر اہمیت کی حامل تھی۔ اس عمارت کی چار دیواری کے باہر اس کی ملاقات بدھ مت کے دینی رہنماؤں سے ہوئی جنہوں نے اسے بتایا کہ انہیں بھی محض اچانک اس عمارت کا سراغ ملا تھا اور وہ اس کے

قریب ہی آباد ہو گئے تھے۔ وہ اسے کسانوں کی ایک نزدیکی بستی بھی لے گئے جو دریائے سیم ریپ کے کنارے پر آباد تھے۔ انہوں نے اس علاقے سے جنگل کا صفایا کر دیا تھا اور وہ اس زرخیز سرزمین سے بہترین فصلیں حاصل کر رہے تھے۔ ان لوگوں سے اسے یہ معلوم ہوا کہ گریٹ جھیل تک پہنچنا کس طرح ممکن تھا جو دریائے ٹونل سیپ تک رہنمائی کرتی تھی۔

موہاٹ توم پن واپس لوٹ آیا۔ اس نے اپنے سفر کی روئیداد تحریر کی۔ اس نے اس روئیداد کو متعلقہ حکام کے بالا کے حوالے کیا اور اس نے دارالحکومت پہنچنے کے فوراً بعد پہلا کام یہی سرانجام دیا۔ حکام نے یہ رپورٹ پیرس روانہ کر دی جہاں پر اس رپورٹ نے دلچسپی اور تجسس کو ابھارا اور چھ ماہ بعد ماہر آثار قدیمہ اور تاریخ دانوں کے علاوہ دیگر ماہرین پر مشتمل ایک جماعت توم پن آن پہنچی اور بذریعہ دریا انگ کور کی جانب روانہ ہوئی۔

اس جماعت میں شامل افراد جوش' جذبے اور ولولے سے سرشار تھے۔ وہ اس قدیم عمارت کو اس کی اصلی شان و شوکت واپس لوٹانے کے جذبے سے سرشار تھے۔ وہ اس کام میں اپنی تمام مہارتیں بروئے کار لانا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے دیگر ساز و سامان اور فوجی جوانوں کا تعاون بھی حاصل کیا تا کہ جسمانی مشقت کے کام کی تکمیل بھی ممکن ہو سکے۔ اس کام کی تکمیل میں چالیس برس کا عرصہ صرف ہوا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے زمین کے نیچے دفن شہر کو بھی بے نقاب کیا جو عبادت گاہ کی دیواروں سے باہر زمین میں دفن ہو چکا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے دیگر عبادت گاہیں اور دیگر شہر بھی دریافت کئے جو سلطنت خمیر کا مرکز تھے۔

پتھروں پر کندہ تحریروں کا ترجمہ کیا گیا اور ان تحریروں کے ترجمے کی بدولت سلطنت خمیر کی تاریخ مرتب کی گئی۔ پہلی صدی بعد از مسیح کے دوران کمبوڈیا آزاد ریاستوں کے ایک تسلسل کا حامل تھا۔ فیونن ایک اہم ترین ریاست تھی۔ اس ریاست پر ایک خوبصورت نوجوان ملکہ حکومت کرتی تھی۔ اس کا نام ولولیف تھا۔ اسی اثنا میں ہندوستان میں ایک امیر و کبیر نوجوان کندینیا کو اپنی نیند کے دوران ایک لافانی روح دکھائی دی جس نے اسے ایک کمان اور تیر عطا کئے اور وہ مشرق کی جانب عازم بحری سفر ہوا۔ جب وہ فیونن کی بندرگاہ پہنچا تب ولولیف اپنی جنگی کشتی میں سوار اس کی کشتی کی جانب روانہ ہوئی لہٰذا اس نے تیر چلایا۔ ولولیف پانی میں گرنے لگی تھی کہ کندینیا نے اسے پانی میں گرنے سے بچایا...... اسے اس کا برہنہ پن دیکھ از حد صدمہ ہوا...... اس نے اسے بہترین کپڑے کا ایک ٹکڑا پیش کیا تا کہ اس کو اپنے جسم کے گرد لپیٹ سکے۔ اس مقابلہ کا اختتام خوشگوار ہوا کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے...... ایک دوسرے سے شادی کر لی اور اکٹھے حکومت کرنے لگے...... کندینیا نے اہل فیونن کو بہترین جہاز بنانے سکھائے اور اس کے علاوہ ان کو سونے' چاندی اور ہاتھی دانت سے زیوارت بنانے بھی سکھائے۔ ان کے جانشینوں نے چھٹی صدی کے وسط تک فیونن پر حکمرانی کی جب ان میں سے ایک نے شاہ چھنلا کی وارث سے شادی رچالی۔ اس کا نام بھاوا ورمن تھا اور جب اس کا والد فوت ہوا تب اس نے اس کے تخت پر قبضہ جما لیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد فیونن کا بادشاہ بھی موت سے ہمکنار ہو گیا اور اس نے اپنے تخت کے حصول کا بھی دعویٰ کر دیا اور بالآخر ڈنڈے کے زور پر فیونن پر بھی قبضہ جما لیا۔ اگلی دو صدیوں تک خمیر بادشاہ اپنے ملک میں گراں قدر قوت و طاقت حاصل کر چکے تھے لیکن جایاورمان I کی وفات کے بعد ایک نوجوان تخت نشین ہوا۔ اس وقت تمام تر جنوب' مشرقی ایشیا سالنڈرا یا پہاڑوں کے بادشاہوں سے خائف رہتا تھا جو سماٹرا...... جاوا...... اور ملایا کے حکمران تھے اور جب اس نوجوان بادشاہ کے ایک وزیر نے سالنڈرا کی سلطنت کی وسعت اور دولت کا ذکر کیا تو اس نوجوان بادشاہ نے کہا کہ:۔

''میری ایک خواہش جس کی میں تکمیل چاہتا ہوں۔''

جب اس کے درباری نے سوال کیا کہ:۔

''وہ کون سی خواہش ہے جس کی آپ تکمیل چاہتے ہیں''

تب اس نوجوان بادشاہ نے جواب دیا کہ:۔

''میری خواہش یہ ہے کہ میں اپنے سامنے ایک پلیٹ میں پہاڑوں کے بادشاہ کا کٹا ہوا سر دیکھنا چاہتا ہوں''

اس کی اس خواہش کا تذکرہ سالنڈرا کے حکمران کے دربار میں بھی ہوا جو ایک ہزار بحری جہازوں کے ہمراہ چھنلا کی جانب روانہ ہوا اور اس نے دارالخلافے کو تاخت و تاراج کر کے رکھ دیا۔ اس کے بعد اس نے چھنلا کے درباریوں کو حکم دیا کہ وہ دانش ورترین شخص کا انتخاب کریں اور جب انہوں نے اسے اپنے انتخاب سے مطلع کیا تب وہ نئے بادشاہ کو جاوا واپس لے گیا جہاں پر اس نے اسے بادشاہت کے فن اور حکومت چلانے کے فن کی تربیت دی۔

وہ لڑکا ایک بہترین شاگرد ثابت ہوا۔ لہٰذا ایک یا دو سال کے عرصے کے بعد اسے واپس اس کے گھر روانہ کر دیا گیا۔ وہ خمیر تخت پر جایاورمین II کی حیثیت سے تخت نشین ہوا۔ ورمین کا مطلب ہے ''حفاظت کرنے والا'' اور اس کی 60 برسوں پر محیط حکمرانی کے دوران اس کا ملک عظمت کی منزلیں طے کرتا رہا۔ اس نے اردگرد کی ہمسایہ ریاستوں کو اپنا محکوم بنا لیا اور انہیں چھنلا کا حصہ بنا ڈالا۔ اس نے اس تمام علاقے کو متحد کرتے ہوئے اسے کمبوجا (کمبوڈیا) کا نام دیا۔ وہ ایک ان تھک حکمران تھا اور اس کا پہلا دارالخلافہ انگ کور تھام تھا جو کہ انگ کور واٹ کے نزدیک واقع تھا۔ تب اس نے میدان کے پار نقل و حرکت سرانجام دی اور ویسٹ بارے کے نزدیک ایک اور شہر بنایا جہاں پر وہ شان و شوکت کے ساتھ مقیم رہا۔ اس نے خمیر بادشاہوں کے لئے یہ مثال قائم کی کہ وہ لکڑی کی بجائے پتھر یا اینٹیں استعمال کریں۔ اس نے اپنا ایک جداگانہ طرز تعمیر اپنایا تا کہ ان میں اس کی حکمرانی کا عکس نمایاں ہو۔

درمیانی عمر میں وہ جان بوجھ کر سالنڈر کی اطاعت سے دست بردار ہو گیا اور اس کی جانب سے کسی خدشے کے پیش نظر اس نے اپنا دارالخلافہ بھی توم کولن کے شمالی پہاڑ کی جانب منتقل کر لیا جہاں پر اس نے قلعوں کا شہر آباد کیا۔ یہاں پر وہ اپنے آپ کو محفوظ تصور کرتا تھا اور 802ء میں اس نے ایک برہمن کو طلب کیا جو ''جادو'' میں ماہر تھا اور اسے حکم دیا کہ وہ ایک عجیب و غریب تقریب کا اہتمام کرے جو مکمل آزادی اور بے پناہ قوت کے حامل بادشاہوں کے مقدر کرے۔ اس رسم کے بعد ''دیواراجا'' اس سلطنت کا مذہب ٹھہرا...... یعنی بادشاہ کی پوجا پاٹ۔

جایاورمین کو یہ تقریب راس آ گئی اور وہ خمیر سلطنت کو تھائی لینڈ کے کچھ حصوں...... وہ علاقے جن کو اب ہم ویتنام کے نام سے جانتے ہیں اور حتیٰ کہ جنوبی چین کے کچھ علاقے تک وسعت پذیر ہوتے دیکھنے کیلئے زندہ رہا...... لیکن اپنے بڑھاپے کے دور کے دوران اس نے اپنا آخری دارالحکومت گریٹ جھیل کے نزدیک بنایا۔ وہ اسے پری بارالایا کہہ کر پکارتا تھا۔ 850ء میں اس نے وفات پائی اور آئندہ ایک سو برس تک کمبوجا پر کئی ایک بادشاہوں نے حکومت سرانجام دی۔ ان میں سے ایک کا نام راجندر اورمین III تھا۔ اس نے یا سودھرا پور شہر کو خوبصورتی سے نوازا تھا۔ اس نے اس شہر کے گھروں کو چمکتے ہوئے سونے کے ساتھ سجایا تھا اور محلات کو قیمتی پتھروں کے ساتھ سجایا تھا۔ وہ 968ء میں موت سے ہمکنار ہو گیا تھا اور اس

کے بعد سے 1150ء تک کمبوجا کو غیر معمولی حکمران میسر نہ آیا تھا۔

آخری حکمران 1155ء میں موت سے ہمکنار ہوا تھا اور اس کا بیٹا اس کا جانشین بنا تھا۔ لیکن یہ نوجوان شہزادہ کٹر بدھ مت تھا اور جب اس کے ایک کزن نے تخت کا دعویٰ کیا تب جایاورمین نے رضا کارانہ طور پر جلاوطنی اختیار کر لی بجائے اس کے کہ اپنے رشتے دار کے ساتھ جنگ کرتا رہا۔ بدقسمتی سے نیا بادشاہ حکومت پر اپنی گرفت مضبوط نہ کر سکا اور جلد ہی کمبوجا سیاسی بدامنی کا شکار ہو گیا اور اسی دوران اس کا انتقال ہو گیا اور تخت پر ایک اور نوجوان نے قبضہ کر لیا۔

جایاورمین VII 1181ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ اگرچہ اس وقت اس کی عمر 50 برس سے زائد تھی لیکن وہ توانائی سے بھرپور تھا۔ اپنے پیش روؤں کی طرح وہ بھی تعمیرات کا شوقین تھا۔ اس نے لوگوں کی ایک فوج نئے دارالحکومت کی تعمیر پر لگا دی اور لوگوں کی ایک اور فوج ایک اور چھوٹے شہر کی تعمیر پر لگا دی۔ اس نے کئی ایک دیگر خوبصورت مقامات بھی تعمیر کروائے لیکن شاید اس کا یادگار کام انگ کورتھام شہر کی تعمیر نو تھا جو انگ کورواٹ کی عبادت گاہ کے قریب تر واقع تھا۔ جایاورمین تقریباً ایک سو برس کی عمر تک زندہ رہا۔ اس نے تمام ملک میں سڑکیں تعمیر کروائیں اور سیاحوں کیلئے ریسٹ ہاؤس بھی تعمیر کروائے۔ بیماروں کیلئے ہسپتال تعمیر کروائے۔ اس نے کئی ایک عبادت گاہیں بھی تعمیر کروائیں۔

اس حیران کن حکمران کا دور حکومت شان و شوکت کی منہ بولتی تصویر تھا۔ اس کی موت کے بعد سلطنت کی قوت بتدریج کم ہوتی چلی گئی اور ہر طرف سے للچائی ہوئی نظریں کمبوجا کی دولت پر پڑنے لگیں۔ کئی ایک تھائی حملے بھی ہوئے۔ کمبوجا کے تمام صوبے ایک ایک کر کے اس سے علیحدہ ہوتے رہے حتیٰ کہ 1430ء میں تھائی حملہ آوروں نے انگ کورتھام میں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا اور اس کے بہت سے خزانے اپنے ہمراہ لے گئے۔ دربار نے توم پن کی جانب راہ فرار اختیار کی جہاں پر انہوں نے اپنی سابقہ شان و شوکت بحال کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے اور یہ سلطنت بتدریج عدم استحکام کا شکار ہوتی چلی گئی۔ اس سلطنت کی تاریخ کا ریکارڈ محض پتھروں پر تحریر شدہ تھا جو پانچ صد برسوں تک جنگل میں دبے رہے تھے۔

فرانسیسی ماہرین کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا جب انہوں نے ان پتھروں پر تحریر کردہ تحریروں کا ترجمہ کروایا اور ان کو وہ تمام تر تاریخی معلومات حاصل ہوئیں جن کے حصول کے وہ عرصہ دراز سے متمنی تھے۔

فرانسیسی ماہرین سالہا سال تک گرمی کی شدت میں اپنی جدوجہد میں مصروف رہے۔ انہوں نے نہ صرف انگ کورواٹ اور انگ کورتھام کو بازیاب کیا اور بے نقاب کیا بلکہ دیگر عبادت گاہیں اور شہر بھی دریافت کئے اور اب بادشاہوں کے کام کو ان کی سابقہ شان و شوکت کے سائے تلے دیکھا جا سکتا ہے۔ حال ہی میں بنکاک سے براہ راست پرواز کی سہولت دستیاب ہو چکی ہے اور سیاح گرینڈ ہوٹل میں اقامت اختیار کرتے ہیں اور علاقے کی سیاحت سرانجام دیتے ہیں۔

کیپٹن ڈانجو کا ہاتھ

آپ کو کیپٹن ڈانجو کا ہاتھ دیکھنے کے لئے سڈی۔بیل۔ابس جانا ہوگا...... جہاں پر فرانس فارن لیجن کی نشانیاں اور یادگاریں ذخیرہ کی گئی ہیں۔

کیپٹن ان لاتعداد لوگوں میں سے ایک تھا جو اپنے ملک کی خدمات سرانجام دینا چاہتے تھے...... وہ لیجن

اگرچہ کیپٹن ڈانجو ایک فرانسیسی تھا لیکن وہ لیجن کا ایک رکن تھا اور اس حیثیت میں آسٹریا اور الجیریا کی مہمات میں لیجن نے زیر سایہ حصہ لیا تھا۔

1863ء میں وہ فرانسیسی فارن لیجن کی پہلی بٹالین کے ایڈجوٹینٹ کے عہدے پر فائز تھا جو آسٹریا میں برسرپیکار تھی......ایک فرانسیسی فوج جس میں تقریباً 40,000 یورپی دستے شامل تھے اور 13,000 آبائی معاون بھی شامل تھے۔

جب کیپٹن ڈانجو کی بٹالین وہاں پہنچی اس وقت فرانسیسیوں کا رابطہ ویرکروز اور میکسیکو سٹی کے درمیان بحال تھا۔ لیکن یہ رابطہ...... یہ مواصلاتی رابطہ گوریلا حملوں کی زد میں تھا۔ ایک خصوصی فوجی قافلے کی حفاظت کی ذمہ داری تیسری کمپنی کے ذمہ تھی جو حال ہی میں یہاں پہنچی تھی۔ یہ قافلہ سونے چاندی کے سکے لا رہا تھا۔ اس وقت زرد بخار کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ اس کمپنی کے افسران اس بیماری کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ لہٰذا یہ کمپنی اپنے افسران سے محروم ہو چکی تھی۔

کیپٹن ڈانجو جو کہ کئی ایک غیر ملکی مہمات سرانجام دے چکا تھا اس کا یہ فرض بنتا تھا کہ وہ رضا کارانہ طور پر آگے بڑھے اور افسران سے محروم اس محافظ دستے کی کمان سنبھال لے۔ لہٰذا کیپٹن ڈانجو نے ایسا ہی کیا۔ اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بٹالین کے دو جونیئر افسران بھی رضا کارانہ طور پر کیپٹن ڈانجو کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے۔ ان کے نام لیفٹیننٹ ولین اور سیکنڈ لیفٹیننٹ موڈٹ تھے۔ نمبر تین کمپنی کے افراد ملی جلی شہرت کے حامل تھے اور ان کی تعداد 62 تھی۔

ملک میں جابجا جاسوس پھیلے ہوئے تھے اور سونے چاندی کے سکوں کی نقل و حمل جو کہ اگلے محاذوں پر برسرپیکار افراد کو ادا کئے جانے تھے کی خبر دشمن تک بھی پہنچ چکی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان پر قبضہ جمانے کے فوری منصوبے تیار ہونے لگے۔ یہ کام کرنل میلان کے سپرد ہوا جس نے جلدی سے ایک ملی جلی پیدل اور گھوڑ سوار فوج اکٹھی کی جس کی تعداد 2,000 تھی جبکہ کیپٹن ڈانجو اور اس کی محافظ کمپنی کی تعداد محض تیس کے قریب تھی۔

کیپٹن ڈانجو حالات سے بے خبر 30 اپریل کی صبح اپنی کمپنی کے ہمراہ روانہ ہوا۔

وہ ناشتے کے لئے رکے تھے جب ایک سنتری کی نگاہ ایک میکسیکو کے گھوڑ سوار پر پڑی جو ان کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ابھی وہ ان سے کافی فاصلے پر تھا۔ درحقیقت یہ 800 اہل میکسیکو پر مشتمل فوج تھی جو کرنل میلان کی ذاتی کمان میں تھی۔

کیپٹن ڈانجو نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ ہوشیار ہیں اور جوں ہی اہل میکسیکوان کی فائر کی زد میں آئیں وہ فائر کھول دیں۔ دشمن اس ناگہانی آفت سے گھبرا گیا اور اس کی پیش قدمی سست پڑ گئی۔

ڈانجو کا ٹرانسپورٹ کا محکمہ...... وہ دو خچروں پر مشتمل تھا جن پر فاضل راشن اور اسلحہ لدا ہوا تھا...... وہ بھی انتشار کا شکار ہو گیا...... فائرنگ کے اچانک شور کی وجہ سے جانور بدک گئے تھے اور بھاگ نکلے تھے۔ ان پر لدا ہوا فاضل راشن اور اسلحے کا نقصان کیپٹن ڈانجو کیلئے کسی سانحے سے کم نہ تھا لیکن اسے اس سے بڑے مسائل درپیش تھے۔

کیپٹن ڈانجو کو یاد آیا کہ وہ جس راستے سے آئے تھے یہاں سے ایک میل کے فاصلے پر اس راستے پر عمارت کا ایک ڈھانچہ کھڑا تھا جس کا ایک برآمدہ چار دیواری کا حامل تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو بتایا کہ وہ اس عمارت کو مورچہ بناتے ہوئے دشمن کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔

لہٰذا وہ جلد از جلد اس عمارت کی جانب روانہ ہو گئے۔ دو مرتبہ انہیں رک کر اپنے دشمن پر گولی چلانی پڑی جو ان کے تعاقب میں تھا۔ بالآخر وہ منزل مقصود تک پہنچ چکے تھے۔

جب کیپٹن ڈانجو اس عمارت میں مورچہ بند ہوا تب ایک نیا چیلنج اس کے سامنے منہ کھولے کھڑا تھا۔ اس عمارت کی بالائی منزل پہلے ہی اہل میکسیکو کے قبضے میں تھی اور ان کی تعداد کا اندازہ لگانا بھی مشکل تھا۔ کپتان نے دشمن کی بالائی منزل پر موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی سپاہ کو حکم دیا کہ وہ برآمدے کے اندر مورچہ بند ہو جائے۔ اس نے اپنی مختصر تعداد کی حامل سپاہ کو برآمدے میں مختلف مقامات پر مورچہ بند کیا۔ برآمدے میں جو بھی کھلی جگہ پائی گئی اس کو اس سامان کے ساتھ پُر کرنے کی کوشش کی گئی جو دستیاب تھا اور اسی طرح برآمدے کی دیواروں کے کمزور حصوں کو بھی مضبوط بنایا گیا۔

جب یہ کام مکمل کر لیا گیا تو کیپٹن ڈانجو نے اپنی سپاہ کو یہ حکم دیا کہ عمارت کی بالائی منزل اہل میکسیکو سے خالی کروائی جائے؟ جلد ہی یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ بھاری نقصان سے بچتے ہوئے ایسا کرنا ممکن نہ تھا اور اس دوران اصل دشمن بھی نزدیک تر پہنچتا چلا جا رہا تھا۔ یہ بھی دکھائی دے رہا تھا کہ دشمن کی نفری گھوڑوں سے نیچے اتر رہی تھی اور اب وہ بقایا راستہ پیدل طے کر رہی تھی۔ انہوں نے بھی اس برآمدے میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی لیکن ان کا پہلا حملہ کیپٹن ڈانجو کی سپاہ نے پسپا کر دیا تھا جو پہلے ہی برآمدے میں مورچہ لگائے بیٹھے تھے۔ لیکن کچھ ہی لمحات کے بعد ان کے کمانڈر کرنل میلان کی آواز سنائی دی۔ وہ کیپٹن ڈانجو کی سپاہ کو ہتھیار ڈالنے کی تلقین کر رہا تھا اور دوسری صورت میں خطرناک نتائج سے دوچار ہونے کی نوید سنا رہا تھا۔

کیپٹن ڈانجو اتنی آسانی سے ہار ماننے کو تیار نہ تھا۔ اگرچہ اس کی سپاہ کے پاس پرانے فیشن کے ہتھیار تھے اور دشمن کی نفری بھی زیادہ تھی لیکن کیپٹن ڈانجو کو اس بارے میں کوئی تشویش نہ تھی۔ وہ اس صورت حال کی نزاکت سے بخوبی واقف تھا جس صورت حال سے وہ اور اس کی سپاہ دوچار تھی۔ اس نے اپنی سپاہ کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کی اور ان کو اپنے مورچے میں ڈٹا رہنے اور دشمن کے ساتھ برسرپیکار ہونے کی بھی تلقین کی۔ سپاہ نے بھی جواب میں جوشِ جذبے اور ولولے کا مظاہرہ کیا۔ کرنل نے دوبارہ ہتھیار پھینکنے کے لئے کہا تو کیپٹن انجو نے سخت الفاظ میں اس کی اس پیشکش کو مسترد کر دیا۔

اہل میکسیکو نے جلد ہی تمام اطراف سے حملہ کر دیا اور دفاع پر مامور کیپٹن ڈانجو کی سپاہ ہلاک یا زخمی ہونے لگی۔ تھوڑی ہی دیر بعد کیپٹن ڈانجو بھی مارا جا چکا تھا...... ہلاک ہو چکا تھا...... اسے حملہ آوروں نے ہلاک نہیں کیا تھا بلکہ مکان کی بالائی منزل کی کھڑکی سے کسی نے اس پر گولی چلائی تھی اور وہ اسی گولی کے لگنے سے ہلاک ہو چکا تھا۔

کیپٹن ڈانجو کی سپاہ اپنے کمانڈر سے محروم ہو چکی تھی لیکن اپنے بہادر کمانڈر کی ہلاکت کے بعد بھی ان کے حوصلے پست نہ ہوئے تھے کیونکہ لیفٹیننٹ ویلین نے ان کی کمان سنبھال لی تھی اور اپنا دفاع جاری رکھا تھا۔

دشمن کو مزید کمک پہنچ چکی تھی۔ حملے میں مصروف گھوڑ سواروں کو اب ایک ہزار پیدل فوج بھی میسر آ چکی تھی۔ لہٰذا دشمن کے حملے میں بھی شدت آ چکی تھی اور دفاع پر مجبور سپاہ پیاس کی شدت سے بھی بے تاب تھی اور اس کے ساتھ ساتھ سورج کی تپش بھی بڑھ رہی تھی اور گرمی ناقابل برداشت ہوتی چلی جا رہی تھی۔ ان کی ہلاکتیں بھی بڑھ رہی تھیں اور دوپہر سے پیشتر ہی لیفٹیننٹ ویلین بھی ہلاک ہو چکا تھا۔

اس کے ہلاک ہونے کے بعد بھی کمانڈر کا عہدہ خالی نہ رہا تھا کیونکہ سیکنڈ لیفٹیننٹ موڈٹ نے کمان سنبھال لی تھی۔ اس نے اپنی رائفل سنبھال لی تھی اور اپنی سپاہ کے کندھے کے ساتھ کندھا ملاتے ہوئے دشمن کے ساتھ برسرپیکار ہو گیا تھا۔

اگرچہ انہوں نے حملہ آوروں پر اپنی فائرنگ جاری رکھی تھی لیکن لحہ بہ لحہ حملہ آوروں کے قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ برآمدہ اب ہلاک شدگان سے بھر چکا تھا۔ ان میں زخمی سپاہ بھی شامل تھی۔

اگرچہ حالات سازگار نہ تھے لیکن لیجنوری حملہ آوروں پر اپنی فائرنگ جاری رکھے ہوئے تھے اور ان کے حملے پسپا کر رہے تھے۔ اب کچھ میکسیکن برآمدے کے انتہائی نزدیک پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے برآمدے کے ایک حصے کے نزدیک گھاس پھوس کا ڈھیر اکٹھا کر لیا تھا اور اس کو آگ لگا دی تھی۔ برآمدے میں محصور سپاہ ایک نئی مصیبت سے دوچار ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے ہمت نہ ہاری تھی۔

بعد از دوپہر کرنل نے دوبارہ ہتھیار ڈالنے کے لئے کہا لیکن کیپٹن ڈانجو کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا گیا۔

دشمن اگرچہ غیر منظم اور کم تربیت کا حامل تھا لیکن وہ کثیر تعداد میں تھا۔ لہٰذا وہ برآمدے کے انتہائی قریب پہنچنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

سیکنڈ لیفٹیننٹ موڈٹ کے محض پانچ سپاہی زندہ بچے تھے۔ وہ بھی بے جگری کے ساتھ دشمن سے برسرپیکار تھے۔ کچھ ہی دیر بعد موڈٹ اور تین سپاہی ہلاک ہو چکے تھے اور محض تین سپاہی باقی بچے تھے۔

دشمن کے خلاف یہ ایک عظیم جدوجہد تھی۔ وہ لوگ جو اس جنگ میں کام آ چکے اگرچہ وہ نہیں جانتے تھے لیکن یہ ایک حقیقت تھی کہ گراں قدر خزانے کو بچانے کا ان کا یہ مشن کامیابی سے ہمکنار ہو چکا تھا اور یہ خزانہ دشمن کے ہاتھ لگنے سے محفوظ رہا تھا۔ آگے سے بھاری فائرنگ کی آواز سننے کے بعد یہ خزانہ فوجی چھاؤنی واپس بھیج دیا گیا تھا۔

اگلے روز بھاری نفری اس مقام پر پہنچ چکی تھی جس مقام پر کیپٹن ڈانجو اور یکے بعد دیگرے اس کے جونیئر کمانڈنگ افسران اور سپاہ نے داد شجاعت دی تھی۔ اس نفری کو ایک زخمی سپاہی ایسا بھی ملا تھا جو ہنوز زندہ تھا اور اگر تھوڑی دیر تک اسے طبی امداد نہ ملتی تو یقیناً وہ بھی زخموں کی تاب نہ لاتے

ہوئے ہلاکت کا شکار ہو جاتا۔ اسے آٹھ زخم لگے تھے۔ خوش قسمتی سے وہ زندہ بچ گیا تھا اور وہ اس کارروائی کا چشم دید گواہ تھا۔ اس نے اپنے افسران اور ساتھی سپاہی کی بہادری کے کارناموں سے پردہ اٹھایا تھا۔

میکسیکو پر فوجی قبضے کے بقایا دورانیے کے دوران فرانسیسی فوجی دستوں کو یہ احکام جاری کر دیے گئے تھے کہ وہ جب بھی اس مقام سے گزریں تو چند منٹ کیلئے وہاں پر رکیں اور سیلوٹ پیش کریں اور مناسب وقت پر اس مقام پر ایک مستقل یادگار بھی تعمیر کر دی گئی تھی۔ یہ یادگار ان لوگوں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے تعمیر کی گئی تھی جنہوں نے ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کیا تھا اور اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے تھے۔

یہ ایک رواج بن چکا تھا کہ کیمرون میں سالانہ تقریب منعقد ہوتی تھی۔ اس تقریب میں وہ فرانسیسی شرکت کرتے تھے جو میکسیکو کے رہائشی تھے۔ اس کے علاوہ میکسیکو کے افسران بھی اس تقریب میں شرکت کرتے تھے۔ لیجنری جہاں کہیں بھی ہوتے وہ 30 اپریل کو خصوصی پریڈ کا انعقاد کرتے تھے اور اس پریڈ میں ان کا سینئر افسر کیمرون کی جنگ کا حال بیان کرتا تھا۔

سڈی۔ بیل۔ ایس میں سب سے بڑی تقریب منعقد ہوتی تھی ...... یہ تین دن پر مشتمل ایک تقریب ہوتی تھی جو 29 اپریل سے شروع ہوتی تھی۔ اگرچہ اس تقریب میں رنگا رنگ پروگرام پیش کئے جاتے تھے لیکن اس تقریب کی خاص بات کیپٹن ڈانجو کا ہاتھ ہوتا تھا جو پریڈ میں شامل کیا جاتا تھا۔ یہ ہاتھ اس مقام سے ملا تھا جہاں پر کیپٹن ڈانجو بے جگری سے لڑتے ہوا ہلاک ہوا تھا۔

درحقیقت کیپٹن ڈانجو نے اپنا آخری معرکہ ایک مصنوعی ہاتھ پہنتے ہوئے سرانجام دیا تھا۔

.....❁.....

جنرل کسٹر کیلئے پہلی کھوپڑی

وار بونٹ کریک کے نزدیک یہ ایک گرم دوپہر تھی...... بلیک ہلز کے جنوب میں...... بیڈ لینڈز آف ڈاکوٹا میں......امریکی سواروں کا پانچواں دستہ...... جنرل ویسلے میرٹ کی زیرکمان اس ترتیب کے ساتھ کھڑا تھا جیسے لڑائی کے لئے انتہائی تیار ہو۔ تقریباً دوصد گز سے بھی کم فاصلے پر شیونی جنگ جُو اس اشارے کے منتظر تھے جس کے تحت وہ اپنے گھوڑوں کو بھگاتے ہوئے امریکی سپاہ پر حملہ آور ہوں۔

لیکن ان کا سردار...... ییلو ہینڈ......اپنے گھوڑے پر سوار اپنی سپاہ کے سامنے گھوڑے کو آگے اور پیچھے لے جا رہا تھا۔ ییلو ہینڈ نے جنگی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔

انڈین کا گھوڑے کو آگے اور پیچھے حرکت دینے کا محض ایک ہی مطلب ہوتا ہے......وہ کسی ایک سپاہی کو یہ چیلنج پیش کر رہا تھا کہ وہ میدان میں نکلے اور ڈوئیل لڑے۔ جس شخص کو یہ چیلنج پیش کیا جا رہا تھا وہ ایک نمایاں شخص تھا۔ اس نے لمبے بوٹ پہن رکھے تھے۔ سرخ شرٹ زیب تن کر رکھی تھی۔ اس کے سر پر ایک بڑا سا ہیٹ بھی موجود تھا۔ اس کے بال لمبے تھے اور اس کے دونوں کندھوں پر جھول رہے تھے جس طرح عورتوں کے بال جھولتے ہیں۔ اس کا نام بفلو بل کوڈی تھا۔

کوڈی نے چیلنج قبول کر لیا تھا۔ اس نے اپنا گھوڑا بھگایا اور انڈین کی جانب رخ کیا۔ جوں ہی اس نے یہ عمل درآمد اختیار کیا توں ہی ییلو ہینڈ نے اپنے چیلنج کو دہراتے ہوئے اپنا گھوڑا بھگاتے ہوئے کوڈی کی جانب رخ کیا تاکہ اس سے مقابلہ کر سکے۔

دونوں گھوڑ سوار برق رفتاری کے ساتھ ایک دوسرے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ان کی رائفلیں ان کے سینوں کے سامنے تھیں اور ان کی انگلیاں ٹریگر پر رکھی تھیں اور کسی بھی لمحے اسے دبانے کیلئے تیار تھیں۔ جب دونوں کے درمیان محض تیس گز کا فاصلہ رہ گیا تب کوڈی نے گولی چلا دی۔ گولی لگنے سے انڈین کا گھوڑا زمین پر ڈھیر ہو چکا تھا...... گولی اس کے سر میں لگی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کوڈی کے گھوڑے کا پاؤں بھی ایک گڑھے میں جا پڑا اور وہ بھی نیچے آن گرا۔

کوڈی زمین سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی گرفت اپنی رائفل پر ہنوز مضبوط تھی۔ انڈین سردار کی گولی اس کے کان کے نزدیک سے گزر چکی تھی۔ سردار اب سنبھل چکا تھا اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے کوڈی کو اپنی گولی کا نشانہ بنایا تھا۔ کوڈی نے بھی جوابی گولی چلائی۔ انڈین کے سینے میں گولی جا لگی اور وہ نیچے گر گیا۔ لیکن وہ ابھی ہلاک نہ ہوا تھا۔ جونہی وہ نیچے گرا اس کی رائفل بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ زمین تک پہنچنے سے بیشتر اس نے اپنی بیلٹ سے خنجر نکال لیا تھا۔ خنجر سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا اور اس کی چمک کوڈی کی آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔ اس دوران کوڈی بھی اپنی بیلٹ سے چاقو نکال چکا تھا لیکن انڈین کی نظر سے اس کی یہ کارروائی اوجھل رہی تھی۔ کوڈی نے یہ چاقو زمین پر گرتے ہوئے انڈین کی

جانب اچھال دیا۔ انڈین کا خنجر کوڈی کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر اس کے کندھے کے اوپر سے گزر گیا جبکہ کوڈی کا پھینکا ہوا چاقو انڈین کے سینے میں پیوست ہو چکا تھا۔ اگلے ہی لمحے کوڈی شیونی تک جا پہنچا تھا اور اپنا چاقو اس کے سینے سے باہر نکال رہا تھا۔

جوں ہی سردار موت سے ہمکنار ہوا توں ہی بفلو بل کوڈی نے اس کی کھوپڑی کاٹ ڈالی۔ اس کے بعد اس نے انڈین کھوپڑی اپنے سر سے اوپر اٹھاتے ہوئے نعرہ بلند کیا:۔

''کسٹر کے لئے پہلی کھوپڑی''

سپاہ نے تالیاں بجائیں۔ فتح کے شادیانے بجائے گئے اور سپاہ انڈین کے تعاقب میں روانہ ہوئی لیکن وہ اپنے سردار کی ہلاکت کے باعث خوفزدہ ہو چکے تھے۔ لہٰذا انہوں نے لڑائی سے منہ موڑ لیا اور راہ فرار اختیار کر گئے۔

کھوپڑی ہنوز کوڈی کے ہاتھ میں تھی۔ وہ شاہی نشست گاہ کی جانب مڑا اور ملکہ کا آداب بجالایا۔ دور سے بینڈ بجنے کی آواز سنائی دے رہی تھی اور ہزاروں لوگ جنہوں نے سامعین کے ایک ہجوم کی صورت اختیار کر لی تھی تالیاں پیٹ رہے تھے۔

درج بالا ڈرامہ لندن میں گریٹ ارل کورٹ امریکن ایگزبشن میں 1887ء میں ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کی تقریبات کے دوران کھیلا گیا۔ اس ڈرامے کے کردار کاؤبوائے یا پرائیویٹ سپاہی تھے۔ طاقتور انڈین سردار حقیقی تھے۔ اس میں سے بہت...... بفلو بل کی طرح...... حقیقت میں لڑائیوں میں حصہ لے چکے تھے اور دیگر ایسے معاملات میں بھی حصہ لے چکے تھے جو ڈرامے میں دکھائے جا رہے تھے۔

بفلو بل ان مغربی ہیرو میں سے پہلا ہیرو تھا جو اپنے زندگی کے دوران ہی شہرت کی بلندیوں تک جا پہنچا تھا۔ وہ آج کل کے ٹیلی وژن کے کسی بھی مغربی ہیرو سے بڑھ کر مقبول تھا۔ اس کی مقبولیت کی وجہ محض وائلڈ ویسٹ شو ہی نہ تھا بلکہ ہزاروں وہ وائلڈ ویسٹ رسائل تھے جو اس پر فیچر چھاپتے تھے اور وہ ناول اور ڈرامے تھے جو اس پر تحریر کیے جاتے تھے۔

بفلو بل کی حقیقی زندگی کس قدر مہم جوئی کی حامل تھی؟ ''کسٹر کے لئے پہلی کھوپڑی'' کے بعد کس قدر کھوپڑیاں اتاری گئیں...... وہ کھوپڑی جس کو اتارنے کا مظاہرہ کوڈی ہر رات اپنے ڈرامے میں کرتا تھا اور ہفتے کے روز دو بار کرتا تھا؟

ولیم فریڈرک کوڈی نے اسکاٹ کاؤنٹی (لووا) میں جنم لیا تھا۔ وہ 1846ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ ایک اسٹور چلاتا تھا۔ اس نے اپنے بچپن کا زیادہ تر حصہ مقامی انڈین کے ساتھ دوستانہ ماحول میں کھیلتے ہوئے گزارا تھا اور وہ اکثر ان کے کیمپوں میں بھی رہائش پذیر ہو جاتا تھا۔ ان انڈین سے اس نے شکار کرنے کا طریقہ سیکھا...... تیر کمان چلانے کا طریقہ سیکھا...... گھوڑ سواری سیکھی اور انڈین کی کئی ایک مقامی زبانیں بھی سیکھیں۔

جب اس کی عمر گیارہ برس ہوئی تب اس کا والد وفات پا گیا اور بل کو نوکری تلاش کرنی پڑی۔ ویگن گاڑیاں اکثر اس کے گھر کے قریب سے گزرتی تھیں اور اس کی پہلی ملازمت بطور ویگن' گاڑی قاصد تھی۔ یہ گاڑیاں اتنی لمبی ہوتی تھیں...... کبھی کبھار دو یا تین میل لمبی ہوتی تھیں اور اس گاڑی کے کپتان کے لئے یہ ممکن نہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی بقایا پارٹی تک اپنے احکامات پہنچا سکے ماسوائے ایک قاصد کے جو اس کے احکامات اس کی پارٹی کے دیگر ارکان تک پہنچائے۔

ابھی وہ اپنی پہلی ویگن گاڑی کے ساتھ اپنی خدمات سرانجام دے رہا تھا کہ ولیم کوڈی کو اخبارات کے ذریعے شہرت سے لطف اندوز ہونے کا پہلا موقع میسر آیا۔ ویگن پر دو یا تین مرتبہ انڈین نے حملہ کر دیا تھا۔ ایک حملے کے دوران جبکہ ویگنیں رات کے وقت محوِ سفر تھیں اور وہ انڈین علاقے کی حدود سے جلد از جلد باہر نکل جانا چاہتی تھیں کہ لڑکے کی نظر ایک انڈین پر پڑی۔ لڑکے نے انڈین کو گولی کا نشانہ بنا ڈالا حالانکہ وہ انڈین یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ بخوبی چھپا ہوا تھا وہ انڈین ہلاک ہو کر اپنی کمین گاہ سے نیچے آن گرا جو کہ اس نے چٹانوں میں بنا رکھی تھی اور گاڑی کے حکام از حد حیران ہوئے کیونکہ ان کے علم میں یہ بات نہ تھی کہ انڈین ان پر حملہ آور ہونے کے لئے قریب ہی کہیں چھپا بیٹھا تھا۔

جوں ہی گاڑی کیرنی پہنچی...... نوجوان کوڈی کا یہ کارنامہ قصبے کے ہر ایک فرد کی زبان پر تھا۔ اس واقعہ کی خبر مغربی اخبارات تک بھی جا پہنچی تھی جنہوں نے اس لڑکے کو''انڈین کا نوجوان ترین قاتل'' کے خطاب سے نوازا تھا۔

کچھ عرصہ مزید گزر چکا تھا۔ اب بل کی عمر 14 برس کے قریب جا پہنچی تھی۔ بل نے فیصلہ کیا کہ وہ کولوراڈو کا رخ کرے اور اپنی قسمت چمکانے کی کوشش کرے۔ لیکن اس کے ہاتھ کچھ بھی نہ آیا۔ جلد ہی وہ تھک ہار گیا اور بھوک کے ہاتھوں وقت کا شکار ہو گیا۔ اس نے سونے کی تلاش ترک کر دینے کا فیصلہ کیا اور کہیں اور قسمت آزمانے کی ٹھانی۔

اس نے دریائے پلاٹی کی نشیبی جانب سفر شروع کیا۔ یہ سفر اس نے گھر میں تیار کردہ ایک کشتی پر سرانجام دیا۔ وہ مسوری پہنچنے کی جدوجہد میں مصروف تھا لیکن کنساس کے نئے قصبے جیولس برگ کے نزدیک اس کی کشتی تباہی سے ہمکنار ہو گئی۔ اس مقام پر بل خوش قسمت واقع ہوا اور اسے فوراً ایک ملازمت مل گئی۔ اسے پونی ایکسپریس میل سروس میں ایک رائیڈر کی ملازمت مل گئی۔ یہ ملازمت مغرب میں ایک سخت ترین اور خطرناک ترین ملازمت تصور کی جاتی تھی۔

پونی ایکسپریس سان فرانسس کو تا سسی پی ڈاک لے جاتی تھی۔ یہی سفر بر فیلڈ اسٹیج لائن (جنوبی روٹ) سے 34 دن کا حامل سفر تھا۔ پونی ایکسپریس یہ فاصلہ محض دس دن میں طے کرتی تھی۔ دورانِ سفر اسے موسمی حالات کے علاوہ انڈین کا سامنا بھی درپیش رہتا تھا۔ اس کے علاوہ شاہراہ پر ڈاکہ زنی کی وارداتیں سرانجام دینے والے افراد بھی اس کے لئے خطرے کا باعث ثابت ہوتے تھے۔ اس گاڑی نے تیز ترین سفر اس وقت طے کیا تھا جبکہ صدر لنکن کا خطبہ استقبالیہ سینٹ جوزف سے سان فرانسسکو پہنچانا مقصود تھا۔ یہ سفر سات دنوں اور سترہ گھنٹوں میں طے کیا گیا تھا۔

یہ ذمہ داری گھوڑوں پر سرانجام دی جاتی تھی۔ گھوڑے دس تا پندرہ میل کے فاصلے پر تیار کھڑے ہوتے تھے۔ رائیڈر تین علیحدہ علیحدہ گھوڑوں پر سفر طے کرتے تھے اور دوسرے فرد کو ڈاک کا تھیلا تھمانے سے بیشتر تقریباً 35 میل کا سفر طے کرتے تھے۔

کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا تھا کہ جب ایک رائیڈر اپنی منزل پر پہنچتا تھا تو اس کے علم میں یہ بات آتی تھی کہ انڈین نے اس کو تباہ کر دیا تھا یا اس منزل پر موجود شخص کو ہلاک کر دیا تھا یا وہ شخص بیماری سے دوچار ہو چکا تھا۔ ایسی صورت میں اسی رائیڈر کو اگلی منزل تک کا سفر بھی طے کرنا پڑتا تھا اور وہ ممکن حد تک تیز رفتاری کے ساتھ سفر طے کرتا تھا۔

ایک مرتبہ نوجوان بل کوڈی نے آرام کئے بغیر 322 میل کا سفر طے کیا تھا۔ وہ راستے میں کسی بھی مقام پر رکا نہ تھا ماسوائے گھوڑے تبدیل کرنے کیلئے...... یہ ایک طویل ترین سفر تھا جو کسی بھی پونی ایکسپریس رائیڈر نے انفرادی طور پر سرانجام دیا تھا۔ اس مرتبہ پھر اس نوجوان کا کارنامہ

اخبارات کا زینت بنا تھا اور اس کے کارنامے کی خبر ساحل تا ساحل پھیل گئی تھی۔

1861ء میں خانہ جنگی (سول وار) شروع ہو چکی تھی۔ 1863ء میں جبکہ اس کی عمر محض 17 برس تھی...... بل کوڈی نے فوج میں شمولیت اختیار کرلی۔ پہلے اس نے بطور ڈاک رائیڈر خدمات سرانجام دیں مگر مابعد 7 ویں کنساس رجمنٹ میں بطور ایک لڑکا سپاہی خدمات سرانجام دیں۔ اس نے جنرل کسٹر کے زیر کمان بھی انڈین کے خلاف خدمات سرانجام دی تھیں۔ جنگ اپنے اختتام کو پہنچی تب کوڈی کنساس واپس لوٹ آیا۔ یہاں پر ریلوے لائن کی تعمیر کا کام جاری تھا۔ اس تعمیری سرگرمی میں تقریباً 1,200 افراد حصہ لے رہے تھے اور ان تمام افراد نے اپنی غذائی ضروریات بھی پوری کرنا تھیں۔ ان ملازمین کو تازہ گوشت فراہم کرنے کی خاطر خصوصی شکاری بھرتی کیے جاتے تھے۔ ان دنوں گھاس کے وسیع میدان ہنوز بھینسوں سے بھرے ہوئے تھے اور ان کا گوشت ان ملازمین کو طمانیت بخشتا تھا۔

بھینسوں کا شکار مشکل ترین سواری اور اچھی نشانہ بازی درکار رکھتا تھا۔ ان دونوں امور پر کوڈی کو دسترس حاصل تھی۔ اس نے کنساس کی ریل کمپنی کے ساتھ یہ معاہدہ کرلیا کہ وہ انہیں روزانہ بارہ بھینسیں فراہم کرے گا۔ لیکن وہ اس قدر ماہر تھا کہ اس سے زائد تعداد میں بھی فراہم کرسکتا تھا۔ بطور بھینسوں کے شکاری بھی بل کی شہرت دور دور تک پھیل گئی جس طرح بطور پونی ایکسپریس رائیڈر اور انڈین کو ہلاک کرنے کی بدولت اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ ایک مرتبہ پھر اس کا نام مغربی اخبارات کی زینت بن چکا تھا۔ اس کی شہرت میں اس وقت مزید اضافہ ہوا جبکہ اس نے بل کوم شاک کے ساتھ مقابلہ سرانجام دیا...... یہ مقابلہ ''بھینس کے شکاری کے چیمپئن'' کا مقابلہ تھا۔ مقررہ روز سینکڑوں افراد اس مقابلے کو دیکھنے کے لئے آن پہنچے تھے اور بہت سے لوگ کافی دور دراز کے علاقوں سے آئے تھے۔ اس مقابلے کی تشہیر میں ریل روڈ کمپنی نے اہم کردار ادا کیا تھا اور اس مقابلے کو دیکھنے کے لئے لوگوں کو رعایتی نرخوں پر سفر کرنے کی پیش کش بھی کی تھی۔

یہ مقابلہ تین مرحلوں میں سرانجام پانا تھا۔ پہلا مرحلہ صبح کے وقت شکار کا مرحلہ تھا۔ اس مرحلے میں کوم شاک نے 26 بھینسوں کا شکار کیا تھا جبکہ کوڈی نے 38 بھینسوں کا شکار کیا تھا۔ دوپہر کے مقابلے کے مرحلے میں اسکور یہ تھا:۔

کوم شاک: 37 بھینسیں

کوڈی: 56 بھینسیں

حتمی مرحلے کے دوران جو سورج غروب ہونے سے چند لمحے بیشتر اپنے اختتام کو پہنچا تھا...... اسکور درج ذیل تھا:۔

کوڈی: 69 بھینسیں

کوم شاک: 46 بھینسیں

ایک مرتبہ پھر کوڈی کا نام اخبارات کی شہ سرخی بن چکا تھا۔ تمام تر امریکہ کے اخبارات میں یہ خبر چھپی تھی اور پہلی مرتبہ اسے ''بفلو بل'' کا نام دیا گیا تھا۔

اب وہ ایک شکاری کے طور پر اس قدر نام کما چکا تھا...... اس قدر مشہور ہو چکا تھا کہ امریکہ کے کروڑ پتی اور یورپی شاہی خاندان کے افراد اس کی خدمات گراں قدر معاوضے کے عوض حاصل کرتے تھے کہ وہ بھینسوں اور دیگر شکار کے سلسلے میں ان کی رہنمائی سرانجام دے۔ اس نے کئی ایک

علاقہ جات کے انڈین کے ساتھ دوستی قائم کر رکھی تھی۔ لہٰذا اس کے شکاری اپنے دورے کا کچھ حصہ انڈین دیہات میں بھی بسر کرتے تھے۔ بہت سے ڈیوک..... شہزادے یا کروڑپتی لوگ جب یورپ واپس روانہ ہوتے تھے تو وہ یہ تصور کر رہے ہوتے تھے کہ وہ انڈین کے تمام تر امور سے نپٹنے کے قابل ہو چکے تھے۔

بفلو بل اب مغربی رسائل کا ہیرو بن چکا تھا۔ اس کے بارے میں کہانیاں نیڈ بنٹ لائن تخلیق کرتا تھا جو ایک معروف ناول نگار اور ڈرامہ نویس تھا اور نیویارک میں رہائش پذیر تھا۔ بنٹ لائن نے بفلو بل کے بارے میں کتب تحریر کرتے ہوئے اور ڈرامے تحریر کرتے ہوئے اپنی قسمت کو خوب چمکایا تھا۔ کوڈی کے حصے بھی قابل ذکر رائلٹی آئی تھی۔

بنٹ لائن نے کوڈی کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنے اوپر لکھے گئے ڈراموں میں بذات خود اداکاری کے جوہر دکھائے۔ کوڈی کو قطعاً تجربہ نہ تھا کہ اسٹیج پر کام کس نوعیت کا حامل ہوتا تھا اور کس طرح سرانجام دیا جاتا تھا۔ لیکن اسے 500 ڈالر فی ہفتہ کی پیش کش ہوئی تھی۔ وہ اس پرکشش پیش کش کو ٹھکرا نہ سکا۔

پہلی شب بل نے نیویارک میں اپنی اداکاری سرانجام دی۔ اسے اپنے اسکرپٹ کی ایک سطر بھی یاد نہ رہی تھی۔ وہ گونگا بنا اسٹیج کے عین وسط میں کھڑا تھا۔

جب یہ محسوس کیا جانے لگا کہ یہ شو سانحہ کا شکار ہو کر اپنے اختتام کو پہنچے گا..... تب تماشائیوں میں سے کسی نے پکارا کہ:۔

"بل..... ہمیں انڈین کے بارے میں کچھ بتاؤ۔"

لہٰذا بل نے ایسا ہی کیا۔ اس نے ان شکاروں کے بارے میں بتایا جو وہ اب تک کر چکا تھا اور ان لاتعداد حیوانوں کے بارے میں بتایا جنہیں وہ ہلاک کر چکا تھا۔ جب اس نے اس امر کا مظاہرہ کیا کہ وہ ایک انڈین حملے میں کس جرأت کا مظاہرہ کر چکا تھا۔ اس نے جب اپنے ریوالور کے ساتھ وحشیوں کے تصوراتی مجمعے کو نشانہ بنایا تو تماشائی اٹھ کھڑے ہوئے اور زور زور سے تالیاں پیٹنے لگے۔

اس کے بعد تماشائی کھیل بھول چکے تھے۔ بل کی فی البدیہہ پرفارمنس دہرائی جانے لگی لیکن تصوراتی انڈین کی بجائے اداکار انڈین کے حلیے میں پیش ہوتے تھے اور یہی سب کچھ مابعد بفلو بل وائلڈ ویسٹ شو کی بنیاد بنا۔ لیکن جلد ہی اسٹیج اپنی شان و شوکت کھو چکی تھی اور بل بھی واپس چلا آیا تھا۔

سول وار کے خاتمے تک بہت سے لوگ ہجرت کر رہے تھے اور مغرب میں آباد ہو رہے تھے بالخصوص انڈین اور ڈاکوٹا میں شیونی اس امر کے مخالف تھے۔ وہ آمادہ جنگ ہوئے مگر شکست ان کا مقدر بنی۔ 1868ء کا معاہدہ طے پایا اور اس معاہدے کے تحت ان کی زمینوں کا کافی زیادہ حصہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ محض بلیک ہلز کا علاقہ انڈین کی تحویل میں رہ گیا تھا اور اس علاقے کو اس وقت تک کیلئے انڈین کی تحویل میں دے دیا گیا تھا "جب تک دریا بہتا اور سورج چمکتا رہے گا"۔

جب جنرل کسٹر نے بلیک ہل میں فوجی مہم سرانجام دی اور وہاں پر سونے کے ذخائر دریافت کیے تب انڈین کے ساتھ جنگ ناگزیر ہو گئی۔

حکومت نے انڈین سے بلیک ہل کا علاقہ خریدنے کی پیشکش کی۔ انڈین نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ:۔

"وہ اپنے آباؤ اجداد کی ہڈیاں نہیں بیچ سکتے۔"

انہوں نے جنگ کی دھمکی دے دی۔

جنرل کروک نے انڈین کو حکم دیا کہ وہ واپس پلٹ جائیں۔اس نے مزید کہا کہ اگر وہ واپس نہیں پلٹیں گے تب ان پر حملہ کیا جائے گا اور انہیں ڈنڈے کے زور پر ایسا کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔ بہت سے انڈین نے ان احکامات کو نظر انداز کر دیا۔ان کے جنگی رہنما ٹسنگ بل اور کریزی ہارس تھے۔گھوڑ سواروں کی فوج دریائے پاؤڈر روانہ کی گئی جہاں پر انڈین نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔سخت سردی تھی...... درجہ حرارت نقطہ انجماد سے 60 درجے نیچے تھا...... سپاہ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور وہ پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔کرنل رینالڈ جو کہ اس مہم کا کمانڈر تھا اس کا کورٹ مارشل ہوا۔

اب یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس وقت تک انتظار کیا جائے حتیٰ کہ موسم کی شدت میں کمی واقع ہو جائے اور موسم قدرے گرم ہو جائے اور اس کے بعد انڈین کو واپس دھکیلنے کے منصوبے پر عمل درآمد کیا جائے۔ یہ منصوبہ تشکیل دیا گیا تھا کہ کریزی ہارس اور سٹنگ بل کے بڑے انڈین کیمپ کو نشانہ بنایا جائے۔جنرل کسٹر 7 ویں گھوڑ سوار دستوں کے ہمراہ شمال' مشرق میں گھیرا ڈالے گا اور حملہ آور ہو گا جبکہ جنرل گبن شمال' مغرب کی جانب سے حملہ آور ہو گا۔اس دوران جنرل کرک...... سپریم کمانڈر براہ راست دریائے پاوڈر کے کیمپ کی جانب پیش قدمی کرے گا۔17 جون 1876ء کو کرک کو روز بڈ کی لڑائی میں بے تحاشا ہزیمت اٹھانی پڑی۔

اسی ماہ کے دوران بفلو بل کا کھیل واشنگٹن میں جاری تھا۔اس نے ہر ایک کو حیران کر کے رکھ دیا تھا...... اداکاروں اور تماشائیوں کو بھی...... وہ میکسیکن طرز کے لباس میں ملبوس اسٹیج کی زینت بنا...... ایک ٹیلی گرام لہرائی اور چلایا کہ:۔

"میں جنگ پر جا رہا ہوں...... میں مغرب کی جانب روانہ ہو رہا ہوں اور جنگ کا حصہ بننے جا رہا ہوں"

یہ ٹیلی گرام جنرل شیرارڈن کے ہیڈ کواٹر سے تھی جس میں اسے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ 5 ویں گھوڑ سوار دستے میں رپورٹ کرے جو کہ ڈینور کے قریب موجود تھا۔

بل خوشی سے اس قدر دیوانہ ہو چکا تھا کہ اپنا اسٹیج کا لباس تبدیل کرنے کے لئے بھی نہ رکا۔جب وہ گاڑی پر سوار ہوا اس وقت بھی وہ اسٹیج کے لباس میں ملبوس تھا۔جب وہ 5 ویں گھوڑ سوار دستے کے ہیڈ کواٹر پہنچا تو اس کے حلیے کی جانب کچھ نگاہیں حیرانگی کے عالم میں اٹھیں لیکن اس پر کوئی تبصرہ نہ کیا گیا۔

22 جون کو بفلو بل اور 5 واں گھوڑ سوار دستہ باغیوں کے خفیہ ٹھکانوں کی تلاش میں تھا۔تقریباً ایک ماہ کی جدوجہد کے بعد بھی وہ ان ٹھکانوں کو ڈھونڈنے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔جولائی کے وسط میں سپاہ اپنے ہیڈ کواٹر واپس پہنچ چکی تھی جو فورٹ لارامی میں واقع تھا۔

اس وقت یہ اطلاع موصول ہوئی تھی کہ 800 شیونی جنگجو اپنے ٹھکانوں سے نکل کر سٹنگ بل میں شمولیت اختیار کرنے کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔یہ احکامات جاری کئے گئے تھے کہ ان کو ان کے مطلوبہ مقام تک پہنچنے سے ہر حال میں روکا جائے۔

نقشوں کی پڑتال کرنے کے بعد بفلو بل اور دیگر عملہ (واضح رہے کہ بفلو بل کو اس علاقے سے بخوبی واقفیت تھی)...... اور جنرل میرٹ اس نتیجے پر پہنچے کہ انڈین سے بلیک ہل کے جنوب میں کسی مقام پر مڈبھیڑ ہو سکتی تھی۔

میرٹ نے جس مقام کا انتخاب کیا تھا وہ مقام فورٹ لارامی کے شمال' مشرق میں 86 میل کی دوری پر واقع تھا۔جوں ہی گھوڑ سواروں کا

5 واں دستہ اپنی طویل پیش قدمی سرانجام دینے کی تیاریوں میں مصروف تھا توں ہی یہ اطلاع موصول ہوئی کہ جنرل کسٹر اور 7 ویں گھوڑ سوار دستے کا لٹل بگ ہارن کی لڑائی میں انڈین نے مکمل صفایا کر دیا تھا۔ جوں ہی 5 ویں دستے کو کوچ کرنے کا سگنل ملا تو اس دستے نے اپنے جھنڈے بلند کئے اور انہوں نے شمال کی جانب پیش قدمی شروع کی...... ان کے دلوں میں اپنے ساتھیوں کی موت کا بدلہ لینے کا جذبہ شدت کے ساتھ سر اٹھارہا تھا اور یہ جذبہ ہر ایک سپاہی کے دل میں موجزن تھا۔ دن ڈوبنے تک 17 ویں بفلو بل اور ''کے'' کمپنی کا لیفٹیننٹ کنگ مطلوبہ مقام پر اپنی پوزیشن سنبھال چکا تھا اور انڈین کے انتظار میں تھے۔ جنوب' مشرق کی جانب سے انڈین کی آمد متوقع تھی۔ دیگر فوجی جو سواروں کی سات کمپنیوں پر مشتمل تھے وہ انتہائی محفوظ مقام پر چھپے بیٹھے تھے۔

صبح 5 بجے انڈین آتے دکھائی دیے۔ شیونی کی بڑی پارٹی یقیناً یہ نہیں جانتی تھی کہ ان کی سرکوبی کے لئے سپاہ موجود تھی۔ لیکن وہ جس عمل در آمد کا مظاہرہ کر رہے تھے اس سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ جنوب' مغرب میں کسی چیز میں دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ ویگن ٹرین تھی۔

وہ دستے جو ٹرین کے آگے جا رہے تھے وہ اس امر سے بے خبر تھے کہ شیونی دیکھے جا چکے تھے۔ ویگن ٹرین سے آگے جانے والی سپاہ اس جگہ کی تلاش میں تھے جہاں پر 5 ویں دستے نے کیمپ لگا رکھا تھا۔ انڈین بھی فوجی دستے کے دو سپاہ کو دیکھ چکے تھے۔ سات انڈین پر مشتمل ایک چھوٹی سی جماعت دیگر انڈین سے جدا ہو کر اس پہاڑی کے سامنے گھوڑوں پر سوار چلی جا رہی تھی جہاں پر بفلو بل اور لیفٹیننٹ کنگ حالات پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ لوگ دونوں سپاہ کو ہلاک کرنا چاہتے تھے۔

کوڈی نے اس موقع کو غنیمت جانا اور انڈین مشرق کی جانب سے انڈین کی آمد متوقع تھی۔ دیگر فوجی جو سواروں کی سات کمپنیوں پر مشتمل تھے وہ انتہائی محفوظ مقام پر چھپے بیٹھے تھے۔

صبح 5 بجے انڈین آتے دکھائی دیے۔ شیونی کی بڑی پارٹی یقیناً یہ نہیں جانتی تھی کہ ان کی سرکوبی کے لئے سپاہ موجود تھی۔ لیکن وہ جس عمل در آمد کا مظاہرہ کر رہے تھے اس سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ جنوب' مغرب میں کسی چیز میں دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ ویگن ٹرین تھی۔

وہ دستے جو ٹرین کے آگے جا رہے تھے وہ اس امر سے بے خبر تھے کہ شیونی دیکھے جا چکے تھے۔ ویگن ٹرین سے آگے جانے والی سپاہ اس جگہ کی تلاش میں تھے جہاں پر 5 ویں دستے نے کیمپ لگا رکھا تھا۔ انڈین بھی فوجی دستے کے دو سپاہ کو دیکھ چکے تھے۔ سات انڈین پر مشتمل ایک چھوٹی سی جماعت دیگر انڈین سے جدا ہو کر اس پہاڑی کے سامنے گھوڑوں پر سوار چلی جا رہی تھی جہاں پر بفلو بل اور لیفٹیننٹ کنگ حالات پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ لوگ دونوں سپاہ کو ہلاک کرنا چاہتے تھے۔

کوڈی نے اس موقع کو غنیمت جانا اور انڈین کو نیست و نابود کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس نے جنرل میرٹ سے درخواست کی جو اس منظر پر نمودار ہو چکا تھا اور اس کے ہمراہ گھوڑ سواروں کی ایک مختصر جماعت تھی جو پہاڑی کے پیچھے چھپی ہوئی تھی کہ اسے ان سات انڈین پر حملہ آور ہونے کی اجازت فراہم کی جائے۔ لہٰذا جنرل میرٹ نے اسے اجازت فراہم کر دی۔

بفلو بل اب بڑی شدت کے ساتھ پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا لیفٹیننٹ کنگ کے اشارے کے انتظار میں تھا۔ اس افسر نے کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہ کیا۔ اس نے اس وقت تک انتظار کیا حتیٰ کہ انڈین کے قدموں کی چاپ اس کے کانوں میں سنائی دینے لگی اور اس کے بعد اس نے اشارہ

دے دیا۔ اس وقت وہ انڈین ایک سو گز سے کم فاصلے پر تھے۔

بفلو بل نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اپنے مختصر دستے کے ہمراہ نعرہ مارتا ہوا ان حیرت زدہ انڈین کے سروں پر جا پہنچا۔ ان میں سے ایک انڈین رک گیا۔ پہاڑی کی چوٹی سے ایک گولی آئی اور اس انڈین کے گھوڑے کی کاٹھی پر جا لگی۔ اس کے بعد انڈین کی بڑی جماعت کی جانب سے فائرنگ شروع ہوگئی۔ ہزاروں انڈین پہاڑی کی جانب بڑھنے لگے۔ جنرل میرٹ نے بھی اپنے سپاہ کو برسرپیکار ہونے کے احکامات جاری کر دیے۔

اس دوران بفلو بل انڈین کی مختصر جماعت کی جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ اور انڈین آپس میں ایک دوسرے تقریباً 30 گز کے فاصلے پر تھے جبکہ انہوں نے بیک وقت ایک دوسرے پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ کوڈی کی گولی انڈین کی ٹانگ میں دھنس چکی تھی اور اس کا گھوڑا بھی زمین بوس ہو رہا تھا۔ انڈین کی گولی کوڈی کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر اس کے سر کے اوپر سے گزر چکی تھی۔ اسی لمحے کوڈی کے گھوڑے کا پاؤں ایک گڑھے میں جا پڑا اور وہ بھی نیچے گر گیا۔

کوڈی نے سوچا شاید اس کے گھوڑے کو گولی لگ چکی تھی۔ لہٰذا وہ گھوڑے سے اچھل پڑا۔ اس نے اپنی رائفل تھام لی...... جوں ہی انڈین اٹھ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہوں کوڈی نے گولی چلا دی اور انڈین موت سے ہمکنار ہو چکا تھا۔ کوڈی اس کی جانب دوڑا...... اس کے سر سے جنگی ٹوپی اتاری اور جوں ہی گھوڑ سوار انڈین کی بڑی جماعت کی جانب پیش قدمی کر رہے تھے...... وہ چلا اٹھا کہ:۔

''جنرل کسٹر کیلئے پہلی کھوپڑی''

جب گھوڑ سوار دستے آگے بڑھ گئے تو کوڈی کے علم میں یہ بات آئی کہ انڈین نے ایک سنہری بالوں والی عورت کی کھوپڑی پہن رکھی تھی۔ اس امر نے بفلو بل کو اس قدر ناراض کر دیا کہ وہ مردہ انڈین کی کھوپڑی اس کے سر پر واپس رکھنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس سے پہلے یہ خیال اس کے ذہن میں نہ آیا تھا۔

مابعد اس انڈین کی شناخت کر لی گئی تھی۔ ایک انڈین اسکاوٹ نے اس کے نام کا ترجمہ ''ییلو ہیئر'' کیا تھا۔ یہ وہی نام تھا جو انڈین نے جنرل کسٹر کو دے رکھا تھا۔ یہ آنجہانی جنرل کی توہین تھی۔ لہٰذا بفلو بل نے اس نام کو تبدیل کر کے ''ییلو ہینڈ'' کر دیا۔

ییلو ہینڈ اس دن جنرل کسٹر کے لئے واحد کھوپڑی تھی۔ انڈین کے خلاف کارروائی کے احکامات فوری طور پر صادر کر دیے گئے تھے۔ انڈین ابھی کافی فاصلے پر تھے۔ جب انہوں نے فوجی دستوں کو اپنی جانب بڑھتے دیکھا تو وہ پیچھے کی جانب مڑے اور راہ فرار اختیار کر گئے کیونکہ ایسا کرنے کیلئے ان کے پاس کافی وقت موجود تھا۔ وہ ہر ایک سمت میں پھیل گئے...... انہوں نے اپنا اسلحہ، اپنے کمبل اور دیگر جنگی ساز و سامان بھی پھینک دیا کیونکہ یہ ان کے بھاگنے کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ تھا۔

اس کے بعد انڈین کبھی سٹنگ بل میں اکٹھے نہ ہوئے

بفلو بل نے 1917ء میں وفات پائی۔

......❁......

ریڈ کراس کا ماخذ

دنیا بھر کے لوگ ریڈ کراس کی کارگزاریوں سے بخوبی واقف ہیں۔ ریڈ کراس زمانہ امن اور زمانہ جنگ کے دوران بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ جب کبھی بھی بنی نوع انسان کو خطرات آن گھیریں تب بھی ریڈ کراس فعال ہو جاتی ہے اور بنی نوع انسان کی خدمت میں مصروف ہو جاتی ہے۔ جنگ کے دنوں میں بھی اس کی خدمات نا قابل فراموش ہوتی ہیں اور گراں قدر اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ یہ نہ صرف زخمی سپاہ کیلئے باعث رحمت ثابت ہوتی ہے بلکہ مصائب کا شکار شہریوں کیلئے باعث رحمت ثابت ہوتی ہے۔ یہ جنگی قیدیوں کی بھی خبر گیری کرتی ہے اور جنگی قیدیوں کے تبادلوں میں بھی اپنا کردار سرانجام دیتی ہے۔ زمانہ امن میں بھی اس کی خدمات نا قابل فراموش ہوتی ہیں۔ اگر خدانخواستہ کوئی سانحہ پیش آئے ......کوئی قدرتی آفت منظر عام پر آ جائے تو ریڈ کراس فوراً موقع پر پہنچتی ہے اور اپنی کارروائی میں مصروف ہو جاتی ہے۔ کئی ایک لحاظ سے ریڈ کراس ہماری روزمرہ زندگیوں کا ایک حصہ بن چکی ہے۔ اس نے کئی ایک مقامات پر اپنے دفاتر قائم کر رکھے ہیں جو ہماری مصروف ترین سڑکوں پر حادثات کے واقعات سے نپٹتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ابتدائی طبی امداد کی تربیت بھی فراہم کرتی ہے۔

ہم ریڈ کراس کی موجودگی کے اس حد تک عادی ہو چکے ہیں کہ ہم میں سے کچھ لوگ یہ جاننے کی خواہش رکھتے ہیں کہ ریڈ کراس کا آغاز کیسے ہوا اور اس کے آغاز کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔

ریڈ کراس کا خیال سوئٹزرلینڈ کے ایک قابل ڈاکٹر کے ذہن میں ابھرا تھا۔ اس کا نام جین ہنری ڈونانٹ تھا۔ اس نے 1828ء میں جنیوا میں جنم لیا تھا اور بچپن میں ہی اس کے سر پر یہ بھوت سوار تھا کہ وہ جب بڑا ہوگا تب ضرور ایک ڈاکٹر بنے گا۔ اسکول کے زمانے میں وہ ایک ذہین طالب علم تھا اور اس کے استاد اس سے انتہائی خوش تھے۔ اس کے والدین بھی یہ قیاس کرتے تھے کہ ان کا بیٹا دنیا میں بہت نام کمائے گا اور از حد ترقی کرے گا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا جس قسم کی بھی تعلیم حاصل کرنا چاہے گا وہ اسے اس قسم کی تعلیم کے حصول کا موقع ضرور فراہم کریں گے۔ لیکن جب وہ جین ہنری سے اس سلسلے میں سوال کرتے تھے تو اس کا جواب ہمیشہ یہی ہوتا تھا کہ وہ اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد یونیورسٹی جانا چاہتا تھا اور طب کی تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اس نے اپنے وضع کردہ پروگرام پر اپنے عمل درآمد کو ممکن بنایا اور اس کے یونیورسٹی کے پروفیسر بھی اس سے بالکل اسی طرح خوش تھے جس طرح اس کے اسکول کے اساتذہ اس سے خوش تھے۔ ان کی یہ رائے تھے کہ یہ نوجوان غیر معمولی صلاحیتوں اور قابلیتوں کا حامل تھا۔ لہٰذا جب وہ فائنل ائر میں پہنچا تب یہ پیشین گوئیاں کی جانے لگیں کہ وہ طب کے کس شعبے میں خصوصی تعلیم حاصل کرے گا۔ لیکن اس نے کسی بھی شعبے میں خصوصی تعلیم حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر نہ کی۔ اس کی گریجوایشن کی تقریب میں اسے کئی ایک انعامات سے نوازا گیا۔ اس کے باپ کی بھی یہ خواہش تھی کہ وہ

طب کے کسی خاص شعبے میں خصوصی تعلیم حاصل کر کے اپنا نام کمائے اور طب کے شعبے میں خصوصی مہارت حاصل کرتے ہوئے ایک قابل ذکر ماہر طب کہلائے جس کے لئے سوئٹزرلینڈ مشہور تھا۔ اس کی مزید تعلیم کے حصول کیلئے رقم کا کوئی مسئلہ درپیش نہ تھا کیونکہ اس کا باپ اس کے تعلیمی اخراجات بخوبی برداشت کر سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے جین ہنری کو یہ پیشکش کی کہ وہ مزید تعلیم جاری رکھ سکتا تھا۔

لیکن جین ہنری نے اپنے باپ کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے اسے مزید تعلیم حاصل کرنے کی پیش کش کی تھی۔ اس نے اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ مزید تعلیم حاصل کرنے کی بجائے وہ ہسپتال میں فاضل تجربہ حاصل کرے گا اور دیگر گریجوایٹس کی نسبت زیادہ عرصے تک ہسپتال میں تجربہ حاصل کرے گا...... وہ جنرل پریکٹیشنر بننے کا خواہاں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا اور وہ اس امر پر یقین رکھتا تھا کہ ڈاکٹر کی حقیقی ذمہ داری غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد کرنا تھا...... ان لوگوں کی مدد کرنا تھا جو جسمانی یا ذہنی معذوری کا شکار تھے...... ان بے شمار افراد کی مدد کرنا تھا جو اپنی مدد آپ کرنے کے قابل نہ تھے۔

اس کا باپ اس کے رویے سے خوش نہ تھا۔ وہ ایک کاروباری شخص تھا اور اسے اس بات سے شدید دکھ پہنچا تھا کہ اس کے بیٹے نے اس کی فراخ دلانہ پیشکش کو مسترد کر دیا تھا۔ اس نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''مسئلہ یہ ہے کہ جین ہنری زندگی کو مثالیت پسند نظریے کے تحت دیکھتا ہے''۔

اس کی بیوی نے آہستگی کے ساتھ جواب دیا کہ:۔

''جوہاں ہیزچ لپسٹالوزی کی طرح۔''

لپسٹالوزی زیورخ کا ایک مشہور ماہر تعلیم ہو گزرا تھا جس نے اپنی تمام تر زندگی ایسے اسکول کھولنے کے لئے وقف کر رکھی تھی جس میں بچے اس کے نئے طریقہ تعلیم اور طرز تعلیم سے مستفید ہوتے تھے۔

لہٰذا اس کے باپ نے اس کی ماں سے اتفاق رائے کرتے ہوئے آہستگی کے ساتھ کہا کہ:۔

''ہاں لپسٹالوزی کی طرح۔''

لہٰذا جین ہنری کے باپ نے اسے طب کے شعبے میں خصوصی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور نہ کیا۔ جین ہینری نے ہسپتال میں تجربہ حاصل کرنے کے بعد اپنی طبی پریکٹس شروع کر دی لیکن جلد ہی اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ جنیوا ایک خوشحال شہر تھا اور چونکہ اہل سوئٹزرلینڈ صاف ستھرے اور صفائی پسند لوگ تھے جو صفائی ستھرائی اور حفظان صحت کی اصولوں پر قرار واقعی توجہ دیتے تھے۔ لہٰذا ایسے ماحول میں جراثیموں کے پرورش پانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جین ہنری جس طرح کا کام سرانجام دینے کا خواب دیکھتا تھا وہ کام یہاں پر موجود نہ تھا...... لہٰذا وہ سرحد پار کرتے ہوئے اٹلی جا پہنچا اور اس کے قصبے سولفی رینو میں آباد ہو گیا۔

اس کی زندگی نے ایک بالکل ہی مختلف تصویر پیش کی۔ اس کی پریکٹس ایک ایسے مقام پر تھی جو ایک پسماندہ مقام تھا۔ یہاں کے مکان چھوٹے چھوٹے تھے اور یہ مقام ایک گنجان آباد مقام تھا۔ لوگوں کو انتہائی جدوجہد سے واسطہ پڑتا تھا۔ ایسی صورت حال کے تحت بیماریاں کثرت کے

ساتھ پھیلتی تھیں اور جس وقت اس کی عمر تیس برس ہوئی اس وقت وہ ایک دن میں 14 یا 15 گھنٹے کام سرانجام دیتا تھا۔ اس کے مریض اس سے محبت کرتے تھے اور مقامی حکام اس سے نفرت کرتے تھے۔ وہ اسے ایک ایسا غیر ملکی تصور کرتے تھے جو مداخلت بے جا کا مرتکب ہو رہا تھا اور کھلم کھلا ان کی شکایت کر رہا تھا کہ انہوں نے اپنے شہریوں کو نظر انداز کر رکھا تھا اور ان کی فلاح و بہبود سے غافل دکھائی دیتے تھے۔ وہ ڈونانٹ کو قدر کی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے لیکن وہ بھی اپنی دھن کا پکا تھا۔ اس نے حکام کے احتجاج کو نظر انداز کر رکھا تھا اور اپنے کام میں مشغول تھا۔ اسے اٹلی کے کئی ایک ڈاکٹروں کا تعاون بھی حاصل تھے جو اس کی تعریف کرتے نہ تھکتے تھے۔ وہ اس کی صاف گوئی اور بے باکی سے بھی از حد متاثر تھے۔

1858ء میں یہ مثالیت پسند پریشان ہو کر رہ گیا تھا۔ فرانس کے نپولین III نے اٹلی کے ساتھ ایک معاہدہ کیا تھا...... ان کا مقصد یہ تھا کہ اٹلی سے آسٹریا کی قوت کے تمام تر نشانات حرف غلط کی طرح مٹا دیے جائیں۔ نپولین جو اس غلط فہمی کا شکار تھا کہ اسے فوجی دانش وری اپنے چچا سے وراثت میں ملی تھی...... اس نے اس پیچیدہ منصوبہ کو ترتیب دیا...... اس منصوبے کے تحت اس نے اٹلی کے راستے اپنی فوج کو شمال کی جانب لے جانا تھا۔ یہ تمام تر مہم غلط انتظام و انصرام کا شکار ہو کر رہ گئی تھی اور 1859ء میں جس وقت وہ ماجینٹا اور سلفرینو پہنچے تب فرانسیسی اپنی فوج کو مکمل تباہی سے بچانے کی خاطر انتہائی مایوسی کے عالم میں برسرپیکار تھے جس کے نتیجے میں سلفرینو کی لڑائی ایک خونریز لڑائی ثابت ہوئی اور اس کے علاوہ کسی المیے سے کم بھی ثابت نہ ہوئی۔ اس لڑائی کی وجہ سے شہری آبادی ناقابل بیان مصائب کا شکار ہوئی اور لڑائی میں حصے لینے والے بھی اسی قسم کے مصائب کا شکار ہوئے۔

اس دوران جین ہنری ڈونانٹ ان تھک خدمات سرانجام دیتا رہا۔ حتیٰ کہ جب لڑائی اپنے جوبن پر تھی اس وقت وہ میدان جنگ روانہ ہو جاتا تھا اور کسی خطرے کی پرواہ نہ کرتا تھا...... وہ زخمیوں کی تیمارداری کرتا تھا...... لحہ بہ لحہ موت کی جانب بڑھنے والوں کو زندگی کی جانب واپس لوٹانے کی جدوجہد کرتا تھا...... جو لوگ رینگنے کے قابل ہوتے تھے ان کو علاج معالجے کی غرض سے محفوظ مقامات تک پہنچاتا تھا۔ اتنی کثیر تعداد میں لوگ اس کی توجہ کے مستحق تھے کہ اس کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ہر ایک کی مدد کیلئے آگے بڑھے اور جب لڑائیاں اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی تب بھی سینکڑوں زخمی زمین پر دراز تڑپ رہے تھے۔ ان کے اردگرد لاشیں بکھری ہوئی تھیں جو ان کے ساتھیوں یا ان کے دشمنوں کی تھیں۔ ان کی چیخ و پکار ہر ایک سمت پر سنائی دیتی تھی۔

ڈونانٹ دن رات خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ اس کے ہمراہ کچھ رضا کار بھی تھے۔ وہ لوگ اپنے رہنماؤں کو کوس رہے تھے جنہوں نے اپنی سپاہ کو کسمپرسی کی حالت میں مرنے کے لئے چھوڑ رکھا تھا۔

طلوع فجر ہو چکی تھی...... ڈونانٹ تھکا ماندہ تھا...... اس کے پاؤں اس کا بوجھ اٹھانے سے قاصر دکھائی دے رہے تھے لیکن ہنوز بہت سے افراد اس کی توجہ کے مستحق تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ایک مختصر سا آرام اس کے لئے کس قدر ضروری تھا تاکہ وہ تازہ دم ہو سکے اور دوبارہ خدمت خلق میں مصروف ہو سکے۔

اگلے ہفتے ڈونانٹ نے 24 گھنٹے خدمات سرانجام دیں۔ وہ محض کھانا کھانے کیلئے کچھ وقت مختص کرتا رہا یا پھر اونگنے کے لئے چند لمحات تک اپنی سرگرمیاں معطل کرتا رہا۔ اس نے اپنے وقت کی تقسیم سرانجام دے رکھی تھی۔ اپنے وقت کو اس نے سپاہ اور بے گھر مریضوں میں تقسیم کر رکھا

تھا جن کے لئے وہ خصوصی ذمہ داری کا مظاہرہ کرتا تھا۔ اس نے علاقے کے تمام ترطبی ماہرین سے بھی اپیل کی اور اس طرح اسے مزید طبی ماہرین میسر آ گئے جو اس کے ہمراہ خدمت خلق میں مصروف ہو گئے۔ وہ اخباری نمائندوں کی نگاہوں میں بھی آ چکا تھا اور جلد ہی تمام تر یورپ کے اخبارات میں سولفرینو کے مصائب زدہ افراد کے بارے میں آرٹیکل شائع ہونے لگے۔ مقامی حکام اس دن کو کوس رہے تھے جس دن سوئٹزرلینڈ کے اس ڈاکٹر نے ان کے قصبے میں قدم رکھا تھا۔ لیکن وہ اس کی شخصیت اور اس کی مقبولیت اور شہرت کے ہاتھوں شکست کھانے پر مجبور تھے۔

لہٰذا میونسپل کونسل نے عارضی اہسپتال قائم کر دیے تھے اور سوپ...... کچن بھی قائم کر دیے گئے تھے۔ بے گھر لوگوں کو آباد کرنے کی غرض سے رقم بھی مہیا کر دی گئی تھی۔ مکانات کی تعمیر نو کا بھی آغاز ہو چکا تھا اور چھ ماہ کے اندر اندر سولفرینو کی زندگی معمول پر آ چکی تھی۔ اخبارات کی رپورٹیں محو کر دی گئی تھیں اور چونکہ انسانی یادداشت دیرپا نہیں ہوتی لہٰذا اب کسی کے پاس اٹلی کے اس قصبے کے بارے میں سوچنے کی فرصت نہ تھی۔ محض ڈونانٹ کا ذہن ایسا تھا جس میں یہ واقعہ ثبت ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ لڑائی کی ہولنا کی کو بھول نہ پایا تھا اور نہ ہی اپنی ان تھک محنت کو بھول پایا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایسے حالات دوبارہ جنم نہ لیں۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ایک شخص...... ایک واحد شخص کس طرح ایسے واقعات کو رونما ہونے سے روکنے پر قادر ہو سکتا تھا۔

1862ء میں جنیوا میں ایک کتابچہ شائع ہوا تھا۔ اس کتابچے کا مصنف جین ہینری ڈونانٹ تھا۔ اس کتابچے کا عنوان ''ان سوینیئر ڈی سولفرینو'' تھا اس کتابچے میں ان زخمی افراد کے مصائب کی داستان بیان کی گئی تھی جن کو میدان جنگ میں سسک سسک کر مرنے کیلئے چھوڑ دیا گیا تھا اور انہیں طبی امداد فراہم کرنے کے بارے میں سوچا بھی نہ گیا تھا۔ اس کتابچے میں جنگ کی ہولنا کیاں اور تباہ کاریاں بیان کرنے کے علاوہ شہری آبادی پر اس کے بداثرات کا جائزہ بھی پیش کیا گیا تھا۔ اس کتاب کے مصنف نے اس بات پر زور دیا تھا کہ مستقل سوسائٹی جات قائم کی جانی چاہئیں جو زخمیوں کی نگہداشت سرانجام دیں اور یہ تجویز بھی پیش کی گئی تھی کہ اس کار خیر کیلئے رضا کاروں کی خدمات حاصل کی جائیں۔ مصنف نے یہ ذکر بھی کیا تھا کہ اسے یقین تھا کہ وہ ایسی سوسائٹی جات کے قیام کو اپنی زندگی میں دیکھ سکے گا۔

ڈونانٹ کی اس تحریر کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور اس نے لوگوں کو ازحد متاثر کیا۔ یہ کتابچہ اس قدر کثیر تعداد میں فروخت ہوا کہ اس کا مصنف نہ صرف حیران رہ گیا بلکہ وہ لوگوں کا شکر گزار بھی ہوا۔ اب یہ موضوع جنیوا کا ایک اہم موضوع بن چکا تھا...... جنیوا ایک ایسا شہر تھا جو مفاد عامہ کے کنونشن جات کے لئے مشہور تھا۔ اس کے بعد ڈونانٹ کو ایک اعزاز بخشا گیا۔ وہ اعزاز یہ تھا کہ ایک بین الاقوامی سوسائٹی کے صدر ایم۔ گیسٹو موئیر نے ڈونانٹ کو دعوت دی کہ وہ سوسائٹی کے آئندہ منعقد ہونے والے اجلاس میں شرکت کرے اور اپنے خیالات اس کے اراکین پر واضح کرے کیونکہ سوسائٹی کا صدر ڈونانٹ کی پیش کردہ تجاویز سے ازحد متاثر ہوا تھا۔

یہ اجلاس ڈونانٹ کی زندگی میں ایک سنگ میل ثابت ہوا۔ اس نے اپنے خیالات کا اظہار خوبصورت انداز میں کیا اور سولفرینو کے المیے کو بھی بیان کیا کہ سوسائٹی کے ارکان ازحد متاثر ہوئے اور انہوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ فوری طور پر ایک کمیشن قائم کیا جائے جو اس امر کا مطالعہ کرے کہ جنگ کے دوران زخمی ہونے والے افراد کی حالت زار کو کس طرح بہتر بنانا ممکن ہو سکتا تھا۔ اس کمیشن کے لئے جن ارکان کا انتخاب کیا گیا وہ درج ذیل تھے:۔

☆ جنرل ڈیوفور..... کمانڈر انچیف سوئٹزر لینڈ افواج

☆ گیسٹو مونیئر

☆ ڈاکٹر جین ہنری ڈونانٹ

☆ ڈاکٹر لوئس اپیا

☆ ڈاکٹر تھیوڈور منور

اس کمیشن کا بنیادی کام یہ تھا کہ وہ ایک ڈرافٹ ایگریمنٹ تیار کرے جو نیشنل کمیٹیوں کی تشکیل کی بابت ہو جو آرمی میڈیکل سروس کے ساتھ تعاون کریں اور اس کو امداد فراہم کریں..... اور اس کام کی سرانجام دہی کے لئے وہ رضا کار گروپ تشکیل دے اور ان کو تربیت فراہم کرے۔ اس کمیشن کے انفرادی اراکین نے دیگر ممالک کے دورے کیے تاکہ ان کو اپنے مقصد سے آگاہ کر سکیں اور 1863ء کے موسم خزاں میں انہوں نے جنیوا میں ایک بین الاقوامی اجلاس طلب کیا..... اس اجلاس میں 36 ماہرین شامل تھے اور مختلف حکومتوں کے وفود بھی شامل تھے۔ یہ کانفرنس 26 تا 29 اکتوبر جاری رہی۔ اس اجلاس کے دوران ریڈ کراس کے بنیادی اصولوں پر اتفاق رائے ہوا اور کمیٹیوں کو یہ ہدایات کی گئیں کہ وہ اپنی تمام تر توانائی دیگر ممالک کو اس امر پر قائل کرنے میں صرف کریں کہ وہ ایسی نیشنل سوسائٹی جات تشکیل دیں جو ریڈ کراس کی تحریک کیلئے تقویت کا باعث ثابت ہوں۔

یہ ایک مشکل کام تھا مگر کمیٹی وقت ضائع کرے بغیر اس کام کی سرانجام دہی میں مصروف ہوگئی۔ ان کے راستے میں کئی ایک مشکلات حائل ہوئیں لیکن وہ ان مشکلات پر قابو پانے میں کامیاب ہوئے۔ اس کمیٹی کے ارکان نے ملک ملک کا سفر کیا..... حکومتی نمائندوں سے انٹرویو کیے..... مختلف حکومتوں نے ان کے اس اقدام کو سراہا اور ان کی کاوش کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اس تحریک میں شامل ہونے کی خواہش کا بھی اظہار کیا۔ حتیٰ کہ شہنشاہ نپولین III بھی اس اسکیم کا ایک بہت بڑا حمایتی بن گیا۔

اس کے بعد کمیٹی نے سوئٹزر لینڈ فیڈرل کونسل سے رابطہ قائم کیا اور اس سے درخواست کی کہ 8 اگست 1864ء کو جنیوا میں ایک سفارتی کانفرنس منعقد کی جائے..... اس کانفرنس میں مختلف حکومتوں کے 26 نمائندوں نے شرکت کی تھی۔ اس کانفرنس کے دوران جنیوا کونشن منظر عام پر آیا تھا۔ ریڈ کراس کو ایک بین الاقوامی درجہ حاصل ہوا اور اس کے بنیادی اصول وضع کیے گئے۔ زخمیوں کو عزت بخشی جائے گی..... فوجی اہسپتالوں کو غیر جانبدار تصور کیا جائے گا..... طب سے متعلق افراد اور طبی ساز و سامان اور ادویات وغیرہ کو تحفظ فراہم کیا جائے گا۔ لہٰذا ریڈ کراس کی انٹرنیشنل کمیٹی سرکاری طور پر قائم کی گئی..... اس کی علامت سفید جھنڈا قرار پایا جس پر سرخ کراس نمایاں تھا۔

ابھی بہت سا کام کرنا باقی تھا اور اپنی باقی ماندہ لمبی زندگی کے دوران جین ہنری ڈونانٹ نے اس ادارے کی اصلاح کیلئے ازحد کوشش سرانجام دی جو اس کی پیش کردہ تجویز کے تحت قائم ہوا تھا۔ ہر سال ...... ہر ماہ...... اس ادارے میں بہتری واقع ہوتی چلی گئی اور اس میں مناسب ترامیم بھی متعارف کروائی جاتی رہیں...... بہتری کی نت نئی تجاویز متعارف کروائی جاتی رہیں اور تربیت کے مزید مراکز بھی کھولے جاتے رہے۔ ڈونانٹ نے ریڈ کراس کی مختلف ممالک میں قائم شاخوں کے ازحد دورے سرانجام دیے اور اس کی جدوجہد کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ہزاروں لوگوں نے

رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کیں اور اس کے ساتھ عطیات میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ جلد ہی ریڈ کراس کی خود مختار سوسائٹی جات تشکیل پا گئیں۔ اس سلسلے میں انٹرنیشنل (بین الاقوامی) کمیٹی نے اہم کردار ادا کیا۔ اس کی ذمہ داری یہ تھی کہ اس امر کی یقین دہانی حاصل کرے کہ جنیوا کنونشن کے اصولوں پر سختی سے عمل درآمد کو ممکن بنایا جا رہا تھا اور کسی بھی خلاف ورزی کی مذمت کرتے ہوئے اس کو روکے۔

1870ء میں انٹرنیشنل کمیٹی نے ایک انفارمیشن ایجنسی قائم کی جو باسل میں قائم کی گئی تھی۔ اس سے فرانس اور جرمن دونوں کے بیمار یا زخمی سپاہ کو استفادہ حاصل ہوتا تھا۔ یہ ایجنسی باقاعدگی کے ساتھ جنگی قیدیوں کے کیمپوں کا دورہ کرتی تھی۔ اور انہیں ہر طرح کا تعاون فراہم کرتی تھی۔ مزید برآں ایجنسی ان شہری مہاجرین کی بھی دیکھ بھال کرتی تھی جو جنگ کے دوران بے گھر ہو چکے تھے...... انہیں مالی امداد فراہم کرتی تھی...... خوراک مہیا کرتی تھی...... سر چھپانے کی جگہ اور عارضی ملازمتیں بھی مہیا کرتی تھی۔ دیگر جنگیں...... اگرچہ اتنی اہم نہ تھیں لیکن وہ بھی کسی المیے سے کم نہ تھیں...... یہ جنگیں دنیا کے مختلف حصوں میں لڑی گئی تھیں...... ان تمام جنگوں میں بھی ریڈ کراس نے فعال کردار سرانجام دیا تھا۔ ایسے واقعات بھی ظہور پذیر ہوئے تھے...... خوش قسمتی سے یہ واقعات خال خال ہی وقوع پذیر ہوئے تھے...... ہسپتالوں کو نشانہ بنایا گیا تھا...... زخمیوں کے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا تھا...... جنگی قیدیوں کے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا تھا...... طبی عملے کے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا تھا...... ادویات چوری کر لی گئی تھیں...... یا دیگر واقعات ظہور پذیر ہوئے تھے...... ان کمیٹیوں نے فوری کارروائی سرانجام دی تھی اور معاملے کو سلجھایا تھا۔

اگلی صدی تک دنیا کے تقریباً تمام ممالک جنیوا کنونشن میں شامل ہو چکے تھے جس پر نظر ثانی کی گئی اور 1916ء میں اس کو اپ۔ٹو۔ڈیٹ کیا گیا جبکہ ہیگ میں 1907ء میں اس کے قوانین کو بحری جنگ پر بھی لاگو کر دیا گیا۔

جین ہنری ڈونانٹ نے 1910ء میں 82 برس کی عمر میں وفات پائی۔ اس نے جو پودا لگایا تھا وہ اب ایک تناور درخت کا روپ دھار چکا تھا جو دنیا بھر میں انسانیت کی خدمت سرانجام دے رہا تھا۔ سولفرینو میں اس نے سخت ترین جدوجہد سرانجام دی تھی اور اپنے خواب کو حقیقت میں بدل کر رکھ دیا تھا...... اور خدا کی مہربانی سے وہ کامیابی سے ہمکنار ہوا تھا۔ وہ پہلی جنگ عظیم کے دوران ریڈ کراس کی گراں قدر سرگرمیاں دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہا تھا اور 1918ء تک اس کی سرگرمیوں کا دائرہ کار وسیع ہوتے ہوئے بھی دیکھ نہ پایا تھا۔ آج کل جہاں کہیں بھی کوئی نہ کوئی سانحہ پیش آتا ہے...... ریڈ کراس سب سے پہلے منظر عام پر آتی ہے۔

دنیا میں بہت کم افراد ایسے ہوتے ہیں جو ایک شاندار اور ہمیشہ قائم رہنے والی یادگار اس دنیا میں چھوڑ جاتے ہیں جیسے جین ہنری ڈونانٹ نے ایک شاندار اور ہمیشہ قائم رہنے والی یادگار چھوڑی تھی۔

......❁......

ڈاکٹر برنارڈو میدانِ عمل میں

اخبارات میں ابھی بھی یہ پڑھنے کو ملتا ہے کہ بہترین ہاؤسنگ اسکیموں کے باوجود بھی شہر میں گندگی اور تاریک گلیاں اور محلے دیکھنے میں آتے ہیں۔ وہ لوگ جو برطانیہ کے عظیم ترین شہروں کے غریب ترین ضلع جات سے حقیقی طور پر واقف ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ گذشتہ چند برسوں کے دوران تنخواہوں میں بے پناہ اضافے کے باوجود بھی لوگ مناسب غذا...... مناسب لباس اور مناسب گرمائش کے حصول میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے...... ایک سچ ہے...... لیکن دنیا میں ''غربت'' کی شدت میں ازحد کمی واقع ہو چکی ہے۔ ایک انتہائی تصوراتی شخص کے لئے بھی یہ ایک انتہائی مشکل امر ہے کہ ایک سو برس پیشتر کی گلیوں اور بازاروں کا تصور کرے جن میں جا بجا گندگی کے ڈھیر بکھرے پڑے تھے...... نکاس آب کا کوئی انتظام نہ تھا...... روشنی کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ یہ یاد رکھنا بھی مساوی طور پر مشکل ہے کہ کچھ لوگ اپنی تمام تر زندگی کے دوران یہ بھی جان نہیں پاتے تھے کہ صاف کپڑے زیب تن کرنا کیسا فعل تھا...... نئے کپڑے تو بہت دور کی بات تھی۔ ان کے نزدیک کپڑے محض چیتھڑے ہی ہوتے تھے۔ ایسے لوگ اس وقت آگ جلانے کی ضرورت محسوس کرتے تھے جب ان کے پاس رات کا کھانا تیار کرنے کیلئے تین پنس موجود ہوتے تھے اور آگ بھی وہ ادھر اُدھر سے مانگ کر لاتے تھے۔ وہ لوگ جو غربت کی انتہائی نچلی سطح پر تھے ان میں وہ بچے بھی شامل تھے جن کے والدین یا تو موت سے ہمکنار ہو چکے تھے یا انہیں چھوڑ کر جا چکے تھے۔ اس امر کے کافی شواہد موجود ہیں کہ تقریباً ایک صدی پیشتر محض لندن میں ہی 30,000 بے گھر بچے موجود تھے۔ ان بچوں کے لئے کیوں کچھ نہ کیا گیا تھا۔ کیونکہ ان کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا...... کوئی نہیں...... ان کی تعلیم کی کسی کو فکر نہ تھی۔ غریب محض یہ جانتا تھا کہ غریب کیسے زندگی بسر کرتے تھے۔

ایک صدی پیشتر کے انگلستان میں ایک چیز قابل غور تھی...... وہ مکمل تقسیم تھی جس کو اسرائیلی ''دو قومیں'' کہتے تھے...... صاحب ثروت اور غریب غربا...... محض چند افراد نے نظر اندازی کی اس دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی جس نے ان جیسے صاحب ثروت لوگوں کو غریب غربا کی دنیا سے الگ کر رکھا تھا۔ ان چند لوگوں میں ایک اہم ترین شخصیت لارڈ شافٹز بری کی تھی۔

لارڈ شافٹز بری کی عظیم کامیابیوں میں سے ایک کامیابی یہ بھی تھی کہ اس نے ''غریب غربا کے اسکولوں'' کی لازوال حمایت سرانجام دی...... جہاں پر غریب اور نادار بچے شام کے وقت حاضر ہو سکیں اور رضا کارانہ طور پر خدمات سرانجام دینے والے اساتذہ انہیں لکھنا اور پڑھنا سکھا سکیں۔ آپ یہ سوچ سکتے ہیں کہ یہ اساتذہ جو روزانہ بچوں کے ساتھ باہم روابط ہوتے تھے لازمی طور پر ان کے علم میں یہ بات ہوگی کہ ان کے زیر تعلیم بچوں میں سے اکثر بچے بے گھر بھی تھے۔ لیکن آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ ان کے علم میں ایسی کوئی بات نہ تھی حتیٰ کہ 1866ء کی ایک شام ایک بچے نے اپنے استاد سے پوچھا کہ اسکول کا وقت ختم ہونے کے بعد کیا وہ اسکول میں قیام کر سکتا تھا اور بجی کچی آگ کے نزدیک دراز ہو کر رات گزار سکتا تھا۔

اس نوجوان استاد...... جو کہ بذات خود طب کا ایک طالب علم تھا نے لڑکے کی درخواست قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اسے سمجھایا کہ اسے اپنے گھر کی راہ لینی چاہئے وگرنہ اس کی والدہ اس کے بارے میں فکرمند ہوگی۔ لیکن جب لڑکے نے اپنے استاد کو بتایا کہ اس کی ماں تھی نہ باپ تھا جو اس کے بارے میں فکرمند ہوتا...... تب اس نوجوان استاد نے فوراً بچے سے دریافت کیا کہ:۔

''تم کہاں رہتے ہو؟''

اور

''تمہارے دوست کدھر ہیں؟''

استاد کو یقین تھا کہ اگر بچے کے والدین موجود نہ تھے تو لازماً وہ کسی نہ کسی کی سرپرستی میں ضرور رہتا ہوگا۔

''میرا کوئی دوست نہیں ہے اور میرا کوئی ٹھکانہ بھی نہیں ہے۔''

تھامس برنارڈو نے یک دم یہ سوچا کہ بچہ جھوٹ بول رہا تھا اور اس نے لڑکے سے مزید سوالات کئے اور ان سے بھی اس نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ بچہ جھوٹ بول رہا تھا:۔

''گذشتہ رات تم کہاں سوئے تھے؟''

لڑکے نے جواب دیا کہ:۔

''مارکیٹ کے قریب واقع سفید خانہ گرجا میں سویا تھا''

استاد نے دریافت کیا کہ:۔

''تم وہاں تک کیسے جا پہنچے تھے؟''

لڑکے نے جواب دیا کہ:۔

''میری ملاقات ایک لڑکے سے ہوئی تھی وہ مجھے اپنے ساتھ وہاں پر لے گیا تھا۔''

استاد نے دریافت کیا کہ:۔

''کیا تمہار طرح اور بھی ایسے بچے موجود ہیں جن کے گھر یا دوست نہیں ہیں؟''

لڑکے نے جواب دیا کہ:۔

''جی ہاں سر...... بہت سے ایسے بچے موجود ہیں''۔

لڑکا ان سوالات سے خوش ہو رہا تھا اور برنارڈو سوچ رہا تھا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا لڑکا واقعی جھوٹ بول رہا تھا۔ لہٰذا اس نے لڑکے کے ساتھ ایک سودا کیا۔ اس نے لڑکے کو گرما گرم کافی کی پیشکش کی اور رات گزارنے کی جگہ کی بھی پیشکش کی۔ اس کے جواب میں لڑکے نے اسے اپنے جیسے دیگر بچوں کی ان خفیہ جگہوں کے بارے میں بتایا جہاں پر وہ اپنی راتیں بسر کرتے تھے۔

اس کے بعد برنارڈو اس دس سالہ جم جاروس کو واپس اسکول لے آیا اور حسب وعدہ اسے نہ صرف کافی دلائی بلکہ اس کے ساتھ کچھ کھانے کے لئے بھی دلایا۔ جم نے جب وہ سب کچھ ہڑپ کرلیا جو اس کے سامنے کھانے کے لئے رکھا گیا تھا تب اس نے اپنے استاد کے کئی ایک سوالات کے جواب دینے شروع کئے کہ کس طرح اس کی ماں اسے سے جدا ہوئی اور کس طرح اس کا باپ اس سے جدا ہوا۔ اس کے علاوہ اس نے ان مصائب کی داستان بھی سنائی جن سے وہ اس وقت تک گزر چکا تھا۔ اس دوران آدھی رات بیت چکی تھی اور لڑکے کی رنج والم سے بھرپور داستان بھی اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ استاد اور شاگرد دونوں سرد رات میں ایک مرتبہ پھر باہر نکلے۔ جم اپنے استاد کو پرانے کپڑوں کی ایک مارکیٹ میں لے گیا۔ وہ خالی اسٹالوں سے گزرتے ہوئے اینٹوں سے بنی ہوئی ایک اونچی دیوار تک جا پہنچے۔ جم بڑی آسانی کے ساتھ اس دیوار پر چڑھ گیا لیکن استاد بدقت اس دیوار پر چڑھ سکا۔ بالآخر وہ چھت پر جا پہنچے تھے۔ استاد نے مابعد وہ سب کچھ بیان کیا جو کچھ اس نے چھت پر دیکھا تھا:۔

''کھلی چھت پر پریشان حال لڑکوں کا ایک گروہ موجود تھا۔ وہ سب کے سب سو رہے تھے۔ میں نے ان کا شمار کیا۔ ان کی تعداد گیارہ تھی۔ وہ کچھ ایسے انداز میں پڑے سو رہے تھے جس طرح بہت سے لوگوں نے کتے آگ کے سامنے بیٹھے ہوئے دیکھے ہوں گے۔ سردی سے بچنے کیلئے کچھ بچے آپس میں جڑے پڑے تھے اور کچھ علیحدہ علیحدہ پڑے سو رہے تھے۔ انہوں نے کپڑوں کے نام پر چیتھڑے پہن رکھے تھے۔ ان میں ایک لڑکا بڑی عمر کا حامل تھا۔ اس کی عمر 18 برس کے قریب تھی لیکن دیگر بچے مختلف عمروں کے حامل تھے...... میرا خیال ہے کہ ان کی عمریں 9 اور 14 برس کے درمیان تھیں۔

''اس دوران بادلوں کی اوٹ سے چاند نمودار ہو چکا تھا۔ اور اس کی روشنی ان بچوں کے چہروں پر پڑ رہی تھی اور میں نے ان کے چہروں سے ٹپکنے والے رنج والم سے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ وہ بچے واقعی بے گھر تھے اور مصیبت کے مارے تھے۔ ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے خدا نے میرے اور ان کے درمیان پڑے پردے کو ہٹا دیا ہو...... اس پردے کو جس کے پیچھے ان بچوں کے مصائب اور رنج والم چھپا ہوا تھا''۔

جوں ہی نوجوان برنارڈو ان سوئے ہوئے بچوں میں کھویا ہوا تھا اس دوران جاروس جو اس کے پاس کھڑا تھا اس نے یہ پیش کش کیا کہ کیا وہ ان بچوں کو جگا دے۔ لیکن برنارڈو نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ اس لمحے وہ ان بچوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اسے وقت درکار تھا تا کہ وہ ان بچوں کی بہبود کیلئے کوئی نہ کوئی منصوبہ زیر غور لا سکے۔ فی الحال وہ محض جم سے نپٹ سکتا تھا۔

لہٰذا وہ جم کو اپنے ساتھ واپس لے آیا تا کہ وہ باقی ماندہ رات اس کے اپنے کمرے میں گزار سکے اور اگلے روز اس نے اس لڑکے کی رہائش کا بندوبست کر دیا۔ کچھ ہی دنوں بعد اس نے ان لڑکوں کی رہائش کا بندوبست بھی کر دیا جنہیں وہ جم کی رہنمائی میں اس رات چھت پر پڑے دیکھ چکا تھا۔

لیکن ابھی تک اس کے ذہن میں ''برنارڈو ہومز'' جیسا خیال نہیں آیا تھا۔ وہ ہنوز طب کا ایک طالب علم تھا۔ وہ تمام تر دن کے دوران لندن کے ہسپتال میں مطالعہ سرانجام دیتا تھا اور اپنے فاضل اوقات میں ان مصائب زدہ بچوں کی کچھ نہ کچھ خدمت کر سکتا تھا۔ کچھ عرصہ پیشتر اس کی یہ خواہش تھی...... اور اب بھی اس کی یہ خواہش برقرار تھی...... کہ وہ بطور طبی مشنری چین جائے۔ اس نے ابھی تک یہ نہیں سوچا تھا کہ اس مصیبت کے

مارے بچوں کا کیا بنے گا جب اس کی تعلیم وتربیت مکمل ہو جائے گی اور وہ چین روانہ ہو جائے گا۔ اس دوران وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی توجہ مصیبت کے مارے ان بچوں کی جانب مبذول کروانا چاہتا تھا اور اگلے چند ہفتوں کے دوران دو واقعات وقوع پذیر ہوئے جس نے اسے دو ایسی چیزیں دیں جن کی اس کو حصول مقصد کے لئے ازحد ضرورت تھی:۔

☆ان بچوں کے مصائب امیر آدمیوں کے علم میں لانا

☆غریبوں کا اعتماد حاصل کرنا

وہ ایک مشنری کانفرنس میں شرکت کر رہا تھا اور اس کانفرنس کا ایک مقرر وقت مقررہ تک نہ پہنچ پایا تھا۔ لہٰذا چیئرمین نے اسے ہدایت کی کہ اس مقرر کی جگہ وہ خطاب کرے اور ان کو غریب غربا کے اسکولوں کے بارے میں بتائے۔ نوجوان برنارڈو پہلے تو یہ محسوس ہی نہ کر سکا کہ قدرت اسے ایک موقع فراہم کر رہی تھی اور وہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان مصائب زدہ بچوں کے حق میں آواز اٹھا سکتا تھا لہٰذا وہ خوف وہراس کا شکار ہو گیا۔ وہ غریب بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے سے نہیں ہچکچاتا تھا...... کیونکہ یہ ایک ایسا امر تھا جسے وہ اکثر سرانجام دیتا رہتا تھا...... لیکن اسے شرم محسوس ہو رہی تھی کہ وہ ایک بڑے اجلاس میں تعلیم یافتہ افراد سے خطاب کرے...... یہی وجہ تھی کہ وہ خوف وہراس کی لپیٹ میں تھا۔ تاہم چیئرمین کو اس کے تعاون کی ازحد ضرورت تھی اور وہ اس پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ وہ ضرور خطاب کرے اور بالآخر برنارڈو خطاب کرنے پر رضامند ہو گیا۔ لہٰذا اس نے غریب غربا کے اسکولوں کے بارے میں سامعین کو بتانا شروع کیا اور ان بچوں کے بارے میں بھی سامعین کو بتایا جنہیں وہ بے یارومددگار کھلی چھت پر سوتے دیکھ چکا تھا۔

ان حقائق کو جان کر سامعین حیران رہ گئے اگرچہ انہوں نے اتنی جرات کا مظاہرہ نہ کیا کہ وہ آگے بڑھتے اور اپنا مشترکہ تعاون پیش کرتے لیکن ان میں سے ایک فرد منظر پر آیا اور اس نے اپنے تعاون کی پیش کش کی۔ یہ ایک لڑکی تھی۔ وہ دیگر سامعین کی مانند بہترین لباس میں ملبوس نہ تھی لیکن وہ غربت کی ماری ہوئی بھی نہ تھی۔ جم اور دیگر بچوں کے ساتھ اگر اس کا موازنہ کیا جاتا تو اس کا پلہ بھاری تھا۔ وہ ایک ملازمت پیشہ لڑکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پیکٹ دیا۔ یہ پیکٹ اس نے نوجوان طب کے طالب علم کو تھما دیا۔ اس نے اس طالب علم کو بتایا کہ اس میں کچھ رقم تھی جو اس نے مشنری فنڈ کیلئے جمع کی تھی۔ اس نے کہا کہ:۔

''جب میں نے آپ کی بات سنی تو میں نے محسوس کیا کہ مجھے یہ رقم آپ کو دینی چاہئے تاکہ آپ اسے غریب بچوں پر خرچ کر سکیں''

یہ پہلا چندہ تھا جو اسے اس مقصد کے لئے عطا کیا گیا تھا۔ اس پر یہ امر واضح ہو چکا تھا کہ وہ اپنے کام کو مزید آگے بڑھا سکتا تھا۔

لوگوں کا اعتماد حاصل کرنا اسے مہنگا پڑا تھا۔ اس نے مشنری کے جو کام اپنے ذمہ لگا رکھے تھے ان میں سے ایک کام یہ بھی تھا جس دن اسے غریب غربا کے اسکول میں پڑھانا نہیں ہوتا تھا اس دن وہ بائبل فروخت کرتا تھا اور ایسے مقامات پر اور ایسے گاہکوں کے ہاتھ بائبل فروخت کرتا تھا جن سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اس امر کی جانب راغب ہوں گے...... مثلاً شراب خانوں وغیرہ میں...... ایسے ہی ایک موقع پر اس نے ایک

شراب خانے کا رخ کیا جس میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک ہجوم تھا جو شور شرابہ کر رہے تھے۔ ان کی توجہ حاصل کرنے کی خاطر وہ ایک میز پر چڑھ گیا جو کمرے کے وسط میں رکھی تھی اور آواز لگانے لگا کہ:۔

''نئی انجیل کی قیمت ایک پینی جبکہ پرانی اور نئی انجیل دونوں کی قیمت تین پینی''

نوجوانوں کے ہجوم نے اس خلل اندازی کو گوارا نہ کیا اور اسے اس کے کام سے روکنے کی کوشش کی۔ اس نے بھی مزاحمت سرانجام دی۔ لہٰذا نوجوانوں نے اس سے خلاصی حاصل کرنے کی غرض سے اس میز کو الٹ دیا جس پر وہ کھڑا تھا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ وہ فرش پر پڑا تھا اور میز اس کے اوپر پڑی تھی اور کچھ نوجوان اس میز پر چڑھ گئے اور رقص کرنے لگے۔ اس شراب خانے کے مالک نے پولیس بلوالی تھی اور پولیس نے برنارڈو کی نوجوانوں سے خلاصی کروائی اور اسے اس کے گھر بھیج دیا اور نوجوانوں کے سرغنہ کو گرفتار کر لیا۔ برنارڈو کی دو پسلیاں ٹوٹ چکی تھیں اور اسے روبصحت ہونے میں چھ ماہ لگے تھے۔ لیکن جب پولیس نے اس سے دریافت کیا کہ کیا وہ مقدمہ درج کروانے کا ارادہ رکھتا تھا تو اس نے یہ کہتے ہوئے ان کے خلاف مقدمہ درج کروانے سے انکار کر دیا کہ:۔

''میں بذات خود مداخلت کا مرتکب ہوا تھا اور میں نے یہ سب کچھ اپنی صوابدید کے تحت کیا تھا''۔

جب یہ جواب ان نوجوان کے علم میں آیا تو وہ ازحد پشیمان ہوئے اور اس سے اظہار ہمدردی کیا۔ برنارڈو نے مابعد تحریر کیا کہ:۔

''مجھے یقین تھا کہ اس واقعہ کی بدولت مجھ پر مشرقی لندن کے اس حصے کے مزید دروازے کھلیں گے اور مجھے اس قماش کے حامل لڑکوں اور لڑکیوں پر اثر انداز ہونے کے عظیم مواقع میسر آئیں گے...... ایسے مواقع جو مجھے ان نوجوانوں کو سال ہا سال تعلیم و تربیت دینے سے بھی میسر نہ آسکتے تھے۔''

اس نے مشنری کے اجلاس کے دوران جو کچھ اپنے خطاب میں بیان کیا تھا اس کی خبر لارڈ شافٹز بری تک بھی پہنچ چکی تھی۔ لہٰذا اس نے برنارڈو کو کھانے پر مدعو کیا تاکہ اس معاملے میں اس سے مزید معلومات حاصل کر سکے اور اس رات کھانے سے فارغ ہونے کے بعد یہ دونوں افراد اور لاتعداد دیگر افراد جو کھانے پر مدعو تھے ایک چھوٹے سے جلوس کی شکل میں بلنگز گیٹ کی جانب روانہ ہوئے۔ وہ صندوقوں کے ایک بہت بڑے ڈھیر کی جانب بڑھے جسے ترپال سے ڈھانپا گیا تھا اور صاف ظاہر تھا کہ لارڈ شافٹز بری اور اس کے دوست اس امر سے ناآشنا تھے۔ کہ ترپال کے اندر ان صندوقوں علاوہ اور کیا کچھ موجود تھا۔ لیکن برنارڈو جانتا تاکہ اس ترپال کے اندر اور کیا کچھ موجود تھا۔ اس نے ترپال کے اندر اپنا ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹے سے بچے کو باہر کھینچ لایا جس نے احتجاج کرنا شروع کر دیا کہ وہ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا رہا تھا۔ برنارڈو نے اسے یقین دلایا کہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کی جائے گی اور اسے چھ پینس دیے تاکہ وہ اس ترپال کے اندر سوئے ہوئے دیگر بچوں کو بھی برآمد کرے۔ اس لڑکے کا نام ارچن تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے ترپال سے 73 بچوں کو برآمد کیا جو نیند سے مخمور آنکھوں سے لارڈ شافٹز بری کو دیکھ رہے اور یہ سوچ رہے تھے کہ نہ جانے وہ انہیں کس قسم کی سزا سے نوازے گا۔

لارڈ شافٹز بری نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ ان بچوں کی جانب دیکھا اور کہا کہ:۔

''تمام لندن کو ان بچوں کے مصائب کی خبر ہونی چاہیئے''

اس کے بعد وہ ان تمام بچوں کو ایک نزدیکی کافی شاپ میں لے گیا جس کے بارے میں برنارڈو جانتا تھا اور گرما گرم کافی سے ان بچوں کی تواضع کی۔

اس کے بعد برنارڈو کو اس عظیم شخصیت کا تعاون بھی حاصل ہو گیا۔ لیکن ابھی اسے دیگر لوگوں کے علم میں یہ حقائق لانے کے لئے بہت کچھ سرانجام دینا تھا اور عطیات بھی اکٹھے کرنے تھے۔ اس نے ایک مذہبی رسالے میں ایک آرٹیکل تحریر کیا اور اس آرٹیکل کے جواب میں اسے 90 پونڈ کے عطیات وصول ہوئے۔ اس عطیے سے وہ اس قابل ہوا کہ غریب غربا بچوں کے اسکول کے لئے ایک کمرہ کرائے پر لے سکے جو پہلے سے زیر استعمال کمرے سے قدرے بڑا ہو اور مابعد اس نے کئی ایک چھوٹے چھوٹے مکانات بھی کرایے پر حاصل کئے جو اس اسکول کے بالمقابل واقع تھے۔ ان مکانات میں اس نے کئی ایک کلاسوں کا اجراء کیا۔ اس نے بچوں کو تعلیم و تربیت کے ساتھ دستکاری کی تعلیم فراہم کرنے کا بندوبست بھی کیا اور عیسائی عقیدے کی تعلیم و تربیت کی فراہمی کا بھی بندوبست کیا۔ وہ اسے

''ایسٹ اینڈ کم سن مشن''

کے نام سے پکارتا تھا۔ ابھی وہ ان مفلس اور محتاج بچوں کے لئے گھر کے بارے میں سوچنے سے کوسوں دور تھا اور اس نے اس کارِ خیر کو اپنے نام کے ساتھ منسوب کرنے کے بارے میں بھی کبھی نہ سوچا تھا۔

وہ ہنوز اپنے آپ کو محض طب کا ایک طالب علم تصور کرتا تھا۔ جو دیارِ غیر میں مشنری کا کام سرانجام دینے کی تربیت حاصل کر رہا تھا۔

ایک روز اسے ایک شخص کا خط موصول ہوا جس کا نام سموئیل اسمتھ تھا۔ اس شخص نے اپنے خط میں یہ تحریر کیا تھا کہ اگر وہ چین روانہ ہونے کا ارادہ ترک کر دے...... کم از کم وقتی طور پر ہی ترک کر دے...... اور ان مفلس اور محتاج بچوں کی فلاح و بہبود کی جانب اپنی تمام تر توجہ مرکوز کروائے رکھے۔ اور اس کے سر چھپانے کے لئے ایک مکان کا بندوبست کرے تو وہ اسے 1,000 پونڈ عطیے کے طور پر دے سکتا تھا برنارڈو نے مابعد تحریر کیا کہ:۔

''کم از کم دس روز تک میں نے اس خط کے نفسِ مضمون کو اپنے سینے میں دفن رکھا...... اپنے سینے میں چھپائے رکھا...... میں نے اس بارے میں کسی کو کچھ نہ بتایا...... اب میں نے دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا...... چین یا مشرقی لندن''

دو برس بعد...... جم جاروس سے ملنے کے چار برس بعد...... برنارڈو نے مفلس اور محتاج بچوں کے لئے اپنا پہلا گھر کھولا۔

......❁......

نہر سویز کی تعمیر

یہ پہلا موقع تھا...... تاریخ کا پہلا موقع جبکہ مسلمانوں اور عیسائیوں کی مذہبی سروس مشترکہ طور پر منعقد کی جا رہی تھی...... دس برس قبل پورٹ سید ریت کی محض ایک پٹی تھی...... ایک بندرگاہ کے علاوہ ویئر ہاؤس اور فیکٹریاں بھی موجود تھیں...... اور ان کے درمیان نائٹ کلبیں...... اور کسینو وغیرہ بھی موجود تھے۔

اس مقام پر دنیا کے عظیم ترین حکمران نہر سویز کے افتتاح کی تقریب میں شرکت کرنے کے لئے موجود تھے...... بلکہ ایوجن...... آسٹریا کا شہنشاہ...... پرشیا کا ولی عہد...... ہالینڈ کا شہزادہ...... اور تمام تر یورپ کی معروف شخصیات بھی موجود تھیں۔

ساحل پر خیمے نصب تھے...... عیسائی اور مسلمان خدا سے دعا گو تھے کہ وہ ان پر اپنا رحم فرمائے۔

اگرچہ وائسرائے اسماعیل عملی طور پر دیوالیہ ہو چکا تھا لیکن اس نے اس تقریب کے اہتمام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

لیسپنر کے لئے یہ فتح کی گھڑی تھی۔ اس کی عمر 65 برس تھی اور گذشتہ پندرہ برسوں سے...... جب سے اسماعیل کے چچا نے نہر سویز کی تعمیر کی ذمہ داری سونپی تھی...... اس نے اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لئے بہت سی مشکلات کا سامنا کیا تھا۔ اب یہ عظیم شاہکار مکمل ہو چکا تھا۔ اس نے پورٹ سید تا نہر سویز ان جہازوں کی اس قطار کی سربراہی سرانجام دینی تھی جنہوں نے پہلی مرتبہ نہر سویز سے گزرنا تھا۔ یہ سربراہی اس نے شہنشاہ کی کشتی میں سوار ہو کر سرانجام دینی تھی جس کا نام ایل۔ ایگل تھا۔

17 نومبر کو ایل۔ ایگل پورٹ سید میں آہستہ آہستہ رواں دواں تھی۔ نہر سویز کی تعمیر کے تمام تر برسوں کے دوران ایوجن نے لیسپنر کی بے پناہ حمایت جاری رکھی تھی جو اس کی والدہ کی جانب سے اس کا دور دراز کا رشتے دار تھا اور دنیا کی نظریں ان جہازوں کے اس قافلے پر لگی ہوئی تھی اور فرانس کا وقار داؤ پر لگا ہوا تھا۔ وہ اچانک شک وشبہات میں مبتلا ہو چکی تھی...... کہیں کوئی سانحہ نہ پیش آ جائے؟ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ اپنے کیبن میں بند ہو چکی تھی...... اس کے کیبن کے دروازے کے باہر سے لیسپنر نے اس کی سسکیوں کی آوازیں سنی تھیں۔ اس نے بعد میں بتایا کہ:۔

"یہ فرانس کی حب الوطنی تھی جو اس کے دل کی گہرائیوں سے امڈ رہی تھی"

ایل۔ ایگل بخوبی اور بحفاظت اسماعیلیہ پہنچ چکی تھی...... ہزاروں افراد تالیاں پیٹ رہے تھے...... اس مقام پر وائسرائے نے اس تقریب کے لئے ایک محل تعمیر کروایا تھا اور قصبے کے باہر 25,000 عرب بھی موجود تھے۔

تین روز بعد جہازوں کی ایک قطار نہر سویز کی جانب بڑھی...... یہ مقام کسی دور میں ایک غیر اہم دیہات تھا لیکن اب اس کی تقدیر بدل چکی تھی اور شاہی کشتی ایل۔ ایگل کے کپتان نے مابعد اپنی لاگ۔ بک میں اپنے تاثرات قلمبند کئے اور لیسپنر اور ملکہ نے بھی اس پر دستخط ثبت کئے۔

کارہائے نمایاں اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ جہاز نہر سویز کے راستے شمال کی جانب محو سفر ہو چکے تھے۔ ملکہ بھی واپس فرانس روانہ ہو چکی تھی جہاں پر جنگ اور جلاوطنی اس کی منتظر تھی۔ لیسپنز جو کہ عمر رسیدہ رنڈوا تھا...... اس نے ایک نوجوان لڑکی سے شادی رچالی تھی (اس شادی سے اس کے ہاں 12 بچوں نے جنم لیا تھا)...... وہ اپنے دن مبارک بادوں کی ٹیلی گراموں کو پڑھنے میں گزارتا تھا۔ یہ ٹیلی گرام اسے دنیا بھر سے وصول ہو رہی تھیں...... وہ اس کے ساتھ ساتھ اپنی جدوجہد...... ان تھک جدوجہد کے برسوں پر بھی اپنی نظر دہراتا رہتا تھا۔

بطور ایک نوجوان...... جوش' جذبے اور ولولے کا حامل...... ذہین اور جفاکش...... اس نے اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے باپ جیسا پیشہ ہی اپنایا تھا...... اس نے فرانسیسی کونسلر سروس میں خدمات سرانجام دی تھیں...... 1830ء میں وہ الیگزینڈریا میں وائس کونسل تھا کہ نہر سویز کا منصوبہ...... اس منصوبے کی تجویز نپولین کے ماہرین نے 30 برس قبل پیش کی تھی...... اس کو سونپ دیا گیا۔ لیسپنز ایک تصوراتی ذہن کا حامل تھا۔

فی الحال نہر سویز کا منصوبہ ایک قابل عمل منصوبہ دکھائی نہ دیتا تھا مگر قسمت لیسپنز کے مستقبل کی کامیابی کی بنیاد رکھ رہی تھی۔ وہ ایک انجینئر نہ تھا اور نہ ہی ایک سرمایہ کار تھا...... لیکن اس کا ایک دوست موجود تھا...... یہ دوست وائسرائے محمد علی کا تیرہ برس کا بیٹا تھا۔ برسوں بعد یہی نوجوان تخت نشین ہوا تھا۔

1849ء تک لیسپنز اپنے کیریئر سے وابستہ رہا مگر مابعد وہ مستعفی ہو گیا۔ اس کے بعد پانچ برس تک نہر سویز کا منصوبہ اس کے ذہن میں گردش کرتا رہا۔ تب 1854ء میں مصر کا آخری وائسرائے بھی موت سے ہمکنار ہوا تب محمد سعید نے تخت سنبھال لیا۔

لیسپنز نے فوراً مصر روانہ ہونے کی تیاری شروع کر دی تا کہ اپنے دوست کو بہ نفس نفیس مبارک باد پیش کر سکے۔ اس نے محمد سعید سے یہ رعائت بھی حاصل کر لی کہ وہ ایک بین الاقوامی کمپنی تشکیل دے گا جو نہر سویز کی تعمیر کا کام سرانجام دے گی۔

اس کے بعد لیسپنز نے جوش' جذبے اور ولولے کے ساتھ کام کا آغاز کیا۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ اس کی راہ میں مالی اور سیاسی رکاوٹیں آئیں گی۔ پہلے اس نے منصوبے کے فنی پہلو کو زیرغور رکھا۔ اس نے اس سے بیشتر اس طرز کے ان منصوبوں کو زیرغور رکھا جو پایہ تکمیل کو پہنچ چکے تھے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ نہر سویز کا منصوبہ ایک قابل عمل منصوبہ تھا۔ لیکن کیا ماہرین اس کے ساتھ اتفاق کریں گے؟

سال کے اختتام سے قبل لیسپنز سروے سرانجام دینے میں مصروف تھا۔ وائسرائے نے اسے تین فرانسیسی انجینئر مستعار دیے تھے...... اس کے علاوہ اس کے پاس 60 اونٹ بھی تھے۔ ان میں تین اونٹوں پر پانی لادا ہوا تھا۔ دو ماہ بعد بالآخر فیصلے کی گھڑی آن پہنچی تھی۔ اور یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ نہر کی تعمیر ممکن تھی۔

اس کے بعد پہلی سیاسی رکاوٹ منظر عام پر آئی۔ ترکی کے سلطان سے اس منصوبے کی منظوری درکار تھی کیونکہ مصر اس کی برائے نام فرماں روائی میں تھا اور برطانوی سفیر نے ترکی کے سلطان پر بے پناہ دباؤ ڈالا تھا کہ وہ اس منظوری کو عطا کرنے سے انکار کر دے۔ برطانیہ کے سفیر کا نام لارڈ سٹاٹ فورڈ ریڈکلف تھا۔ لہٰذا لیسپنز فوراً انگلستان روانہ ہوا۔

لندن میں اس نے حکام سے بات چیت کی...... اس سلسلے میں کئی ایک اعتراضات اٹھائے گئے...... یہ اعتراض بھی شامل تھا کہ

ہندوستان کی جانب نیا مختصر راستہ برطانیہ کے مخالفین کے زیر اثر بھی آ سکتا تھا۔ تین برس تک یہ معاملہ زیر التوا رہا۔ اس دوران لیسپز نے اپنی توجہ بڑے مسئلے کی جانب مبذول کروائے رکھی...... ترکی کے سلطان کی منظوری کے بغیر بین الاقوامی سرمایہ کاروں کی توجہ مبذول کروانا ناممکن تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ سید بھی اپنی عطا کردہ رعائت واپس لے لیتا۔ اب ہر ایک چیز برطانیہ پر انحصار کرتی دکھائی دیتی تھی۔ لیکن برطانیہ کا نکتہ نظر کس طرح تبدیل کیا جائے؟

برطانیہ اپنا نکتہ نظر تبدیل کرتے نظر نہیں آتا تھا لہٰذا لیسپز نے انگریز عوام کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے لیکچر تو سرانجام دیے...... کاروباری افراد کے ساتھ انٹرویو سرانجام دیے اور ہر وہ پراپیگنڈا کیا جو وہ کر سکتا تھا۔ لحہ بہ لحہ وہ کامیابی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ بہت سے لوگوں نے اس منصوبے میں دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ اس کے بعد لیسپز نے ترکی کے سلطان کے ساتھ زبانی معاہدہ کیا۔ اس کے علاوہ اس نے سید سے اپنے لئے اور اپنی کمپنی کے لئے مزید اختیارات حاصل کئے۔

اس منصوبے کے لئے 200 ملین کا سرمایہ درکار تھا۔ اتنا کثیر سرمایہ اکٹھا کرنا ایک مشکل امر تھا۔ فرانس میں حصص بخوبی فروخت ہو چکے تھے جبکہ 85,000 حصص برطانیہ...... آسٹریا...... روس اور امریکہ کیلئے مخصوص تھے جو کہ ان ممالک میں فروخت نہ ہو سکے تھے۔

25 اپریل 1859ء کو پورٹ سید کے قریب کام کا آغاز ہوا۔ برطانوی حکومت مخالفت پر کمربستہ تھی۔ فرانسیسی خاموش تھے۔ سلطان بھی تعمیراتی کام کو غیر قانونی قرار دے رہا تھا۔ سید نے بھی لیسپز کی قانونی حیثیت ختم کر دی...... اس کے پراجیکٹ اور اس کی کمپنی کی قانونی حیثیت بھی ختم کر دی ار چند ہفتوں بعد وہ یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ تمام تر تعمیراتی کام بند کر دیا جائے۔

درحقیقت اس نہر کا پورا منصوبہ خطرے کا شکار تھا اور اس وقت تک پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکتا تھا جب تک حکومت فرانس اس منصوبے کی پشت پناہی نہ کرتی۔ اس موقع پر لیسپز کی ملکہ ایجوجن کے ساتھ رشتے داری معاون ثابت ہو سکتی تھی۔ اس نے ملکہ سے درخواست کی کہ وہ نپولین کو قائل کرے۔ کئی اور وجوہات بھی موجود تھیں جن کی بنا پر بالآخر فرانس کو اپنی پالیسی تبدیل کرنی پڑی۔ لہٰذا سید پر دباؤ بڑھ چکا تھا اور جلد ہی اس نے ہزاروں کی تعداد میں اپنے فلاحین (مصری دیہاتی یا کاشت کار) نہر کے کام پر جبری مزدوروں کے طور پر لگا دیے۔ لیسپز اور اس کے ماہرین بھی روبہ عمل ہو گئے اور لیسپز اپنے کام کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور کرنے کے عمل میں بھی برابر شریک رہا۔

1862ء تک نہر کی کھدائی کا تقریباً نصف کام مکمل ہو چکا تھا کہ سید وفات پا گیا۔ اس کا بھتیجا اسماعیل بطور وائسرائے اس کا جانشین بنا۔ اس دوران سیاسی نشیب و فراز بھی آتے رہے لیکن لیسپز اپنے کام میں ڈٹا رہا۔ 1866ء میں لیسپز نے کہا تھا کہ:

''ہم اس قدر قوت اور توانائی کے ساتھ اپنے کام کی سرانجام دہی میں مصروف رہے کہ تعمیراتی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔''

نہر کی کھدائی کے کام کیلئے ساٹھ ایسی مشینیں روبہ عمل تھی جو خصوصی طور پر اس کام کے لئے ڈیزائن کی گئی تھیں۔ وہ ایک ماہ میں 20 لاکھ مکعب فٹ ریت کی کھدائی سرانجام دیتی تھیں۔

یہ تمام تر کام بہترین انتظامی صلاحیتوں کا متقاضی تھا بالخصوص اس وقت جب کہ غیر ملکی کاریگر بھی اس کام پر لگائے گئے تھے......اور اس منصوبے کی لاگت بھی بے تحاشہ تھی......اس کی لاگت اس کی تخمینہ کردہ لاگت سے دوگنی سے بھی زائد ہو چکی تھی۔

کام کی تکمیل تک مزید کسی غیر معمولی رکاوٹ کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا اور کام بخوبی پایہ تکمیل تک پہنچ چکا تھا۔نہر کے افتتاح کے لئے دعوت نامے تقسیم کئے جا چکے تھے۔ ماہ ستمبر شروع ہو چکا تھا اور اسماعیل پانچ صد باورچی اور ایک ہزار خادم یورپ سے اکٹھے کرنے میں مصروف تھا تا کہ اس کے مہمانوں کی آؤ بھگت کر سکیں۔تب افتتاح سے پندرہ روز قبل ایک اور مسئلہ آن پڑا......شلوفہ کے علاقے میں ایک مخفی چٹان کا علم ہوا...... یہ چٹان جہازوں کی گزرگاہ کو غیر محفوظ بنا سکتی تھی۔لیسپز اور اسماعیل کا بُرا حال تھا۔دونوں بھاگم بھاگ موقع پر جا پہنچے۔لیسپز کا مطالبہ تھا کہ کثیر تعداد میں گن پاؤڈر قاہرہ سے منگوایا جائے تا کہ اس چٹان کو اڑایا جا سکے اور ناکامی کی صورت میں اپنے آپ کو اڑایا جا سکے۔لیکن بالآخر چٹان ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے اڑا دی گئی اور 19 نومبر کو فردی ننڈ ڈی لیسپز کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیر رہے تھے۔

نہر سویز فرانس کی ایک غیر معمولی کامیابی تھی اور اس کامیابی میں واحد فرانسیسی ہاتھ تھا جس نے کامیابی کی راہ میں حائل ہر رکاوٹ دور کی تھی۔اس نہر کی تعمیر سے بنی نوع انسان کو بہت سی سہولتیں میسر آئیں اور سفر کے راستے مختصر ہو گئے۔

کٹی سارک نامی بحری جہاز کی داستان

ساحل کے جس مقام پر "ٹام کا کافی ہاؤس" تھا وہاں پر چائے کی فروخت کیلئے ایک ڈپو کھل چکا تھا اور ملکہ این کے دور میں یہاں پر ایک نایاب اور فیشن ایبل مشروب فروخت ہوتا تھا جس کی قیمت بیس تا تیس شلنگ ہوتی تھی۔ فیشن ایبل خواتین میسرز ٹوننگ ہاؤس میں چائنہ کے چھوٹے چھوٹے پیالوں میں اس مشروب سے لطف اندوز ہوتی تھیں۔ چائے سے بھی اہل ثروت حضرات ہی لطف اندوز ہوتے تھے...... ان میں خوش وضع فیشن ایبل اور دولت مند تاجر شامل تھے۔

چائے کی پتی برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہازوں کے ذریعے انگلستان لائی جاتی تھی۔ اس کمپنی کی چین کے ساتھ تجارت میں اجارہ داری تھی۔ اس کمپنی کے جہاز سبک رفتار تھے اور سال میں محض ایک چکر ہی لگاتے تھے۔ ان کا نام "چائے کے جہاز" تھا۔

1832ء میں یہ کمپنی اپنی تجارتی اجارہ داری کھو بیٹھی اور یہ تجارت ہر اس کمپنی کے لئے کھل چکی تھی جس کے پاس مناسب جہاز تھے۔ اس کے نتیجے میں لمبے لمبے بحری جہاز بنائے گئے جو کہ انسانی دست کاری کا منہ بولتا نمونہ تھے۔ اگر چہ ان جہازوں کو "تیز رو جہاز" کا نام دیا گیا تھا۔ یہ ایک مقبول نام تھا مگر ایک فنی نام نہ تھا۔ بنیادی طور پر یہ نام اس جہاز کے لئے مناسب تھا جو تیز تر رفتار کے لئے بنایا گیا ہو۔ اگر چہ یہ عنصر بھی اہم تھا لیکن دیگر عناصر بھی زیر غور رکھنے چاہئیں تھے۔

بہر کیف ایک تیز رو جہاز ایک بہتر جہاز تھا۔ اس کا ڈیزائن اور اس کی تعمیر ان اسباق کے نتیجے کے طور پر منظر عام پر آئی تھی جو کامیابیوں اور ناکامیوں سے سیکھے گئے تھے۔

چائنہ چائے کے یہ تیز رو جہاز "سمندر کی نفیس لیڈیز" کے نام سے پکارے جانے لگے۔ یہ جہاز خوبصورتی اور کارکردگی دونوں کے اعتبار سے معیاری تھے...... ایسے معیاری جہاز دوبارہ دیکھنے میں نہ آئے تھے۔ اس قسم کے پہلے جہاز امریکن تھے...... یہ ڈونلڈ میکی کے ذہن کی پیداوار تھے۔ وہ تیز رو جہاز بنانے میں مشہور تھا۔ اس نے 33 برس کی عمر میں جہاز ڈیزائن کرنا شروع کر دیے تھے اور شہرت کمائی تھی۔ اس کے تیز رو جہاز چائنہ کی چائے کی تجارت پر جلد ہی اپنی گرفت مضبوط کر چکے تھے اور برطانیہ کے پاس ہنوز وہی پرانے سست رفتار جہاز تھے۔ اب برطانیہ کے سامنے دو ہی راستے تھے...... وہ بھی ایسے ہی جہاز تیار کر دے جو برق رفتار ہوں یا پھر تجارت سے دست برداری اختیار کرے۔ اس کی شپ یارڈ میں گہما گہمی دیکھنے میں آئی اور آرڈروں کی بھرمار ہوگئی اور 1860ء تک اس کے بحری جہاز بھی اس قدر بہترین تھے جس قدر دنیا کے دیگر جہاز بہترین تھے۔

ان میں سے کچھ جہازوں کے نام آج بھی زندہ ہیں۔ مثلاً ایریل...... ٹی پنگ سیراکا...... فائیری کراس...... ٹائے ٹانہ وغیرہ۔ وغیرہ۔

ان میں سب سے مشہور "کٹی سارک" تھا۔

''کٹی سارک'' نامی بحری جہاز اس لئے ڈیزائن کیا گیا تھا اور بنایا گیا تھا تا کہ ''تھرموپائل'' نامی جہاز کا مقابلہ کیا جا سکے جو 7 نومبر 1868ء کو عازم سفر ہوا تھا اور لیزڈ سے ملبورن 62 دن کی ریکارڈ مدت میں پہنچا تھا۔ یہاں سامان اتارنے کے بعد وہ کوئلہ لے کر نیوکیسل...... نیو ساؤتھ ویلز تا شنگھائی روانہ ہوا...... 28 دن پر محیط سفر...... اس نے ایک اور ریکارڈ قائم کیا۔ اس کے بعد وہ چائے لے کر پاگوڈا اینکورج سے روانہ ہوا اور 91 روز کے اندر اندر انگلستان واپس پہنچ گیا...... اس نے ایک اور ریکارڈ قائم کیا۔

اس جہاز کی کامیابیوں نے کیپٹن جان ولس...... لندن کا ایک مشہور شپ ماسٹر۔ مالک...... جو کہ ''اولڈ وائٹ ہیٹ'' کے نام سے بھی جانا جاتا تھا...... اس کو یہ تحریک میسر آئی کہ وہ ایک ایسا جہاز بنائے جو اس جہاز کے ریکارڈ کو بھی توڑ ڈالے۔ لہٰذا کٹی سارک'' نامی بحری جہاز وجود میں آیا۔ اس کا وزن 963 ٹن تھا۔ اس جہاز کی تعمیر ڈمبرٹن کی اسکاٹ اور لنٹن ایک غیر معروف یارڈ میں سرانجام دی گئی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ ولس کا جہاز کی کاملیت پر اصرار اور اس کی بار بار ذہنی تبدیلیوں کی وجہ سے فرم دیوالیہ ہوگئی تھی اور اس فرم نے اس کے بعد کوئی جہاز نہ بنایا تھا۔

ان دنوں بحری جہاز بہترین ناموں کے حامل تھے۔ مثلاً ہیرلڈ آف دی ڈان'' ...... کریسٹ آف دی ویو...... سمندروں کا حکمران وغیرہ۔ وغیرہ...... اس وقت اس جہاز کا نام ''کٹی سارک'' ایک عجیب وغریب نام دکھائی دیتا تھا۔ یہ نام برنز کی ایک نظم سے لیا گیا تھا۔ اس نظم کا وہ مصرعہ کچھ اس طرح تھا کہ:۔

جب بھی تم مے نوشی کرو گے تم اس جانب راغب ہو گے یا ''کٹی سارک'' تمہارے ذہن میں گردش کرے گا۔

کٹی سارک...... یا مختصر سی شرٹ...... وہ شرٹ تھی جو نوجوان دوشیزہ نینی نے پہن رکھی تھی...... جس کا پیچھا نام اوشانٹر کر رہا تھا جو اس نظم کا ہیرو تھا۔

لیکن جہاز کو یہ نام کیوں دیا گیا تھا؟

اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا تھا۔ حتیٰ کہ ولس نے بھی اس سلسلے میں کچھ نہ بتایا تھا۔

جب یہ جہاز تیار ہو گیا تب 15 فروری 1870ء کو یہ لندن سے عازم سفر ہوا۔ اس کے سفر کا آغاز زیادہ خوشگوار نہ تھا اور اس جہاز کا کپتان جارج موڈی جلد ہی پریشانی کا شکار ہو گیا۔ اس نے اس جہاز سے کافی زیادہ توقعات وابستہ کر رکھی تھیں لیکن ہوا سازگار نہ تھی جس کی وجہ سے جہاز کی رفتار کم رہی تھی۔ اس کے علاوہ بھی چھوٹے موٹے کئی ایک حادثات پیش آئے تھے اور جہاز لندن سے روانہ ہونے کے 104 روز بعد منزل مقصود پر پہنچا تھا۔ اگرچہ یہ ایک اچھا دورانیہ نہ تھا مگر کسی بھی لحاظ سے ایک بُرا دورانیہ بھی نہ تھا۔ جہاز کا یہ سفر اتنا اہم نہ تھا۔ ہاں البتہ گھر کی جانب واپسی کا سفر زیادہ اہمیت کا حامل تھا جبکہ اس میں چین کی چائے لدی ہوئی تھی۔ اس وقت اس جہاز نے یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ ایک تیز رو جہاز تھا یا نہیں تھا۔

یہ جہاز 26 جون کو شنگھائی سے روانہ ہوا...... یہ پہلا تیز رفتار جہاز تھا جو اس سیزن میں عازم سفر ہوا تھا اور کپتان موڈی یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اس کا نیا جہاز تھرموپائل نامی جہاز کا ریکارڈ توڑ سکتا تھا۔ اس کو یہ بھی علم تھا کہ اس کا حریف جہاز تھرموپائل ایک ماہ بعد اس کا پیچھا کرنے والا تھا۔ ایک مرتبہ پھر ہوا سازگار نہ تھی جس کی وجہ سے جہاز کی رفتار متاثر ہوئی تھی اور یہ جہاز 13 اکتوبر کو لندن واپس پہنچا تھا۔ اس نے اس سفر میں 110 دن

صرف کئے تھے۔ یہی سفر تھرموپائل نامی جہاز نے محض پانچ یوم کم کی مدت میں طے کیا تھا۔

کٹی سارک نامی جہاز 10 نومبر کو دوبارہ چین کے سفر پر روانہ ہوا۔ اس مرتبہ ہوا سازگار تھی۔ لہٰذا جہاز کی رفتار برقرار رہی۔ جوں ہی یہ جہاز اپنی منزل مقصود کے قریب پہنچا تو اس کی مڈبھیڑ ''ٹیپنگ'' نامی جہاز سے ہوئی جو اس سے 17 روز پیشتر لندن سے روانہ ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی مڈبھیڑ ''ٹائیٹانیا'' نامی جہاز سے بھی ہوئی جو اس سے 12 روز قبل لندن سے روانہ ہوا تھا۔ چونکہ اس موقع پر وقت اہم نہ تھا لہٰذا تینوں خوبصورت جہاز کئی روز تک ایک دوسرے کی رفاقت میں سفر طے کرتے رہے۔

1872ء میں اس کی واپسی کا سفر ایک دلچسپ سفر تھا کیونکہ اس سفر نے اسے یہ موقع فراہم کیا تھا کہ اپنے حریف ''تھرموپائل'' نامی جہاز کے ساتھ تیز رفتاری کا مقابلہ کرے اور یہ ثابت کرے کہ کون سا جہاز بہتر تھا۔

تیز رفتاری کے اس مقابلے نے کپتان موڈی اور اس کے حریف کپتان کو بے انتہا جوش' جذبہ اور ولولہ بخشا تھا۔ کپتان موڈی کے حریف کپتان کا نام کیمبال تھا۔ یہ دونوں کپتان شہرت یافتہ کپتان تھے۔ یہ مقابلہ بالکل اسی طرح تھا جس طرح دو جنگی دنیا کے دو بہترین گھوڑوں کی دوڑ کے مقابلے میں حصہ لے رہے تھے۔ دونوں جہازوں کی تیاری میں کثیر رقم خرچ ہوئی تھی۔ اگرچہ تھرموپائل اپنے حریف سے بڑھ کر شہرت کا حامل تھا۔

دونوں جہاز ایک ہی دن شنگھائی سے روانہ ہوئے تھے لیکن دھند کی وجہ سے انہیں تین روز تک رکنا پڑا تھا۔ جب دھند صاف ہوگئی تب دونوں جہاز عازم سفر ہوئے۔ کبھی ایک جہاز آگے نکل جاتا اور کبھی دوسرا جہاز آگے نکل جاتا۔ بالآخر تھرموپائل اپنے حریف سے آگے نکل گیا۔ چار روز بعد کٹی سارک بھی اس کے سامنے تھا۔ کبھی کبھار دونوں جہاز ایک دوسرے کو نظر آجاتے تھے اور دونوں جہازوں پر جوش' جذبہ اور ولولہ دیدنی تھا۔ جس وقت وہ انجر پوائنٹ...... جاوا پہنچے اس وقت ان دونوں کے ٹائم میں محض دو گھنٹوں کا فرق تھا۔ اس کے بعد کٹی سارک نے اپنی برق رفتاری دکھائی اور 4 ہفتوں کے سفر کے بعد وہ اپنے حریف سے 400 میل آگے نکل چکا تھا۔

اس کے بعد کٹی سارک خرابی کا شکار ہوگیا۔ اس کی خرابی رفع کی جاتی رہی لیکن اس نے اپنا سفر بھی جاری رکھا۔ لیکن اب جہاز کو تیز رفتاری پر مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اب موڈی جانتا تھا کہ تھرموپائل اس کے جہاز سے آگے نکل جانے میں کامیاب ہوجائے گا۔ بالآخر دونوں جہازوں کا سفر اپنے اختتام کو پہنچا۔ کٹی سارک نے یہ سفر 109 دن میں طے کیا تھا جبکہ تھرموپائل نے یہ سفر 105 دن میں طے کیا تھا۔ دونوں جہازوں میں محض چار دن کا فرق تھا۔ اس کے باوجود بھی کٹی سارک کو اخلاقی فتح حاصل ہوئی اور اس کا کپتان ایک قومی ہیرو کے رتبے پر جا پہنچا...... کیونکہ یہ تصور کیا جارہا تھا کہ اگر اس میں خرابی واقع نہ ہوتی تو یہ جہاز اپنے حریف جہاز سے دو ہفتے قبل اپنا سفر طے کرلیتا۔

بدقسمتی سے دوران سفر موڈی کا اپنے جہاز کے مالک کے بھائی کے ساتھ جھگڑا ہوگیا تھا۔ وہ اپنی صحت میں خوشگوار تبدیلی لانے کی خاطر اس جہاز میں سفر کررہا تھا۔ یہ سمجھنا انتہائی آسان ہے کہ کپتان موڈی ذہنی دباؤ کا شکار تھا...... اس کے جہاز کو بھی خطرہ تھا کیونکہ وہ خرابی کا شکار ہوچکا تھا اور وہ دوڑ کے مقابلے کے دباؤ کا بھی شکار تھا اور جب رابرٹ واس مشتعل ہوا تو موڈی سے بھی برداشت نہ ہوسکا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ موڈی نے جہاز کی کمان سے استعفیٰ پیش کردیا۔

ایک اور بحری سفر کیلئے کپتان مور کو کٹی سارک کی کمان سونپی گئی۔ یہ کپتان بھی اپنے میدان میں بہترین شہرت کا حامل تھا۔لیکن وہ حقیقت میں ایک عمر رسیدہ شخص تھا۔لہٰذا وہ زیادہ دیر تک اس عہدے پر قائم نہ رہ سکا۔

اس کے بعد کپتان ٹپ ٹافٹ کو اس جہاز کی کمان سونپی گئی۔ یہ کپتان۔ کپتان مور سے کم عمر کا حامل تھا۔لیکن یہ کپتان جہازوں کی دوڑ کا قائل نہ تھا۔وہ مقابلہ بازی کے رجحان کا حامل نہ تھا۔لیکن اس کے زیر کمان جہاز نے کئی ایک تیز رفتار سفر طے کئے تھے۔جب یہ جہاز کافی بحری سفر سرانجام دے چکا اس وقت آہستہ آہستہ یہ حقیقت واضح ہوتی چلی گئی کہ اب چائے کے تیز رو جہازوں کا زمانہ اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا۔جب کپتان ٹپ ٹافٹ شنگھائی میں وفات پا گیا اور اس کے نائب کپتان نے جہاز کی کمان سنبھالی تو اسے چائے کی کھیپ حاصل کرنے میں ناکامی ہوئی۔ بالآخر اس نے 25 شلنگ فی ٹن کے حساب سے چائے جہاز پر لادی جو کہ انتہائی کم معاوضہ تھا۔اس نے کئی ایک بندرگاہوں کے چکر لگائے اور اس کے علم میں یہ بات آئی کہ چائے کی تمام ترکھیپ اسٹیمروں نے اٹھالی تھی۔لہٰذا مجبوراً وہ کوئلہ لے کر جاپان روانہ ہوا اور مابعد سڈنی واپس آ گیا۔اس نے نیو یارک میں اپنے سفر کا اختتام کیا جہاں پر اسے پٹ سن اور چینی کی کھیپ میسر آئی۔تب اس نے بحراوقیانوس عبور کیا اور انگلستان واپس پہنچ گیا۔

اب کٹی سارک کا کپتان ولاس تھا۔وہ دیگر کپتانوں سے بالکل مختلف واقع ہوا تھا جنہوں نے اس سے قبل کٹی سارک کی کپتانی کے فرائض سرانجام دیے تھے۔اگلے بحری سفر کے دوران اس وقت مسئلے کا سامنا کرنا پڑا جبکہ عملہ کا ایک نیگرو رکن موت سے ہمکنار ہو گیا اور اس کی موت کا ذمہ دار نائب کپتان انجر کے ساحل پر جہاز سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور پلٹ کر نہ آیا۔عملے کے دیگر ارکان کا اعتماد کپتان ولاس سے اٹھ چکا تھا اور تقریباً باغیانہ ماحول قائم ہو چکا تھا۔کپتان ولاس سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہو سکا۔لہٰذا ایک رات اس نے جہاز سے چھلانگ لگا دی اور سمندر کے پانی میں گم ہو گیا۔

سنگاپور میں جہاز کو ایک نیا کپتان میسر آیا......اس کا نام کپتان بروس تھا......وہ اپنا زیادہ وقت شراب نوشی اور گلوکاری کی نذر کرتا تھا۔اس کی قیادت میں ایک مرتبہ یہ قابل فخر جہاز سامان کی کھیپ کی تلاش میں ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔بالآخر اپریل 1882ء میں نیو یارک میں بروس پر بیماری کا شدید حملہ ہوا اور اسے جہاز کی سربراہی سے معزول کر دیا گیا۔جہاز کا ایک نیا کپتان مقرر کیا گیا۔اس کا نام بھی مور تھا اور جب اس نے جہاز کا معائنہ کیا تو وہ خوفزدہ ہو گیا۔بروس کی زیر قیادت جہاز بری طرح شکست و ریخت کا شکار ہوا تھا اور اس کے کئی حصوں کی مرمت ہونے والی تھی اور کئی حصے تبدیل ہونے والے تھے۔لہٰذا کٹی سارک کو اس کی سابقہ صورت حال پر بحال کرنے میں کافی زیادہ لاگت صرف ہونے کا احتمال تھا۔

جہاز واپس انگلستان پہنچ چکا تھا اور ''اولڈ وائٹ ہیٹ'' یہ جانتا تھا کہ اب اچھے دن بیت چکے تھے۔لہٰذا اس نے جہاز کی کم سے کم مرمت کے احکامات صادر کئے۔یہ جہاز مرمت کے بعد دوبارہ عازم سفر ہوا۔جون 1883ء میں یہ جہاز لندن واپس پہنچ چکا تھا۔

اس کا اگلا سفر نیوکیسل کی جانب تھا۔اس پر عام سامان تجارت کی کھیپ لدی تھی اور اس کے واپسی کے سفر کے دوران پہلی مرتبہ اس پر اون کی کھیپ لدی تھی۔اس جہاز نے 82 دن میں اپنا سفر طے کیا اور گھر واپس پہنچ گیا۔ہر کوئی حیران تھا خصوصاً ولس کی حیرانگی قابل دید تھی۔اگلے سفر کے دوران اس نے اون کی کھیپ کے ہمراہ 79 دن میں اپنا سفر طے کیا۔اگرچہ یہ جہاز اون کی باربرداری کے لئے ڈیزائن نہیں کیا گیا تھا بلکہ چائے کی

بار برداری کے لئے ڈیزائن کیا گیا تھا لیکن یہ اون کی بار برداری میں بھی غیر معمولی کامیابی سے ہمکنار ہوا تھا۔ کپتان مور کی اب تبدیلی ہو چکی تھی اور جہاز کی کمان کپتان رچرڈ وڈگٹ کو سونپ دی گئی تھی۔ یہ کپتان کٹی سارک کو لے کر 3 اپریل 1886ء کو اپنے پہلے سفر پر روانہ ہوا اور اس کی زیر کمان آئندہ چند برس خوشگوار ترین برس ثابت ہوئے۔ اس جہاز نے کئی ایک ریکارڈ قائم کئے جو ہنوز قائم ہیں۔ لیکن تیز رو جہازوں کا دور اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ بوڑھا ولس اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا کہ ان جہازوں کا دور اب آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا۔ لہٰذا اس نے کٹی سارک کو بیچنے کا فیصلہ کیا۔

جلد ہی یہ جہاز پرتگالیوں کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ انہوں نے اس کا نام ''فریرا'' رکھا جبکہ اس جہاز کا پرانا حریف جہاز تھرموپائل بھی پرتگالیوں کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا تھا۔ اس کا نام انہوں نے ''پیڈرو نونز'' رکھا تھا۔ کٹی سارک آئندہ پچیس برسوں تک محو سفر رہا۔ ایک دوسرے نام اور ایک دوسرے ملک کے جھنڈے تلے محو سفر رہا۔

1914ء تا 1918ء کی جنگ کے دوران بھی وہ بحفاظت اپنا سفر طے کر کے واپس آ چکا تھا اور 1922ء میں وہ ماضی کی ایک یادگار بن چکا تھا...... اگرچہ اس کی کشش ہنوز باقی تھی لیکن اب دنیا بدل چکی تھی اور یہ جہاز بدلتی دنیا کے بدلتے ہوئے تقاضوں پر پورا نہ اترتا تھا۔

1952ء میں ''کٹی سارک تحفظ سوسائٹی'' وجود میں آئی اور آج یہ جہاز گرین وچ کی زینت بنا ہوا ہے...... یہ ہنوز خوبصورت اور پُروقار دکھائی دیتا ہے...... یہ بحری سفر کے ان حیران کن دنوں کی یاد ہے جو ہمیشہ کیلئے بیت چکے ہیں اور کبھی واپس نہ آئیں گے۔

......❀......

اسٹینلے نے لیونگ اسٹون کو ڈھونڈ نکالا

یہ اکتوبر 1869ء کی ایک شب تھی۔ نیویارک ہیرلڈ کے معمر مالک کا بیٹا جیمز گورڈن بینٹ جونیئر گرینڈ ہوٹل پیرس میں اپنے بیڈروم میں موجود تھا۔ دروازے پر ہلکی سی دستک سنائی دی اور اجازت ملنے پر ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔

بینٹ نے نوجوان سے دریافت کیا کہ:۔

''تم کون ہو؟''

نوجوان نے جواب دیا کہ:۔

''میرا نام اسٹینلے ہے۔''

بینٹ نے جواب میں کہا کہ:۔

''اوہ......ہاں......''

یہ نمائندہ خصوصی تھا جو اسپین کی خانہ جنگی کی رپورٹنگ سرانجام دے رہا تھا اور بینٹ نے اسے طلب کیا تھا۔

بینٹ نے جلد ہی اصل معاملے کی جانب آتے ہوئے کہا کہ:۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہ لیونگ اسٹون کہاں پر موجود ہوسکتا ہے؟''

نوجوان نے جواب دیا کہ:۔

''سر......میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا''

بینٹ نے پھر سوال کیا کہ:۔

''کیا تمہارے خیال میں وہ زندہ ہوگا؟''

نوجوان نے جواب دیا کہ:۔

''اس کا زندہ ہونا عین ممکن بھی ہے اور ممکن نہیں بھی ہے۔''

بینٹ نے جواب دیا کہ:۔

''میرا خیال ہے وہ زندہ ہے اور میں تمہیں اس کی تلاش میں روانہ کررہا ہوں۔''

لہٰذا صحافت کی دنیا کی ایک عظیم مہم کا آغاز ہوا۔ لیونگ اسٹون ایک معروف طبی مشنیری کے علاوہ ایک عظیم مہم جو بھی تھا۔ اس نے تقریباً

نصف افریقہ دریافت کیا تھا اور انگلستان اور امریکہ کے لاکھوں لوگ اس کے نقش قدم پر چلنا فخر محسوس کرتے تھے...... اس کے بارے میں یہ قیاس تھا کہ وہ تاریک براعظم کے وسط میں کہیں نہ کہیں موجود ہوگا...... بشرطیکہ وہ ہنوز زندہ تھا۔ 1865ء میں وہ تیسری مرتبہ افریقہ گیا تھا اور گذشتہ چار برسوں سے کسی بھی سفید فام نے اسے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا تھا۔ یہ افواہ گردش کر رہی تھی کہ وہ ہلاک کر دیا گیا تھا لیکن اس کی جانب سے موصول ہونے والے خطوط اس افواہ کی نفی کرتے تھے۔ اس کے بعد اس کی جانب سے خاموشی چھائی رہی اور گذشتہ بارہ ماہ سے لیونگ اسٹون کے بارے میں کوئی اطلاع نہ تھی...... اس کی صحت کیسی تھی...... اس کی سرگرمیاں کیا تھیں۔ بینٹ نے اس کی تلاش کی ٹھانی تھی اور اس مقصد کیلئے اس نے اسٹینلے کا انتخاب کیا تھا۔

بینٹ نے اسٹینلے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"تم جو کچھ بہتر سمجھتے ہو وہی کچھ کرو لیکن لیونگ اسٹون کو ہر حال میں تلاش کرو...... اس کو ہر حال میں ڈھونڈ نکالو۔"

بینٹ نے مزید کہا کہ:۔

"رقم کا کوئی مسئلہ نہیں ہے...... اس مہم کے لئے ایک ہزار پونڈ کی رقم وصول کر لو...... اگر یہ رقم کم پڑ جائے تب تم مزید ایک ہزار پونڈ وصول کر سکتے ہو...... اگر وہ بھی کم پڑ جائیں تب تم مزید ایک ہزار پونڈ وصول کر سکتے ہو...... لیکن لیونگ اسٹون کو ہر حال میں تلاش کرنا ہوگا۔"

درج بالا الفاظ اسٹینلے کے کانوں میں گونج رہے تھے جب وہ پریس سے روانہ ہوا۔ البتہ بینٹ کو یہ احساس نہ تھا کہ اس نے اس مہم کیلئے کس قدر موزوں شخص کا انتخاب کیا تھا۔ اگرچہ اسٹینلے اپنے آپ کو ایک امریکی شہری کہتا تھا لیکن وہ ایک امریکی شہری ہرگز نہ تھا۔ اس نے 1841ء میں شمالی ویلز میں جنم لیا تھا۔ وہ الزبتھ پاری...... جو ایک قصاب کی بیٹی تھی...... اور جان رونالٹ...... جو ایک کسان تھا کا غیر قانونی بیٹا تھا۔ اس کے والدین نے اس کی پرورش اور نگہداشت کے فرائض سرانجام نہ دیے تھے اور چھ برس کی عمر میں یہ غیر ضروری بچہ خوف و ہراس اور تنہائی کا شکار ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے رشتے داروں کا رخ کیا جنہوں نے اسے مختلف کام دھندوں پر لگائے رکھا حتیٰ کہ وہ سترہ برس کی عمر کو جا پہنچا۔ اب اس نے ایک کیبن بوائے کی حیثیت سے لیورپول تا نیو آرلینز کا بحری سفر طے کیا۔

امریکہ میں اس نوجوان کو ایک مہربان تاجر کی سرپرستی میسر آ گئی۔ وہ اس کا غیر سرکاری سرپرست بن گیا۔ اس سرپرست کا نام ہنری مورٹن اسٹینلے تھا۔ اس شخص نے اسے باپ کا پیار دیا اور اپنا نام بھی دیا...... لیکن وہ شخص جلد ہی موت سے ہمکنار ہو گیا۔ اس کے بعد اسٹینلے نے تجارتی جہازوں میں ملازمت کرنے کے علاوہ بحریہ میں بھی ملازمت سرانجام دی۔ اس کے بعد اس نے "نیویارک ہیرلڈ" میں نمائندہ خصوصی کے طور پر ملازمت اختیار کر لی اور ابیسینیا میں برطانوی مہم کی رپورٹنگ سرانجام دینے لگا۔ اس کے اندر یہ خواہش جنم لے رہی تھی کہ وہ اپنے آپ کو ایک غیر معمولی ہستی ثابت کرے اور کوئی نہ کوئی اہم کارنامہ سرانجام دے اور لیونگ اسٹون کو ڈھونڈنے کا کارنامہ ایک ایسا ہی کارنامہ ثابت ہو سکتا تھا...... یہ ایک ایسا موقع تھا جو اسے ایک ہیرو ثابت کر سکتا تھا...... اور اسے لازوال شہرت حاصل ہو سکتی تھی...... بشرطیکہ وہ لیونگ اسٹون کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتا۔ وہ افریقہ کے جنگلوں کے بارے میں کچھ نہ جانتا تھا اور نہ یہ جانتا تھا کہ وہاں کے آبائی باشندوں سے کس طرح نپٹنا تھا۔

وہ اس مقام تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا جس مقام پر لیونگ اسٹون کی موجودگی کے بارے میں آخری بار سنا گیا تھا۔ لیکن یہ مقام ساحل سے 750 میل دوری پر واقع تھا اور اس مقام تک رسائی حاصل کرنے کی غرض سے ایک اہم مہم سرانجام دینے کی ضرورت درپیش تھی۔ بینٹ کی طرف سے فی الحال کوئی رقم موصول نہ ہوئی تھی اور اسٹینلے کی جیب میں محض 80 پونڈ کی رقم موجود تھی۔ لیکن اس نے امریکن کونسل سے ایک بڑی رقم بطور قرض حاصل کر لی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے سفر کا اصل مقصد بھی ان سے چھپایا تھا۔

اس کے بعد اسٹینلے اپنی مہم کی تیاری سرانجام دے چکا تھا...... وہ دو برس تک کا سامان رسد اپنے ہمراہ لے جانا چاہتا تھا...... اسلحہ...... کپڑے...... خیمے...... ادویات...... کھانا پکانے کے برتن...... خوراک جتنی زیادہ سے زیادہ وہ اپنے ہمراہ رکھ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اسٹینلے نے آٹھ ہزار ڈالر کی مقامی کرنسی بھی اپنے ہمراہ رکھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ رقم کی ادائیگی کے بغیر قبائلی سردار اسے اپنے علاقے سے گزرنے کی اجازت فراہم نہیں کریں گے اور اس کی مہم ناکامی کا شکار ہو کر رہ جائے گی۔

بالآخر رخت سفر باندھ لیا گیا۔ 70 پونڈ کا وزن ایسا تھا جسے سر پر اٹھانا ممکن تھا...... سامان رسد کا تمام تر بوجھ چھ ٹن تھا۔ لہٰذا دو صد مقامی مزدور بھرتی کیے گئے اور اس کے علاوہ دو سفید فاموں کی خدمات بھی حاصل کی گئی تاکہ ان کی معاونت سے بھی مستفید ہونا ممکن ہو سکے۔

لاتعداد گدھے بھی اکٹھے کیے گئے۔ ماہ مارچ میں یہ قافلہ عازم بحری سفر ہوا۔ ساحل پر مزید مزدور بھرتی کرنے پڑے تھے۔ اس طرح مزید وقت صرف ہو گیا اور عازم سفر ہونے سے پیشتر قافلے کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا اور اسٹینلے بذات خود قافلے کے وسط میں رہا۔ اس دوران موسم برسات بھی شروع ہو چکا تھا۔ دریا بھی بپھر چکے تھے اور علاقہ بھی دلدل کی لپیٹ میں تھا۔

لیکن جب یہ قافلہ روانہ ہوا اس وقت اہل قافلہ کے جذبے جوان تھے۔ ان کی خواتین اور مویشی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ مزدور باآواز بلند گانے گا رہے تھے۔ ہنسی خوشی یہ قافلہ روانہ ہوا۔

اندرون علاقہ جانے کے کئی ایک راستے تھے لیکن اسٹینلے نے مغرب کی جانب سے سفر طے کرنے کا فیصلہ کیا لیکن یہ ایک سخت ترین راستہ ثابت ہوا۔ یہ علاقہ جلد ہی بارشوں کی زد میں آ گیا اور دلدلوں کا حامل بن گیا۔ اس علاقے میں حشرات الارض کی بھی بہتات تھی جو انسانوں اور مویشیوں کو کاٹتے تھے اور یہ لوگ شدید بخار کی لپیٹ میں آ جاتے تھے۔

لہٰذا سفر مشکل ترین تھا۔ لیکن اسٹینلے کو دیگر مشکلات کا بھی سامنا تھا۔ مقامی افراد کو اس مہم سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کو محض رقم کمانے سے دلچسپی تھی یا پھر وہ ایسے موقع کی تلاش میں رہتے تھے کہ وہ جو سامان اٹھائے ہوئے آنکھ بچا کر اسے لے کر غائب ہو جائیں۔ جب سفر زیادہ مصائب سے دوچار ہوا تب مقامی لوگ ساتھ چھوڑ گئے اور اگلے آٹھ ماہ کے دوران اسٹینلے باقی ماندہ افراد کو اخلاقی طور پر متحد رکھنے میں کامیاب ہو سکا یا پھر ڈنڈے کے زور پر متحد رکھنے میں کامیاب ہو سکا۔

کچھ لوگ راہ فرار اختیار کر چکے تھے...... کچھ لوگ چیچک کا شکار ہو چکے تھے...... کچھ پیچش کا شکار ہو چکے تھے یا ملیریا کا شکار ہو چکے تھے...... کچھ لوگ موت سے ہمکنار ہو چکے تھے...... مقامی سردار اپنے علاقوں سے گزرنے کا منہ مانگا معاوضہ وصول کر رہے تھے...... وحشی قبائل قافلے کو لوٹنے

کے انتظار میں تھے...... یہ تمام تر مصائب اس قافلے کو درپیش تھے۔

قافلے کے آغاز سفر سے دس میل تک کے سفر کے دوران قافلے کی راہ میں کئی ایک دریا حائل ہوئے۔ ان دریاؤں کو عبور کرنے کی غرض سے جانوروں پر سے بوجھ اتارنا پڑتا تھا اور دریا عبور کرنے کے بعد دوبارہ یہ بوجھ ان پر لادنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد قافلے نے ایک باقاعدہ روٹ اپنا لیا تھا۔ یہ وہ روٹ تھا جسے عرب تاجر استعمال کرتے تھے۔ یہ راستہ دیہاتوں میں سے گزرتا تھا جہاں سے خوراک اور پانی میسر آ جاتا تھا۔ یہ مقامات بیماریوں کا گھر تھے اور جلد ہی اسٹینلے کے دو گھوڑے ہلاک ہو چکے تھے اور اس کے قافلے کے کئی افراد بیمار پڑ چکے تھے۔

کئی روز تک قافلہ جنوب' مغرب کی سمت سفر طے کرتا رہا اور تب مغرب کی جانب عازم سفر ہوا۔ وہ ایک متاثر کن قصبے سے گزرے اس کا نام زمبابونی تھا (آج کل یہ جدید مورو گورو کے نام سے جانا جاتا ہے)۔ اس سفر کے دوران قافلے کے بہت سے افراد بمع اسٹینلے ملیریا کا شکار ہو گئے۔ یہ مقام نسل در نسل عرب تاجروں کی آماجگاہ تھا اور ان کے مزدور گندگی کے حامل تھے اور اسٹینلے بخار کی شدت میں مبتلا اپنے خیمے میں پڑا تھا اور کیڑوں مکوڑوں کی فوج اس پر حملہ آور تھی۔

دو ماہ تک مصائب برداشت کرنے کے بعد بالآخر یہ قافلہ اساگرا کے پہاڑوں کے پار پہنچ چکا تھا۔ اس مقام پر اس قافلے نے اپنے تحفظ کی خاطر ایک عرب قافلے میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ لیکن یہ مشترکہ قافلے مخالف قبیلے کے حملے کی زد میں آ چکا تھا جبکہ اسٹینلے دوبارہ بخار کا شکار ہو چکا تھا' چونکہ اس کے پاس مسلح افراد موجود تھے لہٰذا اسے دشمن کے نیزوں کا کوئی خوف نہ تھا۔

لیکن اس کی مہم کی شکل ترین گھڑی ابھی باقی تھی...... اس مہم کی مشکل ترین آزمائش ہنوز باقی تھی۔ تابوڑ کے مقام پر...... یہ قصبہ جھیل ٹانگا نائیکا کے مشرق میں دو صد میل کے فاصلے پر واقع تھا...... اس مقام پر اسٹینلے ایک انتہائی بری خبر سے دوچار ہوا...... یہ علاقہ جنگ کی لپیٹ میں تھا...... ایک افریقی سردار میرا مبو کے ساتھ جنگ جاری تھی جس نے اوجیجی کی جانب جانے والے قافلوں کی ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ اسٹینلے نے اپنے آدمی عربوں کو مستعار دے دیے تاکہ وہ عربوں کے ساتھ مل کر افریقی سردار کے خلاف جنگ کر سکیں...... ان میں سے بہت سے آدمی مارے گئے۔ اسٹینلے ایک مرتبہ پھر بخار کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ اس کے بعد افریقی سردار میرا مبو نے تابوڑ کے مقام پر حملہ کر دیا۔ اسٹینلے بھی آخری معرکے کے لئے تیار تھا اور وہ میرا مبو کے ہتھے چڑھنے سے بال بال بچا تھا۔

تابوڑ کے مقام پر تین ماہ گزارنے کے بعد اسٹینلے نئی بھرتی کے ساتھ دوبارہ عازم سفر ہوا اور لڑائی جھگڑے کے علاقہ سے بچنے کی خاطر اس نے جنوب کی جانب کا رخ کیا۔ وہ اس علاقے کے بارے میں قطعاً نہیں جانتا تھا۔ یہ راستہ اختیار کرنے کی بدولت اس کا سفر تین گنا طویل ہو چکا تھا۔ اسٹینلے کے بہت سے آدمی چیچک اور بخار کا شکار ہو چکے تھے...... کچھ لوگ اسے چھوڑ کر جا چکے تھے۔ باقی ماندہ افراد کو اسٹینلے نے ایک زنجیر کے ذریعے باندھ دیا تھا تاکہ وہ بھی راہ فرار اختیار نہ کر جائیں۔ اس نے راہ فرار اختیار کرنے والے افراد کو بھی دوبارہ قابو کر لیا تھا اور انہیں بھی زنجیر کے ذریعے باندھ دیا تھا۔ اس کی فولادی قوت ارادی اس قافلے کو رو بہ عمل رکھے ہوئے تھے۔

اب وہ ایک ایسے علاقے میں پہنچ چکے تھے جہاں پر شکار وافر تعداد میں موجود تھا اور کھانے پینے کی کوئی قلت نہ تھی۔ اگرچہ اسٹینلے دوبارہ

بخار کی زد میں تھا لیکن اس کے باوجود وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ بالآخر وہ اوجیجی کے مقام پر پہنچ جائے گا۔

لیکن کیا لیونگ اسٹون اس مقام پر موجود تھا؟

کافی دنوں کے بعد ایک دیہات میں اس نے سفر انجام دینے والے چند دیگر افراد سے یہ افواہ سنی تھی کہ ایک سفید فام اس سے کچھ دوری پر دیکھا گیا تھا۔

اگر چہ یہ خبر درست ثابت نہ ہوئی تھی لیکن یہ خبر سن کر ایک مرتبہ اسٹینے کا دل اپنی پوری رفتار کے ساتھ دھڑ کا تھا۔ اس غیر آباد علاقے میں مخالف قبیلوں کی جانب سے ہنوز خطرہ تھا۔ یہ علاقہ جنگلات اور دلدل کا حامل تھا۔ ایک مقام پر اسٹینلے گردن تک دلدل میں دھنس گیا تھا۔

کئی ہفتے مزید گزر چکے تھے۔ وہ ابھی تک اوجیجی سے ساٹھ میل دور تھے...... ایک افریقی قافلہ جو مخالف سمت سے آ رہا تھا اس نے یہ بتایا تھا کہ انہوں نے بھوری داڑھی کا حامل ایک سفید فام دیکھا تھا جو ابھی ابھی اس مقام پر پہنچا تھا۔

اسٹینلے نے اپنی ڈائری میں تحریر کیا کہ:۔

"ہُر ے...... یہ لیونگ اسٹون ہے...... اسے لازماً لیونگ اسٹون ہی ہونا چاہیے ...... وہ کوئی دوسرا شخص نہیں ہو سکتا...... لیکن اب ہمیں جلد از جلد سفر طے کرنا چاہیے ...... کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے پہنچنے کی خبر اس تک جا پہنچے اور وہ وہاں سے بھاگ نکلے ......"

تیزی سے سفر طے کرتے ہوئے قافلہ جلد ہی ایک اور مسئلے کا شکار ہو گیا۔ واہا قبیلے کا نام نہاد بادشاہ جس کے علاقے سے قافلے نے گزرنا تھا...... وہ بھاری معاوضے کا مطالبہ کر رہا تھا...... اسٹینلے کو منہ مانگا معاوضہ ادا کرنا پڑا۔

لیکن ابھی اسے پانچ مزید دیہات عبور کرنے تھے اور یہاں پر بھی بھاری معاوضے کی ادائیگی درکار تھی جو اسٹینلے کے بس کی بات نہ تھی۔ اگر وہ معاوضے کی ادائیگی سے انکار کرتا تب وحشی قبائل اس کا قافلہ تہس نہس کر کے رکھ دیتے...... ایسی صورت میں ایک ہی نعم البدل موجود تھا کہ اس علاقے سے راہ فرار اختیار کی جائے...... اور ایک رات...... رات کے اندھیرے میں...... دو منحرف غلاموں کے تعاون کی بدولت وہ اور اس کے آدمی میدانوں اور پہاڑیوں سے گزرتے ہوئے بالآخر واہا کے علاقے سے راہ فرار اختیار کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

اس کے بعد وہ ایک خوبصورت وادی میں پہنچ چکے تھے۔ اس وادی میں جنگلی پھلوں کے درخت وافر مقدار میں موجود تھے۔ اس کے علاوہ خوبصورت پھول بھی اس وادی کا حسن بڑھا رہے تھے۔ اس وادی کے آگے اوجیجی کا مقام تھا۔ اور ایک پہاڑی کی چوٹی سے اسٹینلے کے جھیل ٹانگا نائیکا کا اولین نظارہ کیا۔ اسٹینلے کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

لیکن لیونگ اسٹون؟ اسٹینلے نے دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے ایک خادم کو حکم دیا کہ وہ اس کا نیا سوٹ نکالے...... اس کے جوتے چمکائے ...... اس کی نئی پگڑی تیار کرے۔ ...کہ:۔

"میں ایک خوبصورت حلیے میں بھوری داڑھی کے حامل سفید فام کے سامنے پیش ہونا چاہتا ہوں۔"

جب یہ قافلہ اوجیجی کے مقام پر پہنچا تو اس مقام کے لوگ قافلے سے ملنے کے لئے دوڑے چلے آئے اور قافلے کا استقبال کیا۔ وہ

چلائے:۔

''یمبو......یمبو......بانا!''

اچانک اسٹینلے کوایک آواز سنائی دی:۔

''صبح بخیر......سر!''

اور اسٹینلے کے مڑکر آواز کی جانب دیکھا......ایک مقامی باشندہ چمکتے ہوئے دانتوں کی ایک قطار کے ہمراہ اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

اسٹینلے نے پوچھا کہ:۔

''تم کون ہو؟''

مقامی باشندے نے جواب دیا کہ:۔

''میرا نام سوی ہے......میں ڈاکٹر لیونگ اسٹون کا ملازم ہوں''

سوی واپس بھاگا تاکہ اپنے آقا کو مہمانوں کی آمد کی اطلاع کر سکے اور قافلہ بھی لیونگ اسٹون کے گھر کی جانب چل پڑا جہاں پر لوگوں کا ایک ہجوم پہلے ہی جمع ہو چکا تھا۔ایک دبلا پتلا بھوری داڑھی کا حامل شخص باہر نکلا۔

اسٹینلے کے ملازم نے کہا کہ:۔

''سر......کیا میں ڈاکٹر صاحب کی زیارت کر رہا ہوں۔''

اس لمحے اسٹینلے غیر یقینی صورت حال کا شکار تھا۔ڈاکٹر برطانوی جزیروں کا ایک تعلیم یافتہ شخص تھا جہاں پر اسٹینلے نے بہت سے مصائب جھیلے تھے۔وہ سوچ رہا تھا کہ کیا ڈاکٹر اس کا استقبال کرنا پسند کرے گا؟

بہرکیف اسٹینلے سے معجزات سرزد ہوئے تھے۔اس نے ایک کٹھن مہم سرانجام دی تھی......اس نے سامان رسد سینکڑوں میل تک اپنے ہمراہ اٹھایا تھا......کئی مرتبہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی تھیں۔لیکن ہنوز اسے یقین نہ تھا۔

مابعد اس نے یہ تحریر کیا کہ:۔

''میں نہیں جانتا کہ وہ کیسے میرا استقبال کرے گا......لہٰذا میں نے وہی کچھ کیا جو کچھ میرے بزدلانہ اور جھوٹے وقار نے میرے لئے تجویز کیا......میں قدم بڑھاتے ہوئے اس کی جانب بڑھا......اپنا ہیٹ اتارا اور کہا کہ:۔

''میرا خیال ہے کہ آپ ڈاکٹر لیونگ اسٹون ہیں۔''

لیکن ڈاکٹر نہ صرف مہربانی کے ساتھ پیش آیا بلکہ اس نے اظہار تشکر بھی کیا اور اس امر کو نظر انداز کر دیا کہ اسٹینلے نیویارک ہیرلڈ کا نمائندہ تھا۔اسٹینلے نے اگلے چند ہفتے ڈاکٹر کے ساتھ گزارے اور اس نے محسوس کیا کہ افریقہ کی تحقیق وتفتیش سرانجام دینے کا شعلہ ڈاکٹر کے دل میں پوری شدت کے ساتھ بھڑک رہا تھا اور یہ شعلہ ماند پڑتا دکھائی نہ دیتا تھا۔

......❀......

ہینز شلی مان نے شہر ٹرائے دریافت کرلیا

نرم و گرم ہوا میں کچھ نہ کچھ ضرور پنہاں تھا...... کچھ ایسی چیز پنہاں تھی جو ترکی کی عجیب و غریب خوشبو سے بھی بڑھ کر تھی۔ کوئی نہ کوئی چیز آج اسے یہ باور کروا رہی تھی کہ ماہ مئی کے اس گرم دن وہ کچھ نہ کچھ ضرور پالے گا جس کے پانے کی جدوجہد وہ گذشتہ کئی برسوں سے کر رہا تھا۔

اور ایک جرمن باپ کا بیٹا شلی مان کیا ثابت کرنا چاہتا تھا؟ مابعد اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس نے یہ واضح کیا کہ:۔

''میں نے شاہ پرائم کے مکمل افسانوی خزانے کو پایا...... ایک افسانوی شہر کا افسانوی بادشاہ...... جو ایک مکمل افسانوی دور میں رہائش پذیر رہا۔''

ہنیرچ...... 1873ء کی موسم بہار کی اس صبح...... اس روئے زمین پر ان چند افراد میں سے ایک تھا جو اس امر پر یقین رکھتے تھے کہ عظیم یونانی شاعر کی ''ٹروجن وار'' کی داستان...... جو ٹرائے کے شاہ پرائم اور یونانیوں کے درمیان لڑی گئی تھی...... ایک عورت کی محبت میں لڑی گئی یہ لڑائی محض ایک فرضی داستان نہ تھی۔ بہت سے تاریخ دانوں کے نزدیک ٹرائے ایک افسانوی نام تھا اور پرائم بھی ایک افسانوی کردار تھا۔ ان کے بقول یہ ایک افسانوی اور رومانوی قصہ تھا جو صدیوں سے گردش کر رہا تھا۔

لیکن شلی مان اپنے بچپن ہی سے اس قصے کو ایک حقیقی واقعہ تصور کرتا تھا اور اس کے نزدیک ٹرائے بذات خود بھی حقیقی شہر تھا۔ ایک عظیم شہر جو زمانے کی گرد تلے چھپ چکا تھا۔

ترکی کے ساحل کے قریب وہ اپنے آپ سے مخاطب تھا کہ:۔

خدا بہتر جانتا ہے...... ترک بھی شاید نہیں جانتے کہ کسی دور میں اس مقام پر ایک عظیم شہر آباد تھا...... اس کے آثار اس کی تمام تر دولت سمیت زمین کے اندر چند فٹ کی گہرائی میں مدفون ہیں۔''

یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنے کام پر ہر طرح کی پابندی عائد کر رکھی تھی حتیٰ کہ معمر شخص امین آفندی جو کام کی نگرانی سرانجام دیتا تھا...... وہ بھی بمشکل بیلچے کے ایک سرے سے دوسرے تک کو جانتا تھا۔ اس کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ اس امر کی یقین دہانی کرے کہ کوئی بھی چھوٹی چیز...... اگرچہ وہ بے وقعت ہی کیوں نہ ہو...... وہ ہنیرچ شلی مان کی جیب کے علاوہ کسی اور کسی جیب میں نہیں جانی چاہئیے۔

فی الحال زیور سے کم قیمت کی حامل چھوٹی موٹی اشیاء ہی دریافت ہوئی تھیں اور یہ دریافت اس کے مزدوروں کی فوج نے سرانجام دی تھی۔

تمام تر اشیاء مائینر گم شدہ تہذیبوں کا مدفن تھا۔ کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں سے کوئی نہ کوئی قدیم ظروف دریافت نہ ہوا ہو...... اور ان میں سے کوئی بھی دریافت بقول ماہرین آثار قدیمہ یہ ثابت نہ کرتی تھی کہ اس کا تعلق ٹرائے کے عظیم بادشاہ کے عظیم محل سے تھا۔

لیکن ہنیرچ شلی مان بہتر جانتا تھا...... بھاڑ میں جائیں تمام ماہرین آثار قدیمہ......اس نے یہ فقرہ ہزاروں بار اپنے دل میں دہرایا تھا......
اس کے مزدوروں نے ایک لمبی چوڑی خندق کھودی تھی اور ابھی ابھی وہ اس کی کھدائی کے کام سے فارغ ہوئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ماہر آثار قدیمہ یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ اس امر کو ثابت کرسکتا تھا کہ ایک جرمن اس میدان میں بھی کامیابی سے ہمکنار ہوسکتا تھا جس میدان میں وہ ناکام ہوئے تھے۔

اس نے خندق سے نگاہ اوپر اٹھائی......اپنی نوجوان نئی یونانی بیوی صوفیہ کی جانب دیکھا۔ سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لینے کے بعد وہ مسکرانے لگا۔ وہ ایک خوبصورت عورت تھی اور اس سے محبت بھی کرتی تھی اور یہ دو حقائق ایسے تھے جنہوں نے باہم مل کر اسے یہ توانائی بخشی تھی کہ وہ اپنی بات کو ثابت کرسکے۔ جب تک اس کی یہ نئی اور خوبصورت بیوی اس کی زندگی میں داخل نہ ہوئی تھی اس وقت تک وہ اکثر مایوسی اور آزردگی کا شکار رہتا تھا۔اب وہ خوش باش رہتا تھا۔اب اسے ہر چیز کامل دکھائی دیتی تھی۔

یہ خندق تقریباً نو میٹر گہری تھی......28 فٹ گہرائی کی حامل تھی اور اس میں قدرے روشنی دکھائی دی تھی۔ کوئی چیز ایک لمحہ کے لئے چمکتی دکھائی دیتی تھی اور پھر غائب ہوجاتی تھی۔ اس نے اپنے سنہری فریم کی حامل عینک اتاری۔ اس کے شیشے صاف کئے اور اسے دوبارہ اپنے چہرے پر سجالیا۔

اس کے بعد وہ اس قدر زور سے ہانپا کہ صوفیہ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

وہ اس کے خزانے کو نہ دیکھ سکی تھی۔

وہ دوبارہ ہانپ رہا تھا......وہ اس طرح ہانپ رہا تھا جس طرح پانی سے باہر مچھلی تڑپتی ہے......اس کے بعد وہ کسی قدر بولنے کے قابل ہوا
.....

''انہیں روکو صوفیہ......انہیں روکو!''

صوفیہ نے دریافت کیا کہ:۔

''روکوں......مگر کسے روکوں؟''

شلی مان نے جواب دیا کہ:۔

''مزدوروں کو روکو......اب انہیں روک دو۔''

اس نے مزید کہا کہ:۔

''انہیں ان کے گھروں کو روانہ کردو''

صوفیہ نے پوچھا کہ:۔

''انہوں ان کے گھر روانہ کردوں......مگر کیوں؟ اور کیسے؟''

شلی مان چلایا کہ:۔

''صوفیہ جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسے ہی کرو''

صوفیہ نے جواب دیا کہ:۔

''ٹھیک ہے۔''

شلی مان نے مزید کہا کہ:۔

''مزدوروں کو بتادو کہ یہ پیڈو ہے.....یعنی آرام کا وقت ہے.....اور انہیں جلدی سے بتادو۔''

صوفیہ نے پوچھا کہ:۔

''وہ کہیں گے کہ کیوں آرام کا وقت ہے؟

شلی مان نے کہا کہ:۔

''انہیں بتادو کہ آج میری سالگرہ ہے اور مجھے ابھی ابھی یہ یاد آیا ہے.....انہیں لازمی طور پر آرام کی غرض سے چلا جانا چاہیئے
.....اور میں انہیں اس آرام کے درانیے کی بھی ادائیگی کروں گا''

اس نے اپنے کندھے اچکائے اور سیڑھی چڑھنے لگی تاکہ سطح زمین تک پہنچ جائے۔ تھوڑی دیر بعد مزدور چھٹی منا رہے تھے اور ادھر اُدھر مٹر گشت کرر ہے تھے اور اپنے آپ کو مبارکباد دے رہے تھے اور اس غیر ملکی کی حماقت پر ہنس رہے تھے جسے ابھی ابھی اپنی سالگرہ یاد آئی تھی اور وہ اس سالگرہ کی وجہ سے اپنی رقم ضائع کررہا تھا۔

اگر وہ یہ جانتے کہ ہینرچ شلی مان کیا کچھ پارہا تھا.....کچھ کھو نہیں رہا تھا.....تب وہ کبھی بھی اس جگہ سے نہ ملتے۔

یہاں سے نو میٹر نیچے ایک دھاتی صندوق مدفون تھا جو ایک مربع میٹر سائز کا حامل تھا.....اس کا بالائی کنارہ ٹوٹا ہوا تھا.....ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے اندر بادشاہ کا خزانہ سونے اور چاندی کی شکل میں موجود تھا۔

شلی مان نے یہ خزانہ سمیٹنا شروع کردیا.....اس نے اپنی بیوی کو واپس گھر بھیجا کہ وہ گھر سے اپنی بڑی شال لے آئے۔ اس نے یہ خزانہ اس شال میں چھپایا اور اپنے کرائے کے گھر میں لے آیا۔

آج ماہر آثار قدیمہ اور تاریخ دانوں کو یہ یقین ہے کہ شلی مان نے جو ٹرائے دریافت کیا تھا.....وہ ھومر کے دور کا ٹرائے نہ تھا..... بلکہ اس کے دور کے بہت بعد اس مقام پر ایک شہر بسایا گیا تھا اور ٹلی مان بذات خود کامل یقین کا حامل نہ تھا۔ لہٰذا وہ اکثر دہراتا رہتا تھا کہ ''اس نے ایک افسانوی بادشاہ کا افسانوی خزانہ دریافت کیا تھا''.....اس کا یہ کہنا اس کے شک وشبے کے اظہار کے لئے کافی تھا۔

لیکن ہینرچ شلی مان کی ٹرائے کی دریافت.....اگرچہ وہ مابعد بسنے والا ٹرائے تھا..... آثار قدیمہ کی ایک عظیم ترین مہم تھی۔

یہ شلی مان کس قسم کا شخص واقع ہوا تھا؟

اور اس نے اپنا زندگی کا ایک بڑا حصہ کیوں اس مشغلے کی نذر کیا تھا؟ کیونکہ شلی مان کو خزانے کی قطعاً ضرورت نہ تھی.....اس کی قسمت پہلے ہی اس کی یاوری کرچکی تھی.....اس کی قسمت کئی بار چمک چکی تھی

ایک لحاظ سے...... انسانی داستان...... اس کی زندگی...... اس کی دریافت کی نسبت ایک مہم جوئی ہے...... اور ایک مزید بات یہ تھی کہ وہ ایک خوش قسمت شخص واقع ہوا تھا۔

اس نے 6 جنوری 1882ء کو جرمنی کے مشرقی حصے میں جنم لیا تھا جو کہ پولینڈ کی سرحد سے زیادہ دور نہ تھا۔ اس کا باپ...... ہینرچ کی پیدائش سے کچھ ہی عرصہ بعد ایک چھوٹے سے دیہات کا پادری مقرر ہو گیا تھا۔ اس دیہات کا نام اینکر شاجن تھا۔ وہ ایک پروقار اور قابل قدر پادری نہ تھا۔ کیونکہ تمام تر دیہاتی یہ جانتے تھے کہ اس کے اپنی بیوی کی کچن کی خادمہ کے ساتھ ناجائز تعلقات استوار تھے۔ دیہاتی اس وقت تک خاموش رہے جب تک اس کی مظلوم بیوی موت سے ہمکنار نہ ہوگئی...... اس کی وفات کے بعد وہ مشتعل ہو گئے۔ لہٰذا اسے انکر شاجن کے پادری کے عہدے کو خیر باد کہنا پڑا بلکہ اسے اس عہدے سے معزول کر دیا گیا۔

اس تمام تر قصے میں جو افراد مصائب کا شکار ہوئے وہ پادری شلی مان کے بچے تھے۔ وہ اپنی اسکول کی تعلیم کو خیر باد کہنے پر مجبور ہو گئے اور کام کاج کی تلاش میں مصروف ہو گئے تاکہ اپنے پیٹ کا دوزخ بھر سکیں...... روح اور جسم کا رشتہ برقرار رکھ سکیں۔ ہینرچ نے ایک کریانے کی دوکان میں ملازمت اختیار کر لی۔

عین ممکن تھا کہ وہ اپنی تمام زندگی کریانے کی اس دوکان پر ملازمت سرانجام دیتے ہوئے گزار دیتا لیکن ایک دن ایک ایسا حادثہ پیش آیا کہ اسے اس ملازمت کو خیر باد کہنا پڑا۔ اس نے ایک بھاری بکس اٹھایا ہوا تھا کہ اس کا ناتوان پھیپھڑا جواب دے گیا۔ وہ بھاری بکس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا اور اس میں بند سامان اِدھر اُدھر بکھر گیا اور کچھ سامان ضائع بھی ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے کمزور پھیپھڑے کریانے کے اس بھاری کام کو سرانجام نہ دے سکتے تھے...... اور اگر وہ زبردستی اس کام کے ساتھ منسلک رہا تو وہ موت کے منہ میں چلا جائے گا۔

لہٰذا وہ ہمبرگ کی جانب روانہ ہوا۔ دوران سفر وہ روستاک میں رک گیا اور بک کیپنگ کے کام کی تربیت حاصل کی۔ اس نے جس کام کو محض چند روز میں سیکھ لیا تھا اس کی جگہ اگر کوئی اور لڑکا ہوتا تو وہ اس کام کو کم از کم ایک برس میں سیکھ پاتا۔

پہلے پہل اس کو یہ کام سودمند دکھائی نہ دیا۔ کیونکہ کسی بھی آجر نے اسے کام نہ دیا۔ قسمت ایک مرتبہ پھر اس پر مہربان ہوئی۔ اس کی ملاقات ایک مہربان شخص سے ہوئی جو ایک بحری جہاز کا مالک تھا۔ اس نے اسے پیشکش کی کہ وہ برائے نام کرایہ ادا کرتے ہوئے وینزویلا تک کا سفر طے کر سکتا تھا اور وہاں پر اپنی قسمت چمکانے کا جتن کر سکتا تھا۔

لیکن یہ بحری جہاز ذرو تھا اپنے سفر کے آغاز میں ہی تباہی کی زد میں آ گیا اور ہمارے ہیرو نے اپنے آپ کو ٹیکسل کے ساحل پر اوندھے منہ پڑا پایا جبکہ جہاز میں موجودہ دیگر افراد لقمہ اجل بن چکے تھے۔ وہ معجزانہ طور پر زندہ بچ گیا جبکہ اس کے دیگر ساتھی اس قدر خوش قسمت واقع نہ ہوئے تھے۔ وہ ایمسٹرڈم چلا آیا تھا اور یہاں پر ایک قاصد کی ملازمت اختیار کر لی۔ وہ جانتا تھا کہ قسمت کی دیوی دور کھڑی اس پر مسکرا رہی تھی......

اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنی مدد آپ کرے گا اور اس وقت تک اپنی جدوجہد جاری رکھے گا جب تک وہ اس کامیابی کو اپنے گلے سے نہ لگا لے جس کامیابی کا وہ مستحق تھا۔ اس نے پیسے بچانے کی غرض سے ایک سستے ترین مکان میں رہائش اختیار کی۔ اس نے ولندیزی اور انگریزی دونوں زبانیں

سیکھنی شروع کردیں۔

چھ ماہ کے اندر اندر وہ ان زبانوں پر عبور حاصل کر چکا تھا۔ اس کے بعد وہ فرانس۔ پرتگال۔ اٹلی اور اسپین کے دورے کر چکا تھا۔

21 برس کی عمر میں وہ اس قابل تھا کہ ایمسٹرڈم کے کسی بھی اہم ترین دفتر میں داخل ہو کر یہ دعویٰ کر سکے کہ اسے سات زبانوں پر عبور حاصل تھا اور وہ ایک بہت بہتر تنخواہ کی حامل ملازمت کا مستحق تھا۔ ہر شروڈر نے اس نوجوان کا امتحان لیا اور اسے ملازمت کی پیشکش کر دی۔ دو برس کے بھی کم عرصے کے بعد اسے روس بھیج دیا گیا تا کہ وہ سینٹ پیٹر میں فرم کی نمائندگی سرانجام دے سکے۔ اس وقت تک شلی مان روسی زبان پر بھی عبور حاصل کر چکا تھا۔ اس نے روس میں جو مہمات سرانجام دیں ان مہمات کو یہاں پر بیان کرنا ممکن نہیں...... لیکن ہم یہ ضرور بیان کر سکتے ہیں کہ اس نے نہ صرف اپنی فرم کی نمائندگی سرانجام دی بلکہ دیگر فرموں کی بھی نمائندگی سرانجام دی اور ان فرموں سے نصف فیصد کمیشن وصول کرتے ہوئے اپنی قسمت چمکائی۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اس دوران اس کی شادی ایک خوبصورت لڑکی ایکاٹرینا سے ہوئی۔

ابھی وہ خوش قسمتی اور بدقسمتی کے درمیان ہچکولے کھا رہا تھا کہ اسے اس کے بھائی کی وفات کی خبر موصول ہوئی۔ لڈونگ کچھ برس پیشتر نئی دنیا کی جانب عازم سفر ہوا تھا...... وہ کیلی فورنیا گولڈ رش کے ساتھ منسلک ہوا اور ہینرچ سے بھی بڑھ کر اپنی قسمت چمکائی۔ 25 برس کی عمر میں سکرامینٹو میں اس نے وفات پائی تھی۔ ہینرچ نے فیصلہ کیا کہ وہ اس مقام پر ضرور جائے گا اور اپنے بھائی کی قبر بھی دیکھے گا اور عین ممکن تھا کہ اس دوران اسے اپنی قسمت چمکانے کے مزید مواقع میسر آ جاتے۔

لہٰذا وہ عازم سفر ہوا۔ وہ 1851ء کی سان فرانسسکو کی آگ دیکھنے کیلئے بروقت وہاں پر پہنچ چکا تھا۔ مابعد اس نے تحریر کیا کہ:۔

''لوگوں کی چیخ و پکار اور اندھیری رات میں شہر کے جلنے کے عمل نے اس سانحہ کو انتہائی افسوس ناک بنا دیا تھا۔''

اس نے سکرامینٹو کی واحد فائر پروف عمارت میں پناہ لے رکھی تھی۔ اس نے سونے کے برادے کی خرید کا دھندا شروع کر دیا تھا۔ نو ماہ کے قلیل عرصے کے دوران ایک مرتبہ پھر اس کی قیمت چمک اٹھی تھی اور وہ گھر کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔

ایکاٹرینا کے ساتھ اس کی حالت قابل رحم تھی لہٰذا اپنا زیادہ تر وقت قدیم یونانی دنیا کے مطالعہ میں گزارنے لگا۔ اسے اس موضوع میں از حد دلچسپی تھی۔ اس نے کئی زبانوں میں اس موضوع کا مطالعہ سرانجام دیا۔ اس نے نہ صرف قدیم یونان کا مطالعہ کیا بلکہ جدید یونان کا بھی مطالعہ کیا۔

اس دوران اس نے کریمین جنگ کی بدولت تیسری مرتبہ اپنی قسمت چمکائی۔

جوں جوں اس کی قسمت یاوری کر رہی تھی توں توں ایکاٹرینا کے ساتھ اس کی نفرت بڑھتی جا رہی تھی اور قدیم یونان سے اس کی محبت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اب وقت آن پہنچا تھا کہ وہ یونان کا رخ کرے۔ لہٰذا وہ عازم یونان ہوا۔ وہ یونان کی خوبصورتی اور اس کی تاریخ سے از حد متاثر ہوا اور وہ جانتا تھا کہ جوں ہی وہ اس قدیم سرزمین پر پہنچا تھا اس کے کاروباری امور اور دل کے امور اسے پکار رہے تھے...... کہ اسے واپسی کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔

شاید دل کے امور ایک غلط اصطلاح ہے...... کیونکہ اپنے سفروں کے دوران شلی مان یہ جان چکا تھا کہ وہ بہ آسانی ایک امریکی سے طلاق

حاصل کر سکتا تھا۔ لہٰذا وہ وہاں چلا آیا اور طلاق حاصل کر لی اور اس کے بعد ایتھنز واپس چلا آیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک یونانی دوست کی وساطت سے ایک اشتہار شائع کرواتے ہوئے وہ اپنے لئے ایتھنز کی ایک خوبصورت دلہن حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جس نے ایکاٹرینا کی جگہ لے لی تھی۔ یہ ایک قسم کا تبادلہ تھا اور اسے اس تبادلے پر کبھی افسوس نہ ہوا تھا۔ اس نے اس کے اس جذبے میں حصہ داری بٹائی جو وہ اس کے ملک کے لئے رکھتا تھا...... ہومر کی دنیا تلاش کرنے کی اس کی جدوجہد...... وہ دونوں اکٹھے قدیم شہر ٹرائے دریافت کر سکتے تھے...... اس کے راز اور اس کے خزانے دریافت کر سکتے تھے...... شلی مان جو انتہائی تیزی کے ساتھ بڑھاپے کی راہ پر گامزن تھا...... اپنے پیچھے نہ صرف کثیر سرمایہ چھوڑ سکتا تھا بلکہ ایک غائب ہو جانے والی دنیا کے خزانے بھی چھوڑ سکتا تھا۔

اور اس نے ایسا ہی کیا...... اگر شلی مان شہر ٹرائے اور اس کے خزانہ کو دریافت نہ کرتا تو ہم میں سے کوئی بھی اس خوش قسمت بوڑھے کے بارے میں نہ جان سکتا۔ اگرچہ وہ شہر اور اس کا خزانہ شہر ٹرائے کے بعد آباد ہونے والا شہر اور اس کا خزانہ تھا تب بھی یہ ایک حیران کن دریافت تھی اور اہم ترین دریافت بھی تھی۔

وہ برس ہا برس تک تحقیق سرانجام دیتا رہا اور اس نے ہر اس شخص سے مشورہ کیا جس کے بارے میں وہ یہ جانتا تھا کہ اس کا علم اس کے علم سے بڑھ کر تھا۔ بظاہر ایسا دکھائی دیتا تھا کہ قدیم ٹرائے...... اگرچہ اس کا کوئی وجود تھا...... وہ لازماً جدید قصبے بنار باشی کے نزدیک مدفون تھا...... جو ترکی کے ساحل سے دس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ لیکن جب وہ اس مقام پر پہنچا تو اس مقام کو دیکھ کر اسے یہ احساس ہوا کہ ٹرائے اس مقام پر مدفون نہ ہو سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے اس مقام سے چند میل دور کھدائی کروانی چاہیے یعنی ہسارلک کی زیادہ پُرکشش پہاڑی کے مقام پر۔

اور وہ شہر اس مقام پر واقعی مدفون تھا اور اس نے اور صوفیہ نے ایک عظیم دریافت سرانجام دی تھی۔ جوں ہی وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے...... شلی مان ایک بڑے مسئلے سے دوچار ہو چکا تھا......

وہ کس طرح اپنا خزانہ محض اپنے تک ہی محدود رکھ سکتا تھا؟

وہ کس طرح اس خزانے کو لالچی ترکوں سے محفوظ رکھ سکتا تھا؟

بے شک یہ ان کا ملک تھا لیکن وہ اس خزانے کو ان کے ہتھے چڑھنے سے کس طرح محفوظ رکھ سکتا تھا؟

اس کے دل کی دھڑکن تیز تر ہو چکی تھی...... وہ اور صوفیہ اس خزانے کو اپنے گھر لے گئے اور اس کو اپنے گھر میں چھپا لیا۔ اس کے بعد آئندہ ہفتوں کے دوران وہ تھوڑا تھوڑا کر کے اس خزانے کو اپنے دوستوں کے گھروں میں منتقل کرتے رہے جہاں پر اس خزانے کو دفن کیا جاتا رہا۔

برسوں بعد شلی مان نے یہ تمام خزانہ ایک مقام پر اکٹھا کیا۔ بالآخر وہ اس قابل ہو چکا تھا کہ اس خزانے کو اپنا خزانہ کہہ سکے۔ لیکن اسے اس دولت کی قطعاً ضرورت نہ تھی...... وہ محض اس دولت کو دریافت کرنے کا اعزاز پانا چاہتا تھا...... ہومر کے ٹرائے کو دریافت کرنے کا اعزاز حاصل کرنا چاہتا تھا...... اس افسانوی شہر کو دریافت کرنے کا اعزاز پانا چاہتا تھا...... اور اس دوران وہ عظیم خزانوں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس کے خزانے برلن کے عجائب گھر میں رکھے گئے تھے۔ ولی عہد شہزادہ ولیم جلد ہی قیصر ولیم II بن چکا تھا...... اس نے ان دونوں کے

اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی۔ 1890ء میں شلی مان موت سے ہمکنار ہو گیا تھا۔ وہ اس اعتماد کے ساتھ موت سے ہمکنار ہوا تھا کہ اس کی یاد...... اس کے خزانے...... ہمیشہ قائم رہیں گے۔

شاید اس کی یاد ہمیشہ قائم رہے اور جہاں تک اس کے خزانوں کا تعلق ہے...... 1945ء میں روسیوں نے انہیں برلن کے عجائب گھر سے اپنے قبضے میں لے لیا تھا...... اب محض روسی ہی جانتے ہیں کہ وہ خزانے کہاں ہیں...... اور شاید روسی بھی یہ بھول چکے ہیں کہ وہ خزانے کہاں ہیں۔

......❁......

فادر ڈیمن اور کوڑھی

جوزف ڈی ویسٹر کی عمر اس وقت 19 برس تھی جب اس کی مثالی مہم کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس کا تعلق بلجیئم سے تھا اور وہ لووین کے نزدیک رہائش پذیر تھا۔ اس کے والدین نے اسے ایک کٹر رومن کیتھولک بنایا تھا۔ وہ اکثر حیران ہوتے تھے کہ وہ کون سا اختیار کرے گا اور اب جبکہ اس کی اسکول کی تعلیم اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی یہ سوال مزید اہمیت اختیار کرتا جا رہا تھا کہ وہ کون سا پیشہ اختیار کرے گا۔ اس کے والدین اور دیگر اہل خانہ کا خیال تھا کہ اسے وہ پیشہ اختیار کرنا چاہیے جس پیشے میں اس کی جسمانی قوت کا عمل دخل ہو اور اس کے اس جذبے کی تسکین بھی ممکن ہو جس کے تحت وہ اپنے ہاتھوں سے کام سرانجام پسند کرتا تھا۔ وہ لوگوں کے ساتھ باہم روابط رہنا پسند کرتا تھا اور لوگوں کو سمجھنے میں بھی خصوصی مہارت رکھتا تھا...... لہٰذا اس کا کام لوگوں سے متعلق ہونا چاہیے تھا بجائے اس کے کہ وہ چیزوں سے متعلق ہو یا افکار اور خیالات سے متعلق ہو یا انتظامیہ سے متعلق ہو۔ لیکن انہوں نے ان خطوط پر کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اپنے بڑے بھائی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایک پادری بنے گا۔

یہ اس کی 19 ویں سالگرہ کا دن تھا۔ اس دن اس کا باپ اسے اس درس گاہ لے گیا جہاں پر اس کا بھائی ایک پادری بننے کی تربیت حاصل کر رہا تھا۔ اس کا باپ جانتا تھا کہ دونوں بھائی ایک دوسرے سے بہت کچھ کہنا سننا پسند کریں گے لہٰذا اس کے باپ نے کہا کہ وہ رات کے کھانے تک ان دونوں کو اکٹھا رہنے کا موقع فراہم کر رہا تھا...... وہ دونوں رات کا کھانا اکٹھا تناول کریں اور اس دوران گپ شپ سے دل بہلائیں جبکہ اس دوران وہ بذات خود ایک نزدیکی قصبے میں اپنے دوستوں سے ملاقات کی غرض سے جا رہا تھا اور واپسی پر جوزف کو اپنے ہمراہ گھر واپس لے جائے گا۔ لیکن جب وہ واپس آیا تا کہ جوزف کو اپنے ہمراہ واپس گھر لے جا سکے تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اسے یہ معلوم ہوا کہ یہ نوجوان مختلف منصوبے رکھتا تھا۔ جوزف نے کہا کہ اگر اس درس گاہ کا ناظم اسے اجازت فراہم کر دے تو وہ اسی درس گاہ میں مقیم رہے گا۔ اس کے باپ نے اس سے دریافت کیا کہ:۔

"اس اچانک فیصلے کی کیا وجہ تھی۔"

جوزف نے جواب دیا کہ:۔

یہ فیصلہ ایک اچانک فیصلہ نہ تھا...... بلکہ اس فیصلے کو ظاہر کرنے کا لمحہ اچانک آن پہنچا تھا

جوزف یہ کہنے میں ہچکچاہٹ سے کام لے رہا تھا کہ وہ ایک پادری بننا چاہتا تھا۔ اس ہچکچاہٹ کی وجہ یہ تھی کہ پادری بننے کے لئے اسے اپنی ماں اور اپنے گھر کو خدا حافظ کہنا تھا۔ اب اگر وہ اس درس گاہ میں محض قیام کرنے کا ارادہ کرتا...... تب وہ اس تکلیف دہ لمحے سے بچ سکتا تھا۔

لہٰذا وہ چار برس تک اس درس گاہ میں مقیم رہا اور وہی تربیت حاصل کرتا رہا جو تربیت اس کا بھائی حاصل کر رہا تھا اور تب اس نے ایک اور دلیرانہ قدم اٹھایا۔ اس کا بھائی...... اپنی تربیت کے تکمیل پر...... رضا کارانہ طور پر اس مشنری میں شمولیت اختیار کر رہا تھا جو بحرالکاہل کے جزیروں میں

اپنی خدمت سرانجام دینا چاہتی تھی۔ اس کے علم میں یہ بات آئی کہ دیگر نوجوان پادریوں کے ہمراہ ھونولولو روانہ کیا جا رہا تھا بالخصوص سینڈوچ جزیروں پر...... یہ نوجوان جذباتی حد تک جانے کیلئے مچل رہا تھا۔ اس کی اس خواہش کو اس وقت شدید دھچکا لگا جب وہ بیمار پڑ گیا۔ وہ اس قدر شدید بیمار تھا کہ اس کو اپنی روانگی ملتوی کرنا پڑی...... اس نے اکٹھے عازم سفر ہونے کا ارادہ ترک کر دیا۔ دونوں بھائی ایک دوسرے کے اس قدر قریب تھے کہ جوزف جانتا تھا کہ اس کے بھائی کو کس قدر سکون میسر آئے گا اگر وہ اس کی جگہ روانہ ہو جائے اور اس نے ایسا کرنے کی درخواست بھی پیش کر دی اگر چہ اس کی تربیت ہنوز ادھوری تھی اور مکمل نہ ہوئی تھی۔ حیران کن بات یہ تھی کہ اس کی خواہش کو شرف قبولیت بخشا گیا تھا۔

سینڈوچ جزیرے (ان میں سے آج کل ایک جزیرہ ہوائی کے نام سے جانا جاتا ہے) اس لئے سینڈوچ جزیرے کہلاتے تھے کے کپتان کک نے اپنے ایک سرپرست کے نام پر ان جزیروں کا نام رکھا تھا...... ارل آف سینڈوچ...... کپتان کک نے ان جزیروں کو 1768ء میں دریافت کیا تھا۔ آئندہ برسوں کے دوران اہل ہوائی نے اہل یورپ کا پہلا دوستانہ استقبال سرانجام دیا۔ یورپی تاجروں نے اس جزیرے کا رخ کیا تھا...... انہیں یہ جزیرے ایک آسان اور سہل منڈی دکھائی دیے تھے۔ اس کے علاوہ یہ جزیرے بدامنی کی آماجگاہ بھی تھے۔ آتشیں اسلحہ اور الکوحل تازہ پانی اور خوراک کے بدلے میں بہ آسانی دستیاب تھی...... اس کے علاوہ خوبصورت لڑکیاں بھی بخوبی دستیاب تھیں۔ اہل یورپ نے اہل جزیروں کو جو بدترین چیز عطا کی وہ یورپی بیماریاں تھیں جن سے اہل جزیرے اس سے قبل آشنا نہ تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے خلاف مزاحمت کے حامل نہ تھے۔ ایک سو برسوں کے دوران سینڈوچ جزیروں کی آبادی میں 90 فیصد کمی واقع ہوئی تھی...... یہ آبادی 400,000 سے کم ہو کر 40,000 رہ گئی تھی۔

لیکن تصویر کا دوسرا رخ بھی تھا۔ اگر چہ تصویر کا یہ رخ ان برائیوں کی تلافی نہیں کرتا تھا جو برائیاں یورپی تہذیب نے متعارف کروائی تھیں۔ اہل یورپ کے ان جزیروں پر قدم رکھنے سے پیشتر ان جزیروں پر جو طرز زندگی رائج تھی وہ بھی ایک خوشگوار اور معصومیت بھری طرز زندگی نہ تھی۔ قبائلی جنگ وجدل اس طرز زندگی کا ایک حصہ تھا اور بہت سے ظالمانہ قوانین مروج تھے...... بالخصوص وہ قوانین جو قبائلی سرداروں کو تعظیم سرانجام نہ دینے کی پاداش میں لاگو ہوتے تھے۔ ایک شخص جس کا سایہ سردار پر پڑ جاتا تھا یا اس کے سامنے سردار کا نام لیا جائے تو وہ اپنے آپ کو زمین بوس کرنا بھول جاتا تھا...... اس کو سزائے موت سے نوازا جاتا تھا۔ وہ خواتین جو اس قسم کی خوراک استعمال کرتی تھیں جو بتوں کو پیش کی جاتی تھی ان کو بھی سزائے موت یا دیگر سخت سزاؤں سے نوازا جاتا تھا۔ ایک مشنری کی بیوی نے ایک چھوٹی سی لڑکی سے دریافت کیا کہ:۔

''تم اپنی ایک آنکھ سے کس طرح محروم ہوئی تھی؟''

اس لڑکی نے جواب دیا کہ:۔

''میں نے ایک کیلا کھایا تھا۔''

ایسے ظالمانہ رسم ورواج اور اہل یورپ کی متعارف کردہ برائیوں کے باوجود بھی ان مشنریوں نے جنہوں نے 1820ء میں یہاں پہنچنا شروع کیا تھا یہاں کے لوگوں کو دوستانہ پایا تھا۔

بے شک اس کی ایک وجہ ان کا قدرتی ماحول تھا۔ جب جوزف ڈی ویسٹر (یا فادر ڈیمن...... اس کا نیا مذہبی نام) ھونولولو پہنچا تو وہ نیلگوں

سمندر کی خوبصورتی...... سبزے کی بہتات...... پھولوں کی خوشبو...... مسکراتے ہوئے لوگوں کی خوبصورتی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس قدر خوش کن ماحول میں رہنا اسے ازحد پسند آیا اور اس کی انتہائی خوشی کا باعث ثابت ہوا۔ اسے ان لوگوں میں رہتے ہوئے اور ان کے درمیان رہ کر اپنا کام سرانجام دیتے ہوئے ازحد خوشی ہوتی تھی۔ اسے یہ جان کر بھی ازحد خوشی ہوئی کہ یہ لوگ جوق در جوق عیسائیت قبول کر رہے تھے اور ان کے بادشاہ نے انہیں متحد کرنے اور قبائلی جنگوں کو بند کروانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس نے ظالمانہ قانون بھی منسوخ کر دیے تھے اور مشنریوں کو یہ دعوت دی تھی کہ وہ اس کی عوام کی روحانی تربیت سرانجام دیں۔

دس برس گزر چکے تھے اور ایک نیا چیلنج درپیش تھا۔ جس طرح اس موقع پر جبکہ اس کا بھائی بیمار پڑا تھا اور وہ جانتا تھا کہ اسے اس کی جگہ سنبھالنی چاہیے بالکل اسی طرح فادر ڈیمن نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ جو کچھ بھی سرانجام دے رہا تھا وہ کافی نہ تھا۔ مئی 1873ء کے ایک روز وہ بشپ کے ہمراہ جزیرہ مائی کا دورہ کر رہا تھا اور بشپ دیگر ایسے جزیروں میں مصروف تبلیغ تھا جہاں پر ابھی تک مشنریاں خاطر خواہ نتائج سے مستفید نہ ہو سکی تھیں۔ ملوکی ایک ایسا جزیرہ تھا جس کے بارے میں اسے زیادہ تشویش تھی۔ حکومت نے اس جزیرے کو ایک الگ تھلگ جزیرے کے طور پر رکھا ہوا تھا اور اس میں کوڑھی آباد تھے۔ یہ کوڑھیوں کا جزیرہ تھا۔ دیگر جزیروں میں اگر کوئی کوڑھی پایا جاتا تو اسے جزیرہ بدر کرتے ہوئے ملوکی جزیرے روانہ کر دیا جاتا۔ اس جزیرے میں جو کوڑھی آباد تھے ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ وہ بے بسی اور بے چارگی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ کبھی کبھار چند ڈاکٹر اس جزیرے کا چکر لگا لیتے تھے یا پھر کوئی نہ کوئی پادری اس جزیرے کا دورہ کر لیتا تھا مگر یہ لوگ وہاں پر رہائش اختیار نہ کرتے تھے۔ بشپ کی یہ خواہش تھی کہ اسے کوڑھیوں کے اس جزیرے میں ایک مشنری روانہ کرنی چاہیے جو ان کی نگہداشت اور دیکھ بھال سرانجام دے لیکن مشنریاں دیگر جزیروں میں اپنے اپنے کام میں مشغول تھیں اور کسی مشنری کو اس جزیرے کی جانب روانہ کرنے سے قاصر رہا تھا۔

فادر ڈیمن نے اسے یہ باور کروایا کہ مشن میں کچھ نئے لوگ بھرتی ہو کر پہنچ رہے تھے۔ اس نے مزید کہا کہ:۔

''ان میں سے کوئی ایک میری جگہ سنبھال سکتا تھا۔''

اس نے یہ درخواست بھی کی کہ اسے جزیرہ ملوکی جانے کی اجازت فراہم کی جائے...... اور یہ اجازت فوری فراہم کی جائے۔

اس کی یہ خواہش غیر معمولی طور پر اس کی اس خواہش کی موافق تھی جو اس نے 14 برس پیشتر کی تھی۔ جس خواہش کے تحت اس نے درس گاہ میں مقیم ہونے کی اجازت طلب کی تھی اور فوری طور پر اپنی نئی زندگی کو اپنے گلے سے لگا لیا تھا۔ ان لوگوں کو خدا حافظ کہے بغیر جن کو وہ چھوڑ آیا تھا۔

جوں ہی کشتی جزیرہ ملوکی کی جانب روانہ ہوئی وہ یہ سوچنے لگا کہ ایک کوڑھی کے طور پر اس جزیرے کی جانب جلاوطنی اس کوڑھی کے دل و دماغ پر کیا اثر مرتب کرتی ہوگی۔ ایک یا دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد کشتی ایک خصوصی مقام پر رکی اور اس مقام سے اس جیسے عام مسافر کشتی میں سوار ہوئے اور اس مقام پر کئی ایک کوڑھی بھی اس کشتی میں سوار ہوئے...... ان کے اہل خانہ رو رہے تھے اور ان کی جدائی کا ماتم کر رہے تھے کیونکہ وہ ہمیشہ کیلئے ان سے جدا ہو رہے تھے۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ آدھی رات کے وقت وہ جزیرہ ملوکی پہنچ چکے تھے اور طلوع فجر تک وہ کلاؤ دیہات میں پہنچنے میں بھی کامیاب ہو چکے تھے۔

جب سورج نکل آیا اور وہ اس قابل ہوا کہ وہ جزیرے کے ارد گرد گھوم سکے اور اس جگہ کا معائنہ کر سکے جو کہ اب اس کا مسکن تھی...... اس نے سوچا کہ شاید میری بقایا زندگی اسی جگہ پر ہی گزر جائے گی...... اس نے جو کچھ دیکھا وہ درج ذیل تھا:

''تقریباً 80 کوڑھی ہسپتال میں داخل تھے اور دیگر کوڑھی وادی میں مقیم تھے۔ انہوں نے درخت کی شاخیں کاٹ کر اپنے لئے جھونپڑیاں بنا رکھی تھی جن پر گھاس پھوس کی چھتیں ڈالی گئی تھیں''

جزیرے پر اپنے قیام کے پہلے چند ہفتوں کے دوران وہ بذات خود ایک درخت تلے مقیم رہا اور کافی برسوں بعد جب وہ اس مقام پر ایک چرچ بنانے میں کامیاب ہوا اور اس نے اس چرچ کی تعمیر بھی اسی درخت کے پاس سرانجام دی اور اس چرچ کے علاوہ اس نے اپنا پیارا پیارا گھر بھی تعمیر کروایا...... یہ ایک چھوٹا سا گھر تھا جس میں چار کمرے تھے۔ نچلی منزل میں اس کے ان سات ہم منصبوں میں سے ایک رہائش پذیر رہتا تھا جو اس کی امداد اور تعاون کیلئے آتے تھے۔ بالائی منزل پر اس نے دو کمرے اپنے لئے مخصوص کر رکھے تھے...... ایک بیڈ روم...... اور ایک کمرہ مطالعہ...... لیکن اس کے پہلے سروے کے موقع پر یہ سب کچھ موجود نہ تھا...... یہ سب کچھ بہت بعد میں منظر عام پر آیا تھا۔

''یہ لوگ شکستہ جھونپڑیوں میں پڑے تھے...... ان میں عمر اور جنس کی کوئی تفریق نہ تھی...... اور نہ ہی نئے یا پرانے مریض کی کوئی تفریق تھی...... وہ ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے...... یہ وہ لوگ تھے جنہیں معاشرے نے دیس نکالا دے رکھا تھا۔ وہ تاش کھیل کر اپنا وقت گزارتے تھے اور اپنی تیار کردہ الکحل سے دل بہلاتے تھے۔ ان کے کپڑے میلے کچیلے اور گندے ہوتے تھے کیونکہ پانی عدم دستیاب تھا اور دور سے لانا پڑتا تھا۔ میں جب ان کے درمیان تبلیغ کے سلسلے میں موجود ہوتا تھا تب اس دوران مجھے کئی مرتبہ اس سے دور جاتے ہوئے تازہ ہوا میں سانس لینے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ ان کے کپڑوں سے اٹھنے والی بدبو کا اثر زائل کرنے کیلئے مجھے تمباکو نوشی کا سہارا لینا پڑا تھا۔ پائپ کی اپنی مخصوص بُو کی وجہ سے ان کے کپڑوں سے اٹھنے والی بدبو کم محسوس ہوتی تھی۔ اس دور میں یہ بیماری ایک خطرناک بیماری تصور کی جاتی تھی لیکن ان مریضوں کے حوصلے بلند تھے۔ اس مقام پر آباد لوگوں کی قابل رحم حالت کی بدولت اس جگہ کو زندہ لوگوں کے قبرستان سے تعبیر کیا جاتا تھا۔''

ملوکی جزیرے میں اپنے ابتدائی ایام کے یہ تاثرات اس نے چند برس بعد تحریر کئے تھے۔ اس وقت تک وہ کئی ایک اصلاحات سرانجام دے چکا تھا۔ ان اصلاحات کی جانب اس نے اپنی فوری توجہ مبذول کروائی تھی۔ نئے مکانات...... بہتر خوراک...... مناسب طبی امداد...... پانی کی مناسب فراہمی...... شراب نوشی پر پابندی وغیرہ۔ وغیرہ۔ فادر ڈیمن کے بس کی بات نہ تھی کہ وہ ان مریضوں کی صحت یابی کیلئے کوئی جتن کرتا کیونکہ ان دنوں اس مرض کا شافی علاج موجود نہ تھا۔ لیکن وہ ان کی زندگی میں مثبت تبدیلیاں لانے کا خواہاں تھا۔

آغاز میں فادر ڈیمن کو خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ ایک جانب تو وہ حکومت کا تعاون حاصل کرنے میں ناکام رہا جو کہ پانی کی فراہمی اور مناسب ادویات کی فراہمی کیلئے اسے درکار تھا اور دوسری جانب کوڑھی شراب نوشی ترک کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ انہوں نے فادر ڈیمن کی اس تجویز کو بھی مسترد کر دیا تھا کہ وہ اپنے لئے بہتر رہائش گاہوں کی تعمیر کے سلسلے میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ لیکن ایک برس بعد ایک خوفناک طوفان فادر

ڈیمن کی مدد کو آن پہنچا۔ اس طوفان کی وجہ سے ان کی شکستہ جھونپڑیاں تہس نہس ہو گئیں اور انہیں نئی اور بہتر رہائش گاہیں تعمیر کرنا پڑیں۔ فادر ڈیمن بہت پہلے سے جانتا تھا کہ اسے اس سلسلے میں کیا کرنا تھا کیونکہ وہ بذات خود ایک اچھا ترکھان ہونے کے علاوہ تعمیرات کے امور کے بارے میں بھی بخوبی جانتا تھا اور وہ اس سلسلے میں عملی تعاون فراہم کر سکتا تھا۔ اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حکومت سے درخواست کی کہ اسے تعمیراتی لکڑی فراہم کی جائے۔ اس کے علاوہ دیگر تعمیراتی سامان بھی مہیا کیا جائے۔ اس وقت ہنگامی صورت حال کا سامنا تھا اور جزیرے کی تمام آبادی کو کھلے آسمان تلے گزارا کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ بارش میں بھی بھیگتے تھے اور حکومت کو لازماً کچھ نہ کچھ بنیادی اشیاء فراہم کرنا تھیں۔ لوگوں نے بھی عطیات فراہم کئے اور تعمیراتی کام فادر ڈیمن کی نگرانی میں شروع ہوا اور ان لوگوں نے بھی فادر ڈیمن کے ساتھ تعاون کیا جو اب اس کے بہتر پیروکار بن چکے تھے۔ جب اس جزیرے کا دورہ کرنے والے ڈاکٹروں اور حکومتی نمائندوں نے تبدیلی کے عمل کو محسوس کیا تب ان کے دل میں بھی امداد کی فراہمی کے جذبات بیدار ہوئے۔ لہٰذا چند برسوں بعد فادر ڈیمن یہ تحریر کرنے کے قابل تھا کہ:۔

''مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ مقامی حکومت اور اس جزیرے میں آباد لوگوں کے تعاون کی بدولت ہم کامیابی سے ہمکنار ہوئے تھے۔''

فادر ڈیمن کے بقول وہ لمحہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا جب کوڑھی اس پر مکمل اعتماد کرنے لگے تھے اور وہ جو کچھ سرانجام دینے کی کوشش کر رہا تھا اس سلسلے میں اس کے ساتھ آمادہ تعاون تھے...... اور یہ صورت حال اس وقت منظر عام پر آئی جب کوڑھیوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ بھی ان میں سے ایک بن چکا تھا۔ شروع کے برسوں میں ان کی مخالفت مجھ میں آتی تھی کیونکہ فادر ڈیمن ایک خوبصورت اور تندرست نوجوان تھا اور وہ سب لوگ خطرناک بیماری کا شکار تھے۔ لیکن ان لوگوں کے ساتھ دس برس کا عرصہ گزارنے کے بعد...... دس برس ان کے درمیان رہتے ہوئے اپنی خدمات سرانجام دینے کے بعد اس میں بھی ان کی خطرناک بیماری کی علامات ظاہر ہونے لگی تھیں اور یہ لوگ جان چکے تھے کہ وہ بھی ان میں سے ایک تھا۔ لہٰذا وہ اس کے دوست اور حمایتی بن چکے تھے۔

''جب بھی میں اپنے لوگوں میں تبلیغ سرانجام دیتا تھا...... میں ان کو یہ کہہ کر مخاطب نہیں کرتا تھا کہ ''میرے بھائیو''...... جیسا کہ تم کرتے ہو...... بلکہ میں کچھ اس طرح مخاطب ہوتا تھا کہ ''ہم کوڑھی......''

چونکہ یہ درست تھا لہٰذا وہ اس سے محبت کرتے تھے۔ اگر یہ درست نہ ہوتا تو اس طرح مخاطب کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اور وہ اپنی زندگی کے آخری پانچ برسوں میں انتہائی خوشی کے ساتھ داخل ہوا۔

کیپٹن ویب

اگر 1870ء میں کوئی ایسی تدبیر ایجاد ہوئی ہوتی جو مسرت اور خوشی کی پیائش سرانجام دینے پر قادر ہوتی تو وہ ہمیں بتاتی کہ جس پہلے شخص نے انگلش چینل تیر کر عبور کیا تھی اس کا دل کس قدر خوشی اور مسرت سے لبریز تھا۔ ایسے تمام افراد کے نام یاد رکھنا تو ممکن نہیں اور ہم میں سے محض چند لوگ ہی ایسے ہوں گے جو فوری طور پر ان ناموں کو یاد کر سکیں لیکن ان میں سے ایک یادو نام...... جیسا کہ کیپٹن ویب ذہن پر مکمل طور پر چھایا رہتا ہے۔

بہت برسوں تک اس کے نام کے چرچے گھر گھر میں تھے۔ ہر گھر میں اس کا نام جانا جاتا تھا اور اس کی تعظیم سرانجام دی جاتی تھی۔ اگرچہ اس دور میں آج کل کے دور کی طرح تشہیر کے مواقع دستیاب نہ تھے لیکن اس کے باوجود بھی کیپٹن ویب نے خاصی شہرت کمائی تھی۔

آج کل اس امر پر یقین کرنا ایک انہونی بات دکھائی دیتی ہے کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب تیر کر چینل کو عبور کرنا اتنا ہی دشوار تھا جتنا دشوار مونٹ ایورسٹ کی چوٹی سر کرنا تھا...... یا ستاروں تک رسائی حاصل کرنا دشوار تھا۔ جب کیپٹن ویب اس چینل کو تیر کر عبور کر چکا اس کے بعد بھی کئی افراد نے یہ کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کی۔

1870ء کے آغاز میں...... سات میل تک تیراکی...... ایک جانی پہچانی شوقیہ (غیر پیشہ ور) تیراکی سرانجام دینے والے ایک خاندان کے رکن...... جانسن کی شکست وریخت پر ختم ہوئی تھی...... اس وجہ سے لمبے فاصلے تک تیراکی سرانجام دینے کا مشغلہ خطرے سے دوچار ہوتا دکھائی دیتا تھا۔ اس مشغلے کے حامی اس اطلاع سے پُر امید تھے کہ:۔

''جنوبی سمندر کے اہل جزیرہ نے تیراکی کو حصول مسرت کی ایک تدبیر کے طور پر اپنا رکھا ہے...... خشکی سے درجنوں میل تک تیراکی...... اگرچہ اس آب وہوا میں جو ہم سے یکسر مختلف ہے۔''

تقریباً دس برس بعد کیپٹن ویب کی فتح...... یہ ایک بہت بڑا کارہائے نمایاں شمار ہوا جب ہورلیس ڈیون پورٹ نے جنوبی سمندر تا رئیڈ تیراکی سرانجام دی اور واپس بھی پلٹا...... دونوں طرف کا یہ فاصلہ تقریباً 11 میل بنتا تھا۔

ویب کے دور میں تیراکی کے مقابلے محض ایک میل کے فاصلے تک کی تیراکی تک محدود تھے۔ یہ مقابلے ویلش ہارپ...... ہنڈن میں سرانجام پاتے تھے...... ان مقابلوں کا ریکارڈ 29 منٹ 25½ سیکنڈ تھا۔ یہ ریکارڈ بیس برس تک قائم رہا تھا اور کوئی تیراک اس ریکارڈ کو توڑنے میں کامیاب نہ ہوا تھا۔ لینڈر اور بائیرون لمبے فاصلے کی تیراکی کے ہیرو تھے۔

1875ء کے موسم گرما کے آغاز میں جب ویب نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ:۔

''جلد ہی وہ چینل کے پار تیراکی کی کاوش سرانجام دے گا...... اور وہ یہ کارنامہ کسی مصنوعی مدد کے بغیر سرانجام دے گا''

اس کے اس اعلان کے ساتھ ہی تمام تر انگلستان میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ تیر کر چینل کو عبور کرنا ایک کارہائے نمایاں تصور کیا جاتا تھا۔ مصنوعی مدد کے بغیر تیراکی سرانجام دینے کا ذکر اس لئے کیا گیا تھا کہ ایک امریکی ماہر جس کا نام کیپٹن بوائے ٹن تھا اس نے حال ہی میں مخصوص تیراکی کا لباس پہن کر 22 گھنٹوں میں اس چینل کو تیر کر عبور کیا تھا۔

ویب کے بارے میں یہ تصور کیا جارہا تھا کہ وہ اس کارہائے نمایاں کو سرانجام دینے میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔

کیپٹن میتھیو ویب برطانوی تجارتی بحریہ کا ایک افسر تھا۔ اس نے جنوری 1848ء کو آئرن گیٹ کے مقام پر جنم لیا تھا۔ سات برس کی عمر میں اس نے تیراکی کا فن سیکھ لیا تھا۔ جہاز ''کان وے'' میں دوران تربیت اس نے اپنے ایک ساتھی کو ڈوبنے سے بچایا تھا۔ 14 برس کی عمر میں اس نے بحری تجارتی سروس میں شمولیت اختیار کر لی تھی اور بیس برس کی عمر تک پہنچنے سے قبل اس نے جہاز کے نائب کپتان کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا تھا اور 28 برس کی عمر میں اس نے جہاز کے کپتان کا سرٹیفکیٹ بھی حاصل کر لیا تھا۔

1873ء میں اس نے غیر معمولی بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے لئے ایک نمایاں مقام حاصل کیا تھا اور رائل ہیومین سوسائٹی کی جانب سے اپنا پہلا اسٹان ہوپ طلائی تمغہ حاصل کیا تھا۔ ویب نے ایک اسٹیم شپ سے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ یہ جہاز نیویارک تا لیورپول جارہا تھا۔ ویب نے ایک شخص کی جان بچانے کی غرض سے سمندر میں چھلانگ لگائی تھی۔ ان کے جہاز کا ایک شخص جہاز کے عرشے سے سمندر میں گر گیا تھا۔ اس انعامی تقریب میں جس میں ڈیوک آف ایڈن برگ نے ویب کو طلائی تمغہ پیش کیا تھا اس کے اس کارنامے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا گیا تھا کہ:

''اسے بہت دیر ہو چکی تھی...... اس ڈوبنے والے شخص کی محض ٹوپی ہی دکھائی دے رہی تھی جس کو وہ واپس جہاز پر لایا تھا۔ اسٹیمر روک دیا گیا تھا۔ ایک کشتی سمندر میں اتاری گئی تھی اور امداد کیلئے روانہ کی گئی تھی اور آدھ گھنٹے بعد وہ کشتی ویب کے ہمراہ جہاز پر واپس پہنچی تھی جو کہ جہاز سے تقریباً ایک میل دور تیرتا ہوا پایا گیا تھا...... وہ تھکا ماندہ دکھائی نہ دیتا تھا...... ہاں البتہ سردی کی وجہ سے کسی قدر رقت کا شکار تھا۔''

اس تجربے نے ویب کے حوصلے بلند کر دیے تھے اور اسے یقین تھا کہ وہ چینل کو تیر کر عبور کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔

1875ء کے موسم گرما کے آغاز میں اس نے تربیت حاصل کرنا شروع کر دی۔ اس نے جو آزمائشی تیراکی سرانجام دی ان میں سے ایک تیراکی 18 میل کے فاصلے پر محیط تھی...... ڈوور تا راس گیٹ...... ایک اور تیراکی 19 میل کے فاصلے پر محیط تھی...... بلیک وال تا گریوسینڈ...... دریائے تھیمز میں...... اس کے علاوہ ایک اور تیراکی 11 میل کے فاصلے پر محیط تھی اس نے چینل عبور کرنے کی پہلی کوشش 12 اگست 1875ء کو سرانجام دی لیکن وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔

اپنی دوسری کوشش کے دوران اس نے 6 گھنٹے۔ 48 منٹ اور 30 سیکنڈ تک تیراکی سرانجام دی اور ½13 میل کا فاصلہ طے کیا۔ یہ ایک قابل ذکر کوشش تھی۔ لیکن ہنوز چینل کو عبور کرنے کی راہ میں کچھ رکاوٹیں باقی تھیں۔ لیکن 1875ء میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔

اس برس ماہ اگست میں 12 بجکر 55 منٹ پر وہ کارہائے نمایاں سرانجام دینے کیلئے تیار کھڑا تھا۔ اس کا قد 5 فٹ 8 انچ تھا۔ اس چھاتی کی

پیائش 43 انچ تھی اور اس کا وزن ½14 اسٹون تھا۔ دو کشتیاں بھی تیار تھیں۔ ایک کشتی میں ریفری سوار تھا۔ اس ریفری کا تقرر ویب کے اصرار پر کیا گیا تھا۔ ریفری اس امر کی گارنٹی تھا کہ سب کچھ حقیقی تھا۔ دوسری کشتی میں ایک نوجوان تیراک سوار تھا۔ اس کے علاوہ ڈرائیور بیکر بھی سوار تھا جس کی عمر 16 برس تھی تا کہ اگر کیپٹن ویب کسی وقت کا شکار ہو تو اس کو مدد فراہم کی جا سکے۔

12 بجکر 56 منٹ پر ویب نے چینل میں چھلانگ لگا دی۔ تیراکی کے پہلے 15 گھنٹوں کے دوران صورت حال مناسب رہی۔ پانی کا درجہ حرارت 65 درجے تھا۔ دوپہر کے بعد صورت حال قدرے غیر مناسب صورت کا شکار رہی۔ لیکن ویب نے سردی لگنے کی قطعاً شکایت نہ کی اور اپنی جدوجہد جاری رکھی اور چینل عبور کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے 21 گھنٹے اور 45 منٹ سمندر میں گزارے اور اس دوران اس نے ½39 میل کا سفر طے کیا۔ انگلش چینل انتہائی بہادری کے ساتھ فتح کر لی گئی تھی اور اس فتح کا ہیرو بھی ایک انگریز ہی تھا۔ ویب کو خراج تحسین پیش کیا گیا اور اخبار کے قارئین کو بھی اس کارہائے نمایاں کی ایک ایک تفصیل سے آگاہ کیا گیا۔

1879ء میں پاٹاگونیا کو عبور کرنے کی مہم

11 دسمبر 1878ء کو ایس۔ ایس برطانیہ نامی بحری جہاز لیور پول سے روانہ ہوا۔ دیگر مقامات کے علاوہ اسے جنوبی امریکہ کی کئی ایک بندرگاہوں تک رسائی حاصل کرنا تھی۔ اس کی پہلی بندرگاہ بورڈیکس تھی جہاں پر اس جہاز میں انگریز شرفاء کی ایک غیر معمولی جماعت نے سوار ہونا تھا۔ اس جماعت کا برائے نام سربراہ لارڈ کوئینز بیری تھا۔ اس جماعت کی حقیقی سربراہ لارڈ کوئینز بیری کی ہمشیرہ لیڈی فلورنس ڈیکسی تھی جس نے پاٹا گونیا کو عبور کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس منصوبے کی تیاری کے بعد اس نے اپنے خاوند اور دو بھائیوں سے درخواست کی کہ وہ اس مہم میں اس کا ساتھ دیں۔ اس نے اس مہم کے لئے درکار تمام تر ساز و سامان...... اشیائے صرف اور رسد وغیرہ کی تیاری کی نگرانی سرانجام دی۔ یہ مہم چھ ماہ تک جاری رہنا متوقع تھی...... اور مہم سے واپسی پر اس نے اپنی اس مہم کی داستان ایک کتاب میں بیان کی۔ اس کتاب کو اس نے

"پاٹا گونیا کے پار"

کا عنوان دیا تھا۔

لیڈی فلورنس...... اس کا خاوند...... اور اس کے دو بھائیوں کے علاوہ اس مہم میں ان کا ایک دوست بھی شامل تھا جس کا نام بیئر بوہم تھا۔ بیئر بوہم نے اس مہم کے دوران مختلف اسکیچ وغیرہ تیار کرنے کے فرائض سرانجام دینے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے ایک ملازم کو بھی اس مہم میں اپنے ساتھ رکھا تھا...... محض ایک ملازم جس نے تمام تر جماعت کی خدمات سرانجام دینا تھیں۔

28 دسمبر کو انہیں بورڈیکس سے روانہ ہوئے دو ہفتے گزر چکے تھے اور وہ پرنام بکو پہنچ چکے تھے اور اس کے بعد جلد ہی وہ برازیل کی دیگر دو بندرگاہوں تک جا پہنچے تھے۔ یہاں پر انگریزوں کی اس جماعت نے چند گھنٹے سیر و تفریح کی نذر کرنے تھے۔ مونٹ ویڈیو پہنچنے پر...... جہاں پر وہ چند روز بعد جا پہنچے تھے...... لارڈ کوئینز بیری اس وعدہ کے ساتھ ان سے جدا ہو گیا تھا کہ وہ سفر کے کسی اگلے مرحلے پر ان سے آن ملے گا (لیڈی فلورنس نے اس امر کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ سفر کے کسی مرحلے پر ان سے آن ملا تھا یا نہیں)

پاٹا گونیا پہنچ کر لیڈی فلورنس نے اپنی ڈائری میں درج ذیل تحریر لکھی کہ:۔

"یہ مقام اجاڑ...... ویران اور خوفناک دکھائی دیتا تھا...... میدانوں کا ایک تسلسل...... کسی بھی جگہ پر کوئی درخت دکھائی نہ دیتا تھا...... ایک ایسا مقام جو اس دنیا کا مقام ہرگز نہیں لگتا تھا۔ ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے ہم کسی اور کرہ ارض پر پہنچ چکے تھے۔"

وہ ایک چھوٹی سی آبادی تک پہنچ چکے تھے۔ یہ مقام سینڈی پوائنٹ کہلاتا تھا۔ چونکہ یہ علاقہ گندگی کا حامل تھا لہٰذا یہ جماعت اس علاقے میں زیادہ وقت گزارنا پسند نہ کرتی تھی۔ وہ محض اتنی دیر تک اس علاقے میں موجود رہے جب تک انہوں نے 50 گھوڑے اور خچر...... اور کثیر تعداد میں

کتے نہ خرید لئے ...... شکار کی غرض سے کتوں کا حصول ناگزیر تھا اور شکار ہی کی بدولت انہیں اپنی خوراک کا ایک بڑا حصہ حاصل ہونے کی امید تھی۔ انہیں چار ایسے گائیڈوں کی خدمات بھی درکار تھیں جو اندرون شہر کے بارے میں علم رکھتے تھے۔ انہیں عارضی طور پر دو گائیڈ میسر آ گئے اور وہ اس علاقے سے روانہ ہو گئے۔ ان کی اگلی منزل راس نیرو تھی جو کہ محض پندرہ میل کی دوری پر واقع تھی جہاں پر انہوں نے خیمہ زن ہونا تھا اور اپنے سامان اور لمبے دورانیے تک ساتھ نبھانے والے گائیڈوں کا انتظار کرنا تھا۔

وہ 24 گھنٹے جو انہوں نے سیر و سیاحت اور تفریح وغیرہ میں گزارے ...... وہ گھنٹے اس جماعت کیلئے تمام تر مہم کے انتہائی پُر لطف گھنٹے تھے۔ راس نیرو پہنچنے کے بعد وہ ساحل کے ساتھ ساتھ چہل قدمی کرتے رہے۔ مابعد وہ ایک پہاڑی پر چڑھ گئے۔ اس پہاڑی پر انہوں نے اپنے خیمے نصب کئے ...... لکڑی اکٹھی کی اور آگ کا ایک بڑا الاؤ روشن کیا۔ اس آگ کے گرد بیٹھ کر وہ لطف اندوز ہوتے رہے اور آرام کرتے رہے۔

انہوں نے محض مزید 24 گھنٹے گزارنے تھے۔ جب بقایا جماعت ان کے ساتھ آن ملی تب انہوں نے اپنے خیمے اکھاڑے اور ہموار اور خالی میدان میں سفر طے کرنا شروع کیا جو کہ آبناؤں اور کارڈلرا پہاڑوں کے درمیان واقع تھا۔ گھوڑ سواری کے یہ لمحات طویل اور تھکا دینے والے تھے۔ گرم ہوا نے ان کے چہرے جھلسا کر رکھ دیے تھے۔ ان کے سفر کی صورت حال بدتر ہوتی چلی جا رہی تھی۔

ایک اور مسئلہ خوراک کا تھا۔ وہ انگلستان سے خشک اور ڈبہ بند غذائیں اپنے ساتھ لائے تھے (ان دنوں یہ غذائیں انتہائی محدود اقسام میں دستیاب تھیں) ...... لیکن یہ ان کے ہنگامی راشن کے لئے مخصوص تھیں۔ ان کا گزارہ ان پرندوں اور جانوروں پر ہونا تھا جن کا وہ شکار کرتے لیکن ابھی تک وہ کسی شکار کے حصول میں کامیاب نہ ہوئے تھے حتیٰ کہ ان کی ملاقات ایک خانہ بدوش انڈین سے ہوئی جس نے انہیں نہ صرف شکار کے بارے میں بتایا بلکہ شکار کرنے کے مخصوص طریقے کے بارے میں بھی بتایا۔ لہٰذا وہ شکار کرنے کے قابل ہوئے اور انہیں اپنے لئے اور اپنے کتوں کے لئے وافر مقدار میں گوشت میسر آنے لگا۔ اب ان کے جذبے ایک مرتبہ پھر جوان ہو چکے تھے اور ان کو دوبارہ اپنا مستقبل روشن دکھائی دے رہا تھا لیڈی فلورنس نے مابعد صورت حال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ:-

"یہ عجیب و غریب بات ہے ...... شکار اس وقت کس قدر لطف دیتا ہے جبکہ کسی کا ذرا سی شکار کا مرہون منت ہو"۔

اگرچہ خوراک کی جانب سے صورت حال امید افزا تھی لیکن دیگر مسائل درپیش تھے۔ مچھر انہیں از حد تنگ کرتے تھے۔ مچھروں کی وجہ سے وہ سونے سے قاصر رہتے تھے۔ جنگلی بلیاں بھی ان کے لئے ایک مسئلہ بنی ہوئی تھی اور انہیں ان بلیوں کے ساتھ بھی لڑائی سرانجام دینی پڑتی تھی۔ ان کی زندگی کا خوفناک ترین لمحہ اس وقت منظر عام پر آیا جب انہوں نے وسیع میدان میں اچانک بھڑک اٹھنے والی آگ کی دیوار کو اپنی جانب بڑھتے ہوئے پایا۔ مابعد لیڈی فلورنس نے اپنی کتاب میں تحریر کیا کہ ان کی زندگی کا خوفناک لمحہ وہ تھا جب انہوں نے اپنے آپ کو آگ کی لپیٹ میں پایا۔ چند منٹوں کے اندر اندر میدان دھوئیں سے بھر چکا تھا۔ جھاڑیوں اور خشک گھاس کو آگ لگ چکی تھی اور وہ جانتے تھے کہ وہ اس قدر تیزی کے ساتھ نہیں بھاگ سکتے تھے کہ آگ کی گرفت سے بچ سکیں۔ ان کی آخری امید کی کرن یہی تھی کہ وہ اپنے منہ اور سر ڈھانپ لیں اور برق رفتاری کے ساتھ آگ کی دیوار اس طور عبور کر لیں کہ آگ ان کے کپڑوں کو نہ لگ پائے۔

لیڈی فلورنس نے مابعد اس واقعے کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ:۔

''جونہی میں نے اپنے گھوڑے کو آگ کی دیوار عبور کرنے کے لئے آگے بڑھایا اس وقت آگ نزدیک سے نزدیک تر پہنچ چکی تھی۔ مجھے سخت تپش محسوس ہو رہی تھی اور میرا سر چکرانے لگا تھا۔ میرا گھوڑا پہلے تو ہچکچایا مگر مابعد آگ کی دیوار عبور کرنے کی غرض سے آگے بڑھ گیا اور چشم زدن میں ہم یہ دیوار عبور کر چکے تھے لیکن تپش سے بُرا حال تھا۔ آگ کی اس دیوار کو عبور کرنے کے بعد مجھے جس سکون کا احساس ہوا اسے میں زندگی بھر نہ بھلا سکوں گی......اب ہوا نسبتاً صاف تھی اور آگ میرے پیچھے رہ گئی تھی۔''

یہ لمحہ انتہائی خوفناک اور دہشت ناک ہونے کے علاوہ بُراترین لمحہ تھا......اس واقعے کے چند روز بعد تک بھی وہ مایوسی اور آزردگی کا شکار رہے۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کی حالت بہتر ہوتی چلی گئی۔

اس کے بعد بارش شروع ہو چکی تھی۔ ان کے کپڑے بھیگ چکے تھے۔ ان کی خوراک اور آگ جلانے والی لکڑی بھی بھیگ چکی تھی۔ ایک رات وہ گیلے کپڑوں کے ہمراہ سردی میں ہی سونے کیلئے دراز ہو گئے۔ بارش کے ساتھ ساتھ دھند بھی پڑ رہی تھی۔ بارش اور دھند کافی دنوں تک انہیں پریشان کرتی رہی اور بالآخر بارش بھی رک گئی اور دھند بھی غائب ہو گئی۔

اگلی صبح حسب معمول لیڈی فلورنس سب سے پہلے بیدار ہوئی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ دھند غائب ہو چکی تھی اور زمین سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ وسیع وادی میں سرسبز گھاس پھیلی ہوئی تھی اور زرد پھول لہرا رہے تھے۔ وادی کے آخر میں پہاڑیاں تھیں جو درختوں سے بھری ہوئی تھیں اور ان کے پیچھے برف پوش پہاڑوں کا سلسلہ تھا۔

لیڈی فورنس نے اپنے ساتھیوں کو جگایا تاکہ وہ بھی اس کی خوشی اور سکون میں شریک ہو سکیں اور جتنی جلد ممکن ہو سکا خیمے ایک مرتبہ پھر نصب کئے گئے اور ایک مرتبہ تمام تر جماعت آگے کی جانب چل دی۔ وہ ان پہاڑوں کے اس قدر قریب جانا چاہتے تھے جن کی تحقیق و تفتیش کیلئے وہ آئے تھے۔ ان کے گائیڈ یہ انکشاف کر رہے تھے کہ اس سے قبل وہ کبھی اس قدر دور دراز مقام تک نہ آئے تھے۔ تاہم جب یہ جماعت پہاڑی نالے کو عبور کرتی ہوئی ایک اور وادی میں پہنچی تو اس وادی میں انسانی زندگی کے کوئی آثار نظر نہ آ رہے تھے اور اس وادی کے پرندے......سنہری ہرن اور جنگلی گھوڑے اس طرح ان انسانوں کو گھور رہے تھے جیسے انہوں نے پہلی مرتبہ کسی انسان کی شکل دیکھی ہو۔

اس جنت میں یہ جماعت کافی دیر تک خیمہ زن رہی تاکہ وہ ان پہاڑوں کی تحقیق و تفتیش سرانجام دے سکے۔ ایک پہاڑی نالہ عبور کرتے ہوئے وہ ایک جنگل میں پہنچ چکے تھے۔ اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ لہٰذا انہیں اپنی تحقیق و تفتیش اگلے روز تک ملتوی کرنا پڑی۔ اس جنگل کے پیچھے مزید میدان تھے۔ جب جماعت نے اس جنگل کو عبور کیا تو انہوں نے اپنے آپ کو نیلے پانی کے ایک ساحل پر پایا اور اسی جھیل کے عین درمیان میں ایک چھوٹا سا سرسبز جزیرہ واقع تھا اور مہم جو افراد نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور کہا کہ وہ اتنے دور تک پہنچ چکے تھے جتنی دور تک وہ پہنچ سکتے تھے۔

......❁......

گرین لینڈ آئس۔ کیپ کو پہلی مرتبہ عبور کرنے کی مہم

''موت...... یا گرین لینڈ کا مغربی ساحل!''

یہ وہ نعرہ تھا جس کے پس منظر میں فریڈٹ جوف نان سین...... ناروے کا ایک مہم جو اپنی ایک ابتدائی مہم پر روانہ ہوا تھا...... گرین لینڈ آئس۔ کیپ کو عبور کرنے کی مہم...... یہ 1888ء کا برس تھا اور اس وقت اس کی عمر محض 27 برس تھی۔

جب نان سین نے اس مہم کو سرانجام دینے کا فیصلہ کیا تھا اس وقت تک اس کو کسی نے عبور نہ کیا تھا۔ دیگر بہادر مہم جو اگرچہ کوشش سرانجام دے چکے تھے لیکن وہ اسے عبور کئے بغیر ہی واپس لوٹ آنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ان میں ایڈورڈ وائمپر اور رابرٹ براؤن بھی شامل تھے۔ کچھ کاوش اس وقت ناکامی کا شکار ہوگئی تھی جبکہ مہم جو اور حصول مقصد کے درمیان ایک سو میل سے بھی کم فاصلہ حائل تھا۔

نان سین کا خیال تھا کہ وہ جانتا تھا کہ اس سے قبل اس مہم پر روانہ ہونے والے افراد کیوں ناکامی کا شکار ہوئے تھے۔ تاہم تمام تر سابقہ مہم جو تجربہ کار تھے اور درکار ساز و سامان سے بھی لیس تھے لیکن وہ اپنی مہم کے آغاز سے قبل ہی مات کھا چکے تھے۔ انہوں نے جس راستے کا انتخاب کیا تھا وہ کئی ایک خطرات کا حامل تھا۔ انہوں نے مغربی ساحل کی آبادی کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا تھا اور وہ تھکے ماندے انجانے مشرقی ساحل پر جا پہنچے تھے جہاں پر رسد برقرار رکھنے کی بہت کم امید تھی۔

نان سین کے نزدیک مشرق، مغرب کراسنگ زیادہ بہتر راستہ تھا۔ وہ مشکلات اور خطرات کا مقابلہ کرنے کیلئے بخوبی تیار تھا لیکن اس کے باوجود بھی محتاط انداز اپنانے کا قائل تھا۔

لہٰذا مشرقی ساحل سے آغاز کرتے ہوئے وہ اور اس کی جماعت یہ جانتی تھی کہ وہ جو قدم بھی اٹھائیں گے وہ قدم انہیں بے آباد ساحل سے دور لے جائے گا جبکہ آبادی کا حامل مغربی ساحل آہستہ آہستہ ان کے نزدیک تر آتا چلا جائے گا۔ گاڈ تھاب...... گرین لینڈ کا دارالخلافہ مغرب میں واقع تھا۔ ان کی بقا کا راز اسی امر میں پوشیدہ تھا کہ وہ آگے کی جانب بڑھتے رہیں اور واپسی کا قطعاً ارادہ نہ کریں۔

اس کی تیاری میں بھی اس کے اسی منصوبے کی جھلک نمایاں تھی۔ اس کی جماعت میں اس کے علاوہ پانچ مزید افراد شامل تھے جن کے نام درج ذیل تھے:۔

(1) اوٹو سورڈرپ

(2) کرسچین ٹرانا

(3) اولف ڈائٹ رچ سن

(4) رانا

(5) بالٹو

اس مہم کا آغاز 15 اگست کو ہوا اور دو یا تین میل کا سفر طے کرنے کے بعد وہ سطح سمندر سے 500 فٹ کی بلندی پر جا پہنچے تھے۔ اس مقام پر انہوں نے رات گزارنے کے لئے اپنا پہلا کیمپ لگایا۔

اس کے بعد انہوں نے دو دن تک لگا تار سفر طے کیا اور مابعد ایک طوفان کی زد میں آ جانے کی وجہ سے انہیں اپنا سفر موقوف کرنا پڑا۔ اس کے بعد جب کبھی بھی کسی موقعہ پر انہیں اپنے خیموں میں مقیم ہونا پڑتا تب وہ کوئی کام سرانجام نہ دے سکتے تھے۔ نان سین نے راشن میں کافی زیادہ تخفیف کر دی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی بھی ہنگامی صورتحال سے نپٹنے کے لئے راشن کا زیادہ سے زیادہ ذخیرہ موجود ہونا چاہئے۔

21 اگست تک وہ 3000 فٹ کی بلندی تک پہنچ چکے تھے۔ برف لوہے کی مانند سخت تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ تین یا چار میل کا سفر طے کر پائے تھے۔

23 اگست کو انہوں نے خصوصی جدوجہد سرانجام دی اور نو میل کا سفر طے کیا لیکن اگلے روز سخت برف کی بجائے نرم برف ان کے سفر کی راہ میں رکاوٹ بن گئی اور ان کی رفتار کافی سست پڑ گئی۔ ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے وہ رینگ رہے ہوں اور نان سین ہر ایک میل کی مسافت طے کرنے کے بعد انہیں راشن سے نوازتا تھا تا کہ وہ اپنی جدوجہد برقرار رکھ سکیں۔

لہٰذا اس انجانی سرزمین پر گوریلا طرز کی حامل پیش قدمی جاری رہی۔ وقت کی بچت کے پیش نظر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ رات کا کھانا دوران سفر ہی تیار کر لیا کریں تا کہ وہ سفر ختم کرنے کے بعد کھانا تیار ہونے کے انتظار سے محفوظ رہ سکیں اور سفر ختم ہوتے ہی گرما گرم کھانے سے لطف اندوز ہو سکیں۔ لہٰذا برف گاڑیوں میں سے ایک برف گاڑی پر اسٹو رکھ دیا گیا۔

جب وہ 600 فٹ کی بلندی تک جا پہنچے تو انہوں نے اس مقام کو ہموار پایا اور نان سین نے یہ مشورہ دیا کہ ان کو اپنی برف گاڑیوں پر بادبان باندھ لینے چاہئیں تا کہ چلنے والی ہوا سے استفادہ حاصل کرنا ممکن ہو سکے۔ یہ سن کر بالٹو ہنسنے لگا اور کہنے لگا کہ اس نے آج تک برف پر بادبان کے ذریعے سفر کرتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا اور نہ ہی سنا ہے۔

لیکن یہ کہنے کے بعد وہ بھی اس کام میں ہاتھ بٹانے لگا لیکن ان کا یہ منصوبہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا۔

ان کے سفر کے دوران ایسی راتیں بھی آئیں جب ان کو یہ خدشہ پیدا ہوا کہ ان کا خیمہ تند و تیز طوفان کا مقابلہ نہ کر پائے گا اور اس کا شیرازہ بکھر جائے گا اور ان کو کئی ایک ایسی صبحوں کا بھی سامنا کرنا پڑا جبکہ ان کی برف گاڑیاں برف میں دھنسی ہوتی تھیں اور وہ بدقت ان کو برف سے نکالتے تھے۔

6,500 فٹ کی بلندی پر وہ سورج کی چمک سے بالمقابل ہوئے جس کی تپش نا قابل برداشت محسوس ہو رہی تھی۔ انہوں نے چشموں کے علاوہ سرخ ریشمی نقاب بھی اوڑھ لئے۔

اس کے بعد رانا لنگڑا ہو گیا لیکن وہ کیم ستمبر تک آگے بڑھتے رہے اور 7,930 فٹ کی بلندی تک جا پہنچے۔ وہ برف کے وسیع ترین سمندر

میں اکیلے تھے۔

ان کی برف گاڑیاں نرم برف پر بخوبی رواں دواں نہ تھیں اور سفر مشکل ترین صورت حال اختیار کر چکا تھا۔ کئی مرتبہ وہ برف کے طوفان کی زد میں آ چکے تھے۔ وہ معمولی خوراک پر گزارہ کرتے ہوئے یہ تمام تر مصائب برداشت کر رہے تھے۔

12 ستمبر تک وہ 8,250 فٹ کی بلندی تک پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے یہ تخمینہ لگایا تھا کہ مغربی ساحل 75 میل دور ہو سکتا تھا۔ دو دن کا مزید سفر طے کرنے کے بعد بھی انہیں ساحل کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔

روانا کہنے لگا کہ:۔

"مجھے نہیں یقین کہ ہم کبھی ساحل تک پہنچ پائیں گے۔"

نان سین نے کہا کہ:۔

"تم درست کہتے ہوں کیونکہ تم ایک پرانے احمق ہو"

یہ سن کر سب لوگ ہنسنے لگے۔ ایک اور دن جبکہ نان سین کچھ سائنسی حساب کتاب لگانے میں مصروف تھا تو بالٹو اس سے پوچھنے لگا کہ:۔

"روئے زمین پر کوئی یہ کیسے بتا سکتا ہے کہ یہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک کس قدر دوری پر واقع ہے جبکہ کسی نے اسے عبور ہی نہیں کیا؟"

اس کے بعد صورت حال مائل بہ بہتری ہوتی چلی گئی اور ان کی برف گاڑیاں اپنا سفر طے کرنے لگیں۔

دو روز بعد بالٹو یک دم چلا اٹھا کہ:۔

"سامنے زمین نظر آ رہی ہے۔"

اور وہ واقعی درست کہہ رہا تھا۔ تمام لوگ از حد خوش تھے اور انہوں نے بسکٹ...... مکھن...... جام اور گوشت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنی اس خوشی کو دوبالا کیا۔ سردی ہنوز شدید ترین تھی اور نان سین کی انگلیاں جم چکی تھیں۔ لیکن اگلی صبح گاڈتھاپ کے جنوب کا تمام تر علاقہ ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

جنوب کی جانب مڑنے سے پیشتر انہوں نے خوب ڈٹ کر ناشتہ کیا۔ غیر محدود مقدار میں چائے پی اور پنیر کے علاوہ بسکٹ کھائے اور اپنا سفر جاری رکھا۔

بالآخر برف کا سمندر عبور کرنے کے بعد ان کو اپنے پاؤں تلے زمین محسوس ہوئی تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ انہوں نے ایک خوشگوار رات بسر کی اور اپنے باقی ماندہ سفر کی منصوبہ بندی سرانجام دی۔ بالآخر وہ گاڈتھاپ پہنچنے میں کامیاب ہو چکے تھے اور انہیں اسکیموؤں کی جھونپڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ گرین لینڈ آئس۔کیپ کو عبور کر چکے تھے۔

......❀......

خوابوں کا صحرا

سطح زمین پر ریت کے سمندر جنہیں ہم صحرا کہتے ہیں بنی نوع انسان کے لئے کشش کا باعث بنتے رہے ہیں۔ حضرت انسان آتش دان کے قریب براجمان ہو کر ان کے بارے میں کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ لوگ ان معدنیات کا ذکر کرتے ہیں جو ان صحراؤں کے نیچے دفن ہیں۔ محض چند ایک سر پھرے مہم جو ایسے ہیں جو ان صحراؤں کی خاک چھاننے اور ان کی تحقیق و تفتیش میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ ان مہم جو حضرات کی جدوجہد تھی جس کے نتیجے میں تقریباً دنیا بھر کی صحرائیں فتح ہو چکی ہیں۔

19 ویں صدی میں اس قسم کی تحقیق و تفتیش انتہائی زور و شور کے ساتھ دیکھنے میں آئی۔ مہم جو حضرات کی معاونت کیلئے کافی وسیع اقسام کا حامل ساز و سامان دستیاب تھا اور ان حضرات نے سہارا...... سندھ...... عریبین کے علاوہ افریقہ...... ایشیا اور امریکہ کی بہت سی صحرائیں عبور کیں۔ کئی ایک مہم جو اس کاوش کے دوران اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے...... وہ بھوک اور پیاس کی شدت کی تاب نہ لاتے ہوئے موت سے ہمکنار ہو گئے...... کئی ایک گرمی کی شدت برداشت نہ کر سکے اور ہلاک ہو گئے...... کئی ایک ویسے ہی غائب ہو گئے اور ان کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ لیکن کئی ایک مہم جو کامیابی سے ہمکنار بھی ہوئے اور ان کی تحقیق سے استفادہ حاصل کیا گیا۔ محض ایک صحرا ایسا تھا جس کو فتح نہ کیا جا سکا تھا...... یہ صحرا...... صحرائے گوبی تھی جو 3,600 میل کے رقبے پر پھیلی ہوئی ہے اور مشرقی ترکستان میں پامیر اور مانچوڑیا کے درمیان واقع ہے۔ کچھ لوگ اس امر پر یقین رکھتے تھے کہ یہ صحرا شیطان کی سلطنت تھی۔

یہ صحرا ایک روسی مہم جو کا منتظر تھا جس نے اسے عبور کیا تھا۔ اس روسی مہم جو کا نام نکولائی میخائل لووچ پریجی والسکی تھا۔ روس کے کئی ایک نامور مہم جو تھے لیکن پریجی والسکی شاید ان سب سے بڑھ کر عظیم تھا۔ وہ ایک ماہر سروئیر تھا اور اس نے ایشیائی روس کے کئی ایک سفر طے کئے تھے جو تحقیق و تفتیش سرانجام دینے کے نظریے کے تحت سرانجام دیے گئے تھے۔ روسی اکیڈیمی آف سائنس اس کے کام سے انتہائی مطمئن تھی۔ اس اکیڈیمی نے پریجی والسکی کو کئی ایک مہمات پر روانہ کیا تھا اور اس نے یہ مہمات کامیابی کے ساتھ سر کی تھیں۔ صرائے گوبی کو عبور کرنے کی خواہش بھی اس کے دل میں مچل رہی تھی۔ پریجی والسکی کو اپنے اس پراجیکٹ کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہ تھیں۔ وہ محض اتنا جانتا تھا کہ اس کی یہ مہم اس کے لئے کس قدر دشوار اور سخت ثابت ہو سکتی تھی۔ اس کا سفر ایک لمبے دورانیے پر محیط ہو سکتا تھا اور وہ جانتا تھا وہ سرکاری اجازت اور سرکاری امداد کی فراہمی کے بغیر اس مہم کی منصوبہ بندی سرانجام نہیں دے سکتا تھا۔ ان نے کئی ایک ایسی اکیڈیمیوں کو اپنے اس منصوبے کے بارے میں خطوط ارسال کئے جن کے بارے میں وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے کام کو سراہتی تھیں...... پسند کرتی تھیں۔ ایک طرف وہ ان اداروں کی جانب سے جواب کا منتظر تھا دوسری طرف اس نے ان لوگوں سے روابط قائم کر رکھے تھے جو باقاعدگی کے ساتھ صحرا کے کسی نہ کسی حصے کو عبور کرتے رہتے تھے اور ان سے معلومات حاصل

کرنے میں مشغول رہا تھا۔ ان لوگوں میں ترکی...... چینی...... تنتی وغیرہ شامل تھے......ان سب لوگوں میں ایک قدر مشترک تھی......وہ یہ کہ وہ صحرائے گوبی پر بات کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ صحرا ایک بُری جگہ تھی۔ ان کے بقول اس صحرا میں صحرائی بھوت ناچتے تھے اور رات کے وقت غیر مانوس آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے تھے کہ یہ صحرا شیطان کی سلطنت تھی۔ وہ محض اس لئے آمادہ تھے کہ اس صحرا کو عبور کرنے سے انہیں ضروریات زندگی میسر آ سکتی تھیں۔

ان معلومات کی روشنی میں پریجی والسکی اس یقین کا حامل نہ تھا کہ یہ لوگ اس کا ساتھ دیں گے اور اس کے ہمراہ اس افسانوی صحرائے گوبی کی تحقیق وتفتیش سرانجام دیں گے۔ اس وقت اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اسے ایک اکیڈیمی کی جانب سے خط موصول ہوا۔ اس اکیڈیمی نے اس کے منصوبے میں انتہائی دلچسپی کا اظہار کیا تھا اور اس کے سفر کے اخراجات برداشت کرنے کی بھی پیش کش کی تھی۔ اس نے جلد از جلد اپنی تیاریوں کا آغاز کر دیا۔ اس نے ایک چھکڑے کا بندوبست کیا جس میں اس کا ساز وسامان لادا جا سکے......اس نے پہلے خلجا کی جانب سفر کرنے کا فیصلہ کیا...... جو الما۔ اتا کے شمال مشرق میں واقع تھا اور صحرائے گوبی کے روسی حصے میں واقع تھا اور اس مقام سے ٹن شان کو عبور کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ پہاڑوں کی دور دراز سمت پہنچ جاتا تب اس کا سفر غیر واضح اور مبہم ہو سکتا تھا کیونکہ صحرائے گوبی کے بارے میں درست معلومات دستیاب نہ تھیں اور اس کا متعلقہ ساز وسامان اور لوازمات اس کے معاون ثابت ہو سکتے تھے لیکن اسے زیادہ تر انحصار اپنے وجدان پر کرنا تھا۔

پریجی والسکی نے جب اپنے سفر کا آغاز کیا اس وقت موسم خوشگوار تھا لیکن جلد ہی تند وتیز ہوا چلنے لگی۔ یہ ہوا شمال کی جانب سے چلنے لگی تھی۔ وہ بذات خود اور اس کی مال واسباب کھینچنے والی گاڑی ریت سے بھر چکی تھی اور ریت نے ان کے نتھنے بھی بند کر دیے تھے اور وہ بند آنکھوں کے ساتھ ڈگمگانے پر مجبور تھے۔ جوں ہی رات ہوئی تو درجہ حرارت صفر سے بھی کافی نیچے گر گیا اور اس نے سفر ملتوی کرنے اور قیام کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ در پیش صوت حال کے تحت سفر جاری رکھنا حماقت کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اس کے ہمراہ سفر کرنے والا ترکی ملازم بھی اپنے مالک کے بستر میں گھس گیا۔

پہلے تو پریجی والسکی خوش ہوا کہ اس کے بستر میں گھسنے کی وجہ سے اسے فاضل گرمائش میسر آئی تھی لیکن جلد ہی کیڑے مکوڑوں کی یلغار نے اسے بے چین کر دیا۔ یہ کیڑے ترکی ملازم کے اس کوٹ سے حملہ آور ہو رہے تھے جو بھیڑ کی کھال سے بنایا گیا تھا اور اس نے اسے زیب تن کر رکھا تھا۔ لہٰذا پریجی والسکی نے ایک بے سکون رات بسر کی۔ صبح ہو چکی تھی لیکن ہوا کی شدت میں کچھ کمی واقع نہ ہوئی تھی۔ ہوا بدستور تیز رفتاری کے ساتھ چل رہی تھی۔ فضا میں ریت رچی بسی ہوئی تھی۔ انہوں نے خرابی موسم کے باوجود خلجا کی جانب سفر جاری رکھا اور پریجی والسکی اس نکتہ نظر کا حامل بن چکا تھا کہ صحرائے گوبی اپنے مسافروں کو قرار واقعی سبق سکھانے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگاتی۔

وہ خلجا پہنچ چکے تھے۔ یہاں کے لوگ اپنی دنیا میں مست تھے۔ وہ کسی بھی اجنبی کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور پریجی والسکی ٹن شان عبور کرنے کے بارے میں ان سے کسی قسم کی معلومات حاصل کرنے اور ان کو اپنے ہمراہ مزدوری کی پیش کش کرنے سے قاصر تھا۔ اگر وہ کسی شخص سے مخاطب ہوتا تو اس کا ساتھی بھاگم بھاگ آن پہنچتا جیسے شیطان اس کے پیچھے لگا ہو۔ لہٰذا اس نے یہ فیصلہ کیا کہ چند روز اس مقام پر قیام کیا جائے...... ان لوگوں کے ساتھ روابط بڑھائے جائیں اور ان سے معلومات حاصل کی جائیں۔ اس کا یہ منصوبہ کارگر ثابت ہوا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر اس نے

حصول مقصد کیلئے کئی ایک آدمی رضامند کر لئے تھے۔ ان لوگوں کی دو اقسام تھیں۔ پہلی قسم کے لوگ کمینے واقع ہوئے تھے۔ وہ کم سے کم کام کے عوض زیادہ سے زیادہ معاوضہ حاصل کرنے کے خواہاں تھے اور دوسری قسم کے لوگ اگرچہ بہتر کام کرتے تھے لیکن ان میں ایک خامی موجود تھی کہ وہ مالک کی قیمتی اشیاء پر ہاتھ صاف کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔

تن شان کو عبور کرنے کا سفر ایک مشکل سفر ثابت ہوا۔ ان پہاڑوں کی بظاہر پُرسکون شکل وصورت اپنے اندر بہت سی مشکلات چھپائے ہوئے تھی۔ اس کی کئی ایک ڈھلوانیں انتہائی خطرناک تھیں۔ ان کے دروں تک رسائی مشکل تھی اور ان سے ہوا اس قدر تیزی کے ساتھ گزرتی تھی کہ چاقو کی دھار کیا تیز ہوگی۔ پریجی والسکی کو خدشہ تھا کہ ان مشکلات سے گھبرا کر اس کے آدمی واپس نہ پلٹ جائیں۔ لہٰذا اس نے اپنی پوری قوت صرف کرتے ہوئے انہیں واپس جانے سے روکا۔ انہوں نے جس راستے کا انتخاب کیا تھا وہ ایک نہ ختم ہونے والا راستہ دکھائی دیتا تھا۔ بالآخر یہ راستہ اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ اس رات انہوں نے ایک چھوٹی سی وادی میں قیام کیا۔ ان کی قیام گاہ کے نزدیک ایک ندی بھی بہہ رہی تھی جہاں سے انہوں نے میٹھا اور صاف شفاف پانی حاصل کیا۔ اس کے علاوہ اس جھیل سے انہیں مچھلی بھی دستیاب ہوئی۔ وہ جانتے تھے کہ وہ اب صحرائے گوبی سے محض دو دن کی مسافت کے فاصلے پر تھے۔ پریجی والسکی نے فیصلہ کیا کہ انہیں خوب آرام کرنا چاہیے۔ مزدور بھی خوش تھے اور انہوں نے زیادہ وقت سو کر گزارا۔ لیکن اس نے بذات خود الما۔ اتا سے ایک بہتر روٹ تجویز کرنے پر غور وخوص سرانجام دیتے ہوئے وقت گزارا۔

اس کے پاس جو معلومات دستیاب تھیں ان کی روشنی میں پریجی والسکی اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ تین راستوں میں سے کسی ایک راستے کا انتخاب کر سکتا تھا۔ پہلا راستہ اسے بذریعہ کراشر جنوب مشرق کی جانب لے جا سکتا تھا...... دوسرا راستہ بذریعہ ترفان مشرق کی جانب لے جا سکتا تھا اور تیسرا راستہ بذریعہ یورمشی اسے شمال۔ مشرق کی جانب لے جا سکتا تھا۔ اس نے ترفان والے راستے کا انتخاب کیا۔ وہ تمام دن اس راستے پر سفر طے کرتے رہے۔ یہ ایک صحرائی علاقہ تھا اور اس رات جب پریجی والسکی اپنے خیمے میں دراز ہوا تو اسے صحرائے گوبی کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ جانتا تھا کہ یہ آوازیں ہوا کے شور سے پیدا ہوتی تھیں لیکن جوں ہی وہ نیم نیند کی حالت میں تھا اس نے اس قسم کی آوازیں سنیں جو اس سے کہہ رہی تھیں کہ:۔

"واپس چلے جاؤ! واپس چلے جاؤ! یہ شیطان کا ملک ہے...... ہم تمہارا وجود یہاں برداشت نہیں کر سکتے۔"

وہ ایک بہادر شخص تھا اور خطرات سے کھیلنا بخوبی جانتا تھا لیکن اس کے باوجود بھی ذرا سہا پڑا رہا حتیٰ کہ طلوع فجر ہوگئی۔

اگلی صبح اسے ایک قافلہ دکھائی دیا۔ اس قافلے میں بارہ اونٹ شامل تھے۔ ان سب اونٹوں پر سامان تجارت لادا ہوا تھا۔ ان اونٹوں کے پیچھے چھکڑے تھے جنہیں خچر کھینچ رہے تھے۔ اسے سب کچھ واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ یہ بھی امتیاز کر سکتا تھا کہ کون سا مزدور ترکی تھا اور کون سا مزدور چینی تھا۔ لیکن جوں ہی یہ قافلہ اس کے نزدیک پہنچا تو یک دم غائب ہوگیا۔ پریجی والسکی کی حیرانگی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ تب وہ آگے بڑھا اور اس راستے کی جانب روانہ ہوا جس راستے سے اسے یہ قافلہ آتے ہوئے دکھائی دیا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ زمین پر نہ تو اونٹوں کے قدموں کے نشانات موجود تھے اور نہ ہی چھکڑوں کے پہیوں کے نشانات موجود تھے۔ اس نے اپنے آدمیوں سے اس قافلے کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ کہنے لگے کہ یہ ایک فریب تھا...... ایک ایسا فریب جس کا مظاہرہ صحرائے گوبی اکثر کرتا تھا۔

وہ ایک ہفتہ مزید سفر طے کرنے کے بعد ترفان پہنچ چکے تھے۔ ترفان کے ہر ایک گھر میں تہہ خانے موجود تھے اور گرمیوں کے موسم میں لوگ ان تہہ خانوں میں پناہ لیتے تھے۔ قصبے سے باہر ایک ندی بہتی تھی جہاں سے پینے کے لئے پانی بخوبی دستیاب تھا۔ ترکی لڑکے گدھوں پر پانی لاد کر لے جا رہے تھے۔ وہ لوگ صبح سویرے سے لے کر دن گیارہ بجے تک محنت مزدوری کرتے تھے۔

اس کے بعد دوبارہ بعد از دوپہر اپنی محنت مزدوری کا آغاز کر دیتے تھے اور رات گئے تک محنت مزدوری سر انجام دیتے رہتے تھے۔

جلد ہی پریجی والسکی کو مزدور میسر آ گئے اور وہ جنوب کی جانب روانہ ہو گیا۔ یہ ایک لمبا اور تھکا دینے والا سفر تھا۔ وہ اپنا سفر طے کرتے ہوئے لوپ نور کے نخلستان جا پہنچے تھے۔ یہ جگہ ترفان سے بالکل مختلف واقع ہوئی تھی۔ لوگ جھونپڑیوں میں آباد تھے۔ پریجی والسکی نے یہ اندازہ لگایا کہ کسی دور میں یہاں پر ایک پر وقار شہر آباد رہا ہوگا۔ اسے یہاں کے مقامی باشندوں سے کسی قسم کی کوئی بھی مفید معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔

درحقیقت پریجی والسکی لوپ نور کے مقام پر اپنا سفر ختم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن اب اس کے من میں یہ خواہش مچل رہی تھی کہ وہ مشرق کی جانب کیایوک وان کا سفر بھی طے کرے...... یہ ایک چینی فوجی قلعہ تھا جو سرائے گوبی کا مشرقی دروازہ تھا۔ مزدوروں کے ساتھ کافی بحث مباحثے اور انہیں رشوت دینے کے بعد بالآخر پریجی والسکی انہیں مزید سفر پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ لہٰذا یہ جماعت ایک اور صحرائی سفر پر روانہ ہو گئی۔ جلد ہی گوبی نے ایک مرتبہ پھر اپنا روپ بدل لیا۔ اس کی سیاہ ریت اب زرد ریت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اگرچہ یہ ریت بھلی دکھائی دیتی تھی لیکن اس پر سفر طے کرنا ایک مشکل امر ثابت ہو رہا تھا۔ موسم گرما رخصت ہو چکا تھا۔ اگرچہ دن کو سورج چمکتا تھا لیکن رات کو درجہ حرارت صفر تک جا پہنچتا تھا۔ وہ نخلستانی قصبے تن وانگ پہنچ چکے تھے۔

صحرا اب کئی ایک نخلستانوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ان نخلستانوں سے گزرتے ہوئے وہ کیایوک وان پہنچ چکے تھے (بھوتوں کا دروازہ)۔ وہ شہر میں داخل ہو گئے۔ اس کا مشن مکمل ہو چکا تھا۔ وہ اپنی مہم بخوبی سر انجام دے چکا تھا۔ اس کا طویل سفر بالآخر اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ اس نے صحرا گوبی کی لامحدود وسعت پر ایک نظر ڈالی اور آہستہ آہستہ گنگنانے لگا کہ:-

"خوابوں سے بھرپور......وہ صحرا......"

کنوسس کے مقام پر محل کی دریافت

یونانی تاریخ کے بارے میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اس تاریخ کا آغاز 800 قبل از مسیح میں ہوا تھا۔ اس کا قبل از تاریخ کا دور قصوں کہانیوں اور روایات کا ایک دور تھا...... قبل از تاریخ ایسے قصبے تھے جو مابعد تہذیب کے کھنڈرات تلے دب چکے تھے...... لیکن ان میں سے بہت کم ایسے تھے جن کو بازیاب کیا جا چکا تھا...... دریافت کیا جا چکا تھا۔ کیا حقیقت میں ان کا کوئی وجود تھا...... یا کیا وہ محض قصے کہانیاں اور روایات تھیں؟

1834ء میں قدیم کنوسس کا مقام دریافت کیا گیا تھا...... یہ کریٹ میں واقع تھا۔ یہ مقام کینیڈا سے چار میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس کا کنوسس ہونا ثابت ہو چکا تھا...... قبل از تاریخ کا ایک عظیم شہر۔ اس شہر کو دریافت کرنے والے مہم جو کو پُر جوش خراج تحسین پیش کیا گیا...... بالخصوص جزیرہ کریٹ پر جہاں پر ایک قدیم تہذیب نے جنم لیا تھا اور عرصہ دراز قبل صفحۂ ہستی سے مٹ چکی تھی...... کنوسس کی دریافت اس تہذیب کو دریافت کرنے کے سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔

19ویں صدی کے دوسرے نصف حصے کے دوران کئی ایک کھنڈرات دریافت کئے گئے۔ آہستہ آہستہ قدیم دنیا کے بارے میں انسانی علم میں وسعت پیدا ہوتی چلی گئی۔

لیکن ابھی یہ صدی اپنے اختتام کو نہ پہنچی تھی کہ آرتھر ایونز نے اپنا عظیم الشان کام شروع کر دیا تھا۔ اس نے نہ صرف کنوسس کے مقام پر عظیم الشان محل کی کھدائی کا کام شروع کر دیا تھا جو شاہ منس کا محل تھا بلکہ اس کے ایک بڑے حصے کی تعمیر نو کے کام کا بھی آغاز کر دیا تھا تاکہ بنی نوع انسان قدیم دنیا کا عجوبہ دیکھ سکے۔ ہاتھی دانت کی میزیں جن پر سونے کی پالش چڑھائی گئی تھی...... ظروف...... اور سب سے بڑھ کر اہم دریافت یہ تھی کہ یہ قدیم لوگ لکھ پڑھ بھی سکتے تھے۔ ہمیشہ یہی تصور کیا جاتا تھا کہ فونیشین جو کہ بعد میں آنے والی نسل تھی...... انہوں نے لکھائی کے عمل کو ایجاد کیا تھا۔ اب ایونز نے یہ دریافت کیا تھا کہ کریٹین...... "مینونز"...... وہ انہیں مینونز کہنے کو ترجیح دیتا تھا...... بھی لکھائی کے اپنے عمل کے حامل تھے اور انہوں نے فونیشین کے حروف ابجد ایجاد کرنے سے قبل ہی لکھائی کے عمل کا آغاز کر دیا تھا۔

بدقسمتی سے آرتھر ایونز اس امر سے واقف نہ تھا کہ وہ مینونز کی تحریروں کا ترجمہ کس طرح کرے کیونکہ کھدائی کے دوران اسے لاتعداد تحریریں میسر آئی تھیں جو کہ محتاط انداز میں تحریر کی گئی تھیں۔

لیکن ابھی بہت کچھ دریافت ہو رہا تھا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی نئی چیز دریافت ہو رہی تھی اور مینون کی تہذیب کی عکاسی کر رہی تھی اور اس پر نئی روشنی ڈال رہی تھی۔ لہٰذا آرتھر ایونز نے قدیم تحریروں کے بارے میں فکر مند ہونا چھوڑ دیا اور ان اشیاء کی جانب متوجہ ہوا جو ہر روز دریافت ہو رہی تھیں۔

پیشتر اس کے کہ ہم اس امر کی جانب متوجہ ہوں کہ ایونز نے کیا کچھ دریافت کیا اور ان قدیم تحریروں سے کس طرح آشنائی حاصل کی جو

اسے دریافت ہوئی تھیں...... آیئے ہم آثار قدیمہ کے اس عظیم ماہر پر ایک نظر ڈالیں۔ یقیناً اس کی وراثت اس کی پشت پناہی کر رہی تھی کیونکہ اس کا والد سرجان ایک معروف ماہر آثار قدیمہ تھا اور سکوں کو پرکھنے کا بھی ماہر تھا۔ باپ بیٹے دونوں کو خاندانی دولت کا تعاون بھی حاصل تھا۔ اس دولت کا کثیر حصہ ڈکن سن پیپر ملز کا مرہون منت تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ زندگی بھر اپنے پسندیدہ مشاغل میں مصروف رہے تھے اگرچہ یہ مشاغل انہیں مالی فوائد سے مستفید کرنے کے حامل نہ تھے۔

یہ لڑکا ہاروے چلا آیا جہاں پر اس نے ''ہارووین'' کی ایڈیٹر شپ کے فرائض سرانجام دیے۔ ہاروے سے وہ براس نوز کالج آکسفورڈ چلا آیا۔ خاندانی دولت اور اس کی اپنی لگن اسے گوٹنجن یونیورسٹی لے گئی۔ اس کے بعد اس نے سیاحت سرانجام دینا شروع کر دی۔ اس نے بوسنیا...... فن لینڈ اور لیپ لینڈ کے سفر سرانجام دیے اور مانچسٹر گارڈین کیلئے آرٹیکل بھی تحریر کیئے۔

1884ء میں جبکہ اس کی عمر 33 برس تھی اسے ایش مولین میوزیم...... آکسفورڈ میں نگران کی ملازمت کی پیش کش ہوئی۔ اس ملازمت کے دوران سفر کے وسیع مواقع متوقع تھے۔ لہٰذا اس نے اس موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ اگلے دس برس کا دورانیہ اس نے سفر طے کرتے ہوئے گزارا۔ اس نے تمام تر یونان اور مشرق وسطیٰ کے سفر طے کئے اور 1894ء میں سلطنت ترکیہ کے قانون کے مطابق وہ کریٹ میں کیپ ہالہ کی ایک ریاست کے حصص خریدنے کی اہلیت کا حامل بن چکا تھا...... کریٹ ان دنوں سلطنت ترکیہ کا ایک حصہ تھا۔ اس ریاست کی حدود کے اندر قدیم کنوسس کے کھنڈرات واقع تھے جن کی جانب ابھی تک کسی نے توجہ نہ دی تھی۔

چند برسوں تک اس نے اس ریاست میں کسی بھی سرگرمی کا مظاہرہ نہ کیا۔ لیکن جب ترکی نے اس جزیرے کو خالی کر دیا تب یہ جزیرہ مکمل طور پر اس کے قبضے میں آ گیا۔ اس کو یہ اندازہ نہ تھا کہ اس کا یہ قبضہ اسے کس طرح مستفید کر سکتا تھا۔

اس نے ایتھنز میں واقع برطانوی آثار قدیمہ کے ایک اسکول کے تعاون کے تحت اپنے کام کا آغاز کیا۔ کام کافی سہل دکھائی دے رہا تھا۔

جلد ہی یہ انکشاف ہو چکا تھا کہ قابل ذکر قدیم اشیاء برآمد ہوں گی۔ جوں ہی کھدائی گہرائی کی حامل ہوئی...... ایک محل...... یہ محل یقیناً شاہ مینوز کا محل تھا...... عظیم بادشاہ کا محل...... چھ ایکڑ کے رقبے پر محیط یہ محل دریافت ہوا۔ یہ محل مربع شکل کا حامل تھا۔ اس میں ایک دربار بھی تھا اور لاتعداد ہال بھی تھے۔ اس میں ایک چھوٹا سا کونسل چیمبر بھی تھا جس میں تخت رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک باتھ روم بھی منسلک تھا۔ محل میں پانی کی فراہمی کا ایک بہترین نظام بھی موجود تھا۔ دیواریں تصاویر کے ساتھ سجائی گئی تھیں۔ ان تصاویر میں مردوں...... عورتوں...... بیلوں کے علاوہ بیلوں کی لڑائی کی تصاویر بھی شامل تھیں۔ مٹی اور پتھر کے مرتبان بھی دریافت ہوئے تھے۔ ان پر رنگ روغن کیا گیا تھا۔ ایسی میزیں بھی دریافت ہوئی تھیں جن پر مینون تحریریں رقم تھیں۔

لیکن اس تمام تر عمل میں خاصا وقت صرف ہوا تھا۔ ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ حیرا کن دریافتیں منظر عام پر آئی تھیں اور محل بھی انتہائی حیران کن حیثیت کا حامل تھا۔ کیا کوئی شخص اپنی زندگی کے دوران اس قدر عظیم محل تعمیر کروا سکتا تھا؟

ایونز نے یہ محسوس کیا کہ اگر اس محل کو محفوظ بنانا تھا تو اس کی تعمیر نو سرانجام دینی انتہائی ضروری تھی۔

اور شاید یہ آرتھرایونز کے کام کا ایک قابل ذکر حصہ تھا۔اس نے اس محل کی بحالی کا نہ صرف منصوبہ تیار کیا بلکہ اس منصوبے کی نگرانی بھی سرانجام دی۔اس محل کی دیواریں......سیڑھیاں......ستون......سب کچھ بحال کیا گیا اور جہاں تک ممکن ہو سکا اس کی حقیقی باقیات ہی استعمال میں لائی گئیں۔لیکن جہاں پر یہ موجود نہ تھیں یا اس قدر رختہ حالی کا شکار تھیں کہ نا قابل استعمال تھیں تب کنکریٹ وغیرہ استعمال کرتے ہوئے مرمت کا کام سرانجام دیا گیا۔

یہ کام برس ہا برس تک جاری رہا۔1903ء میں لندن میں کنوسس کے خزانوں کی پہلی نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا۔ایونز نے انتہائی محتاط انداز میں حقائق اکٹھے کئے اور اپنی رائے بھی مرتب کی۔1921ء میں اس کی تحریر

''دی پیلس آف مینوس ایٹ کنوسس''

یعنی

''کنوسس میں مینوس کا محل''

منظر عام پر آئی۔1921ء میں اس کی پہلی جلد شائع ہوئی جبکہ 1936ء میں دیگر تین جلدیں منظر عام پر آئیں۔

سر آرتھرایونز نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ کنوسس میں کھدائی۔تعمیر نو اور دیگر سرگرمیوں میں گزارنے کے علاوہ اپنی کثیر دولت بھی اس کام میں صرف کر دی تھی۔1926ء تک وہ اس قابل نہ رہا تھا کہ اپنا مالی تعاون جاری رکھ سکے۔لہٰذا اس نے یونانی حکومت کے ساتھ ایک معاہدہ کیا کہ اس کام کو ایتھنز میں واقع آثار قدیمہ کے برطانوی اسکول کے حوالے کر دیا جائے۔

لیکن مینون تہذیب......تاریخ میں اس کی دلچسپی از حد زیادہ تھی۔لہٰذا اس نے نزدیک ہی واقع شاہی مقبروں کی جانب اپنی توجہ مرکوز کر والی۔اس کے ساتھ ساتھ اس نے اس امر کی جانب بھی نگاہ رکھی کہ عظیم بادشاہ مینوس کے محل کے ساتھ کیا کچھ وقوع پذیر ہو رہا تھا۔

ایونز نے 1941ء میں وفات پائی۔اس کی 90ویں سالگرہ میں ابھی تین روز باقی تھے کہ وہ موت سے ہمکنار ہو گیا۔لیکن مرنے کے بعد بھی اس کا نام زندہ رہا کیونکہ دریافتوں کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔حتیٰ کہ دوسری جنگ عظیم میں اس مقام پر جرمنی کے قبضے کے دوران بھی کام کا سلسلہ جاری رہا......جرمنوں نے بھی اس کام میں دلچسپی کا اظہار کیا اور انہوں نے انتہائی لگن کے ساتھ کام جاری رکھا۔دوسری جنگ عظیم کے دوران کنوسس کو کوئی نقصان نہ پہنچا تھا۔

آرتھرایونز کے دور سے بہت پہلے بھی کریٹ ماہرین آثار قدیمہ کی توجہ کا مرکز بنا رہا تھا بالخصوص انگریز ماہر آثار قدیمہ اس میں از حد دلچسپی لیتے تھے۔رابرٹ پاشلے نے 1837ء میں ایک دلچسپ کتاب شائع کی تھی......یہ وہ برس تھا جب ملکہ وکٹوریہ تخت نشین ہوئی تھی۔اس کتاب کو اس نے

''ٹریول ان کریٹ''

یعنی

''کریٹ کا سفر''

کا عنوان دیا تھا۔

سر آرتھر کا مقصد......اس کی مہم تلاش کرنے کی مہم تھی اور اس نے ایسی کامل صورت حال کے تحت اس تلاش کو ممکن بنایا کہ لوگ حیران رہ گئے۔اس نے انتہائی مہارت کے ساتھ مرمت کا کام بھی سرانجام دیا۔

اگرچہ آنے والے برسوں کے دوران مزید دریافتیں ممکن ہوسکیں گی لیکن جزیرہ کریٹ کے مقام کنوسس پر عظیم بادشاہ کا جو محل دریافت ہو چکا ہے اس سے بڑھ کر حیران کن دریافت کی امید نہیں کی جا سکتی۔

......❁......

ایگنس لی وس کی سینائی مسودے کی تلاش

سیاحت کے میدان میں بھی خواتین نے اپنے آپ کو مردوں کے ہم پلہ ثابت کیا تھا۔حتیٰ کہ اس دور میں بھی جبکہ یہ تصور کیا جاتا تھا کہ عورت ایک کمزور مخلوق تھی......اس دور میں بھی قابل ذکر خواتین میری کنگزلی اور ہیسٹر اسٹان ہوپ اس تصور کو غلط ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھیں...... کچھ مہم جو خواتین بھی موجود تھیں۔ مثال کے طور پر گرٹروڈ بیل اور روسیٹا فوربس وغیرہ۔ وغیرہ...... یہ خواتین بالخصوص صحراؤں میں دلچسپی کی حامل تھیں۔ سیاحت کی دلدادہ بہت سی خواتین ان دیکھی دنیا کو دریافت کرنے میں دلچسپی رکھتی تھیں۔

محض چند ایک خواتین مذہب سے متاثر تھیں مثلاً ایگنس لی وس' ایگنس اور اس کی ہمشیرہ مارگریٹ تعلیم یافتہ اور تہذیب یافتہ وکٹورین خواتین تھیں۔ ایگنس سیموئیل لی وس کی بیوی تھی۔ وہ کارپس کرسٹی۔ کیمرج میں لائبریرین تھا۔ اس کے علاوہ وہ سیاحت کا بھی شوقین تھا۔ مارگریٹ نے جیمز گبسن سے شادی کی تھی۔ وہ بھی مشرق وسطیٰ میں ایک سیاح تھا۔

دونوں بہنیں عین جوانی میں بیوہ ہوگئی تھیں۔ انہوں نے بھی اپنے خاوندوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اکٹھے سیاحت سرانجام دینا شروع کردی تھی۔ وہ ان سرزمینوں کے سفر طے کرتی تھیں جن کا ذکر بائبل میں آیا تھا۔ مثلاً فلسطین......مصر...... یونان اور قبرص وغیرہ۔ وغیرہ......ان کے دور میں خواتین کیلئے ان علاقوں کا سفر انتہائی کٹھن سفر واقع ہوا تھا۔

ان دونوں بہنوں کے ہمراہ یونانی مفکرین بھی تھے جو قدیم اور جدید دونوں اقسام کی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ 1891ء میں ایگنس کے علم میں یہ بات آئی کہ شامی زبان میں غیر مطبوعہ مسودے ماؤنٹ سینائی پر واقع سینٹ کیتھرائن کی خانقاہ میں موجود تھے۔ لہٰذا دونوں بہنوں نے جزیرہ نما سینائی کا طویل سفر طے کرنے کا منصوبہ بنایا...... یہ مقام بائبل میں ایک مقدس مقام گردانا گیا تھا۔

ایگنس اس نکتہ نظر کی حامل تھی کہ اسے نہ صرف مقدس سرزمین کی زیارت کرنے کا موقع میسر آ رہا تھا بلکہ شاید یہ موقع بھی میسر آ رہا تھا کہ وہ دنیا کو بائبل کے ان مسودوں سے بھی روشناس کروا سکے جو صدیوں سے محو کیے جا چکے تھے اور سینائی کی ایک خانقاہ کی گرد آلود الماریوں کی زینت بنے ہوئے تھے۔

اپنے آپ کو اس مہم کے لئے تیار کرنے کی غرض سے اس نے کوئینز کالج۔ کیمرج میں شامی گرائمر کا مطالعہ سرانجام دیا اور اس امر کی تربیت حاصل کی کہ قدیم حروف ابجد کو کس طرح نقل کرنا تھا۔ عربی اور عبرانی دونوں زبانوں پر عبور حاصل کرنے کے بعد ایگنس کو شامی زبان سیکھنے میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

دونوں بہنوں نے مسودوں کے صفحات کی فوٹو بنانے کے فن میں بھی دسترس حاصل کی۔

اپنی تمام تر تیاریاں مکمل کرنے کے بعد انہوں نے قاہرہ کا رخ کیا۔ یہاں پر وہ عجائب گھر میں فرعونوں کی ممیوں (مسالہ لگا کر محفوظ کی گئی لاش) کو دیکھ کر از حد متاثر ہوئیں۔

قاہرہ میں انہوں نے اپنا زیادہ وقت صرف نہ کیا اور سینائی کا رخ کیا۔ سیاحت کی دلدادہ ان بہنوں کے بہت سے دوست تھے۔ ان دوستوں کے مشوروں پر انہوں نے حنا نامی ایک شخص کو اپنا گائیڈ اور ترجمان مقرر کیا اگرچہ زبانوں کے معاملے میں وہ بذات تربیت یافتہ اور ماہر تھیں۔ انہوں نے یونانی چرچ کے ان حکام کے نام سفارشی خطوط بھی حاصل کیے جن کے ماتحت جزیرہ نما سینائی کی اس خانقاہ کے راہب تھے۔

جنوری 1892ء کے آخر میں انہوں نے اپنی مہم کا آغاز کیا۔ انہوں نے نہر سویز عبور کی اور تب اونٹوں کی سواری اختیار کی۔ یہ اونٹ حنا نے فراہم کیے تھے۔ انہوں نے سینائی کے مغربی ساحل کا سفر طے کرنا شروع کیا۔ پہلی رات انہوں نے پام کے درختوں کے قریب اپنے خیمے نصب کیے۔ مقامی باشندوں نے انہیں خوش آمدید کہا۔ اگرچہ ان کا خیمہ آرام دہ تھا لیکن اس کے باوجود بھی وہ رات بھر بے چینی کا شکار رہے کیونکہ ہوا اس قدر تیز چل رہی تھی کہ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں ان کا خیمہ ہی نہ اڑ جائے۔ وہ رات بھر جاگتے رہے اور صبح ساڑھے چھ بجے سفر کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ ان کے گائیڈ اس قدر سست واقع ہوئے تھے کہ انہوں نے اونٹوں پر سامان لادنے میں تین گھنٹے صرف کر دیے تھے۔

ان دونوں بہنوں کا اپنے گائیڈوں کے ساتھ کچھ امور پر اختلاف تھا۔ ایک اختلاف اتوار کے دن پر تھا۔ یہ لوگ اتوار کے روز سفر طے نہیں کرنا چاہتے تھے......وہ اسے آرام کا دن تصور کرتے تھے۔

اگلے روز بھی انہوں نے اپنا سفر جاری رکھا اور بالآخر وہ سینائی کی پہاڑیوں تک جا پہنچے۔ یہ علاقہ باغات اور پام کے درختوں کا حامل تھا۔ انہوں نے ایک ندی کے کنارے دوپہر کا کھانا تناول کیا۔ ایک لڑکی جس نے نقاب پہن رکھا تھا ان سے ملاقات کیلئے آن پہنچی۔ وہ ان لوگوں کو جانتی تھی کیونکہ وہ اپنے سفر کی گذشتہ منزل پر اس کے خاوند سے مل چکے تھے۔

اس عربی لڑکی نے ان دونوں انگریز خواتین کو حیرانگی کے ساتھ دیکھا۔

اس نے پوچھا کہ:۔

''کیا یہ خواتین ہیں؟''

وہ ان کے بے نقاب چہرے دیکھ کر انہیں خواتین تسلیم کرنے پر تیار نہ تھی۔ اس نے ان دونوں انگریز خواتین کے ساتھ بات چیت کی اور ان خواتین کے علم میں یہ بات آئی کہ تین برس قبل اس عربی لڑکی کی شادی ہوئی تھی۔ اب اس کے دو بچے تھے۔

انہوں نے نخلستان کی دوسری جانب اپنے خیمے نصب کر لئے تھے۔ اب وہ لوگ مونٹ سینائی سے زیادہ دور نہ تھے۔ دوپہر کو ان کی ملاقات ڈاکٹر گروٹ سے ہوئی۔ وہ ایک اینگلو جرمن مشنری تھا جو سینٹ کیتھرائن کی خانقاہ میں سردیوں کے مہینے گزار رہا تھا۔

اگلے روز دونوں بہنیں اور ان کا قافلہ سینٹ کیتھرائن کی خانقاہ تک پہنچ چکا تھا۔ یہ خانقاہ 5 ویں صدی میں قائم کی گئی تھی۔ اس کی تعمیر ایک جنگی قلعے کی طرز پر کی گئی تھی۔ اس کی بیرونی دیواریں کافی قدیم تھیں جبکہ اس کے اندرونی کمرے کسی قدر جدید تھے۔

خانقاہ کے نگران اورلائبریرین نے ان کا خیر مقدم کیا۔انہوں نے خانقاہ کے نگران کو رینڈل ہیرس کا خط بھی پہنچایا۔وہ ایک انگریز مفکر تھا اوراس نے کچھ برس پیشتر اس خانقاہ کا دورہ کیا تھا۔خانقاہ کے نگران نے اس خط کو خوشی خوشی پڑھا اور اس تحریر کو بھی پڑھا کہ:۔

"جب ہم دوردراز کے ممالک میں حقیقی دوستوں کے حامل ہوں تب یہ دنیا اس قدر وسعت کی حامل دکھائی نہیں دیتی۔"

انہوں نے جلد ہی لائبریری میں اپنے کام کا آغاز کیا اور مسودوں کی فوٹو گراف تیار کرنے میں ایک ماہ صرف کیا۔یہ مسودے چار انجیلوں کے تھے جن کو شامی زبان میں 200 بعداز مسیح میں ترجمہ کیا گیا تھا۔سینائی مسودہ بائبل سے متعلق ایک اہم دریافت تھی۔

انہوں نے خاصی بے آرامی کی حالت میں وقت گزارا اور بے آرامی کی حالت میں ہی اپنا کام سرانجام دیا۔وہ رات اپنے خیمے میں بسر کرتے تھے اور درجہ حرارت صفر سے نیچے ہوتا تھا۔لائبریری کی کھڑکیوں کے شیشے بھی موجود نہ تھے اور کام کرتے ہوئے پہاڑوں کی سرد ہواؤں سے ان کے ہاتھ کانپ رہے ہوتے تھے۔

8 مارچ 1892ء کو انہوں نے اس خانقاہ کو خیر باد کہا۔ان کے پاس ان کی کاوش کا ثمر فلموں کی صورت میں موجود تھا۔اور وہ واپس مصر کی جانب روانہ ہوئے۔اپنے واپسی کے سفر کے پہلے ہی دن وہ دونوں بہنیں مصائب کا شکار ہو گئیں۔ایگنس کے اونٹ کی کاٹھی ٹوٹ گئی اور وہ اونٹ کی سواری میں دشواری محسوس کرنے لگی جبکہ مارگریٹ کا پاؤں کسی تکلیف کا شکار ہو گیا۔کئی دنوں سے اس کے پاؤں کی ایڑھی سوجن کا شکار تھی اور اب اس میں درد اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ وہ چلنے سے عاجز تھی۔

سینائی کی سرد ہوائیں بھی انہیں پریشان کر رہی تھیں۔الم کے مقام پر جہاں پر کنواں بھی موجود تھا اور درخت بھی موجود تھے انہوں نے اپنے خیمے نصب کر لئے۔یہاں پر انہیں تین مزید مسافروں کا ساتھ میسر آ گیا......ان میں ایک گلاسکو کا ڈاکٹر تھا اور دو امریکی دوست تھے۔یہ لوگ بھی سینائی کی زیارت کرنے کے لئے آئے تھے۔انہوں نے آپس میں معلومات کا تبادلہ سرانجام دیا۔مارگریٹ ہنوز پاؤں کی تکلیف میں مبتلا تھی اور ان کے نئے ساتھیوں نے اسے یہی مشورہ دیا تھا کہ وہ فی الحال چلنے پھرنے سے پرہیز کرے کیونکہ اس سے زیادہ وہ اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

بالآخر انہوں نے ریتلے میدانوں میں جلتے سورج تلے اپنے سفر کا آغاز کیا۔گرمی کی شدت اور پیاس کے ہاتھوں وہ مجبور تھے اور سخت مصیبت میں مبتلا تھے۔بالآخر انہیں نہر سویز دکھائی دی تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔وہ ریتلے ساحل کی جانب دوڑ پڑے۔حتیٰ کہ اونٹوں نے بھی اپنی رفتار تیز کر دی۔

وہ "سگہالین" نامی بحری جہاز پر سوار ہو چکے تھے۔گھر کی جانب سفر طے کرنے کے دوران بھی مارگریٹ پاؤں کی تکلیف میں مبتلا رہی اور اس تکلیف کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ وہ شدید بیماری کا بھی شکار ہو گئی۔

ایگنس نے ہمیں نہیں بتایا کہ اس کی ہمشیرہ کے پاؤں کا زخم کیسا تھا اور اس کی وجہ سے وہ جس علالت کا شکار ہوئی تھی اس کی نوعیت کیا تھی۔ بقول ایگنس اسے یہ تکالیف خدا کی جانب سے آئی تھیں۔

اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ ایگنس کو اپنی ہمشیرہ سے ہمدردی نہ تھی بلکہ وہ اور مارگریٹ دونوں خدا کی رضا میں راضی تھیں۔

ازابیلا برڈ......

مرعوب یا مغلوب ہونے سے بے نیاز

''مسز بشپ...... مجھے آپ کو یہاں پر دیکھ کر ازحد خوشی محسوس ہو رہی ہے۔''

یہ الفاظ ملکہ وکٹوریہ نے اس وقت ادا کئے تھے جبکہ مئی 1893ء میں ایک تقریب کے موقع پر وہ اس مختصری خاتون سے ملاقات کر رہی تھی۔ مسز بشپ کے بارے میں یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی تھی کہ کئی ایک لحاظ سے وہ ملکہ سے بڑھ کر واقع ہوئی تھی۔ حوصلہ اور جرأت...... کامیابی اور چال چلن کے لحاظ سے وہ ایک غیر معمولی خاتون واقع ہوئی تھی۔ عوام اسے اس کے کنوار پن کے نام سے جانتے تھے...... ازابیلا برڈ...... اس نے ایک سیاح کی حیثیت میں بھی کافی نام کمایا تھا۔ اس نے خطرناک سفر سرانجام دیے تھے اور اپنی جان کی پرواہ بھی نہ کی تھی۔ اس کے اس کارہائے نمایاں کی بدولت اسے یہ اعزاز حاصل ہوا تھا کہ وہ رائل جغرافیائی سوسائٹی کی پہلی خاتون رکن بنی تھی۔ اس نے انتہائی مستند کتب بھی تحریر کی تھیں۔ یہ کتب اس کی ان مہمات کے بارے میں تھیں جو اس نے سرانجام دی تھیں۔ اس کی شہرت ملک اور بیرون ملک پھیلی ہوئی تھی۔

وہ حوصلے اور جرأت کی ایک علامت تھی۔ اس نے نہ صرف اپنی مہمات کے دوران حوصلے اور جرأت کا مظاہرہ کیا تھا بلکہ اپنی بیماری کے ضمن میں بھی حوصلے اور جرأت کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ ریڑھ کی ہڈی کی تکلیف میں مبتلا تھی۔ اس کی اس بیماری کی تشخیص ممکن نہ تھی اور مسلسل درد اس کا مقدر بن چکی تھی۔ وہ ایک آپریشن کے عمل سے بھی گزر چکی تھی جو کہ بدقسمتی سے ناکام ثابت ہوا تھا۔ اسے بے خوابی کا مرض بھی لاحق تھا۔

اس نے مغربی تبت سے یہ تحریر کیا تھا کہ:۔

> ''میں اکثر اپنے آپ کو موت کے انتہائی قریب محسوس کرتی تھی۔ میں اس سفر کا کبھی ارادہ نہ کرتی اگر مجھے اس سفر کے مصائب کے بارے میں علم ہوتا۔ لمبی لمبی پیش قدمی...... ناقص خوراک...... ناقص رہائش گاہ...... گندہ پانی...... وحشی لوگ......''

اس کا جذبہ اس کی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ بڑھتا رہا...... اس جذبے کی جڑیں اس مذہبی ماحول میں پیوست تھیں جس مذہبی ماحول میں اس کی پرورش ہوئی تھی۔ اس کے باپ کا تعلق ایک معروف خاندان سے تھا اور وہ مذہبی خیالات کا حامل تھا۔ وہ مڈلینڈز میں رہائش پذیر تھا...... مابعد وائیٹن...... ھنٹنگڈن شائر میں مقیم رہا تھا۔ اس کی بیٹی ازابیلا چرچ کی ان سروسوں کو بھلا نہ سکی تھی جن کے دوران اسے تادیر کھڑا رہنا پڑتا تھا اور اس کی کمر دکھنے لگتی تھی۔

بچپن میں چونکہ وہ ایک بیمار بچہ تھی لہٰذا فیملی ڈاکٹر اس کے لئے تبدیلی آب و ہوا کی سفارش کرتا تھا۔ جب اس کی عمر 18 برس کی ہوئی تب

اس کی ریڑھ کی ہڈی کے قریب واقع ایک رسولی بذریعہ آپریشن نکالی گئی۔ اس کی صحت یابی کی غرض سے اس کا باپ اسے ہائی لینڈز لے گیا۔ ازابیلا اور اس کی ہمشیرہ کئی برس تک ٹوبر موری میں مقیم رہیں۔

جب ازابیلا کی عمر 21 برس کی ہوئی تب اس کے اندر مہمات سرانجام کی دینے کی خواہش نے جنم لیا۔

23 برس کی عمر میں اس نے اپنا پہلا طویل سفر سرانجام دیا۔ یہ ایک بحری سفر تھا۔ یہ سفر اس نے طبی نکتہ نگاہ کے حوالے سے سرانجام دیا تھا۔ اس کے باپ نے اسے 100 پونڈ دیے تھے اور کہا تھا کہ:۔

"جب تک یہ رقم ختم نہ ہو جائے اس وقت تک تم بیرون ملک قیام کر سکتی ہو۔"

اس نے نوواسکوٹیا کا رخ کیا۔ وہ لیور پول سے بحری سفر پر روانہ ہوئی۔ اسکاٹ لینڈ کے کچھ باشندے کرائمیا کے لئے جہاز پر سوار ہو رہے تھے۔ اس وقت شمالی امریکہ کا رخ کرنا خطرے سے خالی نہ تھا کیونکہ کینیڈا اور امریکہ کے ایک بڑے حصے میں ہیضہ کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔

اس نے مابعد تحریر کیا کہ:۔

"میں نے دو ہفتے نیو یارک میں گزارے...... تین ہفتے فلاڈیلفیا میں گزارے...... دو ماہ غلام ریاستوں میں گزارے...... ورجینیا...... جنوبی کارولینا اور جارجیا...... دو ہفتے واشنگٹن میں گزارے۔ ان دنوں کانگرس کا اجلاس جاری تھا...... ایک ماہ بوسٹن کے قریب گزارا...... ایک ہفتہ لونگ فیلو میں گزارا...... دو ہفتے البانی میں گزارے...... ایک ہفتہ نیاگرا میں گزارا...... دو ہفتے ٹورنٹو میں گزارے...... ایک ماہ بش میں گزارا...... چھ ہفتے مغرب بعید کے دورے میں گزارے...... اس دوران میں نے 2,000 میل کا سفر طے کیا اور اس دوران میں چار ہفتوں سے زائد عرصے تک کسی مقام پر قیام پذیر نہ رہی...... آب و ہوا کی تبدیلی میری صحت پر خوشگوار اثرات مرتب کرنے کا موجب ثابت ہو سکتی تھی۔"

بحالی صحت کے مدنظر مابعد اس نے کولوراڈو کا رخ کیا تاکہ وہ پہاڑوں کی شفاف ہوا سے مستفید ہو سکے۔ اس نے گھوڑ سواری کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ وہ زیادہ تر گھوڑ سواری سرانجام دیتی تھی۔ اس کا قد پانچ فٹ سے بھی کم تھا لیکن اس کے باوجود بھی وہ فطری وقار کی حامل تھی اور یہی وہ وقار تھا جس نے اسے آزمائش کے کئی ایک لمحات میں سرخرو کیا تھا۔

اس کی فوری منزل ایسٹس پارک تھی جو ایک خوبصورت وادی تھی اور پتھریلے پہاڑوں کے درمیان واقع تھی۔ ایک روز ایک پہاڑی کی ڈھلوان پر چڑھتے ہوئے وہ گھوڑے سے گر پڑی۔ اس حادثے سے قطع نظر بھی وہ گھوڑ سواری کے لئے موزوں نہ تھی اور گھوڑ سواری اس کے لئے ایک تکلیف دہ مشغلہ تھا۔ اس کے پہلے گائیڈ نے جب اس کی گھوڑ سواری کے انداز پر کوئی اعتراض نہ کیا تو وہ حیران رہ گئی۔

ایک روز وہ مسلسل دس گھنٹے سے گھوڑ سواری میں معروف تھی۔ جوں ہی رات سر پر آن پہنچی اس نے ایک کیبن کا رخ کیا جس کی چمنی سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس نے دروازے پر معمولی سا ہی دباؤ ڈالا تھا کہ دروازہ کھل گیا اور اس کی نظر ایک خوفزدہ شخص پر پڑی۔ اس کے بال لمبے تھے لیکن وہ نصف چہرے کا حامل تھا۔ اس کا نصف چہرہ ایک ریچھ نے بگاڑ ڈالا تھا...... اس کی ایک آنکھ بھی ضائع ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے پھیپھڑے

میں تیر لگا تھا اور اس کا پرانا زخم اس کے سانس کی راہ میں رکاوٹ بن رہا تھا۔ اس نے اپنی ٹوپی اتاری اور اس کی تعظیم بجالایا۔

یہ ایک غیر معمولی دوستی کا آغاز تھا اور جلد ہی یہ دوستی اس شخص کی جانب سے رومانوی احساسات میں ڈھل چکی تھی اور ازابیلا الجھن کا شکار ہوچکی تھی۔ اس شخص کا نام جم نوجنٹ تھا۔ وہ آئرلینڈ کا باشندہ تھا۔ ازابیلا اس کی رفاقت میں خوشی محسوس کرتی تھی۔

وہ شخص جس کی رفاقت میں وہ خوشی محسوس کرتی تھی ماؤنٹین جم (پہاڑی جم) کے نام سے مشہور تھا۔ لیکن اس کے لئے وہ ''مسٹر نوجنٹ'' تھا۔ ازابیلا نے ایک خط میں اپنی ہمشیرہ کو بتایا کہ وہ عام مردوں کی نسبت زیادہ بے باک واقع ہوا تھا۔

اس نے اپنی ہمشیرہ کو یہ بھی بتایا کہ ایک حادثے نے اسے جنگل میں بھیج دیا تھا۔ وہ ایک بہتر شخص تھا اور یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ بھی تھا جو تباہ کن عادات کا شکار ہوچکا تھا۔

ازابیلا لونگ کی چوٹی سر کرنا چاہتی تھی (14,000 فٹ بلند چوٹی) اور ماؤنٹین جم نے اس کا ساتھ دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس چڑھائی سے ماسوائے تھکن کچھ حاصل وصول نہ ہوا۔ اس نے ٹوبرموری سے اپنی ہمشیرہ کو ایک خط تحریر کرتے ہوئے لکھا کہ:۔

''یہ مسٹر نوجنٹ کی قوت ارادی تھی جس کے بل بوتے پر وہ اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے میں کامیاب ہوئی تھی۔''

اس نے مزید تحریر کیا تھا کہ:۔

''اس کا صبر وتحمل اور مہارت کبھی ناکامی کا شکار نہ ہوئی تھی۔''

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی دوستی اس کے لئے کیا اہمیت رکھتی تھی اور لونگ پہاڑی کی چوٹی سر کرنے کے دوران اس نے اپنے لئے اس کی محبت محسوس کی تھی۔

وہ چٹانوں کی حیران کن دنیا کو مزید دیکھنا چاہتی تھی...... یہ دنیا کس قدر جادو بھری دنیا تھی۔ اگرچہ برف باری کا آغاز ہوچکا تھا اور سردی کی آمد آمد تھی لیکن اس کے باوجود بھی وہ انڈین خچر پر سوار ہوچکی تھی۔ اس کا سامان بھی اس کی کاٹھی کے ساتھ بندھا ہوا تھا جس میں سیاہ ریشمی لباس بھی موجود تھا۔ ماؤنٹین جم نے اسے خدا حافظ کہا۔ وہ اس کے گھوڑے پر جھکا اور اسے بتانے لگا کہ:۔

''میں تم سے مل کر ازحد خوش ہوا ہوں...... مس...... انتہائی خوش ہوا ہوں۔ خدا تم پر رحم کرے''

لیکن یہ ان کی آخری ملاقات نہ تھی۔ اس نے ازابیلا سے اصرار کیا کہ وہ اپنے ساتھ ایک پستول ضرور رکھے۔ اس نے سوچا کہ ایک تکلیف دہ حماقت۔

بعد از دوپہر وہ ڈینور پہنچ چکی تھی۔ وہ قصبے سے دور گھوڑ سواری میں مصروف تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن میں بیس برس قبل کے برے دنوں کی یادیں بھی گردش کررہی تھیں۔ اس کی 600 میل پر محیط گھوڑ سواری کے لئے ڈینور ایک بنیادی حیثیت کا حامل تھا۔ اس کی یہ گھوڑ سواری علاقے بھر میں اس کی دھوم مچا سکتی تھی اور اس کی تعریف وتوصیف سرانجام دلوا سکتی تھی کہ ''انگریز خاتون'' گھوڑے کی پشت پر سوار چٹانوں کی تحقیق و تفتیش سرانجام دے رہی تھی۔

وہ ایک ایسی سڑک پر پہنچ چکی تھی جو چٹانی پہاڑوں کی بدترین سڑک کہلاتی تھی۔ اس نے برفانی طوفانوں کی بھی پرواہ نہ کی اور اپنا سفر جاری رکھا۔ اس دوران اس کی ملاقات کو مانچ بل سے ہوئی جس کے والدین کو ریڈ انڈین نے ہلاک کر دیا تھا اور وہ ان سے بدلے لینے کی فکر میں سرگرداں تھا۔ اس کے بال اس کے سینے تک دراز تھے۔ اس کی پیٹی میں پستولیں سجی ہوئی تھیں۔ ازابیلا کے ساتھ وہ بے تکلفی اور ادب آداب کے ساتھ پیش آیا۔

طویل گھوڑ سواری کے بعد وہ ڈینور واپس لوٹ رہی تھی۔ اس نے اس وقت تک آرام نہ کیا جب تک اسے گرین جھیل نظر نہ آ گئی۔ یہاں پر جب اس نے کرایے پر ایک گھوڑا حاصل کرنے کی کوشش کی تو اسے بتایا گیا کہ جھیل کی جانب جانے والا راستہ ایک دشوار گزار راستہ تھا۔

تب وہ مالی بحران کا شکار ہو گئی۔ اس کے مالی بحران کی خبر ڈینور کے بینکوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔ لہٰذا انہوں نے اپنے دروازے اس پر بند کر دیے تھے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اسے ایسٹس پارک واپس چلے جانا چاہیے جہاں پر اسے خوراک اور چھت کا سہارا میسر آ سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے رخت سفر باندھا اور ماؤنٹین جم کے کیبن جا پہنچی۔ اس کے بعد پیش آنے والے حالات کا تذکرہ اس خط سے ماخوذ ہے جو اس نے اپنی ہمشیرہ کو تحریر کیا تھا۔

اندھیرے میں اس کے کیبن کے پاس پہنچ کر اس نے اس کے کتے کا نام لے کر پکارا تھا اور اس کے جواب میں کتے کے بھونکنے کی آواز اس کے مالک کی موجودگی کی خبر دے رہی تھی۔ اس آواز کے بعد جم نوجنٹ بذات خود اس کے استقبال کے لئے نمودار ہوا۔ اس نے ایک مویشی خانے تک اس کی رہنمائی کی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنی مالی حالت درست ہونے تک یہیں پر مقیم رہے گی۔ اس مویشی خانے کے مالکان کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ اس نے اس مویشی خانے کی نگرانی کی ذمہ سنبھال لی۔ دو نوجوان شکاریوں نے اس مویشی خانے کو اپنا عارضی ہیڈ کوارٹر بنا رکھا تھا۔

''ان نوجوانوں نے جس مہربانی اور خوشگوار احساسات کا اظہار کیا ان کے اس عمل در آمد میں کوئی بھی ان سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔''

ان خیالات کا اظہار اس نے اپنے خط کی تحریر میں کیا تھا۔ وہ اس مویشی خانے میں خوش تھی اور پانچ ہفتوں تک اس نے اس کی نگرانی کے فرائض سرانجام دیے تھے۔ اب اس کے پاس یہ موقع موجود تھا کہ وہ رات اپنا سیاہ لباس زیب تن کرے۔

ماؤنٹین جم کیلئے بھی یہ ایک اور موقع تھا۔ ایک روز وہ گھوڑ سواری میں مصروف تھے کہ ایک شدید برفانی طوفان کی زد میں آ گئے۔ اس نے اسے بتایا کہ اس کی حالیہ عدم موجودگی اس کے لئے از حد تکلیف دہ ثابت ہوئی تھی کیونکہ وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ اس نے اپنے اس اقرار کے بعد ..... یعنی اقرار محبت کے بعد اسے اپنی زندگی کی داستان بھی سنائی۔ اس کی داستان میں کچھ ایسے واقعات بھی شامل تھے جن کی وجہ سے وہ کئی راتوں تک سکون کی نیند سے محروم رہی تھی۔

اس نے مابعد اپنی ہمشیرہ کو بتایا کہ:۔

''وہ ایک ایسا آدمی ہے جس کے ساتھ میں شادی کر سکتی تھی۔''

اس نے اپنی ایک آخری گفت وشنید کے دوران اس پر یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتی کہ وہ اس کے ساتھ خوش رہ سکتی تھی۔

''اس کی وجہ وسکی بھی تھی''

شراب نوشی اور گرم مزاجی اس کی زندگی کا ایک لازمی حصہ تھی۔ اس نے کوشش کی کہ اسے سیدھی راہ پر لگا دے۔ اس کی سوانح حیات تحریر کرنے والے لکھاری کے بقول:۔

''وہ تمام تر بری عادات سے دست بردار ہو گیا تھا...... شراب نوشی...... لڑائی جھگڑے...... ہلاکت خیز لڑائیاں...... سب سے دست بردار ہو گیا تھا اور وہ ایک شریف نوجوان کے روپ میں ڈھل گیا تھا...... ہمدرد اور غم خوار نوجوان......''

جب ان کی جدائی کا لمحہ آیا تب وہ توڑ پھوڑ کا شکار ہو کر رہ گیا۔ اس نے اصرار کیا کہ:۔

''میں دوبارہ ضرور تم سے ملوں گا۔''

ازابیلا نے بھی جواب دیا کہ:۔

''میں ضرور تم سے ملوں گی۔''

ایک برس بعد ازابیلا واپس یورپ پہنچ چکی تھی اور اپنی سہیلیوں کے ہمراہ سوئٹزرلینڈ کے ایک ہوٹل میں مقیم تھی۔ ایک صبح وہ اپنے بستر پر دراز تھی جب موئٹین جم اس کے سامنے ظاہر ہوا۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑا تھا۔ وہ اس کے سامنے جھکا اور غائب ہو گیا۔ وہ گرف ایونز نامی ایک شخص کے ساتھ لڑتا ہوا گولی لگنے سے ہلاک ہو چکا تھا اور یہ واقعہ اسی روز پیش آیا تھا جس روز وہ اس کے سامنے ظاہر ہو کر غائب ہوا تھا۔

اس دوران اس کی کتاب

''چٹانی پہاڑوں پر ایک خاتون کی زندگی''

اشاعت کے لئے تیار تھی۔ اس کی اشاعت کا بندوبست اس کے دوست جان مُرے نے کیا تھا۔ ازابیلا جاپان میں تھی اور ایک ایسے سفر کے آغاز میں مصروف تھی جو اسے ایک مثالی خاتون سیاح کی حیثیت سے نوازنے کے لئے کافی تھا۔ وہ اکابرین جنہوں نے اسے رائل جغرافیائی سوسائٹی کا فیلو بنایا تھا نہیں جانتے تھے کہ اس کی تازہ ترین مہم کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنے اور جس شخص کے ساتھ اس نے مابعد شادی کی...... ڈاکٹر جان بشپ کے درمیان ایک فاصلہ برقرار رکھنا چاہتی تھی اور یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ وہ انسان کی بجائے جنگلوں کو ترجیح دیتی تھی۔

ابھی تک کسی بھی انگریز خاتون نے اکیلے اندرونی علاقے کا سفر سرانجام نہیں دیا تھا...... میرے اس منصوبے میں میرے دوستوں نے ازحد دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے مجھے خبردار بھی کیا اور میری تھوڑی بہت حوصلہ افزائی بھی کی۔''

وہ کیوٹو سے گھر خط تحریر کر رہی تھی جو کہ جاپان کا قدیم دارالخلافہ تھا۔ یہاں سے اس نے شمال کی جانب سفر طے کیا۔ اس نے اپنی پہلی تنہا شام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ:۔

''ایشیائی زندگی بھی عجیب و غریب ہے...... تقریباً خوف ناک...... میں تمام دن پریشانی کا شکار رہی...... خوفزدہ ہونے کی پریشانی...... اور نہ جانے کس کس بات کا خوف مجھے لاحق رہا۔''

نکو پہنچنے کے بعد جو کہ ایک غیر مانوس علاقہ تھا:۔

''میں نے اکثر اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں اپنا منصوبہ ترک کر دوں۔ لیکن مجھے اپنی بزدلی پر شرم محسوس ہونے لگی۔''

اس کا سفری اجازت نامہ بھی مشروط تھا۔ اسے یہ اقرار کرنا پڑا کہ وہ جنگلوں میں آگ نہیں جلائے گی ...... عبادت گاہوں۔ مزاروں یا دیواروں پر کچھ نہیں لکھے گی ...... کھیتوں سے نہیں گزرے گی ...... اور ''یہ شاہراہ عام نہیں ہے'' کے نوٹس کو مدنظر رکھے گی۔ اس کے سفر کے دوران ایسے مراحل بھی آئے جو کٹھن ترین مراحل تھے اور وہ محض دس یا پندرہ میل کا فاصلہ کئی گھنٹوں میں طے کر پائی تھی۔

نظارے دلکش تھے۔ ان کے بارے میں اس نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ:۔

''چٹانی پہاڑ ابھی اپنے دروازے کھول دیں گے اور اس قدر کھولیں گے کہ کوئی فرد ان میں سے گزر سکے اور مابعد دوبارہ بند کر دیں گے۔''

ہاکوڈیٹ کے بعد اس کا جو سفر شروع اس کے بارے میں اس نے تحریر کیا کہ:۔

''ایک تنہا خاتون سیاح کی حیثیت سے ...... اور پہلی یورپی خاتون ہونے کی حیثیت سے جسے کئی ایک ضلعوں میں دیکھا گیا تھا ...... میرے تجربات اپنے پیش روسیاحوں سے مختلف تھے۔''

وہ خرابی صحت کے باوجود بھی اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھی۔

''میری صحت کی صورت حال اس وقت کی صورت حال سے از حد بدتر تھی جس صورت حال کے تحت میں گھر سے نکلی تھی''

جو چیز اسے روبہ عمل رکھنے میں اہم کردار ادا کر رہی تھی وہ اس کے اردگرد پھیلی ہوئی عجیب وغریب زندگی تھی اور بالخصوص اس کا وہ تجسس تھا جو وہ ان پراسرار لوگوں کے بارے میں رکھتی تھی جو بالوں کے حامل اینو کے نام سے جانے جاتے تھے۔

ازابیلا نے اینو کو جاپانیوں سے قطعاً مختلف پایا تھا۔ وہ اسے جاپانیوں سے مختلف نسل کے حامل دکھائی دیتے تھے۔ وہ شکار کرتے تھے اور مچھلیاں پکڑتے تھے۔ ایک اعلیٰ حکام کے مطابق ان لوگوں کی تعداد 200,000 تھی جبکہ ایک اور اعلیٰ حکام کے مطابق ان لوگوں کی تعداد محض 25,000 تھی۔ وہ پہاڑوں میں رہائش پذیر تھے۔ اس کے علاوہ وہ شمالی جاپان کے ساحل پر بھی رہائش پذیر تھے۔ پہاڑی علاقوں میں آباد اینو زیادہ بالوں کے حامل تھے۔

کچھ لوگوں کے خیال میں یہ لوگ شریف تھے ...... اچھی فطرت کے حامل تھے اور تابعدار تھے۔ جاپانیوں کے لئے یہ لوگ بالکل اسی طرح تھے جس طرح امریکنوں کے لئے ریڈانڈین تھے۔ لیکن حقیقت میں ان کے ساتھ ریڈانڈین سے بہتر سلوک کیا جاتا تھا۔

ازابیلا نے ان لوگوں کے درمیان چار ماہ کا عرصہ گزارا تھا اور وہ ان لوگوں کی مکمل تفصیلات سے آگاہ ہونے کا دعویٰ کر سکتی تھی۔

......❁......

سون ہیڈن کے وسطی ایشیا کے سفر

ہیڈن سویڈن کا ایک معروف مہم جو تھا۔ اس کی زندگی بذات خود ایک طویل مہم تھی۔ وہ ان لمحات کو اب بھی یاد کرتا تھا جبکہ اس کے بچپن میں ''ویگا'' نامی جہاز واپس اسٹاک ہوم پہنچا تھا۔ اس وقت وہ پندرہ برس کی عمر کا حامل ایک لڑکا تھا اور ''ویگا'' نے معجزانہ طور پر شمال، مشرق کا بحری راستہ دریافت کر لیا تھا...... یورپ تا بحرالکاہل کا سمندری راستہ۔

یہ ایک پُر لطف سفر تھا کیونکہ جہاز سائبیریا کے قطب شمال کے انتہائی مشرقی سرے پر مکمل طور پر برف میں دھنس گیا تھا۔ جہاز برف میں دھنسا رہا اور دس ماہ کے طویل دورانیے تک دھنسا رہا۔

امریکنوں نے ایک اور امدادی جہاز روانہ کیا اور یہ اس سے بھی بڑے سانحہ کا شکار ہو گیا...... وہ برف میں تباہی و بربادی سے ہمکنار ہو گیا اور اس کا تمام عملہ بھی ہلاک ہو گیا۔

اور تب ''ویگا'' بالکل اچانک برف کی گرفت سے آزاد ہو گیا اور واپسی کے سفر پر روانہ ہوا۔ وہ فاتحانہ انداز میں گھر واپس پہنچ چکا تھا۔ نوجوان سون ہیڈن نے اپنے بھائیوں اور بہنوں کے ہمراہ جہاز کی آمد کی تقریب میں شرکت کی۔ یہ ایک عجیب و غریب لمحہ تھا۔ اس روز 24 اپریل 1880ء تھا جبکہ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور آسمان سیاہ نظر آ رہا تھا۔ دوسری طرف اسٹاک ہوم جہاز کے اعزاز میں روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔

یہ ایک حیران کن لمحہ تھا جیسا کہ برسوں بعد ہیڈن نے تحریر کیا کہ اس لمحے نے اسے مجبور کیا کہ وہ قطب شمالی کے ضمن میں جدوجہد پر مبنی کتب کا مطالعہ سرانجام دے...... نئی اور پرانی کتب......

> ''اپنی شمالی سردیوں کے دوران...... میں برف باری میں گھومتا پھرتا تھا اور رات کو کھڑکیاں کھول کر سوتا تھا تا کہ اپنے آپ کو سخت جان بنا سکوں تا کہ جوں ہی میں جوانی کی حدود کو پہنچوں تو قطب شمالی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوں۔ میں اپنے جہاز کو انسانوں اور کتوں کے ساتھ بھرنا چاہتا تھا اور برف کے میدانوں میں سفر طے کرنا چاہتا تھا...... سیدھا اس جانب جہاں پر محض جنوبی ہوائیں چلتی تھیں۔''

لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے فوراً بعد اس ذہین لڑکے سے یہ دریافت کیا گیا کہ کیا وہ باکو جانا چاہتا تھا اور ایک چھوٹے لڑکے کے ٹیوٹر کے فرائض سرانجام دینا چاہتا تھا جہاں پر اس کا والد ایک انجینئر کی حیثیت سے تعینات تھا؟

یہ قطب شمالی نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی ایک مہم تھی...... اور یہ ایشیا تھا...... ہنوز انجانا ایشیا...... سون ہیڈ نے یہ پیش کش قبول کر لی۔

لہٰذا اس نے اس عظیم اور پر اسرار براعظم کا پہلا تجربہ حاصل کیا...... ایک ایسا تجربہ جو اسے دوبارہ اسی براعظم میں لے گیا...... کبھی کبھار کئی برسوں کے لئے...... حتیٰ کہ اس کی زندگی کے اختتام تک۔

اس نے ایشیا کی تحقیق وتفتیش سرانجام دی...... انتہائی محنت کے ساتھ سرانجام دی...... اس نے یہ کاوش 1893ء میں سرانجام دینی شروع کی جبکہ اس کی عمر محض 28 برس تھی اور پہلی جنگ عظیم کے کافی بعد تک بھی وہ یہ کاوش سرانجام دیتا رہا۔ اس طویل دورانیے کے دوران اس نے وہ مقامات دیکھے جو کسی یورپی نے اس سے پیشتر نہ دیکھے تھے۔

لیکن شاید اس کی عظیم ترین مہم وہ تھی جس میں وہ محض اپنی جان بچانے میں ہی کامیاب ہو سکا تھا۔

یہ 17 فروری 1895ء تھا جبکہ وہ سن کیانگ میں کاشغر کے بلیک ٹاؤن سے روانہ ہوا...... کشمیر کے شمال میں...... تبت کے شمال مغرب میں ...... اس کی منزل مقصود شہر نکلا۔ ماکن تھا...... جو صحرا کی ریت میں دفن تھا۔ اس کے ہمراہ اس کے ایشیائی مزدور اور ملازم تھے اور دو چھکڑے تھے جن کے دو بڑے پہیے تھے اور ان کو چار گھوڑے کھینچتے تھے۔ ان پر چٹائیوں کی چھتیں ڈالی گئی تھیں۔

سفر طے کرتے ایک ماہ گزر چکا تھا۔ اگرچہ ان کے سفر کی رفتار بہتر تھی حتیٰ کہ وہ ایک ایسے مقام پر جا پہنچے جہاں پر ہیڈن نے یہ فیصلہ کیا کہ اب وقت آن پہنچا تھا کہ چھکڑوں اور گھوڑوں سے نجات حاصل کر لی جائے اور ان کی جگہ اونٹ حاصل کئے جائیں کیونکہ جنگل اور نیچی پہاڑیاں پیچھے رہ چکی تھیں اور آہستہ آہستہ صحرا کی ریت منظر عام پر آ رہی تھی۔ وہ جو سفر طے کر کے آئے تھے اس دوران بھی ان کا ریت سے سامنا ہوا تھا لیکن دن کے اختتام پر انہیں کوئی نہ کوئی ندی ضرور نظر آ جاتی تھی۔ اور ہر طرف ریت ہی ریت دکھائی دیتی تھی۔ لہٰذا اس نے آٹھ اونٹ خرید لئے۔

اگرچہ یہ عمل درآمد ایک سادہ سا عمل درآمد دکھائی دیتا تھا لیکن تجربہ کار ہیڈن کی نگاہ میں یہ عمل درآمد ایک سادہ سا عمل درآمد نہ تھا۔ جب انہوں نے آٹھ اونٹ خرید لئے اور ان کے آدمی ان کو چلانے لگے اس وقت 10 اپریل تھی۔ اس صبح ان کا چھوٹا سا قافلہ عازم سفر ہوا۔ ان کے جذبے جوان تھے۔ انہوں نے سرکٹ کے دیہات سے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اونٹ اچھلتے کودتے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ وہ درپیش آنے والے خطرے سے بے نیاز تھے۔ جوں ہی وہ اچھلے کودے ان پر لدا ہوا بوجھ ریت پر آن پڑا اور اسے دوبارہ اونٹوں پر لادنا پڑا اور رسے باندھنے پڑے۔ یہ کام کافی محنت طلب ثابت ہوا۔

یہ قافلہ ایک ترتیب کے ساتھ رواں دواں تھا...... چار چار اونٹوں کے دو گروپ تھے۔ ہیڈن بذات خود ''بوگھرا'' کی پشت پر سوار تھا جو دوسرے گروپ کا لیڈر تھا۔

پہلی شام غیر متوقع طور پر وہ ایک گہرے نالے پر جا پہنچے۔ اس مقام پر انہوں نے خیمے نصب کئے اور کھانا تیار کیا جو گوشت اور چاولوں پر مشتمل تھا۔ ایک گھنٹے تک وہ ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کو اپنی ہی آگ کی روشنی میں دیکھتے رہے۔ اس کے بعد یہ جماعت اپنے کمبلوں میں گھس گئی۔

اگلی صبح 11 اپریل تھی۔ چند افراد جو مرکٹ سے ان کے ساتھ بطور گائیڈ آئے تھے وہ اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ یہ جماعت بھی اونٹوں پر سوار ہوئی اور عازم سفر ہوئی۔ جلد ہی وہ ریت کے ٹیلوں کے درمیان تھے۔ لگاتار چلنے والی ہوا نے ریت کی بڑی بڑی پہاڑیاں کھڑی کر دی

تھیں۔اونٹوں نے اپنے پاؤں ان پہاڑیوں پر رکھ دیے جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ اونٹ گر پڑے اور ایک مرتبہ پھر ان پر لدا ہوا سامان بھی بکھر گیا جسے دوبارہ اونٹوں پر لادنا پڑا۔اس رات جماعت کا کوئی فرد بھی خوش نہ تھا اور سفر مشکل اور تکلیف دہ دکھائی دینے لگا تھا۔

بہرکیف انہوں نے سفر جاری رکھا اور 14 اپریل کو وہ ایک صاف اور میٹھے پانی کے تالاب پر پہنچ چکے تھے۔انہوں نے جی بھر کر پانی پیا......انسانوں اور جانوروں دونوں نے جی بھر کر اپنی پیاس بجھائی...... پانی کی بوتلیں بھریں......اور وہاں سے آگے روانہ ہو گئے۔اس کے بعد انہیں آٹھ روز بعد مزید پانی میسر آیا تھا۔

23 اپریل کو انہیں دوبارہ پانی میسر آیا۔وہ صبح سویرے اپنے سفر پر روانہ ہوئے تھے......انہوں نے اپنا سفر جنوب' مشرق کی جانب جاری رکھا ہوا تھا۔اونٹ بھی رواں دواں تھے اور خاموشی کے ساتھ سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔ہوا چل رہی تھی اور جوں جوں سورج بلند ہو رہا تھا اس کی شدت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔کچھ دیر تک ہوا شدت کے ساتھ چلتی رہی۔اب ان کے چاروں جانب ریت کے ٹیلے وجود میں آ چکے تھے۔محتاط انداز میں سفر جاری رکھتے ہوئے وہ ان کے درمیان سے اپنا راستہ بنا سکتے تھے۔

25 اپریل کی صبح سانحہ کا پہلا اشارہ مل چکا تھا۔جماعت نیند سے بیدار ہوئی۔سامان اونٹوں پر لادا اور سفر کیلئے تیاری مکمل کی لیکن شمال، مغرب کی جانب سے تیز ہوا چلنے لگی۔ہوا میں ریت کے ذرات کی آمیزش تھی۔ہر طرف ریت پھیل چکی تھی اور کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔

اور تب ہیڈن نے محسوس کیا کہ پانی کا ٹینک جسے دو اونٹ کھینچ رہے تھے وہ خالی تھا۔اس نے اپنے آدمیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:۔

''پانی کا ٹینک تقریباً خالی ہے۔کیا میں نے تمہیں اسے بھرنے کیلئے نہیں کہا تھا جب ہم نے پچھلی منزل پر پانی کے پاس پڑاؤ ڈالا تھا''

ایک ملازم نے جواب دیا کہ:۔

''بالکل درست ہے مالک......آپ نے اسے بھرنے کے لئے کہا تھا۔اور اللہ آپ کا ساتھ دے۔''

ہیڈن نے دریافت کیا کہ:۔

''کیا تم نے اسے بھرا تھا؟''

ملازم نے جواب دیا کہ:۔

''مالک......اللہ آپ کا ساتھ دے۔ہمیشہ ہمیشہ کیلئے......''

ہیڈن نے جواب دیا کہ:۔

''اگر یہ ٹینک پانی سے بھرے گئے تھے تب کسی نے ہمارے ساتھ فریب کیا ہے...... مجھے فوراً جواب دو......کیا یہ ٹینک بھرے گئے تھے؟''

اور یہ حقیقت واضح ہوئی کہ ٹینک بھرے ہی نہ گئے تھے۔لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہ تھی کیونکہ ٹینکوں میں کسی قدر پانی موجود تھا اور پھر چند

دنوں کے سفر کے بعد وہ دریائے کھوتن تک پہنچنے والے تھے۔

اگرچہ سون ہیڈن غیر ملکی اور یورپی باشندہ تھا لیکن وہ وسطی ایشیا کے صحراؤں میں سفر کرنے کا زیادہ تجربہ رکھتا تھا اور اس میدان میں اپنے ملازمین کی نسبت زیادہ تجربہ کار تھا۔ لہٰذا اس نے فوراً یہ حکم دیا کہ ہر ایک شخص کے لئے پانی کا راشن مقرر کیا جائے اور اونٹوں کو پانی پلانے پر مکمل پابندی عائد کر دی۔ اس طرح اونٹوں کے کمزور ہو جانے کا خدشہ تھا۔ لہٰذا ہیڈن نے یہ حکم بھی جاری کیا کہ اگلی کسی منزل پر پانی کی دستیابی تک تمام لوگ پیدل سفر طے کریں گے۔

ان کی حالت قابل رحم تھی لیکن وہ اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہوا کے چلنے کی رفتار بھی بڑھ رہی تھی اور اس میں شدید اضافہ ہوتا چلا رہا تھا اور ریت کے ٹیلے اونچے ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ہیڈن نے اندازہ لگایا کہ ان میں سے کچھ ٹیلے 150 فٹ سے زیادہ اونچائی کے حامل تھے اور کسی بھی اونٹ کے لئے یہ موقع نہ تھا کہ وہ ان کو عبور کر سکے خواہ وہ کتنا ہی تازہ دم کیوں نہ ہو اور اس نے خوب سیر ہو کر پانی کیوں نہ پیا ہوا۔ معمولی سفر طے کرنے کے بعد انہوں نے ایک ٹیلے کے سایے میں اپنا خیمہ نصب کر لیا لیکن رات ہونے سے قبل وہ بذات خود یہ دیکھنے کے لئے نکل کھڑا ہوا کہ قریب کہیں پانی ملنے کے کوئی آثار نظر آ رہے تھے یا نہیں...... کیونکہ وہ جانتا تھا کہ موجودصورت حال کے تحت اس کی جماعت زندہ سلامت دریائے کھوتن تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ لہٰذا وہ قریب واقع کسی نخلستان کی تلاش میں تھا۔ اس دوران سورج بھی غروب ہونے کو تھا لیکن اسے دور دور تک زندگی یا پانی کے کوئی آثار نظر نہ آئے تھے۔

وہ بوجھل دل لئے اگلی صبح پھر عازم سفر ہوئے۔ انہوں نے دو اونٹ اسی منزل پر چھوڑ دیے تھے۔ اونٹوں کو مرنے کیلئے وہاں پر چھوڑ دیا گیا تھا اور چند دنوں کے اندر اندر انہوں نے موت سے ہمکنار ہو جانا تھا۔

ہوا چلنا بند ہو چکی تھی۔ وہ ریت کے ان ٹیلوں کے پاس جا پہنچے تھے جو ان ٹیلوں سے کافی نیچے تھے جن کو عبور کرنے کی جدوجہد وہ کرتے رہے تھے۔ امیدیں ایک مرتبہ پھر جوان ہوئیں اگرچہ وہاں پر دور دور تک پانی کے کوئی آثار نظر نہ آ رہے تھے۔ وہاں پر جلتی ہوئی ریت کے سمندر کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ انہوں نے ابھی ایک گھنٹے تک سفر طے کیا تھا کہ اس کے سامنے پھر ریت کے ایسے ٹیلے موجود تھے جن کی اونچائی 50 فٹ سے 200 فٹ تک تھی۔ ریت کے اتنے اونچے ٹیلے ہیڈن اور اس کے ساتھیوں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ یہ ٹیلے اس قدر اونچے تھے کہ انہوں نے سورج کی روشنی کا راستہ روک رکھا تھا۔

تب اچانک...... بالکل اچانک طوفانی بادل نمودار ہوئے۔ ان لوگوں کا مورال بلند ہوا اور انہوں نے بارش کا پانی محفوظ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ لیکن بارش نہ برسی...... بادل بھی چھٹ چکے تھے اور ان کی جگہ جلتا ہوا سورج لے چکا تھا۔

یہ لوگ سخت مایوسی کا شکار تھے۔ اسی مایوسی کے عالم میں ایک شخص کو عربی زبان میں یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ:۔

"ہم سب موت کا شکار ہو جائیں گے کیونکہ ہم ایک ہی دائرے کے گرد گھوم رہے ہیں جیسے کہ وہ تمام لوگ گھومتے ہیں جو صحرا میں موت کا شکار ہوتے ہیں...... ہم اس راستے سے پہلے بھی گزر چکے تھے...... آج......"

ایک دوسرے شخص نے سوال کیا کہ:۔

''تب ہمیں قدموں کے نشانات کیوں نظر نہیں آ رہے...... ہمارے اپنے قدموں کے نشانات؟''

پہلے شخص نے جواب دیا کہ:۔

''احمق...... وہ اس لئے نظر نہیں آ رہے کہ ہوا نے انہیں مٹا دیا ہے...... ان پر ریت بکھیر دی ہے۔''

ہیڈن چلایا کہ:۔

''اپنی بکواس بند کرو!''

کیونکہ اس قسم کی بحث خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ یہ ایک حماقت تھی...... خطرناک حماقت...... لہٰذا اس بحث کو ختم ہونا چاہئے تھا۔

ہیڈن نے اپنے آدمیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:۔

''میری بات غور سے سنو...... ہم میں کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو یہ خیال کر رہے ہیں کہ ہم اس جانب نہیں بڑھ رہے جس جانب ہم بڑھنا چاہتے ہیں اور یہ کہ ہم اب صحرا کے رحم و کرم پر ہیں اور ایک ہی دائرے میں گھوم رہے ہیں...... تم بھی کچھ سوچ رہے ہو؟''

مکمل خاموشی طاری رہی۔

ہیڈن نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ:۔

''اگر ایسا ہی ہے تب سورج کیوں ہمیشہ ہمارے دائیں ہاتھ کی جانب رہا ہے...... ہر روز اور ہر دوپہر وہ بالکل ہمارے دائیں ہاتھ کی جانب ہوتا ہے اور ہر وقت ہمارے جسم کی دائیں جانب ہوتا ہے؟ اگر ہم واقعی ایک ہی دائرے کے گرد گھوم رہے ہوتے تب کیا ایسا ممکن ہو سکتا تھا؟ بے شک تب ایسا ممکن نہ تھا۔''

اب بھی خاموشی چھائی رہی۔

ہیڈن نے پھر کہا کہ:۔

''مجھے جواب دو...... سورج کیوں ہمیشہ ہماری دائیں جانب رہا ہے؟ کیا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ناک کی سیدھ میں سفر کر رہے ہیں...... اور جنوب، مشرق کی جانب سفر کر رہے ہیں؟''

ایک آواز سنائی دی کہ:۔

''اس کا مطلب ہے کہ سورج پاگل ہے''

ہیڈن ان لوگوں کو یہ سمجھانے سے قاصر تھا کہ وہ درست سمت میں سفر طے کر رہے تھے اور انہوں نے اگلے دو دنوں تک اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ وہ پیاسے تھے اور ان کی حالت قابل رحم تھی اور 28 تاریخ کو ریت کا ایک اور طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت روشن دوپہر تھی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے رات جیسی تاریکی چھا چکی تھی۔ ہوا شدید تھی۔ ریت کے ذرات ان کی آنکھوں اور کانوں میں گھس رہے تھے...... ان کے جسموں کا گوشت

کاٹ رہے تھے...... ہوا کی گھن گرج اس قدر شدید تھی کہ اس گھن گرج میں کوئی اور آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ اب سفر جاری رکھنا ممکن نہ تھا اور قیام کرنا اپنے آپ کو زندہ ریت میں دفن کرنے کے مترادف تھا۔ لہٰذا انہوں نے تھوڑی بہت حرکت جاری رکھی۔

طوفان کی شدت میں کمی آ چکی تھی اور اس شام ہیڈن نے یہ حکم دیا کہ ساز و سامان سے دست برداری اختیار کر لی جائے۔ اس نے اپنے سائنسی آلات کو بھی خدا حافظ کہا...... اپنے ذاتی سامان کو بھی خدا حافظ...... اونٹ ابھی تک پانی سے محروم تھے۔ لہٰذا ان کو مکھن کھلانے کا فیصلہ کیا گیا۔

ان لوگوں نے تمام ڈبہ بند خوراک بڑے جوش و خروش کے ساتھ کھائی اور اگرچہ وہ اس وقت قابل رحم حالت کا شکار تھے لیکن اس کے باوجود بھی انہوں نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور یہ یقین دہانی حاصل کرنے کے بعد خوراک پر ہاتھ صاف کیا کہ کہیں یہ ممنوعہ گوشت کی حامل تو نہ تھی۔ ان کی زبانیں پیاس کی شدت کے باعث سیاہ پڑ چکی تھیں اور سوج بھی چکی تھیں اور ان کو غذا چبانے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ ان کو کسی ایسی چیز کی ضرورت تھی جو ان کی پیاس بجھا سکے۔

30 اپریل کو ہیڈن نے اپنی ڈائری تحریر کی۔ اس کے خیال میں یہ تحریر اس کی آخری تحریر بھی ثابت ہو سکتی تھی:۔

میں ریت کے ایک ٹیلے پر کھڑا ہوں جہاں پر ہم نے اونٹوں سے دست برداری اختیار کی تھی۔ میں نے فیلڈ گلاس سے اطراف کا معائنہ کیا لیکن چاروں جانب ریت کی پہاڑیوں کے علاوہ مجھے کچھ نظر نہ آیا...... زندگی کے کوئی آثار واضح نہیں ہیں...... تمام لوگ اور اونٹ انتہائی کمزور ہو چکے ہیں...... خدا ہماری مدد کرے۔"

اگلے روز پیاس کی شدت سے اس پر اچانک پاگل پن کا دورہ پڑا۔ اس نے سپرٹ کی وہ بوتل تھامی جو اسٹو و جلانے کیلئے موجود تھی اور اس میں سے سپرٹ کا ایک بڑا گھونٹ اپنے حلق سے نیچے اتار لیا۔ اس عمل در آمد کے بعد وہ موت کے قریب جا پہنچا تھا۔ ایک لمحے بعد وہ زمین پر گر چکا تھا۔ دیگر لوگ بھی اس قدر کمزور ہو چکے تھے کہ وہ اسے سنبھال نہ سکے...... انہوں نے اس کی جانب دیکھا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ موت کو سینے لگا رہا تھا اور آگے بڑھ گئے۔

وہ چند لمحوں تک وہاں پر پڑا رہا اور یہ چند لمحے اسے چند دن محسوس ہو رہے تھے۔ سورج اس کے گھومتے سر پر آگ برسا رہا تھا۔ تب اس نے ایک مافوق الفطرت انسان کی طرح جد و جہد سرانجام دی اور زبردستی اٹھا اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا اور ریت پر چلتا ہوا اپنے قدم آگے بڑھانے لگا۔ ایک گھنٹے بعد وہ اپنے قافلے سے جا ملا اور منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر ان میں شامل ہو گیا۔ دونوں طرف سے کسی بھی قسم کے جذبے کا اظہار نہ کیا گیا۔ لیکن سورج جب ایک مرتبہ پھر غروب ہوا تب اس نے اپنی جماعت کو رکنے کا حکم دیا:۔

"ہم اب آرام کریں گے...... لیکن محض ایک گھنٹے تک کے لئے...... آج رات جب سورج کی تپش اپنے اختتام کو پہنچ جائے گی تب ہم اپنا سفر شروع کریں گے...... تمام رات سفر جاری رکھیں گے...... یہ ہمارے لئے آخری موقع ہے کہ ہم موت کو گلے لگانے سے پیشتر دریائے کھوتن تک پہنچ جائیں"۔

اس رات کچھ لوگوں نے اونٹ کا پیشاب پی لیا اور کئی گھنٹوں تک معدے کی تکلیف کی وجہ سے تڑپتے رہے۔ اگلی صبح وہ لوگ جنہوں نے اونٹ کا پیشاب پیا تھا اور دیگر لوگ جو اس حرکت سے باز رہے تھے...... دونوں گروپ مزید سفر کرنے کے قابل نہ رہے تھے۔ چار مزید اونٹ پچھلی

منزل پر مرنے کیلئے چھوڑ دیے گئے تھے۔ ہیڈن اپنی مختصری جماعت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا رات بھر کا سفر ناکامی کا شکار ہو چکے تھے۔ اس سفر کی ناکامی میں ان لوگوں کا ہاتھ تھا جنہوں نے اونٹ کا پیشاب پیا تھا اور تکلیف میں مبتلا ہوئے تھے اور ان کی نگہداشت کیلئے دیگر لوگوں کو بھی رکنا پڑا تھا۔ ہیڈن کا خیال تھا کہ اب مزید تاخیر ان کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ لہٰذا اس نے کہا کہ:۔

''ہم اکیلے اکیلے ہی سفر جاری رکھیں گے...... ہر شخص محض اپنے لئے سفر جاری رکھے گا اور پہلا شخص جسے پانی دستیاب ہو جائے...... وہ واپس پلٹ آئے اور باقی لوگوں کی مدد سرانجام دے۔''

تین شخص باقی بچے تھے اور ان کے پاس اونٹ کوئی نہ تھا۔

3 مئی کو امید کی پہلی کرن نظر آئی۔ انہیں ایک چھوٹا سا سرسبز پودا دکھائی دیا جو ان کیلئے کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ انہوں نے اس کے پتے توڑے اور اپنے جسموں پر ملے اس امید کے ساتھ کہ ان کی جلد کو کچھ نمی میسر آ سکے۔ کچھ ہی دور انہیں کچھ اور پودے نظر آئے۔ انہوں نے پھر اپنے پہلے والے عمل کو دہرایا۔

لیکن جلد ہی وہ لوگ تین سے کم ہو کر دو رہ چکے تھے...... ہیڈن اور اس کا وفادار ملازم اسلام۔

اسلام بھی ڈھیر ہو چکا تھا اور ہیڈن تنہا ہی آگے بڑھ گیا۔ تب اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ ایک اور شخص اس کے ساتھ آن ملا...... یہ شخص مرنے کیلئے پیچھے رہ گیا تھا۔ اس کا نام قاسم تھا۔

قاسم دوبارہ گر چکا تھا اور اس کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ہیڈن تنہا آگے بڑھ رہا تھا۔ اب مزید درخت نمودار ہو رہے تھے جو اس بات کی علامت تھے کہ کچھ فاصلے پر جنگل واقع تھا...... لیکن اسے دیکھنا مشکل تھا۔ ہیڈن نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔

اور اچانک وہ منزل مقصود تک پہنچ چکا تھا...... یہ دریائے کھوتن کا کنارہ تھا۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ خدا نے دریا کا کنارہ اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ اسے اس کنارے تک پہنچنے کیلئے مزید ایک سو گز کا سفر طے کرنا تھا...... آخری ایک سو گز کا سفر...... بالآخر وہ اس سو گز کا سفر بھی طے کر چکا تھا۔ اس نے جی بھر کر پانی پیا...... اپنی پانی کی بوتل میں پانی بھرا اور دیگر لوگوں کی تلاش میں واپس پلٹا۔

جلد ہی اسے قاسم دکھائی دیا۔ اس نے پانی کی آدھی بوتل اسے پلا دی اور دوبارہ دریا پر جا پہنچا تاکہ اسے دوبارہ بھر سکے لیکن اس کے بعد اندھیرا چھا چکا تھا اور وہ دوبارہ قاسم کو نہ ڈھونڈ سکا۔ اگلے روز بھی اسے قاسم نظر نہ آیا۔ اگلے دن کے خاتمے پر اسے چرواہوں کا ایک گروہ نظر آیا۔ انہوں نے اسے کھانا کھلایا اور دودھ بھی پلایا اور کچھ دنوں تک اسے اپنا مہمان بنائے رکھا۔ اس دوران اس کی توانائی بحال ہو چکی تھی۔ اسے امید تھی کہ قاسم بھی محفوظ ہوگا اور وہ یہ دعا بھی کر رہا تھا کہ قاسم تو محفوظ ہو۔ اس نے آدھی بوتل پانی پیا اور آگے چل دیا۔

اور 10 مئی کو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ وہ نہ صرف قاسم کو ڈھونڈ چکا تھا بلکہ اسلام بھی اسے مل چکا تھا...... وہ بھی محفوظ تھا اور چرواہوں کے ایک اور گروہ میں موجود تھا۔ انہوں نے باہم مل کر دیگر افراد کی تلاش کا کام شروع کیا لیکن انہیں کوئی اور آدمی نہ مل سکا۔ سویڈن کا یہ عظیم مہم جو اپنا مدفون شہر تلاش نہ کر سکا...... لیکن وہ واپس کاشغر پہنچ گیا...... وہ کئی ماہ بعد واپس کاشغر پہنچ سکا تھا...... اور تھکا ماندہ دکھائی دیتا تھا۔

میری کنگزلی مغربی افریقہ میں

میری ہنیریٹا کنگزلی اگست 1893ء میں ''لاگوس'' نامی بحری جہاز میں سوار ہوئی...... یہ جہاز لیورپول کا ایک تجارتی جہاز تھا جو مغربی افریقی بندرگاہوں پر تجارتی سرگرمیاں سرانجام دیتا تھا۔ اس نے حسب معمولی ایک لمبا سیاہ اسکرٹ اور سفید بلاؤز زیب تن کر رکھا تھا۔ اس قسم کا لباس وہ اپنی تمام تر مہمات کی سرانجام دہی کے دوران زیب تن کرتی تھی۔ وہ مغربی افریقہ کے خطرناک جنگلوں...... دلدلی علاقوں اور دریاؤں میں اپنی مہمات سرانجام دینے کی عادی تھی۔ تاجر پیشہ حضرات اور آبائی باشندے دونوں اس سے خوش تھے۔ اس نے بہت جلد نہ صرف عزت کمائی تھی بلکہ انتہائی تعریف وتوصیف بھی پائی تھی۔ انجانی سرزمین پر اپنے طویل سفر کے دوران وہ جس سے بھی باہم روابط ہوتی وہ اس کی تعریف کرتے نہ تھکتا تھا۔ دوران مہم مصائب کو وہ خندہ پیشانی اور انتہائی حوصلے اور جرأت کے ساتھ برداشت کرتی تھی۔ اس کے دور کی خواتین مہمات کی سرانجام دہی کے لئے کم ہی راغب ہوتی تھیں۔

اس نے 13 نومبر 1862ء کو ازلنگٹن میں جنم لیا تھا۔ میری کنگزلی نے اپنی ابتدائی زندگی ایک گھریلو عورت کی طرح گزاری تھی۔ وہ اپنی والدہ اور بھائی کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ اس کا باپ ڈاکٹر جارج ہنری کنگزلی بھی ایک معروف سیاح تھا۔ وہ معروف ناول نگار چارلس کنگزلی کا بھائی تھا۔ جارج کنگزلی اکثر گھر سے باہر رہتا تھا اور اگرچہ اس نے خودغرضانہ انداز میں اپنے اہل خانہ کو نظرانداز کر رکھا تھا لیکن اس کے باوجود بھی میری اس کے ساتھ پوجنے کی حد تک محبت کرتی تھی اور اس کی گھر واپسی یا اس کے خطوط کا شدت کے ساتھ انتظار کرتی رہتی تھی۔ اسے مہم جوئی اور سیاحت کا شوق اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا۔

1892ء میں اس کے والدین انتقال کر گئے تھے اور اس نے مغربی افریقہ جانے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ قدیم معاشروں اور اس کے افراد کے مذاہب کا مطالعہ سرانجام دے سکے۔ اس نے برطانوی عجائب گھر کے لئے دریاؤں اور جھیلوں سے مچھلیوں کے نمونے اکٹھے کرنے کی بھی حامی بھر لی۔

''لاگوس'' نامی جہاز پر میری مقبولیت حاصل کر چکی تھی اور بہت سے دوست بھی بنا چکی تھی۔ تاجر...... مشنریاں...... سرکاری اہلکار اور جہاز کا عملہ...... سبھی اسے اپنے مفید مشوروں سے نواز رہے تھے کہ اسے اپنے آپ کو ان خطرات سے کیسے بچانا تھا جو اسے مغربی افریقہ میں پیش آسکتے تھے۔ انہوں نے اسے سمجھایا کہ اسے افریقہ کے آبائی باشندوں کے ساتھ کس طرح باہم روابط ہونا تھا۔

جب جہاز اس کی مطلوبہ سرزمین پر جا پہنچا اس وقت موسم سازگار نہ تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی اور بارش بھی برس رہی تھی۔ اس کے علاوہ گہری دھند بھی چھائی ہوئی تھی جس نے کئی روز تک جہاز کو اپنے گھیرے میں لئے رکھا۔ لیکن جب دھند چھٹی اور میری نے پہلی مرتبہ فری ٹاؤن کی بندرگاہ کا نظارہ کیا...... یہ مقام اس کے تصور سے بھی بڑھ کی خوبصورت اور دلکش ثابت ہوا۔

اس نے ''لاگوس'' نامی جہاز...... اس کے کپتان اور عملے کو پرتگالی انگولا میں لوآنڈا کے مقام پر خیر باد کہا۔ اس نے پرتگالیوں کو بہتر مہمان نواز پایا۔ انگولا میں اس نے مقامی طریقہ کار کے تحت مچھلی کا شکار کرنے کی مشق سرانجام دی۔ یہ شکار کشتیوں کے ذریعے کیا جاتا تھا۔

لیکن میری کی مہم جو طبیعت قرار نہ پاسکی۔ اس نے دریا کے دور دراز مقام پر مچھلیوں کے شکار کو ترجیح دی۔ ایک مرتبہ جب وہ مچھلی کے شکار میں مصروف تھی کہ اس کے آبائی ساتھیوں میں سے ایک ساتھی نے ایک بڑی مچھلی پکڑ لی اور اس جدوجہد میں ان کی کشتی الٹ گئی۔ تمام لوگ دریا کی تہہ کی مٹی میں جا دھنسے اور مٹی میں لت پت دوبارہ دریا کی سطح آب پر نمودار ہوئے۔ اپنے سیاہ فام دوستوں کی مدد سے میری کشتی تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی۔ ایک اور موقعہ پر جبکہ میری اکیلی مچھلی کے شکار میں مصروف تھی کہ ایک بڑا مگرمچھ نمودار ہوا اور اس کی کشتی میں داخل ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ میری بڑی مشکل سے اس سے جان بچانے میں کامیاب ہوئی۔

اگرچہ اس نے برطانوی عجائب کے حکام کے ساتھ یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کے لئے غیر معمولی اقسام کی حامل مچھلیاں اپنے ہمراہ لائے گی لیکن اس کی اس مہم کا بڑا مقصد وہاں کے لوگوں کا مطالعہ سرانجام دینا تھا۔ وہ حسب وعدہ واپسی پر برطانوی عجائب گھر کے لئے مختلف اقسام کی مچھلیاں اپنے ہمراہ لائی تھی اور عجائب گھر کے حکام اس کی اس کاوش سے ازحد متاثر بھی ہوئے تھے۔

چونکہ اس کا بڑا مقصد یہاں کے لوگوں پر تحقیق کرنا تھا لہٰذا اس نے اپنے مقصد کی جانب اپنی توجہ مبذول کروائی۔ اس موقع پر کرو۔ انگریزی اس کے لئے انتہائی مفید ثابت ہوئی۔ یہ انگریزی اسے جہاز کے نائب کپتان نے سکھائی تھی کہ وہ آبائی باشندوں کے ساتھ گفت وشنید سرانجام دے سکے۔ اس کی اس انگریزی کی بدولت سیاہ فام اس کی بات سمجھنے لگے تھے جنہوں نے اس سے پیشتر کبھی کوئی سفید فام مرد یا عورت نہ دیکھی تھی۔ اس نے زیادہ تر سفر تن تنہا سرانجام دیا تھا۔ وہ سیاہ فاموں کی جھونپڑیوں میں قیام کرتی رہی اور ان جیسی خوراک استعمال کرتی رہی۔ طب کے میدان میں اس کی تربیت اس موقع پر اس کے کام آئی اور وہ اکثر سیاہ فاموں کا علاج معالجہ سرانجام دیتی رہی جس کی وجہ سے ان کے ساتھ اس کے بہتر تعلقات استوار ہوئے۔ اس نے بہت سے ساحر ڈاکٹروں کے ساتھ دوستی استوار کرلی تھی۔

افریقہ کے اپنے پہلے دورے کے موقع پر اسے یہ احساس ہوا کہ اس نے اس تاریک براعظم کے بارے میں جو کچھ کتابوں میں پڑھ رکھا تھا اور ان سے جو افکار اخذ کئے تھے وہ سب کے سب غلط تھے۔ اس نے ان لوگوں کو معاون...... مہربان اور قابل اعتبار پایا تھا۔ یہ سفید فام ہی تھے جو افریقہ پر حکومت کر رہے تھے اور سیاہ فاموں کو اپنے ظلم وتشدد کا نشانہ بنا رہے تھے۔ اس طرح وہ ان یورپی طاقتوں کے لئے نقصان کا باعث ثابت ہو رہے تھے جن کی وہ نمائندگی سرانجام دے رہے تھے۔

وہ برطانوی عجائب گھر حکام کو خوش کرنے کیلئے جو مچھلیاں اور حشرات الارض اپنے ہمراہ لائی تھی ان کی بنا پر اس کے دوسرے افریقی دورے کے موقع پر ان حکام نے اسے اپنا نمائندہ ہونے کا اعزاز بخشا تھا۔

میری کنگز لی نے 22 دسمبر 1894ء کو اپنے دوسرے سفر کا آغاز کیا۔ اس مرتبہ اس نے ''بٹانگا'' نامی جہاز میں سفر طے کیا۔ اس جہاز میں لیڈی میکڈونلڈ بھی اس کی شریک سفر تھی اور میری کو کلابر تک اس کا ساتھ حاصل تھا۔ لیڈی میکڈونلڈ کا خاوند سر کلاڈی میکڈونلڈ ایک برطانوی کمشنر تھا جس نے انہیں کلابر میں ملنا تھا اور اس نے دریائے کلابر میں مچھلیوں کی تلاش میں میری کی معاونت سرانجام دینے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ کلابر میں اس کی

ملاقات میری سلیسر سے ہوئی......وہ ایک معروف مشنری تھی......اس سے اس نے اہل افریقہ کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کیں۔

یہاں پر اس نے ایکبو کا بھی مطالعہ سرانجام دیا......افریقہ کی ایک مخفی سوسائٹی......افریقہ کی تمام تر مخفی سوسائٹیاں بے پناہ اثر ورسوخ کی حامل تھیں۔ان میں کچھ محض رسوم عبادت کی ادائیگی کے نام پر ہلاکتیں کرتے تھے اور آدم خوری کرتے تھے۔

لیپرڈ مخفی سوسائٹی ہلاکتیں سرانجام دیتی تھی اور قربانی کے نام پر آدم خوری کرتی تھی۔وہ چیتے کی کھال زیب تن کرتے تھے اور مقامی قبیلے ان سے خائف رہتے تھے اس کا اگلا اقدام دریائے اوگو میں نمونہ جات کی تلاش تھا۔یہ مغربی ساحل کا ایک خوفناک ترین حصہ تھا۔وہ لمبرین کے مقام پر پہنچ چکی تھی جہاں پر ڈاکٹر شوئنزر 18 برس قبل آیا تھا اور اس فرم میسرز ہاٹن اینڈ کک سن جو کہ ایک تجارتی فرم تھی......اس فرم نے اس کے لئے مقامی کرنسی کا بندوبست سرانجام دیا جو تمباکو کے پتوں پر مشتمل تھی۔اس کرنسی کے حصول کے بعد وہ اپنے آدمیوں کو ادائیگی کرنے اور خوراک خریدنے کے قابل ہوئی۔

لمبرین کے مقام پر شدت کی گرمی تھی اور مچھر بھی ناقابل برداشت تھے۔لہٰذا وہ نجولی چلی آئی۔جو کہ دریائے اوگو کا ایک دور دراز کا مقام تھا جہاں پر جہاز رانی بھی ممکن تھی۔یہاں پر وہ ایک ہفتے تک ایک مشنری فیملی کے ہاں مقیم رہی اور نمونے وغیرہ اکٹھی کرتی رہی اور زہریلے سانپوں کو پکڑنے کے فن میں مہارت حاصل کرتی رہی۔اس کے علاوہ وہ کشتی چلانے کے فن میں بھی مہارت حاصل کرتی رہی حالانکہ کئی ایک مواقع پر وہ ڈوبتے ڈوبتے بچی تھی۔

وہ دریا کی بالائی جانب سفر طے کرنے کیلئے بے صبر ہو رہی تھی۔لہٰذا اس نے ایک مضبوط کشتی حاصل کی اور کم از کم آٹھ افراد پر مشتمل عملہ بھی بھرتی کیا۔کشتی سے بڑھ کر عملہ اس کے لئے مسئلہ بنا ہوا تھا۔کیونکہ بہت سے سفید فام دریا کی بالائی جانب جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔وہ اس خدشے کا شکار تھے کہ اس مقام کے قبائل انہیں ہلاک کر کے کھا جائیں گے کیونکہ وہاں پر آباد قبائل ایسی ہی شہرت کے حامل تھے۔بالآخر اسے لاگل واز قبیلے سے عملہ دستیاب ہو گیا اور وہ نجولی کے لئے روزانہ ہوئے جو پانچ سو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

دریا بپھرا ہوا تھا۔اپنے عملے کے سربراہ مابو کے حکم پر میری اکثر چھلانگ لگا کر دریا کے کنارے پر چڑھ جاتی تھی یا کسی چٹان کے ساتھ لٹک جاتی تھی جبکہ کشتی کو عملہ سنبھالے رکھتا تھا۔کئی مرتبہ وہ چکنی چٹان سے نیچے گر پڑی تھی۔وہ یا تو جھاڑیوں میں گرتی تھی یا پھر پانی میں گرتی تھی۔حتیٰ کہ کونڈو کونڈو کے جزیرے پر جا پہنچے۔میری چاہتی تھی کہ وہ اس مقام پر کچھ دیر کے لئے قیام کرے۔کونڈو کونڈو جزیرے میں اس نے یہ محسوس کیا کہ آدم خوروں کے درمیان رہنا کیا معانی رکھتا تھا۔اس کی ملاقات اجنبا قبیلے کے تین ایسے افراد سے ہوئی جو ہاتھی دانت اکٹھا کرتے تھے۔اس نے ان افراد سے درخواست کی کہ وہ اسے اپنی کشتی میں دیہات کی جانب لے جائیں جہاں پر وہ کسی قسم کی تجارتی سرگرمیاں سرانجام دے سکے۔دوران سفر ایک سیاہ فام کی نظر اس پر پڑی۔صاف ظاہر تھا اس کے پاس فروخت کرنے کیلئے کوئی چیز موجود تھی۔یہ چیز ایک انسانی ٹانگ تھی۔ان لوگوں نے میری کو اگلے دیہات پہنچا دیا تھا۔

دیہاتیوں نے میری کے ہاتھ ہاتھی دانت اور ربڑ فروخت کیا۔وہ ان اشیاء کی خریداری میں دلچسپی نہ رکھتی تھی۔لیکن خریداری سے انکار کرنے سے بھی گھبراتی تھی۔تبادلے میں دینے کے لئے اس کے پاس کپڑے اور تمباکو موجود تھا۔

ہاتھی دانت اکٹھے کرنے والے افراد جو اسے اس دیہات میں چھوڑ گئے تھے انہوں نے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ واپسی پر اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔

اس کے بعد وہ اجنبا قبیلے کے چار مسلح افراد کے ہمراہ دریائے رمبابوے چلی آئی۔ یہاں کے جنگلات بھی دلدل سے بھرپور تھے۔ ایک روز میری اور اس کے ساتھی دلدل میں دھنس گئے تھے اور کیچڑ میں لت پت دلدل سے باہر نکلنے میں بمشکل کامیاب ہوئے تھے۔

ایک روز میری ایک گہرے گڑھے میں گر پڑی تھی۔ اس سفر کے دوران میری نے ایک رات ایک خالی جھونپڑی میں بسر کی۔ اس جھونپڑی سے ناگوار بدبو اٹھ رہی تھی جس کی وجہ سے وہ سونے سے قاصر تھی۔ اس نے اس جھونپڑی کی دیواروں پر لٹکتے ہوئے تھیلوں کی تلاشی لی اور ان میں سے ایک انسانی ہاتھ...... تین بڑی بڑی ایڑھیاں...... چار آنکھیں...... دو کان...... انسانی جسم کے دیگر حصے برآمد ہوئے۔

وہ جن دیہاتوں کا دورہ کر رہے تھے وہ دیہات ایک دوسرے کے ساتھ مصروف جنگ رہتے تھے اور ایک رات ان کے درمیان جنگ متوقع تھی۔ لیکن میری ان لوگوں کا اعتماد حاصل کر چکی تھی اور وہ اس کی عزت کرتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے میری سے درخواست کی کہ وہ ان کے جھگڑے کو نپٹائے۔ لہٰذا میری نے ان کے درمیان تصفیہ کروا دیا۔

میری نے ہر ایک خطرے کا دلیرانہ مقابلہ کیا۔ تمام تر مصائب خندہ پیشانی سے برداشت کیے۔ وہ دلدلوں سے گزری۔ کبھی کبھار وہ اپنی گردن تک دلدل میں دھنس گئی۔ اس نے کئی ایک دریا عبور کیے۔ وہ تیرنا نہیں جانتی تھی لہٰذا اس نے رسوں کی مدد سے دریا عبور کیے۔

اس نے ان وحشی لوگوں کا اعتماد حاصل کیا اور ان کی نظروں میں پُر وقار ٹھہری۔ وہ اسے ''شیطانی روح'' کہہ کر پکارتے تھے اور ان کے نزدیک یہ ایک عظیم ترین خراج تحسین تھا جو وہ اسے پیش کر سکتے تھے۔ وہ کئی ہفتوں تک برہنہ آدم خوروں کے درمیان بھی رہی لیکن وہ اپنی تمام تر مہم کے دوران اپنی نسوانیت برقرار رکھنے میں کامیاب رہی۔

انگلستان واپسی پر اس کا استقبال ایک قومی ہیرو کی طرح کیا گیا۔ اس نے کئی کتب تحریر کیں۔ ان کتب میں اس نے اہل افریقہ کی حقیقی تصویر کشی کی۔ یہ کتب اپنے وقت کی بہترین کتب میں شمار ہوتی تھیں اور قابل ذکر تعداد میں فروخت ہوئی تھیں' لیکن اس کے باوجود بھی میری کنگزلی کو آج کل کوئی نہیں جانتا اور گذشتہ پچاس برسوں سے اس کی تحریر کردہ کتب کی اشاعت بھی بند ہو چکی ہے۔

اس کی مہمات میں ایک مہم کیمرون میں ایک عظیم چوٹی کو سر کرنے کی مہم بھی شامل تھی (13,760 فٹ اونچائی کی حامل)۔ اس نے جس سمت سے اس چوٹی کو سر کیا تھا اس سمت سے کسی نے ابھی تک اس چوٹی کو سر نہیں کیا تھا۔

جنوبی افریقہ کی جنگ کے دوران وہ سیمنز ٹاؤن چلی گئی تھی اور بور جنگی قیدیوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئی تھی۔ ان لوگوں سے وہ ایک خطرناک قسم کے بخار میں مبتلا ہو گئی تھی اور 3 جون 1900ء کو موت سے ہمکنار ہو گئی تھی۔ اس کی اپنی خواہش کے مطابق اس کی لاش کو حوالہ سمندر کر دیا گیا تھا۔

راس سے قاہرہ تک

یہ 1897ء کا برس تھا۔اوارٹ گروگن...... 21 بچوں کے حامل خاندان کا ایک رکن......دوسری مرتبہ کیمبرج سے نکالا گیا تھا۔پہلی مرتبہ وہ اپنے کالج کو آگ لگانے کی پاداش میں نکالا گیا تھا...... یہ آگ بون فائرنائٹ (وہ آگ جو خوشی کے موقع پر جلائی جائے......الاؤ) کے موقع پر جلائی گئی تھی......اب اس نے ایک پروفیسر کے کمرہ مطالعہ میں ایک بکری کو بند کردیا تھا اور اس کے نتیجے میں پروفیسر کی قیمتی کتب بکری کی کارروائی کی نذر ہو چکی تھیں۔

کیمبرج کو چھوڑنے کے فوراً بعد گروگن کی ملاقات نیوزی لینڈ کی ایک لڑکی سے ہوئی اور وہ پاگل پن کی حد تک اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔اس لڑکی کا نام گرٹروڈ واٹ تھا۔اگرچہ اس کے پاس نہ ہی کوئی ملازمت تھی اور نہ دولت تھی لیکن اس کے باوجود بھی گروگن بہ نفس نفیس گرٹروڈ کے سوتیلا باپ کے پاس جا پہنچا اور لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کیلئے اس کی اجازت حاصل کرنے کی کوشش کی۔

لڑکی کے سوتیلے باپ نے جواب دیا کہ:۔

''میں نے ایسی ناعاقبت اندیشی کے بارے میں پہلے کبھی نہیں سنا......تم کسی بھی لڑکی سے شادی کرنے کے قابل نہیں ہو...... جاؤ اور کوئی قابل قدر کارنامہ سرانجام دو......کوئی ایسا کارنامہ سرانجام دو جو یہ ثابت کرے کہ تم ایک مرد ہو......پیشتر اس کے کہ تم شادی کا خواب دیکھو۔''

اوارٹ گروگن نے یہ چیلنج قبول کرلیا۔اس نے گرٹروڈ وارث کے ساتھ اپنی محبت ثابت کرنے کی غرض سے براعظم افریقہ کو راس تا قاہرہ پہلی مرتبہ عبور کرنے کی کاوش سرانجام دینے کا فیصلہ کیا......ایک خطرناک مہم جو تقریباً 8,000 میل پر محیط تھی......اسے تین برس کا عرصہ اس مہم کی نذر کرنا پڑا......1897ء تا 1900ء۔

کچھ امیر رشتے داروں نے اس کی مہم کے اخراجات برداشت کرنے کی حامی بھرلی اور ایک رشتے دار...... ہنری شارجو گروگن سے دوگنی عمر کا حامل تھا وہ اس مہم میں رضا کارانہ طور پر اس کا ساتھ دینے پر بھی رضامند ہوگیا۔ان دونوں افراد نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ہلکے پھلکے ساز وسامان کے ساتھ سفر طے کریں گے۔ان کے سفر کا سامان محض درج ذیل اشیاء تک محدود تھا:۔

☆ تین عدد خیمے

☆ دو عدد بستر

☆ کپڑوں کے چند جوڑے

☆ مچھردانیاں

☆ بندوقیں اور اسلحہ

☆ ڈبہ بند خوراک

☆ ادویات

☆ اہل افریقہ کے ساتھ لین دین کرنے کی غرض سے کچھ ٹرنکٹ

☆ چند دیگر اشیائے صرف

1897ء کے موسم خزاں میں وہ راس ٹاؤن سے عازم سفر ہوئے۔ بذریعہ افریقہ ان کے سفر کا پہلا حصہ آسان تھا۔ راس ٹاؤن سے انہوں نے بولاوایو تک کا سفر ایک پرانی ریل گاڑی میں طے کیا جو راستے میں کئی مرتبہ خرابی سے ہمکنار ہوئی۔ اس کے بعد وہ ایک بیل گاڑی میں سوار ہوئے اور کئی سو میل کا سفر طے کرتے ہوئے موزمبیق کی بندرگاہ پر بیرہ جا پہنچے اور انہوں نے چرومو کے مقام پر خیمہ نصب کر لیا...... بیرہ کے شمال، مشرق کی جانب......ان کی اصل مہم کا آغاز اب ہوا تھا۔

پہلے گروگن بخار کا شکار ہوا۔ اس کے بعد شارپ پر ایک جنگلی بھینس نے حملہ کر دیا۔ خوش قسمتی سے یہ بھینس ابھی اس سے تین گز کے فاصلے پر ہی تھی کہ اس نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس کے فوراً بعد ایک شیر گروگن پر حملہ آور ہوا اور گروگن اس کے حملے سے بال بال بچا...... جوں ہی شیر اس پر چھلانگ لگانے کے پر تول رہا تھا توں ہی اس نے گولی مار کر اسے ہلاک کر دیا۔

ان حادثات سے بال بال بچنے کے بعد گروگن اور اس کے ساتھی نے خیمہ اکھاڑا اور نیاسا کی جانب روانہ ہوئے۔ کبھی وہ پیدل سفر طے کرتے تھے اور کبھی خچر گاڑی میں سفر طے کرتے تھے۔ بالآخر وہ ایک کشتی کے ذریعے دریائے زمبیسی کی معاون ندی تک جا پہنچے۔ اس مقام پر سخت گرمی تھی۔ دن کے وقت سایے میں درجہ حرارت 120 ڈگری تھا۔ ایک افریقی گاؤں میں گروگن نے حماقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ننگے آسمان تلے نہانا شروع کر دیا...... شہد کی مکھیاں فوراً اس پر حملہ آور ہو گئیں۔ درد کی شدت سے بے تاب وہ برہنہ حالت میں بھاگتا ہوا ایک نزدیکی جھونپڑی میں پناہ گزین ہو گیا اور بے ہوش ہو کر گر گیا۔ اس کی حالت نازک تھی لیکن اس جھونپڑی میں جو نیگرو لڑکی رہتی تھی اس کی مہربانی ...... ہمدردی ...... اور تیمارداری کی بدولت اس کی جان بچ گئی تھی۔

تقریباً ایک برس کا سفر طے کرنے کے بعد گروگن اور شارپ جھیل نیاسا تک جا پہنچے تھے۔ جوں ہی وہ وسطی افریقہ میں داخل ہوئے ان کی مہم زیادہ مشکل اور خطرناک ہو گئی۔ بڑے بڑے رقبے جن سے گزرنا اس وقت انتہائی دشوار سمجھا جاتا تھا...... ان علاقوں میں آدم خور آباد تھے اور جنگجو قبیلے آباد تھے جنہوں نے اس سے قبل کسی سفید فام کو نہ دیکھا تھا۔ اس خطرے کو بھانپتے ہوئے گروگن اور شارپ نے یہ فیصلہ کیا کہ اہل افریقہ کی ایک ٹیم بھرتی کی جائے جو انہیں ان خطرناک علاقوں سے بخوبی اور بحفاظت گزار سکے۔ لیکن یہ ایک آسان امر ثابت نہ ہوا۔

ایک شام حالت مایوسی میں گروگن ایک ایسے مکان میں داخل ہو گیا جہاں پر کچھ افریقی کسی قسم کے اجلاس میں مصروف تھے اور اس نے

کچھ لوگوں کو رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات سرانجام دینے کی درخواست کی کہ:۔

''آپ میں کون میرے ہمراہ ایک طویل سفر پر روانہ ہونا پسند کرے گا۔''

افریقی اس سفید فام کی اچانک آمد پر حیران رہ گئے اور خاموش رہے۔

گروگن نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ:۔

''یہ ایک طویل سفر ہوگا...... بہت طویل......''

گروگن نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا:۔

''لیکن میں آپ کو انتہائی حیران کن چیزیں دکھاؤں گا...... ایسی چیزیں جو آپ نے پہلے کبھی نہ دیکھی ہوں گی''

افریقی کسی سوچ میں پڑ گئے لیکن آہستہ آہستہ گروگن ان کا اعتماد جیتنے میں کامیاب ہوگیا۔

چار افریقی سیاہ فام مکیمبیرا...... چاکا چابو...... کماؤ اور کیاپی اس کے ہمراہ جانے پر آمادہ ہوگئے۔ اگلے روز ایک چھوٹا لڑکا جس کا نام پنکا تھا وہ بھی رضا کارانہ طور پر ساتھ جانے پر آمادہ ہوگیا۔ گروگن نے ان پانچوں سیاہ فاموں کو نیلے رنگ کے سوتی ملبوسات زیب تن کروا دیے۔ یہ پانچ وفادار افریقی اس سفر کے اختتام تک گروگن کے ہمراہ رہے۔

ان افریقیوں کی مدد سے گروگن 150 افریقیوں کا ایک اور دستہ بھی تیار کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اندھا دھند بارش اور شدت کی گرمی میں یہ جماعت 200 میل کا سفر طے کرتی ہوئی جھیل ٹانگا نائیکا جا پہنچی...... جہاں پر گروگن بخار کی زد میں آ گیا۔ جوں ہی اس کے بخار کی شدت میں کمی واقع ہوتی وہ اپنی جماعت کو پیش قدمی جاری رکھنے کی تلقین کرتا۔

کئی ایک حادثات سے گزرنے کے بعد 1899ء کے موسم بہار میں یہ جماعت یوجیجی جا پہنچی...... جہاں پر اسٹینلے نے 27 برس قبل لونگ اسٹون دریافت کیا تھا۔ یوجیجی کا مقام اس وقت جرمن تحفظ میں تھا۔ لہٰذا گروگن اور شارپ نے ایک جرمن چوکی کا رخ کیا تاکہ سفر کی اگلی منزل کے لئے سامان رسد کا بندوبست کرسکیں۔ جرمنوں نے خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا اور انہیں رات کے کھانے پر مدعو کیا۔

جب گروگن نے جرمنوں کو اپنی منزل مقصود کے بارے میں بتایا تو وہ خوفزدہ ہوگئے:۔

''ناممکن...... تم کبھی بھی قاہرہ نہیں پہنچ پاؤ گے۔''

یہ جرمنوں کا دعویٰ تھا۔

گروگن نے سوال کیا کہ:۔

''کیوں...... ہم کیوں قاہرہ نہ پہنچ پائیں گے۔''

جرمنوں نے جواب دیا کہ:۔

''روآنڈس...... تمہیں روآنڈا قبائل کے علاقے سے گزرنا ہوگا...... وہ لوگ اپنے ظلم کے لئے مشہور ہیں''

انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ:۔

''حتیٰ کہ عرب بھی ان سے خائف ہیں......وہ تمہیں نیست ونابود کردیں گے۔''

یونیجی کے عربوں نے بھی جرمنوں کی بات کی تصدیق کی اور مزید باور کروایا کہ:۔

''اگر تم روآنڈس قبیلے سے بچ بھی گئے تب مغم بیرو کے مقام پر آتش فشاں پہاڑ تمہارا راستہ روکے کھڑے ہوں گے......ان کو عبور کرنا ناممکن ہوگا......تم سب لوگ بھوک اور پیاس کی شدت سے ہلاک ہوجاؤ گے۔''

عربوں نے گروگن کو قائل کرنے کی از حد کوشش کی۔

لیکن گروگن نے ان کی بات سننے سے اکار کردیا۔عربی خوفزدہ ہوگئے۔انہوں نے محسوس کیا کہ مزید بحث فضول تھی۔لہٰذا انہوں نے اس مہم جو جماعت کو تحائف پیش کیے۔ان تحائف میں گائے......بکریاں......کثیر تعداد میں انڈے......پھل اور سبزیاں وغیرہ شامل تھے تاکہ یہ لوگ فاقہ کشی کا شکار ہونے سے بچ سکیں۔

انہوں نے بہت سی تکالیف اٹھائیں......مصائب برداشت کیے......انہوں نے مگرمچھوں سے بھرپور جھیل ٹانگا نائیکا عبور کی......کچھ افریقی ساتھ چھوڑ گئے تھے......انہیں بھوک اور پیاس کی شدت برداشت کرنی پڑی......اور گروگن پر بخار کا ایک اور حملہ ہوا۔اس کا بخار 106 درجے تک جا پہنچا لیکن انہوں نے جان پر کھیل کر 400 میل کا سفر طے کیا اور روسی وادی جا پہنچے۔اس کے بعد وہ جھیل کیوو کے جنوب میں ایک کھلے میدان میں جا پہنچے جو بلجیم کانگو کے روآنڈا ملک کے دل میں واقع تھی۔

ابھی وہ اپنے خیمے نصب کررہے تھے کہ روآنڈا کا ایک سرداران سے ملاقات کیلئے آن پہنچا۔ان کی حیرانگی کی کوئی انتہا نہ تھی۔اس سردار کا نام نکنزی تھا اور انہیں پیش کش کی کہ وہ انہیں بحفاظت جھیل کیوو تک پہنچادے گا۔اس کے بعد ایک مرتبہ پھر مصائب کا آغاز ہوا۔جھل کی طرف سفر طے کرتے ہوئے پہلی رات کے دوران ان کے خیمے پر حملہ ہوا۔گروگن نے نکنزی کو بلایا اور اس کے ساتھیوں پر چوری کا الزام لگایا۔نکنزی نے اس کے الزام کو جھٹلایا۔گروگن نے اس کی بات کا اعتبار نہ کیا اور اسے دھمکی دی کہ اگر آدھی رات تک چوری کیا جانے والا سامان برآمد نہ ہوسکا تو وہ ان کے خلاف سخت کارروائی سرانجام دے گا۔چوری کا سامان واپس نہ کیا گیا۔لہٰذا گروگن مکنجیرا اور چاکاچابو کے ہمراہ اس قبیلے کے مویشی قابو کرنے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔

اچانک کئی ہزار روآنڈی تمام اطراف سے برآمد ہوئے۔ان کے ہاتھوں میں نیزے پکڑے تھے اور اور وہ پاگلوں کی طرح چلارہے تھے۔

گروگن پرسکون انداز میں کھڑا رہا اور چلایا کہ:۔

''خاموش!خاموش!میرا تمہارے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں ہے......میرا جھگڑا تمہارے سردار کے ساتھ ہے......اس نے مجھے بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔''

اس مجمعے نے ہچکچاتے ہوئے اپنے نیزے نیچے کرلئے۔

گروگن نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ:۔

تمہارے سردار نے چوروں کو یہ اجازت فراہم کی کہ وہ ہمارے کیمپ پر حملہ آور ہوں...... لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ اپنی چوری شدہ اشیاء کے بدلے میں کچھ نہ کچھ بطور تاوان حاصل کریں...... اگر کسی شخص نے ہمیں روکنے کی کوشش کی تو ہم اسے گولی سے اڑا دیں گے...... اپنی جگہ پر کھڑے رہو...... میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں۔"

اس کے بعد گروگن اور اس کے دونوں ساتھیوں نے مویشی ہانکے...... اور کسی بھی روآنڈا نے مزاحمت نہ کی۔

جوں ہی وہ اپنے سفر پر روانہ ہوئے گروگن کی جماعت کے افریقی لوگ اس کی فتح سے ازحد خوش تھے اور انہوں نے روآنڈا کی آبادی پر حملے کرنے شروع کر دیے۔ گروگن نے سزا کے طور پر انہیں خیموں تک محدود کر دیا...... لیکن اس کے عمل درآمد نے بغاوت کو جنم دیا۔ ایک روز جبکہ وہ اور شارپ اپنے خیمے میں دوپہر کے کھانے سے لطف اندوز ہو رہے تھے انہوں نے محسوس کیا کہ باہر سے حسب معمول شور کی آوازیں نہیں آ رہی تھیں۔ وہ وجہ معلوم کرنے کے لئے اپنے خیمے سے باہر نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ افریقی اپنے سامان باندھ رہے تھے اور ان میں سے تیس افراد پہلے ہی واپسی کے لئے چل پڑے تھے۔

شارپ خیمے میں ہی مقیم رہا جبکہ گروگن مکنجیرا اور چاکا چابو کے ہمراہ ان 30 افراد کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا۔ 200 گز دور جا کر انہوں نے ان لوگوں کو پکڑ لیا۔ گروگن نے ان لوگوں کے سرغنہ پر رائفل تان لی جبکہ باقی تمام لوگ خوف کے مارے زمین پر آن گرے اور تابعدار بچوں کی مانند اپنے کیمپ کی جانب روانہ ہو گئے۔ اس طرح یہ بغاوت اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ جب ان کی خوراک کی مقدار کم ہو رہی تھی اور پانی کا ذخیرہ بھی ختم ہو چکا تھا تب گروگن اور اس کی جماعت مفم بیرو کے آتش فشاں پہاڑوں کی جانب رواں دواں تھی۔ جلد ہی وہ گھنے جنگل سے گزر رہے تھے۔ اس کے بعد ان کا گزر ایک ایسے جنگل سے ہوا جس میں جابجا درخت گرے پڑے تھے۔ ان درختوں کو ہاتھیوں نے اکھاڑ پھینکا تھا۔

گروگن ایک مرتبہ پھر اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے کے قریب تھا۔ ایک ہاتھی نے اچانک اس پر حملہ کر دیا تھا۔ جونہی ہاتھی اس پر حملہ آور ہوا اس نے چشم زدن میں اس کے سر کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ لیکن نشانہ خطا ہو چکا تھا۔ اس کا دوسرا نشانہ بھی خطا گیا۔ ہاتھی نے اسے اٹھا کر کانٹوں بھری ایک جھاڑی پر پھینک دیا۔ اگرچہ وہ سر سے پاؤں تک زخمی ہو چکا تھا لیکن معجزانہ طور پر ہنوز زندہ سلامت تھا۔ جلد ہی وہ آتش فشاں پہاڑوں تک پہنچ چکے تھے۔ اس نے شارپ کو بڑے قافلے کے ہمراہ پیچھے چھوڑا اور بذات خود افریقی لوگوں کی ایک مختصر جماعت کے ہمراہ آتش فشاں پہاڑوں کو عبور کرنے کیلئے کسی مناسب راستے کا کھوج لگانے کے لئے چل نکلا۔ لاوا عبور کرنے کے بعد گروگن ایک ایسے میدان میں پہنچ چکا تھا جہاں پر ڈھانچے اور لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ یہ لوگ آدم خوروں کا نشانہ بنے تھے۔ اچانک سینکڑوں آدم خور نمودار ہوئے۔ اور گروگن کی جانب بڑھنے لگے۔ انہوں نے نیزے اٹھا رکھے تھے اور وحشیانہ انداز میں شور مچا رہے تھے۔

گروگن کے افریقی ساتھی خوفزدہ ہو چکے تھے اور بھاگنے کے لئے پر تول رہے تھے۔

گروگن نے انہیں حکم دیا کہ:۔

''جہاں پر کھڑے ہو وہیں پر کھڑے رہو...... حرکت کرنے کی کوشش ہرگز نہ کرو۔''

گروگن نے انتظار کیا حتیٰ کہ وہ آدم خور اس کے نشانے کی زد میں آن پہنچے تب اس نے فائر کھول دیا۔ آدم خور آتشیں اسلحے سے واقف نہ تھے۔ لہٰذا وہ بھاگ نکلے...... گروگن کے ساتھی خوشی کے مارے ناچنے لگے اور تالیاں پیٹنے لگے۔

گروگن نے ان آدم خوروں کا پیچھا کیا لیکن وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ گدھوں کے ایک غول نے ان کو واپس اپنے خیموں کی جانب جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ بادل کی طرح آسمان پر چھائی ہوئی تھیں۔ گروگن نے خوفزدہ ہو کر اپنے خیموں کا رخ کیا...... اور ایک مرتبہ پھر علیل ہو گیا۔

بہت بڑا خطرہ مول لیتے ہوئے گروگن نے ضلع مُشاری کے ایک بڑے حصے کی تحقیق و تفتیش سر انجام دی...... یہ ضلع تقریباً 3,000 مربع میل پر مشتمل تھا اور آدم خوروں کی دہشت کی وجہ سے لوگوں یہاں پر آباد ہونے سے کتراتے تھے۔ گروگن انتہائی جرأت مندی کے ساتھ ایک ویران کیمپ میں داخل ہو گیا اور ایک سانحہ کا شکار ہونے سے بال بال بچا...... آدم خور بھوکے درندوں کی طرح اس کی جانب بڑھ رہے تھے لیکن بندوق نے ایک مرتبہ پھر انہیں اس سے دور رکھا۔

اس واقعہ کے بعد گروگن جلد از جلد واپس لوٹ گیا اور شارپ کے ساتھ مل کر اس نے شمال کی جانب جھیل ایڈورڈ کی جانب اپنا سفر جاری رکھا جہاں پر ایک مرتبہ پھر اس پر بخار کا حملہ ہوا۔ اسے 108 درجے بخار تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا جسم جل رہا ہوں...... کسی لمحے اس کا جسم بخار کی تپش سے جل رہا ہوتا تھا اور کسی لمحے کانپ رہا ہوتا تھا۔ اس کی انگلیوں کے ناخن نیلے پڑ چکے تھے اور وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں چلا رہا تھا۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اس کا دوست موت کے منہ میں جا رہا تھا شارپ اس کے بستر کے ساتھ لگا رہا۔ وہ دن رات اس کی تیمارداری میں مصروف رہا اور اسے کونین کھلاتا رہا۔ شارپ کی بہتر تیمارداری کی بدولت گروگن روبصحت ہو گیا۔

اس وقت تک شارپ بذات خود دباؤ اور پریشانی کی وجہ سے توڑ پھوڑ اور شکست و ریخت کا شکار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ جھیل ایڈورڈ پر پہنچنے کے بعد اس نے گروگن کو بتایا کہ وہ مزید سفر طے نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے گروگن سے کہا کہ:۔

''مجھے مزید تمہارا ساتھ نہ دینے پر افسوس ہو رہا ہے''

گورگن یہ سن کر حیران رہ گیا لیکن اس نے انتہائی اطمینان کے ساتھ جواب دیا کہ:۔

''میرے بارے میں فکر مت کرو...... میں تنہا ہی اس مہم سے نپٹ لوں گا۔''

شارپ کا ساتھ چھوڑنے کے بعد...... بہت سے افریقی بھی گروگن کا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ اب اس کی جماعت کی تعداد ایک تہائی رہ چکی تھی۔ وہ اس جماعت کے ہمراہ عازم سفر ہوا اور جھیل البرٹ کے جنوب میں دلدل زدہ علاقے میں راستے سے بھٹک گیا۔ وہ لوگ گرمی کی شدت میں اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے بالآخر ایک مقامی افریقی نے ان کی رہنمائی کی اور ان کو جھیل تک پہنچایا۔

وہ جھیل کی مغربی جانب سے واڈیلی کی جانب بڑھ رہے تھے جہاں پر وہ بالائی نیل کے ساتھ جا ملے۔ گروگن نے محض پانچ افریقی

باشندوں کے علاوہ باقی تمام تر افریقی باشندوں کو واپس بھیج دیا اور ان کے ہمراہ کشتی میں سوار ہو کر دریا میں اتر گیا۔

دریا میں ایک میل کا سفر طے کرنے کے بعد اسے ایک دریائی گھوڑے کو گولی کا نشانہ بنانا پڑا جو ان کی کشتی کے تعاقب میں تھا۔ وہ ڈوفائل پہنچ چکے تھے جہاں پر ایک آبشار کی وجہ سے انہیں اپنا بحری سفر موقوف کرنا پڑا۔

ڈوفائل سے وہ قلعہ برکلے جا پہنچے۔ وہاں سے کچھ اہل بلجیئم انہیں کشتی میں بوہڑ کے مقام پر لے آئے لیکن اس مقام سے بحری سفر سرانجام دینا ناممکن تھا۔

اوارٹ گروگن اب جگہ کی تکلیف میں مبتلا تھا اور یہ تکلیف اس کے لئے ایک مسئلہ بنی ہوئی تھی...... ابھی اس نے اپنے سفر کا بدترین حصہ طے کرنا تھا...... اور اب واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس نے چند ایسے افریقی اپنے ہمراہ لئے جو مقامی علاقے کا علم رکھتے تھے اور 400 میل پر پھیلا ہوا دلدل زدہ علاقہ عبور کرنا شروع کیا۔ 24 گھنٹوں کے اندر اندر وہ گردن تک دلدل سے لبریز ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ ہاتھیوں اور مگرمچھوں کے حملے کا خطرہ بھی موجود تھا۔ رات کو مچھر تنگ کرتے تھے اور دن کو دیگر خون چوسنے والے کیڑے تنگ کرتے تھے۔ لیکن اس تمام تر مصائب کے باوجود بھی اس نے اپنا سفر جاری رکھا۔

جب انہوں نے دلدل سے پاک خشک سرزمین پر قدم رکھا تب تقریباً ایک سو وحشی...... نیزوں سے مسلح گروگن کی اس مختصر جماعت کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے۔ وہ انہیں گھیرے میں لے کر نیست و نابود کرنا چاہتے تھے۔ گروگن نے فوری کارروائی کرتے ہوئے اپنی بندوق سنبھالی اور انہیں خبردار کیا کہ:۔

''واپس چلے جاؤ...... ورنہ میں تمہیں گولی سے اڑا دوں گا۔''

اس دوران اس کے اپنے آدمی وحشیوں کی زد میں آ چکے تھے۔ وہ چلاتے ہوئے اپنے آقا کی جانب دوڑے کہ:۔

''ہم مارے گئے''

گروگن چلایا کہ:۔

''نیچے لیٹ جاؤ۔''

لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ وحشی ایک آدمی کو ہلاک کرنے کے بعد دیگر تین آدمیوں کو بھی ہلاک کر چکے تھے اور اب گروگن کی جانب بڑھ رہے تھے۔ گروگن نے فائر کھول دیا تھا۔

وحشی خوف کے مارے بھاگ نکلے تھے۔

وہ سوبیٹ پہنچ چکے تھے۔ اس مقام پر دریا دوبارہ کشتی رانی کے قابل تھا۔ اب وہ سخت ترین مشکل کا شکار تھے...... ان کے پاس نہ تو خوراک موجود تھی اور نہ ہی پانی موجود تھا۔ انہیں اب دریائی گھوڑے کے کچے گوشت پر گزارا کرنا تھا اور دلدل سے نمی چوستے ہوئے پانی سے پیاس بجھانی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ الٹیاں کرنے لگ جاتے تھے اور کئی ایک افریقی پیچش کی وجہ سے ہلاک ہو گئے تھے۔

گروگن کے پاس اب اسلحے کے محض دس راؤنڈ باقی تھے۔اس نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ یہ اس کی جرأت اور حوصلے کا امتحان تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ اس قدر کمزوری کا شکار تھا کہ وہ ایک کے بعد دوسرا قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔لہٰذا وہ پیٹ کے بل رینگنے لگا۔افریقی بھی تقریباً آخری سانسیں لے رہے تھے۔

تب ایک روز جارج نے دیکھا کہ دور فاصلے پر ایک کھمبا ہوا میں جھول رہا تھا۔

اس نے اپنے آدمیوں سے دریافت کیا کہ:۔

''یہ کیا ہے؟''

مکنجیرا نے جواب دیا کہ:۔

''یہ پام کا ایک درخت ہے..... میرا خیال ہے کہ یہ ہوا سے جھول رہا ہے۔''

گروگن کے اندر ایک نئی توانائی جنم لے چکی تھی۔ وہ جلد از جلد آگے بڑھنے لگا تاکہ مزید نزدیک جا کر اپنا معائنہ سرانجام دے سکے۔اس کے بعد وہ ساکت کھڑا ہو گیا اور مابعد اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہنے لگا کہ:۔

''یہ کشتی کا مستول ہے..... ہماری جان بچ گئی ہے۔''

یہ کشتی ایک فوجی افسر کی تھی جو چند دنوں کی چھٹیاں شکار کھیلتے ہوئے گزار رہا تھا۔جب اس کی چھٹیاں اپنے اختتام کو پہنچ گئیں..... اس نے گروگن اور اس کے ساتھیوں کو اپنے ہمراہ لیا اور انہیں فشوڈا پہنچا دیا۔اور وہاں سے وہ ایک اور کشتی میں سوار ہو کر خرطوم جا پہنچے۔

باقی سفر اگرچہ ایک طویل سفر تھا لیکن اس سفر کے دوران گروگن کسی مشکل کا شکار نہ ہوا.....اور ماہ فروری 1900ء کی ایک شام وہ بالآخر قاہرہ پہنچ چکا تھا۔

گروگن نے بذریعہ کشتی اپنے وفادار افریقیوں کو واپس نیاسا روانہ کر دیا کیونکہ اس نے ان کے ساتھ یہی وعدہ کیا تھا اور بذات خود انگلستان روانہ ہو گیا اور اس لڑکی سے شادی کر لی جس کی خاطر اس نے یہ عظیم مہم سرانجام دی تھی۔

سیسل رھوڈ کی تجویز پر..... گروگن نے افریقہ کو اپنا مسکن بنا لیا تھا اور اس نے کینیا کی ترقی میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔اس نے نو آبادی کی پہلی لکڑی کی صنعت قائم کی.....اور لمباسا کے مقام پر پہلا گہرا کنواں تعمیر کروایا.....اس کے علاوہ اس نے زراعت اور کاشت کاری کی جانب بھی خصوصی توجہ دی۔ 1943ء میں اس کی بیوی موت سے ہمکنار ہو گئی تھی۔اس نے اپنی بیوی کی یاد میں کینیا میں بچوں کا پہلا ہسپتال تعمیر کروایا۔

ایوارٹ گروگن نے 1967ء میں 92 برس کی عمر میں وفات پائی تھی۔

مافیکنگ کا محاصرہ

دبلا پتلا اور جاذب نظر کرنل رابرٹ بیڈن۔ پاول جولائی 1899ء میں ہندوستان سے لندن واپس آیا۔ اس کی عمر 42 برس تھی۔ وہ قابل ذکر کامیابی سمیت کر واپس آیا تھا۔ اس کا باپ آکسفورڈ میں جیومیٹری کا پروفیسر تھا۔ وہ اس کی تیسری بیوی کے بطن سے آٹھواں بچہ تھا (اس کی بیوی ایک ایڈمرل کی بیٹی تھی)۔ رابرٹ ذہین تھا۔ آرٹ کا دلدادہ تھا اور اس کی رگوں میں ایک مہم جُو خون دوڑ رہا تھا۔ وہ ایک اچھی شخصیت کا حامل تھا اور اس کی والدہ نے اپنے بچوں میں اولوالعزمی۔ حوصلہ مندی اور بلند نظری کے بیج بوئے تھے۔ ان خوبیوں کی بنا پر رابرٹ مائل بہ بلند پروازی تھا۔

فوج میں شمولیت کا امتحان پاس کرنے کے بعد ہندوستان میں 13 ویں ہوزاروں میں اس کی تقرری کی گئی تھی۔ اس نوجوان افسر نے تھوڑے ہی عرصے میں اپنی قابلیتوں کا لوہا منوایا تھا۔ اس کا نشانہ بہترین تھا۔ وہ پولو کا کھلاڑی تھا۔ اس میں پیشہ وارانہ صلاحیتیں بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ وہ نت نئے افکار بھی متعارف کرواتا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ آرٹ میں بھی دلچسپی کا حامل اور ڈرامائی ذہانت کا حامل تھا۔ وہ لندن کے اخبارات کو ہندوستان کی زندگی کے بارے میں اکثر اپنی تحریروں سے نوازتا رہتا تھا۔ ایک شام ایک جرنیل معائنے کے لئے آیا تھا۔ اس جرنیل کی آمد پر رابرٹ کیمپ کی اسٹیج پر چڑھ گیا اور یہ گانا گانے لگا کہ:۔

"میں ایک جدید میجر جنرل کا نمونہ ہوں"

یہ کردار اس پر خوب سجا تھا۔

ہندوستان کے بعد وہ افریقہ چلا آیا ڈراکنس برگ پہاڑوں کی مہم کے سلسلے میں...... اس کے بعد مالٹا کے کمانڈر انچیف کا اے۔ ڈی۔ سی مقرر ہوا...... اس کے بعد واپس افریقہ چلا آیا...... اشانٹی مہم کیلئے اور بالآخر ہندوستان میں پانچویں محافظ سواروں کمانڈنگ کرنل مقرر ہوا۔

اب جولائی 1899ء کو بیڈن۔ پاول چھٹی پر تھا اور فوجی کلب میں دوپہر کے کھانے سے لطف اندوز ہو رہا تھا جبکہ اسے برطانوی فوج کے کمانڈر انچیف لارڈ ولسلے سے ملاقات کے احکامات موصول ہوئے۔ اس کو بتایا گیا کہ ٹرانسوال اور اورنج فری اسٹیٹ کے بور صوبوں میں جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے تھے اور اسے شمال' مغربی سرحدی افواج کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے جنوبی افریقہ روانہ کیا جا رہا تھا۔

اس ویران اور سنسان مقام پر بیڈن۔ پاول کو پیادہ فوج کی دو رجمنٹیں تیار کرنی تھیں...... مابعد جو رھوڈیشیا رجمنٹ اور پروٹیکٹوریٹ رجمنٹ کہلائیں۔ ان رجمنٹوں کی تیاری کا مقصد برطانوی سرحدوں کا دفاع سرانجام دینا تھا اور دشمن کو جنوب' مشرق میں ساحل یا جنوب میں راس سے دور رکھنا تھا کیونکہ ان مقامات پر فوری پیش قدمی کی توقع تھی۔ بالالفاظ دیگر بیڈن۔ پاول کی ذمہ داری کا ایک حصہ اس چیلنج کا مقابلہ کرنا تھا جس چیلنج کا مقابلہ مافیکنگ میں بیٹھ کر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

کرنل نے اپنی دو رجمنٹوں کو تربیت فراہم کی۔ ان رجمنٹوں کیلئے جو جوان بھرتی کیے گئے تھے وہ نہ تو گھوڑ سواری کر سکتے تھے اور نہ ہی نشانہ بازی کر سکتے تھے۔ محض دو ماہ بعد رھوڈیشیا رجمنٹ نے مابعد کرنل ہربرٹ پولمر کی کمان میں بہترین خدمات سرانجام دی تھیں۔ پلومر حرکت پذیر رہا۔

اس نے اپنے اسٹور کے کسی بھی سپلائی ڈپو پر انحصار کرنے سے انکار کر دیا اور وہ بیل گاڑیوں میں اپنے ہمراہ اسلحہ لے گیا۔ لیکن جنگ شروع ہونے سے قبل ہی بیڈن۔ پاول اپنی حرکت پذیری سے دست بردار ہو چکا تھا۔ اس نے گاؤں بیک ہانا لینڈ کو اپنی بیس بنانا چاہا مگر مابعد اس کی رائے بدل گئی اور اس نے مافیکنگ کو اپنی بیس بنانے کا فیصلہ کیا...... یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جس میں 2,000 سفید فام آباد تھے...... راس تابولا وایو اور ٹرانسوال سرحد سے تقریباً دس میل...... یہ ایک خطرناک عمل تھا۔ لیکن بیڈن۔ پاول نے دو وجوہات کے پیش نظر یہ فیصلہ سرانجام دیا تھا۔

مافیکنگ میں بہت سے لوگ تحفظ کا مطالبہ کر رہے تھے جو کہ راس سے فراہم نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس مقام پر سامان حرب کا ذخیرہ وافر مقدار میں موجود تھا۔ کچھ ذخیرہ رھوڈیشیا روانہ کرنے کے لئے محفوظ تھا مگر جنگ کے خطرے کے تحت اسے آگے روانہ نہیں کیا گیا تھا اور اسی مقام پر محفوظ کر لیا گیا تھا۔

ایک مافیکنگ ٹھیکیدار راس ٹاؤن سے لاکھوں پونڈ ایک پرونوٹ کے ذریعے لایا تھا جو میجر لارڈ ایڈورڈ سیسل نے جاری کیا تھا جو وزیر اعظم کا بیٹا تھا اور بیڈن۔ پاول کا چیف آف سٹاف بھی تھا۔

لہٰذا بیڈن۔ پاول نئی پروٹیکٹوریٹ رجمنٹ کے ساتھ مافیکنگ کی جانب روانہ ہوا۔ اس کے دوست اس رجمنٹ کو "بی۔ پی" کے نام سے پکارتے تھے۔ اس رجمنٹ میں 469 افسران اور جوان شامل تھے۔ اس نے جنگ کے آغاز سے ایک ہفتہ قبل اس رجمنٹ کی کمان سنبھال لی تھی۔ اس قصبے میں برطانوی جنوبی افریقی پولیس بھی موجود تھی...... بیک ہانا لینڈ رائفل بھی موجود تھی...... ٹاؤن گارڈ بھی موجود تھے...... یہ سب ملا کر 578 جوانوں کی نفری بنتی تھی...... اس طرح مافیکنگ میں مسلح جوانوں کی کل تعداد تقریباً 1,250 تھی۔

یہ قصبہ بذات خود بھی اس محاصر کے لئے ایک مفید جگہ ثابت ہو سکتا تھا جس کی امید ہر کوئی کر رہا تھا۔ اس قصبے میں ہوٹل...... ہسپتال...... دوکانیں...... کنوئیں...... بیرکیں...... ریلوے ورکشاپیں وغیرہ بھی موجود تھیں جبکہ قصبے کے جنوب میں ایک میل کے فاصلے پر دریا مالو پو بھی بہتا تھا۔

بی۔ پی نے پہلے ہی دفاع کو مضبوط بنانے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ شہری آبادی کے لئے خندقیں کھودی جا رہی تھیں۔ قصبے کے دونوں اطراف کی حفاظت کیلئے جنگلہ تعمیر کیا گیا تھا۔ بکتر بند گاڑیاں تیار کھڑی تھیں۔ اس کے علاوہ بارودی سرنگیں بھی بچھا دی گئی تھیں۔

ہلکا اسلحہ بھی بھاری مقدار میں موجود تھا۔ بور فرانس اور جرمنی سے اسلحہ درآمد کر رہے تھے اور ان کا اسلحہ زیادہ جدید نوعیت کا حامل تھا۔ بیڈن۔ پاول کسی طویل محاصرے کی توقع نہیں کر رہا تھا اور اس نے اپنے لوگوں کو یہ باور کروایا تھا کہ ان کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ مطمئن رہیں اور بوران کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے وگرنہ ہم ان سے بخوبی نپٹ لیں گے۔

لہٰذا مافیکنگ...... جس کے معنی ہیں "پتھروں کی جگہ"...... تاریخ کے عجیب و غریب محاصروں میں سے ایک محاصرے کے طور پر منظر عام پر آیا۔ بی۔ پی ڈٹی رہی...... قصبے کی آبادی اور اپنے اسلحے کے ہمراہ ڈٹی رہی اور اس کوشش میں مصروف رہی کہ بوران سے ایک واضح فاصلے پر رہیں۔

بوروں نے قلعے تعمیر کئے اور زیادہ تر انحصار غیر موثر بمباری پر کیا۔ یہ امور 217 دنوں تک جاری رہے۔

اس کا آغاز 13 اکتوبر 1899ء بروز جمعہ کو ہوا تھا...... اعلان جنگ کے دو روز بعد۔ چھ ہزار گھوڑ سوار بور جنرل کرونج کی زیر قیادت روبہ عمل تھے۔ بی۔ پی بھی تیار تھی لیکن کرونج ابھی تذبذب کا شکار تھا کہ مافیکنگ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جائے یا نہ کی جائے۔

اگلے روز طلوع فجر پر قصبے کے جنوب میں بوروں پر کچھ گھوڑ سوار حملہ آور ہوئے۔ ان پر گولیوں کی ایک بوچھاڑ کی گئی۔ دشمن منتشر ہو گیا اور گھوڑ سوار واپس پلٹ آئے۔ بی۔ پی نے شمال کی جانب ایک بکتر بند گاڑی روانہ کی۔ جلد ہی یہ گاڑی دشمن کے گھیرے میں آ گئی۔ کیپٹن فٹز کلارینس کی کمان میں ایک اسکوارڈن اس کی بازیابی کیلئے روانہ کیا گیا۔ کیپٹن نے ایک پہاڑی کی چوٹی کی جانب دشمن کا تعاقب کیا جہاں پر آتشزدگی کی بنا پر تمام تر اسکوارڈ کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کافی ہلاکتیں دیکھنے میں آئیں اور اسلحہ بھی کم پڑ گیا۔ اور بی۔ پی کو ٹیلی فون کے ذریعے مطلع کیا گیا کہ وہ ایک اور فوجی دستہ روانہ کرے۔ لہٰذا ایک اور فوجی دستہ روانہ کیا گیا۔ بوروں نے اچانک فائرنگ بند کر دی اور واپس چلے گئے۔

ایک اور ناخوشگوار واقعہ پیش آیا جس کی بدولت اٹھارہ برطانوی ہلاک ہوئے۔ بی۔ پی نے کرونج کو پیغام بھیجا جس میں یہ شکایت کی گئی تھی کہ اس کی سپاہ نے ریڈ کراس کے اہلکاروں پر حملہ کیا تھا۔ اس کے جواب میں ایک بور ڈاکٹر معذرت کرنے کے لئے قصبے میں بھیجا گیا۔ بی۔ پی نے اس ڈاکٹر کا خیر مقدم کیا۔ اسے دوپہر کا کھانا کھلایا اور واپسی پر اسے وہسکی اور بیئر کے تحائف بھی پیش کئے جو اس کے کمانڈر کے لئے تھے۔

اگلے روز بمباری...... جو تمام تر محاصرے کے دوران جاری رہی...... کا آغاز ہوا۔ بوروں کی توپوں کی کارکردگی بہتر نہ تھی اور گولے ایک جنگی نمائندے کے بقول:۔

''اس نکمے معیار کے حامل تھے کہ ان میں دھماکہ کرنے کی قوت سرے سے ہی موجود نہ تھی۔''

وہ کوئی نقصان پہنچائے بغیر مٹی کی دیواروں میں پیوست ہو جاتے یا زمین پر گر کر ناکارہ ہو جاتے۔ نصف دن تک اس گولہ باری کی بدولت جو ہلاکتیں ہوئیں ان میں محض ایک مرغی شامل تھی اور ایک کتا زخمی ہوا تھا۔

اس کے بعد کرونج نے ایک اور ایلچی بھیجا جس نے یہ پیغام دیا کہ غیر مشروط طور پر قصبے کو خالی کر دیا جائے تا کہ:۔

''مزید خون خرابہ روکا جا سکے۔''

اس ایلچی کو کھانا کھلایا گیا...... وہسکی اور سوڈے سے اس کی تواضع کی گئی اور اس سوال کے ساتھ اسے واپس روانہ کیا گیا کہ:۔

''خون خرابے کا آغاز کب ہو گا؟''

ایک ہفتے کے بعد کرونج کا جواب موصول ہوا کہ:۔

''عزت مآب سر...... میرے خیال میں مافیکنگ پر تسلط قائم کرنے کا دوسرا کوئی راستہ موجود نہیں ہے ماسوائے بمباری......

لہٰذا میں اگلے سوموار صبح 6 بجے سے دوبارہ بمباری کا آغاز کر دوں گا۔''

یہ خبر گرم تھی کہ دشمن کی ایک بڑی توپ بھی میدان جنگ میں پہنچ رہی تھی۔ لہٰذا عوام کے لئے زیادہ گہری خندقیں کھودی گئیں۔ خطرے کی

نشاندہی کرنے والی گھنٹیوں کے نظام میں بہتری لائی گئی...... ہر کوئی بمباری کے انتظار میں تھا...... حتیٰ کہ منگل کا دن آن پہنچا...... بمباری...... کب؟ بمباری کا آغاز ہوا لیکن یہ بمباری بھی بودی ثابت ہوئی اور کسی قسم کے نقصان سے دوچار نہ کر سکی۔ لوگ اب خندقوں کا رخ بھی نہ کرتے تھے بلکہ کھلی جگہ پر رہنے کو ترجیح دیتے تھے...... تمام تر محاصرے کے دوران 497, 1 راؤنڈ فائر کئے گئے اور بیس سے کم افراد ہلاکت کا شکار ہوئے۔

لیکن بور رینگتے ہوئے کئی ایک مقامات پر نزدیک تر پہنچ چکے تھے اور ماہ نومبر میں قصبے کے جنوب میں وہ ایک پہاڑی سے پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔ ان کے ایک کیمپ کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ فز کلارینس اور اس کے ساتھیوں نے مشرق کی جانب ایک مورچے میں ان کے 40 افراد کو ہلاک کر دیا۔

دسمبر کے آخر تک کوئی کارروائی منظر عام پر نہ آئی ماسوائے کریکی اور اس کے دوستوں کی جانب سے...... اگرچہ خوراک کا راشن مقرر کر دیا گیا تھا لیکن ہنوز خوراک کافی مقدار میں موجود تھی۔ روزانہ فی فرد ایک پاؤنڈ گوشت' ڈبل روٹی اور سبزیاں فراہم کی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ ڈبہ بند خوراک بھی کثیر مقدار میں موجود تھی۔ چونکہ یہ افریقہ کا موسم گرما تھا لہٰذا مکھیاں اور رینگنے والے کیڑے مکوڑے بڑے دشمن تھے۔ اس کے علاوہ بوریت بھی ایک دشمن کا کردار سرانجام دے رہی تھی لیکن کرسمس کے آنے سے جیسے بہار آ گئی۔ رنگا رنگ پروگرام اور کھانے پینے کا اہتمام ہونے لگا۔

اتوار کو عارضی صلح کا دن تصور کیا گیا۔ بوروں نے اپنی بائبل پڑھی اور اہل برطانیہ جم خانے گئے...... کرکٹ کھیلی...... فٹ بال کھیلا اور پولو کھیلی۔

ماہ جنوری میں ٹائیفائڈ کی وبا پھوٹ پڑی۔ یہ مہینہ اس وبا سے نپٹنے اور اسٹور کی پڑتال کے علاوہ اپنی کمزوریاں دور کرنے اور اپنے آپ کو مزید مضبوط بنانے میں گزرا۔

ماہ فروری میں جنگ کا رخ بدل چکا تھا۔ جنوب کی جانب لیڈی اسمتھ اور کمبرلے فارغ کر دیے گئے تھے۔ کرونج جو اپنے کچھ فوجی دستوں کے ہمراہ مافیکنگ سے نکل چکا تھا اسے گھیرے میں لے لیا گیا اور ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا گیا۔ آزادی کی امید پیدا ہونے لگی اور بی۔ پی کا مورال بھی بڑھ چکا تھا۔ انہوں نے بوروں کو جنوب' مشرق کی جانب دھکیل دیا تھا۔ ماہ مئی میں دشمن نے قصبے پر قبضہ جمانے کے لئے دریا کی جانب سے ایک بھرپور حملہ کیا اور اسے شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے بعد بور کمانڈر اور اس کے افسران کو رات کے کھانے پر مدعو کیا گیا۔ اس دوران عام جنگی صورت حال کچھ ایسا رخ اختیار کر گئی کہ امدادی فوج روانہ کرنے کی ضرورت درپیش تھی اور 4 مئی کو یہ کمبرلے کے نزدیک سے شمال کی جانب روانہ ہوا۔ اس فوجی دستے نے 250 میل پیش قدمی سرانجام دیتے ہوئے مافیکنگ کے اس مقام پر پہنچنا تھا جہاں پر اسے پلومر سے جا ملنا تھا جس کے ساتھ رابطہ بحال کر لیا گیا تھا۔ پلومر کے پاس 800 جوان تھے۔ 16 تاریخ کو متحدہ فوج نے مافیکنگ کی جانب پیش قدمی کی اور عین مہارت کے ساتھ بوروں سے بچتی بچاتی اپنی منزل مقصود تک جا پہنچی۔ 18 تاریخ کو اس نے پیش قدمی کی اور اسی اثنا میں دشمن کی تمام تر فوج مشرق کی جانب دور ہٹ گئی...... اس نے ٹرانسوال کی جانب رخ کیا...... کسی نے بھی ان کا تعاقب کرنے کی زحمت نہ کی۔ محاذ جنگ پر سب کچھ خاموشی کے ساتھ ظہور پذیر ہو رہا تھا۔ کسی قسم کا کوئی ہیجان برپا نہ تھا۔ لیکن تب مافیکنگ کا محاصرہ ختم کر دیا گیا۔

یہ سب کچھ کسی مہم سے کم نہ تھا...... یہ اس لئے عظیم تھا کہ برطانوی قوم نے اسے اس رنگ میں رنگنے کی کوشش کی تھی۔ بیڈن۔ پاول کی واہ،

واہ ہو رہی تھی۔ پانچ روز تک لندن اور انگلستان کے ایک بڑے حصے پر پاگل پن جیسی کیفیت طاری رہی۔ تقریبات اور خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ لیکن مکمل فتح حاصل نہ ہوئی تھی...... محض اخلاقی فتح تھی۔ مغرور وکٹورین بوروں کی کامیابی سے ہل چکے تھے۔ کیا یہ جاہل......فوجی ساز و سامان سے عاری کسان شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر سکتے تھے؟ مافیکنگ کے محاصرے کے دوران برطانیہ کا وقار داؤ پر لگا ہوا تھا اور وہ شک وشبہات اور خوف وہراس کا شکار تھا اور بالآخر یہ محاصرہ اپنے اختتام کو پہنچا تو برطانیہ کی جان میں جان آئی۔

ونسٹن چرچل کی بور قید سے رہائی

وہ ایک خندق میں دبکا بیٹھا تھا۔ موسم نم آلود تھا اور اندھیرا ابھی چھا چکا تھا۔ سردی بھی اپنے جوبن پر تھی۔ تھکاوٹ کی وجہ سے اس کے اعصاب درد کر رہے تھے۔ مسائل کی وجہ سے اس کے اعصاب درد کر رہے تھے۔ اس کا ذہن ان مسائل کی وجہ سے پریشان تھا جو مسائل اس میں سمائے ہوئے تھے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور اس کا جذبہ ماند پڑتا چلا جا رہا تھا۔

تب اسے ریل گاڑی کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز ریلوے اسٹیشن سے آ رہی تھی جو اس سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر واقع تھا۔

یہ ریل گاڑی ابھی کافی دور تھی۔ ایک میل یا اس سے زائد دور...... اسٹیشن کی دوسری جانب...... لیکن جلد ہی نزدیک تر پہنچ رہی تھی۔

کیا یہ رکے گی؟

اگر وہ نہ رکی اور پچاس ساٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے اس کی جانب بڑھتی رہی...... تب اس کے لئے اس میں سوار ہونے کا کوئی موقع نہ تھا۔ تاہم اگر یہ اسٹیشن پر رکی...... تب وہ اس کے اسٹیشن پہنچنے تک اپنی رفتار بڑھا نہ پائے گی...... ایسی صورت میں اس کے لئے موقع تھا کہ وہ گاڑی پر سوار ہو سکتا تھا۔

یہ سب کچھ اس کی تقدیر پر منحصر تھا۔ اگر تقدیر یاوری کرتی تو وہ گاڑی پر سوار ہو سکتا تھا...... اور تقدیر اس کا ساتھ دیتی نظر آ رہی تھی۔ کیونکہ گاڑی کی رفتار آہستہ ہونی شروع ہو گئی تھی۔ وہ ابھی تک خندق میں دبکا بیٹھا تھا اور گاڑی کے رکنے کی آواز سن رہا تھا...... اسے گاڑی پر بھاری سامان لادنے کی آوازیں آ رہی تھیں...... اور گاڑی سے سامان اتارنے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

پانچ منٹ بعد گاڑی دوبارہ چل پڑی۔ گاڑی اس کے سر سے ایک یا دو فٹ کے فاصلے پر رینگ رہی تھی۔ اس کی زرد روشنی اس پر پڑ رہی تھی۔ وہ خندق کی دیوار کے ساتھ چپک گیا کہ کہیں روشنی اس کی موجودگی کا راز ظاہر نہ کر دے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ بالآخر انجن کی گھن گرج اپنے جوبن پر پہنچ گئی اور اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا۔

ایک لمحے بعد وہ گاڑی کے دو ڈبوں کے درمیان کپلنگ پر اپنی گرفت مضبوط کر چکا تھا۔ اس نے ایک اور کوشش سرانجام دی۔ اب وہ کپلنگ پر بیٹھ چکا تھا۔

جب اس کا سانس بحال ہوا تب اس نے رینگتے ہوئے گاڑی کے اندر داخل ہونے کی جدوجہد شروع کی۔ وہ گاڑی کے ایک ایسے ڈبے میں داخل ہو چکا تھا جس میں کوئلے کی خالی بوریاں رکھی تھیں۔ یہ بوریاں اس قدر نرم تھیں کہ کوئی بھی فرد ان پر لیٹ سکتا تھا۔ وہ ان بوریوں پر دراز ہو کر سو گیا۔ ابھی اس کی کافی زیادہ پریشانیاں باقی تھیں۔ لیکن ابھی اس کے پاس کچھ مہلت باقی تھی۔

وہ بور جنگ کے دوران عازم جنوبی افریقہ ہوا تھا۔ وہ لندن مارننگ پوسٹ کے ایک نمائندے کی حیثیت سے جنوبی افریقہ جارہا تھا۔ وہ اس نکتہ نظر کا حامل تھا کہ وہ برطانوی فوج میں ایک جونیئر فوجی افسر کی نسبت بطور ایک لکھاری زیادہ دولت کما سکتا تھا۔ وہ صاحب ثروت نہ تھا لیکن اسے دولت کی ضرورت تھی۔ وہ ایسے امور پسند کرتا تھا جن میں دولت کا ملوث ہونا ضروری تھا۔ مثلاً پولو کھیلنا...... شیمپئن پینا...... کتب خریدنا وغیرہ۔ وغیرہ...... لہٰذا اس نے فوج کو خیر باد کہا اور جنوبی افریقہ چلا آیا۔

گاڑی کے ایک سرے پر تین ویگنیں تھیں...... تقریباً درمیان میں ایک انجن تھا اور دو ویگنیں دوسرے سرے پر تھیں۔ ان ویگنوں میں فوجی سوار تھے۔ اس کے علاوہ اس گاڑی میں ''مورننگ پوسٹ'' کا ایک نوجوان نمائندہ بھی موجود تھا۔

چودہ میل کا سفر طے کرنے کے بعد جب گاڑی پر دشمن حملہ آور ہوا جو گھات لگائے بیٹھا تھا تب اس نوجوان نمائندے کا جوش و جذبہ دیدنی تھا۔ اسے موقع میسر آ رہا تھا کہ وہ اس کارروائی کو بہ نفس نفیس دیکھے اور انگلستان میں اپنے اخبار کے قارئین کی خدمت میں پیش کرے۔

بوروں نے ریلوے لائن تباہ کر دی تھی لہٰذا گاڑی پٹڑی سے اتر چکی تھی۔ ونسٹن چرچل پٹڑی سے اتری ہوئی اس گاڑی کی فٹ پلیٹ پر کھڑا تھا۔ جوں ہی اس نے اپنا قدم زمین پر رکھا ایک گولی سنسناتی ہوئی اس کے کان کے قریب سے گزر گئی۔ اس نے بھاگنا شروع کر دیا اور گولیوں نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ کہیں سے ایک گھوڑ سوار نمودار ہوا اور اس پر چلایا اور اپنا گھوڑا اس کے نزدیک کھڑا کر دیا۔

اس گھوڑ سوار نے رائفل اس کے سینے پر رکھی...... ونسٹن چرچل نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے...... بالفاظ دیگر ہتھیار پھینک دیے۔

جلد ہی وہ پری ٹوریا کی جیل میں بند تھا۔ ایک جنگی نمائندہ ہونے کی حیثیت سے اس کے ساتھ افسروں جیسا سلوک روا رکھا گیا اور اسے دیگر ساتھی قیدیوں کے ہمراہ اسٹیٹ ماڈل اسکول میں رکھا گیا۔

چرچل نے دو افسران کے ساتھ مل کر جیل سے بھاگنے کا پروگرام بنایا اور 12 دسمبر 1899ء کو اس پروگرام پر عمل کرنے کا آغاز کیا۔ انہوں نے دیوار پھلانگ کر فرار ہونے کا منصوبہ بنایا تھا۔

چرچل دیوار پھلانگنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے مصائب کا بھی آغاز ہو چکا تھا۔ سنتریوں کو کچھ کچھ شبہ ہو چکا تھا۔ لہٰذا الارم بجا دیے گئے تھے۔ اب اس کے دیگر دونوں ساتھیوں کے لئے کوئی موقع نہ تھا کہ وہ بھی دیوار پھلانگ کر اس کے ساتھ آن ملتے۔ چند لمحوں بعد تمام تر پری ٹوریا اس کی تلاش میں مصروف تھی۔ اس کے دیگر دونوں ساتھی سرگوشیوں میں اسے کہہ رہے تھے کہ وہ دیوار پھلانگ کر واپس جیل میں آ جائے کیونکہ ابھی اس عمل درآمد کیلئے کچھ وقت موجود تھا۔

اب اگر وہ جیل میں واپس کودنے کی خواہش بھی کرتا تو اس کی یہ خواہش فضول تھی کیونکہ اب یہ موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ وہ دشمن کے علاقے کے وسط میں کھڑا تھا۔ اس کے پاس کوئی نقشہ یا کمپاس بھی موجود نہ تھی۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے جو راشن انتہائی محتاط انداز سے بچایا تھا وہ ہنوز جیل میں تھا کیونکہ وہ اس کے ان دونوں ساتھیوں کی جیبوں میں محفوظ تھا جو جیل سے فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ اس کے پاس کل 75 پونڈ موجود تھے۔ وہ نزدیک ترین جائے پناہ سے 300 میل دور تھا...... یہ جائے پناہ پرتگالیوں کی لورینکو مارکوئس کی بندرگاہ تھی۔

وہ رات کو سفر طے کرتا رہا۔ کچھ لوگوں نے اس کی جانب دیکھا لیکن اسے نظر انداز کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک ریلوے لائن تک پہنچ چکا تھا اور اس کی خوش قسمتی تھی کہ یہ لورینکو مارکوئس کی جانب جاتی تھی اور وہ یہ ریلوے لائن ایک دوسری ریلوے لائن نہ تھی جو اس نے نقشے میں دیکھی تھی جو شمال کی جانب جاتی تھی...... پیٹرز برگ کی جانب؟ وہ رات کے اندھیرے میں دو گھنٹوں تک اس ریلوے لائن پر چلتا رہا حتیٰ کہ وہ ایک اسٹیشن پر جا پہنچا۔ اس کے بعد اس ریلوے لائن کو چھوڑ دیا اور اسٹیشن کی پچھلی جانب کا چکر کاٹتے ہوئے 200 گز دور دوبارہ اسی ریلوے لائن پر آن پہنچا۔ وہ دبکا بیٹھا رہا اور گاڑی کا انتظار کرتا رہا۔

جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں کہ وہ ریل گاڑی میں سوار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا اور اس عمل کے دوران وہ زخمی ہونے سے بمشکل بچا تھا۔ اس کے بعد وہ نیند کی وادی میں گم ہو گیا تھا۔

جب وہ نیند سے بیدار ہوا تو اسے سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اسے پہلا موقع میسر آتے ہی ریل گاڑی سے نیچے اترنا تھا اور پانی تلاش کرنا تھا تاکہ اپنی پیاس بجھا سکے کیونکہ گاڑی نے منزل مقصود تک پہنچنے میں ابھی کافی دن لگانے تھے اور اس دوران اس کا پیاس کی شدت کے سبب ہلاک ہونے کا خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا۔

گاڑی کے رکنے کا فی الحال کوئی پروگرام نظر نہ آ رہا تھا۔ چرچل کو اب چلتی گاڑی سے نیچے کودنا تھا۔ یہ عمل درآمد اس کے گاڑی میں سوار ہونے کے عمل درآمد سے بڑھ کر ناخوشگوار عمل تھا۔ وہ ایک خندق میں چھلانگ لگا چکا تھا اور اپنی کامیابی پر نازاں تھا۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد اسے پانی میسر آ گیا اور اس نے ایک اونٹ کی موافق پانی پیا تاکہ اس کے اندر کئی گھنٹوں تک پانی کا ذخیرہ موجود رہے۔

اس نے اپنا سفر جاری رکھا لیکن اب وہ دن کی روشنی میں سفر طے کر رہا تھا۔ یہ سفر زیادہ محفوظ نہ تھا کیونکہ ہر ایک پل پر محافظ موجود تھے...... ہر ایک اسٹیشن لوگوں کے ہجوم سے بھرا ہوا تھا۔ لہٰذا اس نے دن کا زیادہ تر حصہ چھپ چھپا کر گزارا اور شام ہونے پر دوبارہ عازم سفر ہوا۔ یہ ایک مشکل سفر تھا کیونکہ سفر کا زیادہ تر حصہ اسے جانوروں کی طرح رینگ کر طے کرنا پڑتا تھا۔ وہ کیچڑ اور دلدل سے گزرتا رہا اور ان ندیوں سے گزرتا رہا جن کا پانی اس کی کمر تک تھا۔

اندھیرے میں اس نے ایک غیر متوقع مقام کی جانب دیکھا تو اسے ایک نہیں بلکہ تین ریل گاڑیاں کھڑی دکھائی دیں۔

وہ سوچنے لگا کہ:۔

"میں کس ریل گاڑی میں سواری اختیار کروں؟"

پری ٹوریا سے باہر نکلنا اس کے لئے وبال جان بن چکا تھا۔

اس کے لئے فیصلہ سرانجام دیا جا چکا تھا۔

جب اس کے کان کے نزدیک سے گولی گزری تھی اس کے بعد وہ سیدھا کھڑا ہو گیا تھا اور کچھ فاصلے پر واقع ایک دیہات کی جانب چل دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سیاہ فام بوروں سے نفرت کرتے تھے اور اگر یہ ان لوگوں کا دیہات ہوا تب وہ محفوظ تھا۔ دوسری صورت میں یہ بوروں کا گاؤں بھی

ہو سکتا تھا۔

یہ کسی کا بھی گاؤں نہ تھا...... یہ کوئلے کی ایک کان تھی اور اس کے اردگرد چند مکان تھے۔ اس نے محتاط انداز میں ایک گھر کا دروازہ منتخب کیا اور اس پر دستک دی۔ دستک کے جواب میں ایک آواز بلند ہوئی اور چرچل نے با آواز بلند انگریزی میں جواب دیا کہ وہ ایک حادثے کا شکار ہو چکا تھا۔ ایک لمبا تڑنگا شخص جس کا چہرہ زرد تھا اس نے دروازہ کھولا اور چرچل کی جانب دیکھا۔ برسوں بعد چرچل نے اس مڈبھیڑ کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ:۔

''میں نے اسے بتایا تھا کہ میں ایک حادثے سے دوچار ہو چکا تھا۔ میں اپنے دوستوں سے ملنے کو ماٹی پورٹ جا رہا تھا کہ میں گاڑی سے نیچے گر گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میرا کندھا اپنی جگہ سے ہل چکا تھا۔''

''یہ ایک حیران کن بات ہے کہ کوئی کیسے ایسی چیزیں سوچ لیتا ہے۔ میں نے اپنی داستان ایسے بیان کی جیسے میں نے اسے دل کی گہرائیوں سے یاد کر رکھا تھا۔''

اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس اجنبی نے اس کی داستان کی چھان بین کی کوشش نہ کی تھی کیونکہ وہ ایک انگریز تھا اور ٹرانسوال کوئلے کی کان کی نگرانی پر مامور تھا۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کا مہمان ونسٹن چرچل تھا تب جان ہوورڈ نے اس امر کی تصدیق کی کہ فوجی اس کی تلاش میں مصروف تھے اور یہ کہ فرار ہونے والے قیدی کی تین ہزار تصاویر تقسیم کی جا چکی تھیں...... ہر ایک ڈاک خانے کو ٹیلی گرام بھیجی جا چکی تھیں اور ملک کے ہر ایک ریلوے اسٹیشن کو بھی اس فرار کے بارے میں اطلاع کی جا چکی تھی...... اور اس کی زندہ یا مردہ گرفتاری پر ایک بڑے انعام کا بھی اعلان ہو چکا تھا۔

چرچل کو کوئلے کی کان میں پہنچا دیا گیا تھا اور موم بتیاں روشن کر دی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ اس کے لئے وسکی اور سگار کے ڈبوں کا بھی بندوبست کر دیا گیا تھا۔ اس کا میزبان چاہتا تھا کہ وہ خوشگوار آرام سے لطف اندوز ہو سکے۔

چرچل نیند کی وادی میں گم ہو چکا تھا...... جب وہ بیدار ہوا اور موم بتیاں جلانے کی کوشش کی تو اس کے علم میں یہ بات آئی کہ چوہے انہیں کھا چکے تھے۔ وہ کئی گھنٹوں تک اندھیرے میں بیٹھا رہا۔

وہ تین روز تک اس مقام پر قیام پذیر رہا...... لیکن تمام وقت وہ اندھیرے میں نہ ڈوبا رہا تھا کیونکہ کھانے کے ساتھ اسے مزید موم بتیاں فراہم کر دی گئی تھیں۔ اسے یہ ہدایت بھی کی گئی کہ وہ ان موم بتیوں کو چوہوں سے بچا کر رکھے اور سونے سے بیشتر اسے اپنے سرہانے کے نیچے محفوظ کرے۔

19 دسمبر کی صبح دو بجے اس نے ایک بار پھر کھلی فضا میں سانس لیا۔ اس کا میزبان اسے ایک ریلوے ویگن کی جانب لے گیا۔ اس ویگن میں اون لورینکو مارکس لے جائی جا رہی تھی اور اس کی روانگی محض اس لئے زیر التواء تھی کہ پولیس کی بھاری نفری کوئلے کی کان اور اس کے اردگرد کے علاقے کی تلاشی لے رہی تھی۔ مارننگ پوسٹ کا نمائندہ جنگ اون سے بھری ہوئی ویگن میں اون کی معیت میں سفر طے کرنے پر مجبور تھا اور اس کے میزبان نے اسے خوراک اور چائے وغیرہ فراہم کی۔ تھوڑی دیر بعد اس ویگن کو گاڑی کے ساتھ منسلک کر دیا گیا اور گاڑی حرکت میں آ گئی۔

اگلے روز دو پہر تک گاڑی کو ماٹی پورٹ پہنچ چکی تھی۔ یہ آخری بور سرحدی قصبہ تھا۔

سفر کا یہ حصہ ایک خطرناک ترین حصہ تھا۔ وہ اپنی آزادی سے محض چند میل کی مسافت پر تھا لیکن اسے یقین کامل تھا کہ پولیس اور کسٹم حکام

لازماً گاڑی کی تلاشی لیں گے۔ لہٰذا وہ اپنا منہ اون کی بوریوں میں چھپائے لیٹا رہا اور کئی گھنٹوں تک اسی صورت حال کا شکار رہا حتیٰ کہ گاڑی اس اسٹیشن سے آگے بڑھ گئی۔

اب ایک اور مسئلہ درپیش تھا۔ کیا وہ اسٹاپ کومائی پورٹ کا تھا؟

بہرکیف اس نے باہر جھانکنے کی جرأت نہ کی۔ اگر یہ واقعی ہی کومائی پورٹ کا اسٹاپ تھا تب وہ محفوظ تھا...... اگر یہ کومائی پورٹ کا اسٹاپ نہ تھا تب گاڑی کے معائنے کی تلوار اس کے سر پر ہنوز لٹک رہی تھی۔

تب اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی جب اس نے اگلے اسٹاپ پر پرتگالیوں کو اپنی یونیفارم میں ملبوس دیکھا۔ اس نے انہیں ویگن کی ایک دراڑ سے دیکھا تھا۔ اس نے اب بھی اپنے آپ کو چھپائے رکھا تھا لیکن جب گاڑی دوبارہ حرکت میں آئی تو وہ خوشی سے دیوانہ ہوگیا۔ وہ ویگن سے باہر جھانکنے لگا...... خوشی سے چلانے لگا...... اور گانے لگا...... اس کے ساتھ ساتھ اپنے ریوالور سے ہوائی فائر بھی کرنے لگا۔

اور اس روز بعد از دوپہر گاڑی لورینکو مارکوئس پہنچ چکی تھی۔ یہاں پر بھی یہ خطرہ موجود تھا کہ بوروں کے حمائتی کہیں اسے گرفتار نہ کرلیں یا اغوا نہ کرلیں لہٰذا اس نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا حتیٰ کہ وہ برطانوی کونسلیٹ جا پہنچا۔ چند لمحوں بعد اس کی شناخت کا عمل مکمل ہو چکا تھا اور اب نمائندہ جنگ محفوظ تھا۔

اگرچہ چرچل میں بے بہا خوبیاں موجود تھیں۔ لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی اس کی خوش قسمتی تھی۔ اور اسی خوش قسمتی کی بنا پر اب وہ ایک ہیرو کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

اس کی خوش قسمتی برقرار رہی۔ اسے دوبارہ انگلستان آنے کی دعوت دی گئی اور اولڈھام کے حلقے سے پارلیمنٹ کا انتخاب لڑنے کی دعوت بھی دی گئی۔ یہ وہی حلقہ تھا جو اس سے پیشتر اسے مسترد کر چکا تھا۔ اب وہ ایک عالمگیر ہیرو تھا۔ اسے اب اپنی انتخابی مہم چلانے کی بھی ضرورت درپیش نہ تھی۔ لیکن اس نے اپنی انتخابی مہم چلائی تاکہ وہ اپنے علاقے کے رائے دہندگان پر یہ واضح کر سکے کہ جس شخص نے اسے ٹرانسوال کی کوئلے کی کان میں انتہائی مہارت کے ساتھ چھپائے رکھا تھا وہ مسٹر ڈیومیسپ کے علاوہ کوئی نہ تھا...... جس کا تعلق اولڈھام سے تھا۔

اس کے رائے دہندگان یہ سن کر خوشی سے دیوانے ہوگئے تھے۔

راجر پوکاک کی کینیڈا تا میکسیکو گھوڑ سواری

فورٹ میک لیوڈ۔ مغربی کینیڈا تا میکسیکو شہر...... دونوں کے درمیان تین ہزار میل کا فاصلہ حائل ہے...... اس فاصلے کو گھوڑ سواری کے ذریعے طے کرنا کسی بھی معیار کے تحت ایک مہم سرانجام دینے سے کم نہیں ہے...... لیکن راجر پوکاک کے نزدیک یہ مہم زندگی کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہونے والا محض ایک واقعہ تھا۔ اس کی زندگی کو قرار حاصل نہ تھا۔ وہ ایک بے چین روح تھی۔ اپنی بے چین زندگی میں اس نے تقریباً ہر قسم کی ملازمت اختیار کی...... ایک پولیس مین سے لے کر ایک مبلغ تک...... اس نے ہر ایک چیز سے جنگ کی حتیٰ کہ چکی ناگوں کے ساتھ بھی...... اکثر وہ گم ہو جاتا تھا مگر دوبارہ منظر عام پر آ جاتا تھا اور اپنی زندگی کی داستان کو آگے بڑھانے لگ جاتا تھا۔

اس نے 21 برس کی عمر میں رائل کینیڈین پولیس کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ اس سے پیشتر وہ ایک مبلغ کے فرائض سرانجام دیتا تھا اور اس سے بھی پیشتر وہ ایک اخبار کے ساتھ منسلک تھا۔ اب اس نے ان خطوط پر سوچنا شروع کیا تھا کہ اسے کوئی ریکارڈ توڑنا چاہیے...... بہت لطف آئے گا...... یہ یاد رکھا جائے گا کہ اس نے کوئی کارنامہ سرانجام دیا تھا...... کوئی ایسا کارنامہ...... جو اس سے پیشتر کسی نے سرانجام نہ دیا ہو۔

اگرچہ راجر پوکاک نے اپنی زندگی میں کئی اہم کام کیے تھے لیکن وہ اس نکتہ نظر کا حامل تھا کہ یہ کام دیگر افراد بھی سرانجام دیتے تھے...... شاید کسی بھی شخص نے وہ کام نہ کیے ہوں جو کام راجر پوکاک نے کیے تھے...... لیکن یہ کام کوئی بھی شخص سرانجام دے سکتا تھا...... یہ کام کوئی ریکارڈ قائم نہ کرتے تھے اور وہ ریکارڈ قائم کرنے کا متمنی تھا۔

لہٰذا ایک ایسا نوجوان جس کے پاس وافر مقدار میں دولت بھی موجود نہ ہو...... 19 ویں صدی کے آخری دورانیے کے دوران کیا کارنامہ سرانجام دے سکتا تھا...... ایسا کارنامہ جو آنے والے دور میں اس کا نام زندہ رکھ سکے؟

اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے اتنی گھوڑ سواری سرانجام دینی چاہیے جتنی گھوڑ سواری کسی بھی شخص نے سرانجام نہ دی ہو...... وہ کتنی گھوڑ سواری سرانجام دے سکتا تھا؟ اسے یہ تحقیقات سرانجام دینی تھیں۔

پہلے پہل اس کی تحقیق کے نتائج حوصلہ افزا نہ تھے۔ ایک شخص جس کا نام دمستری پش کوف تھا وہ ایک خچر پر ولادی ووسٹاک تا سینٹ پیٹرز برگ سفر سرانجام دے چکا تھا۔ اس عمل کے دوران اس نے چھ ماہ کی مدت میں 5,500 میل کا سفر طے کیا تھا۔ اس کے سفر کی اوسط 28 میل فی دن بنتی تھی۔

نئی دنیا اتنی وسیع سرزمین کی حامل نہ تھی کہ دمستری پش کوف کے ریکارڈ کو توڑنے کی کوشش کی جاتی۔ اس نے دوبارہ سوچ بچار شروع کر دی۔

کٹ کارسن نے مسی سپی تا کیلی فورنیا کا سفر گھوڑے پر طے کیا تھا اور اس کے سفر کے دوران مخالفانہ رویے کے حامل انڈین کا علاقہ بھی پڑتا تھا۔ یہ محض 2,200 میل کا سفر تھا...... لیکن اس نے خطرناک علاقے کی صورت حال کے تحت سفر طے کرنے کا ریکارڈ قائم کیا تھا۔

لیکن اب 1899ء میں مخالفانہ رویے کے حامل اتنے انڈین موجود نہ تھے کہ کارسن کے ریکارڈ پر حملہ آور ہونے کا موقع میسر آتا۔

لیکن وہ ریکارڈ قائم کرسکتا تھا۔ اگرچہ وہ اتنا سفر طے نہیں کر سکتا تھا جتنا سفر روسی نے طے کیا تھا لیکن وہ ایک کھلے...... نقشے کے نہ حامل مشکل ترین علاقے کا سفر طے کرسکتا تھا جو ہوٹلوں اور دیگر ایسی سہولیات کا بھی حامل نہ تھا جو سہولیات روسی مہم جُو کو دوران سفر حاصل رہی تھیں اور کارسن کی طرح نوجوان پوکاک اگرچہ کسی خطرناک صورت حال کا شکار نہ ہو سکتا تھا لیکن وہ اس سے دوگنا سفر بخوشی طے کرسکتا تھا۔

کیا یہ ایک ریکارڈ ہوگا؟

اس نے فیصلہ کیا کہ:۔

"ہاں...... یہ ایک ریکارڈ ہوگا۔"

لہٰذا 28 جولائی 1899ء کی صبح ہمارا ہیرو البرٹا میں فورٹ میک لیوڈ سے عازم سفر ہوا۔ جہاں تک امریکی سرحد کی حدود تھی وہاں تک چوکیاں قائم تھیں۔ وہ ایک چوکی سے گزرتا ہوا دوسری چوکی کی جانب بڑھتا رہا۔ چوکی پر موجود افراد اسے مختلف مشوروں سے نوازتے۔ وہ اس کی انگریزی سن کر لطف اندوز ہوتے۔ وہ گلابی رخساروں اور لمبی ناک کے حامل اس نوجوان کو پسند کرتے تھے اور اسے مختلف تحائف پیش کرتے تھے۔

40 میل کا مزید سفر طے کرنے کے بعد وہ مونٹانہ پہنچ چکا تھا۔ اسے یاد آیا کہ آج یوم آزادی تھا...... 4 جولائی...... بڑے انڈین کیمپ میں مختلف تقریبات کا اہتمام کیا گیا تھا۔ وہ اس کیمپ کی جانب چل دیا۔ اس کیمپ میں 1,400 انڈین موجود تھے۔ اس وقت تک اس نے اپنے سفر کے ساتھیوں کے طور پر کاؤبوائے نوجوان کا ایک گروپ بھی منتخب کرلیا تھا۔ ڈھول بج رہے تھے...... مرد اور عورتیں محورقص تھیں...... لیکن علیحدہ علیحدہ۔

اس نے ایک رات اس مقام پر بسر کی اور اس کے بعد وہ دوبارہ سفر پر روانہ ہوا۔ اس علاقے میں بھیڑوں کی بہتات تھی۔ وہ اور اس کے کاؤبوائے مویشیوں سے بھرے ہوئے اس علاقے کو دیکھ کر ازحد خوش ہوئے۔ ایک تنہا آوارہ گرد کے لئے کاؤبوائے اچھے ساتھی ثابت ہو رہے تھے۔ یہاں چرواہے بھی موجود تھے۔ 400 میل کے سفر کے دوران اس نے محض تین راتیں کیمپ میں گزاری تھیں۔

اب وہ ییلو اسٹون پہنچ چکا تھا۔ یہ جنگل مچھروں سے بھرا پڑا تھا۔ اس کے بعد وہ سیاحوں کے علاقے میں پہنچ چکا تھا۔ جنگل سیاحوں سے بھرے پڑتے تھے اور یہاں کے کسان ان سیاحوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے تھے۔ وہ ان سے زائد قیمتیں وصول کر رہے تھے۔ اس علاقے سے گزرنے کے بعد وہ ڈاگ رانچی پہنچ چکا تھا اور اس مقام کے بعد دریائے گرین کی وادی میں پہنچ گیا اور چند روز بعد ایک مسئلے نے سر اٹھایا...... یہ افتاد اچانک اس پر آن پڑی تھی...... اس نے گریٹ صحرا عبور کرنے کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا۔

لہٰذا اس نے ایک اور راستے کا انتخاب کیا کیونکہ میکسیکو کی جانب تین راستے جاتے تھے۔ اس راستے پر سفر طے کرنے کے دوران اسے کاؤبوائے اور جلاوطن لوگوں سے ملاقات کرنے کی توقع تھی جو چارہ اور پانی کے حصول میں اس کی رہنمائی سرانجام دے سکتے تھے اور میکسیکو کی جانب بھی اس کی رہنمائی کرسکتے تھے۔

سفر طے کرتے ہوئے وہ سان فرانسسکو کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے دو گھوڑوں کو ایک ہفتے کا آرام بہم پہنچایا

جائے۔لہٰذا اس نے ایک سیاح کا روپ دھار لیا......ایک ہوٹل میں رہائش اختیار کر لی اور وہ سب کچھ کرنے لگا جو سب کچھ دیگر لوگ کر رہے تھے۔

لیکن ایک ہفتے کے بعد وہ دوبارہ گھوڑے کی پشت پر سوار تھا اس کو یہ احساس ہی نہ تھا کہ وہ ریکارڈ توڑ چکا تھا۔اس کے اور میکسیکو کے قدیم شہر کے درمیان محض اتنی سڑک حائل تھی جتنی سڑک ایڈن برگ تا ڈوور ہے۔وہ ابھی تک غیر یقینی صورت حال کا شکار تھا کہ اس نے کون سا ریکارڈ توڑا تھا اور کیا کوئی ریکارڈ موجود بھی تھا جو اس نے توڑا تھا......اس دوران وہ علیل ہو گیا۔میکسیکو میں اپنے قیام کے پہلے ہی دن اسے گرفتار کر لیا گیا کیونکہ اس نے اپنے گھوڑوں کی غذا چوری ہونے پر اعتراض کیا تھا اور مابعد اسے رہا کر دیا گیا تھا۔

اس نے 3,600 میل کا سفر طے کیا تھا۔تین بہترین گھوڑوں نے اس سفر کو طے کیا تھا۔

اس سفر میں جو وقت صرف ہوا تھا وہ 28 جون 1899ء تا 21 جنوری 1900ء تھا......جو کہ 200 دن بنتے تھے......یعنی ایک دن میں اوسط 18 میل کا سفر طے کیا گیا تھا۔

ڈیزی بیٹز آسٹریلیا میں

ازابیل برڈ اور میری کنگزلی کی طرز کی قابل ذکر آخری وکٹورین مہم جو خواتین میں سے ایک خاتون نے بیس برس سے زائد عرصہ پیشتر وفات پائی تھی۔ اس کا نام ڈیزی بیٹز تھا اور اس کی طویل عمر کے ایک طویل دورانیے کے دوران اس کے نام کے چرچے تھے۔ اس نے اپنی تقریباً نصف زندگی مغربی اور جنوبی افریقہ کے قدیم باشندوں کے ہمراہ گزاری تھی۔ اس کے ان کے ساتھ اس قدر قریبی تعلقات استوار تھے کہ کسی اور سفید فام کے حصے میں نہ آئے تھے۔

وہ ماہر انسانیات نہ تھی کہ ان کا مطالعہ سرانجام دیتی بلکہ وہ ان کی دوست...... مشیر اور ان کو آرام وسکون سے دوچار کرنے والی ایک ہستی تھی۔ اس نے ان کے دل جیت لئے تھے...... ان کا وہ اعتماد حاصل کیا تھا کہ اسے ان قبائل میں ایک بزرگ خاتون کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ وہ اسے کباری سمجھتے تھے...... یعنی اپنی دادی جان تصور کرتے تھے۔ ڈیزی نے 1862ء میں جنم لیا تھا۔ اس کی جائے پیدائش او۔ ڈوائیر...... ٹپریری تھی۔ وہ ایک فوجی افسر کی بیٹی تھی جو سمندر پار ملکہ اور شہنشاہ کی خدمات سرانجام دیتا تھا۔ وہ انگریزی طور طریقوں کی دلدادہ تھی۔ اس سے بڑھ کر وہ تاج برطانیہ اور جو لوگ برطانوی سلطنت کا نظام چلاتے تھے ان کی دلدادہ تھی۔ وہ ان لوگوں کو انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور انہیں خراج تحسین پیش کرتی تھی جنہوں نے اس کی خدمت کی بجاآوری میں دور دراز علاقوں میں اپنی جانیں نچھاور کی تھیں۔ وہ آوٹ ریم فیملی سے بھی ازحد متاثر تھی جس کا سربراہ سرفرانسس آوٹ ریم تھا...... حکومت ہند کا ایک نمایاں خدمت گزار...... اس نے اور اس کی بیوی نے ڈیزی او۔ ڈوائیر کو باپ اور ماں کا پیار دیا تھا جبکہ اس کی ماں موت سے ہمکنار ہوگئی تھی اور مابعد اس کی دادی بھی موت سے ہمکنار ہوگئی تھی جو اس کی نگہداشت کے فرائض سرانجام دیتی تھی۔ سرفرانسس سے بالخصوص اس نے کم ترقی یافتہ لوگوں کے ضمن میں ذمہ داری کا مظاہرہ سرانجام دینے کا شعور حاصل کیا تھا اور وہ اس کی زندگی سے بھی ازحد متاثر تھی۔

پہلے پہل وہ صحت کی وجوہات کی بنا پر آسٹریلیا گئی تھی۔ وہ سینے کی تکلیف میں مبتلا تھی اور ڈاکٹروں نے اسے گرم آب وہوا میں مقیم ہونے کا مشورہ دیا تھا۔

کوئینز لینڈ میں اس نے جیک بیٹز کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ ان دونوں کے ہاں ایک بیٹے نے بھی جنم لیا تھا۔ چند برسوں تک ان کی ازدواجی زندگی خوشگوار رہی مگر اس کے بعد انہوں نے علیحدگی اختیار کر لی۔

وہ اپنے خاوند اور بچے دونوں کیلئے بہتر جذبات کی حامل نہ تھی۔ ایسی کوئی علامت نہیں ملتی جو یہ ظاہر کرتی ہو کہ وہ دونوں کے ساتھ جذباتی وابستگی کی حامل تھی اگرچہ اس نے بچے کے ساتھ اپنا رابطہ بحال رکھا تھا۔

آسٹریلیا میں دس برس گزارنے کے بعد جو چیز اسے واپس لندن لائی تھی وہ اس کی زندگی کا ناقابل بیان خلا تھا۔ وہ ایک خود مختار خاتون تھی۔ اس کے چند عزیز اور دوست تھے اور خاوند اور بیٹے دونوں کو وہ چھوڑ چکی تھی۔ لندن آنے کا اس کا بڑا مقصد اپنی مدد آپ کرنا تھا اور اپنے لئے روزگار تلاش کرنا تھا۔ پہلے وہ ایک سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہوئی۔ اس کے بعد پروف ریڈنگ کی اور مابعد صحافی بن گئی۔ لیکن آسٹریلیا کبھی بھی اس کے ذہن اور اس کی سوچوں سے محو نہ ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ایک محدود شہر میں رہتے ہوئے طمانیت حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ وہ آزادی کے مفہوم سے آشنا تھی اور اس قدر آشنا تھی کہ اس کے دور کی کوئی عورت اس سے بڑھ کر اس آشنائی کی حامل نہ تھی۔ وہ دوبارہ سیر و سیاحت کے میدان میں قدم رکھنا چاہتی تھی اور 1899ء میں اسے ایک موقع میسر آ گیا

''دی ٹائمز'' میں ایک خط چھپا تھا جو اس کی آسٹریلیا واپسی کا سبب بنا۔ یہ خط پرتھ مغربی آسٹریلیا کے رومن کیتھولک بشپ نے تحریر کیا تھا۔ اس خط میں اس نے یہ انکشاف کیا تھا کہ سفید فام آباد کار قدیم باشندوں پر ظلم وستم ڈھاتے تھے۔ ڈیزی بیٹز نے بذات موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دی ٹائمز کے دفتر سے رابطہ قائم کیا اور انہیں اپنی خدمات پیش کیں اور کہا کہ وہ موقع پر جا کر تحقیقات سرانجام دینا چاہتی تھی اور اخبار کو اس تحقیقات کی مکمل رپورٹ سے نوازنا چاہتی تھی۔ لہٰذا اس کی پیشکش قبول کر لی گئی۔

اس کو برطانیہ کا وقار زیادہ عزیز تھا۔ وہ اسی وقار کو مدنظر رکھتی ہوئی پرتھ جا پہنچی۔ اس نے ایک بگھی اور گھوڑے خریدے...... اس میں ضروری ساز و سامان رکھا اور تن تنہا 800 میل کے سفر پر روانہ ہوگئی اور اپنے سفر کے اختتام پر اسے دی ٹائمز کو رپورٹ پیش کرتے ہوئے فخر محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے تحریر کیا کہ:۔

''میں ایک بھی ظلم ثابت نہیں کر سکتی ماسوائے اس کے کہ آبائی باشندوں کو گوشت کی بجائے سبزی دی گئی اور جب کام سرد بازاری کا شکار ہو گیا تھا اس وقت انہیں کام سے فارغ کر دیا گیا تھا اور ان کے پاس خوراک کا کوئی بندوبست نہ تھا''

اس نے دی ٹائمز کو اپنی مکمل رپورٹ ارسال کی اور یہ تجویز بھی پیش کی کہ اب اس معاملے کو ختم سمجھا جائے۔

پرتھ کے رومن کیتھولک بشپ نے بھی اس کی رپورٹ کو تسلیم کر لیا تھا اور اس نے جن بڑے الزامات کو جھٹلایا تھا وہ ان سے بھی متفق ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے اسے یہ پیشکش بھی کی کہ وہ اس کے ہمراہ خلیج بیگل کی جانب ٹراپسٹ مشن پر روانہ ہو...... شمال مغرب بعید میں...... اس مشن کے مستقبل کا دارومدار ایک سرکاری اہل کار کے مجوزہ معائنے کا مرہون منت تھا۔ بشپ کا خیال تھا کہ مسز بیٹز کی تصدیق بشپ کے کیس کو مضبوط بنانے میں معاون ثابت ہو سکتی تھی اس کے لئے یہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔ اس نے سوچا کہ:۔

''میں شاید پہلی عوت ہوں گی جو ٹراپسٹ کے بستر پر سوؤں گی۔''

جب وہ بشپ کے ہمراہ منزل مقصود پر پہنچی تو راہب اسے دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے۔

''میں جس دنیا کی نمائندگی کر رہی تھی وہ شیطان کی دنیا تھی۔''

اس نے اپنا لائحہ عمل وضع کرنے کا فیصلہ کیا...... اپنی پالیسی مرتب کرنے کا فیصلہ کیا...... وہ چاہتی تھی کہ ان قدیم باشندوں کے ساتھ باہم

روابط ہونے کی اس کی پالیسی ایک مثالی پالیسی ہونی چاہیئے اور اسے اپنی تمام تر قوت اور توانائی صرف کرتے ہوئے انہیں آدم خوری ترک کرنے کی جانب راغب کرنا چاہیئے۔

اس نے بشپ کے ساتھ مل کر مشن کے 10,000 ایکٹر رقبے کا سروے سرانجام دیا۔ وہ سخت گرمی میں کام سرانجام دیتے رہے۔ کبھی کبھار درجہ حرارت 106 درجے سے بھی زائد ہوتا تھا۔ وہ سخت گرمی میں بھی اپنا کام جاری رکھتے تھے اور کبھی کبھار ایک دن میں 12 میل سفر طے کرتے تھے۔

بروم میں اس نے آٹھ ماہ کا عرصہ گزارا۔ اس عرصے کے دوران اس نے مقامی قبائل کا مطالعہ سرانجام دیا۔ ان کے رسم و رواج اور اعتقادات کا مطالعہ سرانجام دیا۔ یہاں پر کچھ مجرم بروم جیل میں بند تھے اور ان کی گردنوں میں زنجیریں ڈالتے ہوئے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ ایک ظالمانہ فعل تھا جو جیل حکام سرانجام دے رہے تھے۔ لیکن اس وقت اس کی حیرانگی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اسے یہ بتایا گیا کہ یہ مجرم ہتھکڑی پہننے سے انکاری تھے اور اپنی گردنوں میں زنجیریں ڈلوانے میں بہتری محسوس کرتے تھے کیونکہ ہتھکڑی پہننے سے انہیں کم آزادی میسر تھی۔

اس نے تحریر کیا کہ:۔

''آہستہ آہستہ میرا علم روبہ اضافہ ہوتا رہا حتیٰ کہ مجھے شمالی قدیم باشندوں کے تمام تر سماجی نظام سے واقفیت حاصل گئی اور ان کی طرز زندگی سے بھی بخوبی آشنائی حاصل ہوئی...... ان کے بچپن سے لے کر ان کے بڑھاپے تک...... میں نے ہر ایک لمحہ ان کا مطالعہ سرانجام دینے کے لئے وقف کر رکھا تھا۔''

اس سے پیشتر کسی نے بھی اس طرز کا کام سرانجام نہ دیا تھا۔

''وہ مجھے ایک مہربان ہستی تصور کرتے تھے اور مجھ سے خوش تھے۔''

وہ مکمل طور پر ان کی زندگیوں میں داخل ہو چکی تھی۔ انہوں نے اسے اپنے مقدس مقامات میں داخل ہونے کی اجازت بھی فراہم کر رکھی تھی۔ وہ ان کی مختلف تقریبات میں بھی شرکت کرتی تھی بلکہ وہ اصرار کرتے ہوئے اسے شرکت پر آمادہ کرتے تھے۔ ان کی کئی ایسی تقریبات بھی تھیں جو ان کی خواتین کیلئے بھی ممنوعہ تھیں اور اگر ان کی کوئی خاتون اس تقریب میں شرکت کرتی تو اس کے لئے موت کی سزا تجویز کی جاتی تھی۔ لیکن وہ اسے ایسی تقریبات میں بخوشی شامل کرتے تھے۔

1914ء میں اسے سائنس کانگریس میں شرکت کی دعوت موصول ہوئی۔ وہ اس دعوت کو پا کر از حد خوش ہوئی۔ یہ کانگریس ایڈی لیڈ...... ملبورن اور سڈنی میں منعقد ہو رہی تھی۔ اس نے ایک بگھی کرائے پر حاصل کی جسے دو اونٹ کھینچتے تھے۔ اس بگھی کے ذریعے اس نے 240 میل کا سفر طے کیا جہاں سے اس نے ایڈی لیڈ کیلئے بحری جہاز پر سوار ہونا تھا۔

کانگریس کے موقع پر اس کی ملاقات کئی ایک معروف ہستیوں سے ہوئی جن میں بیٹ سن...... مالی نوو سکی...... ریورز...... گرابز وغیرہ شامل تھے۔ وہ ان لوگوں سے مل کر از حد خوش ہوئی۔ لیکن اس کی یہ خوشی اس وقت ماند پڑ گئی جب اس نے یورپ میں جنگ کی خبریں سنی۔

''میں بین الاقوامی معاملات سے اس قدر الگ تھلگ ہو کر رہ گئی تھی کہ مجھے بین الاقوامی معاملات کی کچھ خبر نہ تھی۔''

جلد ہی اس کی اس مایوسی کا ازالہ ممکن ہوا کیونکہ اسے لیکچر دینے کی درخواستیں موصول ہونے لگی تھیں بالخصوص آسٹریلیا کے خواتین کے ادارے اس میں جو اس کے کام میں از حد دلچسپی لے رہے تھے۔ اس کے نتیجے میں قدیم باشندوں کی فلاح و بہبود کے وزیر سے درخواست کی گئی کہ اس کی ان خدمات کو جاری رکھا جائے جو وہ جنوبی آسٹریلیا کے آبائی باشندوں کے لئے سرانجام دے رہی تھی۔

اس نے ایڈی لیڈ سے 900 میل دور شمال' مغرب کی جانب اولڈیا کے مقام پر اپنا خیمہ نصب کیا۔ یہاں پر وہ اس علاقے کے لوگوں کا مطالعہ سرانجام دینا چاہتی تھی۔ مختلف قبیلوں کے مرد اور عورتیں زیادہ تر آدم خور تھے۔ عورتوں کو ان کے نوزائیدہ بچے کھانے کے لئے دیے جاتے تھے۔ اس نے ان کی اس حرکت کی کبھی مذمت سرانجام نہ دی تھی اور نہ ہی ان میں انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی تھی۔

وہ اولڈیا کے مقام پر اس وقت تک مقیم رہی حتیٰ کہ اس کی عمر 70 برس ہوگئی۔ اسے اس وقت از حد دکھ پہنچا جب کینبرا حکومت نے اسے ارن ہم لینڈ کے سفر کی اجازت فراہم نہ کی۔ وہ اس مقام پر اس لئے جانا چاہتی تھی تاکہ وہ اس پولیس مین کی ہلاکت کے سلسلے میں تفتیش سرانجام دے سکے جسے وہاں کے مقامی آبائی باشندوں نے ہلاک کر دیا تھا۔ وہ واپس ایڈی لیڈ لوٹ آئی تھی تاکہ اپنے زندگی بھر کے کام کو سمیٹ سکے اور اس داستان کو اس کے اختتام تک پہنچا سکے۔ اس کے دوستوں اور مداحوں نے اس سے درخواست کی کہ وہ ان کے درمیان ہی مقیم رہے لیکن اس نے غیر مہذب اور وحشی لوگوں کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی جہاں پر وہ ان کی بہتری کیلئے روبہ عمل ہو سکتی تھی۔ اس نے اپنے اس فیصلے کے بارے میں تحریر کرتے ہوئے کہا کہ:۔

''جوں جوں وقت گزرتا گیا...... برس ہا برس گزر چکے تھے...... میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس یقین کی حامل بن چکی تھی کہ ان لوگوں کو چھوڑنا میرے لئے ناممکن تھا۔ وہ لوگ میری ذمہ داری بن چکے تھے۔''

وہ جدید دور کی ایک قابل ذکر خاتون تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ تاریخ کی ایک قابل ذکر خاتون تھی۔ وہ پرتھ سے منہ موڑ کر دریائے مُرے کے کنارے اپنے خیمے میں قیام پذیر ہوگئی تھی۔ وہ جس مقام پر خیمہ زن تھی وہ مقام پیاپ کہلاتا تھا۔ اس کی خدمات کے اعتراف میں کامن ویلتھ حکومت اسے ایک قلیل رقم سالانہ بطور امداد عطا کرتی تھی۔

بڑھتی ہوئی عمر اور جسمانی کمزوری کے پیش نظر بالآخر وہ اپنی مہم کو خیرباد کہنے اور خانہ بدوشوں جیسی زندگی سے دست بردار ہونے پر مجبور ہو چکی تھی۔ لہٰذا اس نے دریائے مُرے کو خیرباد کہا اور اپنی زندگی کے آخری ایام گزارنے کیلئے ایڈی لیڈ کے مضافات میں آباد ہوگئی۔ 18 اپریل 1951ء کو اس نے اس مقام پر وفات پائی۔ اس وقت اس کی عمر 90 برس تھی۔ اس نے اپنی کتاب کے آخری صفحے پر یہ تحریر کیا تھا کہ:۔

''ان تمام برسوں کے دوران میں نے اپنے وقت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا تھا۔ میں نے وہی کچھ کیا جو کچھ کرنے کا میں ارادہ رکھتی تھی۔''

......❁......

انجانے دیس کا سفر

کرنل فرانسس ینگ ہسبنڈ کا 1903ء کا تبت کا مشن پُراسراریت کے علاوہ خوف وہراس کا بھی شکار تھا۔آج بھی اس علاقے کی قدیم پر اسراریت مشہور ہے۔ جب کرنل ینگ ہسبنڈ کو احکامات موصول ہوئے اس وقت صورت حال دھماکہ خیز تھی۔ تبت کے فوجی دستوں نے سکم کی ریاست پر حملہ کر دیا تھا۔انہوں نے سرحدوں کی تمیز ختم کر ڈالی تھی اور وائسرائے ہند لارڈ کروزن کے خط کو نظر انداز کر دیا تھا۔

کئی ایک افواہیں گردش کر رہی تھیں۔ کچھ افواہیں روس کے ساتھ سیاسی اور تجارتی سمجھوتے کی نشاندہی کر رہی تھیں...... کچھ افواہیں یہ نشاندہی کر رہی تھیں کہ چین بھی فعال طور پر ملوث تھا۔ ہندوستان کو خطرہ لاحق تھا۔

لارڈ کروزن اس نکتہ نظر کا حامل تھا کہ ایک دوستانہ مشن تبت روانہ کیا جائے تاکہ وہ صورت حال پر گفت وشنید سرانجام دے سکے اور حقائق تلاش کرنے کی کوشش کرے۔

وہ اس مشن کے حقیقی رہنما کی تلاش میں تھا اور ادھر اُدھر نظر دوڑا رہا تھا کہ کوئی موزوں شخص اس مشن کی رہنمائی کیلئے میسر آ جائے۔اس کی نظر لیفٹیننٹ فرانسس ینگ ہسبنڈ پڑی جو کہ شاہ کے محافظ دستے کے سواروں میں شامل تھا۔اس نے کلفٹن اور سینڈ ہرسٹ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ینگ ہسبنڈ ایک قد آور شخصیت کا حامل تھا۔ وہ مشرقی لوگوں کو سمجھتا تھا اور ان کی زبانوں سے بھی واقفیت رکھتا تھا۔اس نے کافی تحقیق وتفتیش سرانجام دے رکھی تھی۔اس کا انتخاب بہترین تھا۔لہٰذا ینگ ہسبنڈ کو کرنل کے عہدے پر ترقی دی گئی اور دارجیلنگ میں اس کے فوجی دستوں کو منظم کرنے میں ایک لحہ کی بھی تاخیر نہ کی گئی۔اس کے پاس ایک گورکھا بٹالین تھی۔دو دیگر کمپنیاں تھیں اور دو پہاڑی توپیں بھی تھیں۔

اگرچہ لڑاکا افواج رائل انجینئرز کے بریگیڈیر جنرل کے زیرکمان تھیں لیکن ان کو کارروائی سرانجام دینے کے احکامات جاری کرنے کی ذمہ داری ینگ ہسبنڈ پر تھی۔ وہ یہ فیصلہ کرنے کا مجاز تھا کہ اسے کب اور کیسے اپنی مسلح افواج کو روبہ عمل کرنا تھا۔میجر بریتھرٹن سپلائی اور ٹرانسپورٹ افسر کے فرائض سرانجام دینے کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔

تبت......''دنیا کی چھت'' کے نام سے جانا جاتا تھا......دور دراز اور الگ تھلگ مقام تھا۔اس کا دارالخلافہ لہاسا تھا جو ایک ''ممنوعہ'' شہر تھا ......بدھ مت کی عبادت گاہوں......خانقاہوں کا مرکز تھا۔

ماہ جون میں ابتدائی جائزہ سرانجام دیا گیا اور آہستہ آہستہ کامیابی کی جانب قدم اٹھنے لگے لیکن کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر کامیابی زور نہ پکڑ سکی۔

اس دوران شملہ میں ایک کانفرنس منعقد کی گئی اور ینگ ہسبنڈ کو بھی اس کانفرنس میں شمولیت کے لئے بلایا گیا۔اس کانفرنس میں لارڈ کروزن اور ہندوستان کا کمانڈر انچیف کچز آف خرطوم بھی شرکت کر رہا تھا۔ ینگ ہسبنڈ نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی افواج کی تنظیم نو سرانجام

دینے کی کوشش کی۔اس کی درخواست پر اسے دو مزید کمپنیاں عطا کی گئیں اور ایک پہاڑی توپ بھی فراہم کی گئی۔

اس نے لاتعداد بھیڑوں کی کھالوں کی فراہمی کی بھی درخواست کی۔اس کے علاوہ اس نے سردی سے بچنے کیلئے دیگر اقسام کی گرم یونیفارم کی بھی درخواست کی کیونکہ اس کے کچھ ساتھی اسے یہ مشورہ دے رہے تھے کہ موسم بہار تک انتظار کیا جائے لیکن وہ اپنا سفر موسم سرما میں ہی جاری رکھنا چاہتا تھا۔وہ اہل تبت کو یہ باور کروانا چاہتا تھا کہ موسم کی صورت حال اگرچہ کسی قدر شدید ہی کیوں نہ ہو...... وہ اہل برطانیہ کو اپنا دوستانہ مشن جاری رکھنے سے نہیں روک سکتی۔

اب اس کے پاس 2,000 لڑاکا جوان تھے اور 4,000 غیر لڑاکا جوان تھے...... یہ اس لئے ضروری تھے کہ انہوں نے ناگوار نوعیت کے حامل ملک کو عبور کرنا تھا۔ان کے راستے میں آنے والا نچلا ترین میدان مرتفع بھی سطح سمندر سے 12,000 فٹ بلند تھا۔

وہ اپنی مہم کے بارے میں پُر امید تھا۔اگرچہ یہ ایک آسان مہم نہ تھی بلکہ ایک سخت ترین مہم تھی۔ ینگ ہسبنڈ کی عمر اس وقت 40 برس تھی اور وہ اس مہم کی سرانجام دہی کیلئے انتہائی موزوں شخص تھا۔کلفٹن میں ایک لڑکے کی حیثیت سے اور سینڈ ہرسٹ میں ایک نوجوان کی حیثیت میں اس نے لمبے فاصلے کی دوڑوں میں کئی کپ جیت رکھے تھے۔اب وہ جانتا تھا کہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو اپنی تمام تر قوت اور توانائی اس مہم پر صرف کرنی ہوگی۔

ان کو درپیش آنے والی مشکلات کی محض چند جھلکیاں ہی پیش کی جاسکتی ہیں۔دوران پیش قدمی وہ اکثر ناقابل برداشت سردی کی زد میں آ جاتے تھے۔ان کے جوتے...... کپڑے...... حتیٰ کہ ان کے سانس بھی جم جاتے تھے۔

ایک اور ایسا واقعہ بیان کیا جاسکتا ہے جو اس مہم کے رہنما کے فولادی عزم کی ایک جھلک پیش کرتا ہے۔یانگ کے مقام پر پیش قدمی کرتے ہوئے دستوں نے پتھروں کی ایک دیوار حائل ہونے کی وجہ سے اپنے گزرنے کا راستہ بند پایا۔پتھروں کی یہ دیوار اس تنگ راستے پر اہل تبت نے رات ہی رات میں قائم کردی تھی۔ ینگ ہسبنڈ نے موقع کا معائنہ سرانجام دیا۔اسے اس دیوار میں ایک جگہ ایک خلا نظر آیا۔وہ انتہائی سکون کے ساتھ اس خلا کو عبور کر گیا۔تبتی یک دم اس کے اردگرد اکٹھے ہوگئے۔ ینگ ہسبنڈ نے انہیں انتہائی پُرسکون انداز میں بتایا کہ ان کا مشن ایک پُرامن نوعیت کا حامل تھا۔اس نے اپنے مشن کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔تبتیوں نے اس کی بات کو غور سے سنا لیکن اسے تنگ کرنے کی کوئی کوشش سرانجام نہ دی اور اسے یہ اجازت فراہم کردی کہ وہ اس دیوار کے خلا سے گزر جائے۔

موسم نے انہیں کبھی بھی معاف نہ کیا۔جوں جوں وقت گزرتا گیا موسم کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔لیکن اس کے باوجود بھی ینگ ہسبنڈ نے اپنے فوجی دستوں کے ہمراہ پیش قدمی جاری رکھی اور وہ ٹیونا کے مقام پر پہنچ چکے تھے جو سطح سمندر سے 15,200 فٹ بلند تھا۔

نامساعد حالات کے باوجود بھی انہوں نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔اس دوران ان کو ایک پیغام موصول ہوا جس سے یہ اشارہ ملتا تھا کہ لہاسا گفت وشنید کیلئے آمادہ تھا۔لہٰذا ینگ ہسبنڈ نے اپنے پولیٹیکل افسر کو حقائق معلوم کرنے کیلئے روانہ کیا۔اس کا نام ایف۔او۔کونر تھا۔لیکن جب اس نے تبتی حکام سے رابطہ کیا تو اسے بتایا گیا کہ وہ یاٹنگ واپس چلے جائیں۔اسے یہ بھی بتایا گیا کہ وہ اپنے حکام بالا کو خبردار کردے کہ لہاسا کی جانب ان کی پیش قدمی کو پوری قوت کے ساتھ روکا جائے گا۔اگلے روز ینگ ہسبنڈ غائب پایا گیا۔

ہیڈ کوارٹر میں افراتفری مچی رہی اور ایک دن کی افراتفری کے بعد وہ اسی طرح اچانک واپس آ گیا جس طرح اچانک غائب ہوا تھا۔وہ

دوبارہ تبتیوں کے ساتھ محوگفت وشنید تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ان تک اس کی ذاتی رسائی ان کا اعتماد حاصل کرنے کا باعث بن سکتی تھی اگرچہ انہوں نے اس کی بات انتہائی توجہ کے ساتھ سنی تھی لیکن اسے یہ یاددہانی بھی کروائی تھی کہ لہاسا ایک ممنوعہ شہر تھا۔ تبتیوں نے دوبارہ اس امر پر اصرار کیا کہ اس مشن کو واپس چلے جانا چاہئیے۔

ینگ ہسبنڈ نے ایک اور کوشش سرانجام دی اور لہاسا جنرل کے ساتھ ملاقات کی جو تیونا میں تھا۔ اس نے کسی گرمجوشی کا مظاہرہ نہ کیا اور نہ ہی کوئی حوصلہ افزا بات کی۔ ینگ ہسبنڈ کے علم میں یہ بات بھی آئی کہ تبتی افواج گورو کے مقام پر جمع ہو رہی تھی۔

جنرل نے اس درخواست کو دہرایا کہ مشن کو واپس چلے جانا چاہئے لیکن ایک مرتبہ پھر ینگ ہسبنڈ نے یہ اصرار کیا کہ وہ اپنے پرامن مشن کو آگے بڑھائے گا۔

جنرل مشتعل ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا ریوالور نکالا اور ینگ ہسبنڈ کے ایک جوان کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ لہٰذا فائرنگ کا تبادلہ ہوا جس کے نتیجے میں 300 تبتی ہلاک ہوئے اور دو برطانوی زخمی ہوئے۔

کرنل ینگ ہسبنڈ صبر وتحمل کا مظاہرہ کر رہا تھا کیونکہ وہ کسی بھی جھڑپ سے بچنا چاہتا تھا اور یہ جھڑپ اس کے لئے کسی سانحہ سے کم نہ تھی۔

لیکن اس کی جوابی کارروائی مناسب اور بروقت تھی۔ تیونا کے مقام پر زخمیوں کیلئے ایک فیلڈ ہسپتال قائم کرنے کے بعد اس نے مشن کو پیش قدمی کے احکامات جاری کر دیئے۔

ایک اور چھوٹی سی جھڑپ ہوئی۔ لیکن بالآخر مشن گیانٹس کی جانب بڑھ گیا۔ اس مقام پر کوئی بھی تبتی اہلکار نہ پایا گیا۔ لہٰذا ینگ ہسبنڈ نے فیصلہ کیا کہ وہ کچھ سپاہ کے ہمراہ اسی مقام پر مقیم رہے جبکہ اس کی باقی ماندہ سپاہ ایک اور جھڑپ کا شکار ہو گئی۔

تبت کا انٹیلی جنس کا محکمہ فعال ہو چکا تھا۔ تقریباً 800 کی تعداد کے حامل تبتی فوجی دستوں نے اچانک مشن کے ہیڈکوارٹر پر حملہ کر دیا۔ ینگ ہسبنڈ نے اپنی رائفل تھامی اور اپنی گورکھا سپاہ کے شانہ بشانہ حملہ آوروں کے حملے کو پسپا کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ان کی جوابی کارروائی اس قدر شدت کی حامل تھی کہ حملہ آوررات کے اندھیرے میں راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ اپنی 250 کے قریب لاشیں بھی وہیں پر چھوڑ گئے۔

دشمن کا حملہ پسپا کرنے کے بعد پیش قدمی کا دوبارہ آغاز کیا گیا۔ ینگ ہسبنڈ اور اس کی سپاہ تمام تر راستے میں طوفانوں اور دھند کی شدت سے دوچار ہوتے رہے۔ جب تقریباً تمام تر سفر اپنے اختتام کو پہنچنے کے قریب تھا تب وہ ایک آخری اور زبردست رکاوٹ سے بالمقابل ہوئے......

یہ رکاوٹ دریائے برہمن پترا تھا...... اس دریا کو عبور کرنا باقی تھا اور دریا میں ان دنوں طغیانی آئی ہوئی تھی۔

ینگ ہسبنڈ ''ناممکن'' کی سرگوشی سننے کو قطعاً تیار نہ تھا۔ ''ناممکن'' کو ممکن بنانا ضروری تھا۔

اب انجینئروں کو یہ موقع میسر آیا تھا کہ وہ بھی اپنی فنی مہارت کا مظاہرہ کریں۔ لہٰذا انہوں نے کشتیوں کا ایک پل تیار کیا جس پر سے بیک وقت ایک سو جوان گزر سکتے تھے۔

تین دن کے اندر اندر تمام تر فوج اور سامان حرب دریا کے پار پہنچایا جا چکا تھا۔

مشن نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور 3 اگست کو انہیں لہاسا کی پہلی جھلک نظر آئی تو انہیں اپنی کامیابی کا انعام مل گیا۔ جوں ہی وہ ممنوعہ

شہر میں داخل ہوئے انہوں نے دلائی لامہ کی رہائش گاہ کا رخ کیا۔

لیکن مایوسی ان کے انتظار میں تھی۔ دلائی لامہ اپنی رہائش گاہ میں موجود نہ تھا۔ ان کو بتایا گیا کہ وہ مراقبہ کرنے کی غرض سے منگولیا جا چکا تھا۔

تاہم وہ اپنی عظیم مُہرا پنے خصوصی نمائندوں کے حوالے کر گیا تھا۔ چار وزراء کی کابینہ اور تمام تر قومی اسمبلی...... اب ینگ ہسبنڈ نے ان کے ساتھ نپٹنا تھا۔

دو ہفتے تک گفت وشنید جاری رہی۔ یہ گفت وشنید ایک آسان گفت وشنید کی نوعیت کی حامل نہ تھی بلکہ یہ ایک کٹھن مرحلہ تھا جس کو بخوبی طے کرنے کی ضرورت درپیش تھی۔

بہر کیف دو ہفتے تک جاری رہنے والی گفت وشنید کے بعد طرفین ایک معاہدہ طے کرنے پر متفق ہو چکے تھے اور 6 ستمبر کو اس معاہدے پر دستخط کیے گئے اور اس پر مُہر ثبت کی گئی۔ کرنل ینگ ہسبنڈ نے ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہ کی اور اپنی اس کامیابی کی خبر شملہ میں اعلیٰ حکام تک پہنچانے کا بندوبست کیا۔

یہ ایک عظیم مشن تھا جو ینگ ہسبنڈ جیسے شخص کے حوالے کیا گیا تھا اور یہ ینگ ہسبنڈ کی ذاتی کامیابی تھی۔ مبارکباد کی تاریں وصول ہونی شروع ہو چکی تھی...... لارڈ کروزن...... وائسرائے...... جس کا انتخاب انتہائی درست ثابت ہو چکا تھا...... ہندوستان کے کمانڈ انچیف...... لارڈ کچز آف خرطوم...... اور دیگر کئی شخصیتوں کی جانب سے مبارکباد کی تاریں موصول ہو رہی تھیں۔

ینگ ہسبنڈ مزید دو ہفتے لہاسا میں مقیم رہا۔ اس دوران اس نے حکام کو کئی ایک تحائف بھی پیش کیے اور ہر وہ فعل سرانجام دیا جو اہل تبت کے ساتھ اس کی دوستی کے رشتے کو مضبوط کرنے میں معاون ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ اس نے لاکھوں مصائب جھیلتے ہوئے ان کی دوستی حاصل کی تھی۔ اس کی انتہائی کامیابی یہ تھی کہ جواب میں تبت کے حکام نے بھی دوستی کے جذبے کا مظاہرہ کیا۔ حتیٰ کہ بڑے پادری نے ذاتی طور پر عبادت خانے کے دروازے پر اس کا استقبال کیا...... یہ ایک ایسا اعزاز تھا جو کسی غیر ملکی شخصیت کو نصیب ہونا مشکل تھا۔

جب ینگ ہسبنڈ کی واپسی کی گھڑی آن پہنچی تب اہل تبت نے انہیں حیران کن الوداعی پارٹی دی۔ انہوں نے مخفی طور پر سڑک پر ایک بہت بڑا خیمہ نصب کیا جب ینگ ہسبنڈ اور اس کے ساتھی اس خیمے کے نزدیک پہنچے تو انہوں نے انہیں روک لیا اور انہیں الوداعی پارٹی سے نوازا۔ اس تقریب میں انہیں طرح طرح کی کھانے پینے کی اشیاء پیش کی گئیں اور مابعد گرمجوشی کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ یہ ان لوگوں کیلئے خراج تحسین تھا جنہوں نے ایک انجانے دیس میں اپنے مشن کی تکمیل سرانجام دی تھی اور بے انتہا مصائب جھیلے تھے۔

فتح سے ہمکنار ہونے والے اس مشن کے گھر پہنچنے پر بھی مختلف تقاریب اس کے انتظار میں تھیں۔ اگرچہ ینگ ہسبنڈ کو نشانہ تنقید بھی بنایا گیا اور اس پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ اس نے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا تھا۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو اس جھگڑے سے بچائے رکھا۔ اس نے اس مشن کی تکمیل بخوبی سرانجام دی تھی جو اسے سونپا گیا تھا۔ اس کامیابی پر ینگ ہسبنڈ کو خطاب سے بھی نوازا گیا۔

......❀......

قطب شمالی پر پہلا قدم

رابرٹ ایڈون پیری کی قطب شمالی کی فتح نہ صرف ایک ٹیم ورک کی فتح تھی بلکہ ایک لمبے دورانیے پر محیط منصوبہ بندی کی بھی فتح تھی۔ وہ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ قطب شمالی کا مطالعہ سرانجام دینے میں مصروف رہا تھا۔ اس نے تقریباً ایک چوتھائی صدی تک یہ مطالعہ سرانجام دیا تھا اور اس کے بعد وہ اس مہم کو سر کرنے کیلئے نکلا تھا۔ اس نے اپنا زیادہ تر وقت گرین لینڈ میں گزارا تھا۔ یہاں پر وہ عملی تجربہ حاصل کرنے میں مصروف رہا۔

اسے گرین لینڈ میں وہی برف دکھائی دیتی تھی جو قطب جنوبی کو گھیرے ہوئے تھی۔ وہ سال بہ سال اس برف پر اپنی مہمات سرانجام دیتا رہا۔ 1891ء اور 1892ء میں پیری نے 1,200 میل پر محیط دو سفر طے کئے۔ وہ اپنی ہمت اور جرأت کو آزماتا رہا...... اس ہمت اور جرأت کو جس کے تحت وہ قطب شمالی کی مہم سرانجام دے سکتا تھا۔

جب اس عظیم مہم کی سرانجام دہی کا لمحہ قریب آیا تب اس نے امریکی بحریہ سے دو برس کی رخصت عطا کرنے کی درخواست کی۔ اس وقت وہ امریکی بحریہ میں اپنی خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ وہ خلیج کولمبیا کو اپنی بڑی بیس بنانا چاہتا تھا (نیویارک تا روز ویلٹ میں خلیج شریڈن کا بحری سفر طے کرتے ہوئے)۔ اس نے اپنے منصوبے پر عمل درآمد کا آغاز کر دیا۔

اس نے اپنے معاونین کا بھی انتخاب سرانجام دے دیا تھا۔ اس کے معاونین میں درج ذیل افراد شامل تھے:۔

راس مارون...... کارنل یونیورسٹی کا پروفیسر...... وہ گرین لینڈ میں بھی اس کے ہمراہ رہا تھا۔

میتھیو ہین سن...... ایک نیگرو خادم جو عرصہ دراز سے اس کے ہمراہ تھا۔

جارج بروپ...... ییل کا ایک اتھلیٹ

ڈونالڈ بی۔ میک ملن...... وارکیسٹرا کیڈیمی کا انسٹرکٹر...... یہ کالج میں بھی پیری کا ہم جماعت تھا...... اور یہ بھی اتھلیٹ تھا۔

ڈاکٹر جے۔ ڈبلیو۔ گڈسیل...... اور اس کا تعلق پینسلوانیا سے تھا۔

کیپٹن باب بارٹ لٹ...... اس کا تعلق نیو فاؤنڈ لینڈ سے تھا۔

پیری کا سازوسامان بھی ایسا تھا جسے ہاتھ میں اٹھایا جا سکتا تھا۔ جس میں گرین لینڈ کے کتے اور برف گاڑیاں بھی شامل تھیں۔ اس نے اپنی جماعت میں کافی تعداد میں اسکیمو بھی شامل کر لئے تھے جن کے ساتھ وہ پہلے بھی کام کر چکا تھا۔ اس نے تمام تر منصوبہ بندی انتہائی نظم و نسق کے تحت سرانجام دی تھی۔ اس کی جماعت چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اور یہ چھوٹی چھوٹی جماعتیں ایک آزاد اکائی کی حیثیت کی حامل تھیں۔ ہر ایک جماعت کو علیحدہ علیحدہ ذمہ داری سونپی گئی تھی۔

کیپٹن بارٹ لٹ کی سربراہی میں رہنما جماعت 28 فروری 1909ء کو خلیج کولمبیا سے روانہ ہوئی۔ اس کے بعد جارج بروپ کی پارٹی روانہ ہوئی جو پہلی جماعت کے روانہ ہونے کے دو گھنٹے بعد روانہ ہوئی۔

پیری نے اپنی جماعت کے ہمراہ اگلے روز روانہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ روانہ ہونے سے قبل اس نے برف گاڑی کھینچنے والے کتوں کیلئے دو گنے راشن کا حکم جاری کیا اور اپنے تمام ساتھیوں کو بھی بہترین کھانا فراہم کیا۔ دن ڈھلنے سے بیشتر وہ عازم سفر ہو چکا تھا۔ ہوا تیز چل رہی تھی۔ ستارے ایسے چمک رہے تھے جیسے ہیرے جواہرات چمکتے ہیں۔

پیری ابھی زیادہ دور نہیں پہنچا تھا کہ اسے دو اسکیمو ملے جو بیس کی جانب واپس آ رہے تھے۔ اس کے ہمراہ خالی برف گاڑیاں تھیں جو تباہ ہو چکی تھیں اور قابل مرمت نہ تھی۔ کھردری اور ناہموار برف کی وجہ سے یہ گاڑیاں تباہ ہوئی تھیں اور انہوں نے انہیں تبدیل کرنا تھا۔

جلد ہی اس کی ملاقات دیگر افراد سے ہوئی وہ بھی اپنی گاڑیاں مرمت کرنے کے لئے رکے ہوئے تھے۔

اس قسم کے حادثات توقعات کے عین مطابق تھے اور ان سے دوچار ہونا لازمی امر تھا۔ پیری کی بڑی جماعت بارٹ لٹ کے لگائے ہوئے پہلے کیمپ میں پہنچ چکی تھی۔ اس مقام پر دو جھونپڑیاں قائم کی گئی تھیں۔ ایک میں پیری اور اس کی جماعت اقامت پذیر ہوگئی جبکہ دوسری میں راس مارون اور اس کے آدمی اقامت پذیر ہو گئے۔ دیگر جماعتوں نے بھی اپنی اقامت گاہیں قائم کر لی تھیں۔ اس طرح ایک مکمل کیمپ آباد ہو چکا تھا۔

پیری رات کے آرام کیلئے دراز ہوا ہی تھا کہ ہین سن کے کیمپ سے ایک آدمی آن پہنچا۔ ان کا اسٹو نہیں جل رہا تھا۔ پیری اس کے ساتھ چلا آیا اور دیکھا کہ جھونپڑی کی فرش پر جا بجا جلی ہوئی ماچس کی تیلیاں بکھری پڑی تھیں۔ پیری نے کاغذ کا ایک ٹکڑا الکحول میں ڈبویا اور جلد ہی اسٹو جلنے لگا۔

دو اسکیمو جو برف گاڑیاں تبدیل کرنے کے لئے گئے تھے ان میں سے ایک اسکیمو رات گئے نئی برف گاڑی کے ساتھ واپس آن پہنچا تھا جبکہ دوسرا اسکیمو اس مہم سے بددل ہو کر پیچھے ہی رہ گیا تھا۔ پہلے ہی دن ایک آدمی کی کمی کسی دھچکے سے کم نہ تھی۔

سفر کی دوسری منزل پہلی منزل کی نسبت مشکل واقع ہوئی تھی۔ برف اس قدر کھردری اور ناہموار تھی کہ انہیں بیلچوں کے ساتھ اپنی برف گاڑیوں کے لئے راستہ صاف کرنا پڑتا تھا۔

دوسرے روز کے سفر کے اختتام تک پیری اور اس کی مختلف جماعتیں باہم اکٹھی ہو چکی تھیں۔ ان کی آگے بڑھنے کی راہیں مسدود تھیں کیونکہ ایک چوتھائی میل تک پانی پھیلا ہوا تھا۔

پیری سمجھ چکا تھا کہ برٹ لٹ اور بروپ اس مقام سے آگے بڑھ چکے تھے پیشتر اس کے کہ تند و تیز ہوائیں برف کو پگھلا کر پانی میں تبدیل کرتیں۔

اب اسے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اس مقام پر قیام کیا جائے۔ لہٰذا اسکیموؤں نے چار جھونپڑیاں تیار کیں اور یہ جماعت ان جھونپڑیوں میں اقامت پذیر ہوگئی۔ ان کو امید تھی کہ پانی جلد ہی جم کر دوبارہ برف کی صورت اختیار کر جائے اور وہ اس مقام سے آگے بڑھ سکیں گے۔ دن چڑھنے سے پیشتر ہی ان کی امید بھر آئی تھی۔ لہٰذا پیری نے جلدی جلدی دیگر لوگوں کو بیدار کیا۔ انہوں نے جلد از جلد ناشتہ کیا اور اپنی برف گاڑیاں

لے کر آگے بڑھے کیونکہ پانی جم کر برف کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ لیکن ان کا سفر بغیر کسی نقصان کے جاری رہا۔

اگلی صبح ہوا کی شدت کی بنا پر ان کی روانگی ملتوی رہی اور جب انہوں نے روانگی کا ارادہ کیا انہیں ایک مرتبہ پھر پانی کا سامنا کرنا پڑا جو ان کا راستہ روکے ہوئے تھا۔ اس کی چوڑائی سینکڑوں فٹ پر محیط تھی۔ پانچ روز تک وہ انتہائی بے صبری کے ساتھ انتظار کرتے رہے کہ کسی مقام سے پانی دوبارہ جم کر برف کی شکل اختیار کرے اور وہ اس مقام سے کوچ کرنے کے قابل ہوں۔ ان کے اسکیمو اس مہم سے اکتا چکے تھے اور اپنے اپنے اہل خانہ کے پاس واپس جانا چاہتے تھے مگر مارون نے انہیں ایسا کرنے سے روک رکھا تھا۔

اس دوران پیری بہت بہتر جا رہا تھا۔ وہ ایک اور جھونپڑی تک پہنچ چکا تھا جو بارٹ لٹ خالی کر کے آگے نکل چکا تھا۔ اس میں ایک رقعہ رکھا تھا جس میں یہ انکشاف کیا گیا تھا کہ کیپٹن شمال کی جانب ایک میل کے فاصلے پر مقیم تھا کیونکہ اس کا راستہ بھی پانی نے روک رکھا تھا۔ پیری اس کے کیمپ تک جا پہنچا تھا۔

اب کچھ دنوں تک جماعت غیر فعال پڑی رہی۔ اگر چہ پیری کو اس پانی کو عبور کرنے کا ایک موقع میسر آیا تھا لیکن وہ پیچھے آنے والی جماعت کے بارے میں فکرمند تھا۔ وہ ان کی جانب سے کوئی خبر سننے کا متمنی تھا۔ اگر رابطہ بحال نہ رہتا تو سب لوگوں کی ناکامی یقینی تھی۔

اس نے بدترین حالات کیلئے منصوبہ بندی سرانجام دینی شروع کر دی۔ اس نے سوچا کہ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو وہ اپنی برف گاڑیوں کو ایندھن کے طور پر جلا ڈالے گا حتیٰ کہ موسم کی شدت میں کمی واقع ہو جائے اور وہ کچھ گرم ہو جائے۔ وہ اپنے اسکیموؤں میں بھی سرکشی کے کچھ آثار دیکھ رہا تھا۔ ان کے تعاون کے بغیر وہ کامیابی کی توقع نہ کر سکتا تھا۔ لیکن وہ ان کے مزاج کو سمجھتا تھا کیونکہ اس نے کافی عرصہ ان کے ساتھ گزارا تھا۔ جب دو اسکیموؤں نے بیماری کا بہانہ بنایا تو اس نے انہیں واپس روانہ کر دیا اور ان کو مارون کیلئے ایک تحریر بھی دی جس میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ وہ ایندھن کے بندوبست کے ساتھ فوراً پہنچے۔

چھ دن کے انتظار کے بعد بالآخر بڑی جماعت دوبارہ حرکت میں آئی۔ لیکن عازم سفر ہونے سے بیشتر اس جماعت نے مارون کیلئے ایک اور تحریر چھوڑی جس میں اسے یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ہلکی برف گاڑی میں ان سے آن ملنے کے لئے کیلئے تیز رفتار سفر سرانجام دے۔ اس نے اس پر زور دیا تھا کہ وہ اس کیمپ میں قیام نہ کرے اور جلد از جلد آگے پہنچے۔ پیغام میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ:۔

"اپنے کتوں کو پیٹ بھر کر راشن کھلاؤ اور ان کو تیز رفتاری کے ساتھ بھگاؤ۔ کیونکہ تمہارا ہمارے ساتھ آن ملنا انتہائی ضروری ہے تاکہ تم ہمیں ایندھن فراہم کر سکو۔"

13 مارچ کو درجہ حرارت نقطہ انجماد سے 53 درجے کم تھا۔ انہوں نے ابھی 12 میل کا سفر طے کیا تھا کہ ایک اسکیمو خوشی سے چلا اٹھا کہ:۔

"کتے آ رہے ہیں"

پیری نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اس نے جلد ہی مارون کے ایک اسکیمو کو پہچان لیا جس نے مارون کا یہ پیغام پہنچایا کہ وہ اور بروپ اگلے روز پہنچ رہے تھے...... ان کی آمد اگلے روز متوقع تھی۔ وہ 30 گیلن الکحل اور سامان رسد اپنے ہمراہ لا رہے تھے۔

بڑی جماعت دو ہفتوں سے برف پر رواں دواں تھی جبکہ معاون جماعتیں واپس پلٹنا شروع ہو چکی تھیں۔ ان کے تمام کام مکمل ہو چکے تھے۔ پہلی واپس آنے والی جماعت کی قیادت ڈاکٹر گڈسیل کر رہا تھا۔ واپس آنے کے دوران اس کی ملاقات مارون اور بروپ سے بھی ہوئی تھی اور ان کے درمیان خبروں کا تبادلہ بھی ہوا تھا۔ پیری اس جوڑے کو خوش آمدید کہنے کا منتظر تھا۔

اب پڑتال سرانجام دی گئی۔ اس پڑتال سے یہ انکشاف ہوا کہ بڑی جماعت 16 افراد...... 12 برف گاڑیوں اور 100 کتوں پر مشتمل تھی۔ جونہی یہ پڑتال جاری تھی کہ وہ ایک سانحہ سے دوچار ہو گئے۔ بروپ برف کی دو پٹیوں کے درمیان سے کتوں کی ایک ٹیم کو گزارنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ اس دوران ایک جانور پھسل کر پانی میں جا گرا اور باقی ماندہ ٹیم بھی اس کے پیچھے پیچھے پانی کی نذر ہونے لگی۔ پیری نے بڑی دقت کے ساتھ گاڑی کو روکا اور باقی ٹیم پانی کی نذر ہونے سے بچ گئی۔ اس کی حاضر دماغی اور فوری عمل درآمد کی بدولت سینکڑوں پاؤنڈ مالیت کی رسد پانی کی نظر ہونے سے بچ گئی۔

20 مارچ کو بروپ کی ٹیم واپس بیس کی جانب روانہ ہوئی اور چھ روز بعد مارون بھی اپنی جماعت کے ہمراہ ان کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

پیری اور ہین سن نے آگے کی جانب اپنا سفر جاری رکھا۔ وہ اسی راستے پر سفر کرتے رہے جس راستے پر برٹ لٹ اور اس کے پیشرو سفر کرتے رہے تھے۔ وہ ان کے بنائے ہوئے راستے پر چلتے رہے۔ وہ اس کے کیمپ پہنچ چکے تھے جبکہ وہ اگلی منزل کی جانب روانہ ہو رہا تھا۔ قطب شمالی کا سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا اور گاگلوں کا مسلسل استعمال ضروری تھا۔ لیکن برف کی سطح ہنوز کھردری اور تیز تھی۔ جسمانی تھکاوٹ کے حصول کے بغیر سفر طے کرنا ناممکن تھا۔ وہ اب زمین سے 240 میل دور تھے اور زندگی کی واحد علامت دو قطب شمالی کے بیل تھے جو دور فاصلے پر برف پر کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔

یکم اپریل کو پیری کی ہدایات کے تحت کیپٹن برٹ لٹ نے واپسی کی راہ لی۔ اس کے ہمراہ دو اسکیمو تھے...... ایک برف گاڑی اور 18 کتے تھے۔ ایک اور برف گاڑی تباہ ہو چکی تھی اور دو کتے بھی ہلاک ہو چکے تھے۔

اب وقت آن پہنچا کہ پیری تنہا اپنی جماعت کے ہمراہ سفر سرانجام دے۔

حتمی مہم سر کرنے کے لئے پیری کی جماعت میں دو اسکیمو...... اس کا دیرینہ خادم میتھیو ہین سن جس کے ہمراہ بھی دو اسکیمو تھے شامل تھے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس پانچ برف گاڑیاں اور 40 بہترین کتے بھی موجود تھے۔ پیری اپنی اس جماعت پر مکمل اعتماد رکھتا تھا۔ اس کے اس اعتماد کا اظہار اس فیصلے سے ہوتا تھا جو اس نے ڈرامائی انداز میں سرانجام دیا تھا۔ کہ وہ فوری طور پر عازم سفر ہوں گے اور پانچ منازل میں اپنا سفر طے کریں گے۔ ہر منزل میں تقریباً 25 میل کا سفر طے کرنا ہو گا۔ محض موزوں ترین افراد ہی یہ کام سرانجام دے سکتے تھے لیکن پیری پانچویں روز انہیں منزل مقصود تک پہنچانے کا متمنی تھا۔ اگر ضرورت محسوس ہوتی تو وہ سفر کی آخری منزل دگنی رفتار سے طے کرنے کیلئے بھی تیار تھا۔ اس نے اپنی جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:۔

''بہتر رفتار سے سفر طے کریں...... چائے سے لطف اندوز ہوں اور خوب ڈٹ کر دوپہر کا کھانا کھائیں...... کتوں کو کچھ دیر تک

آرام کرنے دیں اور تب سوئے بغیر سفر جاری رکھیں۔"

اگرچہ تمام افراد اچھی صورت حال کے حامل تھے لیکن پیری نے جس طرح انہیں منظم کیا تھا وہ اس قابل تھے کہ حسب پروگرام اپنا سفر طے کر سکتے تھے۔ انہیں اب زیادہ جرأت اور حوصلہ درکار تھا تاکہ وہ شدید سردی اور چہرے کو کاٹنے والی ہوا میں بھی اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔

5 اپریل کو سردی اس قدر شدید تھی حتیٰ کہ اسکیمو بھی اپنے مصائب کا رونا رونے لگے۔ لیکن اس موقع پر وہ اس امر کیلئے مجبور تھے کہ کمزور کتوں کو ہلاک کر کے اپنی خوراک کا بندوبست کریں۔

پیری اپنی جماعت کو برق رفتاری کے ساتھ سفر طے کرنے کی برابر تلقین کرتا رہا اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنے سفر کی آخری منزل 6 اپریل کو دس بجے تک طے کر لی تھی۔ ہین سن نے دیکھا کہ اس کا آقا ایک چھوٹا سا پیکٹ کھول رہا تھا۔ اس پیکٹ سے اس نے ایک ریشمی جھنڈا نکالا جسے بیگم پیری نے اپنے خاوند کیلئے چند برس پیشتر بنایا تھا۔ اس نے دیکھا کہ پیری نے اس جھنڈے کو ایک ڈنڈے کے ساتھ باندھا اور اسے برف میں گاڑ دیا۔ اس کے بعد پیری کچھ مشاہدات سرانجام دینے لگا۔ اس کی مہم بخوبی اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ وہ کامیابی سے ہمکنار ہو چکا تھا۔

ماشو پکشو کی دریافت

یہ ایک سرد اور آزردگی بھرا دن تھا۔ بوندا باندی بھی جاری تھی۔ اس کی آزردگی میں اضافہ ہو چکا تھا۔ اس کی آزردگی میں اضافے کا سبب اس کے گائیڈ کا وہ انکشاف تھا جس کے تحت اس نے یہ کہا تھا کہ کھنڈرات ''وہاں اوپر'' موجود تھے۔ بنگھم نے ناخوشگواری کے ساتھ چوٹی کی جانب دیکھا جو کہ اوپر واقع تھی۔

اس مہم کا مقصد انکا کی گمشدہ دولت کو تلاش کرنا تھا۔ اس نے پہاڑ پر ایک اور نگاہ ڈالی...... مرعوب کر دینے والا عمودی ماشو پکشو...... یقیناً کوئی کھنڈرات نہ تھے...... کوئی آبادی نہ تھی...... کیا وہاں پر پہنچنا ممکن تھا؟

24 جولائی 1911ء کی اس سرد صبح دس بجے ہیرام بنگھم اپنے گارڈ کراسکو کے سارجنٹ کے ہمراہ روانہ ہوا۔ اس کے سامنے ایک طویل...... دشوار ترین...... شاید بے ثمر چڑھائی تھی۔ لیکن پہلے پہل راستہ ہموار تھا جو دریائے یورو بمبا کے کنارے کے ساتھ تھا۔ اس کے دو میل بعد برفانی چوٹیاں تھیں۔

جلد ہی انہیں ایک قدیم پل عبور کرنا پڑا۔ اس قدر قدیم پل اس نے اس سے پیشتر کبھی نہ دیکھا تھا۔ یہ چھ لکڑی کے تختوں پر مشتمل تھا جن کی لمبائی اس قدر زائد نہ تھی کہ پانی پر محیط ہو سکے لیکن یہ تختے آپس میں جُڑے ہوئے تھے۔ سارجنٹ اور دیگر لوگ جوان کے ہمراہ بطور گائیڈ شمولیت اختیار کر رہے تھے انتہائی پھرتی کے ساتھ اس پل کو عبور کر چکے تھے جبکہ بنگھم ان کے نقش قدم پر چلتا ہوا پریشانی کے عالم میں اس پل کو عبور کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا غلط اٹھنے والا ایک قدم بھی اسے پانی کے حوالے کر سکتا تھا۔

اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب وہ اس پل کو بخوبی عبور کر چکا تھا۔

اس کے بعد چڑھائی شروع ہوتی تھی۔ ان چاروں نے تقریباً ایک سوگز پر محیط چڑھائی سرانجام دی۔

اس کے بعد وہ ایک سیڑھی تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ یہ ایک قدیم سیڑھی تھی جو کہ درخت کی شاخوں سے بنائی گئی تھی۔ اس سیڑھی کی بدولت وہ ایک سوگز مزید چڑھائی چڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔

ہیرام بنگھم کے اندر یہ خواہش سر ابھار رہی تھی کہ کاش وہ بھی اپنے دو دوستوں کے ہمراہ نیچے رک گیا ہوتا۔ اس رفتار سے اگر وہ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچنے میں کامیاب ہو بھی جاتا...... اور اگر وہاں پر کھنڈرات بھی موجود پاتا...... تو وہ انہیں اپنی توجہ سے فیض یاب کرنے میں محروم رہتا۔ جس سے جان گھبرا رہی تھی کیونکہ وہ پیرو کے ایسے علاقے میں تھے جہاں پر بارشیں کثرت ہوتی تھیں۔

ایک گھنٹے اور بیس منٹ بعد وہ سطح دریا سے 2,000 فٹ بلندی پر پہنچ چکے تھے...... دریائے یورو بمبا سے 2000 فٹ کی بلندی پر...... لیکن

ہیرام بنگھم دنیا کے بہترین قدیم شہروں میں سے ایک شہر میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ اس کو پانے کا مستحق ٹھہرتا تھا کیونکہ بنگھم نے برس ہا برس انکا کی زندگی اور ان کے رسم و رواج کے مطالعے میں گزارے تھے۔ اور سال بہ سال تمام تر پیروکار ہزاروں میل کا دشوار گزار سفر طے کیا تھا...... انکا کی باقیات کا جائزہ لینے کے لئے...... اور آخر کار اس کا صبر و تحمل رنگ لایا تھا اور اسے اپنے صبر کا انعام بھی مل چکا تھا...... وہ ایک ایسی دریافت سرانجام دے چکا تھا جو اس کی امیدوں سے بھی بڑھ کر تھی۔

اس نے اس شہر کو ''ماشوپکشو'' کا نام دیا تھا...... یعنی عظیم چوٹی...... لیکن ہیرام بنگھم کو مکمل ادراک تھا کہ یہ قدیم شہر کیا تھا...... اور اس کا حقیقی نام کیا ہونا چاہئے...... لیکن وقتی طور پر ماشوپکشو سے بھی کام چل سکتا تھا۔

اس دریافت نے آثار قدیمہ کی راہیں مکمل طور پر تبدیل کر کے رکھ دی تھیں۔ ملک میں انکا کے کئی ایک مقامات بکثرت موجود تھے...... لیکن یہ 16 ویں صدی میں ہسپانوی حملہ آوروں کا نشانہ بنے تھے۔ اب ''ماشوپکشو'' کی صورت میں بنگھم نے نہ صرف ایک بہترین مقام دریافت کیا تھا بلکہ اس کا خیال تھا کہ یہ مقام انکا کا دارالحکومت تھا...... چونکہ یہ ایسی جگہ پر واقع تھا کہ کوئی بھی اہسپانوی اس تک نہ پہنچ پایا تھا۔

یہ انکا کون لوگ تھے؟

اور ہیرام بنگھم اس دریافت سے کیوں اس قدر خوش تھا؟

لفظ ''انکا'' بذات خود انکشاف کرتا ہے...... کیونکہ اس کا مطلب ہے بادشاہ...... وہ ایک عظیم نسل تھی...... تاریخ کی انتہائی مراعات یافتہ نسل...... اور یہ نام جو درحقیقت ان کے حکمرانوں کی عکاسی کرتا تھا اب اس تمام تر نسل کیلئے یہی نام تسلیم کیا جا چکا تھا۔ پہلا انکا جنوبی امریکہ کے کوچا قبیلے کا سردار تھا جس نے تقریباً 1200 بعد از مسیح میں کوزکو کے عظیم دارالخلافہ پر حکومت کی تھی۔ لیکن اس کے بعد اس کے لوگ کئی ایک تہذیبوں میں ضم ہو کر رہ گئے۔ ہم پورے وثوق کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ انکا تہذیب ہزاروں برس پرانی تہذیب تھی جو وقت کی گرد و غبار میں گم ہو چکی تھی۔

جہاں تک کوزکو کا تعلق ہے...... 16 ویں صدی میں جب اہسپانوی یہاں پہنچے اس وقت یہ امریکہ کا ایک عظیم ترین شہر تھا...... یہ نہ صرف ایک فوجی قلعہ تھا بلکہ ثقافت کا مرکز بھی تھا۔ یہ سطح سمندر سے 10,600 فٹ کی بلندی پر واقع تھا۔ جب تمام تر یورپ غاروں میں رہ رہا تھا ان وقت انکا کی بڑی کامیابی ان کا فن تعمیر تھا۔ کوزکو کے عقب میں ایک پہاڑی پر ایک قدیم فوجی قلعہ قدیم آرکیٹکٹ کا منہ بولتا شاہکار ہے۔ اس کی دیواریں پتھروں کے بلاکوں سے تعمیر کردہ ہیں اور ان میں سے کئی بلاکوں کا وزن 300 ٹن ہے۔ اور ہر ایک بلاک دوسرے بلاک کے ساتھ انتہائی نفاست کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ اس تعمیر میں کسی قسم کا سیمنٹ یا دیگر مصالحہ استعمال نہیں کیا گیا تھا اور آج بھی کوئی شخص ان کے درمیان سے چاقو کی نوک بھی نہیں گزار سکتا۔ انکا کے دور میں لوہا یا فولاد بھی دستیاب نہ تھا۔

انکا کے تعمیر کردہ پل...... سڑکیں اور آبپاشی کے لئے نہریں اتنی بہترین تھی جتنی بہترین دنیا میں ممکن ہو سکتی تھیں۔ ان کی زراعت کسی بھی دیگر قوم کے مقابلے میں ترقی یافتہ تھی۔

حیرانگی کی بات یہ ہے کہ انکا میں لکھائی کا رواج نہ تھا۔ لاطینی امریکہ کے دیگر حصوں کی طرح یہاں پر ہسپانوی حملہ آوروں نے تباہی و

سطح سمندر سے تقریباً 10,000 فٹ کی بلندی تک پہنچ چکے تھے......اور ان کے پھیپھڑے درد کرنے لگے تھے۔

ان کی حیرانگی کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دو انڈین کو اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا۔

یقیناً کوئی بھی درست دماغ کا حامل فرد اتنی بلندی پر قیام نہیں کر سکتا اور ان چٹانوں کے درمیان...... یہ کیسے یہاں زندہ رہ سکتے تھے؟

انڈین ہنسنے لگے......وہ کسان تھے اور اس بلندی پر انہوں نے زمین کو از حد زرخیز پایا تھا بلکہ ان کے پیش رو اسے ہموار بھی کر گئے تھے۔

''پیش رو؟ کتنی دیر پہلے؟''

انڈین کو تاریخوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی......انہوں نے جواب دیا کہ:۔

''برس ہا برس پیشتر......ہسپانوی حملہ آوروں سے بھی پیشتر......''

وہ اس سفید فام کو اپنی زمین دکھانا چاہتے تھے۔اس کو دکھانے چاہتے تھے کہ یہ کس قدر ہموار تھی......سینکڑوں فٹ لمبائی کی حامل......اور 10 فٹ اونچائی کی حامل......انہوں نے اس سفید فام کو اپنی زمین دکھائی اور انہیں اپنی فصلیں بھی دکھائیں......ان فصلوں میں مکئی کے علاوہ آلو اور گنے کی فصل بھی شامل تھی۔انہوں نے کہا کہ:۔

''یہ جگہ قیام کیلئے انتہائی بہترین ہے......اس جگہ پر فوجی بھرتی کا بھی کوئی خطرہ نہیں ہے اور نہ ہی ٹیکس ادا کرنے کی کوئی فکر ہے''

اس نے زمین کا معائنہ سرانجام دیا۔اس کو اس بات پر کوئی شبہ نہ تھا کہ زمین کو قابل کاشت بنانے میں انکاس کا ہاتھ تھا۔

انہوں دوستانہ اطوار کے حامل ان دونوں انڈین سے اجازت لی اور جلد ہی گھنے جنگل میں جا پہنچے......ان جنگل میں مزید زمین قابل کاشت دکھائی دے رہی تھی۔

''اچانک میں نے اپنے آپ کو تباہ شدہ مکانوں کی دیواروں کے بالمقابل پایا جو انکاس کے پتھر کے کام کی منہ بولتی تصویر تھیں۔ان دیواروں پر نظر پڑنا کوئی آسان امر نہ تھا بلکہ ایک مشکل امر تھا کیونکہ وہ جزوی طور پر درختوں اور گھاس پھوس سے ڈھکی ہوئی تھیں جو صدیوں سے انہیں ڈھانپے ہوئے تھے۔''

وہ ایک غار میں داخل ہوئے۔وہ محض اس کی اندرونی خوبصورتی سے لطف اندوز ہونے کیلئے اس میں داخل ہوئے تھے۔یہ غار بھی پتھر کے کام کا ایک بہترین نمونہ پیش کر رہی تھی۔

اور اس تعمیراتی جنت کو دو انڈین نے کاشتکاری کے لئے منتخب کیا تھا۔ان کے بقول زمین زرخیز تھی اور کاشتکاری کے لئے موزوں بھی تھی۔

وہ سبزیوں کے ایک باغ کے پار چلا آیا اور اس نے اپنے آپ کو قدیم امریکہ کے دو بہترین اور دلچسپ ترین ڈھانچوں کے کھنڈرات میں کھڑا پایا۔

اس تعمیر میں خوبصورت سفید پتھر استعمال کیا گیا تھا۔دیواریں ایک مرد کے قد سے قدرے اونچی تھیں۔

لہٰذا جولائی 1911ء کے اس نم آلود دن......سردیوں کے ایک دن......کیونکہ ماشو پکشو خط استوا کے جنوب میں واقع تھا......امریکن

بربادی مچادی تھی۔ انکا ہسپانویوں سے خائف تھے کیونکہ وہ آتشیں اسلحے کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ 1572ء میں آخری انکا حکمران کو انتہائی بے دردی کے ساتھ ہلاک کیا گیا تھا اور ایک عظیم سلطنت کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ یہ ان حکمرانوں کا آخری گھر تھا جسے ہیرام بنگھم نے دریافت کیا تھا۔ وہ اس بارے میں پُر اعتماد تھا کہ یہ ان حکمرانوں کا آخری گھر تھا۔ ان کو کوزکو سے نکال باہر کیا گیا تھا۔ ہسپانویوں نے انہیں کوزکو سے نکال باہر کیا تھا اور انہوں نے پہاڑوں پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ ان کو اپنا گڑھ بنالیا تھا۔ وہ اسے وِلکاپامپا کہتے تھے۔

اپنی جرأت اور بہادری کے علاوہ غداری کی آمیزش سے ہسپانویوں نے توپاک امارو کو گرفتار کرنے کا بندوبست کیا تھا...... آخری انکا...... انہوں نے وِلکاپامپا کا وہی راستہ دریافت کیا تھا جس کے بارے میں ہیرام بنگھم کو کامل یقین تھا کہ اس نے بھی وہی راستہ دریافت کیا تھا۔ ایک اور مہم کی سرانجام دہی کے دوران جو کہ 1940ء میں سرانجام دی گئی تھی...... ماشوپکشو اور کوزکو دیگر پانچ شہر دریافت ہوئے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی شہر اس قدر بڑا اور کامل نہ تھا جس قدر بڑا اور کامل وہ شہر تھا جو بنگھم نے دریافت کیا تھا۔

ہیرام بنگھم کی دریافت...... ماشوپکشو...... آثار قدیمہ کی عظیم دریافتوں میں سے ایک دریافت تھی۔

اسکاٹ کی قطب جنوبی کی مہم المیے کا شکار ہو کر رہ گئی

اس کی منصوبہ بندی کافی عرصہ پہلے سے کی جا چکی تھی۔ جس وقت ''ٹیرانووا'' نامی بحری جہاز ماہ جون میں انگلستان سے روانہ ہوا...... انگلستان کی امیدیں بھی اس کے ساتھ محوسفر ہوئیں۔ دنیا کے کسی بھی فرد کو قطب جنوبی کا اتنا تجربہ نہ ہوگا جتنا تجربہ اسکاٹ کو تھا۔ اسکاٹ نے اس کی تحقیق و تفتیش سرانجام دی تھی ...... اس کا نقشہ تیار کیا تھا...... اس کا مطالعہ سرانجام دیا تھا...... یہ سب کچھ اس نے ایک عشرہ قبل اپنے وہاں کے پہلے دورے کے دوران سرانجام دیا تھا۔

لیکن جب ''ٹیرانووا'' اور اس میں سوار مہم جو جماعت 12 اکتوبر 1910ء کو ملبورن پہنچی تو ایک ٹیلی گرام ان کی منتظر تھی۔ اس ٹیلی گرام کے نفسِ مضمون نے برطانوی مہم جو جماعت کے اعتماد کو وقتی طور پر متزلزل کر دیا تھا۔

''میں قطب جنوبی کا رخ کر رہا ہوں...... امنڈسن''

ناروے کا مہم جو ...... عظیم مہم جو اسکاٹ کی پہلی مہم سرانجام دینے سے پیشتر ہی قطب جنوبی پر قدم رکھ چکا تھا۔ وہ اب بھی اپنی برتری قائم رکھنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسکاٹ کی جماعت جغرافیائی قطب جنوبی کی مہم سر کرنا چاہتی تھی...... دنیا کا الگ تھلگ مقام...... جہاں پر ابھی کسی بنی نوع کے قدم نہ پہنچے تھے...... ان کی کامیابی کی دعا کی جا سکتی تھی...... مگر امنڈسن اس مقام تک ان سے پہلے رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اس نے انہیں خبردار کر دیا تھا۔

برطانوی مہم جو جماعت نے اس انتباہ کو محسوس کیا اور ایک یا دو روز تک ان کے جذبات قدرے سرد رہے۔ لیکن جونہی ''ٹیرانووا'' نیوزی لینڈ کی جانب روانہ ہوا...... ناروے کا یہ مہم جو ان کے ذہن میں سے محو ہو چکا تھا۔

''ٹیرانووا'' قطب جنوبی کی مین لینڈ تک رسائی حاصل کر چکا تھا اور خالی ہونا شروع ہو چکا تھا۔ اس عمل در آمد میں ایک ہفتہ صرف ہوا تھا ...... دو ہفتے انہیں ایک جھونپڑی تعمیر کرنے میں لگے تھے۔ انہوں نے ایک جماعت جنوب کی جانب روانہ کی تاکہ اشیائے خورد و نوش کا ذخیرہ قطب جنوبی کے اتنے نزدیک کر سکے جتنا نزدیک ممکن تھا۔

اس جماعت نے 200 پونڈ سے زائد اشیائے خوردنی کا ذخیرہ جنوب کی جانب 150 میل کی دوری پر ذخیرہ کر لیا...... اور قطب جنوبی سے 7,72 میل کی دوری پر یہ ذخیرہ واقع تھا۔ اشیائے خوردنی کا یہ ذخیرہ انتہائی ضروری تھا بشرطیکہ وہ کامیابی چاہتے تھے...... یہ ایک ایسی مہم تھی جو ماہ اکتوبر میں آئندہ موسم گرما تک سرانجام نہ دی جا سکتی تھی...... کیونکہ دن پہلے ہی چھوٹے ہونے شروع ہو چکے تھے...... ہوائیں چل رہی تھیں۔

''ٹیرانووا'' نے ساحل کے ساتھ ساتھ ایک مختصر سفر طے کرتے ہوئے امنڈسن کے جہاز کو لنگر انداز ہوتے دیکھا تھا اور انگلستان روانہ

ہونے سے قبل اسکاٹ کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا۔ امنڈسن کو بھی دوسرے موسم گرما کا انتظار کرنا تھا۔ اسکاٹ کی جماعت اس سائنسی کام کی سرانجام دہی میں بخوشی مصروف ہو چکی تھی جو انہوں نے سردیوں کے موسم میں سرانجام دینے کا پروگرام بنایا تھا۔ ان کام میں معدنیات اور نمونہ جات اکٹھے کرنا بھی شامل تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے دیگر مشاہدات بھی سرانجام دیئے تھے۔

اس مہم کا کل سفر 922 میل تھا اور اسکاٹ کے پاس ایک مکمل منصوبہ موجود تھا اور اس منصوبے کے تحت اس نے یہ سفر سرانجام دینا تھا...... اور اتنا ہی سفر واپسی کیلئے طے کرنا تھا۔ اس کے پاس دو بڑی برف گاڑیاں تھیں جن پر موٹریں نصب تھیں۔ لیکن شاید وہ اتنی کارآمد ثابت نہ ہو سکتی تھیں۔ وہ اس گاڑیوں کو اس لئے اپنے ہمراہ لایا تھا کہ تجربہ کر سکے کہ ان کو درپیش صورت حال کے تحت یہ موٹر گاڑیاں کس کارکردگی کا مظاہرہ سرانجام دے سکتی تھیں۔ یہ جتنی دور تک سفر طے کر سکتی تھیں اتنی دور تک ان پر سفر طے کیا جانا تھا اور مابعد ان سے دست برداری اختیار کرنے کا پروگرام وضع کیا گیا تھا۔ اس کے بعد کتوں کی دو ٹیموں اور دس خچروں (کل 19 خچریں تھیں...... ان میں سے دس) کے ذریعہ سفر طے کرنے کا پروگرام وضع کیا گیا تھا۔ تمام تر اشیائے خوردنی ان کتوں اور خچروں پر منتقل کرنی تھیں جبکہ موٹر گاڑیوں سے دست برداری اختیار کر لی جاتی۔ گلیشیئر کا سفر اس مہم جو جماعت نے پیدل طے کرنا تھا اور اس مقام پر خچروں کو ہلاک کر کے ان کا گوشت ذخیرہ کرنا تھا تاکہ واپسی جماعتوں کی غذا بن سکے۔ کتوں کو واپس ساحل پر روانہ کرنا تھا اور مہم کے آخری حصے کا آغاز کرنا تھا...... تین برف گاڑیاں...... ہر ایک گاڑی کو چار افراد نے کھینچنا تھا...... ان پر سامان خوردونوش لادنا تھا ...... انہوں نے مزید سفر پر روانہ ہونا تھا۔

ایک مقام پر...... جس کا فیصلہ اسکاٹ نے کرنا تھا...... محض ایک گاڑی نے اکیلے آگے بڑھنا تھا۔

جنوب کی جانب اس سفر کے دوران آٹھ اسٹور۔ ڈپو قائم کئے جانے تھے۔ یہ ڈپو اس بڑے ڈپو کے علاوہ تھے جس میں ایک ٹن اشیائے خوردنی ذخیرہ کی جانی تھیں تاکہ واپس پلٹنے والی جماعتوں کو راشن میسر آ سکے۔

بالآخر موٹر گاڑیاں حرکت میں آ گئیں۔ اس روز 24 اکتوبر 1911ء تھا۔ ساڑھے تین گھنٹے بعد موٹر گاڑیاں ساڑھے تین میل کا سفر طے کر چکی تھیں۔

ان گاڑیوں کا سفر کئی روز تک جاری رہا اور انہوں نے کل 51 میل کا سفر طے کیا تھا کہ ان سے دست برداری اختیار کر لی گئی۔ ان کا ساز و سامان کتوں اور خچروں پر منتقل کر دیا گیا۔ سواروں کے رسالے کے ایک نوجوان افسر اواٹیز کو ان خچروں کا نگران مقرر کیا گیا...... اس نے اس ذمہ داری کو انتہائی توجہ کے ساتھ نبھایا اور اس فرض کو نبھاتے ہوئے وہ اور اس کے ساتھی بالآخر موت سے ہمکنار ہو گئے۔ ہر ایک پڑاؤ پر...... ہر ایک منزل پر وہ جانوروں کے اردگرد برف کی بڑی بڑی دیواریں کھڑی کرتا تھا تاکہ وہ ہوا کی شدت کی بنا پر ہلاک نہ ہو جائیں...... اور اس عمل درآمد میں قابل ذکر توانائی اور وقت صرف ہوتا تھا۔

اگرچہ جماعت کا کوئی رکن بھی اس عمل درآمد کو سرانجام دینے کے حق میں نہ تھا لیکن صورت حال یہ تھی کہ ان کے اور قطب جنوبی کے درمیان ہنوز سینکڑوں میل کا فاصلہ تھا۔ وہ پہلے ہی لیٹ ہو چکے تھے کیونکہ خچر اس رفتار سے سفر طے نہ کر رہے تھے جس رفتار سے سفر طے کرنے کی ان

سے امید کی جاتی تھی۔اب وہ ہلاک ہونا بھی شروع ہو گئے تھے۔اواٹیز کی انتہائی کوشش اور جدوجہد کے باوجود بھی وہ بیمار پڑ چکے تھے اور ایک ایک کر کے ان سے خلاصی پانا ضروری تھا۔

وہ ناگزیر وجوہات کی بنا پر کئی روز سے سفر ملتوی کیے ہوئے تھے۔اواٹیز اپنے خچروں کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔وہ محض رات گزارنے کے لئے خیمے میں آتا تھا اور اپنا تمام تر وقت خچروں کی دیکھ بھال میں صرف کرتا تھا۔

وہ دوبارہ عازم سفر ہوئے اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد پانچوں خچروں کو ہلاک کر دیا گیا اور ان کا گوشت ذخیرہ کر دیا گیا تا کہ واپسی پر کام آ سکے۔مزید چند روز بعد کتے بھی واپس بھیج دیے گئے۔ان کو طے شدہ پروگرام سے زائد وقت تک اپنے ساتھ رکھنا پڑا تھا کیونکہ خچروں کی کارکردگی حوصلہ افزا نہ تھی۔اس طرح وہ طے شدہ پروگرام سے بڑھ کر راشن ختم کر چکے تھے اور راشن کی کمی منظر عام پر آ رہی تھی۔لہٰذا ہر ایک کے کھانے پینے میں تخفیف سرانجام دے دی گئی۔

اب بنی نوع انسان اکیلے رہ گئے تھے...... 4 افراد پر مشتمل ٹیمیں (جماعتیں)......ان میں سے تین برف گاڑیاں کھینچ رہے تھے۔21 دسمبر کو پہلی جماعت واپسی آ گئی...... یہ پروگرام کے عین مطابق تھا......اور چار افراد انتہائی مایوسی کا شکار تھے......کیونکہ اسکاٹ نے آخری مرحلے کیلئے ان کا انتخاب نہ کیا تھا۔

سکاٹ سے ایک غلطی سرزد ہو چکی تھی......اگرچہ اسے اس غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔اس نے اپنی ڈائری میں تحریر کیا......ڈائری کے بارے میں اس کا نظریہ تھا کہ کسی روز وہ اس کی لاش کے ہمراہ ضرور دریافت کر لی جائے گی......

''باورز ہمارے خیمے میں آ رہا ہے اور کل ہمارا یونٹ پانچ افراد پر مشتمل ہو گا''

وہ دوسری برف گاڑی واپس بھیج رہا تھا......دوبارہ......منصوبے کے عین مطابق......لیکن اس ٹیم کا ایک رکن اپنے ہمراہ رکھ رہا تھا۔

آخر کیوں؟

اس کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ مہربان دل کے حامل اسکاٹ نے یہ محسوس کیا تھا کہ باورز نے اس قدر بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا کہ وہ ان کے ہمراہ قیام کرنے کا مستحق ٹھہرتا تھا۔اس نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا تھا کہ آخری برف گاڑی ہمراہ ولسن......اواٹیز ......ایڈگر ایونز اور وہ بذات خود......محض چار افراد کے راشن کا بوجھ اٹھا سکتی تھی۔اس کے خیمے میں بھی چار افراد بخوبی قیام کر سکتے تھے......ان کے پاس چار پلیٹیں تھیں......چار چمچ تھے......اور چار افراد کیلئے کھانا تیار کرنے کا انتظام موجود تھا۔

اور یہ جماعت بالخصوص اواٹیز انتہائی تیزی کے ساتھ کمزور ہو رہی تھی۔اسکاٹ نے اپنی ڈائری میں مزید تحریر کیا کہ:۔

''پانچ افراد کیلئے کھانا تیار کرنا چار افراد کیلئے کھانا تیار کرنے سے زائد وقت درکار رکھتا تھا۔''

15 جنوری کو انہوں نے قطب جنوبی سے 15 میل دور خیمہ نصب کیا۔کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ امنڈسن ان پر سبقت لے جائے گا......ان کا مورال بلند تھا۔

لیکن اگلے روز ان کی مایوسی کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے امنڈسن کا جھنڈا لہراتا دیکھا۔ تھوڑے فاصلے پر...... وہ امنڈسن کے خیمے میں پہنچ چکے تھے...... ان کی تو جان ہی نکل گئی تھی...... اس خیمے پر ناروے کا جھنڈا ہوا میں لہرا رہا تھا...... اردگرد کتے اور برف گاڑی کے پہیوں کے نشانات موجود تھے۔

خیمہ خالی تھا...... کیونکہ امنڈسن گھر کی جانب نصف راستہ طے کر چکا تھا...... وہ یہاں خیمہ زن ہوا تھا...... عین قطب جنوبی پر...... ایک ماہ پیشتر...... اور اس نے اسکاٹ کے لئے ایک تحریر بھی چھوڑی تھی اور اس کو تاکید کی تھی کہ وہ ناروے کے مہم جُو کے چھوڑے ہوئے ساز و سامان میں سے جو چاہے اپنے استعمال میں لا سکتا تھا۔

ان کے دل مایوسی اور غم و غصے سے لبریز تھے۔ برطانویوں نے واپسی کی تیاری شروع کر دی۔ لیکن واپسی کی راہ اختیار کرنے سے پیشتر انہوں نے قطب جنوبی پر اپنی تصاویر اتاریں...... پس منظر میں یونین جیک لہرا رہا تھا۔ باورز بھی اتنا دل برداشتہ دکھائی دے رہا تھا جتنے دل برداشتہ باقی چار افراد دکھائی دے رہے تھے۔

لہٰذا یہ مہم المیہ کا شکار ہو چکی تھی۔ ایڈگر ایونز ایک عظیم الجثہ شخص تھا...... وہ راشن کی کمی کا شکار تھا...... اسے جو راشن دستیاب تھا وہ اس عظیم الجثہ شخص کے لئے ناکافی تھا...... اس کا ایک ہاتھ بھی زخمی تھا...... وہ تمام افراد سردی سے لگنے والی بیماریوں کا شکار تھے...... موسم مزید بدترین صورت اختیار کر چکا تھا۔ ہوا تیز چل رہی تھی...... ان کے اردگرد برف گر رہی تھی۔ وہ نیم فاقہ کشی کا شکار تھے۔

ایونز اپنے حصے کی گاڑی کھینچنے میں مصروف تھا کہ اچانک موت سے ہمکنار ہو گیا۔ انہوں نے اسے برف میں دفن کر دیا اور اوا ٹیز بھی اپنی زندگی کے آخری لمحات گزار رہا تھا اگرچہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری تھا...... وہ خچروں کی دیکھ بھال کرتے ہوئے ہی توڑ پھوڑ اور شکست و ریخت کا شکار ہو چکا تھا...... اب وہ علیل بھی تھا۔

اسکاٹ نے اپنی ڈائری میں تحریر کیا کہ:۔

"بیچارا سپاہی...... ہمارے لئے ایک تکلیف دہ رکاوٹ بنا ہوا ہے۔"

ایک ٹن خوراک کا حامل ڈپو 63 میل کے فاصلے پر واقع تھا...... اور ان کے پاس محض سات روز کا راشن موجود تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی فرد بھی محض سات یوم میں 63 میل کا سفر طے نہیں کر سکتا تھا۔

14 مارچ کو سردی ان پر مکمل طور پر حملہ آور ہوئی تھی۔ درجہ حرارت نقطہ انجماد سے 43 درجہ نیچے گر چکا تھا۔ یہ چاروں افراد مایوسیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں غرق تھے لیکن اس مایوسی کا اظہار نہیں کر رہے تھے۔ اگرچہ ان کے پاس کسی قدر راشن موجود تھا لیکن اس کو پکانے کیلئے تیل میسر نہ تھا۔

اگلی رات اوا ٹیز نے ان سے درخواست کی کہ وہ اسے چھوڑ کر بذات خود اپنا سفر جاری رکھیں لیکن انہوں نے اس کی اس درخواست کو رد کر دیا اور اسے چھوڑ کر جانے سے انکار کر دیا...... لہٰذا وہ بھی دیگر افراد کے ہمراہ خیمے میں سونے کے لئے چلا آیا۔ صبح سویرے وہ بیدار ہوا اور برف کے وسیع سمندر میں غائب ہو گیا۔

اسکاٹ نے اپنی ڈائری میں تحریر کیا کہ:۔

''ہم جانتے تھے کہ بیچارہ اوائیٹز موت کی وادی کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔ ہم جانتے تھے کہ اس نے ایک بہادر شخص کا کردار سرانجام دیا تھا اور یہ کردار ایک انگریز ہی سرانجام دے سکتا تھا۔ ہمیں امید ہے کہ ہم بھی اسی بہادری کے ساتھ موت کو گلے لگائیں گے اور یقیناً ہماری موت ہم سے زیادہ دور نہیں ہے۔''

مزید دو ہفتے گزر چکے تھے۔ اسکاٹ...... ولسن اور باورز کی جدوجہد جاری تھی۔ ان کے اعصاب جواب دے چکے تھے اور ان کی ایک ٹن خوراک کے حامل ڈپو تک پہنچنے کی امیدیں دم توڑ چکی تھی کیونکہ موسم بھی از حد غیر موافق تھا۔

29 مارچ کو اسکاٹ نے اپنی ڈائری میں تحریر کیا کہ:۔

''21 مارچ سے ہم طوفان کی زد میں تھے۔ ہمارے پاس اتنا ایندھن تھا کہ ہم دو کپ چائے بنا سکتے تھے۔ ہم روزانہ اپنے ڈپو کی جانب بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں جو یہاں سے اب 13 میل کے فاصلے پر ہے کیونکہ ہم خیمے سے باہر نہیں نکل سکتے کیونکہ طوفان اپنا منہ کھولے کھڑا ہے۔ مجھے نہیں یقین کہ اب ہم بہتری کی امید رکھ سکتے ہیں۔ ہم آخری دم تک جدوجہد جاری رکھیں گے لیکن ہم کمزور ہوتے چلے جا رہے ہیں اور اب ہمارا خاتمہ دور نہیں ہے۔

''مجھ میں اس سے زائد لکھنے کی سکت موجود نہیں ہے''

(آر/اسکاٹ)

ایک ٹن خوراک کے حامل ڈپو سے 13 میل کے فاصلے پر ولسن اور باورز موت سے ہمکنار ہو گئے۔ امدادی پارٹی نے ان کو آٹھ ماہ بعد ان کی ڈائریوں کے ہمراہ دریافت کیا۔ ان کے آخری خطوط بھی ان کے ہمراہ تھے اور کئی ایک اہم جغرافیائی نمونہ جات بھی ان کے ہمراہ تھے۔ انہوں نے اسکاٹ کو بتایا تھا کہ وہ ان نمونہ جات کو واپس اپنے ہمراہ لے جائے اور اگرچہ وہ اس کی اور اس کے ساتھیوں کی موت کو یقینی سمجھتے تھے لیکن وہ اپنی ڈیوٹی سے دست بردار نہ ہوا تھا۔

گرٹروڈ بیل کی عرب دنیا کی مہمات

گرٹروڈ بیل نے بڑا نام کمایا...... وہ اپنے دور کی ایک معروف شخصیت کے طور پر جانی جاتی تھی۔ اس کی زندگی مہمات کی کئی ایک داستانوں کا مجموعہ تھی۔ وہ پراسرار اور اجنبی عرب دنیا میں اپنی مہمات سرانجام دیتی تھی۔ وہ مشرق کی ایک راز پسند خاتون کے نام سے مشہور تھی...... عراق کی بے تاج ملکہ...... صحرا کی ڈیایا...... اس کی داستانیں روئے زمین پر بکھری پڑی تھیں۔

وہ اپنے دور کی ایک انتہائی قابل ذکر خاتون تھی...... دانش ور...... فعال...... منتظم...... تاریخ دان...... ماہر آثار قدیمہ...... کوہ پیما...... وغیرہ وغیرہ۔ وہ ذاتی جرأت اور حوصلے کا بھی ایک نمونہ تھی اور عربوں کے ساتھ والہانہ لگاؤ رکھتی تھی۔

وہ سرھوگ بیل کی دختر تھی...... وہ اس کی پہلی شادی کی نشانی تھی۔ اس کا دادا اسحاق لوتھین بیل تھا...... وہ کوئلے کی ایک کان کا مالک تھا۔ اس نے مڈلز بروگ میں لوہے اور فولاد کی ایک بڑی صنعت قائم کی تھی۔ وہ ایک معروف سائنس دان بھی تھا اور رائل سوسائٹی کا فیلو بھی تھا۔ گرٹروڈ بیل نے 1868ء میں جنم لیا تھا اور اپنا بچپن اپنے باپ اور سوتیلی ماں کے گھر واقع یارک شائر میں ایک اعتدال پسند اور دانش ورانہ ماحول میں گزارا تھا...... اس کی سوتیلی ماں کا نام لیڈی فلورنس بیل تھا۔ اس نے اپنی ابتدائی تعلیم بخوبی حاصل کرنے کے بعد 1887ء میں آکسفورڈ میں داخلہ لیا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے دور کے دانش ورانہ حلقے میں اپنے لئے بخوبی جگہ بنائی تھی۔

اس نے زندگی کے تفریحی پہلو کو بھی نظر انداز نہ کیا تھا اور مختلف تفریحات میں بخوبی حصہ لیتی رہی تھی...... مثلاً رقص کے علاوہ لندن کی مختلف پارٹیوں میں شرکت کرنا اور شکار وغیرہ کھیلنا اس کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ اس کا چچا سر فرانک لاس سیلس تہران میں برطانوی وزیر تھا۔ اس کی اپنے چچا کے ساتھ ملاقات اسے مشرق کے قریب لے آئی تھی...... وہ مشرق جو زندگی بھر اس کے حواسوں پر چھایا رہا۔ وہ ایک کہنہ مشق سیاح تھی اور کسی نہ کسی مقام کی سیاحت پر کمربستہ رہتی تھی...... کبھی یورپ میں گھوم رہی ہوتی تھی...... کبھی مشرق قریب میں گھوم رہی ہوتی تھی...... کبھی دنیا کے گرد بحری چکر لگا رہی ہوتی تھی۔

اس نے بحرالکاہل عبور کرتے ہوئے یہ تحریر کیا تھا کہ:۔

"دنیا کو اپنے سامنے پاتے ہوئے میں کس قدر خوشی سے دوچار ہوتی ہوں اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔"

لیکن وہ ایک سنجیدہ خاتون تھی۔ اس نے اس وسیع دنیا کو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ دیکھا تھا اور وہ ہمیشہ اس دنیا کے مطالعے میں مصروف رہی...... اس کی چھان بین اور تحقیق میں مصروف رہی۔ اس کا ذہن کسی ایک میدان تک محدود نہ تھا۔ وہ مفکر...... شاعر...... تاریخ دان...... ماہر آثار قدیمہ...... آرٹ کی نقاد...... فطرت پرست...... سیاست کی طالبہ...... غرضیکہ سب کچھ تھی۔ اور مزیداری کی بات یہ تھی کہ اس کو ان تمام میدانوں میں ایک سند کا درجہ حاصل تھا۔ یہ درست تھا کہ وہ منہ میں سونے کا چمچ لئے پیدا ہوئی تھی لیکن اس قسم کی دولت کی حامل محض چند خواتین ہی ایسی تھیں جنہوں نے

اپنی دولت کو ملک کی خدمت کیلئے خرچ کیا تھا۔

اس کی زندگی مہمات سے بھرپور تھی اور وہ جان بوجھ کر مہمات کی تلاش میں رہتی تھی۔ سوئٹزرلینڈ کے دشوار گزار پہاڑوں پر چڑھنا اور دیگر مہمات سرانجام دینا اس کا مشغلہ تھا۔

20ویں صدی کے پہلے عشرے کے دوران وہ ایشیا مائینز اور عرب کے شمالی حصے کے ضمن میں ایک سند کے درجے کی حامل تھی...... یہ تمام علاقے اس وقت ترک سلطنت کا حصہ تھے جو موجودہ استنبول تا مشرق میں عراق...... جنوب میں موجودہ شام۔ اسرائیل اور اردن...... اور الحجاز کے تمام جزیروں تک پھیلی ہوئی تھی۔ ترکی نے اندرون عرب کے بیشتر علاقے بذات خود فتح کیے تھے...... اگرچہ اس ملک کے زیادہ تر لوگوں کو وہ سدھا نہ سکا تھا...... اس کے بہت سے جنگجو قبیلے اپنے وحشی پن کے لئے مشہور تھے...... وہ اپنے حکمرانوں کے سامنے اپنی گردنیں جھکانے پر آمادہ نہ تھے۔

اس صدی کے ابتدائی برسوں کے دوران ابن سعود...... جو مابعد سعودی عربیہ کا بادشاہ بنا تھا...... اس نے ترکوں کو وسطی عرب سے نکالنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی سربراہی میں بیڈو کے آوارہ گرد قبائل (بیڈو...... یہ نام ان عرب قبائل کے لئے استعمال ہوتا تھا جو خیموں میں رہتے تھے اور خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے) کو زرعی علاقوں میں آباد کیا گیا تھا۔ عرب کا یہ حصہ پہلی جنگ عظیم کے دورن ٹی۔ ای۔ لارنس کی قابل ذکر مہمات کا میدان بنا تھا جبکہ اس نے بہت سی معلومات کے ضمن میں گرٹروڈ پر انحصار کیا تھا۔ اس نے یہ معلومات اندرون عرب کی مہمات سرانجام دیتے ہوئے حاصل کی تھیں...... یہ مہمات اس نے 1913ء اور 1914ء کے موسم سرما اور موسم بہار میں سرانجام دی تھیں۔

عرصہ دراز سے اس کا دل اس سفر کے لئے مچل رہا تھا...... جو کہ بے انتہا مشکل اور خطرناک تھا۔ نومبر 1913ء میں وہ الیگزینڈریا چلی آئی اور مابعد دمشق چلی آئی۔

دمشق سے اچھی خبریں سننے میں آرہی تھیں اور وہ جانتی تھی کہ اب وہ مناسب لمحہ آن پہنچا تھا کہ وہ اپنا طویل سفر سرانجام دے۔ وہ قبائل جو کئی نسلوں سے آپس میں جنگیں کرتے چلے آرہے تھے انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ تصفیہ کر لیا تھا اور اب عظیم صحرا کے مقامات پُرسکون اور پُرامن تھے۔

اس نے 29 نومبر کو تحریر کیا کہ:۔

"اس سفر کو طے کرنے سے اس سے بڑھ کر بہتر کوئی اور برس نہ ہوگا...... اب ابن ال راشد کے دارالحکومت ہا۔ ال اور اس سے آگے کا سفر طے کرنے میں کوئی مشکل حائل نہ تھی۔"

ہا۔ ال نجد کا دارالحکومت تھا جہاں پر ابن راشد کی وسطی عرب پر غیر یقینی حکمرانی قائم تھی اور ترکوں اور ابن سعود کے ساتھ وہ مستقل حالت جنگ میں تھا۔

دمشق کے مقام پر گرٹروڈ بیل نے اپنے یادگار سفر کی تیاری سرانجام دی...... اسے تقریباً تمام تر سفر انجانی راہوں پر طے کرنا تھا۔ اس نے 17 اونٹ خریدے...... ان کی اوسط قیمت 13 پونڈ فی اونٹ تھی...... ان نے 50 پاؤنڈ کی اشیائے خوردنی خریدیں...... 50 پونڈ کے عربی کپڑے کے تحائف خریدے...... اس نے 80 پونڈ نقد اپنے ہمراہ رکھے...... اس کے علاوہ اس نے 200 پونڈ کے لیٹر آف کریڈٹ کا بھی بندوبست کیا۔ اس نے

نجد کے ایک تاجر کے تعاون سے اس کا بندوبست کیا تھا تاکہ وہ ہا۔ال میں یہ رقم حاصل کر سکے۔اس طرح اس کی مہم پر 600 سے زائد پونڈ خرچ ہوئے تھے۔یہ 1913ء کا دور تھا جبکہ 600 پونڈ ایک بڑی رقم تصور کی جاتی تھی۔وہ پہلے ہی اپنے اوسط خرچ سے زائد خرچ کر چکی تھی لہٰذا اس نے اپنے اگلے برس کی آمدنی اس مد میں خرچ کی..... یہ رقم اس کے باپ نے اس کے بنک کے کھاتے میں پہلے ہی جمع کروا رکھی تھی۔وہ اپنے سفر کے بارے میں ایک کتاب تحریر کرنے کا ارادہ رکھتی تھی اور اسے امید تھی کہ اس کتاب کی آمدنی سے وہ اپنی مہم کے اخراجات بخوبی وصول کرے گی۔

12 دسمبر کو اسے دمشق میں ایک شاندار پارٹی دی گئی۔اس تقریب میں ال راشد کا ایجنٹ بھی شریک ہوا تھا جس نے دور دراز کے علاقے ہا۔ال میں اپنے آقا کو انگریز خاتون کے مجوزہ دورے کی اطلاع دے دی تھی۔

لیکن وہ 16 تاریخ سے قبل روانہ نہ ہو سکی کیونکہ اس کا گائیڈ فتو بیماری کا شکار ہو گیا تھا۔اسے ٹائیفائڈ نے آن گھیرا تھا۔لہٰذا اسے اپنے اس گائیڈ کی ہمراہی کے بغیر ہی عازم سفر ہونا پڑا اور وہ اس امر سے از حد مایوس ہوئی۔

اس نے اپنے سفر کو دو مراحل میں طے کرنے کی منصوبہ بندی سرانجام دی۔پہلا مرحلہ شامی صحرا کی سیاحت سرانجام دینے سے متعلق تھا۔یہ سیاحت اس نے آثار قدیمہ کے نکتہ نظر کے تحت سرانجام دینی تھی کیونکہ وہ بازنطینی کے کھنڈرات کی تحقیق سرانجام دینا چاہتی تھی۔

سردیوں کے وسط میں شامی صحرا کی راتیں سرد ترتھیں اور صحرا دھند سے بھی بھرپور تھی۔اس دوران ٹھنڈی بارشیں بھی برسیں اور تیز ہوائیں بھی چلیں۔اونٹ بھی کیچڑ میں ڈگمگاتے رہے اور جماعت کا ہر ایک فرد نہ صرف گیلا ہو گیا تھا بلکہ اس کی ہڈیوں تک سردی دھنس چکی تھی۔

لیکن سرد ترین راتوں کے باوجود بھی صحرا کے دن حیران کن تھے۔

اس نے تحریر کیا کہ:۔

''خاموشی اور تنہائی کا پردہ ہمارے اردگرد ایک نقاب کی طرح پھیلا ہوا تھا اور سفر کے طویل دورانیے طے کرنے کے علاوہ ہمارے پاس اور کوئی کام کرنے کو نہ تھا۔''

اپنے سفر کے 17 ویں روز وہ عرب چرواہوں کے ایک کیمپ تک جا پہنچے تھے جو جبل ڈروز کی پہاڑیوں سے آئے تھے۔کئی ایک عرب ان کے قافلے کی جانب بڑھے اور ان پر گولیاں برسانے لگے۔اگرچہ ان کی گولیاں ہوائی فائر ثابت ہوئے لیکن یہ ایک خوفناک لمحہ تھا۔انہوں نے بیل کے قافلے کو گھیرے میں لے لیا اور اس کو غیر مسلح کر دیا۔یہ ایک خوفناک مرحلہ تھا اور گرٹروڈ بیل نے سوچا کہ کھیل ختم ہو چکا تھا لیکن وہ پُرسکون انداز میں اپنے اونٹ پر بیٹھی رہی اور تماشہ دیکھتی رہی۔

اس دوران شیخ بھی آن پہنچے تھے۔وہ اپنے کیمپ سے آئے تھے اور وہ علی اور محمد کو جانتے تھے...... یہ دونوں اس کے گائیڈ تھے۔لہٰذا معاملہ سلجھ چکا تھا اور ان لوگوں کو ان کا چھینا ہوا اسلحہ بھی واپس کر دیا گیا تھا۔

ان وحشی چرواہوں سے نجات حاصل کرنے کے بعد وہ دوبارہ عازم سفر ہوئے۔کرسمس کے روز وہ برقا کے قدیم قلعے تک پہنچ چکے تھے...... ایک بازنطینی چوکی...... اس قلعے کو صدیوں سے کسی یورپی نے نہیں دیکھا تھا۔اس ضلع میں اپنی آثار قدیمہ سے متعلق سرگرمیاں سرانجام دینے کے بعد گرٹروڈ بیل دوبارہ مشرق کی جانب روانہ ہوئی اور عمان جا پہنچی جہاں پر فتو بھی اس سے آن ملا...... وہ ٹائیفائڈ سے روبصحت ہو چکا تھا۔

اب یہ قافلہ جنوب کی جانب نیفڈ کی طرف بڑھ رہا تھا جو عریبیہ کا وسطی حصہ تھا اور یہ عرب لوگوں کا سرچشمہ کہلاتا تھا۔ یہ علاقہ ریت کی پہاڑیوں پر مشتمل تھا۔ اس علاقے میں دریا بھی موجود تھے جن میں سال میں کبھی کبھار ہی پانی بہتا تھا۔

جنوری 1914ء میں جب گرٹروڈ بیل نیفڈ میں داخل ہوئی اس وقت اس علاقے میں موسم بہار اپنے جوبن پر تھا۔ علاقے میں سبزے اور پھولوں کا راج تھا۔ لہٰذا اونٹوں نے پیٹ بھر کر راتب کھایا۔ وہ چلتے جاتے تھے اور اپنا پیٹ بھرتے جاتے تھے۔ لہٰذا سفر کی رفتار سست پڑ چکی تھی۔ یہ صحرا ایک باغ کی طرح تھا۔ لہٰذا اونٹوں کو مکمل اجازت فراہم کی گئی کہ وہ اپنا پیٹ بخوبی بھر لیں تاکہ اس کے بعد آنے والے ریتیلے علاقے میں سفر طے کرنے کے لئے ان کی توانائی بحال رہے۔

کئی روز تک سفر طے کرنے کے بعد 8 فروری کو وہ عربوں کی ایک آبادی میں پہنچ چکے تھے۔ اس علاقے کے باشندوں نے گرٹروڈ کی اس سرزمین پر موجودگی پر اعتراض کیا کیونکہ اس سے قبل عرب کے اس حصے پر کسی بھی عیسائی نے قدم نہ رکھے تھے۔ انہوں نے فتو کو یہ تجویز پیش کی کہ وہ بھی ان کا ساتھ دے اور اس خاتون اور اس کی جماعت کو ہلاک کر کے اس کا ساز و سامان لوٹ لیا جائے اور اس مال غنیمت کو آپس میں باہم تقسیم کر لیا جائے۔ لیکن اس کے وفادار گائیڈ نے ان کی اس تجویز کو ٹھکرا دیا اور بالآخر عربوں نے انہیں اپنا سفر جاری رکھنے کی اجازت فراہم کر دی۔ لیکن نیفڈ کے دیگر عرب اس کے ساتھ ادب و احترام کے ساتھ پیش آئے اگرچہ انہوں نے اس سے پہلے کسی یورپی کو نہ دیکھا تھا۔

اس نے تحریر کیا کہ:۔

''صحرا کے ادب و آداب بہتر تھے''

وہ نیفڈ سے گزرتے ہوئے عظیم چٹانوں کے حامل ایک علاقے میں داخل ہو چکے تھے۔ بالآخر سفر طے کرتے ہوئے ہا۔ال جا پہنچے تھے۔ وہ اس مقام پر پہنچنے کی خواہش مند تھی۔ 25 فروری کو اس کی یہ خواہش پوری ہو چکی تھی۔

ہا۔ال میں اس کے ساتھ سرد مہری برتی گئی تھی۔ اس کا استقبال کرنا تو دور کی بات تھی بلکہ اس مقام پر اس کے داخلے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی اور اس کو اس شہر میں داخل ہونے کی اجازت فراہم کرنے سے انکار کر دیا گیا تھا بلکہ جنوب کی جانب سے اسے مزید سفر جاری رکھنے سے بھی روک دیا گیا تھا۔ حکمران شہر میں موجود نہ تھا۔ وہ باغی قبائل کی بغاوت کچلنے کی مہم پر نکلا ہوا تھا۔ اسے عربیبین نائٹ طرز کے ایک محل میں رکھا گیا تھا اور یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ بغیر اجازت اس محل سے روانہ نہ ہو۔

جب اس نے 200 پونڈ کے لیٹر آف کریڈٹ کیش کروانے کی کوشش کی تو اسے بتایا گیا کہ چونکہ ان کی ادائیگی امیر کے خزانچی نے کرنی تھی لہٰذا امیر کی واپسی تک ان کے کیش ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ اسے امیر کی واپسی کا انتظار کرنا تھا۔ خزانچی بھی امیر کے ہمراہ گیا ہوا تھا اور ایک ماہ تک ان دونوں کی ہا۔ال میں واپسی کی کوئی امید نہ تھی۔

اس نے بے باک رویہ اختیار کیا اور ان کو سختی کے ساتھ بتایا کہ وہ اگلے روز اس مقام سے کوچ کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

اس کے اس عمل کی بدولت حسب خواہش نتائج برآمد ہوئے۔ سردار کا خواجہ سرا ایک شخص کے ہمراہ آن پہنچا۔ ان کے ہمراہ بیگ میں 200 پونڈ کی رقم بھی موجود تھی اور اسے یہ نوید بھی سنائی گئی کہ وہ جب چاہے اس مقام سے کوچ کر سکتی تھی۔ اس کو یہ اجازت بھی فراہم کی گئی کہ وہ جس قسم کی

بھی تصاویر اتارنا چاہتی تھی بخوشی اتار سکتی تھی۔ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جس کے ضمن میں عرب حساس واقع ہوئے تھے۔

چونکہ اسے جنوب کی جانب سفر طے کرنے سے روک دیا گیا تھا لہٰذا اس نے اپنے اونٹوں کا رخ شمال مشرق کی جانب موڑ دیا اور بغداد کے لئے عازم سفر ہوئی۔ اسے امید تھی کہ اس کی امیر سے ملاقات ہو سکتی تھی جو صحرا میں خیمہ زن تھا۔ لیکن وہ اس سے ملاقات کرنے سے ناکام رہی۔

مزید پریشانی سے بچنے کیلئے گرٹروڈ بیل نے ''رفیقوں'' کی خدمات سے استفادہ حاصل کرنا شروع کیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو ان قبائل سے اس قافلے میں شامل ہوئے تھے جن سے اہل قافلہ کی ملاقات دوران سفر ہوئی تھی۔ جب اس کی ملاقات کسی اور قبیلے سے ہوتی...... تب ''رفیق'' بطور سفیر خدمات سرانجام دیتے اور عام طور پر ان کے ساتھ دشمن کی بجائے مہمانوں جیسا سلوک روا رکھا جاتا۔ صحرا کا غیر تحریر شدہ قانون تھا کہ ان قافلوں کو تنگ نہیں کیا جائے گا جن کے ہمراہ ''رفیق'' ہوں گے۔ حتیٰ کہ انتہائی خونخوار اور وحشی قبیلے بھی اس غیر تحریر شدہ قانون کی پاسداری کرتے تھے۔ کئی ایک مواقع ایسے بھی آئے جب خطرناک قبائل نے یہ کوشش سرانجام دی کہ گرٹروڈ بیل کے ''رفیق'' ان کے ساتھ مل جائیں تاکہ وہ اس کے قافلے کو ہلاک کرے اس کا مال و اسباب لوٹ لیں۔ لیکن ''رفیق'' صحرا کے غیر تحریری قانون کے ساتھ وفادار رہے اور انہوں نے گرٹروڈ بیل کا ساتھ نہ چھوڑا۔ لیکن بغداد پہنچنے پر اسے یہ معلوم ہوا کہ وہاں پر یہ قانون رائج نہ تھا۔

تاہم وہ بحفاظت 29 مارچ کو بغداد پہنچ چکی تھی۔ جہاں پر اس تاریخی سفر کے خاتمے پر اس کا والہانہ استقبال کیا گیا تھا۔ تب اس نے واپسی کا سفر شامی صحرا تا دمشق کا آغاز کیا۔ وہ پالمائیرہ کے کھنڈرات سے بھی گزری...... ''بحفاظت اور بہ آسانی''...... جیسا کہ اس نے مابعد تحریر کیا۔

اس کا سفر اگرچہ ایک بہت بڑی مہم تھی لیکن اس کے ساتھ وہ انتہائی معلوماتی سفر بھی ثابت ہوا۔ اس نے صحرا کے تمام تر ان کنوؤں کو نقشے پر دکھایا جو کہ اس سے پیشتر کسی کے علم میں نہ تھے۔ اس کے علاوہ صحرائی سرحدوں کے بارے میں نت نئے انکشافات بھی کئے جو روم...... پالمائیر اور امیہ سلطنتوں کے زیر حکومت تھیں۔ اس نے قبائل کے بارے میں جو معلومات اکٹھی کی تھیں وہ معلومات اور اطلاعات 1917ء اور 1918ء کی لارنس کی مہمات کے دوران اس کے لئے گراں قدر ثابت ہوئی تھیں۔

گرٹروڈ نے اپنی باقی ماندہ زندگی عرب دنیا کے لئے وقف کر دی تھی۔ یہ اس کی ان تھک کاوش تھی جس کے طفیل امیر فیصل 1911ء میں عراق کا بادشاہ بنا تھا اور اس کی حکمرانی کے ابتدائی برسوں میں وہ اس کے تخت کے پیچھے ایک بھرپور قوت تھی۔ وہ اس ملک کو چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی کیونکہ وہ اس ملک کے ساتھ انتہائی جذباتی وابستگی کی حامل تھی۔ لہٰذا اس نے بغداد میں نوادرات کے اعزازی ڈائریکٹر کا عہدہ سنبھال لیا اور اس نے بغداد کے عجائب گھر کی بنیاد رکھی۔ اس عجائب گھر کا بڑا حصہ اس کے نام کے ساتھ منسوب کیا گیا تھا۔

سالہا سال کے محنت طلب کام نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا...... اس نے بغداد میں جولائی 1926ء کو وفات پائی اور وہیں پر دفن ہوئی۔

جنگل میں ہسپتال کا قیام

1905ء کے موسم خزاں میں ایک روز البرٹ شوئزر...... ایک اونچا لمبا...... صحت مند...... 31 سالہ نوجوان...... جو سٹراس بورگ کے دینی کالج کا پرنسپل تھا اور مقامی چرچ کا منتظم بھی تھا...... اس نے فرانسیسی مشنری سوسائٹی کا ایک رسالہ میز سے اٹھایا اور اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ جلد ہی اس کی توجہ ایک آرٹیکل کی جانب مرکوز ہو گئی۔ اس آرٹیکل میں غربت اور بیماری کی وہ قابل رحم صورت حال بیان کی گئی تھی جس کا شکار مغربی افریقہ کے استوائی مقامی باشندے اس وقت تھے۔ بہت سے افریقی شکستہ حال جھونپڑیوں میں آباد تھے جو کہ نم آلود جنگلوں میں واقع تھیں اور کئی افریقی ایسے بھی تھے جن کے پاس سر چھپانے کا کوئی آسرا نہ تھا۔ ان کو انتہائی قلیل خوراک میسر تھی اور وہ اکثر دو یا تین دن فاقے کی حالت میں گزارنے پر مجبور تھے...... انہیں کھانے کیلئے کچھ بھی میسر نہ آتا تھا۔ طبی سہولتوں کا بھی فقدان تھا لہٰذا تمام تر قبیلے کئی اقسام کی بیماریوں کا شکار تھے۔ ان میں کوڑھ اور پیچش کی بیماریاں سرفہرست تھیں۔ ہر سال ہزاروں افریقی جنگلوں میں موت کا شکار ہو جاتے تھے۔ ان کا کوئی پُرسان حال نہ تھا۔ اس آرٹیکل میں نوجوان مشنریوں اور ڈاکٹروں...... بالخصوص ڈاکٹروں سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ مغربی افریقہ جائیں اور مصائب زدہ لوگوں کی امداد سرانجام دیں۔

یہ آرٹیکل پڑھ کر شوئزر کو ازحد دکھ ہوا۔ جب وہ بچہ تھا اس وقت اس کے والدین نے اسے گنز بیچ میں واقع دیہات کے ایک اسکول میں داخل کروا دیا تھا...... یہ اسکول مونسٹر وادی میں واقع تھا...... شوئزر کے علاوہ اس اسکول کے تمام تر بچے غریب خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے اپنی ابتدائی عمر میں ہی غریبوں کے ساتھ انتہائی ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ عرصہ دراز سے اس کے اندر یہ خواہش مچل رہی تھی کہ وہ ضرورت مند لوگوں کی امداد کے لئے اپنی زندگی وقف کر دے۔ لیکن ابھی تک وہ یہ طے نہیں کر پایا تھا کہ وہ ضرورت مند لوگوں کی امداد کن خطوط پر اسرانجام دے۔ اس نے جوں ہی یہ آرٹیکل پڑھا۔ اس نے یہ سوچا کہ:۔

''یہ میرے لئے ایک انتہائی نادر موقع ہے۔''

لہٰذا اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اس آرٹیکل کے تحت کی گئی درخواست کے جواب میں اپنی خدمات بطور طبی مشنری پیش کرے گا۔

شوئزر نے فوری طور پر ہیلن برسلا کو اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ وہ اس یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کی صاحبزادی تھی۔ وہ ہیلن برسلا سے محبت کرتا تھا اور اس کی محبت میں اس قدر گرفتار تھا کہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اسے بتایا کہ وہ اپنی جیب سے فرانسیسی مشن اسٹیشن پر ایک ہسپتال قائم کرنا چاہتا تھا جو لمبارین میں واقع تھا...... دریائے اوگووی پر...... کانگو کے جنگل کے عین دل میں واقع تھا۔

ہیلن جو بذات خود ایک نرس تھی وہ اس کی بات سن کر ازحد خوش ہوئی۔ لیکن اس نے کہا کہ:۔

''البرٹ...... تمہیں ادویات کے میدان کا کچھ بھی علم نہیں ہے...... تمہیں ایک طبی مشنری بننے سے پیشتر ایک ڈاکٹر بننا ہوگا۔''

البرٹ شوئزر نے جواب دیا کہ:۔

''میں جانتا ہوں......اور یہی سب کچھ میں کرنا بھی چاہتا ہوں''

وہ پہلے ہی تین ڈگریوں کا حامل تھا......فلسفہ......مذہبی تعلیم اور موسیقی۔

ہیلن نے ان مشکلات اور قربانیوں کا ذکر بھی کیا جو اسے دینی تھیں اور جب اس نے یہ دیکھا کہ شوئزر اپنے ادارے پر مضبوطی سے قائم تھا تب اس نے انتہائی نرمی کے ساتھ کہا کہ:۔

''درست ہے البرٹ......میں تمہارے کارِ خیر میں تمہاری مدد سرانجام دوں گی......اگر تم مناسب سمجھو تو میں تمہارے ساتھ افریقہ جانے پر بھی تیار ہوں۔''

چند ہفتوں بعد شوئزر نے طب کے میدان میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا آغاز کر دیا۔اس کے ساتھ ساتھ اس نے گرجا گھر کے منتظم اور دینی کالج کے پرنسپل کے عہدے پر بھی اپنی خدمات کی بجا آوری جاری رکھی۔اس کے علاوہ اس نے موسیقی اور تصنیف کے ذریعے بھی رقم اکٹھی کرنی شروع کر دی تاکہ مشنری کے کام کے لئے کچھ رقم پس انداز ہو سکے۔وہ ایک ایسا شخص تھا جو کئی ایک خوبیوں اور ذہانتوں کا حامل تھا۔وہ کئی ایک تقریبات کے موقع پر آرگن بھی بجاتا تھا۔اس نے تین کتب بھی تحریر کیں۔اس نے موسیقی کی کتاب بھی تحریر کرنی شروع کی۔

چھ برس کے طویل عرصے تک شوئزر نہ صرف طب کے میدان میں تعلیم حاصل کرتا رہا بلکہ مختلف ذرائع سے رقم کما کر پس انداز بھی کرتا رہا۔ طبی تعلیم حاصل کرنا اس کے لئے آسان کام نہ تھا اور طبی کلاس کے اختتام پر وہ اکثر مایوسی کا شکار ہو جاتا تھا۔لیکن اس نے انتہائی صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس میدان میں بھی ڈگری حاصل کر لی......یہ اس کی چوتھی ڈگری تھی......اب وہ ایک سند یافتہ ڈاکٹر تھا اور سرجن بھی تھا......اس وقت اس کی عمر 36 برس تھی۔

جوں ہی اس نے طب کی تعلیم و تربیت مکمل کی......شوئزر اس وقت تک کافی رقم جمع کر چکا تھا......اس نے اپنی مہم کی تیاری کا آغاز کیا۔

اس نے کہا کہ:۔

''میں نے مختلف کیٹیلاگوں سے ان اشیاء کی فہرست مرتب کی تھی جو مجھے درکار تھیں......میں روزانہ ان اشیاء کی خریداری کے لئے نکل جاتا تھا......دوکان دوکان پھرتا تھا......خریداری سرانجام دیتا تھا......حساب کتاب اور ڈیلیوری نوٹ کی پڑتال کرتا تھا......اس کے علاوہ میں دیگر امور کی سرانجام دہی میں بھی مصروف رہتا تھا۔''

ان امور کی سرانجام دہی میں ہیلن نے اس کی معاونت سرانجام دی تھی۔

شوئزر نے جب اپنے رشتہ داروں اور احباب کو یہ بتایا کہ وہ بطور طبی مشنری مغربی افریقہ میں خدمات سرانجام دینا چاہتا تھا تو اس کے بہت سے رشتہ دار اور احباب خوف و ہراس کا شکار ہو گئے اور اسے تلقین کرنے لگے کہ وہ اپنے اس ارادے سے باز آ جائے۔

اس کے رشتہ دار اور احباب اسے مخاطب کرتے ہوئے کہتے تھے کہ:۔

''تم اپنی ذہانتوں کو ضائع کرو گے......بطور موسیقار ایک بہترین کیریئر سے محروم ہو جاؤ گے......اور تم بالآخر جنگل میں دفن ہو جاؤ گے۔''

اب جبکہ شوئزر بہت آگے نکل چکا تھا لہٰذا اس کے کئی دوستوں نے اپنا رویہ تبدیل کر لیا تھا اور بہت سے دوستوں نے اس کے مجوزہ ہسپتال کیلئے اسے مالی امداد سے بھی نوازا تھا۔

شوئزر کے پاس اب ہسپتال کی تعمیر کیلئے معقول رقم جمع ہو چکی تھی۔ وہ ہسپتال تعمیر کرنے کے علاوہ کچھ عرصہ تک اسے بخوبی چلا بھی سکتا تھا۔

جب اس کی تیاریاں تقریباً مکمل ہو گئیں تب البرٹ شوئزر اور ہیلن برسلا نے شادی کر لی اور فروری 1913ء کو وہ مغربی افریقہ کی جانب اپنے بحری سفر پر روانہ ہوئے۔ اس کے ہمراہ ادویات کے 70 صندوق تھے اور کئی ہزار مالیت پونڈ کا سونا بھی موجود تھا۔ دو ماہ بعد وہ پورٹ گینٹل پہنچ چکے تھے۔ اس مقام پر گرمی ناقابل برداشت تھی۔ یہاں پر انہیں دریائے بیلو میں سفر طے کرنا تھا اور لسبارین پہنچنا تھا۔ اس سفر کے دوران انہوں نے جنگلوں میں سے بھی گزرنا تھا۔

شوئزر نے سوچا کہ:۔

"یہ کیسا ملک ہے...... درخت ہی درخت...... ہر جانب درخت ہی درخت...... اگر یہاں پر اتنی زیادہ بیماریاں ہیں تو اس میں حیران ہونے والی کوئی بات نہیں ہے۔"

لسبارین میں موجود مشنریوں نے ان کا والہانہ استقبال کیا اور ان کی رہائش کیلئے لکڑی کا ایک بنگلہ بھی فراہم کر دیا۔ شوئزر اور اس کی بیوی نے اس بنگلے کو ایک ڈسپنسری میں تبدیل کر لیا تھا۔ بذات خود وہ ایک دوسری رہائش گاہ میں جا پہنچے تھے۔ انہوں نے ہسپتال کی تعمیر تک اسی رہائش گاہ میں رہائش اختیار کرنی تھی۔ یہ رہائش گاہ دریا کے قریب واقع تھی۔

جلد ہی جنگل میں یہ خبر پھیل گئی کہ ایک عظیم سفید فام اوگانگا...... مقامی زبان میں ڈاکٹر کے لئے یہی لفظ استعمال ہوتا تھا...... لسبارین پہنچ چکا تھا تاکہ بیمار لوگوں کا علاج سرانجام دے سکے۔ لہٰذا جنگل میں واقع دور اور نزدیک کے دیہاتوں سے لوگ...... جن میں مرد، عورتیں اور بچے بھی شامل تھے شوئزر کے پاس علاج معالجے کی غرض سے آنے لگے۔ ان مریضوں میں زیادہ تر مریض کوڑھ...... پیچش...... ملیریا...... معدے کے السر اور دیگر بیماریوں میں مبتلا تھے۔ بہت سے مریض اس قدر کمزور تھے کہ چل بھی نہیں سکتے تھے۔ ان کے رشتے دار اور دوست ان کو دور دراز کے مقامات سے اٹھا کر لاتے تھے...... یہ لوگ 50 میل یا اس سے زائد فاصلے سے اٹھا کر لائے جاتے تھے...... ان میں سے کچھ مریض راستے میں ہی مر جاتے تھے۔

شوئزر نے افریقی لوگوں کے مصائب کا جو اندازہ لگایا تھا مصائب اس اندازے سے کہیں بڑھ کر تھے۔

لسبارین میں چند ہفتے گزارنے کے بعد اس نے کہا تھا کہ:۔

"میں کس قدر خوش ہوں...... تمام تر مخالفت کے باوجود بھی میں نے اپنے منصوبے پر عمل درآمد کو یقینی بنایا ہے اور یہاں پر ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے مقیم ہوں"

شوئزر کی مشکلات پیچیدہ تر تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے مریض انتہائی جاہل تھے اور انہیں زندگی گزارنے کے بارے میں ایک بھی چیز نہیں بتائی گئی تھی۔ شوئزر کے لئے یہ امر انتہائی مشکل ہوتا تھا...... اور کبھی کبھار ناممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنے مریضوں کو سمجھا سکے کہ اس نے انہیں جو ادویات دی تھیں ان کو کس طرح استعمال کرنا تھا۔ اکثر مریض اس کریم کو کھا جاتے تھے جو وہ انہیں ان کی جلد پر لگانے کے لئے دیتا تھا اور جو سفوف

ان کو کھانے کیلئے دیتا تھا اس کو جلد پر مل لیتے تھے۔

شوئزر کی بدقسمتی تھی کہ وہ مقامی افریقی زبانوں سے نابلد تھا۔ لیکن جلد ہی اس کا یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ ایک روز ایک افریقی لڑکا جس کا نام جوزف تھا وہ اس کے پاس آیا...... وہ فرانسیسی بھی بول سکتا تھا اور افریقی مقامی زبانیں بھی بول سکتا تھا...... اس نے بطور ترجمان اپنی خدمات پیش کر دیں۔ جوزف نے ذہانت اور لگن کا مظاہرہ کیا اور وہ کئی ایک لحاظ سے اس کے لئے انتہائی سودمند ثابت ہوا۔ ہر ایک مریض کے معائنے کے بعد ڈاکٹر ایک پرچی اس کے گلے میں لٹکا دیتا۔ اس پرچی پر فرانسیسی زبان میں اس کا نام...... اس کی بیماری کی نوعیت...... اور تجویز کردہ علاج درج ہوتا تھا۔ مریض اس کے بعد جوزف کے پاس چلا آتا تھا۔ جوزف اس کو مقامی زبان میں سب کچھ سمجھا دیتا تھا۔

جوزف اس قدر محنتی تھا کہ شوئزر نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اس کی خدمات سے زیادہ سے زیادہ استفادہ حاصل کرے گا۔ اس نے جوزف کو ابتدائی طبی امداد اور ادویات کی تربیت فراہم کی اور اسے مردانہ نرس کے عہدے پر فائز کر دیا اور کچھ ہی عرصہ بعد اس نے آپریشن کے دوران بھی شوئزر کی مدد سرانجام دینی شروع کر دی۔ ہیلن بھی آپریشن کے دوران شوئزر کی مدد سرانجام دیتی تھی۔

چونکہ بنگلے میں آپریشن تھیٹر کے لئے کوئی کمرہ موجود نہ تھا لہٰذا تمام آپریشن کھلی فضا میں کئے جاتے تھے۔ شوئزر جو کہ ایک ماہر سرجن تھا بہت سے آپریشن سرانجام دیتا تھا حالانکہ کئی آپریشن پیچیدہ نوعیت کے حامل ہوتے تھے۔ افریقی لوگوں نے آپریشن کیلئے بے ہوش ہونے کے بارے میں نہیں سنا تھا لہٰذا شوئزر کو خطرہ تھا کہ کہیں وہ بے ہوش ہونے کے عمل سے خوفزدہ نہ ہو جائیں۔ لہٰذا وہ انہیں بے ہوش کرنے سے بیشتر تمام تر تفصیلات سے آگاہ کر دیتا تھا کہ جب ان کے چہرے پر ماسک ڈالا جائے گا تو ان کے ساتھ کیا وقوع پذیر ہو گا۔ وہ ان کو سمجھاتے ہوئے کہتا تھا کہ:۔

''اب تم ڈرو نہیں...... تم جب بیدار ہو گے تو تمہیں کوئی درد محسوس نہیں ہو گا۔''

جب افریقی آپریشن کے لئے آتے تھے اور جب یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کی درد حقیقت میں رفع ہو چکی تھی تو وہ بہت خوش ہوتے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ شوئزر کسی قسم کا جادوگر تھا...... شاید ایک دیوتا تھا...... اس کے علاوہ کون شخص ایسا تھا جو ایسے حیران کن کارنامے سرانجام دے سکتا تھا؟ تشکر کے جذبات سے مغلوب مریض اپنے دوستوں اور رشتے داروں کو بتاتے تھے کہ نئے سفید فام ڈاکٹر کے ہاتھ میں کس قدر شفا تھی جو ان لوگوں کی خدمت کے لئے آیا تھا...... انہیں بیماریوں سے نجات دلانے کے لئے آیا تھا۔ آپریشن سے قبل بے ہوشی ان کے نزدیک انتہائی حیران کن امر تھا۔

ایک افریقی لڑکی نے آپریشن سے فارغ ہونے کے بعد کہا کہ:۔

''جب سے اوگانگا (ڈاکٹر) یہاں آیا ہے حیران کن باتیں منظر عام پر آ رہی ہیں...... پہلے وہ بیمار لوگوں کو مار ڈالتا ہے...... پھر ان کا علاج کرتا ہے...... اور اس کے بعد وہ انہیں دوبارہ بیدار کر دیتا ہے''۔

شوئزر کی شہرت اب دور دور تک پھیل چکی تھی اور اس کے پاس دور دراز کے علاقوں سے بھی مریض علاج کی غرض سے آنے لگے تھے۔ مریض 200 میل کا سفر طے کرتے اس کے پاس آتے تھے اور یہ سب کچھ چند ماہ کے اندر اندر وقوع پذیر ہوا تھا۔ شوئزر ایک دن میں کئی سو مریضوں کا معائنہ سرانجام دیتا تھا اور اس نے ان سے کبھی ایک پیسہ بھی وصول نہ کیا تھا۔

وہ ان کو بتاتا تھا کہ:۔

''مجھے کسی رقم کی ضرورت نہیں ہے...... اگر تم میرا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہو...... تب ایک روز تم میری معاونت سرانجام دے سکتے ہو''

شوئٹزر صبح سویرے سے لے کر رات گئے تک کام میں مصروف رہتا تھا۔ مریضوں کی آمد کے دوران جو تھوڑا بہت وقفہ اسے میسر آتا تھا اس وقفے کے دوران وہ اپنے نئے ہسپتال کی تعمیر کی منصوبہ بندی سرانجام دیتا تھا۔ وفادار جوزف کے تعاون سے اس نے نم آلود اور حشرات الارض سے بھرپور جنگل کا کافی زیادہ حصہ صاف کر لیا تھا۔

ہیلن حیران تھی کہ اس کا خاوند کتنی دیر کام کے اس بوجھ کو اٹھا پائے گا۔ کیونکہ آب وہوا بھی غیر صحت مندانہ تھی اور وہ اکثر اسے تلقین کرتی رہتی تھی کہ وہ کچھ دیر کیلئے آرام بھی کر لیا کرے۔ وہ کہا کرتی تھی کہ:۔

''اگر تم اسی شدت کے ساتھ کام کرتے رہے تو تم بذات خود بیمار پڑ جاؤ گے''

شوئٹزر ہنستے ہوئے جواب میں کہا کرتا تھا کہ:۔

''تب میں اپنے نئے اسپتال کا ایک مریض بن جاؤں گا اور تم میری تیمارداری کرو گی۔''

کوئی چیز بھی اسے اس کے کام سے نہ روک سکی۔

جب ہسپتال کے لئے جگہ تیار ہو گئی تب شوئٹزر اور جوزف نے ان درختوں کو کاٹنا شروع کیا جن کو وہ جگہ صاف کرنے کی غرض سے گرا چکے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے جھونپڑیوں کی تعمیر کا کام شروع کر دیا۔

کئی ماہ تک محض جوزف ہی شوئٹزر کی مدد کرتا رہا۔ اس کے بعد ڈاکٹر کے وہ مریض بھی آنے شروع ہو گئے جو صحت یاب ہو چکے تھے اور ڈاکٹر کے انتہائی مشکور تھے۔ انہوں نے بھی اپنی خدمات پیش کر دیں۔ وہ کافی زیادہ تعداد میں رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات کی سرانجام دہی کے لئے آن پہنچے تھے۔

ان کا کہنا تھا کہ:۔

''آپ نے ہماری مدد کی تھی...... اب ہم آپ کی مدد کرنا چاہتے ہیں''

لہٰذا انہوں نے بھی تعمیراتی مراحل میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔

اگرچہ صورت حال کٹھن تھی لیکن اس کے باوجود بھی ہسپتال کی تعمیر کا کام انتہائی تیزی کے ساتھ اپنی تکمیل کے مراحل طے کر رہا تھا۔

لمبارین میں اپنے قیام کے پہلے سال کے دوران شوئٹزر بہترین جھونپڑیاں کثیر تعداد میں تیار کر چکا تھا۔ جو استعمال کے لئے تیار تھیں۔ ان میں مریضوں کیلئے ایک وارڈ تھی...... ایک ڈسپنسری تھی...... ایک سرجری کیلئے مخصوص تھی...... ایک کمرہ انتظار گاہ تھا...... ایک کمرہ جوزف کیلئے مخصوص تھا اور سب سے بڑھ کر اور سب سے اہم یہ کہ ایک آپریشن تھیٹر بھی تھا...... یہ سب کچھ شوئٹزر نے اپنے ہاتھوں کے ساتھ تعمیر کیا تھا۔

شوئٹزر نے اب بنگلہ بھی چھوڑ دیا تھا اور دریا کے نزدیک اپنی رہائش گاہ بھی چھوڑ دی تھی اور نئی جگہ پر منتقل ہو چکا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے مزید جھونپڑیاں تعمیر کرتے ہوئے اپنے ہسپتال کو وسعت عطا کر دی تھی۔ جوں جوں ہسپتال وسعت اختیار کرتا گیا اور مریضوں کی تعداد میں بھی

اضافہ ہوتا چلا گیا تو ں توں شوئٹزر کو مزید معاونین کی ضرورت کا احساس بڑھتا چلا گیا۔ لہٰذا اس نے لاتعداد افریقی مردوں اور عورتوں کو تربیت فراہم کی۔ اس نے جوزف کو پہلے ہی تربیت دے رکھی تھی۔ اس نے ان لوگوں کو بطور نرس خدمات سرانجام دینے کیلئے تیار کر لیا تھا۔

مزید تین برس تک شوئٹزر نے جنگل میں ہی اپنے کام کو جاری رکھا۔ وہ افریقی عوام کے مصائب کا خاتمہ کرتا اور لوگوں کی زندگیاں بچاتا رہا۔ تب 1917ء میں ایک سانحہ پیش آ گیا۔ یہ پہلی جنگ عظیم کا تیسرا سال تھا اور شوئٹزر فرانسیسی حدود میں ایک جرمن قومیت کا حامل شخص تھا...... فرانسیسی حکومت نے اسے اچانک فرانس طلب کر لیا تھا تا کہ اسے زیر نگرانی رکھا جائے۔

بوجھل دل کے ساتھ شوئٹزر اور اس کی بیوی نے اپنے ہسپتال کو بند کیا...... اپنے مریضوں کو خدا حافظ کہا اور دریا کی جانب چل دیے۔ جونہی ان کا اسٹیمر روانہ ہوا وہ افریقی جو اسے خدا حافظ کہنے کے لئے آئے تھے دھاڑیں مار کر رونے لگے۔

وہ چلانے لگے کہ:۔

''اوگا نگا (ڈاکٹر) ہماری جانب واپس لوٹ آؤ...... آپ واپس آئیں گے؟ کیا آپ واپس نہیں آئیں گے؟''

شوئٹزر نہیں جانتا تھا کہ مستقبل کیا کروٹ لیتا تھا...... اس نے اداسی کے ساتھ ہاتھ ہلاتے ہوئے انہیں خدا حافظ کہا لیکن ان کے ساتھ کوئی وعدہ نہ کیا۔

شوئٹزر کو محض ایک مختصر سے دورانیے کیلئے زیر نگرانی رکھا گیا لیکن کئی ایک ناگزیر وجوہات کی بنا پر وہ پانچ برس بعد لمبارین واپس آنے کے قابل ہوا۔ اپنی واپسی پر اسے اپنا ہسپتال عملی طور پر تباہ شدہ حالت میں ملا۔

لیکن افریقی اسے بھول نہ پائے تھے۔ وہ چلانے لگے کہ:۔

''اوگا نگا (ڈاکٹر) واپس آ گیا ہے...... اوگا نگا واپس آ گیا ہے۔''

اس کے واپس آنے کی خبر جنگل میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور جلد ہی مریض بھی آنے شروع ہو گئے...... مریض جوق در جوق آنے لگے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو موت کی دہلیز تک جا پہنچے تھے۔

شوئٹزر نے افریقیوں کی مدد اور تعاون سے فوری طور پر ہسپتال کی تعمیر کو بحال کرنے کے کام کا آغاز کیا اور چند ماہ بعد ہسپتال دوبارہ پورے زور شور کے ساتھ اپنی خدمات سرانجام دے رہا تھا۔

کچھ عرصہ بعد شوئٹزر نے ایک اور مقام پر نیا...... کشادہ اور بہت بہترین ہسپتال تعمیر کر لیا۔

1952ء میں اسے انسانیت کی خدمت کے صلے میں نوبل پرائز سے نوازا گیا اور وہ 1965ء میں اپنی وفات تک وہیں پر اپنے کام میں مصروف رہا تھا۔ اسے لمبارین میں دفن کیا گیا تھا۔

ایمڈن نامی جنگی جہاز

اگست 1914ء میں جنگ کے شعلے بھڑکنے کے ایک یا دو ہفتوں بعد جرمن بحریہ اور تجارتی جہاز سیون سیز سے غائب ہو چکے تھے۔ یہ رائل نیوی کا کمال تھا جوان دنوں اپنے جوبن پر تھی۔ اس میں بحری اصلاحات سرانجام دی گئی تھیں اور اس کی رفتار اور گولہ باری کی صلاحیت بڑھانے کی جانب خصوصی توجہ دی گئی تھی۔

رائل نیوی کو شمالی سمندر (جنگ سے پیشتر اکثر نقشوں میں جرمن سمندر ظاہر کیا جاتا تھا) پر دسترس حاصل تھی۔ اس نے جرمن کے بحری جنگی جہازوں ''گوبن'' اور ''برسلا'' کو جان بچا کر بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔

محض مغربی بحراوقیانوس اور جنوبی بحرالکاہل میں دشمن کی بحری قوت کو پاش پاش کرنا ممکن نہ ہوا تھا۔

''ایمڈن'' 3,593 ٹن وزنی جہاز تھا۔ اس پر 4.1 انچ دہانے کی 12 توپیں نصب تھیں۔ اس جہاز کی کمان کیپٹن وون ملر کے سپرد تھی جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ایک انگریز ماں کا بیٹا تھا اور اس نے ایک انگریز عورت سے شادی کر رکھی تھی۔ آنے والے ہفتوں میں اس نے جہاز کی قیادت اس خوبی سے سرانجام دی کہ رائل نیوی میں اس کی تعریف و توصیف کے چرچے عام ہوئے۔

چھ ہفتوں تک ''ایمڈن'' اور اس کی کارگزاری آنکھوں سے اوجھل رہی حتیٰ کہ وہ اچانک خلیج بنگال میں رونما ہوا۔ اسٹور سے لدے ہوئے کئی ایک جہاز مختلف مقامات کی جانب روانہ کئے گئے تھے لیکن ''ایمڈن'' کے کپتان نے اپنی سپلائی کے لئے زیادہ تر انحصار مال غنیمت پر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یونانی جہاز ''پونٹوپورس'' 6,500 ٹن ہندوستانی کوئلہ لے جا رہا تھا۔ یہ کوئلہ ''ایمڈن'' کے کام آیا۔ لیکن اس کوئلے کا معیار ناقص تھا جس کی وجہ سے اس کی رفتار متاثر ہوئی۔ اس نے جن دیگر اسٹوروں پر قبضہ کیا وہ اس کے لئے خوش قسمتی کا باعث ثابت ہوئے۔

10 اور 14 ستمبر 1914ء کے درمیان ''ایمڈن'' نے سات تجارتی جہازوں کا پیچھا کیا...... ان میں سے چھ کو ڈبو دیا اور ایک جہاز کو قابو کر لیا۔ ''ایمڈن'' کا فرسٹ لیفٹیننٹ میوک تھا۔

ہر نئی کارروائی کے بعد ''ایمڈن'' غائب ہو جاتا تھا۔ چار روز بعد ہر ایک برطانوی اور اتحادی تجارتی جہاز...... بحری ہند کے شمالی حصے میں یا تو سمندر کی تہہ میں ڈوب چکا تھا یا پھر بندرگاہ پر کھڑا تھا تاکہ اسے سمندر کی تہہ میں نہ پہنچا دیا جائے۔

''ایمڈن'' نے اپنی کامیاب کارروائیاں جاری رکھیں اور اس نے اپنی توپوں کا رخ مدراس کے آئل ٹینکوں کی جانب موڑ دیا۔ رات کو اچانک حملہ آور ہو کر تیل کو نذر آتش کر دیا اور شہر پر بھی گولے برسائے جس سے شہر کی آبادی ہراساں ہو گئی۔ اس صدمے سے سنبھلنے کے فوراً بعد مقامی ساحل کی توپیں بھی حرکت میں آ گئیں اور ''ایمڈن'' پر آگ اگلنے لگیں لیکن وہ جلد ہی غائب ہو جانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ کیپٹن وون ملر نے ''ایمڈن'' کو شمال، مشرقی سمت کی جانب گامزن ہونے کا حکم دیا۔ وہ یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ کلکتہ کی جانب بڑھ رہا تھا تاکہ دشمن کو مزید نقصان سے دو

چار کر سکے۔ لیکن نظروں سے دور ہونے کے بعد اس نے اپنا راستہ تبدیل کر لیا اور جنوب کی جانب کا رخ کیا اور سیلون کی مشرقی بندرگاہ جا پہنچا۔

ان پانیوں میں دشمن کے جہاز کی موجودگی نہ صرف سیاسی اعتبار سے پریشان کن تھی بلکہ معاشی اعتبار سے بھی پریشان کن تھی اور ہر ایک برطانوی اور اتحادی جنگی جہازوں کو جو بحر ہند یا اس کے قرب و جوار میں موجود تھے چوکنا کر دیا گیا تھا کہ وہ "ایمڈن" روکیں اور اس پر حملہ آور ہوں۔

کیپٹن وون ملر کی پالیسی یہ تھی کہ وہ ایک علاقے میں لگاتار دو کارروائیاں سرانجام نہیں دیتا تھا۔ اس نے اپنے شکار کی نقل و حرکت سے باخبر ہونے کے لئے وائرلیس ٹیلی گرامی سے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔ وہ دیگر مفید معلومات اتحادی جنگی جہازوں کے ایک دوسرے کو بھیجے گئے پیغامات سے حاصل کر لیتا تھا۔ ایک برطانوی جہاز براہ راست "ایمڈن" کے ساتھ مواصلاتی رابطے میں رہا۔ وہ اس کی شناخت سے بے خبر تھا اور اس سے دریافت کر رہا تھا کہ:۔

"کیا تمہیں "ایمڈن" کے بارے میں کوئی خبر ہے؟"

اور اس کے علاوہ وہ جہاز رانی کے دیگر معاملات کے بارے میں بھی دریافت کرتا رہا۔ اس کے فوراً بعد ہی اس برطانوی بحری جہاز کو قابو کر لیا گیا اور غرق کر دیا گیا۔

ماہ ستمبر کے آخری پانچ دنوں کے دوران "ایمڈن" نے سیلون کے جنوب میں چار جہازوں کو غرق کر دیا تھا اور "بورسک" نامی جہاز پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس جہاز میں 6,600 ٹن ویلش کوئلہ لدا ہوا تھا۔ اس کے بعد تین ہفتوں تک "ایمڈن" کے بارے میں کچھ نہ سنا گیا۔ اس کے بعد 10 اکتوبر کو وہ سیلون سے 1000 میل دور الگ تھلگ واقع جزیرہ ڈیگو گارشیا پہنچ چکا تھا۔ اہل جزیرہ تک جنگ کی خبر تا حال نہ پہنچ پائی تھی۔ وہاں پر برطانوی رعایا آباد تھی لیکن جرمنوں نے ان کے ساتھ بہتر سلوک روا رکھا۔ حتیٰ کہ جزیرے کی واحد موٹر۔ کشتی بھی مرمت کر دی جو کچھ عرصہ سے مرمت طلب چلی آ رہی تھی اور ناکارہ کھڑی تھی۔

20 اکتوبر کو "ایمڈن" ایک مرتبہ پھر سرگرم عمل تھا اور کامیابی سے دوچار ہو رہا تھا۔ اس نے اتحادیوں کے پانچ بحری تجارتی جہاز ڈبو دیے تھے اور ایک کوئلے کے جہاز پر قبضہ کر لیا تھا جو کولمبو اور عدن کے درمیان تجارتی روٹ پر گامزن تھا۔ انہوں نے بروقت کوئلے کے جہاز پر قبضہ کیا تھا کیونکہ ان کے جہاز کا ایندھن ختم ہونے کے قریب تھا۔ کیپٹن وون ملر مشرق کی جانب آبنائے ملاکا کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔

کئی ایک مقامات پر یہ آبنائے اتنی تنگ تھی کہ جہاز رانی کا عمل مشکل دکھائی دیتا تھا بالخصوص رات کے وقت جہاز رانی ایک مشکل امر دکھائی دیتا تھا۔

"ایمڈن" جس وقت بندرگاہ کی جانب بڑھا اس وقت اس پر سفید جھنڈا لہرا رہا تھا۔ بندرگاہ پر پہلے ہی کئی ایک جہاز کھڑے تھے۔ ان میں ایک روسی ہلکا جہاز "زہم چک" بھی شامل تھا۔

پانچ صد گز کے فاصلے پر "ایمڈن" نے سفید جھنڈا اتارا اور اس پر جرمنی جھنڈا لہرا دیا گیا۔ اس دوران اس نے روسی جہاز کو تارپیڈو کا نشانہ بھی بنایا۔

اس کے ساتھ حملہ آور بذات خود حملے کی زد میں آ گیا۔ اس کے اردگرد بارودی گولے گرنے لگے۔ اس دوران اس نے روسی جہاز کو ایک

اور تارپیڈو کا نشانہ بنایا۔ روسی جہاز ''ژہم چگ'' ڈوب چکا تھا جبکہ ''ایمڈن'' نے اپنے حملہ آور کا رخ کیا..... یہ حملہ ایک فرانسیسی تباہ کن جہاز نے اس پر کیا تھا۔ اس کا نام ''ماس کوایٹ'' تھا۔ ''ایمڈن'' نے اپنی پوری رفتار کے ساتھ آ بنائے میں بھاگنا شروع کر دیا اور جلد ہی وہ فرانسیسی جہاز کی پہنچ سے دور نکل چکا تھا۔

30 اکتوبر کو اس نے ''بورسک'' نامی جہاز پر قبضہ کرتے ہوئے کوئلہ حاصل کیا اور کوکاس...... جزیروں کے ایک گروپ کی جانب روانہ ہوا اور ان جزیروں کے مغرب میں جا پہنچا جسے اب انڈونیشیا کہتے ہیں۔ یہاں کا کیبل اسٹیشن برطانیہ کے کنٹرول میں تھا۔ کیپٹن وون طر اس کیبل اسٹیشن کو تباہ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا تاکہ آسٹریلیا کے ساتھ مواصلاتی رابطہ ختم ہو جائے۔ کیبل اسٹیشن کے آپریٹر نے فوراً یہ پیغام دیا کہ ایک ''غیر ملکی جہاز'' دیکھا گیا تھا۔ کیپٹن وون طر اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ اس کا راستہ آسٹریلیا تا کولمبو جانے والے ٹرانسپورٹ بحری بیڑے نے کاٹ رکھا تھا جو آسٹریلیا کے حفاظتی جہاز ''ملبورن'' (کیپٹن سلور) اور سڈنی (کیپٹن گلوسپ) کی معیت میں روبہ عمل تھا۔ ان کے درمیان 50 میل کا فاصلہ حائل تھا۔ لیکن مشرق کی جانب ''ایمڈن'' کی پسپائی اختیار کرنے کی راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔

کیبل اسٹیشن سے ''ملبورن'' کو خبردار رہنے کا پیغام مل چکا تھا۔ ''ملبورن'' کے کپتان نے ''سڈنی'' کو فوراً احکامات صادر کئے کہ کوکاس کے جزیروں تک پہنچے اور چھان بین سرانجام دے۔ ''سڈنی 5,600 ٹن وزنی جہاز تھا۔ اس جہاز کے افسران رائل نیوی کے تجربہ یافتہ تھے۔ وہ جزیروں کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔

''سڈنی'' جلد ہی ''ایمڈن'' سے برسرپیکار ہو چکا تھا۔ ''ایمڈن'' کے پاس محض تین تارپیڈو باقی تھے۔ لیکن کسی فنی خرابی کی بنا پر وہ بھی بیکار تھے۔

جرمنی کپتان نے ''سڈنی'' پر گولہ باری کی بارش کر دی تھی اس کی بارہ میں سے نو توپیں آگ اگل رہی تھیں کیونکہ ان کا کپتان پہلی مرتبہ شکست کی تلخی سے آشنا ہو رہا تھا۔ ''ایمڈن'' کی جارحیت اب دم توڑ چکی تھی اور ''سڈنی'' اس پر تابڑ توڑ حملے کر رہا تھا۔

کیپٹن گلوسپ نے اطاعت قبول کرنے کا مطالبہ کر دیا تھا لیکن اسے کوئی جواب موصول نہ ہوا تھا۔ اس نے کچھ دیر تک انتظار کیا اور دوبارہ ''ایمڈن'' پر بمباری کا حکم دیا۔ ''سڈنی'' کے فتح کے نشے میں سرشار عملے نے دیکھا کہ ''ایمڈن'' سے جرمنی جھنڈا اتار لیا گیا تھا اور اس پر سفید جھنڈا لگا دیا گیا تھا۔ شکست خوردہ جہاز کا کپتان انتہائی مہارت اور بے جگری کے ساتھ لڑا تھا۔ اس جنگ میں اس کے 110 افراد ہلاک ہوئے تھے اور 50 افراد زخمی ہوئے تھے جن میں کچھ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے مابعد ہلاک ہو گئے تھے۔ ''سڈنی'' کے نقصانات میں چار ہلاک شدگان اور 16 زخمی افراد شامل تھے۔

''ایمڈن'' اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ ''سڈنی'' نے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کی کارروائی اتحادیوں بالخصوص برطانیہ کے حق میں انتہائی مفید ثابت ہوئی تھی۔ اب وہ کولمبو کی جانب رواں دواں تھا۔ اس پر گیارہ جرمن افسر بشمول کپتان وون طر سوار تھے۔ کپتان وومن طر کے ساتھ ایک قابل احترام دشمن جیسا سلوک روا رکھا گیا تھا۔

اور لارنس نے ریل گاڑی تباہ کر دی

تقریباً اسی اونٹ سواروں کا ایک مسلح دستہ جس کی قیادت ایک انگریز کے ذمہ تھی ریت کی پہاڑیوں کے عقب میں چھپا ہوا تھا جو حجاز ریلوے کو اڑانے کے منصوبے پر عمل پیرا ہونے کیلئے بے قرار تھا۔

یہ 18 ستمبر 1917ء تھا۔ دمشق اور مدینہ کے درمیان ریلوے لائن برطانیہ کے ساتھ ان کی جنگ کے دوران انتہائی اہمیت کی حامل تھی۔ اس وقت سلطنت ترکیہ میں وہ سب علاقے شامل تھے جو آج کل شام...... لبنان...... اسرائیل...... عراق...... اردن اور مغربی عریبیہ پر مشتمل ہیں۔ لہٰذا برطانیہ کیلئے یہ ایک مشکل امر نہ تھا کہ وہ عربوں کو ترک حکام کے خلاف آمادہ بغاوت کریں۔ میجر تھامس ایڈورڈ لارنس بطور ایک رہنما قابل ذکر حد تک کامیاب ثابت ہو رہا تھا۔ ترکوں نے پہلے ہی ایل۔ اورنز کے سر کی قیمت مقرر کر رکھی تھی...... جس نے انجنوں کو تباہی و بربادی سے ہمکنار کیا تھا۔ اپنے مسلح افراد کو وادی میں چھوڑنے...... جو ریلوے لائن کے عین متوازی حیثیت کی حامل تھی اور ان کو حملہ آور ہونے اور دفاع کی صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد لارنس چند افراد کے ہمراہ ریلوے لائن کا معائنہ کرنے کے لئے آگے بڑھ گیا تھا۔

محل وقوع مُدا وار اسٹیشن کے قدرے جنوب کی جانب واقع تھا جو عقبہ کے مشرق میں تقریباً 70 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس مقام پر ریلوے لائن ایک پشتے پر سے گزرتی ہوئی ایک نشیبی وادی کو عبور کرتی تھی جس کے وسط میں ایک پل بنا ہوا تھا تاکہ بارش کا پانی وادی تک رسائی حاصل کر سکے۔

لارنس نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے اس پل پر اپنا مورچہ قائم کرنا چاہیئے۔ اس طرح وہ دہرے فوائد سے مستفید ہو سکتا تھا...... ریل گاڑی کی تباہی و بربادی کے ساتھ ساتھ پُل کی تباہی و بربادی بھی اس کی دسترس میں تھی۔

اس نے مناسب جگہ پر مشین گنیں نصب کروادی تھیں۔ یہ دو برطانوی سارجنٹوں کی زیر کمان تھیں جو عارضی طور پر لارنس کی ہمراہی اختیار کئے ہوئے تھے تاکہ عربوں کو ان ہتھیاروں کے استعمال کی تربیت فراہم کر سکیں۔

لارنس نے پُل پر سلیپروں (لکڑی کے وہ تختے جن پر پٹڑیاں رکھی ہوتی ہیں) کے نیچے 50 پونڈ دھماکہ خیز مواد چھپا دیا۔ اس نے انتہائی احتیاط سے کام لیا اور یہ یقین دہانی حاصل کی کہ ان سلیپروں کو ادھر اُدھر ہٹانے کی کوئی واضح علامت باقی نہ رہے۔ اب اس نے بھاری تاریں بچھائی تھیں جنہیں بم کے اس حصے کے ساتھ منسلک کرنا تھا جس سے بم پھٹتا ہے۔ اس نے تاروں کو بخوبی چھپا دیا تھا۔

چونکہ اس مقام سے پل دکھائی نہ دیتا تھا جس مقام پر دھماکہ کرنے والا شخص چھپا بیٹھا تھا لہٰذا اسے چٹان کی چوٹی سے اشارے کا انتظار کرنا تھا۔ اس اعزاز کو حاصل کرنے کے لئے عرب بے چین تھے اور ان کے درمیان سخت مقابلے کی فضا منظر عام پر آ گئی تھی۔ اس ذمہ داری کو نبھانے کے

لئے سلیم...... جو امیر (مابعد شاہ) فیصل کا معتبر غلام تھا اس کا انتخاب کیا گیا۔ دھماکہ سرانجام دینے کی ذمہ داری اس نے نبھائی تھی۔ دو روز تک اسے اس کام کی تربیت فراہم کی گئی۔

سورج غروب ہونے تک تمام تیاری مکمل ہو چکی تھی اور جوں ہی لارنس اپنے کیمپ کی جانب واپس آ رہا تھا اس نے چٹان پر کئی ایک عربوں کو بیٹھا دیکھا جو میلوں دور سے بخوبی دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے انہیں اس مقام سے ہٹ جانے کی تاکید کی لیکن اسے دیر ہو چکی تھی۔ دور کے فاصلے سے ترک انہیں مُدّاوارا اسٹیشن سے دیکھ چکے تھے۔ اس کے علاوہ ہالاٹ عمار اسٹیشن سے بھی انہیں دیکھ لیا گیا تھا۔ یہ اسٹیشن ریلوے لائن سے چار میل کے فاصلے پر جنوب کی سمت واقع تھا۔

رات پڑ چکی تھی۔ انہوں نے ایک گہری کھائی میں کیمپ لگا رکھا تھا۔ انہوں نے آگ جلائی اور کھانا تیار کیا اور پُرسکون انداز میں سو گئے۔

صبح کے وقت ترک سپاہ کا ایک دستہ جس کی تعداد تقریباً 40 افراد تھی وہ ہالاٹ عمار اسٹیشن سے گشت کے لئے نکلا۔ اس دوران لارنس اور اس کے ساتھ اپنی کمین گاہوں میں چھپے رہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی بارودی سرنگ کسی گڑبڑ کا شکار ہو۔

دوپہر کے وقت لارنس نے مُدّاوارا اسٹیشن کی جانب دوربین سے دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ تقریباً ایک سو ترک سپاہ ریت کا میدان عبور کرتے ہوئے اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ وہ ابھی ان سے چند میل کے فاصلے پر تھے اور تیز رفتاری کے ساتھ پیش قدمی نہیں کر رہے تھے کیونکہ دوپہر کے وقت شدید گرمی تھی۔ لارنس نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے اپنے موجودہ مقام سے نکل جانا چاہئے اور اس بارودی سرنگ کو چھوڑ دینا چاہئے...... اس امید کے ساتھ کہ ترک اسے تلاش نہیں کر سکیں گے۔

اس دوران اسے جنوبی ڈھلوان سے دھواں اٹھتا نظر آیا...... یہ دھواں اس گاڑی سے برآمد ہو رہا تھا جو ہالاٹ عمار کے اسٹیشن پر پہنچ چکی تھی۔ لارنس بھاگ کر چٹان کی چوٹی پر چڑھ گیا اور گاڑی کو دیکھنے لگا۔ اس گاڑی کو دو انجن کھینچ رہے تھے اور وہ ہالاٹ عمار کے اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ریل گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی اور ان کی جانب بڑھ رہی تھی۔

عرب اپنی پوزیشنیں سنبھال چکے تھے۔ رائفل بردار ریتلی چٹان کے عقب میں لیٹے ہوئے تھے جہاں پر وہ 150 گز سے کم فاصلے سے ریل گاڑی کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنا سکتے تھے۔ لارنس بذات خود ایک ٹیلے پر بیٹھا گیا تاکہ سلیم کو اشارہ کر سکے۔

جب ریل گاڑی اس مقام پر پہنچی جہاں پر لارنس اور اس کے آدمی چھپے ہوئے تھے تو اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی گئی لیکن زیادہ تر گولیاں ریت میں دھنس رہی تھیں۔

اس دوران ریل گاڑی کے دونوں انجن واضح طور پر دکھائی دینے لگے۔ ان سے بھاپ نکل رہی تھی۔ انجنوں کے پیچھے دس ڈبے تھے جن میں سپاہ بھری ہوئی تھی...... ان کی بندوقیں ریل کی کھڑکیوں اور دروازوں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ گاڑی چھت پر بھی ریت کے بوروں کے پیچھے مسلح ترک سپاہ لیٹی ہوئی تھی۔ دیگر ترک سپاہ نے اندھا دھند فائرنگ کی۔ وہ اپنے ان دیکھے دشمن پر گولیاں برسا رہے تھے جو ریت کے ٹیلوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔

پائلٹ انجن پل پر پہنچ چکا تھا اور جونہی دوسرے انجن کا پہلا پہیہ پل پر پہنچا لارنس نے سلیم کو اشارہ دے دیا۔ جس نے دھماکہ کرنے والے لیور کو پوری قوت کے ساتھ کھینچ دیا۔

اچانک قیامت خیز دھماکے کی آواز سنائی دی اور تمام تر گاڑی دھوئیں اور گرد وغبار میں چھپ گئی۔ اس دھماکے کے بعد قیامت خیز خاموشی چھا گئی اور مابعد چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ جونہی دھوئیں کے بادل چھٹنے لگے لارنس کے آدمیوں نے تباہ شدہ گاڑی پر گولیاں برسانی شروع کردیں اور گاڑی کو ٹکڑوں میں بکھیر کر رکھ دیا۔ بچ جانے والے ترکوں نے گاڑی سے باہر چھلانگیں لگائیں اور ریلوے کے پشتے کے پیچھے پناہ لی۔ جو ترک سپاہ ریل گاڑی کی چھت پر موجود تھی وہ کم خوش قسمت ثابت ہوئی اور وہ مشین گنوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئی۔

عربی چیختے چلاتے گاڑی کے ملبے کی جانب بھاگے تاکہ لوٹ مار کر سکیں۔ لیکن وہ ترک سپاہ جو جان بچا کر گاڑی سے نکلنے میں کامیاب ہو چکی تھی اور پشتے کے پیچھے پناہ گزین تھی انہوں نے عربوں پر گولیاں برسانی شروع کردیں۔ لارنس نے بھی جوابی فائرنگ کی۔ ترک اس فائرنگ کی تاب نہ لا کر صحرا کی جانب بھاگے لیکن وہ مشین گنوں کی گولیوں کا نشانہ بننے سے نہ بچ سکے۔ اس کے بعد عرب دوبارہ چیختے چلاتے ہوئے گاڑی پر ٹوٹ پڑے...... وہ وحشی جانوروں کی طرح چلا رہے تھے اور انہوں نے لوٹ مار کا عمل شروع کردیا تھا۔

لارنس نے دیکھا کہ ترکوں کا ایک فوجی دستہ مُداوارا اسٹیشن سے جائے وقوعہ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ ابھی کچھ فاصلے پر پیش قدمی جاری رکھے ہوئے تھے۔ ہالات عمار کی جانب سے بھی مزید ترک فوجی اسی جانب بڑھ رہے تھے۔ لارنس جانتا تھا کہ دونوں اطراف سے بڑھنے والے ترک فوجی کم از کم نصف گھنٹے تک اس مقام پر پہنچ پائیں اور اس سے پیشتر اسے کوئی خطرہ نہ تھا۔

وہ تباہ شدہ ریل گاڑی کی جانب چل دیا۔ پل تباہ ہو چکا تھا اور ریل گاڑی کا پہلا ڈبہ جو زخمیوں اور ہلاک شدگان سے بھرا پڑا تھا وہ ایک شگاف میں گر چکا تھا۔ لارنس اس ڈبے کی جانب بڑھا اور اس پر ایک نظر ڈالی اور مابعد اس نے انتہائی سرعت کے ساتھ ڈبے کا دروازہ بند کردیا اور اس ڈبے کے مکینوں کو ان کی قسمت پر چھوڑ دیا۔

اس کے بعد اس نے ریل گاڑی کے انجنوں کا معائنہ کیا۔ گاڑی کا دوسرا انجن تباہ ہو چکا تھا لیکن پہلا انجن محض پٹڑی سے اترا تھا۔ لارنس کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ جتنے زیادہ سے زیادہ انجن تباہ کرسکتا تھا کر گزرے۔ لہٰذا اس نے اس انجن کو بھی تباہ کرنے کا بندوبست سرانجام دیا۔

عربوں کی تمام تر دلچسپی محض لوٹ مار تک ہی محدود تھی۔ گاڑی میں پناہ گزینوں کے علاوہ بیمار اور زخمیوں کا ایک ہجوم تھا...... اور ترک افسران کے خاندان دمشق واپس جا رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر عورتیں اور بچے شامل تھے۔ وہ پریشانی کے عالم میں ریل کی پٹڑی پر کھڑے تھے۔ وہ رو رہے تھے اور ہلاک ہونے والوں کا ماتم کر رہے تھے۔ وہ اپنے کپڑے پھاڑ رہے تھے اور بال نوچ رہے تھے جبکہ عربی ان کے مال واسباب کی لوٹ مار میں مصروف تھے۔ وہ ان کی قیمتی اشیاء اپنے اونٹوں پر لاد رہے تھے اور جس چیز کو گراں قدر تصور نہ کرتے تھے اس کی توڑ پھوڑ سرانجام دے ڈالتے تھے۔ قالینیں...... کمبل...... تمام اقسام کے کپڑے...... گھڑیاں...... کھانا پکانے کے برتن...... خوراک...... زیورات اور اسلحہ وغیرہ...... لارنس آف عریبیہ کے عرب لوٹ رہے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح لوٹ مار میں مصروف تھے اور لوٹ مار کے ضمن میں آپس میں لڑ جھگڑ بھی رہے تھے۔

تقریباً 40 کے قریب خوفزدہ ترک خواتین کے حواس بحال ہو چکے تھے اور وہ لارنس کی جانب بڑھی تھیں۔اس کے بہترین ملبوسات سے انہوں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ دشمنوں کا سربراہ تھا...... انہوں نے اس سے رحم کی درخواست کی۔اس نے انہیں یقین دلایا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ان کے کچھ مردوں نے خواتین کو لارنس سے پرے ہٹایا اور بذات خود لارنس کے پاؤں پکڑ کر اس سے رحم کی درخواست کرنے لگے۔ لارنس نے ان کو اپنے آپ سے دور ہٹایا۔

لارنس نے ان لوگوں کو بتایا کہ اس کے پاس زخمیوں اور بیماروں کے لئے ڈاکٹر کا کوئی بندوبست نہ تھا۔تاہم اس نے انہیں یقین دلایا کہ ترک فوجی مدد اوراایک گھنٹے تک جائے وقوعہ پر پہنچ جائیں گے۔لارنس نے انہیں جان بخشی کی بھی نوید سنائی۔لیکن جلد ہی اہل آسٹریا اور عربوں کے مابین جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا جو عربوں کا مال اسباب لوٹ رہے تھے۔اس دوران اہل آسٹریا نے ایک شخص کو ہلاک کر ڈالا۔لارنس صورت حال پر قابو پانے کی پوزیشن میں نہ تھا۔

اس دوران لارنس اور دو برطانوی سارجنٹوں نے ہلاک شدگان کا معائنہ سرانجام دینا شروع کیا۔20 ترک دھماکے سے ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکے تھے اور مزید 30 ترک مشین گنوں کی گولیوں کا نشانہ بنے تھے کیونکہ انہوں نے صحرا کی جانب بھاگنے کی کوشش کی تھی اور فائرنگ کی زد میں آ گئے تھے اور کئی ایک ترک عربوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے۔تقریباً 70 ترک ہلاک ہوئے تھے اور 30 زخمی ہوئے تھے جن میں سے اکثر مابعد موت سے ہمکنار ہو گئے تھے۔

اب لارنس کیلئے وہ لمحہ آن پہنچا تھا کہ وہ وہاں سے کوچ کر جائے کیونکہ دشمن اس کے قریب پہنچ رہا تھا اور اس کے ساتھ عربی لوٹ مار کے اسباب سمیت غائب ہو چکے تھے۔لارنس...... اس کا عرب باڈی گارڈ اور دو سارجنٹ اپنے اسلحہ سمیت ان کا پیچھا کرنے کی تیاری میں مصروف تھے۔

ایک قدیم عرب لیڈی جو گاڑی کے آخری ڈبے میں سوار تھی اس نے لارنس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا اور اس سے مطالبہ کیا کہ اسے بتایا جائے کہ یہ سب کچھ کیا تھا۔لارنس نے اس جنگ کی ناگہانی ضروریات کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بتایا۔اس لیڈی نے بتایا کہ وہ امیر فیصل کی دیرینہ دوست اور مہمان تھی جو عرب باغی افواج کا کمانڈر تھا۔اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ اب مزید سفر کرنے سے خائف تھی اور اس مقام پر اپنی موت سے ہمکنار ہونے کی آرزومند تھی۔لیکن لارنس نے اسے یقین دلایا کہ وہ بالکل محفوظ رہے گی۔کیونکہ ترک پہنچنے ہی والے تھے اور اسے خوف کھانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔لارنس نے اسے پینے کیلئے پانی دیا۔اس کے بعد لیڈی عائشہ آف مدینہ نے لارنس کو ایک خط اور بلوچی قالین تحفے کے طور پر پیش کی...... یہ ان کی اس ملاقات کی یادگار تھے۔

اب وہاں سے لارنس کا راہ فرار اختیار کرنا انتہائی ضروری تھا کیونکہ دونوں جانب سے ترک فوجی اس تباہ شدہ گاڑی کے قریب تر پہنچ رہے تھے۔وہ صحرا میں اپنی رائفلوں سے فائرنگ کرتے چلے آ رہے تھے۔وہ جتنا قیمتی فوجی ساز و سامان اٹھا سکتے تھے انہوں نے اٹھایا اور لارنس اور اس کے چند بقایا ساتھی ترکوں کے پہنچنے سے پیشتر وہاں سے راہ فرار اختیار کرنے کیلئے تیار ہو گئے۔لیکن راہ فرار اختیار کرنے سے بیشتر انہوں نے ردی ساز و سامان کا ایک ڈھیر اکٹھا کیا اور اس کے عین اوپر توپوں کے کچھ گولے رکھے اور اس کو آگ لگائی اور بذات خود راہ فرار اختیار کر گئے۔

جب آگ کے شعلے اسلحے اور گولوں تک پہنچے تو اس طرح شور برپا ہوا جس طرح ایک مختصر فوج گولہ باری میں مصروف تھی۔

جائے وقوعہ کی جانب بڑھنے والے ترکوں نے یہ خیال کیا کہ دشمن کی ایک کثیر فوج ان کے انتظار میں موجود تھی۔ لہٰذا انہوں نے محفوظ جگہ تلاش کرنے اور اپنی پوزیشنیں سنبھالنے کی تیاری شروع کر دی۔ لارنس اور اس کے ساتھی ریت کے ٹیلوں کی اوٹ میں فرار ہونے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنے اونٹ سنبھالے اور رم کی جانب بڑھنا شروع کر دیا...... مغرب کی جانب پہاڑیوں کے دامن میں۔

ان کا نقصان نہ ہونے کے برابر تھا...... ان کا بڑا نقصان سلیم کی ہلاکت تھی جس نے لیور کھینچ کر گاڑی کو دھماکے سے اڑا دیا تھا۔ اپنی ذمہ داری سرانجام دینے کے بعد وہ دیگر عربوں کی جانب بھاگا تھا تاکہ ان کے ہمراہ لوٹ مار کر سکے اور لارنس کو بتایا گیا تھا کہ آخری مرتبہ اسے زخمی حالت میں انجن کے پیچھے پڑا ہوا دیکھا گیا تھا۔

لارنس...... جو سلیم کے ضمن میں ذمہ دار تھا...... اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ واپس جائیں اور اسے تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ 13 عرب اپنے اونٹوں پر سوار ہوئے اور لارنس کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ وہ بھاگم بھاگ صحرا میں سے گزر رہے تھے تاکہ جلد از جلد جائے وقوعہ پر پہنچ سکیں۔ انہوں نے دیکھا کہ ترک فوجی دستوں نے تباہ ہونے والی گاڑی کو گھیر رکھا تھا۔ اب سلیم کو تلاش کرنے کی کوئی امید باقی نہ رہی تھی۔ ترک عربوں کو قیدی نہیں بناتے تھے بلکہ انہیں خوفناک انداز میں ہلاک کر دیتے تھے۔ تاہم انہیں اپنی ایک مشین گن دکھائی دی اور پیشتر اس کے کہ ترکوں کو ان کی موجودگی کی خبر ہوتی وہ وہاں سے کوچ کر گئے۔

24 ستمبر کو لارنس نے ایک دوست کو تحریر کیا کہ:۔

''میں دو روز سے عقبہ میں مقیم ہوں اور خوش باش ہوں۔ میرا گذشتہ کارنامہ حجاز ریلوے کو اڑانا تھا۔ اس کارنامے کے دوران ہم نے دو انجنوں کی حامل ایک ریل گاڑی کو تباہ کیا تھا (دیوتا مجھ پر مہربان تھے) اور اس کے علاوہ ہم نے کئی ایک ترک بھی ہلاک کئے تھے۔''

الکاک اور براؤن کی پرواز

وہ ایک برس میں ایک مرتبہ آتا تھا...... درمیانی عمر کا حامل ایک دبلا پتلا شخص...... اگرچہ وہ بوڑھا دکھائی دیتا تھا۔ وہ سائنس میوزیم کنسنگٹن کی بڑی گیلریوں میں سے ایک گیلری کی جانب آہستگی کے ساتھ بڑھ جاتا تھا...... اس کے بعد وہ رک جاتا تھا اور اپنی نظریں گیلری کی چھت پر جما دیتا تھا...... وہ کھڑا رہتا تھا اور چھت کی جانب تکتا رہتا تھا اور تھوڑی دیر تک اس کا یہ معمول جاری رہتا تھا تب اپنی چھڑی پر جھکتے ہوئے وہ وہاں سے رخصت ہو جاتا تھا...... اور مزید ایک برس تک وہ نظر نہ آتا تھا اور ایک برس بعد ہی ادھر کا رخ کرتا تھا۔

میوزیم کا عملہ اسے انتہائی احترام کے ساتھ سلام کرتا تھا جونہی وہ ان کے نزدیک سے گزرتا تھا اور وہ جس مقام پر کھڑا ہوتا تھا وہ اس کے اردگرد کھڑے رہتے تھے اور وہ اس زرد ہوائی جہاز کی جانب دیکھتا رہتا تھا جو چھت کے ساتھ لٹکا ہوا تھا اور یہ سوچتا رہتا تھا کہ یہ کیسا رہے گا کہ وہ پہلا شخص ہو جو بحر اوقیانوس پر پرواز کرے گا۔

وکرز وی بمبار طیارے آج بھی سائنس میوزیم میں لٹکے ہوئے ہیں۔ آج کل کے بمبار طیاروں کے ساتھ اگر ان کا موازنہ کیا جائے تو یہ اس سے بہت چھوٹے اور مختصر دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے پروں کی پیائش 68 فٹ تھی...... اس کی لمبائی 42 فٹ تھی...... اس کا وزن...... 865 گیلن پٹرول...... 50 گیلن تیل...... اور دو افراد جو اس میں پرواز کرتے تھے بمعہ ان کے ساز و سامان تقریباً 14,000 پونڈ تھا...... آج کل کے حساب سے یہ وزن ایک سامان سے لدی ہوئی ڈلیوری وین سے زائد ہرگز نہ تھا۔

سر آرتھر وٹن براؤن کی سائنس میوزیم کی سالانہ زیارت اس کی موت کے ساتھ ہی اپنے اختتام کو پہنچ گئی تھی۔ اس نے 1948ء میں وفات پائی تھی۔ اس وقت اس کی عمر تقریباً 60 برس تھی۔ اس کا ساتھی سر جان الکاک وہ 29 برس قبل دوران پرواز ایک ہوائی حادثے میں 1919ء میں ہلاک ہوا تھا۔ اس وقت اس کی عمر محض 27 برس تھی۔ مسافر...... جو ہیتھرو ائر پورٹ پر جہاز میں سوار ہو رہے ہوتے ہیں یا اپنا فضائی سفر ختم کر کے بڑے بڑے جٹ طیاروں سے باہر نکل رہے ہوتے ہیں...... بحر اوقیانوس کی تھکا دینے والی اور بور کر دینے والی پرواز کے خاتمے پر وہ لوگ اس پرواز کی راہ دکھانے والے دو افراد کی یادگاریں دیکھ سکتے ہیں...... ان کی حقیقی یادگار بحر اوقیانوس پر پرواز بذات خود ہے۔

لارڈ نارتھ کلف جس نے کئی ایک اشیاء متعارف کروائیں...... اچھی بھی اور بری بھی...... اس نے اس کام کا آغاز کیا تھا۔ وہ فضائی برتری کا خواب دیکھ رہا تھا اور برطانوی حکومت کی بے حسی پر کڑھتا تھا۔ اس نے "ڈیلی میل" کی وساطت سے 10,000 پونڈ کے انعام کا اعلان کیا...... یہ انعام اس فرد کے لئے تھا جو بحر اوقیانوس پر پہلی پرواز ہوائی جہاز...... واٹر پلین...... یا ائرشپ سے سرانجام دیتا۔ یہ پیش کش یکم اپریل 1913ء کو کی گئی تھی...... پہلے ہوائی جہاز کی پرواز کو محض دس برس بیت چکے تھے۔

جنگ کی وجہ سے یہ پیش کش معطل کر دی گئی اور 1918ء میں یہ پیشکش دوبار بحال کر دی گئی ......اس دور میں اس پیش کش کا مقصد یہ تھا کہ زیادہ طاقتور انجن اور بہتر ہوائی جہاز تیار کیے جائیں۔ بہت سی کمپنیوں نے انعام کے حصول کے علاوہ نام کمانے کی غرض سے منصوبے بنانے شروع کر دیے۔

کیپٹن جان الکاک اور لیفٹیننٹ آرتھر وٹن براؤن......دونوں دوران جنگ فضائی پرواز سے منسلک رہے تھے۔ الکاک بطور پائلٹ......اور براؤن بطور ایک ''مشاہدہ سرانجام دینے والا'' ......اور دونوں جنگی قیدی بھی بنے تھے......لیکن وہ اس وقت تک اس جانب مائل نہ ہوئے حتیٰ کہ براؤن بے روزگاری کا شکار ہو گیا۔ اس کے علاوہ ایک حادثے میں اس کی ٹانگ بھی شدید زخمی ہو چکی تھی......اس نے وکرز فیکٹری کا دورہ کیا......اتفاق سے اس نے جہاز رانی میں اپنی انتہائی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور فوری طور پر اپنے ساتھی الکاک کے ہمراہ روبہ عمل ہو گیا۔ وہ جلد ہی اپنی سرگرمی میں انتہائی مصروف ہو گئے اور جہاز تیار کرنے کی ایک ایک تفصیل طے کرنے لگے۔ رولز رائس انجنوں کی فراہمی...... 12 سلنڈروں کے حامل اور 360 ہارس پاور قوت کے حامل...... جہاز رانی کے آلات کا انتخاب......وائرلیس کی ٹیسٹنگ اور سب سے بڑھ کر بہترین ٹیکنیشنوں کا انتخاب۔

محض یہ دونوں ہی تیاریوں میں مصروف نہ تھے بلکہ ان کے حریف بھی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ان کے پاس ہیری ہاکر جیسے ذہین پائلٹ بھی موجود تھے۔ ان کے علاوہ دیگر افراد بھی ان کے ہمراہ جدوجہد میں شامل تھے۔

ان تمام لوگوں کے لئے سنجیدہ چیلنج ایک امریکی ٹیم تھی۔ ایک مرحلے میں شمالی بحراوقیانوس کا ممکنہ چھوٹے سے چھوٹا روٹ نیو فاؤنڈ لینڈ تا آئرلینڈ 1,880 میل پر مشتمل تھا۔ مئی 1919ء کے آغاز میں الکاک اور براؤن اور ان کی جماعت کے دیگر ارکان نے بحری سفر اختیار کرتے ہوئے نیو فاؤڈلینڈ کا رخ کیا۔ جب وہ وہاں پہنچے اس وقت وہاں پر بارش برس رہی تھی اور برف باری بھی ہو رہی تھی۔ یہ سلسلہ گذشتہ ایک ہفتے سے جاری تھا۔ ان کے بڑے حریف ہاکر اور رے ہام بھی ان سے پہلے وہاں پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے بہترین کھیت کرائے پر لے رکھے تھے اور ان کی مشینیں اڑان کیلئے تیار تھیں۔

دو روز پیشتر ہاکر اور اس کا جہاز ران میکنزی گریو اسکاٹ لینڈ پہنچے تھے۔ وہ اس راستے سے اسکاٹ لینڈ نہ پہنچے تھے جس راستے وہ پہنچنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ وہ 18 مئی کو نیو فاؤنڈ لینڈ سے روانہ ہوئے......اور غائب ہو گئے تھے۔ چند دنوں بعد ان کی موت کو تسلیم کر لیا گیا تھا اور بادشاہ اور ملکہ نے مسز ہاکر کو تعزیتی پیغامات ارسال کر دیے تھے۔ اس کے بعد وہ دوبارہ منظر عام پر آ گئے۔ بحراوقیانوس میں وہ حادثے کا شکار ہو گئے تھے اور ڈنمارک کے ایک چھوٹے سے اسٹیمر نے جس میں ریڈیو کی سہولت موجود نہ تھی ان کو بچایا تھا۔ لندن میں ان کا والہانہ استقبال کیا گیا۔

سخت سردی کے باوجود الکاک اور براؤن اپنے کام پر ڈٹے رہے۔ وہ کھلی فضا میں کام سرانجام دے رہے تھے۔ کئی روز کی جدوجہد کے بعد وہ جہاز اسمبل کر چکے تھے۔ اب انہیں ایک ائر فیلڈ کی تلاش تھی۔

8 جون تک فیلڈ بھی تیار ہو چکا تھا اور وی بھی تیار تھا۔ الکاک نے اپنے جہاز کو ٹیسٹ کیا۔ جہاز نے اچھے نتائج پیش کئے۔ لیکن چند گھنٹوں بعد تند ہوا چلنے لگی اور ان کو ہوا کے تھمنے کا انتظار کرنا پڑا۔

یہ انتظار کئی روز تک جاری رہا۔ 14 جون بروز ہفتہ ساڑھے تین بجے صبح ابھی تاریکی طاری تھی کہ ایک آواز نے اچانک الکاک کو گہری نیند سے بیدار کر دیا۔ اس نے آواز کو کان لگا کر سنا۔ یہ آواز نہ تھی بلکہ خاموشی کا ایک دھاوا تھا چونکہ طوفان اچانک تھم چکا تھا۔ اس نے براؤن کو نیند سے بیدار کیا اور وہ اپنے ائرفیلڈ کی جانب بھاگے۔

ہوا دوبارہ چلنا شروع ہو چکی تھی لیکن بہتر صورت حال کی توقع کی جا سکتی تھی۔ ہینڈرے کے جہاز کی پرواز کی افواہ گشت کر رہی تھی جو کہ مابعد غلط ثابت ہوئی۔ کئی گھنٹے گزر چکے تھے مگر ہوا ابھی تک سازگار نہ ہوئی تھی۔ دوپہر کے کھانے تک ان کے گرد لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا کیونکہ فیکٹریاں اور ورک شاپس سیچرڈے دوپہر کے لئے بند ہو چکی تھیں۔ ہوا ابھی تک چل رہی تھی لیکن آہستہ آہستہ موسم صاف ہوتا چلا گیا۔ لہٰذا الکاک اور براؤن نے جہاز کے کاک پٹ میں قدم رکھے تا کہ اپنی پرواز کی پڑتال کر سکیں۔

وہ دونوں خصوصی ترمیم شدہ کھلے کاٹ پٹ میں ایک دوسرے کے ہمراہ براجمان تھے۔ اس کی زخمی ٹانگ اس کے لئے مسلسل تکلیف کا باعث ثابت ہو رہی تھی۔

ان کے پاس کھانے پینے کے لئے سینڈوچ...... چاکلیٹ...... کافی اور بیئر موجود تھی۔ ایک ٹارچ بھی موجود تھی تا کہ اندھیرا چھا جانے کے بعد انجن کا معائنہ سرانجام دیا جا سکے اور ایک پستول بھی تھی تا کہ ہنگامی حالات میں وہ سگنل دے سکیں۔ ان کے پاس پیراشوٹ موجود نہ تھے۔ ربڑ کے زندگی بچانے والے سوٹ...... اگر خدانخواستہ وہ سمندر میں گرتے تو ان کے کام آ سکتے تھے...... وہ بھی ان کے پاس موجود نہ تھے۔

ان کے پاس جو بڑی آئٹم تھی وہ کینوس کا ایک چھوٹا سا بیگ تھا جس میں 197 ہوائی ڈاک کے خطوط تھے۔

نیچے کھڑا ہجوم اس لمحے کے انتظار میں تھا کہ وی نامی جہاز بھی اسی طرح حادثے کا شکار ہو جائے گا جس طرح رے ہام کا جہاز حادثے کا شکار ہوا تھا۔ وہ ایک پہاڑی کے پیچھے ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا مگر چند لمحوں بعد وہ دوبارہ ان کی نظروں کے سامنے تھا اور سینٹ جون کی بندرگاہ اور سمندر کی جانب محو پرواز تھا۔

وہ سمندر کے اوپر محو پرواز تھے۔ انہیں نیلا سمندر واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ مناسب ہوا ان کی رفتار بڑھانے میں معاون ثابت ہو رہی تھی اور وہ 140 ناٹ کی اطمینان بخش رفتار کے ساتھ محو پرواز تھے۔

جلد ہی صورت حال سازگار نہ رہی تھی۔ وہ گہری دھند میں اندھا دھند پرواز کر رہے تھے۔ الکاک کی کوشش تھی کہ وہ وی کو دھند سے اوپر اٹھانے میں کامیاب ہو جائے۔ لیکن آدھ گھنٹے تک وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ ان کا وائرلیس کا نظام بھی کام چھوڑ چکا تھا۔ اب وہ کوئی پیغام نشر نہیں کر سکتے تھے۔ ان کا رابطہ تمام تر دنیا سے کٹ چکا تھا اور یہ سب کچھ گہری دھند کی بنا پر ہوا تھا۔

وہ دوبارہ بادلوں کی زد میں تھے اور ابھی تک مزید بلندی کی جانب بڑھ رہے تھے کہ یکدم وہ ایک زبردست آواز سن کر چونک اٹھے۔ یہ ایسی آواز تھی جیسے کوئی مشین گن سے فائرنگ کر رہا تھا۔ لیکن یہ مشین گن کی فائرنگ نہ تھی بلکہ ان کے اسٹاربورڈ انجن کا ایگزاسٹ پائپ اپنی مہلت پوری کر چکا تھا اور توڑ پھوڑ کا شکار ہو چکا تھا۔ انہوں نے اسے شدید حرارت کی بنا پر سرخ ہوتے دیکھا...... اس کے بعد سفید ہوتے دیکھا...... اس کے

بعد وہ اچانک غائب ہو گیا۔اب چھ سلنڈروں کا حامل انجن ایگزاسٹ پائپ کے بغیر ہی اپنی کارکردگی سرانجام دے رہا تھا۔اور بے انتہا شور سنائی دے رہا تھا۔

حتیٰ کہ با آواز بلند کی جانے والی بات بھی وہ سننے سے قاصر تھے اور شور کی وجہ سے ان کے اعصاب بھی شل ہو چکے تھے۔انجن نے اپنی کارکردگی جاری رکھی تھی اور اس سے بلند ہونے والے شعلے جہاز کے کسی حصے کو متاثر نہیں کر رہے تھے۔

رات نو بجے کے قریب وہ 6,000 فٹ کی بلندی پر تھے۔وہ بادلوں کی زد سے بھی باہر نکل چکے تھے۔وہ ایک تہائی سفر طے کر چکے تھے۔

اب رات پڑ چکی تھی اب سورج کی بجائے انہیں ستارے دیکھنے کی ضرورت درپیش تھی۔سخت سردی تھی اور نمی بھی زیادہ تھی۔

ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے وہ کبھی بھی بادلوں سے نجات حاصل نہ کر سکیں گے۔آدھی رات کے بعد براؤن بھی فکرمندی کا شکار ہو چکا تھا کیونکہ وہ جہاز رانی کی بابت پڑتال سرانجام دینے سے قاصر تھا۔اس نے ایک تحریر لکھ کر الکاک کی جانب بڑھائی جس میں یہ درج تھا کہ جہاز کو مزید بلندی پر لے جایا جائے۔چند لمحوں بعد وہ طمانیت سے دوچار ہو چکے تھے کیونکہ چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا اور اپنی روشنی بکھیر رہا تھا۔براؤن نے ستاروں کی مدد سے یہ اندازہ لگایا کہ وہ معمولی سا اپنے راستے سے ہٹے تھے اور وہ اپنا نصف سفر طے کر چکے تھے۔انہوں نے اس خوشی میں سینڈوچ کھائے......چاکلیٹ......کافی اور وہسکی سے دل بہلایا۔

لیکن صبح 3 بجکر 10 منٹ پر وہ کسی خوشی سے دوچار ہونے کے قابل دکھائی نہ دیتے تھے۔وہ بحر اوقیانوس کی جانب بڑھ رہے تھے۔وی مکمل طور پر ان کے کنٹرول سے باہر ہو چکا تھا۔بارش بھی شروع ہو چکی تھی۔ان کے آلات بھی بے کار ہو چکے تھے۔الکاک کی تمام تر مہارت اور تجربہ بھی جہاز کو سمندر کی جانب بڑھنے سے نہ روک سکا۔کسی بھی عمل درآمد کے لئے الکاک کے پاس محض چند سیکنڈ تھے۔بالآخر الکاک کی مہارت اور تجربہ رنگ لایا اور وی سمندر کے نزدیک تر پہنچنے کے بعد دوبارہ فضا میں بلند ہونا شروع ہو گیا۔کچھ دیر بعد انہوں نے کمپاس کا معائنہ کیا......انہیں یہ علم ہوا کہ وہ واپس نیوفاؤنڈلینڈ کی جانب بڑھ رہے تھے۔وہ اس حماقت پر بھی پُرسکون رہے کیونکہ الکاک نے جہاز کو درست راہ پر گامزن کر دیا تھا اور دوبارہ جہاز کو بلند کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

وہ ایک مصیبت سے خلاصی پا کر دوسری مصیبت کا شکار ہو جاتے تھے۔اب دن چڑھ چکا تھا۔لیکن سورج گہرے بادلوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔8,000 فٹ کی بلندی پر برف جہاز پر گر رہی تھی۔اگر الکاک وی کو فضا میں مزید بلندی پر نہ لے جاتا تب وہ سورج کو نہیں دیکھ سکتے تھے اور سورج کے بغیر براؤن جہاز رانی سرانجام دینے سے قاصر تھا۔

صبح 7 بجکر 20 منٹ پر وہ 11,000 فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہے تھے۔سورج کی بدولت وہ یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہوئے تھے کہ وہ درست سمت پر گامزن تھے اور آئرش کے ساحل سے ایک گھنٹے کی پرواز پر تھے۔اس دوران جہاز کے انجن نے مس فائر کرنا شروع کر دیا اور اس میں زوردار دھماکے بھی ہونے لگے۔

لیکن یہ اس پرواز کا آخری ڈرامہ ثابت ہوا۔8 بجکر 15 منٹ تک ان کو زمین نظر آ چکی تھی اور دس منٹ بعد وہ کلفڈن کے نزدیک سے

آئرش کا ساحل عبور کر رہے تھے اور ان کو وائرلیس اسٹیشن بخوبی نظر آ رہا تھا۔ براؤن نے اپنی پستول سے دو فائر کیے...... اور انہوں نے دیکھا کہ لوگ بھاگے چلے آ رہے تھے اور دوستانہ انداز میں ہاتھ ہلا رہے تھے۔ لوگ ایک لحاظ سے انہیں مبارکباد پیش کر رہے تھے۔ بالآخر وہ جہاز کو بخوبی زمین پر اتارنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ ان کی اڑان ایک فاتحانہ اڑان ثابت ہوئی تھی۔

جی ہاں...... یہ ایک فاتحانہ پرواز تھی۔ انہوں نے کہیں رکے بغیر 1,890 میل کا سفر طے کیا تھا...... سفر کا زیادہ تر حصہ سمندر کے اوپر طے کیا گیا تھا اور یہ سفر محض 16 گھنٹوں میں طے کیا گیا تھا...... ان کی اوسط رفتار 118 میل فی گھنٹہ تھی۔ آٹھ برس بعد ایک اور جہاز اس جیسی پرواز سرانجام دینے میں کامیاب ہوا تھا۔

روسیٹا فوربس کا کُفرا کی جانب سفر

کُفرا البنانی صحرا کے وسط میں واقع ہے۔ یہ سینسی کی حفاظت کرنے والا ایک مقدس قلعہ تھا۔ یہ وہ سرزمین تھی جس پر کسی کے قدم نہ پڑے تھے۔ بے دین' ملحد اور کافروں کیلئے یہ ممنوعہ علاقہ تھا۔ روسیٹا فوربس نے پہلی بار کفرا کے بارے میں اس وقت سنا تھا جبکہ وہ 1919ء میں صحرا کا ایک سفر طے کر رہی تھی۔ ماسوائے ایک جرمن مہم جُو کوئی بھی اہل یورپ کفرا نہیں گیا تھا۔ اس جرمن مہم جُو کا نام گرہارڈ رولف تھا۔ وہ 1870ء میں اس مقام تک پہنچا تھا اور تن تنہا واپس لوٹا تھا۔ اس نے یہ داستان سنائی تھی کہ اس کی تمام تر جماعت کو ہلاک کر دیا گیا تھا اور اس کے کیمپ کو لوٹ لیا گیا تھا۔

روسیٹا فوربس نے بذات خود کفرا جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ سفر جان پر کھیلنے کے مترادف تھا اور اس قسم کا سفر اس کی مہم جُو طبیعت کیلئے انتہائی خوشی کا باعث تھا...... اس سے اس کی اہل افریقہ اور عربوں سے محبت کی بھی عکاسی ہوتی تھی۔ کفرا کے سفر کے دوران 600 میل کا سفر لبنانی صحرا سے طے کرنا ضروری تھا۔ یہ صحرا ترائی پولی ٹینین کے ساحل پر اٹلی کی زیر نگرانی تھی اور اندرون ملک طاقت ور اور بہادر سینسی حکمران تھے...... جو اس صدی کے آغاز سے فرانس اور برطانیہ دونوں کی افواج سے صحرائی جنگ لڑ رہے تھے۔

روسیٹا فوربس نوجوان تھی...... دلکش مطلقہ تھی...... اور مہم جُوئی کے حقیقی جذبے سے سرشار تھی۔ وہ جسمانی خطرات سے نہیں گھبراتی تھی۔ اس نے بے آب صحرا میں اپنے مجوزہ سفر کی سرانجام دہی ایک عرب خاتون کی حیثیت سے سرانجام دینے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کیلئے اس نے عربی زبان سیکھی...... قرآن پاک کا مطالعہ کیا...... اور اسلامی رسم ورواج سے آگاہی حاصل کی تاکہ وہ صحیح معنوں میں ایک عرب خاتون کی حیثیت سے منظر عام پر آسکے۔ اس نے کھانے پینے...... بیٹھنے اٹھنے...... سونے...... لباس زیب تن کرنے...... اور اپنے تمام تر عمل درآمد میں عرب خواتین جیسا انداز بھی سیکھا۔ اس نے اپنا نام خدیجہ رکھا اور اپنے آپ کو ایک مصری تاجر عبداللہ فہمی کی بیٹی ظاہر کیا۔ اس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ حال ہی میں بیوہ ہوئی تھی اور اب کفرا کی زیارت کے لئے محو سفر تھی۔

احمد بے حسنین اس کے سفر کا ساتھی تھی۔ وہ مصر کے شاہ فواد کا چیمبرلین تھا اور اس کے علاوہ وہ سینٹ مچل اور سینٹ جارج کا اس وقت نائٹ کمانڈر بھی رہا تھا جب وہ شاہ فواد کی ہمراہی میں انگلستان گیا تھا۔

سنسی اسلامی اخوت کا ایک طاقتور مقام تھا۔ اس علاقے پر سنسی خاندان کی حکومت قائم تھی۔ یہ کٹر مذہبی لوگ تھے۔ وہ عیسائیوں اور ترکوں دونوں کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کے حق میں نہ تھے۔ ان کی قوت کا راز درحقیقت مشرقی سہارا کی وسعت میں پنہاں تھا جو دنیا کا غیر آباد ترین اور سنسان ترین علاقہ تھا اور معمولی آبادی کا حامل تھا۔

19 ویں صدی کے آخر میں سنسی پسپائی اختیار کرتے ہوئے کفرا کے الگ تھلگ اور ناقابل رسائی مقام تک محدود ہو کر رہ گئے تھے اور

فرانس کے شمال مغربی افریقہ میں نوآبادیاتی فتح کے خلاف شدید مسلح مزاحمت سرانجام دے رہے تھے۔ 1900ء اور 1910ء کے دوران وہ جھیل چاڈ تا وادی نیل فرانسیسیوں کے خلاف لڑے تھے اور 1910ء تا 1911ء وہ اٹلی کے خلاف برسرپیکار رہے تھے۔ 1916ء میں وہ مصر کی سرحد پر برطانیہ سے بھی لڑے تھے۔ سنسی اپنی لڑاکا صلاحیتوں کی وجہ سے شہرت پا چکے تھے۔

1918ء میں سیدی محمد ال ادریس سنسی کا رہنما بنا۔ وہ امن پسند شخص واقع ہوا تھا اور اس نے برطانیہ اور اٹلی دونوں کے ساتھ معاہدے سرانجام دیے۔ تاہم لیبیا میں اٹلی حکام ساحلی فوائد سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ساحل کے عقب کے علاقے میں سنسی اثرورسوخ کا چرچا تھا اور ادریس کے الفاظ قانون کا درجہ رکھتے تھے۔

مسز فوربس کسی قسم کی اتھارٹی کی عدم موجودگی میں کفرا کا سفر طے نہیں کرنا چاہتی تھی۔ شمالی افریقہ کے سفر کے دوران وہ اور حسنین بے نے اٹلی کے راستے سفر اختیار کیا جہاں پر امیر فیصل مقیم تھا جسے فرانسیسی حکام نے شام میں اس کے تخت سے معزول کر دیا تھا اور جلاوطن کر دیا تھا۔ فیصل شریف مکہ تھا اور اسلامی دنیا میں بے بہا اثرورسوخ کا حامل تھا۔

اٹلی میں مسز فوربس کی ملاقات مسولینی سے ہوئی جو اس وقت ایک اخبار کا ایڈیٹر تھا اور اس نے ایک ریلوے اسٹیشن پر کمیونسٹوں کے ایک ہنگامے کے دوران اس کا سامان تلف ہونے سے بچایا تھا۔ اس کے جواب میں اس نے اسے اپنے اس سفر کی داستان سنائی تھی جس کا وہ منصوبہ بنا چکی تھی...... بالالفاظ دیگر کفرا کا سفر۔

مسولینی ہنس پڑا تھا اور اس نے اسے بتایا تھا کہ وہ اس مقام تک کبھی بھی رسائی حاصل نہ کر سکتی تھی۔

"کچھ لوگ تمہاری محبت میں گرفتار ہو جائیں گے اور اس طرح یہ کہانی اپنے انجام کو پہنچ جائے گی"

اس نے جواب دیا تھا کہ:۔

"محبت ایک عارضی صورت حال کا درجہ رکھتی تھی اور وہ ایک سے زائد مرتبہ محبت کر چکی تھی۔"

اس نے مزید کہا تھا کہ:۔

"یہ ذہن کی ایک انتہائی خوشگوار حالت ہوتی ہے لیکن یہ پہلی ترجیح نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ ایک سنجیدہ سفر کے دوران محبوب ایک بارعب شخصیت کا حامل ہونا چاہیے"۔

مسولینی نے اس دلکش خاتون کو بتایا کہ اس کی زندگی میں "سہارا" ایک مرد کی جگہ نہیں لے سکتی تھی۔

بہرکیف اس نے امیر فیصل سے ملاقات کی۔ اس نے اسے سیدی محمد ال ادریس کے نام ایک تعارفی خط دیا اور یہ خط اس کے لئے انتہائی کارآمد ثابت ہوا۔

مسز فوبس اور حسنین بے بذریعہ ریل گاڑی نیپلس کی جانب روانہ ہوئے اور ان کی گاڑی دوران سفر پٹڑی سے اتر گئی اور ان کو اپنے سامان سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ مسولینی کے حصول اقتدار سے پیشتر اٹلی ریلوے کا یہ حال تھا کہ ریلوے گارڈ کے لئے یہ امر معمول سے ہٹ کر نہ تھا کہ وہ

فرسٹ کلاس کے ریل کے ڈبے میں داخل ہوا اور مسافروں کا قیمتی سامان پستول کی نوک پر ان سے چھین لے۔ صاف ظاہر تھا کہ انہیں مسولینی جیسے ڈکٹیٹر کی ضرورت تھی جو اٹلی ریلوے کا نظم و نسق برقرار رکھ سکے اور اس کی کارکردگی میں اضافہ کر سکے۔

انہیں اپنا ساز و سامان واپس لینے کے لئے اٹلی کی نوکر شاہی کے ساتھ کافی جنگ لڑنا پڑی تھی۔ اس کے بعد مسز فوربس اور حسنین بے نے اپنا سامان اپنی آنکھوں سے اوجھل کرنے سے انکار کر دیا تھا اور نیپلس کی جانب بقایا سفر اپنے سامان کے ہمراہ گاڑی کے مال بردار ڈبے میں طے کیا تھا۔ بن غازی پہنچنے کے بعد انہیں ادریس سے ملاقات کرنی تھی...... سنسی کا امیر......اور اس سے کفرا کا سفر اختیار کرنے کی اجازت طلب کرنی تھی۔ اسے اس سفر کی اجازت فراہم کرتے ہوئے امیر کا اپنا وقار داؤ پر لگنے کا خدشہ تھا اور اس کے اپنے لوگ ہی اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو سکتے تھے۔ اس لئے ادریس اور اس کے بھائی دونوں کا اس کو سفر کی اجازت فراہم کرنا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ اس اجازت کے حصول کے لئے مسز فوربس نے تین امور سے استفادہ حاصل کیا تھا۔

امیر فیصل کا خط جو انتہائی اہمیت کا حامل ثابت ہوا۔

حسنین بے کی قائل کرنے کی صلاحیت۔

سنسی رہنما کی وہ خواہش جس کے تحت وہ اٹلی کی بجائے برطانیہ کے ساتھ نزدیکی روابط استوار کرنا چاہتا تھا۔

اہل اٹلی کفرا کی جانب اس کے مجوزہ سفر کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے اور مسز فوربس بھی اپنے منصوبے کو خفیہ رکھنا چاہتی تھی۔ اس سلسلے میں اسے امیر ادریس کا تعاون بھی حاصل تھا جس کے اہل اٹلی کے ساتھ تعلقات سرد مہری کا شکار تھے۔

انہیں خفیہ طور پر بن غازی سے نکلنا تھا کیونکہ اگر اہل اٹلی کو ان کے ارادے کی خبر ہو جاتی تو انہوں نے انہیں بن غازی سے نکلنے ہی نہیں دینا تھا۔ وہ ڈبی ڈابیا کی جانب روانہ ہوئے...... ایک عرب دیہات جو صحرا کے کنارے پر واقع تھا جہاں پر سید ردا ال سنسی قیام پذیر تھا جو ادریس کا بھائی تھا۔ ردا نے مسز فوربس کے ساتھ گرمجوشی اور دوستانہ انداز میں ملاقات کی اور انتہائی راز داری کے ساتھ سفر کی تیاری سرانجام دینے میں اس کی معاونت سرانجام دی۔

اس نے ان کے لئے اونٹوں کا بندوبست کیا...... گائیڈوں کا بندوبست کیا...... اور سیاہ فام غلاموں کا بندوبست کیا جو ان کی حفاظت کر سکیں۔ انہوں نے مقامی لباس زیب تن کیا اور رات کے وقت عازم سفر ہوئے۔

سنسی کے متعصب افراد یہ سمجھتے تھے کہ وہ زندہ سلامت مقدس کفرا نہیں پہنچ سکتے تھے۔ ان کو راستے میں ہی ہلاک کر دیا جائے گا یا پھر وہ صحرا کے ریتلے طوفان کی نذر ہو جائیں گے اور بے آب صحرا میں پیاس کے ہاتھوں دم توڑ جائیں گے۔

ان کو بعد میں معلوم ہوا تھا کہ ان کے کیمپ میں گائیڈ عبداللہ ایک غدار تھا۔ اس کو یہ احکامات دیے گئے تھے کہ وہ ان کو ہلاک کر دے۔ لیکن بہت سے عرب ان کے وفادار تھے۔ ردا کے دو وفادار خادم محمد اور یوسف بھی ان کے ہمراہ تھے اور ردا نے ان کو سختی کے ساتھ ہدایت کی تھی کہ:

"اس مرد اور اس عورت کے تحفظ کے ذمہ دار تم دونوں ہو"

چنانچہ وہ 8 دسمبر 1920ء کو رات کے اندھیرے میں ڈی ڈابیا دیہات سے روانہ ہوئے۔

ان کا سامان اونٹوں پر لدا ہوا تھا اور وہ ریت کے وسیع تر سمندر میں تقریباً دو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کر رہے تھے۔ وہ ایک کنوئیں سے دوسرے کنوئیں تک پیش قدمی جاری رکھے ہوئے تھے کیونکہ ان کی زندگی کا دارومدار پانی پر تھا۔ کبھی کبھار وہ صحرا کے اس حصے میں محوسفر ہوتے تھے جہاں پر کسی کنوئیں کا نام ونشان بھی نہ ہوتا تھا اور کبھی کبھار ریت کے اندھے کر دینے والے طوفان ان کے اونٹوں کو بیمار کر دیتے تھے۔ وہ بے خوابی کی حالت میں...... دکھتے ہوئے پاؤں کے ہمراہ 17 گھنٹے کا سفر طے کرتے ہوئے جب آبادی کے حامل علاقے میں پہنچتے تھے تب ان کو اس آبادی کے مخالفانہ رویے کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

جب وہ اپنے سفر کا کچھ حصہ طے کر چکے تب ان پر یہ انکشاف ہوا کہ ان کے کیمپ میں ایک غدار بھی موجود تھا۔ وہ اس غدار اور اس کے ارادوں کے بارے میں آگاہ ہو چکے تھے۔ روسیٹا فوربس اور حسنین بے یہ سوچ رہے تھے کہ:۔

"کیا انہیں رازداری کے ساتھ عبداللہ کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہئے پیشتر اس کے کہ وہ انہیں موت کے گھاٹ اتار دے؟"

اگر وہ یہ انتہائی قدم اٹھا لیتے تو ان پر کسی نے الزام نہیں دھرنا تھا۔ لیکن انہوں نے اس انتہائی قدم کو اٹھانے سے گریز کیا لیکن وہ محتاط ضرور ہو گئے۔ لیکن عبداللہ کو اب اپنی موت واضح طور پر نظر آ رہی تھی بالخصوص وہ محمد کی جانب سے متفکر تھا جو اس غدار کو گولی سے اڑا دینے کے حق میں تھا۔

ماہ جنوری کے آغاز میں وہ اس مقام پر پہنچ چکے تھے جس مقام کو ان کے نقشے کے مطابق کفرا ہونا تھا۔ لیکن اس مقام پر انہیں جو کچھ نظر آ رہا تھا وہ گہرے براؤن رنگ کے صحرا کے سوا کچھ نہ تھا جس نے انہیں چاروں جانب سے گھیر رکھا تھا۔ سایے میں درجہ حرارت 100 سے بھی زائد تھا۔ انہوں نے اپنے پانی کا آخری قطرہ بھی پی لیا تھا۔ ان کے اونٹ گیارہ روز سے پیاسے تھے اور ایک ماہ سے انہوں نے سبز چارہ بھی نہیں کھایا تھا۔ تمام لوگ یہ جانتے تھے کہ اگر انہیں پانی میسر نہ آیا تب 24 گھنٹوں کے اندر اندر موت ناگزیر تھی۔ انہوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ وہ بمشکل ہی بات کرنے یا کچھ دیکھنے کے قابل تھے۔ ان کے پاؤں سے خون ٹپک رہا تھا۔

وہ ال اتاش پہنچ چکے تھے...... جس کا مطلب تھا "پیاس" ...... اس مقام پر وہ انتہائی مایوسی کا شکار ہوئے جب انہوں نے اہل قافلہ کی ہڈیاں دیکھیں جو اپنا راستہ کھو چکے تھے اور موت کا شکار ہو چکے تھے...... انسانوں اور اونٹوں کے ڈھانچے بکھرے ہوئے تھے۔ محض نم آلود دھند تھی جس نے ان کی زندگیاں بچائیں...... ان کے گلوں کو کچھ سکون میسر آیا اور وہ پیاس کی شدت کے سبب پاگل ہونے سے بچ گئے۔

انہوں نے جدوجہد جاری رکھی۔ اب مسز فوربس اس دلبرداشتہ اور دل شکستہ جماعت کی قیادت کے فرائض بذات خود سرانجام دے رہی تھی کیونکہ گائیڈ نہیں جانتے تھے کہ وہ اس وقت کس مقام پر موجود تھے۔ اپنی قوت ارادی کے زور پر وہ جماعت کو متحد رکھے ہوئے تھی۔ اسے یقین تھا کہ کفرا کے نخلستان ان سے زیادہ دور نہ تھے۔ اگلے روز انہیں کھارا پانی میسر آ گیا جس نے ان کی زندگیاں بچائیں۔

انہوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ وہ ایسے مقام تک جا پہنچے تھے۔ جہاں پر انہیں ایک قافلے میں شامل افراد کی ہڈیوں کے پنجر دکھائی دیے۔

وہ لوگ پیاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر موت سے ہمکنار ہوئے تھے۔

بالآخر 14 جنوری کو وہ کفرا پہنچ چکے تھے...... ایک ایسی وادی جو بصورت اور رنگین چٹانوں میں گھری ہوئی تھی اور اس میں تین جھیلیں بھی بہہ رہی تھیں۔ تاج...... سنسی کا مقدس مقام ایک چٹان کی چوٹی پر واقع تھا اور بڑی جھیل کے اس پار وادی میں ایک قبضہ جوف آباد تھا۔

تاج کے مقام پر انہوں نے امیر ادریس کا خط پیش کیا۔ لہٰذا انہیں کسی قسم کی دقت پیش نہ آئی۔ لیکن جب وہ نیچے وادی جوف میں پہنچے تو قبیلے کے لوگوں نے ان کی انتہائی مخالفت سرانجام دی اور ان کو ہلاک کرنے کی کئی ایک کوششیں بھی سرانجام دیں۔

غدار عبداللہ جوف کے گورنر کو یہ باور کروانے میں مصروف رہا کہ مسز فوربس اور حسنین بے دونوں اٹلی کے عیسائی تھے اور انہوں نے مسلمانوں کا بھیس بدلا ہوا تھا جو کفرا کے مقام پر جاسوسی کی غرض سے آئے تھے تاکہ مابعد اس سرزمین کو فتح کرنے میں آسانی رہے۔ گورنر اس امر پر اصرار کر رہا تھا کہ ان لوگوں کے پاس امیر اور اس کے بھائی کے خطوط تھے لیکن عبداللہ یہ اصرار کرتا رہا کہ مسز فوربس اور اس کے ساتھی نے سنسی کے شہزادوں کو دھوکا دیا تھا۔

اس نے گورنر کو مزید بتایا کہ:۔

"جب سے یہ لوگ سفر کے لئے روانہ ہوئے تھے یہ لوگ خفیہ طور پر نقشے تیار کر رہے تھے...... انہوں نے اونٹوں کے پاؤں کے ساتھ گھڑیاں باندھ رکھی تھیں اور یہ خاتون بھی ہر وقت اپنے ہاتھ میں ایک گھڑی پکڑے رکھتی تھی (یہ کمپاس تھی)"

اس نے بیرومیٹر کو جو سفر کرنے والے لوگ اپنے خیمے میں لٹکاتے ہیں کو ایک ایسا ہتھیار بتایا کہ:۔

"ایک ایسا ہتھیار جو ایسی صورت میں ہمیں ہلاک کر دیتا اگر ہم اس کے نزدیک بڑھتے۔"

اس نے گورنر کو مزید بتایا کہ:۔

"ان کے پاس ایسے چشمے بھی ہیں جو ملک کے دور دراز کے حصوں کو بڑا کر کے دکھاتے ہیں۔"

بہرکیف وہ گورنر کو قائل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا کہ اجنبی خطرناک سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ گورنر نے اجنبیوں کے خلاف کوئی سخت کارروائی سرانجام دینے کی بجائے یہ حکم صادر کیا کہ انہیں اسی راستے سے واپس بھیجا جائے جس راستے پر سفر کرتے ہوئے یہ یہاں تک پہنچے تھے...... یہ حکم عبداللہ کے منصوبے کے عین مطابق نہ تھا کیونکہ اس غداری کے بعد وہ امیر کا سامنا کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ لہٰذا وہ واپسی کے سفر کے دوران ان کی ہلاکت کے منصوبے بناتا رہا۔

مسز فوربس اور حسنین بے تاج کے مقام پر دس روز تک مقیم رہے۔ وہ ایک سنسی کے گھر میں عربی بن کر مقیم رہے۔ ان کے علم میں یہ بات آئی کہ عبداللہ ان کے قتل کے منصوبے بنا رہا تھا۔ وہ یہ منصوبے علاقے کے سنسی انتہا پسندوں کے ساتھ مل کر بنا رہا تھا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ واپسی کے سفر کے آغاز میں ہی ان دونوں کو ہلاک کر دے۔ وہ ان کو ایسے علاقے میں ہلاک کرنا چاہتا تھا جہاں پر اکثر ریت کے طوفان آتے رہتے تھے اور صحرا کی تند و تیز ہوائیں چلتی رہتی تھیں...... ایسے مقام پر قافلے اکثر غائب ہو جاتے تھے اور ان کا نشان بھی نہ ملتا تھا۔

لیکن انہوں نے بڑی رازداری کے ساتھ اپنے واپسی کے سفر کا منصوبہ تبدیل کر لیا اور مصر کے راستے واپسی کا سفر اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے تاج کے مذہبی رہنماؤں کو اپنے اعتماد میں لیا اور ان کے مکمل تعاون سے استفادہ حاصل کیا۔

انہوں نے رات کے اندھیرے میں تاج کو چھوڑا اور ایک مرتبہ پھر اپنی جانوں کو ہتھیلی پر رکھتے ہوئے واپسی کے سفر پر روانہ ہوئے۔ ان کے قافلے میں چھ افراد اور چار اونٹ شامل تھے۔ مسز فوربس اور حسنین بے...... وفادار محمد اور یوسف...... وہ دونوں تجربہ کار گائیڈ تھے...... تاج کے حکام نے ان کا بندوبست کیا تھا...... اور ایک طالب علم جو سنسی روائی جا رہا تھا۔ جو جاگ حبوب میں واقع تھا۔

ان کا سفر ایک ایسی صحرا کو عبور کرنے پر مشتمل تھا جس میں سینکڑوں میلوں تک کنوؤں کا نام ونشان بھی نہ تھا اور یہی وجہ تھی کہ قبائلی اور سنسی قافلے اس راستے پر سفر سرانجام نہیں دیتے تھے۔

ابھی انہوں نے زیادہ سفر طے نہیں کیا تھا کہ ان کے علم میں یہ بات آئی کہ ایک مسلح گروہ ان کے انتظار میں تھا اور وہ تمام رات ریت کے ٹیلوں پر بیٹھے رہے...... ان کی رائفلیں ان کے ہاتھوں میں پکڑی تھیں...... وہ انتہائی جرأت کے ساتھ اپنی جانیں داؤ پر لگانے کیلئے تیار تھے۔ لیکن قبائلی ان کو تلاش نہ کر سکے اور سورج طلوع ہونے پر وہ بے آب صحرا میں کہیں گم ہو چکے تھے۔ بارہ روز مسلسل سفر طے کرنے کے بعد وہ ایک کنوئیں پر جا پہنچے تھے۔ وہ روزانہ 17 گھنٹے سفر طے کرتے تھے اور رات کے وقت ان میں اتنی سکت نہ ہوتی تھی کہ وہ رات گزارنے کے لیے خیمہ نصب کر سکیں۔ 10 فروری کو بالآخر وہ جاگ حبوب پہنچ چکے تھے۔ وہ تھکے ماندے تھے۔ یہ مقام سنسی کا ایک اور مقدس مقام تھا۔ ان کو خوش دلی کے ساتھ اس مقام پر قبول کیا گیا۔ چند روز آرام کرنے کے بعد انہوں نے مصر کی جانب اپنا سفر جاری رکھا۔

کچھ دنوں کے بعد حسنین بے اپنے اونٹ پر کھڑا ہو کر ارد گرد کے ماحول کا بہتر طور پر جائزہ لینے میں مصروف تھا کہ وہ اونٹ سے نیچے گر پڑا اور اس کی ہنسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مسز فوبس نے اس کی ہڈی کو اس کے مقام پر سیٹ کیا۔ اس کا بازو اور کندھا باندھا اور اسے مارفیا دیا...... اسے اس کے اونٹ پر سوار کیا اور وہ دوبارہ مصر کے جانب روانہ ہوئے۔ اونٹ کی سواری کے دوران جھٹکے لگنے سے حسنین بے کو تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس وقت ایک انتہائی بُری صورت حال کا شکار تھا جب ایک قافلہ ان کی مدد کو آن پہنچا۔ اس قافلے کو ان کی مدد کیلئے خصوصی طور پر روانہ کیا گیا تھا۔

لہٰذا روسٹیا فوربس کی عظیم مہم اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ اپنی بقایا زندگی کے دوران بھی اس نے دیگر مہمات سرانجام دیں لیکن اس کی کوئی مہم بھی اس قدر اہمیت کی حامل نہ تھی جس قدر اہمیت کا حامل اس کا کفرا کی جانب سفر تھا۔ اس نے جولائی 1967ء میں وفات پائی تھی۔

ٹیوٹان خامین کے مقبرے کی دریافت

1920ء میں ٹیوٹان خامین کے مقبرے اور ممی (حنوط شدہ لاش) کی دریافت اور اس کے معائنے کی قابل ذکر داستان نے ایک ہیجان برپا کر دیا تھا۔ مقبرے میں وہ خزانہ دریافت ہوا تھا جس کا تصور خواب میں بھی نہیں کیا گیا تھا...... خالص سونے کے ڈھیر...... اس کے علاوہ مصر کے سنہری دور کی دستکاری اور آرٹ کے بہترین نمونے بھی منظر عام پر آئے تھے۔

جب لارڈ کارنروون...... کھدائی کا دولت مند سرپرست اچانک موت سے ہمکنار ہو گیا تب جماعت کے دیگر لوگوں کیلئے اس کی موت ایک سانحہ سے کم نہ تھی...... اس داستان نے جنم لیا تھا کہ اس کی موت "ٹیوٹان خامین کی لعنت" کی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔ عرصہ دراز پہلے سے موت سے ہمکنار ہونے والے فرعون کے مقبرے کی کھدائی آثار قدیمہ کی تاریخ کا ایک مشہور اور ہیجان خیز واقعہ تھا۔

ٹیوٹان خامین کی داستان کا آغاز 31 صدیاں بیشتر ہوا تھا جب مصر کی دو سلطنتیں ایک عظیم قوت اور طاقت کی حامل تھیں۔ شمال میں فلسطین اور شام...... اور جنوب میں سوڈان تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس قوت اور خوشحالی کی بدولت آسائشوں نے ڈیرے ڈال لئے تھے اور مصری آرٹ اپنی انتہا کو چھو رہا تھا۔

یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ٹیوٹا خامین کے والدین کون تھے۔ عین ممکن ہے کہ اس کا باپ امین ہوٹپ III یا امین ہوٹپ IV یا اخناٹن جیسا کہ وہ جانا جاتا رہا ہو۔ ان ماہرین نے ٹیوٹان خامین کی جسمانی مشابہت اخناٹن کے ساتھ پائی تھی جنہوں نے 1925ء میں اس کی ممی کا معائنہ سرانجام دیا تھا۔ ان دنوں یہ تصور کیا جاتا تھا کہ اخناٹن یا تو اس کا باپ تھا یا پھر اس کا خسر تھا۔ کچھ جدید مفکر اس نکتہ نظر کے حامل تھے کہ اخناٹن اس کا بڑا بھائی تھا۔

اخناٹن کی ملکہ نہ صرف معروف ہستی تھی بلکہ خوبصورت بھی تھی۔ اس کا نام نفرتٹی تھا۔ اس نے قدیم مصر کی در و دیوار کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے بہت سے دیوتاؤں کو ماننے والا پرانا مذہب مسترد کر دیا تھا اور ایک دیوتا کا حامل مذہب متعارف کروایا تھا...... اٹن...... سورج دیوتا...... ٹیوٹان خامین نے اس مذہبی ہیجان کے وسط میں جنم لیا تھا۔ اس کی نوجوانی کے دور میں ملک انقلاب کی زد میں رہا تھا...... اخناٹن کے قوی ترین مخالف پرانے مذہب کے مذہبی رہنما تھے۔

اخناٹن نے نفرتٹی سے جھگڑا کر لیا تھا اور اس کے ساتھ رہنا بند کر دیا تھا۔ اس نے اپنے داماد کو اپنے ہمراہ اقتدار میں شریک کر لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں ہی پراسرار طور پر ہلاک ہو گئے اور ٹیوٹان خامین فرعون بن گیا۔ وہ 8واں فرعون تھا اور یہ دور 1350 قبل از مسیح کا دور تھا۔

ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ نوعمر فرعون کو تخت نشین کروانے کے پیچھے کیا مقاصد کارفرما تھے۔ اس پر اس کے مشیر حکومت کرتے تھے اور پہلا کام اس نے یہ سرانجام دیا کہ اس نے مصریوں کی زندگی میں قدیم دیوتاؤں کو دوبارہ بحال کر دیا اور اس طرح اس نے اخناٹن کے کئے پر پانی پھیر

دیا۔اس کی شادی انک ہسینا من نامی لڑکی سے ہوئی تھی جو عمر میں اس سے دو برس بڑی تھی۔وہ اخناٹن کی بیٹی تھی اور اپنے ہی باپ سے بیاہی رہی تھی اور یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اس سے اس کی ایک بیٹی بھی تھی۔

اس طرح ٹیوٹان خامین نہ صرف دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا بلکہ وہ مصر کے پُرقوت مذہبی رہنماؤں کی خوشنودی حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوا تھا۔

ٹیوٹان خامین نے خلل اور خلفشار سے دوچار اس سلطنت پر دس برس تک حکومت کی تھی۔وہ ایک بہتر نوجوان تھا۔اگرچہ وہ زیادہ تر مردانہ کھیلوں کی جانب متوجہ رہا...... تیراکی...... ریسلنگ...... شکار وغیرہ مگر اس امر کے شواہد موجود ہیں کہ وہ اور اس کی دلہن دونوں آپس میں ہنسی خوشی رہتے تھے۔اس کے دو حمل ضائع ہو چکے تھے۔ٹیوٹان خامین نے جنوری 1343 قبل از مسیح میں وفات پائی تھی۔اس وقت اس کی عمر تقریباً 18 برس تھی۔وہ شاید عظیم فرعونوں میں سے ایک تھا۔

اگرچہ اس کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہیں لیکن اس کی موت کی وجہ ایک معمہ ہی بنی رہی تھی اور صدیاں گزرنے کے باوجود بھی معمہ ہی بنی رہی۔دستیاب معلومات کے مطابق اس کی نوجوان بیوہ نے مایوسی کی حالت میں شاہی سلسلہ برقرار رکھنے کی کوشش کی۔اس نے شاہ ہٹی سے درخواست کی کہ وہ ایک شہزادے کو اس کا متبنیٰ بنادے۔اس شہزادے نے جونہی مصر کی سرزمین پر قدم رکھا تو وہ موت سے ہمکنار ہو گیا۔غالباً اس کی موت میں ہورم ہب کا ہاتھ تھا...... وہ ایک فوجی رہنما تھا جس نے ٹیوٹان خامین کی موت کے فوراً بعد اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا۔لہٰذا اس سانحہ کا ذمہ دار وہی تھا۔

اگرچہ ہورم ہب نے عبادت گاہوں اور عوامی مقامات سے ٹیوٹان خامین کا نام حرف غلط کی طرح مٹا دیا تھا لیکن اس نے اس نوجوان فرعون کے مقبرے کو ہاتھ لگانے کی قطعاً کوشش نہ کی تھی جس کو انتہائی پُرشکوہ انداز میں تعمیر کیا گیا تھا اور اس میں سونے کے ذخائر بھی دفن کئے گئے تھے۔ہورم ہب نے ملک میں مختلف اصلاحات سرانجام دیں اور مصر کی فوجی عظمت کو دوبارہ بحال کیا۔

70 روز تک مذہبی رہنما ٹیوٹان خامین کی لاش کو حنوط کرتے رہے اور اس کو دفنانے کی تیاریوں میں مصروف رہے۔اس کے جسم پر کئی سو گز بہترین ریشمی کپڑے میں لپیٹا گیا جس میں نایاب ہیرے اور موتی لگے ہوئے تھے۔مقدس سیال اس کی لاش پر چھڑکا گیا اور اس کی لاش کو ٹھوس سونے کے تابوت میں بند کیا گیا۔اس کی لاش کے چہرے پر سونے کا ایک ماسک سجایا گیا جو نوجوان فرعون کی مشابہت کا حامل تھا۔اس کے بعد سونے کے تابوت کو دیگر دو تابوتوں میں بند کیا گیا اور ہر ایک تابوت میں موت کا شکار ہونے والے فرعون کا سونے کا ماسک موجود تھا۔

اس کے بعد ٹیوٹان خامین کو اس کے زیرزمین مقبرے میں دفن کر دیا گیا۔اس کے بعد مقبرے کا داخلی دروازہ بند کر دیا گیا اور نوجوان ٹیوٹان خامین کو اس کے سونے کے تابوت میں تنہا چھوڑ دیا گیا۔

اس داستان کے اگلے مرحلے نے 1902ء میں جرمنی میں جنم لیا جبکہ کارنروون کا ایک امیر ارل اپنی گاڑی چلا رہا تھا۔اس کی ٹکر ایک دوسری گاڑی سے ہو گئی تھی اور اس کے سینے پر زخم آئے تھے۔اس کے ڈاکٹروں نے اسے یہ مشورہ دیا کہ اسے گرم اور خشک آب و ہوا میں رہائش اختیار کرنی چاہیئے۔لہٰذا وہ مصر چلا آیا اور اس نے مصر کی قدیم تہذیب میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔اس کی ملاقات ڈاکٹر ہوورڈ کارٹر سے ہوئی اور اس

کے بعد اس کی ملاقات مصری حکومت کے محکمے کے نوادرات کے انسپکٹر جنرل سے ہوئی۔ کارٹر ٹیوٹان خامین کے گمشدہ مقبرے کی تلاش میں دلچسپی رکھتا تھا اور 1907ء میں کارنروون نے مطلوبہ کھدائی کے لئے سرمایہ مہیا کر دیا۔ کھدائی کا کام ایک ہولناک اور بھیانک کام تھا۔ تقریباً ہر ایک فرعون کا مقبرہ ان لوگوں کی لوٹ مار سے نہ بچ سکا تھا جو مقبرے لوٹنے والی نسل سے متعلق تھے۔ ٹیوٹان خامین کو دفنانے کے دس برس بعد...... مقبرہ لوٹنے والے مقبرے میں داخل ہوئے لیکن جلد ہی وہ حکام کی نظروں میں آ گئے لہٰذا وہ اپنی کاوش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کے بعد اس مقبرے میں کوئی سانحہ پیش نہ آیا۔ اس کے بارے میں قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کی نگرانی سخت کر دی گئی تھی۔ دو سو برس بعد رامیسس VI کے مقبرے کی کھدائی کے نتیجے میں ٹیوٹان خامین کا مقبرہ مکمل طور پر ٹنوں کے حساب سے چونے کے پتھر کے نیچے دب چکا تھا۔

ٹیوٹان خامین کے مقبرے کی تلاش کئی برسوں تک جاری رہی اور اس دوران پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی اور یہ کاوش بھی خلل کا شکار ہوئی۔ بہر کیف کھدائی کے کام کا دوبارہ آغاز ہوا اور مقبرے کا داخلی دروازہ 4 نومبر 1922ء کو دریافت کر لیا گیا۔ اپنے سرپرست اور سرپرست کی لیڈی کی ہمراہی میں کارٹر نے سولہ عدد سیڑھیاں اور برآمدوں کی کھدائی سرانجام دی جہاں پر گذشتہ 30 صدیوں سے کسی نے قدم نہ رکھا تھا۔ انہیں چاروں طرف سونا ہی سونا نظر آیا۔ کارٹر کو یقین تھا کہ ٹیوٹان خامین اپنے پورے شاہی وقار کے ساتھ اسی مقام پر دفن تھا۔ اس طرح کا مقبرہ جسے اس سے پیشتر کسی نے چھوا تک نہ تھا آثار قدیمہ کی تاریخ میں ایک بہت بڑی دریافت تھی۔

اس دریافت کی خبر دنیا بھر میں پھیل چکی تھی اور سیاح اور رپورٹر حضرات نے اس مقام کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ مقبرے میں داخل ہونے کا راستہ لوہے کا ایک دروازہ نصب کرتے ہوئے بند کر دیا گیا تھا اور دن رات سختی کے ساتھ اس کی نگرانی کی جاتی تھی۔

کارٹر نے کہا کہ:۔

"کمرے کا نظارہ قابل دید تھا اور وہ اس نظارے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کمرے کی پیمائش 26×12 فٹ تھی اور یہ کمرہ دیدہ زیب فرنیچر سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ خوبصورتی کی حامل تقریباً تمام تر اشیاء اس کمرے میں موجود تھیں۔ یہ اشیاء مصر کے فرعونوں کے دور کے بہترین آرٹ کی نمائندہ تھیں۔

پینی لوپ فوکس نے کہا کہ:۔

"اس مقبرے کا حیران کن فرنیچر ایک شاندار ماضی کی عکاسی کرتا تھا۔"

لیکن ہوورڈ کارٹر کا عظیم ترین اور ہیجان خیز تجربہ مقبرے کو مسمار کرنا تھا۔ قبر کی کھدائی کے دوران انہیں سونے کے تابوت میں عرصہ دراز پیشتر موت سے ہمکنار ہونے والے فرعون کی لاش دریافت ہوئی۔

دنیا میں پہلے ہی ٹیوٹان خامین کی لعنت کی داستانیں گردش کر رہی تھیں جو ان لوگوں کو اپنی نشانہ بناتی تھی جو اس کے مقبرے کو نقصان پہنچاتے تھے۔ لارڈ کارنروون اپریل 1923ء میں موت سے ہمکنار ہو گیا۔ اسے مقبرے کی کھدائی کے عمل کے دوران کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا تھا۔

کارٹر اور اس کے معاونین کئی برس تک مقبرے میں اپنا کام سرانجام دیتے رہے۔ بالآخر کئی ایک اعلیٰ حکام...... سائنس دانوں اور مصری تہذیب کے ماہرین کی موجودگی میں تابوت کو کھولا گیا۔

پہلے تابوت کے بعد دوسرا تابوت تھا۔ اس کے بعد جو تابوت تھا وہ ٹھوس سونے سے بنایا گیا تھا اور اس میں فرعون کی ممی (لاش) موجود تھی۔ یہ اس قدر بھاری تھا کہ آٹھ توانا افراد بمشکل اسے اٹھا سکے تھے۔ ٹھوس سونے کے اس تابوت کی دریافت ایک حساس معاملہ تھا۔ ٹیوٹان خامین ایک چھوٹا فرعون تھا۔ وہ خزانے جو بڑے فرعونوں کے ساتھ دفن کئے جاتے تھے ان کی مالیت کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔

ٹیوٹان خامین کی داستان کا نقطہ عروج سونے کے اس تابوت کو کھولنا اور اس میں رکھی ممی کا معائنہ سرانجام دینا تھا۔ ممی بذات خود ایک خوبصورت انداز میں بنائی گئی تھی اور اس کے سر پر سونے کا ماسک تھا۔ ممی کو ایک بہترین ریشمی کپڑے میں لپیٹا گیا تھا جس کو ہیرے جواہرات اور سونے سے سجایا گیا تھا۔ ٹیوٹان خامین کا جسم درست حالت میں تھا۔

11 نومبر 1926ء کو ممی کا معائنہ سرانجام دینے کے کام کا آغاز ہوا۔ اس موقع پر بہت سے اعلیٰ حکام اور سائنس دان بھی موجود تھے۔ ھوورڈ کارٹر اور ڈاکٹر ڈوگلس ای۔ ڈیری...... مصری یونیورسٹی کا پروفیسر...... معائنے کا کام سرانجام دینے کا آغاز کیا۔

جب ممی سے کپڑا ہٹایا گیا تو ٹیوٹان خامین کا شیو زدہ سر اور دیگر نین نقش سامنے آئے۔ ہڈیاں اور گوشت اس قدر نازک صورت اختیار کر چکا تھا کہ معمولی سی غلطی کسی بڑے نقصان کا موجب بن سکتی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات پُرسکون تھے۔ اس کی اپنے خسر اخناتن کے ساتھ غیر معمولی مشابہت کو بھی محسوس کیا گیا۔

چونکہ اس کا جسم تابوت کے ساتھ چپکا ہوا تھا لہٰذا اس کے جسم کے گرد لپیٹے گئے کپڑے کو کاٹنا پڑا اور اس کے اندر سے گراں قدر ہیرے جواہرات' زیورات اور قیمتی پتھر دریافت ہوئے جو کاریگری کا منہ بولتا شاہکار تھے اور آج کل کے سنیارے بھی ایسی کاریگری دکھانے کے قابل نہ تھے۔

اس کی آنکھیں جزوی طور پر کھلی تھیں...... اس کی پلکیں دراز تھیں...... ہونٹ بھی معمولی سے کھلے تھے اور دانت دکھائی دے رہے تھے...... کان چھوٹے تھے اور خوبصورت تھے...... جلد شکستہ ہو چکی تھی...... لاش کی پیمائش کی گئی تو یہ امر واضح ہوا کہ ٹیوٹان خامین کا قد 5 فٹ 4½ انچ تھا اور اس کا جسم دبلا پتلا تھا۔ لیکن اس کی لاش قدرے سکڑ چکی تھی اور یہ اندازہ لگایا گیا کہ 1340 قبل از مسیح اس کا قد 5 فٹ 6 انچ رہا ہوگا۔ اس کی موت کی وجہ معلوم نہ ہو سکی تھی۔

کئی افراد ایسے بھی تھے جو ٹیوٹان خامین کے مقبرے میں خلل اندازی کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اسے پُرسکون انداز سے مدفون رہنے دیا جائے۔ لیکن آثار قدیمہ کا برتر علم حاصل کرنے کے علاوہ اعلیٰ حکام اس امر سے بھی بخوبی واقف تھے کہ اس مقبرے میں مدفون عظیم خزانے جلد ہی مقبرے لوٹنے والے جدید ڈاکوؤں کو اپنی جانب راغب کر لیں گے۔ لہٰذا خزانوں کو نکال لینا ہی بہتر تھا۔

بالآخر ٹیوٹان خامین کو دوبارہ سپرد خاک کر دیا گیا تھا اور اس کے مقبرے سے دریافت کئے جانے والے بہت سے خوبصورت خزانے قاہرہ کے عجائب گھر کی زینت بنا دیے گئے تھے۔

مالکولم کیمپبل کی دلیرانہ داستان

صدی کے آغاز سے ہی یورپ بھر میں یہ بحث عام تھی کہ تین اقسام کی حامل موٹر گاڑیوں میں سے کون سی قسم کی حامل موٹر گاڑی بہتر رہے گی:۔

بھاپ سے چلنے والی۔

بجلی سے چلنے والی۔

پٹرول سے چلنے والی۔

ان تمام اقسام کی گاڑیوں کو حال ہی میں متعارف کروایا گیا تھا اور پٹرول سے چلنے والی گاڑی پہلے پہل 1885ء میں متعارف کروائی گئی تھی۔

کون سی گاڑی بہتر رہے گی...... اس نتیجے پر پہنچنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ ان مختلف نظام کی حامل گاڑیوں کے ان مختلف نمائندوں کے درمیان گاڑیوں کی ریس کا ایک مقابلہ منعقد کیا جاتا جو جس نظام کی حامل گاڑی کو بہتر تصور کرتے تھے۔ یہ مقابلہ 1894ء میں پیرس اور رون کے درمیان سڑک پر منعقد ہوا اور اس مقابلے کو کونٹ البرٹ ڈی ڈون نے جیت لیا...... اس نے 13 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ایک چھوٹی اینم کار میں سفر طے کیا تھا۔ اس ریس میں لوگوں کی دلچسپی اس حد تک بڑھی کہ ایک اور ریس کا اہتمام کرنا پڑا...... یہ ریس پیرس تا بورڈ یکس تھی اور بورڈ یکس سے واپس پیرس بھی آنا تھا...... اس ریس کا سفر پہلی ریس کے سفر سے 10 گنا زائد تھا...... اس ریس کا اہتمام آئندہ برس کیا گیا تھا...... اس ریس میں 21 گاڑیاں حصہ لے رہی تھیں۔ اس ریس میں جیت سے ہمکنار ہونے والی پٹرول سے چلنے والی پین ہارڈ۔ لیواسر کار تھی جس نے اس سفر کے لئے تخمینہ کی گئی مدت سے نصف مدت میں یہ سفر طے کر لیا تھا۔ اس ریس کی انتظامیہ نے اس سفر کیلئے ایک سو گھنٹے کا تخمینہ لگایا تھا۔

ان دو مقابلوں سے مونزا...... مونٹ کارلو...... لی مین...... انڈیانا پولس اور تمام تر دیگر مقابلے منظر عام پر آئے جو آج کل مقبول عام ہیں۔

اس کے ساتھ ہی کار کی رفتار بھی ایک اہم پہلو کے طور پر منظر عام پر آئی۔ آہستہ آہستہ رفتار میں اضافہ ممکن ہوتا رہا...... 40 میل ...... 50 میل...... 60 میل فی گھنٹہ مگر 100 میل فی گھنٹہ کی رفتار فی الحال ناممکن دکھائی دیتی تھی۔

1904ء میں ایک فرانسیسی لوئس رگولی نے رفتار کا سابقہ ریکارڈ توڑتے ہوئے 100 میل فی گھنٹہ کی رفتار کا ریکارڈ قائم کیا...... اب اگلا ہدف 150 میل فی گھنٹہ تھا۔

1907ء میں بروک لینڈز میں کاروں کی دوڑ کے ایک نئے ٹریک کا افتتاح کیا گیا تھا اور کاروں کی دوڑ کی برطانیہ کی نئی نسل بھی منظر عام پر آ چکی تھی لیکن اس دور میں نہ ہی یہاں اور نہ ہی دنیا کے کسی حصہ میں 150 میل فی گھنٹے کی رفتار کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ 1914ء تا 1918ء کی جنگ نے ان مقابلوں کو ختم کر کے رکھ دیا تھا لیکن 1920ء تک رفتار کا مسئلہ دوبارہ زیر غور تھا۔ اسی برس بروک لینڈز میں ایک کار منظر عام پر آئی...... 35 اوانچ

پی وی 12 سن بیم...... جنگ کے بعد کا یہ پہلا کار کا ڈیزائن تھا اور یہ ڈیزائن اس لئے تخلیق کیا گیا تھا کہ کار کی رفتار کے سابقہ ریکارڈ کو توڑ سکے اور دو برس بعد اس کار کے ساتھ کے۔ لی گینس نے رفتار کا ایک نیا عالمی ریکارڈ قائم کیا جو 133.75 میل فی گھنٹہ تھا۔

اس کامیابی کا مشاہدہ کرنے والوں میں وہ شخص بھی شامل تھا جو رفتار کے اس ریکارڈ کو توڑنے کا شدت کے ساتھ خواہاں تھا...... کیپٹن (مابعد سر) مالکولم کیمپبل...... اس وقت تک وہ کاروں کی دوڑ کے ایک ڈرائیور کی حیثیت سے شہرت کما چکا تھا اور اپنے دور کے مقابلوں میں سے کئی ایک مقابلے بخوبی جیت چکا تھا۔ اس کے ساتھ مقابلے سرانجام دینے والوں میں لی گینس ...... لارڈ ہاؤ...... ایل۔ جی۔ ہارنیسٹڈ (1914ء کا ایک سابقہ ریکارڈ ہولڈر) بھی شامل تھے اور اس کو اس امر کا شدت کے ساتھ احساس تھا کہ اسے سن بیم ریکارڈ توڑنے والی کار خریدنی چاہیے۔ چنانچہ اس نے لوئس کوٹالن ...... سن بیم کے سربراہ سے درخواست کی کہ وہ یہ گاڑی اس کے ہاتھ فروخت کر دے...... لیکن اسے کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ تاہم مابعد کوٹالن اس امر پر راضی ہوگیا وہ سالٹ برن۔ یارک شائر میں ایک نیا ورلڈ ریکارڈ قائم کرنے کی کوشش سرانجام دینے کیلئے یہ گاڑی اسے مستعار دے دے گا۔

17 جون 1922ء کو کیمپبل سن بیم کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ وہ انتہائی پُراعتماد تھا کہ وہ گنس کا ریکارڈ توڑتے ہوئے ایک بہتر ریکارڈ قائم کرنے میں ضرور کامیاب ہوگا۔ اس کا چیف میکینک لیوولا تھا...... وہ اپنے میدان میں انتہائی ماہر تھا اور ولا نے کئی گھنٹے اس گاڑی کے انجن پر صرف کئے حتیٰ کہ وہ اتنا کامل ہو چکا تھا جتنا کامل بنانا اس کے بس میں تھا۔ مقابلے کا جھنڈا لہرایا گیا...... انجن گرجا...... اور گاڑی آگے بڑھ گئی...... گاڑی تیز رفتار پکڑ چکی تھی...... کیمپبل کی پہلی دوڑ 130.6 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے تھی...... اس کی واپسی کی دوڑ...... اگرچہ اچانک ایک کتا اس کی گاڑی کی زد میں آ گیا تھا اور مرتے مرتے بچا تھا...... 134.8 میل فی گھنٹہ تھی...... بالآخر جب وہ سن بیم سے باہر نکلا...... اسے یہ جان کر ازحد خوشی ہوئی کہ اس کی اوسط رفتار لی گنس کی رفتار سے خاصی بہتر رہی تھی...... اب یہ عالمی ریکارڈ تھا۔

تاہم اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ پیرس کے بین الاقوامی کمیشن نے ٹائم کی تصدیق نہ کی کیونکہ ٹائمنگ ہاتھ میں پکڑنے والی اسٹاپ واچ کی وساطت سے کی گئی تھی اور اس لئے یہ قابل قبول نہ تھی۔ لیکن کیمپبل ایک مضبوط قوت ارادی کا حامل شخص تھا۔ اس نے کوٹالن پر ایک مرتبہ پھر زور دیا کہ وہ یہ کار اس کے ہاتھ فروخت کر دے اور کوٹالن کو اس امر پر راغب کرنے کے بعد وہ بین الاقوامی اسپیڈ مقابلوں میں شرکت کرنے کی تیاری کرنے لگا جو فین آئی لینڈ۔ ڈنمارک میں منعقد ہونے تھے...... یہ مقابلے 1923ء کے موسم بہار میں منعقد ہونے تھے۔ سن بیم کو بروک لینڈز میں اس کے گیراج سے باہر نکالا گیا اور اس پر نیلا رنگ کیا گیا...... یہ کیمپبل کا لکی رنگ تھا...... اور اس کا نام بھی بلیو برڈ رکھا گیا۔ لیکن اسے محسوس ہوا کہ ابھی اس کار کی مرمت کے سلسلے میں بہت سا کام سرانجام دینا باقی تھا۔ دوڑ شروع ہونے 24 گھنٹے پیشتر ایک اور سانحہ پیش آ گیا کیونکہ گاڑی کو ٹیسٹ کرنے کے دوران اس کی شاک ابزاربر کی بریکٹیں ٹوٹ چکی تھیں۔ ان کو تبدیل کرنے کیلئے دن رات کام سرانجام دیا گیا۔ جرمن اس مقابلے میں بڑی اوپل گاڑی کے ساتھ حصہ لے رہے تھے اور وہ اپنی جیت کے بارے میں پُرامید تھے۔

چھ دیگر اقوام بھی اس مقابلے میں حصہ لے رہی تھیں...... لیکن کیمپبل نے اس دن کا ہر ایک مقابلہ جیتا تھا...... بشمول بڑا مقابلہ...... اس کی رفتار 137.72 میل فی گھنٹہ تھی...... اس کی نزدیکی حریف اوپل گاڑی سے پانچ میل فی گھنٹہ زائد...... اور ایک نیا بین الاقوامی ریکارڈ قائم ہو چکا تھا۔

اس کی جھولی میں تھا۔

اس کے دوسرے حریف اب 150 میل فی گھنٹے کا ہدف حاصل کرنے کے متمنی تھے۔ بہت سے افراد مثلاً پاری تھامس...... ایچ۔ او۔ ڈی۔ سیگریو اس ہدف کو حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے اور نئی گاڑیوں کے آرڈر دے رہے تھے جو اس ہدف کو حاصل کرنے میں معاون ثابت ہوسکتی تھیں۔ کیمپبل نے بھی اپنے لئے ایک نئی گاڑی کا آرڈر دے دیا...... لیکن اس کی تیاری کیلئے وقت درکار تھا۔ لہٰذا ایک مرتبہ پھر 21 جولائی 1925ء کو وہ اپنی وفادار بلیو برڈ کو پینڈن سینڈز پر لے آیا اور 150.87 میل فی گھنٹہ کی رفتار کا نیا عالمی ریکارڈ قائم کر دیا۔ فوراً ہی اس ریکارڈ کی تصدیق کر دی گئی۔ اب اس نے اپنا ہدف مزید بڑھا دیا تھا...... اب نیا ہدف 180 میل فی گھنٹہ تھا...... یعنی 3 میل فی منٹ...... عام لوگوں کو بہ آسانی سمجھ آ سکتی تھی...... کیونکہ عام لوگ بھی اب ان مقابلوں میں ازحد دلچسپی کا مظاہرہ کر رہے تھے اور ریکارڈ توڑنے کی ان کوششوں میں ازحد دلچسپی لے رہے تھے۔

اس دور میں 180 میل فی گھنٹے کا ہدف ایک مشکل ہدف تھا۔ اس کی نئی بلیو برڈ کی تیاری میں کچھ وقت درکار تھا اور اس دوران اس کے حریف اس کا ریکارڈ لے اڑے تھے...... پہلے سیگریو نے 152.33 میل فی گھنٹے کا ریکارڈ قائم کیا...... اس کے بعد پاری تھامس نے 171.02 میل فی گھنٹے کا ریکارڈ قائم کیا۔ تاہم 1927ء کے آغاز میں نئی نیپیئر۔ کیمپبل بلیو برڈ اپنی پہلی دوڑ کیلئے تیار تھی۔ کیمپبل اسے پینڈن سینڈز لے گیا اور 4 فروری کو اس نے 174 میل فی گھنٹے کی رفتار کا ریکارڈ قائم کر دیا۔

اب ایک مرتبہ ریکارڈ پھر اس کی جھولی میں آنے پڑا تھا۔ لیکن اس کی اس فتح پر اس کے حریف اور دوست پاری تھامس کی موت کا المیہ چھا گیا۔ کیمپبل کے ریکارڈ قائم کرنے کے ایک ماہ بعد وہ اپنی کار پینڈن سینڈز سے باہر بالبز لے گیا اور اس وقت ہلاکت کا شکار ہوا جب آف۔ سائیڈ ڈرائیونگ چین پوری رفتار کے ساتھ ٹوٹی اور اس کے سر پر آن لگی۔ چھ ہفتے بعد...... سیگریو جو اپنی سن بیم کو امریکہ میں ڈے ٹونا بیچ لے گیا تھا اس نے 203.792 میل فی گھنٹے کا ریکارڈ قائم کر دیا جو ایک ناقابل یقین فتح تھی۔

کیمپبل اس ریکارڈ کو توڑنا چاہتا تھا اور فروری 1928ء کو وہ اپنی بلیو برڈ کے ہمراہ ڈے ٹونا پہنچ چکا تھا...... اب اس میں 900 ہارس پاور کا انجن نصب تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ ساحل پینڈن کے ساحل سے قدرے بہتر تھا۔ اس نے برق رفتاری کے ساتھ اپنی گاڑی بھگا دی لیکن جب وہ پیمائش شدہ فاصلے کے اختتام پر پہنچا تب ایک حادثے کی نذر ہونے سے بال بال بچا۔ بہرکیف اس نے اپنی گاڑی واپسی کے سفر کے لئے بھگا دی۔ اس نے اس مقابلے میں 206.96 میل فی گھنٹے کی رفتار کا نیا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔

وہ سابقہ عالمی ریکارڈ توڑ کر نیا عالمی ریکارڈ قائم کر چکا تھا اور اب آرام کرنا چاہتا تھا۔ اس کی عمر 43 برس ہو چکی تھی اور گاڑیاں دوڑانا اور ریکارڈ توڑنا ایک نوجوان شخص کو زیب دیتا تھا...... یہ نوجوانوں کا کھیل تھا۔ لیکن جب دو ماہ بعد پہلے ایک امریکن آر۔ کیچ نے اس کا ریکارڈ توڑا اور مابعد اگلے برس سیگریو نے 231.44 میل فی گھنٹے کا ریکارڈ قائم کیا تب اس نے محسوس کیا کہ ایک مرتبہ پھر بلیو برڈ کو میدان میں اتارا جائے۔ 1931ء کے آغاز میں وہ واپس امریکہ چلا آیا اور پانچ مرتبہ مزید عالمی ریکارڈ توڑنے کے لئے روبہ عمل ہو گیا...... 4 مرتبہ ڈے ٹونا میں اور مابعد ستمبر 1935ء میں بون ولی فلیٹر میں...... وہ اس اعزاز کا حامل تھا کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے 300 میل فی گھنٹہ سے زائد رفتار کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کی اوسط رفتار 301.13 میل

لیکن اس مرتبہ بھی کیمبل کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مرتبہ بین الاقوامی ادارے نے ٹائمنگ کے اس ساز وسامان پر اعتراض اٹھایا تھا جو بروئے استعمال لایا گیا تھا اور اگرچہ ڈنمارک کے منتظمین نے اس ساز وسامان کو پیرس بھیجا تھا جہاں پر اس کی پڑتال کی گئی تھی اور اسے درست ہونے کی سند بھی دی گئی تھی لیکن کیمبل کا ریکارڈ سرکاری طور پر تسلیم نہ کیا گیا تھا۔

کیمبل اپنی گاڑی کی رفتار مزید بڑھانے کی جدوجہد میں مصروف رہا۔ لہٰذا اس نے اس میں کئی ترامیم سرانجام دیں اور اب بلیو برڈ ایک اور مقابلے کے لئے تیار تھی۔ 1924ء سے پیشتر بین الاقوامی مقابلے کا موقع میسر نہ آ سکا۔ 1924ء میں بین الاقوامی مقابلے کا موقع ایک بار پھر میسر آیا جبکہ فین مقابلے دوبارہ منعقد ہونے تھے۔

وہ تین مرتبہ بین الاقوامی ریکارڈ توڑ چکا تھا لیکن تینوں مرتبہ اس کے نئے ریکارڈ کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔

اگست 1924ء میں فین مقابلے منعقد ہونے سے قبل لی گنس کا ریکارڈ دو مرتبہ توڑا جا چکا تھا...... پہلے ایک فرانسیسی رین تھامس نے 143.31 میل فی گھنٹہ کی رفتار کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ ریکارڈ توڑا تھا...... اس کے بعد ایک برطانوی ارنسٹ ایلڈ ریج نے 146.01 میل فی گھنٹہ کی رفتار کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ ریکارڈ توڑا تھا۔ لیکن کیمبل کو تسلی تھی کہ ابھی تک کسی نے 150 میل فی گھنٹہ کی رفتار کا مظاہرہ نہیں کیا تھا اور یہ مظاہرہ وہ بذات خود کرنے کا متمنی تھا۔ لیکن جب وہ فین پہنچا تب وہ اس راستے کو دیکھ کر از حد مایوس ہوا جس پر گاڑیاں دوڑنی تھیں۔ اس راستے میں کئی ایک رکاوٹیں موجود تھیں۔ اگرچہ کافی رکاوٹیں دور کی جا چکی تھیں لیکن ہنوز کسی قدر رکاوٹیں باقی تھیں۔

کیمبل نے ان رکاوٹوں کے بارے میں انتظامیہ سے پرزور احتجاج کیا اور اس کے علاوہ تماشائیوں کے عدم تحفظ کے بارے میں بھی احتجاج کیا کیونکہ محض ایک رسے کی بدولت ان کو تیز رفتار کاروں سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس احتجاج کے بعد وہ اپنی بلیو برڈ میں سوار مقابلے میں شریک ہوا۔ غیر ہموار راستے کی وجہ سے اس کے پچھلے ٹائر جواب دے گئے تھے اور اسے دونوں ٹائر بدلنے پڑے اور مابعد وہ دوبارہ گاڑی دوڑانے لگا۔ اس مرتبہ اس کے اگلے ٹائروں میں سے ایک ٹائر گاڑی سے الگ ہوا اور تماشائیوں کے ہجوم میں جا پڑا۔ کیمبل نے بڑی مشکل سے گاڑی کو قابو کیا اور اسے تماشائیوں کے ہجوم سے دور رکھنے میں کامیاب رہا وگرنہ ایک خوفناک المیہ ناگزیر تھا۔ اس کے علم میں یہ بات آئی کہ اس کی گاڑی کا جو ٹائر علیحدہ ہو کر تماشائیوں کے ہجوم میں جا گرا تھا اس کے گرنے کی بدولت ایک نوجوان لڑکا ہلاک ہو گیا تھا۔ مقابلہ کو فوری طور پر ختم کر دیا گیا اور اور لڑکے کی ہلاکت پر لے دے ہونے لگی۔ کیمبل چونکہ پہلے ہی اس سلسلے میں احتجاج کر چکا تھا لہٰذا وہ بری الذمہ قرار پایا گیا۔ لیکن یہ حادثہ کئی ماہ تک اس کے ذہن پر چھایا رہا۔

اب تک وہ چار مرتبہ عالمی ریکارڈ توڑنے کی کوشش کر چکا تھا لیکن ہر مرتبہ وہ حالات کے ہاتھوں شکست کھا چکا تھا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر 25 ستمبر 1925ء کو بلیو برڈ کو میدان میں اتارا۔ یہ مقابلہ کارمارتھن شائر میں پینڈن بیچ کی نرم اور گیلی ریت پر منعقد ہوا تھا...... ہوا تند و تیز تھی جو ریت اڑا کر اس کے منہ میں دھکیل رہی تھی اور اس کا چشمہ بھی ریت کے غبار سے بھر چکا تھا...... اس نے 146.16 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر طے کیا تھا...... اس موقع پر...... اس کی 5ویں کاوش کے موقع پر...... اس مقابلے کو تسلیم کر لیا گیا تھا...... بالآخر عالمی ریکارڈ

فی گھنٹہ تھی۔ بالآخر وہ مطمئن ہو چکا تھا۔ اس نے سرکاری طور پر عالمی لینڈ اسپیڈ کے ریکارڈ نو مرتبہ توڑے تھے۔ اسے روئے زمین کے تیز ترین شخص کا خطاب دیا گیا تھا۔ اب اس نے فیصلہ کیا تھا کہ نوجوانوں کو موقع ملنا چاہیئے کہ وہ اپنی زندگیاں داؤ پر لگائیں...... اس کے زمینی دوڑ کے دن ختم ہو چکے تھے ...... اب اس میں ایک نئی دلچسپی نے جنم لیا تھا...... واٹر اسپیڈ کا ریکارڈ قائم کرنے کا شوق اس کے دل میں چرایا تھا۔

اس میدان میں مقابلہ سخت نہ تھا۔ اگرچہ برطانیہ اور امریکہ اس میدان میں ایک دوسرے کے حریف تھے۔ 1920ء سے عالمی ریکارڈ امریکہ کے پاس تھا اور یہ ریکارڈ دس برس تک امریکہ کے پاس ہی رہا تھا حتیٰ کہ سر ہینری سیگریو نے یہ ریکارڈ برطانیہ کیلئے حاصل کر لیا تھا اور اگلے ہی برس یہ ریکارڈ دوبارہ امریکہ کے پاس واپس آ چکا تھا اور 1931ء میں کے ڈون نے یہ ریکارڈ پھر برطانیہ کیلئے جیت لیا تھا۔ 1932ء میں گار وڈ...... ایک امریکن...... اس نے اس ریکارڈ کو پھر اپنے ملک کے لئے حاصل کر لیا تھا۔ اس نے 124.8 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کشتی چلاتے ہوئے یہ ریکارڈ قائم کیا تھا...... اس کی کشتی کا نام ''مس امریکہ ایکس'' تھا اور ایسا دکھائی دیتا تھا کہ یہ ریکارڈ امریکہ کے پاس ہی رہے گا اور یہی وہ ریکارڈ تھا جس نے کیمپبل کو اس میدان کی جانب راغب کیا تھا اور اس نے ایک کشتی کی تیاری کے لئے آرڈر دے دیا تھا۔ اس کشتی کو اس کا لکی رنگ...... یعنی بلیو رنگ کیا گیا تھا اور اس کا نام ''بلیو برڈ I'' رکھا گیا تھا۔ اس کشتی کی لمبائی 24 فٹ تھی لیکن اس میں طاقتور انجن نصب تھا۔

کسی قدر مشق سرانجام دینے کے بعد وہ اپنی نئی کشتی کو جھیل میگی اور...... اٹلی لے آیا تھا اور ستمبر 1937ء میں اس نے 128.3 میل فی گھنٹہ کی رفتار کا مظاہرہ کرتے ہوئے سابقہ ریکارڈ توڑ ڈالا تھا۔ تاہم وہ جانتا تھا کہ یہ ایک بہتر ریکارڈ نہ تھا جو اس نے قائم کیا تھا لہٰذا اس نے فوری طور پر ایک بالکل نئی کشتی کی تعمیر کا آرڈر دے دیا...... بلیو برڈ II...... اس کشتی کا ڈیزائن ایک انقلابی ڈیزائن تھا اور روایتی ڈیزائن سے ہٹ کر تھا۔ نئی کشتی کو کونسٹن واٹر میں چھوڑا گیا اور اگست 1939ء میں کیمپبل نے جھیل کے ساکن پانیوں میں کشتی رانی کا مقابلہ سرانجام دیا اور اپنی کشتی کو برق رفتاری کے ساتھ بھگایا اگرچہ اسے یہ بتایا گیا تھا کہ 150 میل فی گھنٹہ کے لگ بھگ رفتار اس کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی اور کشتی کسی حادثے کا شکار ہو سکتی تھی۔

وہ 141.47 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے واپس آیا...... یہ ایک ایسا ریکارڈ تھا جو گیارہ برس تک قائم رہا...... اور اس ریکارڈ نے اسے یہ اعزاز بھی بخشا کہ وہ دنیا کا پہلا فرد تھا جس کے پاس بیک وقت خشکی اور پانی کے سپیڈ ریکارڈ موجود تھے۔

1939ء تا 1945ء کی جنگ نے ان مقابلوں کو ختم کر کے رکھ دیا تھا اور کیمپبل کو دیگر خدمات کی سرانجام دہی کیلئے طلب کر لیا گیا تھا۔ جب دوبارہ امن وامان قائم ہو گیا تب اس کا شوق دوبارہ بیدار ہوا۔ لہٰذا اس نے ''بلیو برڈ'' کی تیاری شروع کر دی تاکہ ایک اور عالمی واٹر سپیڈ کے مقابلے میں حصہ لے سکے۔ وہ ایک ایسا ریکارڈ قائم کرنا چاہتا تھا جو اس کے خشکی پر قائم کردہ ریکارڈ کی طرح سالہا سال تک محفوظ رہ سکے اور کوئی اس ریکارڈ کو توڑ نہ سکے...... لیکن اس کی صحت جواب دے چکی تھی...... سالہا سال کی سخت محنت کی بدولت اس کی صحت شکست وریخت کا شکار ہو چکی تھی۔ جب وہ اپنے وفادار دوست لوولا کے ہمراہ گاڑی بھگا رہا تھا تو وہ اچانک اس کی کار کے پہیے پر جا گرا اور چند روز بعد...... 1948ء کے آخری دن...... موت سے ہمکنار ہو گیا...... اور موت کے ساتھ ہی ایک عظیم انگریز ایک قصہ پارینہ بن گیا اور تاریخ میں محفوظ ہو گیا۔

......❁......

فضا کی ہیروئن

ایمی جانسن نے جب 26 برس کی عمر میں آسٹریلیا کی جانب اپنی پہلی پرواز سرانجام دی اس وقت امریکہ کی اس معروف ہواباز کی عمر 34 برس تھی اور وہ اس وقت بحراوقیانوس پر اپنی تنہا پرواز کی حساس تیاریوں میں مصروف تھی۔ پانچ برس پیشتر چارلس لنڈبرگ پہلا شخص تھا جس نے بحراوقیانوس پر تنہا پرواز سرانجام دی تھی اور امیلا ارہاٹ چاہتی تھی کہ وہ پہلی خاتون ثابت ہو جو یہ کارنامہ سرانجام دے۔

امیلا 1898ء میں کنساس میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کی ابتدائی زندگی پر اس کے والدین کی ناخوشگوار ازدواجی زندگی سایہ فگن رہی تھی...... اس کے والدین کی ناخوشگوار ازدواجی زندگی کی بڑی وجہ اس کے باپ کی کثرت شراب نوشی تھی۔ 1920ء میں اس نے ایک فضائی شو کے دوران محض لطف اندوز ہونے کی خاطر پرواز سرانجام دی...... اس پرواز نے اس کے دل میں یہ خواہش اجاگر کی کہ وہ بھی پرواز سرانجام دینا سیکھے...... اور اس کے بعد اس کے دل میں ایک پائلٹ بننے کا خیال اس شدت کے ساتھ سمایا کہ کوئی فرد بھی اس کے دل سے اس خیال کو نکال باہر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور آئندہ برس تربیت حاصل کرنا شروع کر دی اور ایک برس بعد اپنے باپ کے تعاون سے وہ اپنا پہلا ایئرکرافٹ خریدنے کے قابل ہو گئی۔ یہ ایک سیکنڈ ہینڈ جہاز تھا۔ اس مشین کے ذریعے اس نے بے انتہا مشق سرانجام دی اور اس کی مرمت کے بارے میں تمام تر حقائق بخوبی سیکھ لئے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک تجربہ کار اور ماہر ہواباز بن چکی تھی اگرچہ 1928ء تک اس نے کوئی کارنامہ سرانجام نہ دیا تھا۔ 1928ء میں اس سے یہ دریافت کیا گیا کہ کیا وہ ایک مسافر کی حیثیت سے بحراوقیانوس پر پرواز کرنے کی خواہش کی حامل تھی...... اسے اس پرواز کی پیش کش ایک ایسے جہاز میں کی گئی تھی جسے دو افراد اڑا رہے تھے...... ولمر سلٹ بطور پائلٹ اور لوئس گورڈن بطور فلائٹ میکینک...... اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس پیش کش کو قبول کر لیا۔ یہ پرواز کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور اسے بھی کافی شہرت حاصل ہوئی اور اس کو یہ شہرت دلانے کا اہتمام جارج پالمر پٹنام نے کیا تھا جو ایک پبلشر تھا اور اس نے پہلے ہی لنڈبرگ کی پہلی پرواز کی تفصیل چھاپ کر عظیم کامیابی حاصل کی تھی اور اس نے امیلا ارہاٹ کی شکل میں ایک اور دولت کمانے والا پراجیکٹ محسوس کیا تھا۔ تاہم مابعد اسے امیلا میں ایک کامیاب بیوی کی خوبیاں محسوس ہوئیں...... اور اس نے اپنی بیوی سے طلاق حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی...... 1930ء میں یہ طلاق ہو چکی تھی اور آئندہ برس امریکہ کی معروف ترین خاتون ہواباز مسز امیلا ارہاٹ پٹنام بن چکی تھی۔

لیکن وہ بحراوقیانوس پر پرواز کرنے والی پہلی مسافر خاتون کے اعزاز سے مطمئن نہ تھی بلکہ وہ تن تنہا یہ پرواز سرانجام دینا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کی خاطر پانچ برس تک سخت محنت کی۔ اس عرصے کے دوران امیلا اپنے پرانے ائرکرافٹ کے ذریعے ایک

کے بعد دوسرا ریکارڈ قائم کرتی رہی۔اس کی اس کارکردگی سے لاک ہیڈ کمپنی از حد متاثر ہوئی کہ اس کمپنی سے اسے ایک نیا جہاز پیش کر دیا......ایک سرخ ہائی۔ونگ لاک ہیڈ ویگا...... بالآخر امیلا اس قابل ہو چکی تھی کہ وہ اپنی خواہش کی تکمیل سرانجام دے سکے۔

اس کا خیال تھا کہ چارلس لنڈبرگ کی تاریخ ساز پرواز جو اس نے پانچ برس قبل سرانجام دی تھی کی سالگرہ کے دن اپنی پرواز کا آغاز کرے لیکن وہ خرابی موسم کی بنا پر ایسا نہ کر سکی اور اس کی پرواز تاخیر کا شکار ہوگئی۔امیلا پرواز سرانجام دینے کیلئے بے صبری ہوئی جا رہی تھی۔اس نے یہ فیصلہ کیا کہ جونہی موسم سازگار ہوا توں ہی وہ اپنی پرواز کا آغاز کردے گی۔اس نے اپنے نقشے اور فلائنگ کٹ کے علاوہ دو ڈبے ٹماٹروں کے جوس کے بطور خوراک استعمال کرنے کے لئے اپنے ہمراہ رکھے تھے اور 20 مئی 1932ء کی شام سات بجے کے بعد وہ نیوفاؤنڈلینڈ سے پرواز کرگئی۔

اندھیرے میں امیلا تن تنہا بحراوقیانوس پر پرواز سرانجام دیتی رہی۔ان دنوں ریڈار کا نظام منظر عام پر نہیں آیا تھا۔اور جہاز رانی کی محض چند ایک سہولتیں دستیاب تھیں۔موسم عام طور پر ناسازگار تھا اور وہ زیادہ تر بادلوں میں ہی پرواز سرانجام دیتی رہی۔جلد ہی اس کے علم میں یہ بات آئی کہ آلٹی میٹر کام نہیں کر رہا تھا۔لہٰذا اسے اپنی پرواز کے بارے میں کوئی علم نہ تھا...... گہرے بادلوں میں عین ممکن تھا کہ وہ سطح سمندر سے محض چند فٹ اوپر ہی پرواز کر رہی ہو۔محفوظ پرواز کی غرض سے اس نے جہاز کو فضا میں مزید بلند کیا...... وہ کتنی بلندی پر پرواز کر رہی تھی...... اس کے بارے میں اسے محض اندازہ ہی قائم کرنا تھا کیونکہ آلٹی میٹر کام نہیں کر رہا تھا۔اس کے علاوہ ایگزاسٹ پائپ سے بھی آگ کے شعلے بلند ہو رہے اور ان شعلوں کو دیکھ کر وہ فکر مند ہوگئی تھی۔لیکن اس نے سوچا کہ دھات اس قدر موٹائی کی حامل تھی کہ اس وقت تک کسی نقصان سے دوچار نہ ہو سکتی تھی حتیٰ کہ وہ اپنا سفر مکمل کر لیتی۔

ایک زبردست طوفان ایک شدید رکاوٹ ثابت ہو رہا تھا۔اندھیرے میں جہاز ہوا میں ہچکولے کھا رہا تھا۔اس نے کوشش کی کہ وہ طوفان سے اوپر نکل جائے لیکن جہاز کے پروں پر برف جمنی شروع ہو چکی تھی اور اس کی رفتار میں کمی واقع ہونی شروع ہو چکی تھی۔وہ دوبارہ نیچے آ گئی لیکن آلٹی میٹر کے بغیر وہ زیادہ نیچے آنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی...... لہٰذا پانچ گھنٹوں تک وہ اندھی پرواز سرانجام دیتی رہی...... محض اپنے اندازے پر بھروسہ کرتے ہوئے...... ہوا۔بارش اور چمکتی ہوئی بجلی سے دوچار ہوتے ہوئے وہ رواں دواں رہی۔

طلوع فجر......اگرچہ یہ خوش کن تھی لیکن یہ اس کے لئے ایک اور صدمے کا باعث ثابت ہوئی۔پٹرول کی کچھ مقدار لیک کر رہی تھی اور جہاز کے پر کے باہر کی جانب بہہ رہی تھی اور یہ ایگزاسٹ پائپ کے بالکل قریب بہہ رہی تھی......اور دن کی روشنی میں اگرچہ وہ ایگزاسٹ پائپ سے نکلنے والے آگ کے شعلے نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ شعلے بدستور موجود تھے۔وہ کئی ایک خطرات سے دوچار تھی:۔

کیا وہ آگ کی نذر ہو جائے گی؟

کیا وہ اپنے جہاز کے تمام پٹرول سے محروم ہو جائے گی؟

کیا وہ سمندر میں گرنے پر مجبور ہو جائے گی؟

کیا اسے اتنا وقت میسر آ جائے گا کہ وہ خشکی پر اپنا جہاز اتار سکے؟

اسے اپنی کمپاس سے معلوم ہوا کہ وہ درست سمت رواں دواں تھی۔ لیکن ریڈیو مواصلاتی رابطے سے وہ محروم تھی اور وہ محض اندازے سے یہ جانچ کرسکتی تھی کہ وہ کتنا سفر طے کرچکی تھی...... ایک انداز کے مطابق وہ اتنا سفر طے کرچکی تھی کہ اب واپس پلٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا...... اس کی آنکھیں مسلسل فیول گیج پر لگی ہوئی تھیں تا کہ فیول کے لیک ہونے کے بارے میں باخبر رہ سکے۔ اچانک اسے افق پر ایک لمبا سیاہ دھبہ نظر آیا جو آہستہ آہستہ آئرلینڈ کے تازہ سبزے میں تبدیل ہوگیا۔

امیلا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اور وہ فوراً لندن کے اوپر سے پرواز کرنے کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ سوچنے لگی اور وہ اس اقدام کو سرانجام دینے کی بے انتہا خواہش بھی رکھتی تھی لیکن جب اس نے جہاز کے پرکا دوبارہ معائنہ سرانجام دیا تو اس کی خوف کی انتہا نہ رہی کہ ایگزاسٹ پائپ ٹوٹ چکا تھا اور لیک کرنے والے پٹرول کو آگ لگنے کا خدشہ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکا تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ جتنی جلد ممکن ہوسکے زمین پر اترا جائے۔ اس نے بلندی سے نیچے آئے ہوئے ایک قصبے کا چکر لگایا لیکن اسے ایروڈروم یا لینڈنگ کی کوئی علامت دکھائی نہ دی۔ لہٰذا اس نے نچلی پرواز جاری رکھی حتیٰ کہ اسے ایک وسیع سبزہ زار نظر آیا جو مناسب لمبائی کا حامل تھا...... لیکن ایک مسئلہ موجود تھا۔ اس سبزہ زار میں گائیں چر رہی تھیں۔ جہاز اتارنے سے پیشتر وہ جہاز کو اوپر اور نیچے لاتی رہی تا کہ شور کی آواز سن کر گائیں سبزہ زار کے کسی کونے کا رخ کرلیں لیکن خوفزدہ گائیں محض آگے پیچھے ہی حرکت کرتی رہیں۔ لہٰذا اس نے ان سے بچتے بچاتے جہاز کو زمین پر اتار لیا...... پہلی خاتون بحراوقیانوس پر پرواز سرانجام دے چکی تھی...... یہ پرواز اس نے 13½ گھنٹوں میں سرانجام دی تھی...... خوفزدہ گائیوں کے جھرمٹ میں اس نے لینڈنگ کی تھی۔

جلد ہی علاقے کے مکین امیلا تک آن پہنچے تھے۔ انہوں نے اس کا والہانہ استقبال کیا اور جلد ہی اس کی کامیابی کی خبر لندن پہنچ چکی تھی۔ اخباری نمائندے اور فوٹوگرافر اسے گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔ اس کی کامیابی پر اس کے ہم وطن از حد خوش تھے اور اس کامیابی کے حصول کے بعد سے وہ ''سویٹ ہارٹ آف امریکہ'' کے نام سے جانی جانے لگی تھی۔

اس کے بعد بھی اس نے اپنے فضائی معرکے جاری رکھے۔ اس کے فضائی سفر دنیا بھر میں جاری رہے اور یہ سفر اسے برازیل...... وینزویلا میکسیکو...... میامی اور بحرالکاہل کے پار لے گئے۔ اس پر اعزازات کی بارش ہوتی رہی۔ اس نے پرڈیو یونیورسٹی کے صدر کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے خواتین طالبات کیلئے بطور وزیٹنگ ووکیشنل کونسلر فیکلٹی میں شمولیت اختیار کرلی۔

اپنے اس نئے کردار میں امیلا نے اپنے آپ کو خواتین اور ان کے حقوق کا چیمپئن ثابت کیا۔ یونیورسٹی کا صدر اس کی کارکردگی سے اس قدر متاثر اور خوش ہوا کہ اس نے ایروناٹیکل ریسرچ کے لئے خصوصی فنڈ قائم کردیا اور یونیورسٹی نے امیلا کے لئے 50,000 ڈالر کے فنڈ کا بندوبست کیا تا کہ وہ نیا ہوائی جہاز خرید سکے۔ اب اس کے لئے یہ موقع تھا کہ وہ اپنی اگلی خواہش کی تکمیل سرانجام دے...... دنیا کے گرد فضائی چکر۔

اس نے ایک جدید اور لمبی پرواز سرانجام دینے کا حامل ہوائی جہاز خریدا...... یہ جہاز اس قدر جدید تھا جس قدر جدید اس دور میں دستیاب ہوسکتا تھا۔ یہ جہاز دو انجنوں کا حامل تھا۔ لاک ہیڈ 10-ای الیکٹرا ایئرلائنر...... اس کے کیبن کی دس نشستوں کو ختم کرتے ہوئے سازوسامان سے آراستہ جہاز رانی کے کمرے اور فاضل پٹرول کے ٹینکوں کے لئے مخصوص کردیا گیا تھا۔ اس طرح جہاز میں 1200 گیلن پٹرول ذخیرہ کرنے کی

گنجائش موجود تھی اور وہ 4500 میل تک کا سفر بخوبی سرانجام دے سکتا تھا۔ اپنی 38 ویں سالگرہ کے موقع پر یہ جہاز اس کے قبضے میں آ چکا تھا اور ایک برس سے کم مدت کے بعد...... مارچ 1937ء میں...... وہ دنیا کے گرد پرواز سرانجام دینے کے لئے تیار تھی۔ اگرچہ اس وقت وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ پرواز اس کی آخری پرواز تھی۔

اس سفر کا آغاز بہتر نہ تھا۔ پرواز کا آغاز کرتے ہوئے جہاز حادثے کا شکار ہو گیا۔ اگرچہ اس حادثے میں کوئی جانی نقصان نہ ہوا اور نہ ہی کوئی زخمی ہوا لیکن الیکٹرا کو لاک ہیڈ فیکٹری مرمت کیلئے روانہ کرنا پڑا۔ دو ماہ بعد دوبارہ پرواز کا آغاز کامیابی کے ساتھ ہوا اور اس کے ساتھ ہی دنیا کے گرد چکر لگانے کی پرواز کا آغاز ہوا۔ اس پرواز کے دوران ایک انتہائی تجربہ کار بحری جہاز رانی کا ماہر فریڈ نونان بھی امیلا کے ہمراہ تھا۔ اپنی پرواز کے پہلے مرحلے کے دوران وہ اری زونا...... مابعد اور لینز اور پھر میامی پہنچے...... اس دوران چھوٹے موٹے سانحہ جات درپیش آئے اور چھوٹی موٹی مرمت بھی سرانجام دینا پڑی۔ برازیل کے ساحل سے پرواز کرتے ہوئے اس نے بحراوقیانوس کے پار 1900 میل کا فضائی سفر بغیر کسی دقت کے طے کیا۔ اس کے بعد اس کا روٹ افریقہ تا اریٹیریا...... بحیرہ عرب تا کراچی...... جہاں پر جہاز کی اوور ہالنگ سرانجام دی گئی اور اس عمل میں دو دن صرف ہوئے اور انہیں دو دنوں کے لئے رکنا پڑا...... یہ اوور ہالنگ امپیریل ائرویز اور رائل ائرفورس کے میکینکوں نے سرانجام دی۔ تب کلکتہ اور برما میں اخیاب سے ہوتے ہوئے الیکٹرا بالآخر سنگاپور پہنچ گیا اور مابعد جاوا میں بندونگ کی جانب پرواز کی۔ اس مقام پر بھی جہاز کی مکمل اوور ہالنگ سرانجام دی گئی۔ یہ اوور ہالنگ امریکن ایروانجن کے ماہرین اور میکینکوں کے عملے نے سرانجام دی۔

آسٹریلیا میں امیلا اور فریڈ نونان نے دو روز تک آرام کیا اور اس کے بعد 30 جون کو پورٹ ڈارون سے روانہ ہوئے۔ انہوں نے ابھی اپنی پرواز کے 7,000 میل طے کرنے تھے...... یہ ان کے کل سفر کا محض ایک چوتھائی حصہ تھا۔ لیکن ان کے سفر کا اگلا مرحلہ ایک مشکل مرحلہ تھا۔ انہوں نے بحرالکاہل پر 2,500 میل کا سفر سرانجام دینا تھا اور ایک چھوٹے سے جزیرے ہاؤلینڈ پہنچنا تھا۔ اس کے بعد ان کا اگلا اسٹاپ ھونولولو تھا۔

موسم کی خرابی کی وجہ سے وہ تاخیر کا شکار ہو چکے تھے۔ لہٰذا دو دن کی تاخیر کے بعد الیکٹرا نے 2 جولائی 1937ء کو ساڑھے دس بجے اپنی پرواز کا آغاز کیا۔ اس میں پوری مقدار میں ایندھن موجود تھا۔ لیکن 3 جولائی کے بعد لاک ہیڈ الیکٹرا کو دوبارہ نہ دیکھا گیا تھا۔ امریکہ کے بحری جہازوں اور ہوائی جہازوں نے اس جہاز کی تلاش شروع کر دی تھی۔ انہوں نے بحرالکاہل کا تقریباً ایک چوتھائی ملین رقبہ چھان مارا لیکن امیلا اور فریڈ نونان کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ بالآخر سرکاری طور پر امیلا اور فریڈ نونان کی سمندر میں گمشدگی کا اعلان کر دیا گیا اور یہ بھی اعلان کیا گیا کہ انہیں مردہ تصور کیا جائے۔

دو برس بعد اس کے خاوند جارج پٹنام نے دوبارہ شادی کر لی اور اپنی تیسری بیوی کو 1944ء میں طلاق دے ڈالی اور دوبارہ شادی کر لی۔ جنگ کے دوران اس نے امریکی فضائی فوج میں خدمات سرانجام دیں اور جنوری 1950ء میں موت سے ہمکنار ہو گیا۔

امیلا کا دنیا کے گرد فضائی چکر لگانے کا خواب المیے اور پُراسراریت کی نذر ہو چکا تھا۔ کچھ برسوں بعد یہ افواہ گردش کر رہی تھی کہ ایک امریکن خاتون ہواباز سائی پان کے مقام پر دیکھی گئی تھی...... جاپانی جزیروں میں سے ایک جزیرہ...... ہاؤلینڈ سے سینکڑوں میل دور...... بالآخر ایک

امریکی صحافی جو کولمبیا براڈ کاسٹنگ سسٹم کیلئے خدمات سرانجام دے رہا تھا اس نے ان افواہوں کی مفصل چھان بین کی۔ کئی برسوں کی تحقیق کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ امیلا اور فریڈ نونان دونوں امریکی حکومت کیلئے جاسوسی کے ایک غیر سرکاری مشن کی سرانجام دہی میں ملوث تھے۔

اس کے خیال میں ان کے اس مشن میں جاپانیوں کے ہوائی اڈوں کا مشاہدہ کرنے کے علاوہ کا رولائن جزیروں میں فضائی بیڑے کی سروس کی سہولیات کی وسعت کا جائزہ لینا بھی شامل تھا۔ حیران کن تدبیر اور تیز رفتار جہاز استعمال کرنے کی بدولت انہیں جاپانیوں کی جانب سے کوئی خطرہ لاحق ہونے کا اندیشہ نہ تھا اور ان کے پاس اس کارروائی کی سرانجام دہی کیلئے کافی ایندھن بھی موجود تھا۔ تاہم ان کا مشن مکمل ہو چکا تھا اور ہاؤلینڈ جزیرے کے واپسی کے سفر کے دوران وہ اپنے راستے سے بھٹک گئے تھے۔ بالآخر جب ان کے پاس ایندھن ختم ہو گیا تو وہ ایک جاپانی جزیرے ملی اٹال اترنے پر مجبور ہو گئے۔ وہاں سے انہیں سپین لے جایا گیا...... بحرالکاہل میں جاپانی فوجی ہیڈ کوارٹر...... جہاں پر کون جانتا ہے کہ ان کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہو گا...... امیلا کے بارے میں یہ کہا گیا تھا کہ وہ تشدد کی تاب نہ لاتے ہوئے ہلاک ہو گئی تھی اور نونان جاپانیوں کی قید میں ہی رہا تھا۔ حقیقت کیا تھی...... شاید اس سے کبھی بھی پردہ نہ اٹھ سکے۔

......❁......

تھیٹس نامی آبدوز سمندر کی نذر ہوگئی

یکم جون 1939ء کی صبح صاف شفاف اور پُرسکون پانی میں...... بالکل نئی سب میرین "تھیٹس" برکن ہیڈ سے روانہ ہوئی...... جہاں پر اس کی تعمیر سرانجام دی گئی تھی...... وہ خلیج لیورپول میں آزمائشی سفر سرانجام دے رہی تھی۔ جیسا کہ ایسے موقعوں پر اکثر دیکھنے میں آتا ہے ایک ہلکی پھلکی پارٹی جیسا سماں تھا۔ ایک نئی کشتی...... ایک نیا عملہ...... اس کی تعمیر میں صرف ہونے والا ایک لمبا دورانیہ جواب اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا اور بہت سے مہمانوں کی موجودگی بھی اس تقریب کا حصہ تھی۔ کیمل ئیرڈ سے فٹر تھے...... کشتی بنانے والے تھے...... سویلین عملہ تھا...... سب میرین ہیڈ کوارٹر سے افسران تھے...... برکن ہیڈ سے دیگر سب میرینوں کا عملہ اور افسران موجود تھے...... کل 101 افراد موجود تھے۔ لیورپول سے کیٹرنگ کے دو افراد دوپہر کا کھانا فراہم کرنے کے لئے موجود تھے۔ سب لوگ مطمئن تھے...... بین الاقوامی افق پر جنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ جلد ہی "تھیٹس" نے ایک اہم کردار ادا کرنا تھا۔

"تھیٹس" مغرب کی جانب رواں دواں تھی...... اس میں موجود تمام افراد کو شاندار کھانا مہیا کیا گیا تھا اور مابعد ایک شخص یہ یاد کرکے انتہائی خوشی سے دوچار ہو رہا تھا کہ اسے بیئر کی ایک فاضل بوتل سے بھی نوازا گیا تھا۔ اس دوران دوپہر کا ڈیڑھ بج چکا تھا اور "تھیٹس" اپنی غوطہ خوری کی پوزیشنیں اختیار کر چکی تھی۔ وہ لیورپول سے 38 میل اور 15 میل شمال سے مغرب کی جانب تھی۔ نوجوان کیپٹن بولس نے اعلان کا تھا کہ جو فرد بھی اس سب میرین سے اترنا چاہتا تھا اس کو اتارا جاسکتا تھا۔

تقریباً 30 افراد نے اترنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ لیکن بقایا افراد بشمول کیٹرنگ عملہ...... انہوں نے سب میرین پر ہی سوار رہنے کو ترجیح دی تھی۔ یہ ایک حیران کن امر تھا لیکن بہت سے مہمان ان ٹیسٹوں وغیرہ کو جانتے تھے جن کے مراحل سے یہ آبدوز بخوبی گزر چکی تھی اور یہ ناممکن دکھائی دیتا تھا کہ کوئی بھی غلط بات منظر عام پر آسکتی تھی۔ یہ کشتی غوطہ زن بھی ہوسکتی تھی اور جب ضرورت محسوس ہوا سے سطح آب پر بھی لانا ممکن تھا۔ ایک سب میرین میں اس کی غوطہ خوری اور سطح آب پر نمودار ہونے کا عمل بلاسٹ ٹینکوں کا مرہون منت ہوتا ہے جو والوز کے ذریعے سمندر کے پانی سے بھرے جاسکتے ہیں اور کمپرسیڈ ایئر کی وساطت سے دوبارہ خالی کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن مہارت کی کارکردگی کشتی کی لوچ اور لچک کی مرہون منت ہوتی ہے (ٹھوس اجسام کو پانی میں ڈالنے سے...... بحال رکھنے یا ابھارنے کی صلاحیت)...... اگر کشتی بہت بھاری ہو تب اس کے وزن میں تخفیف کرنی درکار ہوتی ہے...... اگر یہ بہت ہلکی ہو تب پگ آئرن کی وساطت سے اس کا وزن بڑھانا درکار ہوتا ہے۔ "تھیٹس" کی اس نکتہ نگاہ کے تحت بھی پڑتال کی گئی تھی اور وہ موزوں حالت میں تھی۔

اس کے ڈیزائن میں کوئی خاص جدت نہیں پائی جاتی تھی۔ یہ ایک عام مقصد کی حامل کشتی تھی جو سابقہ کشتیوں سے بڑی تھی۔ اس کی رینج

8,000 میل تھی۔ سطح آب پر اس کی زیادہ سے زیادہ رفتار 16 ناٹ اور زیر آب اس کی زیادہ سے زیادہ رفتار 9 ناٹ تھی۔ اس کی لمبائی 270 فٹ تھی۔ اس میں 4 انچ کی ایک توپ نصب تھی اور 10 اکیس انچ تارپیڈو کی ٹیوبیں بھی نصب تھیں۔ اس کا ڈیزائن اس نکتہ نظر کے تحت سرانجام دیا گیا تھا کہ اس کا آپریشن آسان تر ہو اور اس کی کارکردگی قابل اعتماد ہو۔

لہٰذا دوپہر دو بجے تک یہ سب میرین اعتماد پر پوری اترتی رہی۔ کیپٹن بولس نے کنٹرول روم کا رخ کیا تاکہ اس کو غوطہ زن کر سکے لیکن وہ حصول مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس نے ضروری دیکھ بھال سرانجام دینے کے بعد حصول مقصد کی کوشش سرانجام دی۔ اس مرتبہ ''تھیٹس'' ایک بطخ کی مانند پانی پر بیٹھ گئی۔ لہٰذا اس کے ہائیڈروپلینز کو غوطہ زنی کے ایک وسیع زاویے کے ہمراہ زیادہ اسپیڈ فراہم کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیس فٹ پانی کے اندر چلی آئی اور وہاں پر جا ٹکرائی۔ اس کے کوننگ ٹاور پانی کے سطح سے اوپر تھے۔

صاف ظاہر تھا کہ سب میرین بہت ہلکی تھی۔ اس کے تمام ٹینک بھرے ہوئے تھے۔ فرسٹ لیفٹیننٹ نے وزن برابر کرنے والی سٹیٹ منٹ کو دیکھا اور اسے معلوم ہوا کہ ٹیوب نمبر پانچ اور چھ بھی پانی سے لبریز تھیں۔ لیکن ایسا کیوں ممکن ہوا تھا؟ اس دوران تارپیڈو افسر بھی اپنے آپ سے یہی سوال پوچھ رہا تھا۔ وہ بھی اس سٹیٹ منٹ کو دیکھ چکا تھا اور جب کشتی نے مناسب طور پر غوطہ زن ہونے سے انکار کر دیا تھا تو اس نے ٹیوبوں کا معائنہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ چھ تارپیڈو ٹیوبیں دو عمودی قطاروں میں نصب تھیں اور ان کے نمبر دو۔ چار۔ چھ اور ایک۔ تین۔ پانچ تھے۔ نمبر پانچ اور چھ قطاروں کی تہہ پر نصب تھیں۔ ہر ایک تارپیڈو ٹیوب ایک بُو۔ کیپ کی حامل تھی جسے جب کھولا جاتا تو وہ تارپیڈو کو سمندر میں داخل ہونے کی اجازت فراہم کرتی اور عقبی دروازہ ہمیشہ بند رہتا تھا۔ اسے اس وقت کھولا جاتا تھا جبکہ کوئی ٹیوب لوڈ کی جا رہی ہوتی یا صاف کی جا رہی ہوتی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ دونوں دروازوں کو بیک وقت کھولنے سے سانحہ رونما ہو سکتا تھا۔

ووڈز نے پہلے یہ پڑتال کرنا چاہی کہ کیا ٹیوب نمبر پانچ اور چھ میں پانی موجود تھا۔ یہ پڑتال ایک سٹیٹ۔ کاک کے ذریعے ممکن تھی جو عقبی دروازوں پر نصب تھا۔ اس نے لیور کو ٹیوب نمبر چھ کی جانب حرکت دی اور ایک قلیل مقدار میں پانی باہر نکلا جس کا مطلب یہ تھا کہ ٹیوب نصف بھری ہوئی تھی۔ تب وہ ٹیوب نمبر پانچ کی جانب متوجہ ہوا اور لیور گھمایا...... اس میں سے پانی بالکل بھی برآمد نہ ہوا۔

ووڈز نے فرسٹ لیفٹیننٹ کو رپورٹ پیش کی اور یہ فیصلہ ہوا کہ یہ ایک لازمی امر تھا کہ دونوں ٹیوبوں کو پانی سے بھرا جائے۔ جب ووڈز تارپیڈو کی جگہ پر واپس پہنچا اور یکدم اس کے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ تمام تر چھ ٹیوبوں کی صورت حال کی پڑتال سرانجام دینی چاہیے۔ شاید اس کے ذہن میں یہ خیال سمایا تھا کہ چونکہ کشتی بہت زیادہ ہلکی تھی لہٰذا یہ ضروری امر تھا کہ تمام ٹیوبوں کو پانی سے بھرا جائے۔ اس نے یہ بھی فیصلہ کیا...... اور اس فیصلے کا جواز کیا تھا اس کا انکشاف نہ ہو سکا...... کہ عقبی دروازے بھی کھول دیے جائیں اور ان کا بھی معائنہ سرانجام دیا جائے۔ اسے سب سے پہلے یہ یقین دہانی حاصل کرنی تھی کہ بو۔ کیپ بند تھیں۔ ان کی صورت حال کا مشاہدہ انڈیکٹر ڈائیلوں کے اس تسلسل سے کیا جا سکتا تھا جو ٹیوبوں کے اوپر اور قریب نصب تھے۔ لیکن ان ڈائیلوں کو پڑھنا مشکل تھا۔ ان پر ترتیب وار نمبر درج نہ تھے بلکہ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ چھ۔ پانچ نمبر درج تھے۔ پانچ نمبر تہہ پر تھا اور ایک افقی بار کے پیچھے چھپا ہوا تھا جو اس کے پار گزرتی تھی۔ اس کے علاوہ بند ہونے کی صورت حال ڈائیلوں پر مختلف مقامات پر دکھائی

گئی تھی۔ مثال کے طور پر نمبر ایک یہ گیارہ بجے بند ہوا تھا اور نمبر پانچ پر یہ ڈرامائی طور پر مخالف صورت حال کا شکار تھا یعنی پانچ بجے بند ہوا تھا۔

ووڈز نے ڈائیلوں کا معائنہ سرانجام دیا اور ان مشکلات کے باوجود اس نے اطمینان محسوس کیا کہ تمام تر ڈائل بند تھے۔ اس کے بعد اس نے ٹیسٹ کاکز کا معائنہ سرانجام دیا اور نمبر ایک سے اس معائنے کا آغاز کیا۔ وہاں پر ہوا کی معمولی سی ''سی سی'' کی آواز موجود تھی۔ اس نے عقبی دروازہ کھولا اور جیسا کہ اسے امید تھی ٹیوب خشک ثابت ہوئی اور یہی کارکردگی ٹیوب نمبر دو۔ تین اور چار کے ساتھ سرانجام دی گئی اور اس کا بھی یہی نتیجہ سامنے آیا۔ اب ووڈز کے ذہن میں اس امر کے بارے میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہا تھا کہ ٹیوب نمبر پانچ بھی خالی تھی۔ اس نے دوبارہ ٹیسٹ، کاک پر پنجہ آزمائی کی لیکن کچھ بھی وقوع پذیر نہ ہوا۔ اس کے ساتھی نے عقبی دروازے کو فعال کرنے والے لیور کی جانب بڑھنا شروع کیا۔ یہ دیگر لیوروں کے مقابلے میں سخت واقع ہوا تھا لیکن زیادہ قوت استعمال کرنے کی بدولت اس نے آہستہ آہستہ حرکت کرنی شروع کر دی۔ لہٰذا ''تھیٹس'' کا مقدر داؤ پر لگا ہوا تھا۔ ٹیوب نمبر پانچ کو سمندر کی جانب کھول دیا گیا۔ ٹو۔ کیپ کھلی تھی۔ کچھ ماہ بعد اس سب میرین کے ملبے کے معائنے کے دوران یہ انکشاف ہوا تھا کہ ٹسٹ۔ کاک بیکار ہو چکا تھا کیونکہ اس کے چھوٹے سوراخوں میں سے ایک سوراخ اس رنگ روغن کی وجہ سے بند ہو چکا تھا جو دروازے کی اندرونی جانب کیا گیا تھا۔ اس وقت ٹیوب نمبر پانچ کا انڈیکیٹر بھی بند پایا گیا تھا۔

دروازے کا لیور آہستگی کے ساتھ حرکت میں آ چکا تھا۔ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ سانحہ پیش آنے والا تھا۔

''گریبی کاک'' جو کہ تقریباً آدھ میل کی دوری پر کھڑی تھی...... اس نے ''تھیٹس'' کو انتہائی سرعت کے ساتھ غوطہ زن ہوتے دیکھا تھا۔ اس قسم کی غوطہ زنی کوئی بھی دیکھنا پسند نہ کرتا تھا۔ لیکن ابھی الارم کے لئے کوئی جواز نظر نہ آ رہا تھا حتیٰ کہ دو گھنٹے بیت گئے اور ''تھیٹس'' ہنوز سطح آب پر نمودار نہ ہوئی تھی۔ لہٰذا ''گریبی کاک'' نے پورٹ ماؤتھ میں پانچویں سب میرین کے ہیڈ کوارٹر کو سگنل روانہ کیا کہ:۔

''تھیٹس'' کی غوطہ زنی کا دورانیہ کتنا تھا؟''

کسی نہ کسی وجہ کی بنا پر یہ پیغام شام چھ بجکر پندرہ منٹ تک اپنے مطلوبہ مقام تک نہ پہنچ سکا۔ لیکن اس وقت سے ہیڈ کوارٹر آدھ گھنٹے سے زائد عرصہ پیشتر سے اس سب میرین سے وائرلیس کے ذریعے رابطہ قائم کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اس پیغام کے موصول ہونے کے بعد فوری آپریشن کا آغاز ہوا۔ ''آپریشن سب شمیش'' (سب میرین کے تباہ ہونے کا آپریشن) کے احکامات جاری کر دیے گئے۔ فوری فضائی اور بحری تلاش کا آغاز ہوا لیکن بے سود...... اس روز کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

لیکن اگلی صبح ''تھیٹس'' کو ڈھونڈنا مشکل ثابت نہ ہوا۔ صبح سات بجکر پچاس منٹ پر تباہ کن جہاز ''برازن'' نے اس مقام سے شمال، مشرق کی جانب پانی میں کوئی شے دیکھی جہاں پر ''گریبی کاک'' کھڑی تھی اور ''تھیٹس'' دریافت ہو چکی تھی۔ لیکن اس کی دریافت صدمے کا باعث ثابت ہوئی تھی۔ یہ فرض کیا جا رہا تھا کہ اس میں موجود افراد ہنوز زندہ تھے۔

اس دوران جب پچھلے روز تین بجے بعد از دوپہر ''تھیٹس'' میں پانی بھر چکا تھا اس کو سطح سمندر پر لانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ووڈز اور اس کے ساتھی تارپیڈو کے مقام سے باہر چلے آئے تھے کیونکہ اس مقام پر پانی کی سطح تیزی کے ساتھ بلند ہو رہی تھی۔ ووڈز نے پہلے یہ سوچا کہ ٹیوب نمبر پانچ

ٹوٹ چکی تھی۔ کافی دیر بعد اسے یہ احساس ہوا کہ بو۔ کیپ شاید کھلی تھی وگرنہ وہ اسے بند کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاتا۔ جب سطح آب تک پہنچنے کی تمام تر کوششوں کے باوجود سب میرین نیچے ہی نیچے دھنستی چلی گئی تب بہت سے افراد نے مل کر یہ کوشش کی کہ واٹر ٹائٹ دروازہ بند کر دیں۔ انہوں نے پانی کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے خلاف دروازہ بند کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن وہ ناکام رہے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اس مقام کو چھوڑ دیں اور اسے سیل کر دیں وگرنہ سمندر کا نمکین پانی بیٹریوں تک جا پہنچتا اور کلورین گیس پیدا ہو جاتی جو چند لمحوں کے اندر اندر سب لوگوں کو ہلاک کر کے رکھ دیتی۔ وہ دوسرے واٹر ٹائٹ دروازے کی جانب بھاگے اور انہوں نے اسے بند کرنے کی کوشش کی۔

اب 103 افراد اس مقام پر موجود تھے اور جلد ہی ''تھیٹس'' 160 فٹ گہرائی تک جا پہنچی تھی اور مٹی میں جا دھنسی تھی۔ پانی سے بھرے کمپارٹمنٹوں سے بلو۔ کیپ بند کئے بغیر پانی نکالنا ممکن نہ تھا اور یہ امر ناممکن ثابت ہوا تھا اور امداد پہنچنے تک لوگوں کا زندہ رہنا بھی ایک معجزہ دکھائی دیتا تھا۔ اگر اگلے روز یعنی 2 جون کو تین بجے بعد از دوپہر ان کے سطح آب پر پہنچنے کا بندوبست ہو جاتا تب ان لوگوں کا زندہ بچنا ممکن تھا۔

امدادی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ 97 افراد لقمہ اجل بن چکے تھے جبکہ باقی افراد کو بچا لیا گیا تھا۔

بعد میں ''تھیٹس'' کا ملبہ بھی سمندر سے نکال لیا گیا تھا۔

''نیوی یہاں ہے!''

کوساک اور الٹ مارک

دوسری جنگ عظیم کے ابتدائی مہینوں کے دوران...... عجیب وغریب ''نقلی/جعلی جنگ'' جو جلد ہی تبدیل ہو کر ایک حقیقی جنگ کا روپ اختیار کر گئی تھی...... برطانوی لوگوں کو دو بحری فتوحات نصیب ہوئیں جس نے برطانوی مردوں اور عورتوں کو یہ باور کروایا کہ جرمن برطانیہ کو سمندر میں چیلنج نہ کر سکتے تھے۔ برطانیہ اب بھی ایک عظیم بحری قوت تھی۔

یہ دونوں فتوحات ایک دوسرے سے باہم منسلک تھیں۔ الائیڈ مرچنٹ شپنگ کا ''گراف سپی'' نامی جہاز تین برطانوی گشتی جنگی جہازوں کے ہتھے چڑھ گیا اور بری طرح تباہی سے ہمکنار ہوا۔ اس کے کپتان نے اس کے پیندے میں سوراخ کر دیا تاکہ جہاز ڈوب جائے اور بذات خود بھی خودکشی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ دو ماہ بعد ''سپی'' کا سپلائی جہاز ''الٹ مارک'' جو تقریباً تین سو برطانوی جنگی قیدی لے جا رہا تھا ڈرامائی انداز میں جنگی جہاز کے ہتھے چڑھ گیا اور جنگی قیدیوں کو آزاد کروا لیا گیا۔ ''گراف سپی'' کے خلاف کارروائی جو دسمبر 1939ء کے وسط میں سرانجام دی گئی اس کی ڈرامائی داستان اکثر سنائی جاتی تھی۔ لیکن یہاں پر ہم ''سپی'' کے ساتھ ''الٹ مارک'' کا ذکر کریں گے۔

6 اگست 1939ء کو ''الٹ مارک'' انگلش چینل کے ذریعے مغرب کی جانب بڑھا ''سپی'' بھی اسی راستے سے گزرا تھا۔ اس امر کا بھی انکشاف ہوا کہ ''سپی'' کا بنیادی مقصد ہر ممکن ذرائع سے دشمن کے تجارتی جہازوں کو تباہی سے ہمکنار کرنا تھا۔ ''الٹ مارک'' نے بطور ''تیرتی ہوئی سپلائی بیس'' اس کا پیچھا کرنا تھا اور اسے نہ صرف ایندھن فراہم کرنا تھا بلکہ اسلحہ...... اسٹور اور راشن بھی فراہم کرنا تھا۔

چند دنوں کے بعد ''سپی'' نے اپنی پہلی کارروائی سرانجام دی۔ یہ کارروائی غیر مسلح تجارتی بحری جہازوں کے خلاف تھی۔ اس کا پہلا شکار برطانوی ''ایس۔ ایس کلیمنٹ'' تھا...... اس کا وزن 5,050 ٹن تھا...... یہ ایک ٹینکر تھا جو نیویارک تا کیپ ٹاؤن پیرافین لے جا رہا تھا۔ مزاحمت فضول تھی۔ لہٰذا کپتان ہیرس نے عملے کو کشتیاں سنبھالنے کا حکم دے دیا۔

جہاز پر قبضہ کر لیا گیا۔ دونوں افسران کپتان ہیرس اور مرچنٹ سروس آفیسر کو ''سپی'' نامی جہاز پر منتقل کر دیا گیا۔

خالی ''کلیمنٹ'' کو توپ کے فائر سے اڑا دیا گیا اور ''سپی'' جس پر دو برطانوی جنگی قیدی بھی سوار تھے وہ مزید شکار کی تلاش میں نکل گیا۔

''سپی'' کا کپتان لینگزڈورف چاہتا تھا کہ اس کے ہمراہ جتنے کم جنگی قیدی ہوں اتنا ہی بہتر ہے بلکہ وہ کسی بھی جنگی قیدی کو اپنے ہمراہ رکھنے کو ترجیح نہیں دیتا تھا۔ اس نے ایک یونانی جہاز کو گن پوائنٹ پر روک لیا تھا اور اسے مجبور کیا کہ اس کے دو انگریزوں کو یورپ لے جائے۔

''کلیمنٹ'' کے بعد مزید جہاز ڈوبے گئے...... ''نیوٹن بیچ''......

''ایش لی''......''ہنٹز مین''......''ٹری وینیٹسن''......''افریقہ شل''......''ڈورک اسٹار''......''ٹارو''اور''سٹیرن شال''......برطانوی تجارتی بحریہ کے کل 50,000 ٹن سے زائد جہاز ڈبو دیے گئے۔لینگز ڈروف کا خیال تھا کہ ان میں سے کچھ جہاز جرمن لے جائے لیکن اسے جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ ایندھن ناکافی ہوگا۔''ہنٹر مین'' کے ڈبونے تک کپتان لینگز ڈروف کے جہاز پر 150 جنگی قیدی موجود تھے اور ان کو اس نے مابعد ''الٹ مارک'' کے حوالے کر دیا تھا۔

سپلائی جہاز کا کپتان ڈوان قیدیوں کو لینے پر آمادہ نہ تھا لیکن بالآخر اس نے یہ قیدی اپنے جہاز پر سوار کر لیے۔خوراک کی کمی تھی۔قیدیوں کو نہ تو بہتر ہوا میسر آرہی تھی اور نہ ہی خوراک میسر آرہی تھی۔

قیدیوں کی تعداد 299 تک پہنچ چکی تھی......اور تب''سپی''ڈوب گیا......اس کے اپنے عملے نے اسے ڈبو دیا تھا۔''الٹ مارک''کو واپس پلٹنے کے احکامات جاری کر دیے گئے تھے۔

جس دوران کپتان ڈو پیغام موصول کر رہا تھا اس وقت ایک اور پیغام بھی روانہ کیا جا رہا تھا۔جنگی قیدیوں میں سے ایک جنگی قیدی آہستہ آہستہ اور محتاط انداز سے کاغذ کے ایک بڑے ٹکڑے پر تحریر کر رہا تھا جبکہ اس کے ساتھی نیم تاریکی میں اس کے پاس بیٹھے تھے۔

''ایس او ایس''......ہم برطانوی جہازوں کے تین صد افراد......جن کے جہازوں کو''گراف سپی''نے ڈبو دیا تھا......اب ہم ''گراف سپی''کے سپلائی جہاز''الٹ مارک''پر موجود ہیں۔''

اس پیغام کو احتیاط کے ساتھ تہہ کیا گیا۔اس کو لپیٹا گیا اور سگریٹ کے ڈبے میں رکھا گیا اور جہاز سے باہر پھینک دیا گیا۔لیکن اس حرکت کو دیکھ لیا گیا تھا لہٰذا''الٹ مارک''رک گیا۔اس ڈبے کو پانی سے باہر نکالا گیا جس میں پیغام محفوظ تھا۔کپتان ڈو غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔

''الٹ مارک''اب شمال کی جانب عازم سفر تھا۔

1939ء کا کرسمس آیا اور گزر گیا اور قیدیوں نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ڈو نے قیدیوں کو بتایا کہ برطانیہ کو بتا دیا گیا تھا کہ اس کے قیدی محفوظ تھے۔

انہوں نے خط استوا عبور کر لیا تھا اور درجہ حرارت گرنا شروع ہو گیا تھا۔جلد ہی''الٹ مارک''کا قیدیوں سے بھرا ہوا دوزخ برف کا ایک صندوق بن چکا تھا۔

اور برطانیہ میں بحریہ تیار تھی۔اگرچہ سگریٹ کا ڈبہ اپنا پیغام پہنچانے میں ناکام رہا تھا لیکن وہی معلومات اور اطلاعات دیگر ذرائع سے حاصل کی جا چکی تھیں۔

13 فروری کو جبکہ''الٹ مارک''ناروے پہنچ رہا تھا تباہ کن جہاز''کوساک''جس کا کپتان فلپ وین تھا......اس کو یہ احکامات موصول ہوئے کہ وہ ڈنمارک کے شمال کا رخ کرے۔لہٰذا''کوساک''مشرق کی جانب روانہ ہوا۔

اس دوران''الٹ مارک''بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ناروے جیسے غیر جانبدار ملک کے پانیوں میں داخل ہو چکا تھا۔اس پر جنگی قیدی بھی سوار تھے۔ناروے کی ایک کشتی نے اسے روک لیا تھا۔جب قیدیوں نے جہاز پر کسی کو چڑھتے دیکھا تو انہوں نے شور مچایا اور

دروازوں کو پیٹنا شروع کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد اہل ناروے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ انہوں نے قیدیوں کی آواز نہیں سنی اپنے جہاز پر واپس چلے گئے۔

اس رات ایک اور نوٹس جاری کیا گیا کہ:۔

''فروری 15......قیدیوں کے آج کے عمل درآمد کی پاداش میں انہیں کل ڈبل روٹی اور پانی ملے گا۔''

شمالی سمندر میں ''کوساک'' کپتان وین نے احکامات وصول کئے کہ:۔

''الٹ مارک'' کو تلاش کرو۔''

لیکن کہاں؟

لیکن 15 فروری کی شام ایک مخبر نے برگن میں اطلاع دی کہ ''الٹ مارک'' دوپہر کو یہاں سے گزرا تھا۔ چند منٹ بعد بذریعہ لندن کپتان وین کو یہ اطلاع بہم پہنچا دی گئی۔

اگلی دوپہر ایک بجے زیادہ درست اطلاع موصول ہوئی......ساحلی کمانڈ دو علیحدہ علیحدہ ہڈسن ائر کرافٹ نے اس بحری جہاز کو دیکھنے کی خبر دی۔

تھوڑی دیر بعد جرمن جہاز نظر آ چکا تھا اور ''کوساک'' نے اس کی جانب بڑھنا شروع کر دیا تھا۔

کپتان وین نے ناروے کے پانیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کا پیچھا جاری رکھا۔

چار بجکر دس منٹ بعد ناروے کو یہ پیغام دیا گیا کہ تمام تر برطانوی قیدی واپس کر دیے جائیں۔ واپس جواب موصول ہوا کہ برگن کے مقام پر جرمنی جہاز کی تلاشی لی گئی تھی اور جہاز پر کوئی قیدی نہ پایا گیا تھا۔

رات دس بجے 30 افراد کو کارروائی کے لئے تیار کیا گیا اور رات گیارہ بجے ''کوساک'' اپنے ہدف کی جانب بڑھا۔

چند منٹوں میں کارروائی مکمل ہو چکی تھی۔ قیدی اس تمام تر کارروائی سے بے خبر تھے۔ وہ تقریباً ساؤنڈ پروف کمرے میں بند تھے۔

تب اچانک ایک آواز گونجی کہ:۔

''کیا کوئی انگریز نیچے موجود ہے؟''

تین صد آوازیں بیک وقت ابھریں کہ:۔

''ہاں!''

جواب میں پھر وہی آواز ابھری کہ:۔

''تب اوپر آ جاؤ......نیوی یہاں ہے''

جلد ہی ''کوساک'' تین صد قیدیوں کے ہمراہ محو سفر تھا۔

......❀......

گلیڈس آلوارڈ اپنے بچوں کو محفوظ مقام تک پہنچانے میں کامیاب ہوگئی

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ایک خندق میں پڑی ہو...... وہ غصے سے کانپ رہی تھی۔ وہ وہاں پر لیٹی رہی اور اپنے اوورکوٹ پر گولیاں برستی ہوئی دیکھتی رہی...... وہ اوورکوٹ جو اس سے دس فٹ دور پڑا تھا۔ اس نے اپنا اوورکوٹ اتار کر دور پھینک دیا تھا اور بذات خود اس خندق میں پڑی تھی جبکہ جاپانی اس کے اوورکوٹ پر فائرنگ کر رہے تھے۔

وہ تقریباً ایک منٹ تک اس کے اوورکوٹ پر فائرنگ کرتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی رائفلیں سنبھالیں اور جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ انہوں نے اتنی زحمت بھی نہ کی کہ نزدیک آ کر دیکھتے۔ اس نے ان کی باتیں کرنے کی آوازیں سنیں جواب دور سے آ رہی تھیں۔ بالآخر آہستہ آہستہ اور محتاط انداز سے اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا۔

وہ تن تنہا تھی...... گولیوں سے چھلنی اوورکوٹ کے سوا اس کے نزدیک کچھ نہ تھا۔

وہ سوچ رہی تھی کہ مجھے یانگ چینگ کو خیر باد کہنا ہوگا...... وہ قصبہ جس سے وہ از حد محبت کرتی تھی...... وہ قصبہ جس کو اس نے اپنی زندگی کے ڈھیروں برس دیے تھے...... اور بچوں کے ساتھ راہ فرار اختیار کرنا ہوگی...... یہاں سے بچ نکلنا ہوگا۔ یہ ایک آسان معاملہ نہ تھا...... اسے ایک سو بچوں کی ہمراہی میں بے وفا پہاڑوں سے گزرنا ہوگا۔

ایک سو لڑکے اور لڑکیاں...... ان میں سے کچھ اس قدر کم عمر کے حامل تھے کہ بخوبی چل بھی نہ سکتے تھے...... ایک سو میل کا فاصلہ طے کرنا تھا اور وہ بھی پیدل طے کرنا تھا۔

اگر وہ اس مسئلے پر زیادہ غور کرتی تو گلیڈس الوارڈ کبھی بھی اپنے منصوبے پر عمل درآمد نہ کر سکتی تھی کیونکہ آخری لمحات میں جب بچوں کو اکٹھا کر چکی تھی اور راشن کا بندوبست بھی کر چکی تھی...... اس نے تمام تر ممکنہ روٹ پر نظر دوڑائی تھی اور اکثر لوگوں نے اسے یہ باور کروایا تھا کہ یہ امر کس قدر ناممکن تھا۔ لیکن اس کے پاس لوگوں کی باتیں سننے کیلئے وقت نہ تھا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی۔ اس نے جدید دور کا ناقابل یقین سفر طے کیا اور اپنے ہر ایک بچے کو تحفظ عطا کیا۔

گلیڈن الوارڈ کی بچ نکلنے کی داستان...... اپنے ایک سو چینی بچوں کے ہمراہ بچ نکلنے کی داستان جن کی عمریں چار اور پندرہ برس کے درمیان تھیں...... ایک عظیم کارنامہ تھا جو کہ ایک طویل مہم دکھائی دیتا تھا۔ وہ چین میں ایک مشنری بننا چاہتی تھی۔ وہ لندن میں چائنہ ان لینڈ مشن جا پہنچی تھی۔

انہوں نے نرمی کے ساتھ اس سے دریافت کیا کہ:۔

''وہ کیا وجہ تھی جس کی بنا پر وہ چین جانے کا سوچ رہی تھی؟''

اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کیا وجہ تھی جو اسے چین جانے پر اکسارہی تھی لیکن اسے چین جانا تھا اور ضرور جانا تھا۔

انہوں نے اسے آزمائشی طور پر اپنے ساتھ رکھ لیا تا کہ وہ اپنی ذمہ داری سرانجام دے سکے......لیکن اس کی کارکردگی بہتر نہ تھی۔ انہوں نے اعتراض کیا کہ اس کا دین کے بارے میں علم نہ ہونے کے برابر تھا اور انہیں امید نہ تھی کہ وہ چین جا کر اہل چین کو عیسائیت کی جانب راغب کر سکے گی۔

لہٰذا وہ وہاں سے چلی آئی......کچھ ہی دیر کے بعد وہ ڈوک اینڈ آف ویلز میں مشن کا کام سرانجام دے رہی تھی۔ یہاں پر وہ اطمینان بخش طریقے سے اپنی ذمہ داری نبھا رہی تھی......وہ ان لوگوں اور بچوں کی دیکھ بھال کرتی تھی جو مدد اور تعاون کی ضرورت درکار رکھتے تھے۔لیکن وہ اب بھی وہ سب کچھ سرانجام نہ دے پا رہی تھی جو کچھ اس نے اپنی زندگی میں سرانجام دینے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔اس کی عمر محض 26 برس تھی۔اس کے پاس ابھی کافی وقت موجود تھا اور یہ مشن کا کام اگرچہ یہ ایک عظیم کام تھا لیکن اس سے کسی قسم کی آمدن کی توقع نہ تھی۔ اگر وہ چین جانا چاہتی تھی......ان لینڈ مشن پہلے ہی اسے اس سلسلے میں مسترد کر چکا تھا......تب گلیڈس آلوارڈ کو چین جانے کیلئے کرایے کی رقم کا بندوبست کرنا تھا۔

وہ دوبارہ اندرون ملک خدمات کی سرانجام دہی میں مصروف ہوگئی۔

جلد ہی وہ ے مارکیٹ میں واقع ایک ٹریول ایجنسی کے دفتر جا پہنچی اور کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے شخص کو تین پونڈ ادا کرتے ہوئے کہنے لگی کہ اس رقم کو اس کے چین کے ٹکٹ کے لئے جمع کر لیا جائے...... 47 پونڈ میں سے محض تین پونڈ......اس شخص نے اسے سمجھانے کی کوشش کی......دیگر پہلوؤں سے قطع نظر......چین اور روس کے درمیان غیر اعلانیہ جنگ جاری تھی اور اس کا سفر کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔لیکن گلیڈس نے جواب دیا کہ اس سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا کیونکہ اس کے بقایا رقم جمع کرنے تک جنگ اپنے اختتام کو پہنچ چکی ہوگی۔

وقت گزرتا گیا......کئی ماہ گزر چکے تھے......وہ رقم پس انداز کر چکی تھی۔اسے چین میں کام کرنے کی پیش کش بھی ہوئی تھی۔ اگر وہ تائی سین پہنچ جاتی تو اسے پہاڑیوں میں قائم مشن اسٹیشن روانہ کیا جا سکتا جہاں پر اسے بوڑھے جینی لاسن کی معاونت سرانجام دینی تھی اور اس کے مشن کے دوستوں نے جینی لاسن کی معانت سرانجام دینی تھی اور اس کے مشن کے دوستوں نے جینی لاسن کو اس کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔

لہٰذا 18 اکتوبر 1930ء بروز ہفتہ گاڑی میں سوار ہوئی جو اسے نئی زندگی کی جانب لے جا رہی تھی۔اس کے پرس میں 90 پنیس تھے۔اس کے علاوہ ٹریولر چیک کی صورت میں دو پونڈ تھے۔

یہ سفر کسی مہم سے کم نہ تھا۔لیکن ہم یہاں اس مہم کو بیان نہیں کریں گے۔ بہر کیف وہ سفر طے کرتے ہوئے ولادی ووستاک پہنچ گئی (یہ وہ جگہ نہ تھی جہاں جانے کا اس نے پروگرام بنایا تھا) اور حیران تھی کہ اپنی منزل مقصود یعنی تائی سین تک کیسے پہنچا جائے۔اس دوران ایک مہربان جاپانی بحری کپتان اس کی مدد کیلئے آمادہ ہوگیا۔وہ ایک مہربان نوجوان تھا اور اس نے اپنے بحری جہاز میں ولادی ووستاک تا جاپان اس کے سفر کا بندوبست

کر دیا تھا اور مابعد ایک اور جاپانی بندرگاہ سے اسے ایک اور بحری جہاز میں تائی سین تک کا سفر طے کرنا تھا۔

یہ سب کچھ ایک پیچیدہ ترین خواب کی مانند تھا لیکن جلد ہی وہ تائی سین کی بندرگاہ کی جانب بڑھ رہی تھی اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ پیکنگ جانے والی گاڑی میں سوار تھی اور اس کے فوراً بعد وہ محتاط انداز میں ایک خچر پر سوار اپنے سفر کا آخری مرحلہ طے کر رہی تھی اور شمالی چین کی پہاڑیوں کی جانب گامزن تھی اور ینگ چینگ قصبے تک رسائی حاصل کرنے میں مصروف تھی۔

جینی لاسن ایک بوڑھا شخص تھا اور اس کے ساتھ وقت گزارنا ایک آسان کام نہ تھا۔ اس پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ اہل چین ان کے جوڑے کو غیر ملکی شیطان تصور کرتے تھے۔ اس نے اپنے آپ کو چینی لباس میں ملبوس کر لیا تھا لیکن اس سے کوئی فرق نہ پڑا تھا۔ چین میں اس کی زندگی کے پہلے چند ہفتے کچھ بہتر نہ گزرے تھے۔ وہ جہاں بھی جاتی اس کی توہین کی جاتی تھی۔

اسے چین آئے ایک ماہ گزر چکا تھا۔ اس کے اور جینی لاسن کے ذہن میں ایک خیال آیا کہ انہیں ایک سرائے کھولنی چاہیے تاکہ اس سرائے میں ٹھہرنے والے لوگوں کو خدا کے بارے میں بتایا جاسکے۔

پہلے پہل بہت کم لوگ سرائے کا رخ کرتے تھے لیکن جلد ہی لوگ اس سرائے کی جانب راغب ہونا شروع ہو گئے تھے کیونکہ انہیں یہاں پر اچھا کھانا ملنے کی امید ہوتی تھی...... صاف ستھرا ماحول میسر آتا تھا...... اور بائبل کی کہانیاں بھی سننے کو ملتی تھیں۔ لہٰذا وہ اس سرائے کی جانب راغب ہونے لگے تھے۔

تھوڑے ہی عرصہ بعد جینی لاس موت سے ہمکنار ہو گیا۔

ایک روز ایک مقامی چینی اہلکار نے غیر متوقع طور پر گلیڈسن کو ملاقات کی دعوت دی۔ لہٰذا وہ اس سے ملاقات کرنے کے لئے چلی آئی۔

گلیڈسن کی حیرانگی کی انتہا نہ رہی جب اس مقامی افسر نے اسے ملازمت کی پیش کش کی اور وہ اس ملازمت کو قبول کر کے مزید حیران ہوئی۔ حکومت نے نوعمر لڑکیوں کے پاؤں باندھنے کی ممانعت کر رکھی تھی۔ لیکن بہت سے والدین اس قانون کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ لہٰذا اس چینی افسر کو ایک ایسے انسپکٹر کی ضرورت درپیش تھی جو ضلع کا چکر لگائے اور لڑکیوں کے پاؤں کی پڑتال کرے۔

اس کو ''فٹ انسپکٹر'' کا عہدہ پیش کیا گیا تھا۔ وہ اس عہدے پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ اس نے اس ملازمت کو قبول کر لیا تھا۔ کیونکہ اس ملازمت کے دوران اسے سفر کے وسیع مواقع میسر آنے تھے اور دوران سفر وہ خدا کا پیغام بھی پھیلا سکتی تھی۔ وقتاً فوقتاً وہ اپنی سرائے میں بھی واپس آ سکتی تھی۔ لیکن اب اس سرائے کی نگرانی بوڑھی یانگ کے ذمہ تھی۔

اپنی معائنہ سرانجام دینے کی ملازمت کے پہلے سفر کے دوران اس کی ملاقات ایک خاتون سے ہوئی جس کی گود میں ایک برہنہ بچی تھی جسے وہ دو ڈالر کے عوض فروخت کرنا چاہتی تھی۔ وہ خوفزدہ ہو گئی...... نئی فٹ انسپکٹر اپنے آجر کے پاس چلی آئی اور اس واقعہ کی اطلاع اسے بہم پہنچائی۔

اس افسر نے اپنے کندھے اچکائے۔ اگرچہ یہ ایک افسوس ناک امر تھا لیکن یہ ایک طرز زندگی بھی تھا۔ لہٰذا وہ واپس چلی آئی۔ اس نے بچی بیچنے والی عورت کے ساتھ سودے بازی کی اور نو پنس میں اس بچی کو خرید لیا۔ یہ بچی ان پانچ بچوں میں پہلی تھی جو گلیڈس آلوارڈ نے اختیار کئے تھے

......اور اس بچی کا نام "نوپینس" رکھا گیا کیونکہ اسے نوپینس میں خرید ا گیا تھا۔

1936ء میں اسے صوبہ شانسی میں آباد چھ برس گزر چکے تھے۔ اب گلیڈس نے چین کی شہریت اختیار کر لی تھی۔ اب لوگ اس پر اعتماد کرتے تھے بلکہ اسے ایک چھوٹی سی ہیروئن ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہو چکا تھا کیونکہ اس نے باغیوں کے ایک ہنگامے پر بھی قابو پایا تھا۔ یہ کارروائی اس نے اسی چینی افسر کے کہنے پر سرانجام دی تھی جس نے اسے ملازمت مہیا کی تھی۔ وہ خوف و ہراس کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس ہجوم میں گھس گئی تھی اور اس کے شرکاء کو اس امر کی جانب راغب کیا تھا کہ وہ اپنے ہتھیار پھینک دیں اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی تھی۔ اس دن سے شانسی میں اسے "ای۔ وی۔ دی" یعنی پارسا خاتون کے نام سے پکارا جانے لگا تھا۔

جاپانیوں کیلئے وہ محض ایک "مختصر عورت" تھی۔

گلیڈس واقعی ایک مختصر عورت تھی اور جاپانیوں نے اس کی پارسائی کی بجائے اس کی اس خصوصیت کو مدنظر رکھا تھا۔ اس نے یہ خبریں بھی سنی تھیں کہ وہ اس کے ملک پر حملہ آور ہو رہے تھے......اب چین ہی اس کا ملک تھا......انگلستان اس سے کوسوں دور تھا۔

لیکن 1938ء میں جبکہ اسے چین کی شہریت اختیار کئے دو برس بیت چکے تھے......چھوٹے بمبار طیاروں نے نچلی پرواز کرتے ہوئے پہاڑیوں پر بمباری کی تھی۔ انہوں نے قصبے پر بمباری بھی کی تھی اور مشین گنوں سے فائرنگ بھی کی تھی......سینکڑوں لوگ ہلاک اور زخمی ہوئے تھے۔ گلیڈس نے اس موقع پر ایک پناہ گزین کیمپ قائم کیا تھا اور مرہم پٹی کا انتظام بھی کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے خوف و ہراس کے شکار لوگوں کو پُرسکون رہنے میں ازحد معاونت بھی سرانجام دی تھی۔

کچھ ہی عرصہ بعد جاپانی فوجی دستے بھی پہنچ چکے تھے۔ یانگ چینگ کے بہت سے رہائشی جلد بازی میں بھاگ کر پہاڑیوں پر پناہ گزین ہو گئے تھے۔ لیکن وہاں پر وہ بمباری کا نشانہ بنے۔ گلیڈس بھی باقی لوگوں کے ہمراہ قصبہ چھوڑ آئی تھی اور جب اس نے لوگوں کو ہلاک ہوتے دیکھا تب اس نے ان کو دفن کرنے کی کوشش شروع کر دیں......وہ لاشوں کو اکٹھا کرتی اور ان کو اجتماعی قبروں کے حوالے کر دیتی۔

لیکن یہ سب کچھ اسے عجیب و غریب دکھائی دیتا تھا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر تنگ آ چکی تھی کہ جاپانی لوگ......جن سے وہ مل چکی تھی اور جنہیں وہ پسند بھی کرتی تھی......کس طرح اس وحشت کا مظاہرہ کر سکتے تھے......کس طرح اس درندگی کا مظاہرہ کر سکتے تھے۔

لیکن انہوں نے درندگی کا مظاہرہ کیا......آتشزدگی...... ہلاکتیں اور آبروریزی وغیرہ......اب اس کے اختیار کردہ بچوں کی تعداد پانچ سے بڑھ کر دس تک جا پہنچی تھی......اس کے بعد یہ تعداد پچاس اور مابعد ایک سو تک جا پہنچی......یتیم پناہ گزین بچے......اگرچہ ان کو قانونی طور پر اختیار نہ دیا گیا تھا لیکن وہ اس کی زندگی کا ایک حصہ بن چکے تھے۔ جیسے تیسے وہ ان کی خوراک کا بندوبست کر لیتی تھی۔

اس نے بطور "فٹ انسپکٹر" تھوڑے ہی عرصے تک خدمات سرانجام دی تھیں۔

جاپانی دوبارہ ینگ چین آئے......ایک گشتی پارٹی کی نظر اس پر پڑی......وہ اس وقت موٹے چینی کوٹ میں ملبوس تھی......انہوں نے اس پر فائرنگ کرنا شروع کر دی۔ وہ خوفزدہ ہو گئی۔ اسی صبح ایک قاصد اس کے پاس جاپانیوں کے ایک اعلان کی نقل لے کر آیا تھا جس میں ان کو مطلوب مردوں

اور عورتوں کے نام درج تھے۔ اس اعلان میں اس فرد کے لئے ایک سو ڈالر کے انعام کا اعلان کیا گیا تھا جو گلیڈس آلوارڈ کو گرفتار کروانے میں معاون ثابت ہوتا اور اس کا ذکر بطور ''مختصر خاتون'' کیا گیا تھا۔

جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں کہ وہ جاپانیوں کی فائرنگ سے محفوظ رہی تھی۔ اس نے اپنا کوٹ اتار پھینکا تھا اور بذات خود ایک خندق میں پناہ گزین ہو گئی تھی۔ وہ اس کے کوٹ کو اپنی فائرنگ کا نشانہ بناتے رہے تھے۔ خندق میں پڑے ہوئے اس کے ذہن میں بچے گردش کر رہے تھے۔

جاپانی ان بچوں کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟

عین ممکن تھا کہ وہ اس کی گرفتاری کیلئے ان بچوں کو یرغمال بنالیں؟

تھوڑی دیر بعد وہ بچوں کے ایک ایسے گروپ کی سربراہ کے طور پر محو سفر تھی جس گروپ کے بچوں کی عمریں چار تا پندرہ برس تھیں۔ اس کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ میڈم چیانگ کائی شک پناہ گزین بچوں کے کیمپ چلا رہی تھی۔ یہ کیمپ محفوظ علاقوں میں واقع تھے اور یہ انہی کیمپوں میں سے ایک کیمپ تھا جس کا رخ اس نے بچوں کے ہمراہ کیا تھا...... یہ کیمپ سینکڑوں میل دور واقع تھا۔

بچے اس کی سرائے میں جمع ہو چکے تھے۔ وہ ہنس کھیل رہے تھے۔ محض گلیڈس الوارڈ ہی اس امر سے باخبر تھی کہ ان کی آزمائش شروع ہونے والی تھی۔ بڑی سڑک کا سفر اختیار کرتے ہوئے وہ دریائے ییلو تک پانچ روز میں پہنچ سکتے تھے...... بشرطیکہ دوران سفر کوئی بچہ بیمار نہ پڑتا...... لیکن جاپانی جہازوں اور جاپانی گشتی پارٹیوں سے بچنے کی خاطر جو اس ''مختصر خاتون'' کے تعاقب میں تھیں۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے جاپانیوں کی یلغار کو روکنے کی کوشش کی تھی (کیسے روکنے کی کوشش کی تھی...... اس کے بارے میں وہ کبھی نہ جان سکی)...... لہٰذا انہیں پہاڑی راستہ اختیار کرنا تھا۔ اس طرح انہیں پانچ روز کی بجائے چودہ روز کے سفر کے بعد دریائے ییلو تک پہنچنا تھا۔

سفر کے دوسرے ہی روز وہ مشکلات کا شکار ہو گئے۔ پہلی رات انہوں نے بدھ مت کی ایک عبادت گاہ میں گزاری جہاں پر ان کے پادریوں نے ان کا استقبال کیا۔ لیکن دوسرے دن کی صبح ان کے پاؤں سوجھ چکے تھے اور ٹانگیں درد کر رہی تھیں اور بچے مایوسی کا شکار تھے لیکن گلیڈس نے انہیں رو بہ عمل رکھا۔ دن پر دن گزرتے گئے۔ چھوٹے بچوں کو گود میں اٹھا کر سفر طے کیا جاتا رہا۔ بڑے بچے بھی اس کام میں بھی معاون ثابت ہوئے۔ وہ چھوٹے بچوں کو گود میں اٹھا کر سفر طے کرتے رہے۔ وہ ہنستے اور گاتے رہے اور پیدل چلتے رہے۔

بالآخر تھکا ماندہ قافلہ دریائے ییلو تک پہنچ چکا تھا۔ اب انہیں دریا کے پار پہنچنا تھا۔

یک دم چینی سپاہ نمودار ہوئی...... ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے اس سپاہ کو آسمان سے گرایا گیا ہو۔ وہ اس مختصر خاتون کو ایک سو بچوں کی ہمراہی میں دیکھ کر ازحد محظوظ ہوئے۔ وہ ان کو اپنی کشتیوں میں بٹھا کر دریا عبور کروانے پر رضامند ہو گئے۔

دریا کے دوسرے کنارے پر وہ ایک اور سانحہ سے دوچار ہوئے...... پولیس کے ایک سپاہی نے اس تمام تر قافلے کو گرفتار کر لیا...... کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ دریائے ییلو تمام تر ٹریفک کے لئے بند تھا...... جنگ کی وجہ سے؟

انہیں مقامی افسر کے حضور پیش کیا گیا۔

گلیڈن اس افسر کے ساتھ بحث مباحثے میں مصروف رہی اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرتی رہی حتیٰ کہ وہ بھی...... یعنی مقامی افسر...... یہی کچھ کرتا بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ جاپانی فوج اس کے تعاقب میں ہوتی...... لہٰذا مقدمہ خارج کر دیا۔

اس نے اس قافلے کو ایک ریل گاڑی میں سوار کر دیا۔ بچوں کیلئے یہ سفر کسی خوش کن مہم سے کم نہ تھا کیونکہ محض چند بچوں نے اس سے پیشتر ریل دیکھی تھی یا ریل گاڑی کا سفر طے کیا تھا۔ انہوں نے چار دن سفر میں گزارے اور تائی سین جا پہنچے۔ چونکہ پل تباہ کیا چکا تھا لہٰذا دوبارہ ڈبل مارچ کا آغاز ہوا۔ بچے گرتے پڑتے روتے دھوتے دکھتے پاؤں کے ساتھ پہاڑیوں پر سفر طے کرتے ہوئے ننگ خوان کی جانب رواں دواں تھے۔ گلیڈن با آواز بلند گانا گاتے ہوئے اور ان کو بھی اپنے ساتھ گانے میں شامل کرتے ہوئے ان کو سفر طے کرنے پر آمادہ رکھنے میں کامیاب رہی تھی۔

ان میں سے کسی کو بھی تاریخ کے بارے میں کوئی خبر نہ تھی حالانکہ اس وقت اپریل 1940ء تھی...... وہ محفوظ مقام تک پہنچ چکے تھے۔ گلیڈس جس نے بچوں کو روبہ عمل رکھا تھا وہ بخار میں مبتلا سڑک کے کنارے لڑکھڑا رہی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ خدانخواستہ موت سے ہمکنار ہونے سے پیشتر وہ بچوں کو پناہ گزین کیمپ میں پہنچا دیا۔

کسانوں نے اس مختصر خاتون کو انتہائی محبت اور مہربانی کے ساتھ اٹھایا...... اسے ایک بیل گاڑی میں لٹایا...... کچھ کسان یہ کہہ رہے تھے کہ یہ خاتون موت سے ہمکنار ہو چکی تھی۔ اسے ہسپتال لے جانے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی تھی بلکہ اسے بیل گاڑی میں سیکنڈے نیوین۔ امریکن مشن پہنچا دیا گیا تھا جو ہسنگ پیانگ میں واقع تھا اگرچہ وہاں کے ڈاکٹر نہیں جانتے تھے کہ وہ کون تھی اور کیا تھی لیکن اس کو موت کے پنجوں سے چھڑا لیا گیا تھا۔

وہ مزید دس برس تک چین میں ہی مقیم رہی تھی۔ جب کمیونسٹ اس کے اختیار کردہ محبوب وطن پر چڑھ دوڑے تب گلیڈس آلوارڈ نے انگلستان واپس جانے کا ارادہ کر لیا...... ایک ایسا ملک جو اب اس کے لئے اجنبی ہو چکا تھا۔

اس کے جانے سے لوگ غمگین تھے لیکن وہ اس کے مشکور بھی تھے۔ اسے جتنی خدمات کی سرانجام دہی کی اجازت فراہم کی گئی تھی وہ اتنی خدمات سرانجام دے چکی تھی۔ اب اس کا کام ختم ہو چکا تھا اور گلیڈس اپنی جائے پیدائش کی جانب لوٹ آئی تھی اور اس نے مذہب کی تبلیغ کا کام شروع کر دیا تھا اور لوگوں کو خدا کی راہ دکھا رہی تھی۔ اس نے اپنے اختیار کردہ ملک میں چوبیس برس کا عرصہ گزارا تھا وہ اسے مقدس تصور کرتی تھی...... وہ اسے ایک فرض تصور کرتی تھی...... وہ اسے ایک مہم تصور نہ کرتی تھی۔

لونگ رینج ڈیزرٹ گروپ (ایل۔آر۔ڈی۔جی) کی کارروائی

پہلے گرج کی آواز سنائی دی مابعد ایک شعلہ آسمان کی جانب بلند ہوا۔ گرج کے بعد مشین گن کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ پہلے خال خال راؤنڈ چلائے گئے مگر پھر پورا میگزین ہی خالی کر دیا گیا اور یکے بعد دیگرے کئی میگزین خالی کر دیے گئے۔

ایک بم چھت پر گرا تھا...... چھت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آگ بھڑک اٹھی تھی۔ چیخ و پکار کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ اس کے بعد مزید بم برسائے گئے تھے۔

اب سوچ بچار کا وقت نہ تھا۔ انہوں نے اٹلی کے ان بیس جنگی قیدیوں میں سے چار جنگی قیدیوں کا انتخاب کیا جو شکل سے ہی ذہین دکھائی دیتے تھے جن جنگی قیدیوں کو انہوں نے مشین گنوں کے زور پر بٹھا رکھا تھا۔ تب انہوں نے دیگر جنگی قیدیوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا...... ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے تھے...... انہوں نے ان کا صفایا کر دیا تھا کیونکہ ان تمام کے لئے ٹرکوں میں جگہ موجود نہ تھی۔

ٹرکوں کے انجن سٹارٹ ہوئے...... انہیں گیئر میں ڈالا گیا اور ٹرک روانہ ہو گئے۔ وہ واپس اپنے مرکز کی جانب روانہ ہوئے اور اگلی منصوبہ بندی سرانجام دینے لگے...... چند منٹوں بعد...... یا پھر چند سیکنڈوں بعد...... لونگ رینج ڈیزرٹ گروپ (ایل۔آر۔ڈی۔جی) نے لیبیا کی صحرا میں اٹلی کے اس ہیڈ کوارٹر کو غیر فعال بنا کے رکھ دیا تھا۔ انہوں نے ہوائی اڈا تباہ کر دیا تھا...... ہوائی جہاز تباہ کر دیے تھے...... اس کے کمانڈر اور کئی دیگر افراد کو ہلاک کر دیا تھا اور دیگر افراد کو جنگی قیدی بنا لیا تھا تاکہ ان سے گراں قدر معلومات حاصل کی جا سکیں۔

جلتے ہوئے مرزک کے مقام سے کچھ دور ایل۔آر۔ڈی۔جی نے اپنا گشت موقوف کیا تاکہ اپنے ہلاک شدگان کو ریت میں دفن کر سکیں۔

مرزک کے قصبے پر یہ جرأت مندانہ اور موثر حملہ جو صحرائے لیبیا کے انتہائی وسط میں واقع تھا...... پہلی کارروائی تھی جو نئے قائم کردہ "لونگ رینج ڈیزرٹ گروپ" (درحقیقت اس ابتدائی مرحلے پر یہ گروپ ابھی تک "لونگ رینج پٹرول" (ایل۔آر۔پی۔) کہلاتا تھا) نے سرانجام دی تھی۔ لیکن یہ ایک مخصوص اور حیران کن کارروائی تھی اور ہم اس پر ایک بغور نظر ڈال سکتے ہیں۔

پہلی جنگ عظیم اور دونوں جنگوں کے درمیان یہ خیال کئی مرتبہ آیا تھا کہ "لائٹ کار پٹرول" (ہلکی کاروں پر گشت) نے 1915ء اور 1917ء کے درمیان بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا...... اس نے مغربی حملے کے خلاف مصر کی سرحدوں کی حفاظت کی تھی۔ گھوڑے اپنی افادیت کھو چکے تھے کیونکہ انہیں پانی اور چارے کی ضرورت تھی اور وہ اسی صورت میں مفید ثابت ہو سکتے تھے جب ان کا استعمال ایسے علاقے میں کیا جائے جہاں پر پانی اور چارہ ان کے قریب تر واقع ہو۔ لہٰذا گاڑیوں کے اس ابتدائی دور میں یہ خیال ذہن میں سمایا کہ سپاہ کو گاڑیوں میں گشت کرایا جائے تاکہ وہ صحرا کے وسیع علاقے کا گشت سرانجام دے سکیں۔

1940ء میں صورت حال زیادہ نازک تھی۔ اٹلی اعلان جنگ کر چکا تھا اور اہل اٹلی تمام تر شمالی افریقہ پر چھائے ہوئے تھے...... ایبے سینیا اور اریٹیریا میں بھی...... برطانوی افواج کو نکال باہر کر رہے تھے۔ اگر جنرل ویول کارکردگی کا مظاہرہ نہ کرتا تو اٹلی کے جنگ میں شامل ہونے کے پہلے ہفتے کے اندر اندر برطانیہ کو تمام تر مشرق وسطیٰ سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ محض ایبے سینیا میں اٹلی کی پانچ لاکھ نفری موجود تھی...... جبکہ شمالی افریقہ میں برطانوی افواج کی تعداد 2,500 برطانوی اور 4,500 سوڈانی سپاہ پر مشتمل تھی۔ اس فوج کو ٹینک بھی دستیاب نہ تھے اور کل سات طیارے موجود تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ ایک ایسی فورس کی ضرورت درپیش تھی جو سریع الحرکت ہو اور خود راہ فرار اختیار کرتے ہوئے دشمن پر دوبارہ ضرب کاری لگاتے ہوئے اسے ورطہ حیرت میں ڈال دے کہ ان پر حملہ کرنے والا کون تھا۔ اور اس قسم کی فورس تیار کرنا اہل برطانیہ کے لئے ایک مشکل امر نہ تھا۔ جنگوں کے درمیان بہت سے انگریز...... ان میں سے بہت سے فوجی افسران تھے جو رخصت پر تھے...... لیبیا کی صحرا کی تحقیق و تفتیش کی سرانجام دہی کے لئے موجود تھے۔ 1939ء میں جنگ کا آغاز ہونے تک لاتعداد ایسے افراد موجود تھے جنہوں نے اپنی جیب سے اخراجات برداشت کرتے ہوئے بحیرہ روم تا سوڈان کے کافی علاقے کی تحقیق و تفتیش سرانجام دی تھی۔ انہوں نے متعلقہ ساز و سامان بھی بذات خود ایجاد کیا تھا...... اس تمام تر کارگزاری کے دوران میجر بیگنولڈ ایک ان تھک قوت کے حامل کے طور پر منظر عام پر آیا تھا۔ وہ دیگر لوگوں کو روبہ عمل رکھنے کے فن سے بھی بخوبی آراستہ تھا اور جوش، جذبے اور ولولے کا بھی حامل تھا۔ 1939ء میں ایک خوشگوار حادثہ بیگنولڈ کو الیگزینڈریا لے آیا تھا...... جنرل ویول نے اسے اپنی کمان میں لینے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہ کی اور بیگنولڈ نے فوری طور پر صحرا میں استعمال کرنے کیلئے ایک لونگ رینج فورس (لمبے دورانیے تک کارروائی سرانجام دینے والی فوج) کی تجویز پیش کر دی...... یہ فورس ایسی صورت میں انتہائی کارگر ثابت ہوسکتی تھی اگر اہل اٹلی اس قدر احمق واقع ہوتے کہ وہ بھی جنگ میں کود پڑتے۔

کسی نے بھی اس تجویز پر زیادہ توجہ نہ دی حتیٰ کہ جنرل ویول نے بھی اس تجویز کو قدر کی نگاہ سے نہ دیکھا حتیٰ کہ جون 1940ء آن پہنچا اور اٹلی نے جنگ میں شامل ہونے کا احمقانہ اقدام سرانجام دے ڈالا۔ اب جون تا آنیوالے دورانیہ تک کیلئے حالات مختلف صورت حال اختیار کر چکے تھے...... لہٰذا ''لونگ رینج پٹرول'' نے اپنے پہلے تربیتی کیمپ کا آغاز پانچ اگست کو کیا...... اور 27 اگست کو یہ اپنی کارروائی سرانجام دینے کیلئے تیار تھا...... صحرا کے نقشے جلد از جلد چھاپے گئے...... یہ کام مصر میں سرانجام دیا گیا اور پرائیویٹ طور پر سرانجام دیا گیا...... فورڈ کمپنی کے مقامی نمائندے کو 15- سی ڈبلیو ٹی ٹرکوں میں ضروری ترمیم کے لئے کہا گیا تاکہ مجوزہ گشت میں انہیں استعمال کیا جاسکے...... لوگ ارتھم تھیلیں تیار کی گئیں اور دیگر درکار ساز و سامان کی تیاری سرانجام دی گئی اور 27 اگست تک یہ ''ایل۔ آر۔ ڈی۔ جی'' اپنی کارروائی کے لئے تیار تھی اور اس میں شامل ہر ایک فرد ایک رضا کار کی حیثیت سے شامل تھا اور اس کا آدھا ساز و سامان ادھار خریدا گیا تھا۔

ابتدائی گشت دو کمانڈنگ افسران...... 30 جوانوں...... اور 11 ٹرکوں پر مشتمل تھے۔ اسلحے کے طور پر 11 مشین گنیں...... 4 ٹینک شکن رائفلیں...... 37 ایم ایم کی بندوقیں...... پستولیں...... رائفلیں...... گرینڈ...... ان کے پاس موجود تھے۔ جلد ہی کنٹرول سرانجام دینے کے نکتہ نظر سے گشتی پارٹی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا...... یعنی ایک کمانڈنگ افسر...... 15 جوان فی پارٹی اور ان کے سفر طے کرنے کیلئے پانچ پانچ ٹرک شامل تھے۔

ایل۔آر۔ڈی۔جی کے لئے خصوصی راشن تجویز کیا گیا تھا اور اس خصوصی راشن کی منظوری بھی عطا کر دی گئی تھی۔انہیں برطانوی فوج کے کسی بھی یونٹ سے بہتر اور زیادہ راشن مہیا کیا جاتا تھا۔

آیئے اب ہم مرزک کی کارروائی کی جانب آتے ہیں۔

مرزک...... قاہرہ کے جنوب' مغرب میں ایک ہزار میل کے فاصلے پر واقع ہے اور صحرائے لیبیا میں فیضان کا دارالخلافہ ہے۔کبھی یہ ایک عظیم شہر تھا۔لیکن 1940ء میں یہ مقام جنگی نکتہ نگاہ سے اہمیت کا حامل بن گیا تھا۔اس شہر میں اٹلی اور لیبیا کے 200 فوجی دستے موجود تھے۔چھاپہ مار کارروائی کی بدولت نہ صرف اٹلی کے مورال کو شدید نقصان پہنچ سکتا تھا بلکہ اگر قسمت یاوری کرتی تو اٹلی کے پٹرول کے ذخیرے اور اسلحے کو بھی قرار واقعی نقصان پہنچ سکتا تھا۔26 دسمبر کو ایل۔آر۔ڈی۔جی کی دو گشتی ٹیمیں ''جی'' اور ''ٹی'' قاہرہ سے روانہ ہوئیں۔یہ 76 جوانوں اور 23 گاڑیوں پر مشتمل تھیں۔

یہ پارٹی آہستہ آہستہ سفر طے کرتی رہی۔کچھ فاضل جوان اپنے ساتھ شامل کرتی رہی...... مزید راشن سمیٹتی رہی...... مزید پٹرول ذخیرہ کرتی رہی...... اور یہ تمام کارروائی وہ دوران سفر سرانجام دیتی رہی۔10 ویں روز یہ دونوں گشتی پارٹیاں علیحدہ علیحدہ ہوگئیں...... ایک پارٹی نے جنوب کا رخ کیا اور فرانسیسیوں کی ایک جماعت کو اپنے ساتھ شامل کیا جو اس لڑائی میں حصہ لینے کی متمنی تھی...... دوسری پارٹی نے اہم نقشوں کی تیاری سرانجام دینی شروع کر دی۔رات کو دونوں گشتی پارٹیاں باہم یکجا ہوگئیں اور کھلے ٹون جو ''ٹی'' کی کمان سرانجام دے رہا تھا اس نے لیفٹیننٹ کرنل ڈی۔آرنانو کو متعارف کرایا جو ایک دراز قد شخص تھا...... اس کے ہمراہ بھی آٹھ فرانسیسی تھے۔

یہ پارٹی سفر طے کرتی رہی...... دوران سفر انہیں چند خانہ بدوش عرب اپنے اونٹوں کے ہمراہ دکھائی دیے۔9 جنوری کی شام وہ اپنے ہدف سے محض 150 میل دور رہ گئے تھے۔اچانک وہ اہل اٹلی کی لاریوں کے روٹ تک جا پہنچے تھے۔ریت میں واضح طور پر اس کی نشاندہی کی گئی تھی...... اگر وہ اس روٹ کو استعمال کرتے...... ان کی گاڑیوں کے پہیوں کے نشانات جلد ہی دریافت کر لئے جاتے اور ان کا تعاقب شروع ہو جاتا۔انہوں نے اس روٹ سے گزرنا مناسب نہ سمجھا اور اس مقام سے ایک میل کے فاصلے پر رات گزارنے کیلئے خیمہ زن ہو گئے۔طلوع صبح پر انہوں نے محتاط انداز میں گاڑیاں چلانا شروع کی...... وہ پہلی گاڑی کے پہیوں کے نشانات پر اپنی گاڑی چلاتے رہے۔جب ان کی آخری گاڑی بھی گزر چکی تھی تب انہوں نے بھیڑ کی کھال کے جو کوٹ پہن رکھے تھے ان کے ساتھ گاڑیوں کے پہیوں کے نشانات مٹا دیے۔اس کے بعد وہ جتنی تیز گاڑیاں بھگا سکتے تھے انہوں نے بھگائیں۔

اگلی صبح وہ ایک ایسی سڑک پر پہنچ چکے تھے جو مرزک سے دس میل کے فاصلے پر تھی اور ایک نزدیکی ٹیلے سے وہ قصبے کا مشاہدہ سرانجام دے سکتے تھے۔وہ دوپہر کے کھانے کیلئے رکے اور اس کے بعد اپنے سفر کا آخری مرحلہ طے کرنے لگے۔کلے ٹون اپنی 15 سی ڈبلیوٹی میں رہنمائی سرانجام دے رہا تھا۔ہر ایک جوان کی انگلی ٹریگر پر تھی...... انہیں کسی مخفی مشین گن چوکی سے گولیوں کی بوچھاڑ کا خدشہ لاحق تھا...... لیکن ان کا خدشہ درست ثابت نہ ہوا۔قصبے کے نزدیک پہنچنے پر اہل لیبیا نے ان کا خیر مقدم کیا۔

وہ قلعے کے نزدیک پہنچ چکے تھے اور انہیں اٹلی کے سپاہی بخوبی دکھائی دے رہے تھے۔ اس پارٹی نے فوری طور پر اپنی کارروائی کا آغاز کر دیا۔ کلےٹون بھی سرگرم عمل تھا۔ ہیوسن اور اس کے پانچ ٹرکوں پر سوار جوانوں نے سڑک پار کا رخ کیا اور اٹلی کی سپاہ کو اپنی فائرنگ کا نشانہ بنانے لگے۔ دوسرے پانچ ٹرکوں نے دوسری جانب کا رخ کیا اور قلعے کو اپنی فائرنگ کا نشانہ بنایا۔ ڈبلیو۔ بی۔ کینیڈی شاہ جس نے اس کارروائی اور دیگر ایسی کارروائیوں کی خوبصورت انداز میں تفصیل تحریر کی تھی جن میں بھی وہ بذات خود شریک ہوا تھا وہ بروس بالنفائن کے ہمراہ تھا۔ یہ ''ٹی'' پٹرول کا دوسرا نصف حصہ تھا جس کے ذمے ہوائی اڈے کو تباہ کرنا تھا۔ کینیڈی شاہ کے بقول کہ:۔

''ہینگر (وہ جگہ جہاں جہاز کھڑے ہوتے ہیں) اب نظر نہیں آ رہا تھا...... وہ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ ایک جھونپڑی کے باہر آبائی باشندوں کا ایک گروہ براجمان تھا۔ میں نے ان میں سے ایک سوڈانی پر قابو پالیا تاکہ اس سے رہنمائی حاصل کر سکوں۔ میں نے اسے لاکر اپنے ٹرک میں پھینک دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اسے ہلاک کر دیا جائے گا۔ اس کا رنگ اس قدر زرد پڑ چکا تھا جس قدر زرد ایک سیاہ فام شخص کا پڑ سکتا تھا۔ وہ بات کرنے کے بھی قابل نہ رہا تھا اور وہ جلد ہی ڈھیر ہو گیا...... لیکن اس وقت ہمیں ہینگر نظر آ چکا تھا اور ہم اس کے محافظوں کو ہلاک کرنے کیلئے ان کی مشین گنوں کی چوکیوں کی جانب دوڑ پڑے تھے۔ بروس دو ٹرکوں کے ہمراہ پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا اور بہت سے محافظ ہتھیار ڈال چکے تھے...... انہوں نے بغیر فائرنگ کے ہی ہتھیار ڈال دیے تھے لیکن اس نے آخری محافظ تک کو ہلاک کر دیا تھا کیونکہ وہ ہنوز اپنے ہاتھ میں رائفل پکڑے ہوئے تھا۔ اس نے اس کے سر کا نشانہ لیا تھا۔''

کلےٹون اس مشین گن چوکی کی جانب بڑھ چکا تھا جو ہینگر کے نزدیک واقع تھی اور اس مشین گن نے اس کے ٹرک پر فائرنگ شروع کر دی تھی۔ بدقسمت لیفٹیننٹ کرنل او۔ اور نانو کے گلے پر اس مشین گن کی ایک گولی لگی تھی اور وہ ہلاک ہو چکا تھا۔ انہوں نے اٹلی فضائیہ کے ایک سارجنٹ کو جنگی قیدی بنا لیا تھا۔ پٹرول پارٹی نے مشین گن اور ہینگر کو اپنی فائرنگ کا نشانہ بنانا شروع کر دیا تھا اور جلد ہی اٹلی والوں نے ہینگر کی چھت پر سفید جھنڈا لہرانا شروع کر دیا تھا۔

مرنے والے اور موت کا شکار بننے والے اردگرد بکھرے پڑے تھے۔ تھوڑا آگے پٹرول پارٹی (گشتی پارٹی) نے قلعہ کو گھیر رکھا تھا اور اس کے مینار کو آگ لگا دی تھی۔ اٹلی کا جھنڈا بھی آگ کے شعلوں کی نذر ہو چکا تھا۔ جب جنگ اپنے عروج پر تھی اس وقت اٹلی کا کمانڈر اپنی بڑی گاڑی میں براجمان دوپہر کے کھانے کے لئے نکلا تھا...... ہم نہیں جانتے کہ اسے یہ علم تھا کہ نہیں کہ کیا معرکہ سرانجام دے جا رہا تھا...... لیکن فوری طور پر وہ کسی غیر معمولی صورت حال کو محسوس کرنے میں ناکام رہا تھا جبکہ گولیوں کے خول اس کے اردگرد گر رہے تھے۔ اور مشین گن کے گرجنے کی آواز کے علاوہ اس کے قلعے سے آگ کے شعلے بلند ہوتے بھی نظر آ رہے تھے۔ مشین گن کی ایک گولی کا خول اس کی کار سے جا ٹکرایا تھا۔

وہ اب تک کافی جنگی قیدی اکٹھے کر چکے تھے اور کینیڈی شاہ انہیں ان کے ہینگر میں جمع کر چکا تھا۔

بالنفائن اپنے ٹرکوں اور جنگی قیدیوں کے ہمراہ ہینگر سے دور جا چکا تھا اور ہم نے دروازے پر پٹرول چھڑک دیا تھا۔ ماچس کی ایک تیلی

دکھانے کی دیر تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہینگر آگ کے شعلوں کی مکمل لپیٹ میں تھا اور اسلحہ بھی پھٹ رہا تھا اور بم بھی پھٹ رہے تھے۔

کلے ٹون اپنی گاڑی میں چلاتا ہوا واپس پلٹا تھا وہ چلا رہا تھا کہ یہ ان کی حتمی کارروائی تھی...... اہل اٹلی قلعہ خالی کرنے سے انکاری تھے اور قلعہ بند ہو کر لڑائی کی تیاری کر رہے تھے۔ ایل۔ آر۔ ڈی۔ جی کسی طویل جنگ کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ انہیں اب غائب ہونا تھا اور بالکل اسی طرح اچانک غائب ہونا تھا جس طرح اچانک وہ کارروائی سرانجام دینے کے لئے آن پہنچے تھے...... اپنے ہدف کو کھنڈرات میں تبدیل کرنے کے بعد ان کو فوراً غائب ہونا تھا۔ ایک ماہ بعد وہ دوبارہ کارروائی کے لئے آسکتے تھے اور بچی کھچی کارروائی سرانجام دے سکتے تھے۔

آگ کے شعلے سرد پڑ رہے تھے...... فائرنگ میں بھی کمی واقع ہو رہی تھی...... فائرنگ اب اہل اٹلی کر رہے تھے...... اور اچانک گشتی پارٹی جا چکی تھی۔ پیشتر اس کے کہ اٹلی کے حکام اپنے نقصان کا تخمینہ لگاتے وہ ان سے میلوں دور پہنچ چکے تھے۔ وہ ڈلم نامی دیہات میں واقع کیمپ جا پہنچے تھے اور وائرلیس کے ذریعے اپنے کامیاب معرکے کی خبر قاہرہ میں منتظر حکام کو پہنچا رہے تھے...... جو وہاں سے ایک ہزار میل دور بیٹھے تھے۔

لونگ رینج ڈیزرٹ گروپ (ایل۔ آر۔ ڈی۔ جی) کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا اور ان کی دہشت میں بھی برابر اضافہ ہوتا رہا اور 1941ء اور 1942ء کے دوران انہوں نے دشمن پر اپنا دباؤ برقرار رکھا...... 1943ء کے پہلے نصف دورانیے کے دوران بھی انہوں نے دشمن پر اپنا دباؤ برقرار رکھا۔ اس کے بعد اتحادی افریقہ میں محوریوں کے پُر جوش تعاقب میں رہے۔ جرمنی اور اٹلی نے انتہائی سرعت کے ساتھ واپس پلٹنا شروع کر دیا تھا اور ان کا تعاقب کرنا ایل۔ آر۔ ڈی۔ جی کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کے علاوہ جنگ کا میدان پہاڑیاں اور وادیاں بن چکی تھیں جہاں پر ایل۔ آر۔ ڈی۔ جی اپنی کارروائیاں سرانجام دینے سے قاصر تھی۔ لہٰذا اس کو ختم کر دیا تھا کیونکہ ان کا کام پایہ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔

......❁......

مونٹی گناک کی کراماتی غاریں

یہ قصہ خرگوشوں کے شکار سے شروع ہوا اور ایک ایسی دریافت پر جا کر ختم ہوا جس نے دنیا بھر کے لوگوں کے تصورات میں تلاطم برپا کر دیا۔

سترہ سالہ ایک فرانسیسی لڑکا جس کا نام رویدت تھا وہ اپنے کتے روبوٹ اور چار ساتھیوں کے ہمراہ مونٹی گناک سے 12 ستمبر 1940ء کو روانہ ہوا......ان کے پاس دو بندوقیں تھیں۔ ان کو امید تھی کہ وہ چند خرگوشوں کا شکار کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ رویدت کے دو دوست مقامی لڑکے تھے اور دیگر دو دوست مقبوضہ فرانس کے پناہ گزین تھے۔

وہ ایک پہاڑی کی چوٹی پر جا پہنچے جس کا نام لیس کاکس تھا جو قصبے کے جنوب میں واقع تھی۔ کتا بھی اپنے شکار کی تلاش میں نکلا اور فر کے درخت کے ایک سوراخ کی جانب بڑھا جو کہ ان نوجوانوں کی پیدائش سے بھی پہلے کا دکھائی دیتا تھا۔ کوئی بھی اس دن کی اہمیت کے بارے میں پیشین گوئی نہیں کر سکتا تھا۔

جب لڑکے کتے کے پیچھے پہنچے اس قت ان کا کتا روبوٹ مکمل طور پر غائب ہو چکا تھا۔ انہوں نے سیٹی بجائی اور کتے کو پکارا۔ لیکن کتا دوبارہ باہر نہ آیا۔ رویدت کو اپنے پالتو کتے کی فکر ستانے لگی۔ اس نے کچھ جھاڑیاں صاف کیں۔ دیگر لڑکوں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ جھاڑیاں ہٹانے سے ایک سوراخ نمودار ہوا۔

رویدت نے دوبارہ چلاتے ہوئے اپنے کتے کو پکارا۔ جواب نہ پا کر اس نے کہا:۔

''میں نیچے جا رہا ہوں!''

لہٰذا وہ نیچے اترا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ وہ تقریباً 25 فٹ کی گہرائی میں جا گرا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک کشادہ غار میں پایا۔ اس نے چلاتے ہوئے دیگر لڑکوں کو بھی پکارا کہ وہ بھی اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے نیچے چھلانگ لگائیں......لہٰذا دوسرے لڑکے بھی اس کے پاس پہنچ چکے تھے۔

جب دیا سلائیاں جلائی گئیں تب روبوٹ بھی کسی اندرونی گیلری سے بھاگا چلا آیا اور اپنے مالک کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرنے لگا۔ لڑکوں نے مزید دیا سلائیاں جلائیں اور یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ وہاں پر جانوروں کی تصاویر (پینٹنگ) موجود تھیں۔ لیکن دیا سلائی کی روشنی اس قدر کم تھی کہ ان کا صحیح معائنہ سرانجام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا وہ غار سے باہر چلے آئے کیونکہ غار کے اندر گھٹن کا ماحول تھا اور وہ واپس دن کی روشنی اور تازہ ہوا میں چلے آئے۔

وہ خرگوشوں کا شکار بھول چکے تھے۔ انہوں نے اپنے گھروں کی راہ لی اور یہ عہد کیا کہ وہ اپنی دریافت کا راز اپنے آپ تک ہی محدود رکھیں گے جب تک وہ غار کا مکمل معائنہ نہ کر لیں......اس کی مکمل تحقیق و تفتیش سرانجام نہ دے لیں۔

اگلے روز انہوں نے ایک لالٹین کا بندوبست کیا۔اس کے علاوہ انہوں نے ایک رسے کا بھی بندوبست کیا تا کہ بہ آسانی غار میں اتر سکیں اور دوبارہ باہر نکل سکیں۔

اس مرتبہ وہ غار کی مکمل تحقیق وتفتیش سرانجام دینے میں کامیاب ہوئے۔غار کی دیواروں پر لاتعداد تصاویر بنائی گئی تھیں۔ان میں بیل...... گھوڑے......اور ہرن کی تصاویر شامل تھیں۔انہوں نے جو تصاویر دیکھیں وہ سرخ......زرد...... براؤن اور سیاہ رنگوں میں تخلیق کی گئی تھیں۔

غار میں دوبارہ چکر لگانے اور لالٹین کی روشنی کی بدولت نوجوان مہم جو دیگر چیمبروں میں بھی گھومے پھرے۔ان کی دیواریں بھی اسی طرح جانوروں کی تصاویر سے مزین تھیں۔ان جانوروں کی شناخت آسان تھی۔ان جانوروں میں گھوڑے......بیل......گائیں اور ہرن شامل تھے۔

پانچ روز تک رویدت اور اس کے دوستوں نے اس بات کو اپنے تک ہی محدود رکھا......اس کے بعد انہوں نے ایک مقامی اسکول ماسٹر کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا......اس اسکول ماسٹر کا نام ایم۔ لیون لاول تھا۔انہوں نے یہ قدم اس لئے اٹھایا تھا کہ مذکورہ اسکول ماسٹر نے اپنے شاگردوں کو پتھر کے ابتدائی دور کے بارے میں کچھ ہدایات سے نوازا تھا۔اس کے علاوہ اس نے انہیں اس دور کے آرٹ کے بارے میں بھی بتایا تھا اور اپنے طلباء کو مشہور وال پینٹنگ دکھانے کے لئے فورٹ ڈی گیم لے گیا تھا۔

اس نے لڑکوں سے جب داستان سنی تو پہلے پہل اسے بالکل یقین نہ آیا۔اس نے سوچا کہ لڑکے مذاق کر رہے تھے۔لیکن لڑکوں کی سنجیدگی دیکھ کر بالآخر وہ یہ ماننے پر تیار ہوگیا کہ لڑکے سچ بول رہے تھے اور وہ اس امر پر آمادہ ہوگیا کہ وہ ان لڑکوں کے ہمراہ ان کی دریافت دیکھنے ضرور جائے گا اور انہیں اس دریافت کے بارے میں اپنی رائے سے بھی آگاہ کرے گا۔

وہ ان کو یہ بتانے میں حق بجانب تھا کہ انہوں نے ایک شاندار دریافت کی تھی۔اس نے لڑکوں کو بتایا کہ یہ تصاویر کم از کم پندرہ ہزار برس پرانی ہو سکتی تھیں۔مابعد اسی ماہ ایب بریل جو وہاں سے 20 میل دور اقامت پذیر تھا وہ بھی اس مقام پر آن پہنچا اور وہ بھی غاروں کو دیکھنے کا متمنی تھا۔

دیگر ماہرین......ایسے ماہرین جو قبل از تاریخ کی تہذیب میں مہارت رکھتے تھے......ان کے ساتھ باہم مشاورت کے بعد انہوں نے بھی اسکول ماسٹر کے خیال کی تصدیق کردی اور اسی سال ماہ اکتوبر میں اس نے متعلقہ محکمے کو اس دریافت سے آگاہ بھی کر دیا۔اس دوران یہ فیصلہ طے پایا کہ غاروں کو کسی مزید فرد کو نہ دکھایا جائے......ان میں داخلہ بند کر دیا جائے حتیٰ کہ ان کے مستقبل کے بارے میں سرکاری فیصلہ سرانجام نہ دے لیا جائے۔

جب جنگ کا خاتمہ ہوا اور فرانس کو آزادی نصیب ہوئی تب حکومت فرانس کے تاریخی یادگاروں کے کمیشن نے لیس کاس کو اپنی نگرانی میں لے لیا اور اس کے مناسب تحفظ اور حفاظت کی تیاریاں ہونے لگیں۔

دو دروازے نصب کئے گئے تا کہ غاروں میں داخل ہونے کے راستے کو بند کرنا ممکن ہو سکے۔غاروں میں اترنے کیلئے سیڑھیاں بنائی گئیں۔سیمنٹ کے راستے بنائے گئے اور بجلی کا نظام مہیا کیا گیا تا کہ تصاویر کو بخوبی دیکھنا ممکن ہو سکے۔

اس دوران غاروں کا مفصل سروے سرانجام دینے اور تصاویر کی فہرست تیار کرنے کے کام کا آغاز کیا گیا اور یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ ان غاروں کو عوام کیلئے کھول دیا جائے۔اور ایک دن دو مرتبہ ان کو عوام کیلئے کھولا جائے......ساڑھے نو بجے تا بارہ بجے دوپہر تک اور دو بجے بعد از دوپہر تا شام سات بجے تک۔

1948ء میں جب ان غاروں کو عوام کیلئے کھولا گیا اس کے بعد غاروں کے بارے میں کئی کتب منظر عام پر آئیں ...... غاروں کے اندرونی حصے کو نقشوں سے مزین کیا گیا اور ہزاروں مفکرانہ الفاظ تصاویر کے بارے میں لکھے گئے ...... ان کے رنگوں کے بارے میں ...... اور ان میں تخلیق کردہ نظاروں کی اہمیت کے بارے میں۔

ان غاروں کی تصاویر کے کام کا علاقے میں موجود اسی نوعیت کی حامل دیگر غاروں کے کام کے ساتھ موازنہ سرانجام دیا گیا اور ماہرین اس بارے میں مختلف پیشین گوئیاں کرنے لگے۔ بہت سے ماہرین اس نکتہ نظر کے حامل تھے کہ روبوٹ نامی کتا جس راستے سے غار میں داخل ہوا تھا محض وہی راستہ غار میں داخل ہونے کا واحد راستہ نہ تھا بلکہ پہاڑیوں میں سرنگ یا سرنگوں کے ذریعے بھی غار تک رسائی حاصل کرنا ممکن تھا۔ لیکن کوئی بھی متبادل راستہ دریافت نہ ہو سکا۔

بڑی غار جس میں لڑکے سب سے پہلے داخل ہوئے تھے گریٹ ہال آف بلز (بیلوں کا عظیم ہال) کا نام دیا گیا۔ اس کی لمبائی تقریباً 17 گز ہے اور چوڑائی تقریباً دس گز ہے۔ اس ہال کی دیواروں پر بیلوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں جو فوراً نگاہ کا مرکز بن جاتی ہیں کیونکہ چیمبر کی دیگر تصاویر ان کے مقابلے میں کوتاہ قد دکھائی دیتی ہیں۔ ان تصاویر میں گھوڑوں ...... ہرن اور ریچھ کی تصاویر شامل ہیں۔ ان میں غیر معمولی دکھائی دینے والی مخلوق کی تصاویر بھی موجود ہیں جن کو یونی کارن کا نام دیا گیا ہے اگرچہ ماہرین اس نام سے متفق نہیں ہیں۔

ہال میں داخل ہونے پر بائیں جانب جو تصویر نظر آتی ہیں وہ ایک گھوڑے کے سر پر مبنی ہے جو سیاہ رنگ میں تخلیق کیا گیا ہے۔ ایک دوسری دیوار پر چھ چھوٹے گھوڑے دیکھے جا سکتے ہیں اور ان سے کچھ دور ایک چھوٹے ہرن کی تصویر ہے۔

بیلوں کے عظیم ہال کے ایک کونے میں تصاویر کی ایک تنگ گیلری ہے۔ اس کی چوڑائی تقریباً اڑھائی گز ہے اور لمبائی تقریباً 22 گز ہے۔ یہاں مختلف تصاویر دیکھنے کو ملتی ہیں۔ کچھ تصاویر گروپوں کی صورت میں ہیں اور کچھ تصاویر تنہا ہیں۔ ایک تصویر میں ایک چھوٹا براؤن گھوڑا دکھایا گیا ہے ...... ایک اور تصویر میں ہرن دکھایا گیا ہے۔

ہمارے پاس اتنی گنجائش نہیں ہے کہ ہم تمام تر تصاویر کا مفصل تذکرہ کریں۔

درحقیقت یہ غاریں آرٹ کا ایک ایسا خزانہ ہیں کہ ماہرین دور دراز سے اور دیگر ممالک سے کھنچے چلے آتے ہیں۔

یہ جگہ نہ صرف ماہرین' مفکرین اور آثار قدیمہ کے ماہرین کیلئے کشش کا باعث ہے بلکہ اس کی بدولت اس علاقے کو بھی بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی ہے۔ مختلف ممالک سے سالانہ سیاح جوق در جوق ان غاروں کو دیکھنے کے لئے آتے ہیں اور سیاحوں کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ کیونکہ یہ کراماتی غارتیں ایک عجوبے کی حیثیت کی حامل ہیں۔

اور کتا روبوٹ جو ان عجوبوں کو دریافت کرنے کا باعث بنا تھا وہ کب کا اس دنیا سے جدا ہو چکا ہے۔ لیکن اس کا مالک رویدت اور اس کا دوست مارشل ...... ان دونوں کو ان غاروں کا گائیڈ مقرر کر دیا گیا تھا۔

......❁......

ڈن کرک کے چھوٹے بحری جہاز

اس جدید زندگی کی ایک بدقسمتی یہ بھی ہے کہ انسان اپنی مخفی اور پوشیدہ قوت و توانائی کی جانب بہت کم رجوع کرتا ہے۔ یہ ایسی قوت و توانائی ہوتی ہے جو بنی نوع انسان کو ایک ہیرو کے مرتبے پر فائز کردیتی ہے اور ذاتی قربانی کے جذبے کو ابھارتی ہے۔ جب سیاست دان معیشت میں انقلاب لانے کی غرض سے "ڈن کرک کے جذبے" کا مظاہرہ کرنے پر زور دیتے ہیں تو ان کا محض زور دینا ہی کافی نہیں بلکہ ہمیں یقیناً یہ جاننا چاہیئے کہ ہم کیا انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں اور یہی جذبہ ہم میں مفقود نظر آتا ہے۔

واقعات کا وقوع پذیر ہونا...... وہ خطرات جن میں ہم گھرے ہوئے تھے ان خطرات نے ہمارے اندرونی احساس کے گرد ایک پردہ تان رکھا تھا اور ہم محض اس احساس کے حامل تھے کہ ہم کس مقصد کے لئے جنگ کر رہے تھے۔ ہم لندن کی پُرکشش زندگی میں اپنے خاندان اور دوستوں کے ہمراہ رہنے کے لئے آزادی کے حصول کے متمنی تھے۔ اپنے ملک کی خوبصورتیوں سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔

ڈن کرک کی کرامات کو کیسے بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی کرامات کا ظہور صبر و تحمل اور قوت برداشت کا مرہون منت ہوتا ہے۔
338,266 برطانویوں اور اتحادی فوجیوں کا انگلستان کی جانب رخ کرنا اور نو روز کے اندر اندر اس مقام کا رخ کرنا اور اس عمل درآمد کا 4 جون 1940ء کو اپنے اختتام پر پہنچنا۔

اس کامیابی کو سمجھنے کے لئے اس مسئلے کو واضح طور پر دیکھنا ہوگا۔

پیشتر اس کے کہ بی۔ ای۔ ایف کے باقی ماندہ افراد ڈن کرک کے ساحلوں پر پہنچتے وہ گذشتہ دو ہفتوں سے بھاری اور مسلسل جنگ میں مصروف رہے تھے۔ 10 مئی کو جرمنی نے ہالینڈ اور بلجیئم پر حملہ کیا تھا۔ بلجیئم کی افواج بھی نازک صورت حال کا شکار ہو چکی تھی۔ چند روز کے اندر اندر شمالی افواج بشمول برطانیہ فرانسیسی فوج سے علیحدہ ہو چکی تھیں۔

اگر بی۔ ای۔ ایف کو لڑائی جاری رکھنا تھی تب انہیں ایک جنکشن کی ضرورت درپیش تھی۔ شمال کی جانب بلجیئم کی افواج بھی ڈگمگا رہی تھیں اور 26 مئی کو یہ فوجی دستے شمالی کنارے کی جانب منتقل کئے جا چکے تھے۔ اس عمل درآمد کی بدولت بی۔ ای۔ ایف مکمل تباہی سے ہمکنار ہونے سے محفوظ رہا۔ دو روز بعد بلجیئم کی فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔

اب انخلاء کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا جبکہ لارڈ گورٹ...... پہلی جنگ عظیم کا ہیرو...... شیر کے نام سے جانے جانا والا...... ڈن کرک کے دفاع کے منصوبے تیار کر رہا تھا اور وائس ایڈمرل رامسے کو پہلے ہی ڈوور روانہ کیا جا چکا تھا تا کہ آپریشن ڈنمو کی تیاری کر سکے۔ اس کو آپریشن ڈنمو کا نام اس لئے دیا گیا تھا کہ اس آپریشن کا ہیڈ کوارٹر ایک سابقہ ڈنمو روم میں قائم کیا گیا تھا۔ بنگالی بنیادوں پر استعمال کرنے کیلئے چھوٹے جہازوں کا

بیڑہ پہلے ہی موجود تھا۔

اسی اثنا میں فوجی دستے ڈن کرک کی جانب رواں دواں تھے۔ کئی روز تک وہ بلجیم اور شمالی فرانس کی سڑکوں پر آگے پیچھے حرکت کرتے رہے...... ان کو احکامات ملتے رہے اور نظر ثانی شدہ احکامات ملتے رہے۔ وہ حقیقی صورت حال سے نا آشنا تھے۔ وہ غذائی قلت کا شکار ہونے کے علاوہ نیند سے بھی محروم تھے۔ بالآخر انہوں نے اپنی توپیں تباہ کر ڈالیں اور پیدل ہی ڈن کرک کی جانب روانہ ہو گئے۔ ان کا مورال بلند تھا لیکن وہ بھوکے اور تھکے ماندہ تھے۔ حالات ان کا مورال پست کرنے کا موجب نہ بنے تھے۔ وہ گھر کی جانب رواں دواں تھے۔

لیکن انہیں وقت کا سامنا تھا۔ گھر پہنچنے کیلئے انہیں پہلے ڈن کرک پہنچنا تھا اور اس کے علاوہ ایک خطرناک قصبے میں سے بھی گزرنا تھا۔ فرانس کی تیسری بندرگاہ...... اس کی گودیاں بمباری کی نذر ہو چکی تھیں۔ اس کے علاوہ تیل کے ذخیرے کو بھی آگ لگ چکی تھی اور آگ کے شعلے اور سیاہ دھوئیں کے بادل آسمان کو چھو رہے تھے۔ فوجی دستوں نے اس منظر سے نگاہ ہٹانے کی خاطر اپنی نگاہیں سمندر کی جانب موڑ لیں...... وہ سوچ رہے تھے کہ کیا وہ اس مصیبت سے نجات حاصل کر پائیں گے یا نہیں...... ہزاروں کی تعداد میں سپاہ لمبی قطاروں میں کھڑے ہو گئے جو ایک چوتھائی یا اس سے زائد میل کے رقبے پر پھیلی ہوئی تھیں اور یہ قطاریں پانی میں بنی ہوئی تھیں جو زیادہ گہرائی کا حامل نہ تھا۔ کچھ سپاہ ساحلوں پر ہی نیند سے ہم آغوش ہو چکی تھی۔ ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ ان کے صحیح سلامت واپس پہنچنے کے مواقع کس قدر کم تھے اور یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس خطرے سے مکمل طور پر آگاہ تھے جو انہیں درپیش ہو سکتا تھا۔

ڈن کرک پر کتنے عرصے تک قبضہ برقرار رکھا جا سکتا تھا؟ برطانوی اور فرانسیسی دفاعی لائن قائم کی جا رہی تھی...... یہ دفاع لائن بندرگاہ کے مغرب میں چھ میل کی دوری پر واقع تھی اور چھ میل کی دوری پر جنوب کی جانب واقع تھی اور مشرق سے تقریباً پندرہ میل کی دوری پر واقع تھی۔ اس کے درمیان جرمن اور سمندر کا ایک وسیع رقبہ حائل تھا۔ لیکن کالیس اور بولونج نے جلد ہی ہاتھ سے نکل جانا تھا اور جرمن گھیرا تنگ ہونے کا خدشہ تھا۔

لہٰذا وقت کی قلت تھی اور لاتعداد افراد کو نکالنا تھا۔ ڈوور سے ڈن کرک کا مختصر راستہ ایک کھاری/خلیج سے گزرتا تھا جو کالیس سے جرمن توپوں کی بمباری جلد ہی متوقع تھی لیکن سمندر میں 39 میل کا سفر انجام دینے کی کوشش کرنا عین دانش مندانہ فعل تھا۔ کم مقدار پانی اور زیادہ مقدار پانی کے درمیان آدھ میل کا فاصلہ حائل تھا اور اگر سپاہ اپنی گردن تک پانی میں سے بحفاظت گزر جاتے تب انہیں چھوٹی کشتیوں میں سوار کرنا ممکن تھا اور مابعد ان کو بڑی کشتیوں میں منتقل کیا جا سکتا تھا۔

ایک اور اہم مسئلہ بھی درپیش تھا۔ ڈن کرک پہلے ہی بمباری کی زد میں تھا اور جرمن توپیں مشرق اور مغرب دونوں جانب سے گھیرا تنگ کر رہی تھیں اور ایک دوسرے کے قریب تر آنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ ایسی صورت میں ان کی بمباری اپنی انتہا کو پہنچنے کا خدشہ بدستور موجود تھا۔ یہ جہازوں اور ساحلوں پر کھڑے افراد کو جو نقصان پہنچا سکتی تھیں اس کا تصور کرنا بھی محال تھا۔

انخلاء بالآخر کامیابی سے ہمکنار ہوا اگرچہ جرمنوں نے اسے ناکام بنانے کی از حد کوشش سرانجام دی اور یہی ڈن کرک کی کامیابی کی بنیاد تھی۔ لیکن اسی اثناء میں رامسے منصوبہ 24 گھنٹوں میں ہی ناکامی کا شکار ہو کر رہ گیا...... اگرچہ 26 مئی کی اس اتوار کو رات گئے تک کئی ایک فوجی

دستے نکال لئے گئے تھے لیکن ان کی تعداد ایک معقول حد تک نہ تھی...... جب آپریشن ڈینمو کا آغاز سرکاری طور پر ہوا اس وقت تک انگلستان میں لائی گئی سپاہ کی تعداد 28,00 تھی اور بقایا تعداد کا انخلاء آئندہ چار روز میں مکمل ہوا۔

سپاہ کو لے جانے کیلئے 27 مئی کو چھوٹے جہازوں کا قافلہ رواں دواں ہوا۔ اس کے علاوہ کشتیاں وغیرہ جو کچھ بھی دستیاب ہوا اس مقصد کے لئے بروئے کار لایا گیا۔ سپاہ پانی کی ٹھنڈک اور تھکان کی شدت کی بنا پر موت سے نزدیک تر ہو چکی تھی اس دوران انگلستان میں موجود حکام نے درکار جہازوں کی تعداد کا تخمینہ لگانے کا کام سرانجام دینا موقوف کر دیا اور شیئرنیس میں چھوٹے جہازوں کے بیڑے......ایسکس میں کشتی رانی کی کلبوں...... بالائی ٹھیمز پر کشتی سازوں...... تمام بندرگاہوں کو یہ ہدائت کی گئی کہ وہ ہر ایک جہاز اور کشتی تیار رکھیں جس میں سپاہ سفر کر سکیں۔ پہلے بحریہ کی کشتیاں استعمال کی گئیں لیکن بعد میں سویلین کشتیاں بھی اس مقصد کے لئے استعمال کی گئیں۔ لٹل ہمپٹن کا مسٹر ہٹن شپ یارڈ میں اپنی کشتی کی تعمیر کا کام سرانجام دے رہا تھا۔ اسے بھی یہ پیغام دیا گیا کہ وہ اس کشتی کو سمندر میں اتار دے۔ تھیمس کے پاس ایک موٹر کشتی تھی جس پر وہ بے انتہا فخر کرتا تھا۔ اسے آدھی رات کے وقت ٹیلی فون پر پیغام موصول ہوا تھا۔ مسٹر سی۔ پی۔ ڈک جب اپنے فلیٹ میں پہنچا تو اسی قسم کے احکامات اس کے بھی منتظر تھے۔

اس وقت تک جہازوں کے کپتان اور عملہ اپنی منزل مقصود سے بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ ان کے علم میں یہ بات آ چکی تھی کہ انہیں کس مقام کی جانب سفر طے کرنا تھا انہیں معلوم تھا کہ انہیں ڈن کرک پہنچنا تھا۔ دوران سفر انہیں بمباری...... بارودی سرنگوں......اور تارپیڈو کے خطرات بھی لاحق تھے اور ان کو یہ علم تھا کہ کس قسم کے مصائب ان کے انتظار میں تھے۔ لیکن کوئی فرد بھی گھبراہٹ کا شکار نہ ہوا۔ وہ آمادہ سفر تھے اور کسی قسم کے خوف وخطرات کا شکار نہ تھے۔ کچھ کشتیاں بحریہ کا عملہ چلا رہا تھا اور کچھ کشتیوں کو ان کے مالکان کا عملہ چلا رہا تھا۔

لہٰذا چھوٹے جہازوں کا قافلہ اپنے سفر پر روانہ ہوا اور انہوں نے برطانوی اور اتحادیوں کی ہزاروں کی تعداد میں سپاہ کو بچایا۔

گھر کی جانب سفر طے کرنے کے دوران کئی ایک المیے بھی پیش آئے۔ ایچ۔ ایم۔ ایس ''ویک فل'' کو تارپیڈو کا نشانہ بنایا گیا اور وہ سات سو افراد سمیت سمندر کی تہہ میں جا پہنچا۔ کچھ افراد کو اس کے پیچھے آنے والے تباہ کن جہاز ''گرافٹن'' نے بچا لیا اور اس کے بعد اسے بھی تارپیڈو کا نشانہ بنایا گیا اگرچہ وہ ڈوبا نہیں بلکہ سطح آب پر ہی موجود رہا۔

آپریشن ڈینمو کی بدولت اگرچہ ایک چوتھائی جہازوں کا نقصان برداشت کرنا پڑا لیکن یہ آپریشن فتح کے قریب تر پہنچتا چلا گیا اور 4 جون کو 2 بجکر 23 منٹ پر یہ آپریشن سرکاری طور پر اپنے اختتام کو جا پہنچا۔

ٹوکیو میں جاسوسی کی دنیا کا عظیم کارنامہ

ایک جاسوس کی زندگی ہر وقت خطرات میں گھری رہتی ہے۔ اسے ہمیشہ یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں اس کی شناخت نہ کر لی جائے...... اسے گرفتار نہ کر لیا جائے اور بہت سے جاسوس اس قسم کی مہم سرانجام دینے کے تجربے سے دوچار نہیں ہوئے جس قسم کی مہم جاسوسی کے اس کھیل کا ایک لازمی حصہ ہوتی ہے۔

رچرڈ سورگ نہ صرف اس صدی کا ایک قابل ذکر اور ذہین ترین جاسوس تھا بلکہ وہ ایک قابل ذکر انسان بھی تھا جو ایک قابل ذکر زندگی بسر کرنے کا عادی تھا۔ اس نے اپنے ملک کیلئے ہر قسم کے خطرات کا سامنا کیا اور دوسری جنگ عظیم کے دوران جاسوسی کے میدان میں اس نے اہم معرکہ سرانجام دیا۔ یہ معرکہ اس نے اپنی جان پر کھیل کر سرانجام دیا۔ کوئی بھی معرکہ سرانجام دینے کیلئے جان کی بازی لگانا ضروری ہوتا ہے۔ سورگ اس نکتہ نظر کا حامل تھا کہ جاسوسی محض فوجی راز چرانے کا نام نہیں ہے بلکہ دشمن کے حقیقی سیاسی عزائم سے باخبر ہونے کا نام جاسوسی ہے اور اس نے روس کو قدر گراں قدر معلومات/ اطلاعات فراہم کرتے ہوئے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کیا اور اس گراں قدر معلومات/ اطلاعات نے تاریخ کا رخ موڑ کر رکھ دیا۔

سورگ کا دادا فریڈرچ سورگ فرسٹ انٹرنیشنل کا سیکرٹری تھا اور وہ مارکس کو جانتا تھا۔ رچرڈ سورگ 4 اکتوبر 1895ء کو باکو میں پیدا ہوا تھا جو روس کو کاس میں واقع تھا۔ لیکن پہلی جنگ عظیم سے پیشتر اس کا خاندان برلن چلا آیا تھا جہاں پر نوجوان سورگ نے تعلیم و تربیت حاصل کی اور ایک مڈل کلاس جرمن فیملی کی سہولتوں سے فیض یاب ہوا۔

1914ء میں وہ اپنے آپ کو اس حد تک ایک جرمن تصور کرنے لگا تھا کہ اس نے فوج میں شمولیت اختیار کر لی اور قیصر کی جنگ میں شریک ہوا جس میں وہ دو مرتبہ زخمی ہوا۔ اس جنگ نے اسے ایک کیمونسٹ بھی بنا کر رکھ دیا۔

جنگ کے بعد اس نے یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اس نے ہمبرگ یونیورسٹی سے 1920ء میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی۔ اب وہ ایک کیمونسٹ ورکر بن کر منظر عام پر آیا تھا اور کیمونزم کا بڑا علمبردار تھا۔ وہ 1924ء میں ماسکو روانہ ہو گیا۔ اسے جلد ہی روسی کیمونسٹ پارٹی کی رکنیت حاصل ہو گئی کیونکہ مارکس کے ساتھ اس کی فیملی کے تعلقات تھے اور فرسٹ انٹرنیشنل کے ساتھ بھی اس کی فیملی کے تعلقات تھے اور یہی تعلقات کیمونسٹ پارٹی میں اسے رکنیت دلانے میں معاون ثابت ہوئے۔

سورگ سویت یونین کیلئے ایک مفید اور کارآمد شخص تھا۔ اس نے اپنی زیادہ تر توجہ جاسوسی پر ہی مرکوز رکھی۔ وہ اس میدان میں اپنی صلاحیت کا لوہا منوانے کا متمنی تھا۔ اس نے جاسوسی کا ایک مکمل نیٹ ورک تیار کیا اور یہ نیٹ ورک کیمونسٹ پارٹی کی بین الاقوامی پالیسی تھی۔ 1929ء میں اسے ریڈ آرمی کے چوتھے بیورو میں ٹرانسفر کر دیا گیا جو جاسوسی سے متعلق تھا اور اس وقت یہ بیورو عالمی سطح پر جاسوسی کا جال بچھانے میں مصروف تھا۔ وہ

بیوروایجنٹ اور جاسوسوں کا ایک جال بچھانے میں مصروف تھا جو دوسری جنگ عظیم کے دوران انتہائی کارآمد ثابت ہوا اور مابعد آنے والے ایٹمی دور میں بھی انتہائی کارگر اور معاون ثابت ہوا۔

سورگ کو جو ذمہ داری تفویض کی گئی وہ مشرق بعید سے متعلق تھی اور اس نے کچھ برس چین میں گزارے جہاں پر اس نے دوہری زندگی بسر کی۔ وہ ایک جرمن صحافی کی حیثیت سے چین گیا تھا اور پہلے پہل وہ اہم جرمن رسائل کے ساتھ منسلک رہا۔ وہ ایک ہوشیار چالاک اور وسائل کا حامل صحافی تھا اور اس نے اپنے لئے کافی شہرت بھی کمائی تھی۔ اس کے معلوماتی آرٹیکل جو مشرق بعید پر ہوتے تھے اس سے بہت سے قارئین متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے تھے اور بہت سے لوگ ان کا مطالعہ سرانجام دیتے تھے۔ قارئین کی ایک بڑی تعداد اس کے آرٹیکل کو خوش آمدید کہتی تھی۔

جاسوسی کے میدان میں اس کی کامیابی کا راز اس کی دوہری زندگی بسر کرنے میں پنہاں تھا۔ اس نے دوہری زندگی گزارنے میں انتہائی مہارت حاصل کر رکھی تھی اور اس کی یہی مہارت اس کی کامیابی کا راز تھی۔ وہ ایک جرمن دانش ور کی زندگی انتہائی مہارت کے ساتھ بسر کرتا تھا۔ وہ اس زندگی میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی خاطر عیش و عشرت...... شراب اور عورتوں سے اظہار محبت کرتا تھا۔ وہ عیش و عشرت کا دلدادہ بن کر زندگی بسر کرتا تھا اور اس کی عیش و عشرت کے چرچے عام تھے۔ وہ ایک دلکش اور مقناطیسی شخصیت کا حامل تھا۔ لوگ اس کے اردگرد منڈلاتے رہتے تھے اور یہ اس کی شخصیت کا کمال تھا جو لوگوں کو اس کی جانب مائل کرنے میں اہم کردار ادا کرتا تھا۔ عورتیں اس کی تعریف کرتے نہ تھکتی تھیں اور انتہائی رغبت کے ساتھ اس کے ساتھ داد عیش دینے میں مصروف رہتی تھیں۔ مرد بھی اسے پسند کرتے تھے اور اس کی رفاقت کو ترجیح دیتے تھے۔

ان کارگزاریوں کے پردے میں سورگ نے انتہائی محتاط انداز میں اپنا مشہور زمانہ ٹوکیو کی جاسوسی کا مرکز قائم رکھا تھا جس کی سرگرمیوں میں دوسری جنگ کی راہیں تبدیل کرنا شامل تھا۔ اس کا بڑا معاون اور شریک کار ایک جاپانی صحافی تھا۔ وہ چینی امور کا ماہر بھی تھا۔ اس کا نام اوذاکی ہاٹ سوی تھا۔ وہ ایک نوجوان شخص تھا اور کمیونسٹ نظریات کا بھی حامل تھا۔ سورگ کے ساتھ اس کا تعارف مس اگنس سمیڈلی نے کروایا تھا جو ایک امریکی صحافی تھی اور بائیں بازو سے تعلق رکھتی تھی۔ مابعد اسے امریکہ مخالف سرگرمیوں کی پاداش میں ہاؤس کمیٹی کے سامنے پیش ہونا پڑا تھا۔ 1950ء میں لندن میں اس کا انتقال ہوا تھا۔ وہ سورگ کی جاسوسی تنظیم کا حصہ نہ تھی اگرچہ اس کو اس کی تنظیم کا ایک حصہ ثابت کرنے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔ سورگ نے میکس کلاسن کو اپنا ریڈیو آپریٹر مقرر کیا تھا...... وہ ہمبرگ کیمونسٹ پارٹی کا سابق ممبر تھا۔

1932ء میں وہ ماسکو واپس لوٹ آیا تھا اور اس سے اگلے برس اسے اپنے مشہور زمانہ مشن پر ٹوکیو روانہ کر دیا گیا تھا۔ اس مشن کا مقصد اس امر سے آگاہی حاصل کرنا تھا کہ کیا جاپان روس پر حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتا تھا یا نہیں رکھتا تھا۔ فرینک فرٹرزی ٹنگ نے سورگ کو مشرق بعید کیلئے اپنا نمائندہ مقرر کیا تھا اور 1933ء کے موسم خزاں میں وہ ٹوکیو پہنچ چکا تھا۔ اس کے پاس ٹوکیو میں جرمن کے اعلیٰ ترین سفارتی حلقوں کے لئے تعارفی خطوط بھی موجود تھے۔

جرمن کے سفارت خانے کے افسروں نے اس کا والہانہ استقبال کیا...... اس کی تعلیمی اور صحافت کے میدان میں قدر و منزلت اور شہرت ...... اس کی فوجی خدمات...... اس کے تعارفی خطوط جو وہ برلن سے لایا تھا...... اس کی دلکش شخصیت اور اس کا سماجی مرتبہ...... یہ سب کچھ اس کی کامیابی

کی ضمانت تھا۔ وہ جاپان میں نازی پارٹی کا رکن بن گیا۔ یہ سب کچھ مل ملا کر اس کی صورت حال کو مستحکم بنانے میں انتہائی معاون ثابت ہوا اور اس کی صورت حال اس قدر مستحکم ہو چکی تھی کہ کوئی اس پر حملہ آور ہونے کا سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

یہ اس کے گہرے منصوبے کا ایک حصہ تھا...... سورگ بخوبی جانتا تھا کہ جرمنی جاپان سے بڑھ کر روس کا دشمن تھا۔ منصوبے کا دوسرا حصہ وہ تھا جو اوزاکی ہاٹ سومی نے سرانجام دیا تھا...... وہ چین کے امور پر جاپانی ماہر تھا...... اسے کسی قدر دقت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اسے جاپانی وزیر اعظم شہزادہ کونوئی کے نزدیکی حلقے تک رسائی حاصل کرنے میں ازحد دقت پیش آئی تھی اور 1938ء میں اسے جاپانی کابینہ کے سیکرٹری کا مشیر اور ریسرچ اسسٹنٹ مقرر کر دیا گیا تھا۔

یہ سب کچھ قدرے آسان دکھائی دیتا تھا لیکن حقیقت میں یہ سب کچھ اس قدر مشکل تھا۔ یہ سالہا سال کی محنت اور کاوش کا نتیجہ تھا۔ اس کے علاوہ یہ مناسب اور درست منصوبہ بندی کا ثمر تھا اور اس کا حصول کسی عام آدمی کے بس کی بات نہ تھی بلکہ انتہائی دانش ور اور ذہین شخص ہی یہ کارنامہ سرانجام دے سکتا تھا۔ ایک ذہین اور زیرک شخص سورگ اگرچہ وہ دنیا کا معمولی سا غیر مستحکم شخص واقع ہوا تھا...... وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوا جس مقصد کو اس نے اپنا نصب العین بنایا تھا۔ اگرچہ وہ ایک کٹر کمیونسٹ تھا لیکن کسی بھی موقع پر اس نے جاپانی کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ کسی بھی قسم کا کوئی رابطہ استوار نہ کیا تھا اور نہ ہی ٹوکیو میں روسی سفارت خانے کے ساتھ کسی قسم کا رابطہ استوار کیا تھا اور نہ ہی ان کو کوئی خبر تھی کہ وہ ایک روسی جاسوس تھا۔

وہ اسے ٹوکیو کا ایک عیاش اور تماش بین تصور کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اسے اپنا ایک سفارتی ساتھی تصور کرتے تھے جو کسی مہم میں محو تھا۔ اس کے اسکینڈل پورے جاپان میں مشہور تھے اور جاپانی عورتیں اس کی دیوانی تھیں۔

تاہم اس کی زندگی محبت سے خالی نہ تھی۔ ایک جاپانی عورت اس کی محبت حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اس عورت کا نام می یاک نہاتو تھا۔ اس عورت سے اس کی ملاقات 1935ء میں ہوئی تھی جبکہ وہ اپنی 40ویں سالگرہ منا رہا تھا۔ وہ جس ہوٹل میں سالگرہ منا رہا تھا نہاتو اس ہوٹل میں ویٹرس کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ وہ اس کی داشتہ بن گئی تھی اور سورگ اس کے ساتھ مہربانی اور محبت کے ساتھ پیش آتا تھا...... یہ واحد عورت تھی جس کے ساتھ اس کے مستقل نوعیت کے حامل تعلقات استوار تھے۔ وہ اپنے آپ کو اس کی بیوی تصور کرتی تھی جو ''کامن لا وائف'' کہلاتی تھی اور دیگر عورتوں کے ساتھ اس کے تعلقات کو بخوشی برداشت کرتی تھی۔ وہ بھی سورگ کو پسند کرتی تھی اور کسی دوسرے مرد کی رفاقت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔

1936ء تک سورگ جرمن سفارت خانے میں اپنا بے پناہ اثر ورسوخ قائم کرنے میں انتہائی کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ اس امر میں اس حد تک کامیاب ہو چکا تھا کہ جرمن سفیر اکثر اس کے خیالات اور نظریات اور مشورہ جات جاننے کیلئے کوشاں رہتا تھا...... اور کرنل اوٹ جو کہ ملٹری اتاشی تھا...... اس کے ساتھ اس کے خصوصی دوستانہ تعلقات استوار تھے۔ وہ اس کو ایسے پیغامات سے بھی مطلع کر دیتا تھا جو پیغامات انتہائی خفیہ نوعیت کے حامل ہوتے تھے اور ایسے پیغامات سفارت خانے کے معمولی اراکین کے حوالے نہیں کیے جا سکتے تھے۔ اوٹ کو سفیر مقرر کر دیا گیا تھا اور سورگ اس کے غیر سرکاری سیکرٹری کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ اس کی رسائی تمام تر خفیہ معلومات اور اطلاعات تک ممکن تھی۔ اسے دوسری جنگ عظیم کیلئے

ہٹلر کی فوجی تیاریوں کی بھی بخوبی خبر تھی۔

لہٰذا سورگ نے اس صدی کی جاسوسی کی دنیا میں عظیم کامیابی حاصل کی......شاید اس نے ہر دور کی جاسوسی کی دنیا کی عظیم کامیابی حاصل کی اور اس نے اس کامیابی کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔

اس نے جس راستے کا انتخاب کیا تھا اگرچہ وہ راستہ خطرات سے بھرپور تھا لیکن اس نے اپنی اسکینڈل سے بھرپور زندگی جاری رکھی۔ اس نے اپنی اس روش میں کوئی کمی نہ آنے دی اور عیاشی کی دنیا کا باسی بنا رہا۔ وہ تیز رفتار ڈرائیونگ کا بھی شوقین تھا۔ وہ اپنی گاڑی کے علاوہ اپنی موٹر سائیکل بھی برق رفتاری کے ساتھ چلاتا تھا۔

ایک روز وہ جرمن سفارتخانے سے باہر نکلا۔ اس کی جیبیں خفیہ پیغامات سے بھری ہوئی تھیں جسے وہ میکس کلاسن کا پہنچانا چاہتا تھا تاکہ وہ ان پیغامات کو ماسکو پہنچانے کا بندوبست کر سکے۔ اس کی موٹر سائیکل ایک حادثے کا شکار ہوگئی اور اسے اہسپتال پہنچا دیا گیا۔ کلاسن فوراً اہسپتال جا پہنچا اور اس نے ان خفیہ پیغامات کو سورگ کی جیبوں سے نکالنے کی کوشش کی پیشتر اس کے کہ اس کے خون آلود کپڑے اس کے جسم سے اتارے جاتے۔

برس ہا برس تک کلاسن خفیہ پیغامات کریملن پہنچاتا رہا۔ وہ یہ پیغامات ایک روسی اسٹیشن کی وساطت سے پہنچاتا تھا جو ولادی ووسٹاک میں واقع تھا۔ ایک مرتبہ جاپانی پولیس نے ٹرانسمشن کو سنا لیکن انہوں نے اس امر کی جانب کوئی توجہ نہ دی کہ یہ ایک جاسوسی کارروائی تھی۔

سواگ جرمنی سفارتخانے میں انتہائی باقاعدگی کے ساتھ جرمن کی خفیہ دستاویزات کی فوٹو بناتا رہا اور ان فلموں کو خصوصی کوریئر کے ذریعہ سائبیریا کے راستے ماسکو پہنچاتا رہا یا پھر ہانگ کانگ میں روسی ایجنٹ کو پہنچاتا رہا۔

سورگ کا جاسوسی کا نظام سورگ کی اپنی مدد آپ کے تحت جاری و ساری تھا۔ وہ اس سلسلے میں ماسکو سے کوئی رقم وصول نہ کرتا تھا۔ میکس کلاسن ایک ایسی جرمن فرم کا نمائندہ تھا جو دفتری مشینری تیار کرتی تھی۔ وہ ایک منافع بخش درآمد برآمد کا کاروبار بھی سرانجام دیتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ دستاویزات کی نقول اور فوٹو گراف تیار کرنے کے کاروبار سے بھی منسلک تھا۔ وہ اس کام میں اس قدر ماہر تھا کہ جاپانی حکومت نے بھی اسے اس نوعیت کے کام سے نوازا تھا۔ اس کے کام میں خفیہ دستاویزات کی نقول تیار کرنا بھی شامل تھا۔ یہ کاروبار سورگ کی جاسوسی کی سرگرمیوں کی مالی ضروریات کی تکمیل کرتا تھا۔

1939ء میں یورپ میں جنگ کے شعلے بھڑکنے کے بعد ٹوکیو میں واقع جرمن سفارت خانے میں جاسوسی سے متعلق سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ لہٰذا جاپانی سیکورٹی حکام کو ریڈیو ٹرانسمشن پر خصوصی نظر رکھنی پڑی۔ ان کے ریڈیو کے ماہرین کے علم میں یہ بات آئی کہ باقاعدہ وقفوں کے تحت پیغامات سائبیریا کی جانب روانہ کیے جاتے تھے۔ یہ پیغامات خفیہ کوڈ کے تحت ارسال کیے جاتے تھے اور کوئی غیر پیشہ ور شخص اس قسم کے پیغامات ارسال نہ کر سکتا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ پیغامات روسی جاسوسی حلقوں کی جانب سے روانہ کیے جا رہے تھے۔

جاپانیوں کے پاس ایسا ساز و سامان موجود نہ تھا جس کے ذریعے وہ پیغام ارسال کرنے والے شخص تک پہنچ سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے جرمن سفارتخانے سے فوری درخواست کی کہ مطلوبہ ساز و سامان کی جرمنی سے فراہمی کا فوری بندوبست کیا جائے۔

بے شک سورگ ہی وہ پہلا شخص تھا جس کو اس خفیہ ترین درخواست کی خبر مل چکی تھی اور اس نے اس کا فوری تدارک کرنے کی ٹھانی۔ اس نے اس سلسلے میں فوری کارروائی کی۔ اس نے ایک بڑی کشتی تیار کی جس کو مچھلیاں پکڑنے والی کشتی ظاہر کیا گیا اور اس نے اس کشتی میں ایک خفیہ کیبن بھی بنایا جہاں سے کلاسن پیغامات نشر کر سکے۔ وہ اس کشتی پر پارٹیاں منعقد کرتا تھا اور ان پارٹیوں میں کابینہ کے وزراء کے علاوہ جرمن کے سفارتی نمائندے بھی شرکت کرتے تھے۔ جب معزز مہمان شراب نوشی میں مصروف ہوتے تھے اس وقت کلاسن ان سے چند قدم دوران کے جنگی راز ماسکو روانہ کرنے میں مصروف ہوتا تھا۔

اس دوران جاپان سیکرٹ سروس پیغامات نشر کرنے والے خفیہ ریڈیو کو تلاش کرنے میں مصروف تھی۔ وہ جس ساز و سامان کے ساتھ رو بہ عمل تھی وہ ساز و سامان برلن سے روانہ کیا گیا تھا۔ ان کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ یہ پراسرار ٹرانسمشن ایک مختلف سمت سے آتی تھی اور سمندر کی جانب سے آتی تھی۔

اب سورگ پر بھی شبہ کیا جانے لگا تھا اور اس کو بھی مشتبہ افراد کی فہرست میں شامل کر لیا گیا تھا۔ جاپانی سیکرٹ سروس اس کے بارے میں سوال اٹھا رہی تھی اور برلن میں ایڈمرل کنارس اس امر سے مطلع ہو چکا تھا کہ 1920ء میں سورگ کا تعلق جرمن کمیونسٹ پارٹی سے رہا تھا۔ لیکن شک و شبہ ایک علیحدہ چیز تھی اور ثبوت ایک علیحٰدہ چیز تھی۔ چونکہ سورگ ایک پرقوت صورت حال کا حامل تھا لہٰذا ثبوت کی عدم موجودگی میں اس پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔

سورگ بذات خود بھی اس حقیقت سے آشنا تھا کہ اس کے گرد گھیرا تنگ کیا جا رہا تھا اور اسے اپنے مشن کی تکمیل کیلئے جلد از جلد کارروائی سرانجام دینے کی ضرورت درپیش تھی۔

یہ 1941ء کا دور تھا اور سورگ جرمن سفارت خانے میں ہنوز اثر و رسوخ کا حامل تھا۔ اسے سویت یونین پر مجوزہ نازی حملے کا علم ہو چکا تھا۔ 5 مارچ کو اس نے ان ٹیلی گراموں کی مائیکرو فلم ماسکو روانہ کی جو رین تروپ کی جانب سے سفیر اوٹ کو موصول ہوئی تھیں۔ ان میں روس پر جرمن حملے کی تاریخ کے تعین کے بارے میں وضاحت کی گئی تھی۔ حملے کی مجوزہ تاریخ جون کے وسط میں مقرر کی گئی تھیں۔ اسٹالن کو اس خبر پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا اگرچہ اسے اسی قسم کی وارننگ دیگر ذرائع سے بھی موصول ہو چکی تھی جن میں برطانیہ بھی شامل تھا۔

12 مئی کی رات کو سورگ نے اپنی کشتی پر ایک پارٹی ترتیب دی۔ اس پارٹی میں جاپانی حکومت کے اہم نمائندوں کے علاوہ جرمن کے سفارت کار بھی مدعو تھے۔ کشتی کو سمندر میں دور تک لے جایا گیا اور معزز مہمان مچھلی کے شکار اور شراب سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ اس دوران کلاسن نے ایک اہم پیغام اپنی کشتی کے خفیہ کیبن سے روس نشر کیا۔ اس پیغام میں روسی حکام کو مطلع کیا گیا کہ جرمن افواج کے 120 ڈویژن روس پر حملہ آور ہوں گے اور یہ حملہ 22 جون کی صبح کو ہوگا اور یہ کہ جاپانیوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ فی الحال وہ اس حملے میں جرمنی کی معاونت سرانجام نہیں دیں گے۔

یہ حملہ سورگ کی اطلاع کے عین مطابق ہوا۔ روسی فوج حالت تیاری میں نہ تھی کہ حملہ آوروں نے اس کو دبوچ لیا۔ اسٹالن کچھ اس قسم کا شخص واقع ہوا تھا کہ وہ ایسی اطلاعات کو مسترد کر دیتا تھا جو اس کے اپنے خیالات اور افکار سے میل نہ کھاتی ہوں۔

ماسکو بھی خطرے کی زد میں تھا۔ اسٹالن کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ اگر وہ اپنی بڑی تعداد افواج جو کہ انتہائی تربیت یافتہ بھی تھی کو سائبیریا سے نکال کر مشرق کے دفاع پر مامور کر دے تو اس کا یہ عمل در آمد جاپان حملے کی دعوت دینے کے مترادف ہوگا جو کہ جرمنی کا اتحادی تھا۔

سورگ نے اب جاپانی کابینہ کے حتمی فیصلے کا انتظار کرنا تھا۔ جب یہ فیصلہ سرانجام پا گیا تب اوزا کی نے اس فیصلے سے سورگ کو فوری طور پر مطلع کیا اور سورگ نے یہ فیصلہ فوراً ماسکو روانہ کر دیا۔

اسٹالن کو جب یہ معلوم ہوا کہ جاپان جنوب کی جانب ملائیشیا اور ایسٹ انڈیز کا رخ کرنا چاہتا تھا تب وہ مشرق بعید میں اپنی افواج کو یہ احکامات صادر کرنے کے قابل ہوا کہ وہ ماسکو کے دفاع کے لئے آن پہنچیں اور یہی وجہ تھی کہ ماسکو کو بچالیا گیا تھا اور جرمنی کی پیش قدمی روک دی گئی تھی اور بالآخر جرمن افواج موسم سرما کی برف باری کی نذر ہو گئی تھی۔

سورگ جانتا تھا کہ ٹوکیو میں اس کا مشن اب اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا اور اب وقت آن پہنچا تھا کہ وہ اپنے جاسوسی کے جال کو توڑ پھینکے۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ جاسوسی کی دنیا کی عظیم مہم اس کے تمام تر کارندوں کی گرفتاری کے عمل کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچی۔ 15 اکتوبر 1941ء کو سورگ کو بھی گرفتار کرلیا گیا تھا۔

اس کے پاس اعتراف جرم کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا۔ لہٰذا اس نے اعتراف جرم کرلیا......اور مکمل طور پر اعتراف جرم کیا......وہ پر امید تھا اور اسے یقین کامل تھا کہ جاسوسی کے میدان میں اس کے عظیم کارناموں کی بدولت اسٹالن اسے بچانے کے لئے کچھ بھی کر گزرے گا۔ کیونکہ اس نے تاریخ کا رخ موڑ دیا تھا اور اسے کامل یقین تھا کہ ماسکو چاہے گا کہ یا تو اسے آزاد کر دیا جائے یا جنگی قیدیوں کے تبادلے میں اسے رہائی دلائی جائے۔

لیکن وہ غلط فہمی کا شکار تھا۔ اسٹالن نے اس کی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ 7 نومبر 1944ء کو اسے اور اوزا کی کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ کلاسن اور اس گروہ کے دیگر ارکان کو سزائے قید سنا دی گئی۔

یہ کہانیاں گشت کرتی رہیں کہ سورگ کو پھانسی پر نہیں لٹکایا جائے گا۔ لیکن ان داستانوں میں کوئی حقیقت نہ تھی اور جنگ کے بعد یہ کہانیاں اس وقت اپنی موت آپ مر چکی تھیں جب ہنا کو نے اس کی لاش کی شناخت سرانجام دے دی تھی۔

1964ء میں رچرڈ سورگ کو سویت یونین کا ایک ہیرو بنا دیا گیا تھا......اسے ایک ہیرو کے روپ میں پیش کیا گیا تھا اور اسٹالن پر سخت تنقید کی جارہی تھی کہ اس نے اس کی زندگی بچانے کیلئے ایک انگلی تک نہ اٹھائی تھی۔

......❁......

قطب شمالی/ بحر منجمد شمالی کی جانب روانہ ہونے والا قافلہ

رائل بحریہ کی وردی میں ملبوس اونچا لمبا شخص مخاطب تھا کہ:۔

"اس مہم کا آغاز کرنے والوں میں کیا کوئی فرد کسی قسم کے شک وشبے کا شکار ہے؟"

اور اس کے ساتھ ہی کانفرنس کا آغاز ہوتا ہے۔

چالیس افراد میز کے اردگرد براجمان تھے۔ ان کے چہرے تجربے کی روشنی سے منور تھے۔ کچھ افراد وردی میں ملبوس تھے اور کچھ افراد دیگر ملبوسات زیب تن کئے ہوئے تھے۔ مرچنٹ نیوی کے افراد پوری توجہ اور لگن کے ساتھ کرسیوں پر براجمان تھے۔ ان کے سامنے میز پر چارٹ اور نقشہ جات بکھرے پڑے تھے۔

چیئرمین کی آواز ایک مرتبہ پھر گونجی کہ:۔

"اس قافلے میں کسی بھی قسم کے شک وشبے کا حامل کوئی بھی شخص موجود نہیں ہونا چاہئے"۔

یہ قافلے کی روانگی کی کانفرنس ہے۔ یہ قافلہ برفانی سرزمین کی جانب روانہ ہو رہا ہے۔ اس قافلے میں شامل کئی ایک افراد قطب شمالی/ بحر منجمد شمالی کی جانب اپنا پہلا سفر سرانجام دے رہے ہیں اور کئی ایک افراد کیلئے یہ سفر ان کا آخری سفر بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ روس کی جانب جانے والا یہ قافلہ ان گنت مشکلات کا شکار ہوسکتا ہے۔ ابھی موسم گرما ہے اور یہ ممکن ہے کہ شمال کی جانب دور تک بحری سفر طے کر لیا جائے...... دشمن کے سمندر سے انتہائی دور تک کا سفر اور ناروے میں ہوائی اڈوں تک کا سفر...... لیکن موسم گرما میں تمام دن سورج کی روشنی ہوتی ہے...... 24 گھنٹے دن کی روشنی ہوتی ہے اور قافلے کو دیکھا جاسکتا ہے...... اس پر حملہ کیا جاسکتا ہے...... 24 گھنٹوں تک حملہ متوقع ہوسکتا ہے۔

آر۔ این چیئرمین ایک اچھے انداز میں اپنی بات واضح کر رہا تھا۔ ریڈیو کے ذریعے رہنمائی سرانجام دی جائے گی...... سمندر میں اپنے آپ کو شناخت کرنے کی غرض سے...... رخصتی کے وقت کے ضمن میں...... رفتار کے ضمن میں...... جہازوں کے درمیان فاصلے کے ضمن میں...... کسی جہاز کے کاروان سے پیچھے رہ جانے کے ضمن میں...... کسی بھی جہاز کو دشمن ڈبو سکتا ہے لیکن قافلہ انتظار نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد چیئرمین قافلے کے کامریڈ کی جانب متوجہ ہوا جو ایک دبلا پتلا ادھیڑ عمر شخص تھا...... وہ رائل بحریہ ریزرو میں کامریڈ تھا...... اس کا سروس ریکارڈ شاندار تھا۔ وہ گذشتہ تین برسوں میں تقریباً پوری دنیا کا بحری سفر سرانجام دے چکا تھا اور اس کی نگرانی میں دیئے گئے ایک سو بحری جہازوں میں سے محض سات بحری جہازوں سے ہاتھ دھونا پڑا تھا...... سات بحری جہازوں اور 16 زندگیوں کا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ لیکن یہ قافلہ...... جو روس کی جانب رواں دواں تھا...... اس کے اس بہترین ریکارڈ پر پانی پھیر سکتا تھا۔

یہ 1914ء تا 1918ء کی جنگ کا زمانہ تھا جس نے یہ ثابت کیا تھا کہ کارواں...... بحری جہاز بڑے گروپوں کی صورت میں...... ایک دوسرے سے مناسب فاصلے پر اور مسلح نگرانی کے زیر اہتمام تاکہ ان کو حملے کی زد سے محفوظ رکھا جاسکے...... ایک بہتر اور احسن طریقہ تھا جس کے تحت غیر مسلح تجارتی جہازوں کو وسیع تر پانیوں کے پار لے جانا ممکن تھا۔ ایک واحد جہاز اسی صورت میں تن تنہا کامیاب سفر سے ہمکنار ہوسکتا تھا بشرطیکہ وہ برق رفتاری کا حامل ہو اور دشمن کے ریڈاروں سے بچ سکے۔ جہازوں کا کارواں اگرچہ سُست رفتاری کے ساتھ سفر طے کرتا تھا لیکن اس کو تباہ کن جہازوں کے علاوہ دیگر اقسام کا تحفظ بھی حاصل ہوتا تھا اور اس کارواں کو تباہ کرنا ایک آسان امر نہ تھا۔

لیکن زیادہ محدود پانیوں میں جس کے ایک جانب برف ہو اور دوسری جانب جرمن اڈے ہوں...... نقصان کی شرح زیادہ ہونے کی توقع کی جاسکتی تھی۔

دوسری جنگ عظیم کا پہلا قافلہ برطانیہ سے 7 ستمبر 1939ء کو روانہ ہوا تھا اور 27 ستمبر تک برطانیہ کے 14 بڑے قافلے سمندر میں رواں دواں تھے اور برطانوی تجارتی جہازوں کا مزید بیڑہ تیار کیا جارہا تھا۔ جنگ کے پہلے ہفتے کے دوران جبکہ بہت سے جہاز قافلے میں موجود تھے...... کھلے سمندروں میں دشمن کے ہتھے چڑھ گئے تھے 16 اتحادی اور غیر جانبدار جہازوں کو جرمنوں نے ڈبو دیا تھا۔

جتنے زیادہ سے زیادہ جہاز قافلے میں شریک ہوتے گئے نقصان کی شرح اتنی ہی کم ہوتی چلی گئی۔

اس کے بعد دو سانحے پیش آئے...... 1940ء میں فرانس شکست سے دوچار ہوا اور جرمن بحری بیڑے کو ریڈاروں کے لئے نئے اڈے میسر آگئے اور دوسرا سانحہ 1941ء میں روس پر جرمنی کا حملہ تھا۔ اگرچہ اس حملے کے نتیجے میں برطانیہ کو ایک غیر متوقع اتحادی میسر آیا لیکن اس کو رسد باہم پہنچانے کی ذمہ داری ایک اہم مسئلہ تھا۔

براہ راست...... مختصر روٹ...... شمالی روسی بندرگاہ مرمانسک تھی جو ناروے کے قریب واقع تھی اور جو قافلے اس روٹ کے ذریعے رسد بہم پہنچاتے تھے ان کو خفیہ نام 'پی۔کیو' دیا گیا تھا اور جو قافلے واپسی کی راہ اختیار کرتے تھے ان کو خفیہ نام ''کیو پی'' دیا گیا تھا۔ پہلا پی کیو اگست 1941ء میں برطانیہ سے روس کیلئے روانہ ہوا...... یہ روس پر جرمن حملے کے فوراً بعد روانہ ہوا تھا۔ یہ حفاظتی دستے کے علاوہ چھ برطانوی تاجروں اور ایک روسی جہاز پر مشتمل تھا اور یہ ماہ ستمبر میں بحفاظت منزل مقصود تک پہنچ چکا تھا۔ اس قافلے نے 64 لڑاکا طیارے جن کی اشد ضرورت درپیش تھی کے علاوہ 30 فوجی گاڑیاں اور 1500 ٹن فوجی ساز وسامان بہم پہنچایا تھا۔ اس کارواں نے کئی ماہ تک محفوظ سفر سرانجام دیا تھا۔ اس قافلے کا پہلا بحری جہاز مارچ 1942ء میں غرق ہوا تھا کیونکہ اس وقت تک جرمن نے اس روٹ پر سفر کرنے والے قافلوں کو نیست و نابود کرنے کی تدبیر سرانجام دے ڈالی تھی۔

ہم اب اپنے پی کیو قافلے کی جانب آتے ہیں۔ یہ کسی بھی قسم کے نقصان سے دوچار نہ ہوا...... اس میں تمام تر اقسام کے حامل 35 تجارتی جہاز شامل تھے...... یہ تعداد بہت زیادہ تھی...... کئی ایک بحری ماہرین کی دانست میں یہ تعداد ایک بہت بڑی تعداد تھی۔ لیکن سیاسی دباؤ موجود تھا...... اوپر سے از حد سیاسی دباؤ موجود تھا کہ سویت یونین کی مدد کی جائے۔

یہ قافلہ اپنی منزل کی جانب گامزن رہا۔ منگل، بدھ، جمعرات اور جمعہ بخریت گزر گیا۔ اس دوران تباہ کن جہازوں میں ٹینکر نے ایندھن بھرا۔

بروز ہفتہ چار بجے بعد از دوپہر مخالف سمت سے واپس پلٹنے والا ایک قافلہ ان کے قریب سے گزرا اور اس کے چند لمحوں بعد جرمن ہوائی جہاز نمودار ہوا اور اس قافلے سے ہزاروں فٹ اوپر اس کے پر منڈلانے لگا۔ اس نے قافلے کی رفتار اور سمت کے بارے میں جرمن بحری ہیڈ کوارٹر کو مطلع کر دیا گیا۔

دو گھنٹے بعد جرمن طیاروں کا ایک اسکوارڈن مشرق کی جانب سے نمودار ہوا اور بحری جہازوں کے قافلے پر حملہ آور ہوا اور قافلے پر بمباری کرنے لگا۔ دو جرمن طیارے مار گرائے گئے اور سمندر کی نذر ہو گئے جبکہ برطانیہ کا ایک بحری جہاز سخت نقصان سے دوچار ہوا اور اسے آئس لینڈ واپس بھیجنے کے احکامات جاری کر دیے گئے۔

32 منٹ بعد پانچ تارپیڈو بمبار طیارے نمودار ہوئے۔ انہوں نے تارپیڈو برسائے لیکن ان کا نشانہ خطا گیا۔ ایک بمبار طیارے کو مار گرایا گیا۔

اس کے بعد جرمنی کی کارروائی جاری رہی۔ اگلی صبح دن دیہاڑے پہلے نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ یو۔بوٹ کے ذریعے ایک تجارتی جہاز کو نشانہ بنایا گیا۔ اس کو تارپیڈو کا نشانہ بنایا گیا اور وہ فوراً ڈوب گیا۔ ایک تباہ کن جہاز نے اس کے عملے کے 40 ارکان میں سے 28 ارکان کو بچا لیا۔ پانی کا درجہ حرارت نقطعہ انجماد سے ایک درجہ اوپر تھا۔

بروز سوموار صبح سات بجے قافلہ جمی ہوئی برف کے نزدیک تر پہنچ چکا تھا۔ لہٰذا اس نے جنوب' مشرق کی سمت کا راستہ اختیار کر لیا۔ وہ نصف سفر طے کر چکے تھے۔ ابھی انہوں نے بدترین حالات سے مقابلہ کرنا تھا۔ دو گھنٹوں کے بعد بمبار طیاروں کا شدید حملہ ہوا۔ اس حملے میں غوطہ لگا کر بمباری کرنے والے طیارے...... تارپیڈو بمبار طیارے بھی شامل تھے۔ غالباً ان طیاروں کی تعداد بیس کے قریب تھی۔ چند منٹوں کے اندر اندر تین تجارتی جہاز سمندر میں ڈوب چکے تھے اور ان جہازوں کے ڈوبنے سے انسانی جانیں بھی کثیر تعداد میں ضائع ہوئی تھیں۔

اس کے بعد ٹینکر کو ایک تارپیڈو آن لگا۔ تیل سے آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ لیکن عملے نے کسی نہ کسی طرح آگ پر قابو پا لیا اور ٹینکر کو سطح آب پر رواں دواں رکھنے میں بھی کامیاب رہے۔ ٹینکر سے نکلنے والے آگ کے شعلے سینکڑوں میل دور سے دکھائی دیتے تھے۔ لہٰذا تمام تر جرمنی بحری بیڑہ اور فضائی بیڑہ قافلے کی موجودگی اور اس کی درست سمت سے واقف ہو چکا تھا اور وہ اس کے خلاف مناسب کارروائی میں مصروف تھے۔

اس مرتبہ جنوب سے مزید غوطہ خور بمبار طیارے نمودار ہوئے۔ انہوں نے دو بحری جہازوں کو نشانہ بنایا لیکن جہاز سطح آب پر تیرتے رہے اور ڈوبنے سے محفوظ رہے اور وہ اپنا سفر طے کرنے کے بھی قابل تھے۔

ایک اور طیارہ 20,000 فٹ کی بلندی سے غوطہ لگا کر آیا اور اچانک شور بلند ہوا۔ قافلے کے عین وسط میں موجود اسلحے کے ایک جہاز کو نشانہ بنایا گیا تھا اور جہاز نذر آتش ہو چکا تھا۔

تین سیکنڈ بعد یہ جہاز ڈوبنے لگا تھا۔

بروز بدھ تین روسی تباہ کن بحری جہاز مرمانسک سے اس قافلے کی مدد کیلئے آن پہنچے۔

آخری روز یعنی بروز جمعرات ان جہازوں کو سطح آب پر نو روز گزر چکے تھے جن میں سے پانچ روز تک وہ حملہ آوروں کی زد میں رہے تھے۔

35 جہازوں کے قافلے میں سے سات جہاز ڈوب چکے تھے۔ ان کے عملے کی ایک بڑی تعداد کو بچا لیا گیا تھا اور قافلہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ چکا تھا۔

اس دوران اسی بحری روٹ سے روس کی جانب قافلے آتے اور جاتے رہے اور مشکل گھڑی میں روس کی مدد سرانجام دیتے رہے اور یہ قافلے انسانی عزم و جرأت کی ایک لافانی داستان تھے اور انسانی ہمت اور جرأت کی فتح کے مترادف تھے۔

......❁......

وہ دلائی لامہ کا اتالیق بن گیا

ہینرچ ہارر لاساسا کے ممنوعہ شہر میں پائی پائی کو محتاج لڑکھڑا رہا تھا۔ وہ تھکا ماندہ تھا اور چیتھڑوں میں ملبوس تھا۔ یہ ایک الگ داستان ہے کہ وہ کس طرح ہندوستان کی شمال مشرقی سرحد سے اس مقام تک پہنچا تھا لیکن وہ نوجوان دلائی لامہ کا اتالیق کس طرح بنا یہ ایک دلچسپ داستان ہے اور جدید دور کی ذاتی مہمات میں سے ایک قابل ذکر اور اہم مہم کی حیثیت کی حامل ہے۔

ہارر نے اپنی داستان اپنی تحریر ''تبت میں سات برس'' میں تحریر کی ہے۔

وہ ایک جرمن باشندہ تھا اور کوہ پیا بھی تھا۔ 1939ء میں وہ نانگا پربت کی چوٹی سر کرنے کے لئے ہندوستان میں موجود تھا۔ 1939ء میں جب دوسری جنگ کا آغاز ہوا تو اسے ڈیرہ ڈون کے ایک کیمپ میں نظر بند کر دیا گیا۔

اس نے یہاں سے پہاڑوں کی جانب فرار ہونے کا منصوبہ بنایا اور تبت کی جانب روانہ ہوا۔ دو مرتبہ وہ فرار ہونے میں کامیاب ہوا اور دونوں مرتبہ وہ پکڑا گیا اور واپس کیمپ بھیج دیا گیا اور 1943ء میں اس نے تیسری مرتبہ فرار ہونے کی کوشش کی اور خوش قسمتی سے اس مرتبہ وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ اور اس کے ساتھی کوہ پیا اوف شینٹر نے تبت میں داخل ہونے کا بندوبست سرانجام دیا۔

لیکن ان کا ہدف ایک ہزار میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ دو برس سے زائد عرصے تک ہارر اور اس کا ساتھی مشکلات اور مصائب کا شکار رہے۔ اکثر انہیں بھوک برداشت کرنا پڑتی تھی۔ شدت کی سردی برداشت کرنا پڑتی تھی اور تھکن سے ان کا بُرا حال ہوتا تھا۔ وہ موسموں کے تغیر و تبدل کا شکار رہتے تھے۔ ہارر کے بقول کہ:۔

> ''کبھی ہم شدت کی سردی کا شکار ہوتے تھے اور کبھی ہم تپتے سورج کا شکار ہوتے تھے۔ کبھی ژالہ باری...... بارش اور دھوپ یکے بعد دیگرے ہم پر حملہ آور ہوتی تھی...... ایک صبح جب ہم بیدار ہوتے تھے تو اپنا خیمہ برف میں دھنسا ہوا پاتے تھے جو چند گھنٹوں بعد سورج کی تمازت سے پگھل جاتی تھی''

ان کے یورپی طرز کے حامل ملبوسات ایسے موسم میں کارآمد نہ تھے۔ لہٰذا انہوں نے مقامی طرز کے ملبوسات زیب تن کرنا شروع کر دیے تھے۔ اگرچہ ان کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن مجموعی طور پر اہل تبت مہربان لوگ واقع ہوئے تھے۔ وہ تبتی اہلکاروں سے خائف رہتے تھے کہ وہ کہیں انہیں ہندوستان واپس نہ بھیج دیں۔ لہٰذا وہ ان سے بچنے کی از حد کوشش کرتے تھے۔

وہ کے رونگ پہنچ چکے تھے...... اس کا مطلب ہے ''خوشی کا گاؤں'' ...... یہاں پہنچنے پر انہیں قدرے آرام میسر آیا...... بشرطیکہ اسے آرام کا نام دیا جا سکتا تھا...... کیونکہ انہیں چوہوں اور دیگر حشرات الارض سے نپٹنا پڑتا تھا۔ ہارر نے یہاں پر ایک پتلون سلوانے کی بھی جسارت کی تھی۔

انہیں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ وہ اردگرد بسنے والے جنگلی درندوں سے خبردار رہیں۔ ان درندوں میں چیتے اور ریچھ بھی شامل تھے۔ ایک روز بارر کا سامنا ایک جنگلی کتے سے ہوگیا تھا۔ اس کے بازو پر کتے کے تشدد کے نشان ہنوز موجود تھے۔

موسم سرما کے آغاز میں انہوں نے وسطی ایشیا کا بلند سطح مرتفع عبور کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے غلط وقت کا انتخاب کیا تھا۔ لیکن ان کا خیال تھا کہ کے رونگ میں رہائش پذیر رہنا زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔

انہوں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی لیکن انہیں محسوس ہوا کہ انہوں نے اپنی قوت کا اندازہ غلط لگایا تھا۔ وہ اس قدر توانائی کے حامل نہ تھے جس قدر توانائی کے حامل وہ اپنے آپ کو تصور کرتے تھے۔ وہ سرد ہوا کے سامنے مجبور اور بے بس ہو کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے ایک سردترین رات خیمے میں بسر کی۔

انہوں نے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچ کر آرام کیا۔ اس گاؤں کا نام ٹریک چن تھا۔ اگلی منزل پر ان کو مونٹ ایورسٹ دکھائی دے رہا تھا۔ انہوں نے اس کے کچھ اسکیچ تیار کئے۔

اب فیصلے کی گھڑی آن پہنچی تھی۔ انہیں یہ فیصلہ سرانجام دینا تھا کہ لاحاسا تک کا سفر انہیں شاہراہ کے ذریعے طے کرنا تھا یا کسی متبادل روٹ سے طے کرنا تھا۔ وہ اتنی دور پہنچ چکے تھے کہ اپنی کامیابی کو داؤ پر لگانے کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ گرفتار ہونے کے خدشے کا شکار نہیں بننا چاہتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے شاہراہ کی بجائے شمالی میدانوں سے سفر طے کرنے کا پروگرام بنایا۔ ان میدانوں میں اکادکا خانہ بدوش آباد تھے اور ان کے ساتھ نپٹنا وہ بخوبی سیکھ چکے تھے۔

اتفاق سے ان کو ایک چھوٹا خیمہ دکھائی دیا۔ اس خیمے میں ایک بوڑھا جوڑا اور ان کا بیٹا رہائش پذیر تھا۔ انہوں نے ان دونوں کو کھانا کھلایا اور ان کے ہاتھ تبتی بیل کا گوشت بھی فروخت کیا جو انہوں نے ذخیرہ کرلیا۔

اپنے سفر کے دوران انہیں کئی مرتبہ پھر برف کے یخ بستہ پانی میں سے گزرنا پڑتا اور سردی کی وجہ سے ان کے پاؤں سن ہوجاتے۔ دن کے اختتام پر وہ چند میل کا سفر طے کر چکے تھے۔ لیکن ابھی انہیں بدترین حالات کا سامنا کرنا تھا۔ ایک اجنبی نے ان کو روک لیا تھا۔ یہ اجنبی ایک مختلف زبان میں بات کر رہا تھا۔ وہ ان سے یہ دریافت کر رہا تھا کہ وہ کہاں سے آئے تھے اور انہیں کہاں جانا تھا۔ وہ اس کو قائل کرنے میں کامیاب ہوئے کہ وہ محض زائرین تھے اور اس نے انہیں مزید تنگ کئے بنا ہی چھوڑ دیا۔ بعد میں جب کچھ دوست خانہ بدوشوں سے ان کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے انہیں بتایا کہ وہ اجنبی لازمی طور پر ڈاکہ زنی کرنے والا خاماپاس تھا۔ بعد میں ان ڈاکوؤں کا گروہ کافی فعال ہوگیا تھا۔ وہ رائفلوں اور تلواروں کے ساتھ مسلح ہوتے تھے اور یہ خاماپاس ایک کے بعد دوسرے خیمے کو اپنی لوٹ مار کا نشانہ بناتے تھے اور قیمتی اشیاء لوٹ کرلے جاتے تھے۔ اگرچہ وہ پکڑے جاتے تو حکومت انہیں قرار واقعی سزا دیتی لیکن اس کے باوجود بھی وہ لوٹ مار سے باز نہ آتے تھے۔

انہیں یہ احساس ہوا کہ وہ ایک لٹیرے سے بال بال بچ گئے تھے۔ لہٰذا یہ "زائرین" برف پر رات کو سفر طے کرنے لگے۔ وہ ان لٹیروں سے اس قدر دور ہوجانا چاہتے تھے جس قدر دور ہونا ان کے بس میں تھا۔ سردی شدید تھی۔ سردی اس قدر شدید تھی کہ دوران سفر جب وہ خشک گوشت کا

ایک چمچ اپنے منہ میں ڈالنے کی کوشش کرتے تھے تو چمچ کی دھات اس قدر سرد ہوتی تھی کہ ان کے ہونٹ اس کی ٹھنڈک سے جم جاتے تھے۔ اگلے روز وہ ایک ایسے کیمپ میں پہنچ چکے تھے جہاں پر پندرہ افراد قیام پذیر تھے۔ ان کے پاس تقریباً 50 کے قریب تبتی بیل تھے اور دو سو بھیڑیں بھی موجود تھیں چونکہ ان کو بھی خاماپاس کی جانب سے حملے کا خطرہ تھا لہٰذا انہوں نے ان دونوں افراد کو خوش آمدید کہا کیونکہ ان کے شامل ہو جانے سے ان کو مزید تقویت میسر آئی تھی۔ یہ دونوں مسافر کئی روز تک اس قافلے کے ہمراہ محو سفر رہے۔ اگرچہ ان کے سفر کی رفتار سست تھی لیکن ان کو پینے کے لئے گرما گرم سوپ مل جاتا تھا اور اس کے علاوہ سفر کے ساتھی بھی انہیں میسر تھے۔ بعد میں انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ انہیں تنہا سفر سرانجام دینا چاہیے۔ اس سلسلے میں ہارر نے تحریر کیا کہ:۔

"اب ہمارا مستقل ساتھ ہوا اور سردی کے ساتھ تھا۔ ہمیں ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے تمام تر دنیا کا درجہ حرارت نقطعہ انجماد سے تیس درجے نیچے گر چکا ہو۔"

ان کے پاس خوراک کی بھی قلت تھی۔ محض اتنی خوراک موجود تھی کہ روح اور جسم کا رشتہ برقرار رکھنا ممکن ہو سکے۔ وہ اپنے تبتی بیل اور کتے کی حالت دیکھ کر بھی ازحد پریشان تھے۔ وہ بھی فاقوں کا شکار تھے۔ یہ دونوں جانور محض ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ گئے تھے۔ مزید بیس روز تک انہوں نے تمام تر مصائب برداشت کئے اور اپنا سفر جاری رکھا۔ وہ برف باری اور دھند میں بھی اپنا سفر سرانجام دیتے رہے۔ ان کے مصائب بھرے دن ختم ہونے کو نہ آتے تھے حتیٰ کہ وہ 20,000 فٹ کی بلندی پر واقع گورنگ لا پاس پہنچ گئے۔ یہ دنیا کا بلند ترین درہ تھا۔ ان کے بال اور داڑھیاں سردی کی شدت کی بنا پر جم چکی تھیں۔ ہارر بھی علیل ہو چکا تھا اور اسے خطرہ تھا کہ وہ مزید سفر برقرار نہ رکھ سکے گا۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے جدوجہد جاری رکھی۔ اب وہ قدرے کم شدت کی سردی کے حامل علاقے میں داخل ہو چکے تھے جس کی بنا پر وہ قدرے پُرسکون تھے۔ درحقیقت وہ ایک ایسی وادی میں داخل ہو چکے تھے جو لاحاسا کے میدان کی جانب جاتی تھی۔

ابھی وہ لاحاسا سے تین روز کی مسافت پر تھے کہ انہوں نے اپنے آپ کو ایک ایسے علاقے میں پایا جہاں پر موسم بہار اپنے جوبن پر تھا۔ سرسبز چراگاہیں دکھائی دے رہی تھیں اور درختوں پر پرندے چہچہا رہے تھے۔ ایک کسان نے انہیں رات گزارنے کے لئے جگہ بھی دے دی تھی۔

ان کے حلیے بگڑ چکے تھے۔ کپڑے پھٹ چکے تھے۔ وہ بدترین صورت حال کا شکار تھے اور اسی حلیے میں انہیں تین سو برس پرانے پوٹالا کی چھتیں دکھائی دیں...... یہ نوجوان دلائی لامہ کی موسم سرما کی رہائش گاہ تھی۔ کے رونگ سے روانہ ہونے کے بعد وہ اب تک 600 میل سے زائد سفر طے کر چکے تھے۔ وہ 75 روز تک سخت سردی میں سفر سرانجام دیتے رہے تھے۔ اس دوران وہ بھوک...... خطرات اور تھکن کا بھی شکار ہوئے۔ اس تمام تر سفر کے دوران انہوں نے محض پانچ روز آرام کیا تھا۔ انہیں اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے ابھی مزید چھ میل کا سفر طے کرنا تھا۔

اب وہ ایک بہتر علاقے میں سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ پھر وہ اپنے پکڑے جانے کے خطرے سے دوچار تھے۔ انہیں خطرہ لاحق تھا کہ حکام کہیں انہیں پکڑ نہ لیں اور واپس ہندوستان نہ بھیج دیں۔ لیکن ان کی خوش قسمتی تھی وہ جس پہلے اہلکار سے متعارف ہوئے وہ مسٹر تھانگم تھا...... "ماسٹر آف الیکٹرک سٹی"...... شہر میں بجلی کا نگران...... وہ نہ صرف انہیں اپنے ہمراہ اپنے گھر لے آیا بلکہ ان کا بہتر طور پر استقبال بھی کیا...... انہیں خوش آمدید کہا

اوران کے طبی معائنے کیلئے ڈاکٹر کو بھی طلب کیا۔

ہارر نے اس سلسلے میں اپنا نکتہ نظر بیان کرتے ہوئے کہا کہ:۔

''دنیا کا کوئی بھی ملک دو غریب پناہ گزینوں کا اس طرح استقبال نہیں کرتا جس طرح تبت میں ہمارا استقبال ہوا۔''

حکومت کی جانب سے انہیں نئے کپڑے مہیا کئے گئے......ان کے میزبان نے اور اس کے اہل خانہ نے ان کے ساتھ دوستانہ برتاؤ کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر مصائب بھرا جو سفر طے کیا تھا اس سفر کی بدولت ان کو قدر و منزلت اور عزت میسر آئی۔ آٹھ روز کے بعد انہیں دلائی لامہ کے والدین کی رہائش گاہ پر طلب کیا گیا جہاں پر ان کی ملاقات لامہ کے بھائی سے ہوئی۔ اس کا نام لوب سینگ سمٹن تھا۔ اس نے ان سے مختلف سوالات کئے اور کہا کہ اس کا بھائی ان کے سفر کا مفصل حال سننے کا مشتاق تھا۔

اس ملاقات کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ان کے ساتھ مزید بہتر سلوک کا مظاہرہ کیا جانے لگا۔ حکام بالا اب انہیں نقل و حرکت کی آزادی بخوبی فراہم کررہے تھے۔ ایک امیر شخص نے انہیں اپنے گھر میں ایک بڑا کمرہ رہائش اختیار کرنے کیلئے فراہم کردیا تھا۔ اس شخص کا نام تسارونگ تھا۔ یہ کمرہ یورپی طرز سے سجایا گیا تھا۔

ایک روز جبکہ ہارر بستر علالت پر دراز مجبور اور بے بس پڑا تھا کہ اسی اثنا میں کچھ سپاہی آن پہنچے اور انہوں نے یہ مایوس کن خبر سنائی کہ انہیں حکام بالا سے یہ احکامات موصول ہوئے ہیں کہ ان دونوں افراد کو واپس ہندوستان بھجوادیا جائے۔ تھوڑی بہت بحث مباحثے کے بعد سپاہی بالآخر واپس چلے گئے۔ ہارر نے اس ضمن میں اپنے دوستوں سے مدد اور تعاون کی درخواست کی اور اس طرح یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔

حالات نے ایک مرتبہ پھر اس وقت پلٹا کھایا جب اوف شینٹر جو ایک زرعی انجینئر تھا......اسے تبت کے ایک اعلیٰ حکام نے ایک زرعی نہر تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ اس دوران ہارر نے بھی یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی غرض سے اپنے میزبان کے باغیچے میں ایک فوارہ تعمیر کرے گا۔ ان سرگرمیوں نے ان دونوں افراد کو لاحاسا میں اپنی صورت حال مستحکم کرنے میں انتہائی معاونت سرانجام دی۔

لاحاسا میں نئے سال کا جشن منایا جارہا تھا۔ ہارر نے اس جشن کی تمام تر تقریبات میں حصہ لیا۔ دیگر زائرین کے ہمراہ اس نے چودہ سالہ دلائی لامہ کے ہاں بھی حاضری دینے کا شرف حاصل کیا۔ اس کے بعد کئی ایک مواقع پر وہ پوٹالا میں اپنے ان دوستوں کا مہمان بھی رہا جو وہاں پر رہائش پذیر تھے۔

ہارر نے اپنے میزبان کے باغیچے میں جو فوارہ تعمیر کیا تھا اس کی تعمیر کی خبریں دور دور تک پھیل چکی تھی۔ لہٰذا اعلیٰ حکام نے اسے دلائی لامہ کے موسم گرما کے محل کی عمارت کی تعمیر کی نگرانی کیلئے ملازمت کی پیشکش کی۔ اس پراجیکٹ کی تکمیل کیلئے پانچ سو سپاہی اور ایک ہزار قلی اس کی نگرانی میں دے دیے گئے۔ اس نے ان سے انتہائی کامیابی کے ساتھ کام کروایا۔ اب کئی ایک اعلیٰ حکام اسے اپنا مہمان بنانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

اب ان دونوں افراد کے رتبے اور مرتبے میں برابر اضافہ ہورہا تھا۔ اب وہ دولت کمانے کے قابل بھی ہوچکے تھے اور اب وہ اپنے محسن تسارونگ کو اپنی رہائش گاہ کا کرایہ بھی ادا کرسکتے تھے۔ لاحاسا میں انہیں ہرفن مولا سمجھا جانے لگا تھا اور ایک روز ہارر نے دلائی لامہ کی جانب سے بھیجے

گئے ایک وفد کا حیرانگی کے عالم میں استقبال کیا۔

اس سلسلے کی ابتداء دلائی لامہ کے بھائی لوب سینگ سمٹن کی جانب سے ہوئی جس کے ساتھ ہارر کے آغاز ہی سے بہتر تعلقات استوار تھے۔لیکن حقیقی وفد دلائی لامہ کے سرپرستوں کی جانب سے روانہ کیا گیا تھا۔یہ ایک حکم کے سوا کچھ نہ تھا اور حکم یہ تھا کہ ہارر دلائی لامہ کے موسم گرما کے محل ناربلنکا میں ایک سینما پروجیکشن روم تعمیر کروائے۔ہارر نے جلد از جلد اس تعمیر کی منصوبہ بندی شروع کردی کیونکہ حکم عدولی کی گنجائش موجود نہ تھی۔

لاحاسا کے بہترین معمار ہارر کے سپرد کر دیئے گئے۔ہارر نے مطلوبہ تعمیر کے لئے بہترین مقام کا انتخاب کیا اور تعمیر کا کام شروع کروا دیا۔

سینما کی تعمیر اس کی عظیم کامیابی ثابت ہوئی اور دلائی لامہ نے اس سینما گھر میں فلم دیکھی۔وہ جن فلموں سے لطف اندوز ہوا ان فلموں میں ''ہینری V'' کے علاوہ مہاتما گاندھی کی ایک دستاویزی فلم بھی شامل تھی۔اس فلم کو اس نے کئی مرتبہ دیکھا۔

اس کے بعد سب سے بڑھ کر حیران کن بات منظر عام پر آئی...... دلائی لامہ نے ہارر کو اپنا ذاتی اتالیق مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔اس وقت اس کے علم میں یہ بات نہ تھی کہ یہ جرمن ایک تربیت یافتہ استاد بھی تھا۔

ہارر نے مابعد اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ:۔

''میں نے جو وقت اپنے شاگرد کے ہمراہ گزارا وہ وقت میرے لئے بھی اسی قدر حصول علم کا باعث بنا جس قدر حصول علم کا باعث میرے شاگرد کے لئے بنا...... میرے شاگرد نے مجھے تبت کی تاریخ کے بارے میں بہت کچھ بتایا...... اس کے علاوہ اس نے مجھے گوتم بدھ کی تعلیمات کے بارے میں بھی بہت کچھ بتایا۔''

لیکن سیاسی حالات اب سازگار نہ رہے تھے۔پیکنگ ریڈیو کا لہجہ بھی تلخ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

لاحاسا میں نئے فوجی دستے تیار کئے جا رہے تھے۔فوجی مشقیں اور پریڈ میں روزمرہ کا معمول بن چکا تھا۔جیسا کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ دلائی لامہ کو ملک سے فرار ہونا پڑا اور اس نے ہندوستان میں سیاسی پناہ حاصل کر لی کیونکہ حملہ آور چینی تبت میں گھس آئے تھے۔

اور ہینرچ ہارر کے لئے بھی تبت سے روانگی کا لمحہ آن پہنچا تھا اور وہ لاحاسا کو خدا حافظ کہنے پر مجبور تھا اور یہی وہ مقام تھا جہاں پر اس نے محبت نچھاور کرنے کا درس حاصل کیا تھا۔

اس نے غمناک انداز میں یہ اقرار کیا کہ:۔

''میں جہاں کہیں بھی رہوں گا مجھے تبت کی یاد ستاتی رہے گی۔''

......❀......

اکوالنگ کے ذریعے پہلی غوطہ خوری

ایک اور دنیا کی جانب رخت سفر باندھنا شروع ہی سے بنی نوع انسانوں کے پسندیدہ خوابوں میں سے ایک خواب رہا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران زیر تسلط یورپ میں لاکھوں لوگ اس خواب میں مبتلا ہوئے تھے۔

لیکن جس شخص نے اس صدی کا قابل ذکر اور اہم ترین خواب محسوس کیا اس شخص کا نام کیپٹن جیکوئس۔ یس کوسٹی تھا جس نے 1943ء کی ایک صبح اپنا غوطہ خوری کا لباس زیب تن کیا...... یہ لباس اس نے بذات خود ڈیزائن کیا تھا...... اور زیر سمندر دنیا میں جا پہنچا...... وہ معمول کے مطابق سانس لیتا رہا اور اس دنیا کے جادو بھرے نظاروں اور خوبصورتی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ وہ پہلا شخص تھا جو انسان نما مچھلی کے روپ میں جلوہ گر ہوا۔

کوسٹی دشمن کے تسلط کے مصائب اور شکست کی شرم سے فرار حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جنگ سے بہت پہلے زیر پانی دنیا اس کے دل کو بھاتی تھی۔ وہ اس امر پر یقین رکھتا تھا کہ بنی نوع انسان اسی عنصر کے ساتھ اپنی بقا کو قائم رکھ سکتا تھا جس عنصر کے ساتھ لاکھوں برس پیشتر وہ حقیقت میں ظہور پذیر ہوا تھا بشرطیکہ وہ اپنے پھیپھڑوں کو ہوا سے بھرنے کا بندوبست بخوبی سرانجام دینے کے قابل ہو۔ پہلے پہل اس کو مصنوعی طور پر ایک اکوالنگ کے ذریعے سرانجام دیا جا سکتا تھا۔ مابعد شاید بنی نوع انسان اکوا۔ لائف کو فطری طور پر اپنا لے جیسا کہ بہت سے دودھ پلانے پر جانور کر چکے تھے۔

کوسٹی فرانسیسی بحریہ میں خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ 1936ء میں اس نے گاگلز کے ہمراہ غوطہ خوری سے لطف اندوز ہونے کی ابتداء کی تھی۔ ان دنوں اس طرز کی غوطہ خوری تیراکوں میں عام طور پر مروج تھی۔ کئی برسوں سے کوسٹی اور اس کے ساتھی غوطہ خوری کے ایسے ساز و سامان کے خواب دیکھ رہے تھے جو کمپرسیڈ ائر کا حامل ہو جو غوطہ خور کو پانی کے اندر زندہ رہنے میں معاون ثابت ہو۔ ایک غوطہ خور دو یا تین منٹ تک اپنے سانس کی آمد و رفت کو برقرار رکھ سکتا تھا اور یہ دورانیہ اس قدر کم تھا کہ اس دوران سمندر کے نیچے موجود دنیا سے مکمل طور پر لطف اندوز ہونا ممکن نہ تھا۔

زیر پانی دنیا کی تحقیق و تفتیش سرانجام دینے کی خواہش اتنی ہی پرانی ہے جتنی پرانی ہماری تاریخ ہے۔

تب اکوالنگ منظر عام پر آیا اور اسے کیپٹن کوسٹی نے 1943ء کے موسم گرما میں استعمال کیا۔

کوسٹی نے بندول کے ریلوے اسٹیشن سے اس اکوالنگ کو حاصل کیا جو کہ ایک نزدیکی قصبے میں واقع تھا۔ اسے سائیکل پر رکھا اور ساناری کی جانب روانہ ہوا جہاں پر اس کی بیوی سیمون اور اس کے دو غوطہ خور ساتھی بڑی بے صبری کے ساتھ اس کھلونے کے انتظار میں تھے۔ اس کے ساتھیوں کے نام فلپ ٹیلزی اور فریڈرک ڈیوس تھے۔

وہ ساحل سمندر تک جا پہنچے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی سرگرمیاں اٹلی کے فوجی دستوں کی نظر میں آئیں یا ان مقامی لوگوں کی نظر میں آئیں جو ساحل سمندر پر نہانے کے عمل سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

کوسٹی نے اکوالنگ زیب تن کیا...... اپنی پشت پر کمپرسیڈ ائر کے تین سلنڈر رکھے۔ ناک اور آنکھوں کی حفاظت کے لئے ٹوٹنے سے محفوظ شیشے کا ایک کور جمایا۔ یہ تدبیر بھی اختیار کی گئی تھی کہ اس کی بیوی سیمون سطح آب پر تیرتی رہے گی۔ اس کے پاس ماسک اور سانس کی آمدورفت بحال رکھنے والی ٹیوب ہوگی اور وہ سطح آب سے کوسٹی پر نظر رکھے گی اور اگر کوسٹی کسی مشکل کا شکار نظر آئے گا تو وہ ڈیومس کو اشارہ کرے گی جو ساحل سمندر پر کھڑا ہوگا اور اس کی مدد کیلئے غوطہ لگانے کے لئے تیار ہوگا۔

تیراکی کے اس ساز وسامان کا وزن پچاس پونڈ تھا اور کوسٹی اپنی پہلی غوطہ خوری کے لئے سمندر میں کود چکا تھا۔ وہ سمندر کی تہہ میں اپنے آپ کو بے وزن...... ہلکا پھلکا اور پُرسکون محسوس کررہا تھا۔ وہ ایک انسان نما مچھلی بن چکا تھا اور اس خاموش دنیا کے عجوبوں کا نظارہ کررہا تھا۔

وہ سمندر میں نیچے اور اوپر کی جانب حرکت کررہا تھا۔ اب وہ مزید نیچے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اپنے غوطہ خوری ساز وسامان کی بدولت اسے سانس کی آمدورفت میں آسانی محسوس ہورہی تھی۔

جونہی وہ مزید نیچے چلا آیا...... اکوالنگ نے خود بخود اسے زیادہ ہوا بہم پہنچانی شروع کردی کیونکہ پانی کا دباؤ بڑھ چکا تھا۔ 30 فٹ کی گہرائی پر اسے دباؤ کا کوئی اثر محسوس نہ ہورہا تھا۔ اگرچہ سطح کی نسبت اس گہرائی پر دباؤ دوگنا ہوتا ہے۔

اسے مچھلی کی مانند تیرتے ہوئے لطف محسوس ہورہا تھا۔ تیراکی کا یہ طریقہ ایک منطقی طریقہ تھا۔

1943ء کے موسم گرما کے دوران کوسٹی اور اس کے ساتھیوں نے اکوالنگ کے ساتھ پانچ صد مرتبہ غوطہ خوری سرانجام دی۔ ان کو اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ اکوالنگ کے ذریعے غوطہ خوری میں زیادہ توانائی صرف ہوئی تھی۔ لہٰذا انہیں زیادہ کلوریز کی حامل غذا استعمال کرنے کی ضرورت درپیش تھی اور مقبوضہ فرانس میں ایسی غذا کا حصول انتہائی مشکل امر تھا۔ حتیٰ کہ زیر پانی مچھلی کا شکار بھی اتنی کلوریز کا استعمال درکار رکھتا تھا جتنی کلوریز مچھلی سے حاصل نہ ہوتی تھیں۔

زیادہ گہرائی میں اکوالنگ کی کارکردگی کی پڑتال ضروری تھی۔ لہٰذا 240 فٹ کی گہرائی میں ایک کشتی لنگر انداز کی گئی اور غوطہ خور تہہ نشین ہوئے اس لنگر کی زنجیر کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ ایک سو فٹ سے نیچے روشنی مدہم تھی اور جونہی وہ مزید نیچے گیا اس کے ساتھ عجیب وغریب واقعات رونما ہونے لگے۔ واپس اوپر اٹھنے سے پیشتر وہ 210 فٹ کی گہرائی تک جا پہنچا تھا۔

غوطہ زن کے لئے ایک اور مشکل اور خطرناک صورت حال اس صورت حال کو کہا جاتا ہے جسے "نیلے پانیوں میں جانا" کہتے ہیں۔ اگر ایک غوطہ خور سطح یا تہہ کو نہ دیکھ سکتا ہو اور نہ ہی کسی اور حوالہ جاتی نقطے کو دیکھ سکتا ہو...... مثلاً لنگر کی زنجیر وغیرہ...... تب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ "نیلے پانی" میں ہے۔ ایسی صورت میں اس کے اردگرد کچھ نہیں ہوتا ماسوائے نیلا گہرا سمندر...... ایسی صورت میں وہ سمت کا تعین کرنے میں بھی ناکام رہتا ہے اور وہ مسائل کا شکار ہوجاتا ہے اور کسی بھی سانحے سے دوچار ہوسکتا ہے۔

1945ء میں کیپٹن کوسٹی نے فرانسیسی بحریہ کا زیر سمندر ریسرچ گروپ قائم کیا اور دنیا کے کئی ایک حصوں کی جانب بذات خود تحقیقاتی مہمات پر روانہ ہوا۔

1953ء اس کی ایک تحریر شائع ہوئی تھی جس کا عنوان تھا:۔

''خاموش دنیا''

اس تحریر میں اس نے اپنی زیر سمندر مہمات کا ایک نقشہ کھینچا تھا۔ مابعد اس پر ایک فلم بھی بنائی گئی تھی۔
اکوالنگ 20ویں صدی کی عظیم مہمات میں سے ایک عظیم اور اہم مہم تھی اور اس ایجاد نے انسان کیلئے ایک نئی دنیا کی تحقیق کے دروازے کھول دیے تھے۔

ایک شخص جس کا وجود ہی نہ تھا

جس امر پر بخوشی یقین کرلیا جاتا ہے اس امر کے برعکس ذہانت آمیز کام بے لطف اور بے روح دکھائی دیتا ہے۔ اکثر ایسا نہیں ہوتا کہ حقیقی لطف کی حامل کوئی شے منظر عام پر آئے لیکن جب وہ منظر عام پر آجائے تب یہ اوٹ پٹانگ داستانوں سے بڑھ کر ثابت ہوتی ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانوی بحریہ کی انٹیلی جنس نے جنگ کی تاریخ کا ایک بہترین سیکرٹ سروس آپریشن سرانجام دیا جو کسی گراں قدر معرکے سے کسی طور پر بھی کم نہ تھا۔ یہ آپریشن چیف آف سٹاف کی توقعات سے بڑھ کر کامیاب ثابت ہوا اور اس آپریشن کی بدولت بہت سے اتحادیوں کی زندگی بچانا ممکن ہوا۔ اگرچہ اس آپریشن کی کامیابی کا سہرا رائل نیوی انٹیلی جنس کے لیفٹیننٹ کمانڈر ایون مونٹاگو کے سر تھا لیکن اس آپریشن کا ہیرو ایک انجانا برطانوی شہری تھا جو اس آپریشن کے آغاز سے پیشتر ہی موت سے ہمکنار ہو چکا تھا اور اس کے جسم کو اتحادیوں کے عظیم تر مفاد میں استعمال میں لایا گیا۔

یہ ایک خوشگوار آپریشن تھا کیونکہ اس آپریشن کے دوران ایک انجانے شخص کے جسم کو استعمال میں لانا تھا۔ اعلیٰ حکام خفیہ طور پر اس منصوبے پر غور کرتے رہے تھے۔

آنجہانی الفریڈ ڈف کوپر نے ایک ایسے شخص کی ایک افسانوی داستان تحریر کی تھی جو جنگ میں اپنی خدمات سرانجام دینے کا از حد متمنی تھا۔ لیکن اس کی صحت اس امر کی اجازت نہ دیتی تھی۔ اسے تینوں افواج میں شمولیت کا موقع میسر نہ آسکا تھا اور اسے مسترد کر دیا گیا تھا۔ وہ دلبرداشتہ اور دل شکستہ موت سے ہمکنار ہو گیا تھا۔ اس کی موت کے بعد اس کا جسم جنگ کے ایک اہم مرحلے کے دوران دشمن کو دھوکا دینے کی غرض سے استعمال کیا گیا تھا۔

یہ داستان حقیقت کے قریب تر دکھائی دے رہی تھی۔ لہٰذا اعلیٰ حکام نے ایون مونٹاگو کو ہدایت کی کہ وہ مکمل داستان سے انہیں آگاہ کرے۔ اس نے بے انتہا فروخت ہونے والی تحریر

"ایک شخص جس کا کوئی وجود نہ تھا"

تحریر کی اور اس تحریر پر مبنی فلم بھی بنائی گئی تھی۔ برطانوی حکام نے مونٹاگو کو یہ اجازت فراہم کی کہ وہ سرکاری داستان سنائے۔ ان کے ہاتھ ان افواہوں اور نیم سچائی نے باندھ رکھے تھے جو ان کے اردگرد پھیلی ہوئی تھی اور جو برطانیہ کو نقصان پہنچا سکتی تھی۔

مسئلہ یہ درپیش تھا کہ اس پراجیکٹ کی وساطت سے جرمن ہائی کمان کو کس طرح دھوکا دیا جائے...... اتحادیوں کے فوجی منصوبوں کے بارے میں ان کو کس طرح دھوکے میں رکھا جائے بالخصوص شمالی افریقہ کی فتح سے ہمکنار ہونے والی مہم کے بعد...... اتحادیوں نے یہ فیصلہ سرانجام دیا تھا کہ ان کا اگلا اقدام سسلی کے ذریعہ اٹلی پر حملہ آور ہونا تھا۔ جرمن بھی اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ انہیں اسی سمت سے بڑے خطرے کا سامنا

تھااور وہ اس خطرے سے نپٹنے کے لئے اپنے دفاع کو مضبوط تر بنا رہے تھے۔ ان کو اس دھوکے میں رکھنا درکار تھا کہ مجوزہ حملہ بحرہ روم سے کسی اور مقام پر کیا جائے گا۔

لیفٹیننٹ کمانڈر ایون مونٹا گو کا تعلق ایک چھوٹی سی انٹر۔ سروس کمیٹی سے تھا۔ اس کمیٹی کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ متوقع آپریشن (منصوبوں) کا تحفظ سرانجام دے۔ دشمن کے سامنے ایک مردہ جسم پیش کرنا...... ایک ایسی لاش اس کی نظروں میں لانا جس کی جیب میں گمراہ کن دستاویزات موجود ہوں...... یہ منصوبہ ایک نیا منصوبہ نہ تھا۔

مونٹا گو اور اس کی ٹیم کو اس منصوبے پر کام کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ ان لوگوں نے اس کامیاب منصوبے پر انتہائی جانفشانی سے کام کیا۔ جسم کسی ایسے اسٹاف افسر کا درکار تھا جو ایک ذمہ دار عہدے پر فائز تھا جس کے پاس اونچے درجے کی دستاویزات تھیں جو یہ ثابت کرتی تھیں کہ اتحادی کسی اور مقام سے حملہ آور ہوں گے اور متوقع مقام سے ہرگز حملہ آور نہ ہوں گے۔ اس جسم کو تیرتے ہوئے سپین کے ساحل تک جا پہنچنا تھا جہاں پر جرمن ایجنٹ بکثرت موجود تھے۔ یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ یہ افسر کسی فضائی حادثے کا شکار ہوا تھا۔ سپین میں جرمنوں کو یہ موقع میسر نہیں آئے گا کہ وہ اس کے جسم کا بغور معائنہ سرانجام دیں...... ایسا موقع میسر نہیں آئیگا جیسا موقع انہیں فرانس میں میسر آ سکتا تھا...... تاہم وہ اس کی جیب میں موجود دستاویزات کا بغور مشاہدہ سرانجام دیں گے اور ان پر یقین کرنے پر بھی آمادہ ہوں گے۔

جسم کے حصول کا مسئلہ ایک مشکل مسئلہ تھا۔ وہ کیسے ایک مناسب عمر کی حامل لاش دریافت کریں اور وہ لاش ایسی صورت حال کی حامل ہو جس سے یہ واضح طور پر ظاہر ہو اور سپین کے اعلیٰ حکام اس امر پر یقین کر لیں کہ یہ شخص سمندر کے اوپر ہوائی حادثے کا شکار ہوا تھا؟ یہ بھی خدشہ تھا کہ دشمن اس لاش کا ڈاکٹر معائنہ نہ کروالے۔ لاش کا حصول بھی اس قدر مشکل تھا۔ جس قدر مشکل اعلیٰ حکام کو قائل کرنا تھا کہ یہ منصوبہ ایک کارگر منصوبہ تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ منصوبہ اخلاقی حدود سے تجاوز نہیں کرتا تھا۔

چونکہ یہ جنگ کا زمانہ تھا لہٰذا ایک ایسے شخص کی لاش کا حصول ایک مشکل امر نہ تھا جو فضائی حادثے کا شکار ہونے کے بعد سمندر میں ڈوب کر جاں بحق ہوا ہو۔ برنارڈ سپلس بری نے مونٹا گو کو یقین دلایا کہ وہ اس قسم کی لاش کے حصول کی کوشش سرانجام دے گا۔

لاش کے حصول کے بعد بھی ایک اور مسئلہ درپیش تھا۔ وہ مسئلہ لاش کے رشتہ داروں کی اجازت کے حصول سے متعلق تھا۔ بہت سے رشتے دار اپنے کسی پیارے کی لاش کو اس طریقہ کار کے تحت استعمال کرنے کی اجازت فراہم نہیں کرتے اگرچہ لاش کا استعمال ملک کے بہترین مفاد میں ہی کیوں نہ ہو اور اگر رشتے دار اس کے استعمال کی اجازت فراہم کر بھی دیں تب مسئلہ یہ تھا کہ کیا وہ اس راز کو راز رکھ سکیں گے۔

یہ مسئلہ نہ صرف ایک مشکل مسئلہ تھا بلکہ اسے ایک مختصر سے دورانیے میں حل کرنا بھی ضروری تھا۔ مطلوبہ لاش کا حصول ایک قبرستان سے ممکن ہوا۔ اب اس کے رشتہ داروں سے اجازت حاصل کرنے کا مسئلہ درپیش تھا جو بالآخر رضامند ہو گئے اگرچہ ان کو درست طور پر یہ نہ بتایا گیا تھا کہ اس لاش کو کس مقصد کے لئے استعمال کرنا تھا۔ ان کو محض یہ بتایا گیا تھا کہ اس لاش کو عظیم ترین قومی مفاد میں استعمال کرنا تھا اور مابعد اس لاش کو مناسب طور پر دفن کر دیا جانا تھا۔ وہ علیحدہ بات تھی کہ اس لاش کو دوبارہ کسی اور نام کے تحت دفن ہونا تھا۔ انٹیلی جنس حکام کافی زیادہ تحقیقات سرانجام

دینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ لاش کے ورثاء قابل اعتبار لوگ تھے اور ان پر اعتماد کیا جا سکتا تھا۔

ان تفصیلات کو طے کرنے کا کام باقی تھا جن کی موجودگی میں اس آپریشن کو کامیاب بنانا عین ممکن تھا۔ اس موقع پر برطانوی انٹیلی جنس ٹیم نے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

لاش کو برف میں رکھا گیا۔ اسے رائل میرین کے میجر کی وردی زیب تن کروائی گئی۔ بریف کیس اس کی کمر کے ساتھ ایک زنجیر کی مدد سے باندھا گیا۔

اس دوران ماہرین ان دستاویزات کی تیاری میں مصروف رہے جن کو اس لاش کے بریف کیس میں رکھنا مقصود تھا۔

سب سے اہم دستاویزات وہ خط تھا جو "پرسنل اور انتہائی سیکرٹ" تھا۔ یہ خط جنرل سر آرچی بالڈ کی جانب سے تھا جو امپیریل جنرل اسٹاف کا وائس چیف تھا۔ یہ خط جنرل الیگزینڈر کے نام تحریر کیا گیا تھا جو جنرل آئزن ہاور کی نگرانی میں 18 ویں آرمی گروپ ہیڈ کوارٹر میں برطانوی فوج کی کمان سرانجام دے رہا تھا۔ سر آرچی بالڈ نے مونٹا گو سے بحث مباحثہ سرانجام دینے کے بعد خط کا نفس مضمون بذات خود تیار کیا۔ اس خط پر 23 اپریل 1943ء کی تاریخ لکھی گئی تھی۔ خط کا مضمون کچھ اس طرز کا حامل تھا کہ:۔

میرے پیارے الیگزینڈر

"یہ ایک غیر سرکاری خط ہے جو انتہائی مخفی انکشافات کا حامل ہے۔ ایک ذمہ دار اور قابل اعتماد افسر یہ خط آپ تک پہنچائے گا۔ اس خط کو سرکاری ڈاک کے ذریعے بھیجنا ایک احسن اقدام نہ تھا۔ یہ خط کسی خاص ہدایت پر مبنی نہیں ہے اور نہ ہی یہ کسی قسم کی حکمت عملی تیار کرنے کی بابت ہے۔ یہ محض آف دی ریکارڈ ایک تبادلہ خیال ہے۔ یہ تبادلہ خیال اس حقیقت کے بارے میں ہے کہ سسلی کی جانب سے حملہ محض ایک چال ہے۔ دشمن کو دھوکے میں رکھنے کی ایک تدبیر ہے جبکہ حقیقی حملہ بحر روم کے مشرق میں یونان میں فوجیں اتارنے کے بعد کیا جائے گا۔ سسلی کی جانب سے حملہ آور ہونے کا پرچار اتحادیوں کے عین مفاد میں تھا۔ اس طرح جرمنی کی توجہ سسلی کی جانب مرکوز رہے گی۔"

لاش کو اب ایک بارعب افسر کا روپ دینا تھا۔ اس کا زیادہ تر دارومدار اس کی وردی پر تھا۔ اسے رائل میرین کے میجر کی ولیم مارٹن کی وردی زیب تن کروائی گئی...... اس کی پیدائش کارڈف میں 1907ء ظاہر کی گئی۔ وہ شمالی افریقہ کی جانب پرواز کر رہا تھا۔

متعلقہ دستاویزات اور اس کی شناخت کی دستاویزات کے علاوہ اس کی ایک منگیتر بھی تخلیق کی گئی جس کا نام پام تھا۔ اس کی فوٹو بھی اس کی دستاویزات میں شامل کی گئی تھیں اور اس کے دو عدد خطوط بھی دستاویزات میں شامل کیے گئے تھے۔ اس کی منگنی کی انگوٹھی کی خریداری کی ایک رسید بھی دستاویزات میں شامل کی گئی تھی۔

میجر مارٹن اب اپنے مشن کی انجام دہی کے لئے تیار تھا۔ میجر مارٹن کو حوالہ سمندر کر دیا گیا تھا۔

لندن میں بحریہ کی انٹیلی جنس اپنی کارروائی کے نتائج کی منتظر تھی۔ 3 مئی کو انہیں برطانوی بحری اتاشی کی جانب سے ایک سگنل موصول ہوا

جس کے تحت یہ انکشاف کیا گیا تھا کہ رائل میرین کے میجر مارٹن کی لاش ہسپانوی مچھیروں کے ہاتھ لگ چکی تھی اور اسے پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کر دیا گیا تھا۔

لندن کو اب انتہائی محتاط رہنا تھا۔ انہیں پھونک پھونک کر قدم اٹھانا تھا کیونکہ ہسپانوی حکام نے فطری طور پر دستاویزات کا معائنہ سرانجام دینا تھا کیونکہ ان حالات میں کوئی بھی ملک اس قسم کا اقدام سرانجام دینے کا مجاز تھا۔ یہ دستاویزات اگر حقیقی نوعیت کی حامل ہوتیں تب لندن کو ان کے بارے میں حقیقی تشویش لاحق ہونا تھی کیونکہ ان کے ایک اہم راز کا انکشاف ہو چکا تھا۔ وائٹ ہال نے انتہائی مہارت کے ساتھ اس کھیل کو کھیلا اور سپین میں اپنے سفارتی نمائندوں کو یہ احکامات جاری کئے...... یہ نمائندے حقیقت سے باخبر نہ تھے...... کہ وہ ان دستاویزات کی بازیابی کی جانب توجہ دیں جو میجر مارٹن کی لاش سے برآمد ہوئی تھیں...... لیکن ان کی بازیابی کے لئے اس طور کوشش سرانجام دی کہ ان میں زیادہ دلچسپی ابھرتی نظر نہ آئے۔ دستاویزات کا حامل بریف کیس 13 مئی تک برطانوی بحری اتاشی کے حوالے نہ کیا گیا تھا۔ جب یہ بریف کیس لندن واپس پہنچا تب ماہرین نے اس امر کا انکشاف کیا کہ دستاویزات کو کھولا گیا تھا...... ان کا معائنہ سرانجام دیا گیا تھا اور مابعد ان کو محتاط اور ماہرانہ انداز میں اسی طور بند کر دیا گیا تھا۔

جب اتحادی سسلی میں اترے تب ان کے علم میں یہ بات آئی کہ جرمنی نے جزیرے کے اس جنوبی حصے سے اپنے دفاع کی جانب غفلت اختیار کر رکھی تھی جس حصے پر اتحادیوں نے حملہ آور ہونا تھا۔ دھوکہ دہی یقیناً اپنا کام کر چکی تھی۔

جنگ کے بعد یہ بات منظر عام پر آئی تھی کہ یہ آپریشن کس قدر کامیابی سے ہمکنار ہوا تھا۔ یہ دستاویزات ایک جرمن ایجنٹ کے ہاتھ لگ گئی تھیں اور اس نے ان دستاویزات کا نفس مضمون فوراً ٹیلی گرافنگ کے ذریعے برلن منتقل کر دیا تھا۔ لندن کے حکام کی توقع کے عین مطابق جرمن انٹیلی جنس سروس سے اس کی صداقت کے مفصل ثبوت طلب کئے تھے اور میجر مارٹن کی زندگی کے بارے میں ایجاد کیا گیا تمام تر پس منظر برلن کو روانہ کر دیا گیا تھا۔

جرمنی حکام نے میجر مارٹن کی دستاویزات ہاتھ لگنے کو اپنا ایک بہترین کارنامہ تصور کیا اور ان کے انٹیلی جنس کے محکمے نے بھی یہ تصدیق کر دی کہ یہ دستاویزات شک وشبہے سے بالاتر تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ انہوں نے اتحادیوں کے متوقع حملے کے مقام کو غیر اہم قرار دیتے ہوئے اپنی فوجی صورت حال میں تبدیلی سرانجام دی اور پیشتر اس کے کہ وہ یہ جان پاتے کہ ان کو جان بوجھ کر دھوکہ دیا گیا تھا اور بے وقوف بنایا گیا تھا اتحادی مضبوطی کے ساتھ سسلی میں اپنے قدم جما چکے تھے۔

ربن تروپ...... جرمن وزیر خارجہ...... ان افراد میں سے ایک تھا جنہوں نے سب سے پہلے یہ محسوس کیا تھا میجر مارٹن کی دستاویزات ایک دھوکے کے سوا کچھ بھی نہ تھا...... یہ ایک شاندار دھوکا تھا...... ایک فریب دہی تھی...... ایک چال تھی...... اس کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ اس سلسلے میں اس کی جانب سے تحریر کردہ ایک خط...... جو اس نے اپنے سفیر کو تحریر کر دیا تھا ہنوز ریکارڈ پر موجود ہے۔

ایک شخص جس نے لندن کو بچالیا

اس خصوصی آپریشن ایگزیکٹو کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جس نے فرانس کی شکست کے بعد...... فرانس کے ہتھیار ڈالنے کے بعد تخریب کاری کے مراکز قائم کئے۔ فرانس کے ایسے مراکز کرنل موراِئس بک ماسٹر کی زیر نگرانی قائم تھے جس نے اپنا ہیڈ کوارٹر بیکر اسٹریٹ میں بنا رکھا تھا۔ اس نے خصوصی تربیت یافتہ سینکڑوں ایجنٹ فرانس روانہ کئے تا کہ وہ مزاحمتی کارروائیاں سرانجام دے سکیں یا ایسی کارروائیوں کی نگرانی سرانجام دے سکیں۔

یہ مرد اور عورتیں ایک قریبی ٹیم کی مانند تھیں۔ لہٰذا ان کی انفرادی کامیابی کا تعین کرنا مشکل تھا۔ ان کی داستانوں سے ان کی انفرادی کامیابی کا یقین کرنا ممکن نہ تھا۔ لیکن ایک فرانسیسی شخص کی انفرادی کامیابی شک وشبے سے بالاتر تھی۔ اس شخص نے اپنا ایک علیحدہ ادارہ قائم کر رکھا تھا۔ وہ لندن سے کسی قسم کی مدد یا معاونت حاصل نہ کرتا تھا اور نہ ہی بک ماسٹر کے سرکٹ سے اس کا کوئی رابطہ استوار تھا۔ اس شخص کا نام مچل ہوبرڈ تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ اس کی عمر 40 برس تھی۔ وہ فرانسیسی وار منسٹری میں بطور سول انجینئر ملازم تھا۔ وہ خدا پر یقین رکھتا تھا...... اور فرانس پر بھی یقین رکھتا تھا۔ وہ نہ صرف ٹیکنالوجی کے میدان میں دلچسپی کا حامل تھا بلکہ موسیقی اور ادب میں بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ ایک شادی شدہ شخص تھا اور تین بچوں کا باپ بھی تھا۔

مچل بخوبی جانتا تھا کہ وہ شکست قبول نہ کر سکتا تھا...... وہ کوئی سمجھوتہ کرنا نہ چاہتا تھا بلکہ وہ لڑنا چاہتا تھا...... جدوجہد کرنا چاہتا تھا...... لیکن کیسے؟ اس کی وار منسٹری کی برانچ بلاسٹک اور اسلحہ جات سے متعلق تھی...... اب وہ جرمنوں کے لئے کام کر رہی تھی۔ لہٰذا اس نے استعفیٰ پیش کر دیا۔ لیکن اسے اپنے اہل خانہ کا پیٹ بھرنا تھا اور ایک دوسرے روزگار کا بندوبست ناگزیر تھا۔

قسمت اس کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔ اس نے اخبار میں ایک اشتہار دیکھا۔ ایک پیرس ایجنٹ کی خدمات درکار تھیں۔ یہ فرم گیس انجن تیار کرتی تھی جو لکڑی کے کوئلے سے چلتے تھے اور موٹر وہیکل کے کام آتے تھے...... یہ ایک ایسی ایجاد تھی جو پٹرول کی عدم دستیابی کے بعد مقبول عام ہو سکتی تھی اور اس کی مانگ ازحد بڑھ سکتی تھی۔ اسے یہ نوکری میسر آ چکی تھی۔ اس نے جلد ہی فرانس کے ایک وسیع رقبے کو اپنے احاطہ میں لے لیا تھا۔ اس کو بہترین آمدنی حاصل ہو رہی تھی اور وہ اس فرض کی انجام دہی کے لئے بے قرار تھا جو اس کے دل کی دھڑکن بن چکا تھا۔ لیکن یہ سوال ہنوز منہ اٹھائے کھڑا تھا کہ:

وہ حصول مقصد کیلئے کس طرح برسرپیکار ہو؟ کس طرح روبہ عمل ہو؟

اس نے فرانس کے دیگر مزاحمتیوں کی جانب نظر دوڑائی اور ان کے بارے میں سوچا...... ان سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی اور مابعد وہ ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا...... اسے براہ راست برطانیہ سے رابطہ کرنا چاہئے تھا۔ بذریعہ سوئزرلینڈ اسے ایک بہترین روٹ دکھائی دیتا...... بالخصوص ایسی

صورت میں جبکہ اسے لکڑی کے کوئلے کی اپنے گیس انجنوں کیلئے ضرورت بھی درپیش تھی۔لہٰذا اس کے پاس جنگلوں سے بھرپور سرحد کی جانب جانے کا معقول جواز موجود تھا۔مئی 1941ء میں وہ سائیکل پر روانہ ہوا اور چند دنوں بعد وہ سفر طے کرتا ہوا برطانوی سفارت خانے پہنچ چکا تھا جو برن میں واقع تھا اور اسسٹنٹ ملٹری اتاشی کے ساتھ محوِ گفتگو تھا۔اگلے تین برسوں کے دوران اس نے اس سرحد کو 98 مرتبہ عبور کیا حالانکہ اس کی سخت نگرانی سرانجام دی جاتی تھی۔

مچل نے اطلاعات اور معلومات کی فراہمی کی خدمات اپنے ذمے لے لی تھیں۔لیکن اس میں کسی دلچسپی کا اظہار نہ کیا گیا تھا۔لہٰذا وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا کہ وہ جلد ہی واپس آئے گا۔

لیکن وہ اپنا ایک تاثر قائم کر چکا تھا۔لہٰذا اس نے جو اطلاعات بہم پہنچائیں وہ لندن روانہ کر دی گئیں جہاں پر ان کا گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا گیا۔اس کے پس منظر کی آزادانہ تحقیقات سرانجام دی گئیں (اس کے سسرالی رشتے دار انگریز تھے) اور جب چند ماہ بعد وہ دوبارہ برن پہنچا تب اس نے داستان بالکل مختلف پائی۔اس نے یہ دریافت کیا گیا کہ وہ کتنی دیر بعد یہاں پر آ سکتا تھا......اس نے جواب دیا کہ وہ ہر تین ہفتے بعد یہاں آ سکتا تھا۔

اس سے مزید سوال کیا گیا کہ:۔

کیا وہ ہر ایک جرمن یونٹ کی تفصیل اور مقام تعیناتی کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتا تھا جو فرانس کے زیرِ تسلط زون میں تعینات تھے؟

اس نے جواب دیا کہ:۔

ہاں......وہ ایسی معلومات حاصل کر سکتا تھا اور ان تک پہنچا بھی سکتا تھا۔

تب گلبلی مچل نے جواب دیا کہ:۔

درست ہے۔

لیکن یہ کام اس قدر آسان نہ تھا اور جلد ہی اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس کام کو سرانجام دینے کے لئے اسے معاون درکار تھے......ایسے معاون درکار تھے جو اپنے کام کاج کے سلسلے میں ملک میں گھومیں پھریں یا ریلوے میں خدمات سرانجام دیتے ہوں اور اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنے پر بھی قادر ہوں۔لہٰذا اس نے ایسے افراد بھرتی کرنا شروع کر دیے اور اپنا نیٹ ورک تیار کرنا شروع کر دیا...... یہ افراد محض اس کے اپنے دوستوں میں سے نہ تھے بلکہ زیادہ تر افراد وہ افراد تھے جو اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے متمنی تھے......مثال کے طور پر ایک روز ایک شخص اس کے دفتر میں آیا جس کی لاری میں ایک گیس انجن فٹ تھا۔وہ شخص جب اس کے دفتر سے باہر نکلا تب وہ اس کا ایک قابلِ اعتماد معاون بن چکا تھا اور مابعد انتہائی مفید بھی ثابت ہوا تھا۔ایک اہم اسٹیشن کا ایک اسٹیشن ماسٹر ایسا بھی تھا جسے مچل نے محض پانچ منٹ میں قائل کر کے بھرتی بھی کر لیا تھا جبکہ وہ اسٹیشن ماسٹر ایک گاڑی کے انتظار میں تھا۔اس کے علاوہ اس نے ایک ہوٹل کے منیجر کو بھی قائل کر لیا۔یہ منیجر ہوٹل ٹرمینس کا منیجر تھا جو ایوی گنون میں واقع تھا......وہ بھی اس کے لئے بالکل اجنبی تھا......وہ اس امر پر رضامند ہو گیا تھا کہ وہ اسے اپنے ہوٹل میں رہائش اختیار کرنے والے ایک جرمن

جرنیل کے نام سے ضرور آگاہ کرے گا۔ وہ بھی اس کے نیٹ ورک کا ایک وفادار رکن بن چکا تھا۔

آہستہ آہستہ ایک مکمل ادارہ وجود میں آ چکا تھا اور تین ہفتوں کے وقفے کے بعد برطانوی حکام کو درکار معلومات/اطلاعات برن کی سرحد سے پار پہنچائی جا چکی تھی اور وہاں سے وہ معلومات اور اطلاعات وائرلیس یا سفارت خانے کی ڈاک کے ذریعے لندن بھجوائی جا چکی تھی۔ اس کے کام کا دائرہ کار وسعت اختیار کرتا چلا گیا۔ اس نے جرمن فوجی دستوں کی تعیناتی...... ان کی نقل وحرکت...... پیداواری شماریات...... فوجی تنصیبات...... اور دیگر کارآمد معلومات اور اطلاعات فراہم کرنی شروع کر دیں۔ وہ ایسی معلومات بھی فراہم کر دیتا تھا جن کے بارے میں اس سے دریافت نہیں کیا جاتا تھا لیکن اپنی دانست میں وہ ان معلومات کو کارآمد اور مفید گردانتا تھا۔ لہٰذا وہ ایسی معلومات بھی بہم پہنچا دیتا تھا۔ پہلے پہل مچل کے معاونین کو کسی قسم کی کوئی ادائیگی نہ کی جاتی تھی لیکن مابعد اس نے یہ ضروری سمجھا کہ ان لوگوں کو تنخواہوں کی ادائیگی کی جانی چاہیئے۔ لہٰذا وہ انہیں اپنی جیب سے تنخواہیں ادا کرنے لگا۔

جہاں تک وائرلیس...... پوسٹ بکس...... یا کوریئر کا تعلق تھا...... مچل بذات خود انہیں استعمال نہ کرتا تھا...... وہ اشخاص ذاتی طور پر اسے رپورٹ کرتے تھے یا وہ بذات خود ان کے پاس چلا جاتا تھا۔

فوجی دستوں کی نقل وحرکت بالخصوص اتحادیوں کے شمالی افریقہ پر حملہ آور ہونے کے بعد اور جرمنوں کی غیر مقبوضہ فرانس میں نقل وحرکت...... ان کے لئے ایک معانی رکھتی تھی۔ اس کے چند افراد کبھی کبھار جرمنوں کے ہتھے بھی چڑھ جاتے تھے لیکن کسی بھی فرد نے اس کے سرپرست مچل ھولرڈ کو دھوکا نہیں دیا تھا۔

1943ء تک...... اس نے مفصل اور درست رپورٹوں کی ترسیل جاری رکھی اور انہی وجوہات کی بنا پر وہ برطانیہ کے انتہائی قابل اعتماد مخبروں میں سے ایک مخبر کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اسی برس کے موسم بہار اور موسم گرما کے دوران وہ ہٹلر کے خفیہ ہتھیاروں کے بارے میں کچھ نہ جانتا تھا اور یہ محض اتفاق تھا کہ وہ ایک کیفے میں بیٹھا دو افراد کی گفتگو سن رہا تھا کیونکہ وہ اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھنے کا قائل تھا۔ دو فرانسیسی ٹھیکیدار غیر معمولی عمارات کے حصول کی باتیں کر رہے تھے جو کہ محتاط مقام پر واقع ہوں اور آپس میں ملحق بھی ہوں۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان عمارات کو کس مقصد کیلئے استعمال کرنا درکار تھا۔

لندن میں بھی بغیر پائلٹ کے جہاز کی افواہیں گردش کر رہی تھیں۔

اس ماہ کے آغاز میں مچل ھولرڈ روین جا پہنچا...... وہ "پروٹسٹنٹ ویلفیئر آرگنائزیشن" کے نمائندے کی حیثیت سے اس مقام پر پہنچا تھا۔ وہ سیدھا لیبر آفیسر کے پاس چلا آیا اور اس سے کہا کہ اس نے سنا تھا کہ اس مقام کے قریب فرانسیسی ورکروں کو تعمیرات کے نئے کام میں لگایا جا رہا تھا۔ اس نے ان کاریگروں کے گھروں کے پتے (ایڈریس) طلب کئے تا کہ وہ انہیں بائبلیں اور دیگر مذہبی مواد بہم پہنچا سکے۔ اسے بغیر کسی حیل وحجت ان کے گھروں کے پتے (ایڈریس) فراہم کر دیے گئے۔

نزدیکی ایڈریس اس مقام پر واقع تھا جو روین سے بیس میل دور شمال کی جانب واقع تھا اور مچل بذریعہ ریل گاڑی ایک گھنٹے کے اندر اندر

اس مقام تک پہنچ چکا تھا۔ راستے میں اس نے ورکروں جیسے کپڑے زیب تن کر لئے تھے۔ اس نے بائبلیں اپنے بریف کیس میں رکھ لی تھیں۔

اس نے بغیر کسی دقت کے اس جگہ کو تلاش کر لیا تھا جو بڑی سڑک پر واقع تھی۔ بہت سے ورکر اور کاریگر اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ اس نے لوگوں سے دریافت کیا کہ:۔

یہ عمارات کیوں تعمیر کی جا رہی تھیں؟

اس کو ان عمارات کی تعمیر کی جو وجہ بیان کی گئی وہ غلط تھی۔ کیونکہ اسے وہی وجہ بتائی گئی تھی جس کا چرچا جرمنوں نے کر رکھا تھا۔ کل دس عمارات زیر تعمیر تھیں۔ یہ عمارتیں اتنی چھوٹی تھیں کہ گیراج کے طور پر بھی کام میں نہ لائی جا سکتی تھیں اور بے قاعدہ طرز پر تعمیر کی گئی تھیں اور مختلف راستوں کے ذریعے انہیں آپس میں باہم ملایا گیا تھا۔

وہ ابھی پریشانی کی حالت میں کھڑا تھا کہ پچاس گز کنکریٹ کی ایک پٹی نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی۔ وہ سائٹ سے کچھ دور مقام پر واقع تھی۔ اس نے سوچا کہ:۔

کیا یہ پٹی اس معمے کو حل کر دے گی؟

مچل نے اپنی اینٹیں اپنے سر پر اٹھائیں اور اس پٹی کا رخ کیا۔ اس نے اپنے اردگرد دیکھا...... کوئی بھی جرمن اس کی جانب متوجہ نہ تھا۔ اس نے اس پٹی کا معقول معائنہ سرانجام دیا۔ اس نے ایک جیبی کمپاس اپنی جیب سے نکالی اور اس طرح نیچے کی جانب جھک گیا جیسے اپنے بوٹ کے تسمے باندھنا چاہتا ہو اور اس نے اس پٹی کی میگنیٹک بیئرنگ حاصل کی۔

اس رات اس کے پیرس کے فلیٹ میں ایک نقشے نے اسے یہ باور کروایا کہ کنکریٹ کی پٹی کا محور لندن کے دل کی جانب تھا۔

مچل بذات خود بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ معلومات برطانیہ کیلئے کس قدر اہمیت کی حامل ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ معلومات اس کے ہمراہ تھیں جبکہ اس نے سوئٹزرلینڈ کی جانب سرحد پار کی اور چند ہفتوں کے بعد جب وہ دوبارہ روئین میں تھا...... اسے ایک اہم پیغام تھمایا گیا...... یہ پیغام لندن سے تھا...... اس پیغام میں درج تھا کہ اگر ممکن ہو سکے تو وہ مزید ایسے مقامات تلاش کرے اور اگر ممکن ہو سکے تو ان تنصیبات کا مکمل منصوبہ بھی فراہم کرے۔

ماہ ستمبر کا آغاز ہو چکا تھا...... شمالی فرانس میں ایسی بہت سی سائٹ (مقامات) موجود تھیں...... یہ مقامات ایک سو سے زائد تھے...... مچل اور اس کی ٹیم نے یہ مقامات دریافت کئے تھے۔ یہ تمام مقامات ایک جیسی طرز تعمیر کے حامل تھے۔ ہر ایک مقام پر کنکریٹ کی ایک پٹی موجود تھی جس کا رخ لندن کی جانب تھا۔ اس دوران برطانیہ کے علم میں یہ بات آ چکی تھی کہ جرمن غالباً بغیر پائلٹ طیارے استعمال کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے اس اقدام کی تفصیل سے آگاہی ممکن نہ ہو سکی تھی اور نہ ہی کوئی ایسی معلومات سے آگاہی ممکن ہو سکی تھی جو دفاع کیلئے اہمیت کی حامل ہوں۔ انہیں اس بارے میں بھی کوئی اطلاع نہ تھی کہ وہ ان مقامات سے جن کو وہ تعمیر کر رہے تھے کس قسم کے میزائل فائر کریں گے۔

ایسا دکھائی دیتا تھا کہ قسمت کی دیوی دوبارہ مہربان تھی...... قسمت دوبارہ یاوری کر رہی تھی۔ مچل کی ملاقات ایک نوجوان فرانسیسی انجینئر سے ہوئی جس نے حال ہی میں اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔ اس کا نام اینڈر کومپس تھا۔ اینڈر کو اس امر کی جانب راغب کیا گیا کہ وہ ایک غیر مخصوص فنی جاب

کیلئے اپلائی کرے جو ایک غیر مخصوص جگہ پر واقع ہوا تھا جہاں پر ''ضروری کام'' جاری تھا۔ جیسا کہ شک کیا جا رہا تھا یہ مقام وہی مقام تھا جہاں پر تعمیراتی کام جاری تھا اور اینڈ رڈرائینگ آفس میں موجود تھا۔ اس نے کسی دقت کے بغیر ہی مچل کو اس مقام کا ایک نقشہ فراہم کر دیا۔ اس کے بعد وہ ایک جرمن انجینئر کے اوورکوٹ کی جیب سے ماسٹر پلان چرانے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ اس نے اس ماسٹر پلان کی ایک نقل تیار کی اور اس ماسٹر پلان کو واپس اس جرمن انجینئر کی اوورکوٹ کی جیب میں رکھ دیا جبکہ وہ باتھ روم میں موجود تھا۔

اب یہ راز کھل چکا تھا کہ اس مقام سے میزائل فائر کیا جانا تھا جو ایک اڑتے ہوئے بم کے موافق تھا۔

ماہ اکتوبر میں ہٹلر کے خفیہ ہتھیاروں کے بارے میں صدر روز ویلٹ کو ایک پیغام ارسال کرتے ہوئے ونسٹن چرچل نے شمالی فرانس کے اس حصے میں انٹیلی جنس کے بہترین نظام کا بھی تذکرہ کیا تھا۔ ہٹلر کا یہ منصوبہ تھا کہ وہ لندن پر ہر ماہ 5,000 بم گرائے گا اور اس قسم کی بمباری کا آغاز جنوری 1944ء سے ہونا تھا۔ لیکن وہ ماہ جنوری کی بجائے ماہ جون میں اس بمباری کا آغاز کر سکا اور ماہ ستمبر میں یہ بمباری اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ اس دوران 8,500 اڑنے والے بم پھینکے جا چکے تھے۔ برطانیہ کے مخبروں نے اس ضمن میں انتہائی اہم خدمات سرانجام دی تھیں۔ ان مخبروں میں چوٹی کا مخبر مچل ہولرڈ تھا۔ اسے اعلیٰ ترین فوجی اعزاز ڈی۔ ایس۔ او سے نوازا گیا تھا۔ یہ ایک اعلیٰ ترین فوجی اعزاز تھا جو یہ ملک ایک غیر ملکی کو پیش کر سکتا تھا۔

بہترین خدمات کی سرانجام دہی کے بعد وہ بخوبی ریٹائرڈ ہو سکتا تھا لیکن بدقسمتی اس کی منتظر تھی۔ اس کی ایک خاتون ایجنٹ عرصہ دراز بعد اپنی کسی دوست سے ملی تھی۔ اس نے حماقت کرتے ہوئے اپنی اس دوست کو اس کے بارے میں بتا دیا تھا۔ لیکن اس کی دوست اب ایک گسٹاپو ایجنٹ تھی۔ لہٰذا اس کے تعاون سے اسے گرفتار کر لیا گیا اور پرلیس کے مضافات میں واقع ایک مکان میں دکھا گیا اور اسے اذیتیں دی گئیں...... اس پر تشدد کیا گیا لیکن اس نے بھی زبان نہ کھولی اور دشمن کو کچھ نہ بتایا۔ اس کے بعد اس نے تین ماہ فرانسیسی جیل میں گزارے اور اسے سزائے موت کی سزا سنائی گئی۔ اسے کیوں تختہ دار پر نہ چڑھایا گیا...... یہ ایک راز ہے...... ایک معمہ ہے۔ جون 1944ء میں اسے دیگر فرانسیسی قیدیوں کے ہمراہ ہمبرگ کے نزدیک ایک کیمپ میں منتقل کر دیا گیا۔

مابعد کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ وہ فرار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اپنے سفر کا پہلا مرحلہ طے کرتے ہوئے سویڈن جا پہنچا...... یہ سفر اس کی آزادی کا سفر تھا...... اپنے اہل خانہ کی جانب سفر تھا...... یہ اس آزادی کا سفر تھا جو اس نے اپنی جرأت...... ذہانت اور جدوجہد کے بل بوتے پر حاصل کی تھی...... اس نے مغربی دنیا کی جیت میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

......❀......

مسولینی کی رہائی

بوڑھا اور بیمار شخص اپنی کھڑکی کے قریب بیٹھا تھا...... شوروغل کی آواز سن کر وہ جس نتیجے پر پہنچا تھا اس پر حیران ہو رہا تھا...... اس کے سر کے اوپر درجنوں جہاز منڈلا رہے تھے...... انہوں نے ہوٹل کو گھیر رکھا تھا...... وہ ایک دائرے کی شکل میں ہوٹل کو گھیرے ہوئے تھے...... ایک لمحے کے لئے ایسا دکھائی دیتا تھا کہ وہ ہوٹل پر بمباری کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ کیا کچھ وقوع پذیر ہونے والا تھا اور جو کچھ وقوع پذیر ہونے والا تھا اس سے کوئی فرق بھی نہ پڑتا تھا۔ مسولینی کی زندگی کے دن اب اپنے اختتام کو پہنچ چکے تھے۔ وہ اپنی ہی اٹلی کی عوام کا قیدی تھا اور پہاڑی پر واقع ایک ہوٹل میں بند تھا جو سطح سمندر سے 6,000 فٹ کی بلندی پر واقع تھا۔ اگر موت مقدر میں لکھی ہی جا چکی تھی...... اگر کسی گولی یا بم پر کسی کا نام لکھا جا چکا تھا...... تب مرنے کیلئے بدترین مقامات موجود تھے۔

انجنوں کی آواز میں کمی واقع ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے سر کو مزید آگے کی جانب بڑھایا۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے پیراشوٹ کے ذریعے کچھ افراد زمین پر اترتے دکھائی دیے جو اس سے تقریباً 40 گز کے فاصلے پر اتر رہے تھے۔ مسولینی کو یہ جاننے میں دقت ہو رہی تھی کہ یہ کون لوگ تھے۔ لیکن اسے ان افراد میں ایک فرد اٹلی کے جرنیل کی وردی میں ملبوس نظر آیا تھا۔

وہ ان لوگوں کی جانب گھور رہا تھا جو اس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ مابعد یہ لوگ ہوٹل کے محافظوں پر چلانے لگے کہ:۔

”گولی مت چلانا...... گولی مت چلانا...... اٹلی کا ایک جرنیل ان کے ہمراہ ہے!...... سب کچھ ٹھیک ہے...... سب کچھ درست ہے۔“

اٹلی کے جرنیل کی وردی میں ملبوس شخص اوٹو سکورزنی تھا۔ وہ پیراشوٹ دستوں کا کیپٹن تھا اور ہٹلر نے بذات خود اسے منتخب کیا تھا کہ وہ رہائی کے اس آپریشن کی منصوبہ بندی سرانجام دے اور اس آپریشن کی نگرانی بھی سرانجام دے۔ اب تقریباً کھیل ختم ہو چکا تھا۔ اس ڈکٹیٹر کی نظر بندی کے مقام کا پتہ چلانا ایک مشکل امر تھا۔ اسے بادشاہ اس کے عہدے سے معزول کر چکا تھا اور اس کی نظر بندی کے مقام اکثر تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ایک موقع پر سکورزنی اپنے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے سے ناامید ہو چکا تھا۔ لیکن مسولینی کو رہا کروانا تھا...... اسے جرمنی لانا تھا...... اس کے سواہ کوئی چارہ نہ تھا...... اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ کامیابی سے ہمکنار ہو چکا تھا۔ مسولینی کو منظر سے ہٹایا جا چکا تھا۔ اٹلی کے عوام کیلئے ریڈیو سے یہ خبر نشر کی گئی تھی کہ:۔

”عزت مآب بادشاہ شہنشاہ نے سربراہ حکومت اور چیف سیکرٹری آف اسٹیٹ جناب مسولینی کا استعفیٰ منظور کر لیا ہے اور ان

کی جگہ مارشل آف اٹلی پیٹرو باڈ وگلیو کو سربراہ حکومت اور سیکرٹری آف اسٹیٹ مقرر کیا ہے۔"

مسولینی کو سخت حفاظتی انتظامات کے تحت روم سے پورٹ آف گیٹا لے جایا گیا جہاں سے ایک بحری جنگی جہاز کے ذریعے اسے جزیرہ پونزا پہنچا دیا گیا۔ ہٹلر نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ جرمن سفیر کو معزول مسولینی سے ملنے کی اجازت فراہم کی جائے لیکن اس کے اس مطالبے کو ہمدردانہ انداز میں رد کر دیا گیا تھا۔

مسولینی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا رہا اور یہ منتقلی نصف رات کے بعد عمل میں لائی جاتی تھی اور اس منتقلی کی کوئی پیشگی اطلاع بھی فراہم نہ کی جاتی تھی۔ مسولینی ایک بیمار شخص تھا۔ وہ معدے کی بیماری میں مبتلا تھا اور اس بیماری کا پرانا مریض تھا۔ اگرچہ اس کے ساتھ بہتر سلوک روا رکھا جاتا تھا لیکن اس کی ایک مقام سے دوسرے مقام کی جانب بار بار منتقلی اور غیر موزوں خوراک کی وجہ سے اس کی صحت بگڑتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے وزن میں روزانہ کمی واقع ہو رہی تھی۔ اس کے محافظوں کی رپورٹ کے مطابق وہ مسیح علیہ اسلام کی زندگی کے مطالعہ میں مصروف رہتا تھا اور کتاب کے حاشیہ پر وہ مسیح علیہ اسلام اور اپنے ساتھ روا رکھے گئے سلوک کی مشابہت درج کرتا رہتا تھا۔

3 ستمبر کو جب اٹلی نے اتحادیوں کے سامنے ہتھیار پھینکے تھے اس وقت تک اسے جزیرہ مدالینا منتقل کیا جا چکا تھا۔ اسی صبح اس کے جانشین باڈوگلیو نے روم میں جرمن سفیر کو یہ یقین دہانی کروائی تھی کہ اٹلی جرمن کے ساتھ کندھے سے کندھا ملاتے ہوئے اتحادیوں کے خلاف جنگ جاری رکھے گا۔ اس دوران ہٹلر نے یہ جاننے کا مطالبہ کیا کہ مسولینی کی رہائی کا منصوبہ کس مرحلے پر تھا۔ اسے مسولینی کی قسمت پر رہ رہ کر افسوس آ رہا تھا۔ وہ اسے ہر قسم کی بدقسمتی سے مدمقابل ہونے سے بچانا چاہتا تھا۔

مسولینی کو دوبارہ واپس لایا گیا تھا۔ اس نے ایک ایمبولینس میں یہ سفر طے کیا تھا اور اسے سطح سمندر سے 6,500 فٹ کی بلندی پر واقع ایک ہوٹل میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔

اور سکورزنی کے جاسوسوں نے اس کی نظر بندی کے مقام کا پتہ چلا لیا تھا اور وہ اپنے مشن کی تکمیل کے لئے اس مقام تک پہنچ چکا تھا۔

جرمن سپاہ ہوٹل کو اپنے گھیرے میں لے چکی تھی۔ انہیں معمولی مزاحمت کا بھی سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ ان کا آپریشن کامیاب ہو چکا تھا۔ مسولینی کو طیارے میں سوار کیا جا چکا تھا۔ مسولینی نے طیارے میں سے ہوٹل کی چھت کی جانب دیکھا۔ اس کے محافظ بھی آسمان کی جانب اس طیارے کو گھور رہے تھے جس میں مسولینی محو سفر تھا۔

اگرچہ مسولینی کی رہائی کا مشن اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا لیکن مسولینی آئندہ کئی ماہ تک مایوسی کا شکار رہا۔ جرمن کے زیر تسلط ایک ہوائی اڈے پر اس کا طیارہ تبدیل کرتے ہوئے اسے ایک بمبار طیارے میں سوار کیا گیا اور ویانا پہنچا دیا گیا۔ ایک روز بعد...... 13 ستمبر کو وہ میونخ پہنچ چکا تھا اور اپنی بیوی سے بھی مل چکا تھا۔ انہوں نے دو دن اکٹھے گزارے۔ اس کے بعد اسے ہٹلر کے ہیڈ کوارٹر مشرقی پروشیا منتقل کر دیا گیا۔ جونہی طیارہ رن وے پر رکا جرمن ڈکٹیٹر اپنے اٹلی کے ساتھی کے ساتھ ملاقات کرنے کے لئے تیار کھڑا تھا۔

وہ دونوں آپس میں بغل گیر ہو گئے۔ مسولینی کی مایوسی کو محسوس کرتے ہوئے ہٹلر نے اسے یقین دلایا کہ وہ بہت جلد اپنے ملک واپس پہنچ

جائے گا...... اور ایک مرتبہ پھر وہ اپنے ملک کا حکمران ہوگا...... وہ اٹلی کا دوبارہ حکمران بنے گا اور جن لوگوں نے اسے معزول کرنے کی سازش میں حصہ لیا تھا ان تمام تر لوگوں کو قرار واقعہ سزا دی جائے گی...... یہ ایک ضروری امر تھا...... ان کا شکار کیا جائے گا اور انہیں سزا سے نوازا جائے گا۔

مسولینی کی دیکھ بھال اور تیمارداری سرانجام دی گئی اور اس کی صحت بہتری کی جانب مائل ہونا شروع ہوگئی اور جب 27 ستمبر کو وہ ایک کٹھ پتلی ...... جرمن کی پشت پناہی سے قائم کردہ حکومت کے حوالے سے اٹلی واپس آیا تو اس کی صحت کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ اس کی ٹیلی فون کالیں بھی جرمنوں کی نگرانی میں سرانجام پاتی تھیں...... وہ جہاں کہیں بھی جاتا جرمن سپاہی اس کا تعاقب کرتے خواہ وہ پیدل جا رہا ہوتا یا گاڑی کے ذریعے محوِ سفر ہوتا۔

اس نے تحریر کیا کہ:۔

"جرمن ہمیشہ میرے تعاقب میں رہتے تھے"

ہٹلر کے اصرار پر اس نے ان سازشیوں کو اپنی گرفت میں لیا جنہوں نے جولائی میں اسے استعفیٰ پیش کرنے پر مجبور کیا تھا۔ ان میں اس کا داماد کیانو بھی شامل تھا۔ اگرچہ اس کی بیٹی ایدا نے اس کی جان بخشی کے لئے پرزور درخواست کی لیکن اسے اور دیگر افراد کو فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کر دیا گیا۔ مسولینی اب ٹوٹ پھوٹ چکا تھا...... وہ دلبرداشتہ تھا اور مزید انتقام لینے میں کوئی دلچسپی نہ رکھتا تھا لیکن وہ مجبور تھا۔ لہٰذا اس نے دیگر افراد کی فہرست بھی پیش کر دی۔

وہ جانتا تھا کہ یہ ڈرامہ اس کے لئے نہیں رچایا گیا تھا۔ 27 اپریل 1945ء کو اس وقت پردہ گرا جبکہ اسے اپنے ملک کا ایک کٹھ پتلی حکمران بن کر واپس آئے محض آٹھ ماہ گزرے تھے۔ جرمن پیش قدمی کرتے ہوئے اتحادیوں کے سامنے بے بس تھے اور راہ فرار اختیار کر چکے تھے اور اب انہوں نے مسولینی کو اپنے ساتھ لے جانے کی بہت کم کوشش سرانجام دی تاکہ اسے اس کی عوام کے غیض و غضب سے بچا سکیں۔ یہ غیض و غضب آہستہ آہستہ پروان چڑھا تھا اور اس کو پروان چڑھتے ہوئے کئی ماہ لگے تھے اور وہ لوگ جو ایک یا دو برس پیشتر اسے ایک عظیم لیڈر مانتے تھے اور اٹلی کا نجات دہندہ قرار دیتے تھے اب وہی لوگ اسے اٹلی کی تباہی و بربادی کا ذمہ دار قرار دیتے تھے۔

اس کو تلاش کر لیا گیا تھا اور گولی سے اڑا دیا گیا تھا۔ اس کے بعد اس کے جسم کو دیگر سزائے موت سے نوازے گئے دیگر افراد کے جسموں کے ہمراہ ایک پٹرول پمپ کے باہر لٹکا دیا گیا تھا۔ سینکڑوں لوگ اس کے جسم پر تھوکتے تھے...... پتھر برساتے تھے اور ہنستے تھے۔

ڈرامے کا وہ کردار بھی اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا جو پہلے نجات دھندہ تھا مابعد اپنے ملک کا ولن قرار پایا۔

617 اسکوارڈن نے ڈیموں کو اپنا نشانہ بنایا

یہ ایک نیا اسکوارڈن تھا۔ اس اسکوارڈن کو ایک مخصوص آپریشن کی سرانجام وہی کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ جب تک اس اسکوارڈن کو نمبر 617 کے نام سے نہ نوازا گیا تھا اس وقت تک اس اسکوارڈن کو ''ایکس'' اسکوارڈن...... آر۔اے۔ ایف کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

مختلف اسکوارڈن کے مختلف اہداف تھے۔ لیکن 617 اسکوارڈن محض ڈیموں پر بمباری کے لئے مخصوص تھا۔

بمبار طیارے پرواز کیلئے تیار کھڑے تھے۔ یہ 16 مئی 1943ء تھا۔ جہازوں کے عملے کو اسی دوپہر چار بجے بریفنگ دے دی گئی تھی۔ ہر جہاز کا عملہ سات افراد پر مشتمل تھا۔ اس رات کی تیاری کیلئے کئی ماہ پیشتر سے تیاریاں جاری تھیں۔ محض ایک شام پیشتر ہوائی عملے کو منصوبے سے آگاہ کیا گیا تھا۔

اور اب بریفنگ بھی تمام ہو چکی تھی۔ نو طیاروں نے اپنے مشن پر روانہ ہونا تھا۔ ان طیاروں نے تین ٹکڑیوں میں پرواز سرانجام دینی تھی۔ ہر ٹکڑی میں تین تین طیارے تھے۔ پہلی ٹکڑی کی کمان اسکوارڈن کمانڈر گبسن نے سرانجام دینی تھی۔ دیگر ٹکڑیوں کی کمان ہوپ گڈ اور مارٹن نے سرانجام دینی تھی۔

ان نو طیاروں نے جرمنی کے عظیم موہن ڈیم پر حملہ آور ہونا تھا جو روہر کے مقام پر واقع تھا اور اگر یہ ڈیم تباہی و بربادی سے ہمکنار کر دیا جاتا تب جرمنی کا ایک بڑا حصہ زیر آب جانے کی توقع تھی اور یہ تمام تر حصہ صنعتی علاقہ تھا۔ اس طرح نہ صرف اس کی صنعتیں تباہی و برباد کا شکار ہو کر رہ جاتیں بلکہ بچ جانے والی صنعتوں کو پانی کی قلت کا بھی سامنا کرنا پڑتا۔

ان پہلے نو طیاروں نے اس ڈیم پر بمباری کرنے کے بعد واپس پلٹ آنا تھا اور طیاروں کی ایک اور فارمیشن (ٹکڑی) نے ایڈر ڈیم کو اپنا نشانہ بنانا تھا۔ اگر یہ دونوں فضائی حملے کامیاب ہو جاتے اور دونوں ڈیم تباہی و بربادی سے ہمکنار ہو جاتے تب جرمنی کا جنگی نقصان اس قدر زیادہ ہوتا تھا کہ اس کا تخمینہ لگانا مشکل تھا۔

لیکن یہ کام اس قدر آسان نہ تھا...... اپنے ہدف تک پہنچنا...... بموں سے لوڈ طیاروں میں جرمنی کی فضائی حدود سے گزرنا...... ہدف کو نشانہ بنانے کیلئے 60 فٹ کی بلندی تک آنا اور بم برسانا...... یہ سب کچھ اس قدر آسان امر نہ تھا۔ اس کے بعد واپس گھر پہنچنا بھی ایک مسئلہ تھا۔

طیاروں کی ایک دوسری فارمیشن (ٹکڑی) جو پانچ طیاروں پر مشتمل تھی اس نے ایک تیسرے ڈیم کو نشانہ بنانا تھا...... اس ڈیم کا نام سورپ ڈیم تھا۔

طیاروں کی ایک تیسری فارمیشن جو دوسرے پانچ طیاروں پر مشتمل تھی۔ اس نے دو گھنٹوں بعد پرواز سرانجام دینی تھی...... یہ ''موبائل

ریزرو' فارمیشن تھی۔ اس نے شمالی سمندر کے اوپر ریڈیو کی وساطت سے مزید احکامات کا انتظار کرنا تھا۔

نو بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ گبسن نے اپنی گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور کچھ کہنے کے لئے اپنا منہ کھولا۔ پائلٹ جو گھاس پر دراز موسم بہار کی گرمائش سے لطف اندوز ہو رہے تھے وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے جہازوں میں سوار ہو گئے۔ انہوں نے پیراشوٹ اپنے سامنے پھینک لئے۔

20 منٹ بعد گبسن نے اپنے طیارے کے پاس کھڑے ہو کر اپنی پستول سے ہوائی فائر کیا۔ یہ فارمیشن نمبر 2 کیلئے سگنل تھا کہ وہ اپنی پرواز کا آغاز کر دے۔ وہ شمالی روٹ کی جانب پرواز کر رہے تھے۔ یہ ایک طویل روٹ تھا۔ انہیں اسٹارٹ ہونے کیلئے دس منٹ کا دورانیہ درکار تھا۔

طیارے ایک ایک کر کے رن وے پر دوڑنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے محو پرواز ہو گئے۔ 9 بجکر 25 منٹ پر گبسن کا طیارہ بھی حرکت میں آ گیا۔ اس کے پیچھے مارٹن اور ھوپ گڈ کے طیارے تھے۔ وہ بھی محو پرواز ہو گئے۔

اس دوران پانچ طیارے جرمنی پہنچ چکے تھے۔ ایک طیارہ واپس پلٹ چکا تھا۔ ایک اور طیارہ نقصان زدہ ہو کر واپس پلٹ چکا تھا اور تین طیاروں کو مار گرایا گیا تھا۔

جہاز رانی ایک مشکل امر تھا۔ دشمن کو دھوکا دینے کیلئے ایک پیچیدہ روٹ اختیار کیا گیا تھا۔

جلد ہی انہیں چاند کی روشنی میں ڈیم کی سفید کنکریٹ چمکتی ہوئی دکھائی دی۔ دفاع سرانجام دینے والے بھی چوکنے ہو چکے تھے اور انہوں نے فائر کھول دیا تھا۔

گبسن نے اپنی فارمیشن کو پکارا کہ:۔

''حملے کے لئے تیار ہو جاؤ...... جب تمہیں حملے کے لئے کہا جائے تو اپنی درست ترتیب کے ساتھ حملہ آور ہو جاؤ۔''

وہ 60 فٹ کی بلندی تک آن پہنچے تھے۔ ڈیم انہیں اب بڑا دکھائی دے رہا تھا۔ بم گرانے کے احکامات صادر کر دیے گئے تھے۔ بم گرا کر وہ جھیل پر واپس پہنچ چکے تھے۔

بم پھٹ چکے تھے۔ بموں کے دھماکے سنائی دے رہے تھے۔ پانی ڈیم کی چوٹی سے بہہ نکلا تھا۔ لیکن ڈیم مکمل طور پر تباہ نہیں ہوا تھا۔ گبسن نے ھوپ گڈ کو مزید بم برسانے کیلئے کہا۔ ھوپ گڈ کے طیارے کو انٹی ائر کرافٹ کا نشانہ بنایا گیا لیکن اس نے اپنی کارروائی جاری رکھی اور ڈیم کو اپنی بمباری کا نشانہ بنایا۔ اس کی بمباری سے بجلی گھر بھی تباہ ہو چکا تھا اور کچھ ہی دیر بعد اس کا اپنا طیارہ بھی دھماکے سے پھٹ چکا تھا۔

مارٹن بھی اپنی کارروائی سرانجام دے رہا تھا۔ گبسن کا عملہ کا یہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے طیارے کو بھی بری طرح نقصان پہنچا تھا۔ لیکن اس نے ٹھیک نشانے پر بم گرائے۔ جھیل کی سطح پر پانی ابل رہا تھا۔

لیکن ڈیم ہنوز اپنی جگہ پر موجود تھا۔

بمباری کے نتیجے میں اس وقت تک فضا اس قدر گرد آلود ہو چکی تھی کہ اپنے ہدف کو دیکھنا ناممکن تھا۔ اب گبسن اور مالٹ بائے کی باری تھی۔ مالٹ بائی مطلوبہ بلندی تک پہنچا اور بم برسانے شروع کئے۔

گبسن ایک دوسرے پائلٹ کو احکامات صادر کرنے ہی والا تھا کہ اس کے ائرفون پر مسرت بھری آواز گونجی کہ:۔

''یہ تباہ ہو چکا ہے...... میرے خدا...... ڈیم تباہ ہو چکا ہے...... اس کی جانب دیکھیں...... یہ تباہ ہو چکا ہے۔''

لاکھوں ٹن پانی ڈیم سے بہہ رہا تھا...... اس کا تخمینہ 134 ملین لگایا گیا تھا۔ پانی اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے جا رہا تھا۔ گاڑیاں...... مویشی...... مکانات...... ریل گاڑیاں...... غرضیکہ وہ سب کچھ اپنے ساتھ بہا کر لے جا رہا تھا۔

اب وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ جو طیارے بم گرا چکے تھے گبسن نے انہیں واپسی کی راہ اختیار کرنے کے احکامات صادر کر دیے تھے...... وہ بذات خود بھی بم گرا چکا تھا لیکن اسے باقی ماندہ طیاروں کی قیادت سرانجام دینی تھی جنہوں نے ایڈر ڈیم کا رخ کرنا تھا۔

انہیں اس ڈیم کو ڈھونڈنے میں دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا کیونکہ آسمان پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ لیکن انہوں نے جدوجہد جاری رکھی اور بالآخر اس ڈیم کو بھی ڈھونڈ نکالا۔ اس ڈیم کو ڈھونڈ کر ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ مزید خوشی کا مقام یہ تھا کہ اس ڈیم کے دفاع کے لئے کوئی قابل ذکر تدبیر سرانجام نہ دی گئی تھی۔ اپنے محل وقوع کے اعتبار سے یہ ڈیم ایک مشکل ہدف ثابت ہو سکتا تھا۔

شانون ڈیم پر حملہ آور ہوا لیکن وہ مناسب حملہ کرنے میں ناکام رہا۔ گبسن نے موڈسلے کو حملہ آور ہونے کا حکم دیا۔

موڈسلے نے بم برسائے۔

شانون دوبارہ حملہ آور ہوا۔ اس مرتبہ اس کے بم نشانے پر گرے لیکن ڈیم کو کوئی خاص نقصان نہ پہنچا۔

اب نائٹ کی باری تھی۔ وہ دو مرتبہ ناکامی کا شکار ہوا۔ بالآخر اس نے نشانے پر بم گرا دیے۔

ایک دھماکے کے ساتھ ڈیم تباہی سے ہمکنار ہو چکا تھا۔

اس ڈیم سے 200 ملین ٹن پانی بہہ رہا تھا۔ پانی کی دیوار کی اونچائی 50 فٹ تھی۔ پائلٹ اپنے طیاروں سے پانی بہنے کا نظارہ کر رہے تھے اور ڈیم کے اردگرد چکر کاٹ رہے تھے۔

دو ڈیم تباہی و بربادی سے ہمکنار ہو چکے تھے۔ گبسن نے اس معرکے میں بچ نکلنے والے طیاروں کو واپس گھر کی راہ اختیار کرنے کے احکامات جاری کر دیے تھے۔

فارمیشن نمبر 2 میں محض ایک ہی طیارہ بچا تھا۔

اب فارمیشن نمبر 3...... موبائل ریزرو...... جرمن سرزمین کی جانب بڑھ رہی تھی۔ انہیں سورپ ڈیم پر بمباری کرنے کے احکامات صادر کئے گئے تھے۔

19 طیاروں میں سے 10 طیارے باقی بچے تھے...... چھ طیارے گبسن کے 9 طیاروں میں سے باقی بچے تھے۔ فارمیشن نمبر 2 کے پانچ طیاروں میں سے محض ایک طیارہ باقی بچا تھا اور فارمیشن نمبر 3 میں سے تین طیارے باقی بچے تھے۔

جب یہ طیارے کامیابی کی خبر کے ہمراہ واپس پلٹے تو اس کامیاب آپریشن پر جشن کا سماں دیکھنے میں آیا۔ جرمنی کی جنگ کی جدوجہد کو عظیم

نقصان سے دو چار کر دیا گیا تھا...... اور یہ نقصان ایک انتہائی مختصر قوت کے ساتھ پہنچایا گیا تھا...... اس مختصر قوت کے ساتھ اس قدر عظیم کامیابی کا خواب بھی نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ بم ڈیزائنر بارنس والس فضائی عملے کے جانی نقصان پر ملول تھا...... عملے کے 56 افراد لاپتہ تھے۔ موہن اور ریڈر ڈیم مکمل طور پر تباہ ہو چکے تھے۔ فضا سے لی گئی تصاویر کی اگلے روز نمائش سرانجام دی گئی تھی۔ یہ ڈیم مکمل طور پر برباد ہو چکے تھے اوران کی تعمیر نو پر کئی ماہ صرف ہو سکتے تھے۔ تصاویر قصبوں اور دیہاتوں کی بربادی اور ویرانی کی بھی عکاسی کر رہی تھیں۔ کوئلے کی کانیں پانی سے بھری ہوئی تھیں اور موہن اور ایڈر ڈیم کی جھیلیں بے آب ہو چکی تھیں اور خشک پڑی تھیں۔

617 اسکوارڈن زیادہ عرصے تک ایک ایسے واحد اسکوارڈن کی اہمیت کا حامل نہ رہا جو ناممکن اہداف کو نشانہ بنانے کیلئے مشہور تھا۔ جلد ہی دیگر اسکوارڈن بھی تقریباً تمام تر ناممکن اہداف کو اپنا نشانہ بنانے لگے تھے۔

لیکن 617 اسکوارڈن ''ڈیموں کو نشانہ بنانے والے اسکوارڈن'' کے نام سے ہی مشہور رہا۔

چھلانگ لگانے والا گھوڑا

محافظ ان کی جانب دیکھ رہے تھے۔ انہیں ان سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ایک چھوٹا سا گروپ کینٹین کے دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ انہوں نے نیکریں پہن رکھی تھیں...... یہ نامعقول انگریز...... ایسا دکھائی دیتا تھا کہ یہ لوگ اپنی زندگیاں ورزش کی نذر کر دیتے تھے تاکہ فٹ رہ سکیں...... یہ کس مقصد کیلئے فٹ رہنا چاہتے تھے؟ یہ احمق لوگ تھے...... وہ اسکول کے بچوں کی مانند کھیلیں کھیلتے تھے اور ان میں سے کچھ اس قدر بڑی عمر کے حامل تھے کہ سخت ورزش کے لائق نہ تھے۔ غالباً وہ دوبارہ فٹ بال کھیلنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

لیکن نہیں...... یہ فٹ بال نہ تھا...... یہ کوئی عجیب سی گیم تھی...... چار نوجوان لکڑی کا ایک ڈھانچہ اٹھائے ہوئے تھے...... ایک بہت بڑا صندوق نما ڈھانچہ...... یہ ایک بے ڈھنگی اور بے ڈول سی چیز تھی اور وہ اس کو بدقت اٹھائے ہوئے تھے۔ یہ لکڑی کے دو کھمبوں یا بانسوں پر نصب تھی جو اس کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک جانب سے دوسری جانب نکلے ہوئے تھے۔

اوہ...... چھلانگ لگانے والا گھوڑا...... محافظ یہ سب کچھ اپنی تربیت کے دوران سرانجام دیتے رہے تھے۔ انہیں مجبوراً ایسی چیزوں سے واسطہ رکھنا پڑتا تھا۔ لیکن یہ انگریز جنگی قیدی کیوں ایسی گیم کھیلنا چاہتے تھے...... ان کو قلیل مقدار میں راشن دیا جاتا تھا اور یہ اس گیم کو کھیل کر اپنی توانائی ضائع کرنا چاہتے تھے۔ ان کے لئے بہتر تھا کہ وہ اپنی جھونپڑیوں میں ہی قیام پذیر رہتے...... مطالعہ کرتے رہتے...... سوتے رہتے...... حتیٰ کہ ایک نامعقول اور ہنسنے والی سوچ...... راہ فرار اختیار کرنے کی منصوبہ بندی کرتے رہتے۔

انہوں نے اسے مناسب ٹھکانے پر رکھا۔ اس کا ٹھکانہ ان تاروں کے اندر تھا جن تاروں سے باہر کوئی قیدی نہیں جا سکتا تھا اور اگر وہ ان تاروں کو عبور کرنے کی کوشش کرے تو اسے گولی کا نشانہ بنا دیا جاتا تھا۔ انہوں نے اس گھوڑے کو محتاط انداز میں نیچے رکھا اور اس کے اوپر سے چھلانگیں لگانا شروع کر دیں۔ ان میں سے ایک شخص گھوڑے کے قریب کھڑا رہا نگرانی سرانجام دیتا رہا۔

محافظ ان کی کارروائی کو دیکھتے رہے۔

بہت سے چھلانگ لگانے والے اس فن میں ماہر تھے مگر ایک شخص اس فن میں طاق دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس کا گھٹنا یا پاؤں چھلانگ لگاتے ہوئے گھوڑے سے چھو جاتا تھا۔ کبھی کبھار وہ لکڑی کے ساتھ ٹکرا جاتا تھا اور درد کی وجہ سے شور مچاتا تھا۔

اس طرح محافظوں کو بھی ہنسنے کا موقع میسر آ جاتا تھا۔ اب دوسرے لوگ چھلانگیں لگا رہے تھے۔ دوبارہ اسی شخص کی باری آن پہنچی تھی جو چھلانگ لگانے میں ماہر نہ تھا۔ محافظ بغور اسے دیکھ رہے کہ اب یہ شخص اب کیا کرتا تھا۔

وہ چھلانگ لگانے کے لئے دور سے بھاگتا چلا آ رہا تھا۔ اس نے چھلانگ لگائی مگر اس مرتبہ وہ شدت کے ساتھ گھوڑے کے ساتھ ٹکرایا تھا

اور درد کی شدت سے بے تاب زمین پر پڑا تھا۔

دیگر افراد نے اس کو ہلا کر داد دی اور اس کے حواس بحال کرنے میں اس کی معاونت سرانجام دی اور اپنی ورزش جاری رکھی۔ چند منٹ بعد وہ اس گھوڑے کو واپس کینٹین میں لے گئے۔

جرمن محافظ سے یہ جانتے تھے کہ برطانوی جنگی قیدیوں نے کس وقت کے ساتھ اس گھوڑے کو بنایا تھا۔ انہوں نے اسے بنانے کے لئے ریڈ کراس کے صندوق اور لکڑی استعمال کی تھی۔ اس گیم کا اس کے سوا کوئی مقصد نہ تھا کہ اس سے اپنے آپ کو فٹ رکھا جائے...... چاک و چوبند رکھا جائے۔

اگلے روز یہی گیم دوبارہ شروع ہوئی۔ وہ شخص جو اس گیم میں ماہر نہ تھا وہ حصول مہارت کی خاطر اس قدر جدوجہد سرانجام دے رہا تھا کہ محافظوں کو اس پر رحم آنے لگا تھا۔ محافظوں کو امید تھی کہ ایک نہ ایک روز وہ بھی اس فن میں مہارت حاصل کرلے گا۔

جنگی قیدیوں کو اس گیم سے دست بردار ہونا پڑا کیونکہ سرنگ کی کھدائی کا وقت سر پر آن پہنچا تھا۔ قیدی سرنگ کی کھدائی میں مصروف ہو گئے۔ اس سرنگ کی کھدائی میں مصروف قیدی کسی بھی روز راہ فرار اختیار کر سکتے تھے بشرطیکہ قسمت ان کی یاوری کرے۔ وہ پاگلوں کی طرح دوڑتے ہوئے سرچ لائٹوں اور مشین گنوں کی پہنچ سے باہر نکل سکتے تھے۔

یہ قیدی محافظوں کی زیر نگرانی مشقت سرانجام دیتے تھے۔ کسی بھی قیدی کو یہ اجازت فراہم نہ تھی کہ وہ بیلچہ اٹھائے صحن کے وسط میں داخل ہو اور کھدائی کا کام شروع کردے...... ایسا کرنے کی پاداش میں چند لمحوں کے اندر اندر وہ اپنے آپ کو یا تو مردہ پاتا یا پھر قید میں پاتا۔

یہی وجہ تھی کہ جان نامی ایک قیدی جو ایک دوسرے کیمپ میں مقیم تھا اور اس نے راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش کی تھی...... وہ دوبارہ پکڑا گیا تھا...... اس اچھلنے والی گھوڑے کی سوچ...... اگر کوئی بھی شخص اس قسم کی چیز سرنگ کے اندر لے جائے اور اسے تاروں کے نزدیک لے جانے میں کامیاب ہو جائے...... وہ سرنگ کی کھدائی کا کام شروع کرسکتا تھا جبکہ اس کے دیگر ساتھی چھلانگیں لگانے میں مصروف رہ سکتے تھے اور یہ ایک چھوٹی سرنگ ہوتی جو ایک جھونپڑی سے شروع ہوتی۔

یہ ایک انہونی بات تھی...... کوئی بھی شخص ایک دن میں سرنگ تیار نہیں کرسکتا تھا حتیٰ کہ اس کے ساتھی صبح سویرے سے لیکر شام تک چھلانگیں لگاتے رہیں۔ کیونکہ یہ سرنگ کئی گز لمبائی پر محیط ہوتی اور اس کی کھدائی میں بہت سے دن صرف ہو سکتے تھے اور روزانہ اسے اس سرنگ کو ڈھانپنے اور چھپانے کی ضرورت درپیش تھی اور کھودی گئی مٹی بھی چھپانے کی ضرورت تھی۔

اور بے شک روزانہ کھودی گئی مٹی وہ روزانہ ہی ٹھکانے لگا سکتا تھا۔

اس سکیم کے بارے میں اگر سوچا جاتا تو یہ ایک مایوس کن اسکیم دکھائی دیتی تھی۔ لیکن مایوس اور بوریت کا شکار لوگ مایوس کن کاموں میں بخوبی ہاتھ ڈال لیتے ہیں اور نوجوان برطانوی جنگی قیدی اس کام کو سرانجام دے سکتے تھے۔

انہوں نے سرنگ کی لمبائی کا تخمینہ لگایا۔ سرچ لائٹ کی رینج سے باہر نکلنے کے لئے اس کی لمبائی 120 فٹ ہونی چاہیے تھی۔

ایک ہفتہ گزر چکا تھا...... وہ اس وقت طلب کام میں مصروف تھے۔ روزانہ کھودی گئی مٹی باہر لے جائی جاتی تھی۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے پتلون کی ٹانگوں کو استعمال کیا تھا۔

اس داستان کو ایرک ولیمز نے اپنی کتاب

''لکڑی کا گھوڑا''

میں انتہائی دلچسپ انداز میں بیان کیا تھا اور اس کہانی پر فلم بھی بنائی گئی تھی۔ وہ گھوڑے کی اوٹ میں اپنا کام سرانجام دیتے رہتے تھے اور پتلون کی ٹانگوں میں مٹی بھر کر باہر پھینکتے رہتے تھے۔

جوں جوں سرنگ گہری ہوتی چلی گئی انہیں اس کی تہہ تک پہنچنے میں دشواری پیش آتی رہی۔

بالآخر سرنگ اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی۔

ایک یادومنٹ بعد جان اور گھوڑا کینٹین میں واپس آ چکے تھے۔

لہٰذا یہ غیر معمولی منصوبہ اپنی تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ اس اسکیم کے پیچھے جان اور پیٹر کا ذہن کارفرما تھا۔ وہ کھدائی سرانجام دیتے رہے تھے جبکہ دیگر لوگ چھلانگیں لگانے میں مصروف رہے تھے۔

ایک روز پیٹر تھکن سے بے حال شکست وریخت کا شکار ہو کر گر پڑا تھا۔ برطانوی طبی افسر نے اس کے لئے ایک ہفتہ آرام کی سفارش کی تھی۔

لہٰذا ایک ہفتہ تک کھدائی کا کام بند رہا تھا لیکن چھلانگیں لگانے کا عمل جاری رہا تھا۔

پیٹر صحت یاب ہو چکا تھا اور دوبارہ گھوڑے سے چھلانگیں لگانے کے عمل کی نگرانی سرانجام دے رہا تھا۔ وہ جان کے ساتھ سرنگ میں روبہ عمل تھا کہ اچانک ایک مقام سے زمین نیچے پھسل گئی۔ یہ مقام گھوڑے سے چند گز کے فاصلے پر واقع تھا۔ لیکن اس نئی افتاد پر بھی بخوبی قابو پا لیا گیا۔

28 اکتوبر کو سرنگ کی کھدائی کا کام اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا اور اس منصوبے کے خالق فرار حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ وہ بالٹک بندرگاہوں اور غیر جانبدار سویڈن کے راستے برطانیہ پہنچنے میں بھی کامیاب ہو چکے تھے۔

فٹز میکلین ......ٹیٹو کی جانب مشن

اہل یوگوسلاویہ مغرور لوگ ہیں۔ جب 1941ء کے موسم بہار میں ہٹلر نے انہیں الٹی میٹم دیا کہ وہ اس کے سامنے ہتھیار پھینک دیں تو وہ آمادہ بغاوت ہو گئے۔ ملک کے سربراہ شہزادہ پال نے اس الٹی میٹم کو قبول کرلیا تھا۔ انہوں نے اسے اس کے عہدے سے معزول کرتے ہوئے ایک نو عمر بادشاہ پیٹر کو تخت نشین کر دیا تھا۔

جرمن ملک میں گھس آئے تھے۔

یوگوسلاویہ کی عوام جانتی تھی کہ یہ سب کچھ ایک نہ ایک دن ہونا ہی تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مزاحمت سرانجام دینے کے ان کے مواقع انتہائی مایوس کن تھے۔ لیکن ان کے دلوں میں آزادی کی شمع روشن تھی۔ وہ آزادی کے متوالے تھے۔ لہٰذا ان کے سامنے ماسوائے لڑنے کے اور کوئی راستہ نہ تھا۔

چند ہفتوں کے اندر اندر ان کے ملک کو پامال کر دیا گیا تھا۔ نوعمر شاہ پیٹر فرار ہو کر لندن پہنچ چکا تھا۔ اس نے اپنے مشیروں کے ساتھ مل کر وہاں پر جلاوطن حکومت قائم کر لی تھی۔

مزاحمت کا جذبہ اپنے عروج پر تھا۔ برطانوی وزیراعظم ونسٹن چرچل اس جذبے کو قوت فراہم کرنے پر آمادہ تھا...... اس نے ہر ممکن مدد کی تھی۔ یوگوسلاویہ کے اندر صورت حال انتہائی پیچیدگی کی حامل تھا۔ جرمنوں کے خلاف مہم چلانے اور ان کی مزاحمت سرانجام دینے کیلئے ایک سے زائد گروپ میدان عمل میں مصروف کار تھے اور ہر گروپ رہنمائی کا دعوے دار تھا...... ان کی امداد کی جاسکتی تھی۔ لیکن اگر یہ امداد غلط ہاتھوں میں چلی جاتی تب یہ ایک بہت بڑا سانحہ بھی ہوسکتا تھا۔ اور کچھ امداد غلط ہاتھوں تک بھی جا پہنچی تھی...... لیکن جو امداد یوگوسلاویہ کے کٹر حامیوں کے ہاتھوں تک پہنچی...... اس امداد نے نہ صرف جنگ کو مختصر کر دیا بلکہ بے شمار اتحادیوں کی جانیں بھی بچائیں۔

جلد ہی یہ محسوس کیا جانے لگا اور یہ بات واضح بھی ہو گئی کہ امداد کی مؤثر منصوبہ بندی اسی صورت میں سرانجام دی جاسکتی تھی اور اس کو اسی صورت میں مؤثر طور پر بروئے کار لا جا سکتا تھا جبکہ ایک اتحادی ٹیم بذات خود دشمن کے زیر تسلط یوگوسلاویہ میں موجود ہو۔ اور اس ٹیم کا سربراہ ایک قابل ذکر شخص ہونا چاہیئے۔

اس قابل ذکر شخص کو تلاش کرلیا گیا تھا اور چند ہفتوں کے اندر اندر جرمن بھی یہ جاننے کے متمنی تھے کہ وہ قابل ذکر ہستی کون تھی۔

انتھونی ایڈن نے اس ہستی کے چہرے سے نقاب اٹھایا اور اس پراسرار ہستی کو بے نقاب کیا:۔

”فٹز میکلین...... ہاؤس آف کامن کا رکن اور قصبہ لان کاسٹر کا ڈپٹی...... نیا بھرتی کردہ بریگیڈئر...... 30 برس عمر کا حامل

......ٹیٹو کے ہیڈ کوارٹر میں برطانوی مشن کا چیف......اسکاٹ لینڈ کی آفیسرز فیملی کا رکن......مہمات سرانجام دینے کا شوقین بالخصوص دیارِ غیر میں مہمات سرانجام دینے کا شوقین......مختصر یہ کہ وہ ایک مہم جو ہے جو دورانِ جنگ یہ بھی ذہن نشین رکھتا ہے کہ وہ ایک افسر ہے......اس قابلِ ذکر ہستی کا انتخاب انگلستان نے سرانجام دیا تھا جبکہ اس امر کی ضرورت درپیش تھی کہ ٹیٹو کی جانب ایک مشن روانہ کیا جائے۔"

یہ ایک حقیقت تھی کہ فٹز میکلین ہمیشہ مہم جوئی کی تلاش میں رہتا تھا حتیٰ کہ جب وہ برطانوی سفارت کاری سروس میں اپنی خدمات سرانجام دے رہا تھا اس وقت بھی وہ مہم جوئی کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا۔ جب جنگ کا آغاز ہوا اور اس کے علم میں یہ بات آئی کہ برطانوی سفارت کاری سروس اس کی فوجی سروس میں شمولیت کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوگی تو اس نے اس سروس سے راہ فرار اختیار کرنے کی ٹھانی۔ اس سروس سے راہ فرار اختیار کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ پارلیمنٹ کا انتخاب لڑنے کا اعلان کر دے۔ لہٰذا اس نے یہی راستہ اختیار کیا۔ اس کا استعفیٰ منظور کر لیا گیا۔

اگرچہ وہ پارلیمنٹ کا انتخاب لڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر اس نے یہ انتخاب نہ لڑا تو اسے واپس اسی سروس میں طلب کر لیا جائے گا۔ لہٰذا وہ جلد از جلد کنزرویٹو مرکزی دفتر جا پہنچا اور ان سے درخواست کی کہ انتخاب لڑنے کے لئے اس کا کوئی انتخابی حلقہ تجویز کیا جائے۔ بالآخر اس کے لئے لان کاسٹر کا انتخابی حلقہ تجویز کیا گیا۔ مقامی کنزرویٹو پارٹی نے اسے خوش آمدید کہا۔ اس پارٹی نے اس کی اس شرط کو بھی تسلیم کر لیا کہ اگر وہ انتخاب میں کامیاب ہو گیا تب وہ اپنی فوجی ذمہ داریاں بھی نبھاتا رہے گا......اس نے یہ بھی واضح کر دیا کہ فوجی ذمہ داریاں اس کی اولین ترجیح ہوں گی اور پارلیمنٹ کی ذمہ داریاں اس کی ثانوی ترجیح ہوں گی۔

اسے فوج سے رخصت عطا کر دی گئی تا کہ وہ اپنی انتخابی مہم بخوبی چلا سکے اور وہ جلد ہی رات کو سیاسی تقاریر سرانجام دینے لگا۔ بہت جلد اسے لوگوں کی تعریف میسر آنے لگی اور اس کے حلقہ انتخاب کے لوگ اس کی عزت کرنے لگے اور انہوں نے اسے منتخب کروا کر ہی دم لیا۔

تھوڑی دیر بعد اسے لانس کارپورل کے عہدے پر ترقی دے دی گئی اور مابعد ڈرامائی انداز میں اسے سیکنڈ لیفٹیننٹ کے عہدے پر ترقی دے دی گئی جبکہ وہ قاہرہ کے سفر پر گامزن تھا۔ اگرچہ اسے یہاں پر ایک مخصوص ذمہ داری سے نپٹنے کے لئے روانہ کیا گیا تھا لیکن وہ ذمہ داری کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی اور اس نے نئی تشکیل کردہ خصوصی ہوائی سروس جوائن کر لی۔ اس نے جرمنوں اور اٹلی کے خلاف جنوبی افریقہ کی صحرا میں کئی ایک مشکل ترین آپریشن سرانجام دیے۔ وہ اپنے اس کام میں مگن تھا اور انتہائی خوش بھی تھا حتیٰ کہ اسے 1943ء میں یہ احکامات موصول ہوئے کہ وہ لندن واپس پہنچے وہ حیران پریشان لندن واپس پہنچ چکا تھا......اسے یوگوسلاویہ کی مہم کے بارے میں بریف کیا جا چکا تھا...... جب وہ اس مہم کی تفصیل سے آگاہ ہوا تو اس نے اس مہم سے نپٹنے کی حامی بھر لی۔

اس دوران وزیراعظم کو ایک ٹیلی گرام موصول ہوئی۔ اس نے باآواز بلند اپنے مہمانوں کو یہ ٹیلی گرام پڑھ کر سنایا۔ کہ:۔

"مسولینی استعفیٰ پیش کر چکا تھا۔"

اس کے بعد مسٹر چرچل نے میکلین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:۔

''تمہیں بغیر مزید تاخیر کئے روانہ ہو جانا چاہیئے۔''

لیکن اس کے روانہ ہونے سے پیشتر چرچل نے اسے ایک قابل ذکر بریفنگ دی۔ اسے اس کے کام کے بارے میں مفصل طور پر سمجھایا۔ یہ اطلاعات بھی موصول ہوئی تھیں کہ یوگوسلاویہ کے ''سیٹ نک'' جو کہ جنرل میہاج لووک کی زیر کمان برسر پیکار تھے وہ جرمنوں کے خلاف اس مزاحمت کا مظاہرہ نہیں کر رہے تھے جس مزاحمت کی توقع ان سے کی جاتی تھی اگر چہ برطانیہ کی جانب سے انہیں بھاری امداد اور ساز وسامان فراہم کیا جا رہا تھا۔ ایک دوسرا گروپ جو اپنے آپ کو ''پارٹی زین'' (کٹر حامی)...... یوگوسلاویہ کے کٹر حامی کہلواتا تھا وہ زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ تاہم ''سیٹ نک'' کے بارے میں اب یہ گمان کیا جا رہا تھا کہ وہ جرمنی کی مدد کر رہے تھے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ کسی نہ کسی کو صحیح صورت حال کا اندازہ کرنا تھا کہ حقیقی صورت حال کیا تھی۔ کوئی ایسی ہستی درکار تھی جو سفارت کاری کے ساتھ ساتھ فوجی میدان میں بھی مہارت کی حامل ہو۔ اگر پارٹی زین (یوگوسلاویہ کے حامی) حقیقت میں جرمنوں کے خلاف لڑ رہے تھے...... ان کی مزاحمت سرانجام دے رہے تھے...... تب تمام تر امداد کا رخ ان کی جانب ہونا چاہیئے تھا اور ان کی کارروائیوں کی منصوبہ بندی اتحادیوں کی مہم کے ساتھ منصوبہ بند کی جانی چاہئے تھی۔ حصول مقصد کیلئے موقع پر ایک ٹیم کی موجودگی ضروری تھی جو دشمن کے زیر تسلط یوگوسلاویہ میں بہ نفس نفیس موجود ہو۔

میکلین نے اپنی نئی ذمہ داری کو نہ صرف خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا۔ بلکہ انتہائی جوش۔ جذبے اور ولولے کا مظاہرہ بھی کیا۔ وہ واپس قاہرہ جا پہنچا تاکہ اپنی وہاں کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوتے ہوئے ان ذمہ داریوں کو کسی اور معقول شخص کو سونپ سکے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنی نئی ذمہ داریوں کی سرانجام دہی کیلئے سیکنڈ۔ ان۔ کمانڈ ایک نوجوان کا انتخاب کر رکھا تھا۔ اس کا نام ویون اسٹریٹ تھا۔ اسٹریٹ ڈرامائی فوجی کارروائیاں سرانجام دے چکا تھا اور اس قسم کی کارروائیاں کسی دوسرے برطانوی فوجی افسر نے سرانجام نہ دی تھیں۔ اس کی دیگر ٹیم میں انٹیلی جنس اور رسد کی فراہمی کے علاوہ لوگوں کے ساتھ باہم روابط ہونے کے ماہرین بھی شامل تھے۔ پارٹی زین (یوگوسلاویہ کے کٹر حامی) سے رابطہ کیا جا چکا تھا اور وہ اس امر پر آمادہ ہو چکے تھے کہ وہ کسی بھی ایسے مشن کو قبول کرنے پر آمادہ تھے اور وہ اپنی شرائط پر اس مشن کو قبول کریں گے۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ یوگوسلاویہ کی جلاوطن حکومت کو تسلیم نہیں کریں گے۔ اگر چہ برطانوی حکومت اس حکومت کو تسلیم کر چکی تھی لیکن وہ اسے ہرگز تسلیم نہیں کریں گے۔

آہستہ آہستہ ٹیم کی تشکیل مکمل ہوتی چلی گئی۔ قاہرہ میں قیام کے آخری ایام مصروف ترین ایام تھے۔ خصوصی ریڈیو ساز وسامان کو جوڑنا...... دھماکہ خیز مواد...... ہتھیار...... سگنل جات کی ترتیب دینا...... اور سب کچھ انتہائی مخفی رکھنا۔

یوگوسلاویہ کے حامیوں کی جانب سے کوئی پیغام موصول نہ ہوا تھا...... کوئی اشارہ موصول نہ ہوا تھا کہ پیراشوٹ کے ذریعے کس مقام پر اترا جائے۔ دن گزرتے چلے گئے اور یوگوسلاویہ میں بھاری لڑائی کی خبریں موصول ہوتی رہیں۔ اس لڑائی میں یوگوسلاویہ کے حامیوں کو شدید جانی نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ اس دوران پیغام موصول ہو چکا تھا۔ لڑائی کی شدت میں قدرے کمی واقع ہوئی تھی اور اتحادی مشن کو اب بوسنیا کی ایک وادی میں اتارا جا سکتا تھا اور کامیابی کے کافی زیادہ مواقع نظر آ رہے تھے۔

اس ٹیم کو دو جہازوں سے اتارا جانا تھا اور اب حتمی تیاریاں مکمل کی جارہی تھیں منتخب کردہ دن آدھی رات کے وقت میکلین اور اس کے تین ساتھی ایک بمبار طیارے میں سوار ہوئے۔ اگر یہ ٹیم یوگوسلاویہ کے حامیوں کے ساتھ بہتر تعلقات قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتی ...... ان کی جدوجہد کو اتحادی حکمت عملی کے ساتھ منصوبہ بند کرنے میں کامیاب ہو جاتی اور اس کے ساتھ ساتھ انہیں مسلح کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتی تب جنگ کی مدت مختصر ہو سکتی تھی۔

پہلا اقدام...... انتہائی ضروری اقدام یوگوسلاویہ کے حامیوں کا ہیڈ کوارٹر زندہ وسلامت پہنچنا تھا۔

بمبار طیارے ہالی فیکس کے دروازے بند کئے جاچکے تھے۔ اس سے پیشتر آر۔ اے۔ ایف اسٹیشن کمانڈر مشن پر روانہ ہونے والے افراد سے ہاتھ ملا چکا تھا۔ جہاز نے حرکت کرنی شروع کر دی تھی۔ پہلے پہل اس کی حرکت آہستہ آہستہ تھی۔ وہ رن وے پر دوڑ رہا تھا۔

میکلین اس وقت اونگھ رہا تھا جب فلائٹ سارجنٹ نے اس کا کندھا ہلایا۔ جہاز انتہائی تیزی کے ساتھ زمین کی جانب بڑھ رہا تھا۔

اب ٹیم کے ارکان کو جہاز سے نیچے گرانے کا عمل باقی تھا۔ میکلین نے کہا کہ اسے پہلے جہاز سے نیچے گرایا جائے۔ اس کے بعد اس کی ٹیم کے دیگر تین ارکان کو نیچے گرایا جائے اور اس طور گرایا جائے کہ وہ ایک دوسرے سے زیادہ فاصلے پر نہ گریں۔ ایک دوسرے بمبار طیارے نے دوسری پارٹی کے لئے یہی عمل سرانجام دینا تھا۔

اس کا پیراشوٹ زمین تک پہنچ چکا تھا۔ جلد ہی اس نے اپنے آپ کو پیراشوٹ سے آزاد کیا۔

وہ ایک سب مشین گن کے حامل ایک جرمن کی نظر میں آچکا تھا...... اس کا دل ڈوب رہا تھا...... کیا تمام تر منصوبہ تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گا ...... کیا اتحادی مشن ناکامی کی بھینٹ چڑھنے والا تھا...... لیکن وہ شخص جرمن یونیفارم کے باوجود یوگوسلاویہ کا ایک باشندہ تھا۔

کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی۔ اس کے بعد اس سپاہی نے اپنی مشین گن کا رخ نیچے کی جانب کر دیا...... بلکہ اسے زمین پر گرادیا...... وہ خوشی اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے میکلین سے بغل گیر ہو گیا۔ جلد ہی ادھر اُدھر سے مزید لوگ آگے بڑھنے لگے۔ یہ تمام تر افراد یوگوسلاویہ کی حامی تنظیم کے افراد تھے۔ ان کی وردیوں پر سرخ ستارے چمک رہے تھے...... وہ مسکرا رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ وہ نوجوان شخص جس نے سب مشین گن تھام رکھی تھی اور جرمنی کی سیکنڈ ہینڈ یونیفارم میں ملبوس تھا وہ بار بار یہ دہرا رہا تھا کہ:

''میں نے جنرل کو ڈھونڈ نکالا تھا۔''

اڈولف ایکمان کی تلاش

1945ء کے موسم بہار میں جب نازی جرمنی تباہی و بربادی اور شکست سے دوچار ہوا تب بہت سے مایوس' دل شکستہ اور دلبرداشتہ افراد اتحادیوں کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے بچنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ وہ اتحادیوں کے ہتھے چڑھنے سے گھبراتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ مہذب دنیا ان کے ان کرتوتوں کو کبھی معاف نہیں کرے گی جو کرتوت وہ دوران جنگ سرانجام دیتے رہے تھے۔
ان افراد میں سے ایک فرد اڈولف ایکمان بھی تھا...... یہ ایک ایسا شخص تھا جو ہٹلر کے زیر قیادت لاکھوں یہودیوں کے قتل کا ذاتی طور پر ذمہ دار تھا۔ اس کے ایک محتاط ذاتی تخمینہ کے مطابق 50 لاکھ یہودی اس کے براہ راست احکامات کے تحت ہلاک کیے گئے تھے۔
اسے یہ خطرہ لاحق تھا کہ وہ اپنے آپ کو اور نازیوں کے مجرمانہ نیٹ ورک کو جنگ کے بعد کے یورپ سے کسی بھی صورت نہ بچا سکتا تھا ......ان سے مخفی نہ رکھ سکتا تھا۔
1946ء میں ایکمان جنگی قیدیوں کے ایک امریکی کیمپ سے فرار حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا اور ایکمان کا نام اختیار کرتے ہوئے ایک پناہ گزین لکڑی کی ایک فرم میں اپنی خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ یہ فرم لیون برگ ہیتھ میں واقع تھی اور یہ حصہ جرمنی کے برطانوی زون میں شامل تھا۔
ان دنوں لاتعداد خفیہ ادارے اتحادیوں کے خلاف کام کر رہے تھے۔ ایکمان جس خفیہ جگہ پر پناہ لئے ہوئے تھا...... چھپا ہوا تھا اس سے نزدیک ہی بیلسن نامی ایک مقام تھا۔ اب اس کا نیا نام ہوہین تھا۔ اس مقام پر یہودی کالے دھندے کا ایک بہت بڑا کاروبار چلا رہے تھے اور اس کاروبار سے حاصل ہونے والا منافع یہودیوں کی فلسطین کی جانب غیر قانونی ہجرت کی مد میں خرچ کیا جاتا تھا۔ یہ مقام اب برطانیہ کے زیر تسلط تھا۔ بیلسن غالباً ایک بدترین موت کا کیمپ تھا...... یہ مقام اب ہگانا کا جرمن ہیڈ کوارٹر تھا...... ہگانا یہودیوں کی قومی فوج تھی۔ اسی مقام پر ارگن زوائی لیوی اور اسٹرنگ گینگ نے جنم لیا تھا...... یہ یہودیوں کے دہشت گرد ادارے تھے اور یہ ادارے نازیوں اور برطانیہ دونوں کے خلاف استعمال کیے جاتے تھے۔ یہ ادارے بھی ایکمان کی تلاش میں مصروف تھے۔ ان کے علم میں یہ بات نہ تھی کہ وہ ان سے تقریباً ایک درجن میل دور چھپا بیٹھا تھا۔
سابق نازیوں کے اپنے زیر زمین ادارے تھے اور یہ ادارے جنگی مجرموں اور جنگی جرائم میں ملوث افراد کو سپین اور جنوبی امریکہ کی جانب فرار ہونے میں معاونت سرانجام دیتے تھے۔
1947ء میں یورپ میں ایک نئی صورت حال نے جنم لیا اور یہ صورت حال ایکمان اور دیگر جنگی مجرموں (جنگی جرائم میں ملوث افراد) کے حق میں بہتر ثابت ہوئی۔ یہ سرد جنگ کا آغاز تھا۔ اتحادیوں کی سیکرٹ سروس نازیوں میں اپنی دلچسپی کھو بیٹھی تھی اور اس نے اپنی توجہ روس کی جانب مبذول کروائی تھی اور کمیونزم کو روکنے کی جانب مرکوز کروائی تھی۔ انہوں نے سابق نازیوں کا معاملہ بون میں نئی جرمن حکومت کے حوالے کر دیا تھا۔

ایکمان لیون برگ میں ہی مقیم رہا اور کسی نہ کسی طرح اپنا وقت گزارتا رہا اور اس موقعے کی تلاش میں رہا کہ یورپ سے فرار حاصل کرتے ہوئے کسی ایسے ملک میں قیام پذیر ہو جائے جہاں پر وہ محفوظ ہو۔ وہ جانتا تھا کہ وہ جو کچھ سرانجام دے چکا تھا اس کی پاداش میں یہودی اسے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جنگی جرائم میں ملوث افراد کے خلاف اگرچہ برطانیہ اپنی دلچسپی کھو چکا تھا لیکن یہودیوں کی دلچسپی ہنوز برقرار تھی۔ وہ ایک عالمگیر انٹیلی جنس نیٹ ورک کے حامل تھے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس دہشت گرد ادارے بھی موجود تھے۔

کئی برسوں سے ایکمان زیر زمین نازی تحریکوں سے باہم روابط چلا آ رہا تھا اور فرار کا منصوبہ تا دیر زیر غور رہا تھا اور اس کی منصوبہ بندی انتہائی محتاط انداز میں سرانجام دی گئی تھی۔ وہ 1950ء کے موسم بہار میں جرمنی سے غائب ہو چکا تھا۔

1950ء تک مغربی جرمنی میں زندگی اپنے معمول پر واپس آ چکی تھی اور اب سفر پر بھی کوئی پابندی عائد نہ تھی۔ لہٰذا ایکمان میونخ ایکسپریس میں سوار ہوا اور انز بروک تک اپنا سفر جاری رکھا۔ آسٹریلیا کی سرحد پار کرتے ہوئے اسے کسی بھی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑا کیونکہ اس نے جرمنی کا ایک عام شناختی کارڈ حکام کو پیش کر دیا تھا۔

اس کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ بذریعہ بحری جہاز ارجنٹائن کا سفر سرانجام دے جہاں پر صدر پیرون ...... جو ہٹلر کا مداح تھا...... وہ ہر اس سابق نازی کو پناہ دے رہا تھا اور سہولیات فراہم کر رہا تھا جو اہل یورپ کو جنگی جرائم کے سلسلے میں مطلوب تھا۔

اتحادی انٹیلی جنس اس امر پر یقین رکھتے تھے کہ ایکمان اور دیگر سابق نازیوں کو یورپ سے فرار ہونے میں زیر زمین ریلوے کا ایک نظام معاونت پیش کر رہا تھا۔ اس نظام کو رومن کیتھولک چلا رہے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اس فرقے کی کئی ایک خانقاہوں کو وہ لوگ بطور پناہ گزین استعمال کرتے تھے جو جنگی جرائم میں ملوث تھے اور حکام کو مطلوب تھے۔ ایکمان روم میں ایک جرمن درویش خانے جا پہنچا۔ وہاں سے اس نے پناہ گزینوں کا ایک پاسپورٹ حاصل کیا۔ اس نے یہ پاسپورٹ ریکارڈو کلیمنٹ کے نام کے تحت حاصل کیا۔ اس کے بعد اس نے ارجنٹائن کا ویزا حاصل کیا۔

تاہم یہ بات وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ خانقاہوں کے حکام اس امر سے واقف تھے کہ وہ ایک ایسے شخص کے فرار حاصل کرنے میں معاون ثابت ہو رہے تھے جس نے وسیع پیمانے پر قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ اس دور میں کمیونسٹ ممالک میں کیتھولک فرقے کے لوگوں کو اذیت سے دوچار کیا جا رہا تھا بالخصوص چیکوسلاویہ میں...... اور خانقاہی حکام پناہ گزینوں کو ان کے فرار حاصل کرنے میں ایک فعال کردار ادا کر رہے تھے اور ان کے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔ ایکمان نے بھی کمیونزم اور کمیونسٹوں کے ظلم سے فرار حاصل کرنے کا سوانگ رچایا تھا۔

یہ بات ماننا پڑے گی کہ جرمن سے اس کے فرار کا منصوبہ انتہائی مہارت کے ساتھ تیار کیا گیا تھا۔ 14 جولائی 1950ء کو وہ بیونس آئرس پہنچ چکا تھا اور سابق نازیوں کی ایک بڑی تعداد نے اس کو خوش آمدید کہا تھا۔

اسرائیلی ایکمان کو نہ بھول پائے تھے۔ ان کے نزدیک وہ جنگی جرائم میں ملوث افراد میں سرفہرست تھا۔ پہلے پہل اس کے بارے میں ان لوگوں سے پوچھ گچھ کی گئی جو اس کے ہاتھوں ظلم کا نشانہ بنے تھے...... ان لوگوں کے عزیزوں واقارب سے اس کے بارے میں پوچھ گچھ کی گئی جو اس کے حکم پر ہلاک کیے گئے تھے...... یہ ایسے لوگ تھے جو اس سے انتقام لینے کے لئے بے چین تھے۔

ہگانا کی سیکرٹ سروس...... یہودی قومی فوج 1945ء سے ہی ایکمان کے غائب ہو جانے کی چھان بین اور تحقیق و تفتیش میں مصروف تھی۔

ان کا بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ان کے پاس ایکمان کی کوئی فوٹو موجود نہ تھی۔ ایکمان نے غائب ہونے سے پیشتر اپنی تمام تر سرکاری اور غیر سرکاری تصاویر ضائع کر دی تھیں۔

ہگانا کو یہ خبر ملی کہ ایکمان کی بیوی اور تین بچے آسٹریا میں مقیم تھے اور انہوں نے اس نکتہ نظر کے تحت ایک ایجنٹ کو روانہ کیا کہ عین ممکن تھا کہ وہ ایکمان کی کوئی نہ کوئی تصویر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ انہیں امید تھی کہ یہ ایجنٹ اس کی بیوی سے اس کی تصویر حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ لیکن اس کی بیوی فرو ایکمان نے ایکمان کے بارے میں بات چیت کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اگرچہ ہگانا کے جاسوسوں نے پورے گھر کی تلاشی لے ڈالی لیکن انہیں ایکمان کی کوئی تصویر ہاتھ نہ لگی۔

تاہم یہ ہگانا کی خوش قسمتی تھی کہ ان کی رسائی ایکمان کی ایک سابق داشتہ تک ممکن ہوئی جو ویانا میں رہائش پذیر تھی۔ یہ خاتون اب تنہا تھی اور ماضی کی خوشگوار یادوں کے ہمراہ زندہ تھی۔ اس خاتون کو انتہائی طریقے کے ساتھ اس امر پر راغب کیا گیا کہ وہ اپنی تصاویر کی البم دکھائے۔ اس البم میں ایکمان کی اکلوتی تصویر بھی موجود تھی۔ مابعد اس خاتون کے گھر پر پولیس کے ایک چھاپہ کے دوران اس سے یہ تصویر چھین لی گئی۔

ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے یہ کہانی اپنے اختتام کو پہنچ چکی ہو کیونکہ 1947ء میں فرو ایکمان نے یہ دعویٰ کیا کہ اس کا خاوند موت سے ہمکنار ہو چکا تھا۔ لیکن وہ اپنے اس ڈرامے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس پر مستقل نظر رکھی جانے لگی۔ ایکمان کی ایک مکمل فائل تیار کر لی گئی تھی۔ 1948ء میں آسٹریا میں ایک نیو۔ نازی گروپ کی گرفتاری عمل میں آئی۔ انہوں نے ایکمان کے بارے میں بھی کچھ انکشافات کیے جس کے جواب میں آسٹریا کی پولیس نے فرو ایکمان سے پوچھ گچھ کی اور اس سے دریافت کیا کہ کیا وہ اپنے خاوند سے ملی تھی یا اس نے اپنے خاوند کو دیکھا تھا۔ اس نے جواب دیا...... غالباً اس کا جواب درست تھا...... کہ اس کی اپنے خاوند سے کوئی ملاقات نہ ہوئی تھی اور اس امر پر اصرار کیا کہ وہ 1945ء میں چیکوسلاویکیا میں موت سے ہمکنار ہو گیا تھا۔

اس دوران ایکمان ارجنٹائن میں مقیم ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا نام ریکارڈو کلیمنٹ رکھ لیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ خفیہ طور پر اپنی نقل و حرکت کے بارے میں اپنی بیوی کو مطلع کرتا رہتا تھا۔ ارجنٹائن میں آباد دیگر نازی اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس نے ایک چھوٹے سے ادارے میں ملازمت بھی اختیار کر لی تھی اور ارجنٹائن کا شناختی کارڈ بھی حاصل کر لیا تھا۔ یہ شناختی کارڈ اس نے ریکارڈو کلیمنٹ کے نام سے حاصل کیا تھا۔ اس شناختی کارڈ کے حصول کی خاطر اسے بیونس آئرس میں اپنے فنگر پرنٹ بھی ریکارڈ کروانے پڑے تھے۔ اس کے بااثر دوستوں نے اسے ایک اچھی ملازمت بھی دلوا دی تھی اور ایکمان اب انتظامی امور کا ایک ماہر بن چکا تھا اور اپنی ملازمت کے دوران بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

اس نے خفیہ طور پر اپنی بیوی کو خط تحریر کیا اور 1952ء کے موسم گرما میں اس کی بیوی نے اپنے بچوں سمیت انتہائی خاموشی کے ساتھ آسٹریا کو چھوڑا اور بحری سفر طے کرتے ہوئے بیونس آئرس جا پہنچی۔ اس وقت اس کی سخت نگرانی سرانجام نہ دی جا رہی تھی اور یہودی سیکرٹ سروس اس کی جانب سے قدرے غفلت برت رہی تھی اور مابعد وہ اس کے فرار حاصل کرنے پر انتہائی غم و غصے کا شکار ہوئے۔

بیونس آئرس میں یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی کہ ایکمان ارجنٹائن میں قیام پذیر تھا۔ 1953ء تک باخبر لوگ یہ جانتے تھے کہ وہ کہاں موجود تھا اور اس بارے میں اخبارات میں بھی شائع ہو چکا تھا۔

اس دوران ایکمان اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو چکا تھا اور اس کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ اس کا مقدر اب گردش میں تھا۔ اس نے بیونس آئرس میں کم آمدنی کی حامل ملازمتیں اختیار کیں۔ اب وہ بین الاقوامی دلچسپی کا محور بھی بن چکا تھا اور پیرون حکومت بھی خوف و ہراس کا شکار تھی۔ 1955ء میں پیرون بھی اقتدار سے محروم ہو چکا تھا اور ملک سے بھی فرار ہو چکا تھا۔ سابق نازی اب بھی پُر امید تھے لیکن محتاط تھے۔ ایکمان کو بیونس آئرس کی ایک کار فیکٹری میں ملازمت مل چکی تھی۔ اب وہ اپنے ماضی کے بارے میں اپنے سابق نازی دوستوں سے کھل کر بات کرتا تھا اور اکثر ان یادوں کا شکار رہتا تھا جو کسی نہ کسی وقت انسان کو ڈستی رہتی ہیں۔

یہودی ابھی تک اس کو نہ بھولے تھے۔ ارگن اور اسٹرن دہشت گرد اسرائیلی سیکرٹ سروس میں شمولیت اختیار کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنی تمام تر توانیاں بورمان ...... ملر اور ایکمان کی تلاش میں صرف کر دی تھیں۔ ایکمان تک رسائی حاصل کرنے کے لئے کسی سخت ترین جدوجہد کی ضرورت درپیش نہ تھی۔ اس کے بارے میں یہ معلوم تھا کہ وہ ارجنٹائن میں موجود تھا جو سابق نازیوں سے بھرا پڑا تھا اور ان کے ساتھ اس کے دوستانہ مراسم استوار تھے۔ مسئلہ اس کی نگرانی سرانجام دینے اور انتظار کرنے کا تھا۔ مسئلہ یہ بھی تھا کہ اس کا کیا حشر کیا جائے۔

کیا اسے اغوا کر لیا جائے؟ کیا اسے قتل کر دیا جائے؟

کیا اس غیر ملکی پناہ گزین مجرم کو اس کی حکومت کے حوالے کر دیا جائے؟

اس مسئلے کو اسرائیلی کابینہ نے اس وقت فوری طور پر حل کرنا تھا جبکہ 1960ء کے آغاز میں ایکمان کو تلاش کر لیا گیا تھا۔ اس کے ایکمان ہونے کے بارے میں کوئی شک نہ تھا۔ کیونکہ اس کے فنگر پرنٹوں کی پڑتال سرانجام دی گئی تھی اور ان فنگر پرنٹوں سے ملایا گیا تھا جو اسرائیلی حکام کے پاس موجود تھے۔

اسرائیلی وزیراعظم ڈیوڈ بن۔ گورین کو ایک لمحے کے لئے بھی یہ یقین نہ تھا کہ وہ ایکمان کو ارجنٹائن کی حکومت سے حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اس نے جرائم کا ارتکاب جرمنی میں کیا تھا لہٰذا قانون کی روح سے اسے جرمنی کے حکام کے حوالے کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اسرائیلی وزیراعظم ایکمان کو اسرائیل لانا چاہتا تھا اور اسرائیلی سرزمین پر اس پر مقدمہ چلانا چاہتا تھا۔ حصول مقصد کا محض ایک ہی طریقہ تھا اور وہ طریقہ یہ تھا کہ ایکمان کو اغوا کر لیا جائے۔ لیکن یہ کوئی آسان کام نہ تھا کہ ایک شخص کو اغوا کر کے آدھی دنیا کا سفر طے کراتے ہوئے اسے اسرائیل لایا جائے۔

اس مسئلے کا حل ارجنٹائن کی حکومت نے بذات خود ہی پیش کر دیا جبکہ اس نے اسرائیل کو ایک سرکاری دعوت پیش کی کہ وہ اپنا ایک سفارتی نمائندہ ارجنٹائن روانہ کرے جو اسپین سے ارجنٹائن کی آزادی کی 150 ویں سالگرہ کے موقع پر اسرائیل کی نمائندگی سرانجام دے۔ یہ تقریب ماہ مئی کے اختتام میں منعقد ہونی تھی۔

اسرائیلی وزیراعظم نے اس موقع سے خاطر خواہ فائدہ حاصل کرنے کی ٹھانی۔ اس نے نہ صرف ایک سرکاری وفد اس تقریب میں شرکت کے لئے روانہ کیا بلکہ یہ فیصلہ بھی کیا کہ یہ وفد ایک خصوصی اسرائیلی طیارے میں اپنا سفر سرانجام دے گا...... برطانوی ساخت کا بریٹانیا طیارہ...... اور ایکمان کو اغوا کر کے اسی طیارے میں واپس اسرائیل لانا تھا۔ اس طیارے کو سفارتی مراعات حاصل تھیں۔ اس کام میں انتہائی احتیاط برتی گئی اور اسے انتہائی خفیہ رکھا گیا۔

کے عملے کی تعداد معمول کی تعداد سے خاصی زیادہ تھی۔ بیونس آئرس ہوائی اڈے پر اس سفارتی وفد کا خندہ پیشانی سے سرکاری طور پر استقبال کیا گیا۔ اس کے بعد جہاز کا عملہ شہر کی جانب روانہ ہو گیا۔ تاکہ کھانے سے لطف اندوز ہو سکے۔

جب یہ عملہ واپس لوٹا تب اس عملے کا ایک رکن شراب کے نشے میں دکھائی دے رہا تھا۔ ہوائی اڈے کے حکام نے اس امر کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ ایکمان کی کافی میں نشہ آور دوا ملا دی گئی تھی اور اسے عملے کے دیگر ارکان کے ہمراہ جہاز پر سوار کر لیا گیا تھا۔ کسی نے بھی کسی بھی غیر معمولی واقعہ کو محسوس نہ کیا تھا۔ صبح تین بجے برطانیہ واپسی کے لئے محو پرواز تھا۔

لیکن ابھی خطرہ ٹلا نہ تھا۔ طیارے نے ایک لمبی پرواز سرانجام دینی تھی۔ طیارے نے ایندھن کے حصول کے لئے بھی کئی ایک مقامات پر رکنا تھا اور کسی بھی قسم کی مداخلت کا خطرہ ہنوز باقی تھا۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ایندھن کے حصول کی خاطر انہیں ڈاکر رکنا چاہئے جہاں پر ہوائی اڈا فرانسیسیوں کے کنٹرول میں تھا۔ وہ اس امر پر یقین رکھتے تھے کہ فرانسیسی ...... چونکہ نازیوں کے دوست نہ تھے...... وہ انہیں روکنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ لہٰذا پرواز کسی دقت کا شکار ہوئے بنا ہی جاری رہی۔ ڈاکر کے مقام پر طیارے میں ایندھن بھرا گیا اور اس کے ٹینک مکمل حد تک بھر لئے گئے اور اس کے بعد طیارہ اسرائیل کی جانب روانہ ہوا۔ دو روز بعد اسرائیلی وزیر اعظم نے اپنی پارلیمنٹ کو بتایا کہ:

"ایکمان...... جو نازی رہنماؤں کے ہمراہ اس عمل درآمد میں مصروف رہا تھا جسے وہ "یہودی سوال کا حتمی حل" کہتے تھے......
یعنی یورپ کے 60 لاکھ یہودیوں کا قتل۔"

اس کو اسرائیل سیکورٹی سروس نے تلاش کر لیا تھا اور اب وہ اسرائیل میں زیر حراست تھا اور جلد ہی اسے عدالت کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا جائے گا۔

ایکمان کے اغوا نے ایک غیر معمولی داستان میں ایک اور باب کا اضافہ کر دیا تھا۔ ارجنٹائن کی حکومت اس کی واپسی کا مطالبہ کر رہی تھی اور اس نے اس سلسلے میں اقوام متحدہ سے بھی درخواست کی تھی۔ اقوام متحدہ نے بھی اسرائیل کے اس اقدام کی مذمت کی تھی۔ لیکن اقوام متحدہ نے یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ دونوں اقوام اس جھگڑے کو بذات خود حل کریں۔

اگرچہ اسرائیل نے ایکمان کو اسرائیل لانے کے لئے ایک درست راستے کا انتخاب نہ کیا تھا لیکن اس کے باوجود بھی دنیا نے اسرائیل کے اس اقدام کی مذمت نہ کی کیونکہ ایکمان کا جرم بنی نوع انسان کی تاریخ کا ایک عظیم ترین جرم تھا اور اسے انصاف کے کٹہرے میں لا کھڑا کرنے کا طریقہ کار ایک اہم امور نہ تھا اور کسی کو بھی یہ کہنے کی جرأت نہ ہوئی تھی کہ اسے اسرائیلی ججوں سے انصاف نہ ملا تھا۔

......❁......

ایکمان کو اغوا کرنے والے اسکواڈ کا لیڈر ہنگری کا ایک یہودی تھا۔اس نے 11 مئی کو اپنے شکار پر جھپٹنے کا پروگرام بنایا۔خصوصی طیارے نے 20 مئی سے پیشتر ارجنٹائن نہیں پہنچنا تھا۔

اس کے اغوا کے منصوبے کو بخوبی ترتیب دیا گیا تھا اور اس کی بہترین منصوبہ بندی سرانجام دی گئی تھی۔ یہ مشاہدہ کیا گیا تھا کہ ایکمان باقاعدگی کے ساتھ اپنے سب سے بڑے بیٹے کے گھر آتا جاتا رہتا تھا جس کا نام کلاس تھا اور جواب شادی شدہ تھا اور اس کی ایک سالہ بیٹی تھی۔ ایکمان جب بھی ان سے ملاقات کرنے کی غرض سے آتا تھا تب وہ رات کا کھانا ان کے ہمراہ کھاتا تھا اور رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان اپنے گھر کے لئے روانہ ہوتا تھا۔اب ایکمان کی سرگرمیاں اسرائیلی ایجنٹوں کی نظر میں تھیں۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتا اس پر نظر رکھی جاتی تھی۔اس نے 11 مئی کو بھی اپنے بیٹے کے گھر کا چکر لگایا اور آٹھ بجے کے بعد بیٹے کے گھر سے واپس اپنے گھر کے لئے روانہ ہوا۔

ایک شخص گاڑی میں اس کے انتظار میں موجود تھا۔وہ اپنی گاڑی سے باہر نکلا اور ایکمان سے کہنے لگا کہ:۔

''ہمارے ہمراہ چلو''

ایکمان نے گمان کیا کہ عین ممکن تھا کہ یہ ارجنٹائن پولیس کے آدمی ہوں۔ لہٰذا وہ بلاخوف وخطر ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ جونہی کار اپنی منزل کی جانب روانہ ہوئی توں ہی اسے شک وشبے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی کہ اس کے اغوا کنندگان کون لوگ تھے۔اس کا خیال تھا کہ وہ اسے فوراً گولی کا نشانہ بنادیں گے لیکن ان لوگوں نے اسے یہ یقین دہانی کروائی کہ وہ ایسا کوئی ارادہ نہ رکھتے تھے بشرطیکہ وہ چیخنے چلانے اور فرار ہونے کی کوئی کوشش سرانجام نہ دے۔

وہ اسے ایک ایسے امیر یہودی کے گھر لے گئے جس گھر کے مکین نیویارک جاچکے تھے اور اس گھر کے ملازمین یہودی ایجنٹ تھے۔ وہ دس روز تک اس گھر میں مقیم رہا۔اسے جب یہ بتایا گیا کہ اس کے اغوا کنندگان اسے اسرائیل لے جانا چاہتے تھے تاکہ اس کے خلاف جرائم کی پاداش میں مقدمہ چلایا جائے جو اس نے یہودیوں کے ضمن میں سرانجام دیے تھے تب اسے کچھ سکون محسوس ہوا۔درحقیقت وہ اس امر پر آمادہ ہو چکا تھا کہ وہ اسرائیل جائے گا اور مقدمے کا سامنا کرے گا اور اس نے اس سلسلے میں ایک دستاویز پر اپنے دستخط بھی ثبت کردیے تھے۔

اس دوران تل ابیب میں یہ تجسس پایا جاتا تھا کہ:۔

کیا یہ ممکن تھا کہ ایکمان کو دس روز تک بیونس ائرس میں جس بے جا میں رکھا جائے اور مابعد اسے اسرائیلی بریٹانیا نامی جہاز میں اغوا کر کے اسرائیل لایا جائے جو 20 تاریخ کو اس مقام پر پہنچ رہا تھا؟

کیا اس کی گمشدگی کوئی مسئلہ کھڑا نہ کردے گی؟

اس کی بیوی جان جائے گی کہ اس کے خاوند کے ساتھ کیا مسئلہ درپیش آیا تھا اور وہ ارجنٹائن حکومت کی مدد طلب کرے گی اور ایسی صورت میں اسرائیلی طیارے پر ہی شک کیا جاسکتا تھا۔

لیکن ایک ہفتہ گزر چکا تھا اور ایکمان کے بارے میں کسی قسم کا کوئی بھی شوروغوغا سننے میں نہ آیا تھا اور نہ ہی اس کی گمشدگی کا کوئی شور مچا تھا۔19 تاریخ کو بریٹانیا ارجنٹائن کے لئے محو پرواز ہوا۔اس میں سفارتی مشن سوار تھا۔اس مشن کی سربراہی مسٹر اباابان کے ذمہ تھی۔اس طیارے

دیارِ غیر میں ایک لڑکی کی مہمات

1940ء کا دور برطانیہ میں جنگ کے بعد کی مایوسی اور مشکلات کا دور تھا۔ جنگ جیتی جا چکی تھی لیکن اس فتح کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوئے تھے۔ بہت سے لوگ جنگ کی مہم سر کرنے کے بعد زمانہ امن میں اپنی روزمرہ زندگی کا معمول جاری رکھنے میں مشکلات کا شکار دکھائی دیتے تھے۔

لیکن ان لوگوں کے لئے خوشی اور راحت اور مہم جوئی کا سامان موجود تھا جو دنیا کا سفر طے کرنے کے متمنی تھے تاکہ اس دنیا کے اسرار اور بھید جان سکیں۔ جن لوگوں نے ان برسوں کے دوران بڑی بڑی مہمات سرانجام دیں ان میں چارلاٹ ابینر بھی شامل تھی۔ وہ ایک امریکی لڑکی تھی اور انٹرنیشنل نیوز سروس کی رپورٹر بھی رہی تھی۔ 1944ء میں وہ ایشیا چلی آئی تھی تاکہ ہندوستان میں امریکن ریڈکراس کے لئے کام کر سکے۔ اس نے برما اور چین میں بھی قیام کیا تھا۔

جب جنگ اپنے اختتام کو پہنچی تب اس نے امریکہ واپس جانا پسند نہ کیا کیونکہ ایشیا میں بڑے بڑے اور اہم ترین واقعات جنم لے رہے تھے...... انقلاب چین...... پرانے شہنشاہی نظام کا خاتمہ جس نے ہندوستان...... انڈونیشیا اور جنوب' مشرقی ایشیا کو ان کی آزادی سے نوازا...... اسرائیل کے ظہور پذیر ہونے کی جنگ...... کوریا کی جنگ...... اور ویت نام میں ایک طویل جدوجہد کا آغاز...... چارلاٹ ابینر ایک فری لانسر صحافی بن گئی اور مہم جوئی سے بھرپور زندگی بسر کرنے لگی۔

اس کے نین نقش مشرقی طرز کے حامل تھے...... اگرچہ اس کے آباؤاجداد تین سو برس سے جرمن یا فرانسیسی تھے۔ چونکہ اس کے نین نقش مشرقی طرز کے حامل تھے لہٰذا مشرق میں اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی جاتی تھی جبکہ مشرقی طرز کے نین نقوش کی حامل ہونے کی بنا پر امریکہ میں وہ حکام کی توجہ کا مرکز بن جاتی تھی۔

1946ء کے اختتام پر وہ کمبوڈیا چلی آئی اور اس نے انگ کورواٹ کے مشہور کھنڈرات دیکھے۔ کمبوڈیا فرانسیسی انڈوچائنا کا حصہ تھا اور فرانسیسی وہاں پر موجود تھے تاکہ اپنی کالونی کے باغیوں کی بغاوت کو کچل سکیں جو اپنی آزادی کی جنگ کا آغاز کر چکے تھے۔

انگ کورواٹ کے کھنڈرات دیکھنے کے دوران وہ ایک حادثے کا شکار ہو گئی تھی اور فرانسیسی فارن لیجن (دیارِ غیر میں متعین فرانسیسی فوج) کے ایک رکن نے اس کی جان بچائی تھی۔ اس اہلکار نے اس سے درخواست کی کہ وہ کرسمس کا تہوار اس کے ہمراہ کرالن میں منائے۔

کرالن ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں پر اس لیجن کی ایک عارضی چوکی قائم تھی۔ کرسمس کی چھٹیاں منسوخ کر دی گئی تھیں اور یہ کارروائی اسارکوں کی سرگرمیوں کے مدنظر سرانجام دی گئی تھی۔ اسارک کمبوڈیا کے گوریلے تھے جو فرانس سے آزادی حاصل کرنے کیلئے اپنی گوریلا کارروائیوں میں مصروف تھے۔

کرالن میں اس کا استقبال فرانسیسی فارن لیجن کے 13 ویں ڈیمی۔ بریگیڈ کے اراکین نے انتہائی گرمجوشی کے ساتھ کیا۔ چارلاٹ ایبنر کے لیفٹیننٹ رابرٹ گولبن کے ساتھ دوستانہ روابط استوار ہو چکے تھے اور اس کی ملاقات اس لیجن کی واحد خاتون رکن سے بھی ہوئی تھی۔ اس خاتون کا نام سوزانی ٹراورز تھا۔ اس کے بقول وہ ایک انگریز ایڈمرل کی بیٹی تھی اور بلند جرأت کی حامل تھی۔

امریکی لڑکی ٹراورز کے ساتھ بہتر تعلقات استوار نہ کر سکی اگرچہ اس نے اس رات اسے اپنی جھونپڑی میں مقیم رکھا۔ ٹراورز نے اسے برآمدے میں ایک فوجی چارپائی پر سلا دیا جہاں پر وہ کسی قسم کے جانوروں کی آوازوں کے شور کی وجہ سے ڈر گئی اور خوفزدہ ہو کر چیخنے چلانے لگی۔

اس کے چیخنے چلانے سے تمام کیمپ بیدار ہو گیا۔ گولبن اس کے پاس آیا اور اس کی خیریت دریافت کی۔ اس نے اسے صاف صاف بتایا کہ وہ باہر برآمدے میں سونے کی وجہ سے ڈر گئی تھی۔ اس نے اسے اپنی جھونپڑی میں سلا دیا اور بذات خود وہ برآمدے میں سو گیا۔

صبح بیدار ہونے پر اس کے علم میں یہ بات آئی کہ رات کو اسارکوں نے کیمپ پر حملہ کیا تھا اور لیجن کے دو افراد کو ہلاک کر دیا تھا۔ وہ مزید افراد کو بھی اپنی ہلاکت کا نشانہ بنا سکتے تھے لیکن اس کے چیخنے چلانے کی وجہ سے کیمپ میں سوئے ہوئے افراد بیدار ہو چکے تھے لہٰذا زیادہ جانی نقصان نہ ہوا تھا۔

فوری طور پر اسارکوں کی سرکوبی کے لئے ایک فوجی دستہ تیار کیا گیا تھا۔ اب اس کا اس ویران دیہات میں مقیم رہنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ اس لوگوں کے ساتھ ہی روانہ ہونا چاہتی تھی۔ بہرکیف 13 واں ڈیمی۔ بریگیڈ اسے خوش قسمت قرار دے رہا تھا کیونکہ اس کے چیخنے چلانے کی وجہ سے وہ مزید ہلاکتوں سے بچ گئے تھے۔

ڈیمی۔ بریگیڈ جیپوں اور ٹرکوں میں روانہ ہوا۔ وہ جنگل سے گزرتے ہوئے اسارکوں کو تلاش کر رہے تھے۔

چارلاٹ ایبنر پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ فرانسیسی فارن لیجن کے 60 فی صد اراکین وہ لوگ تھے جو ہٹلر کی فوج کے رکن تھے اور جو گرفتار ہونے سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اب وہ 1946ء میں فرانسیسی انڈو۔ چائینا میں فرانسیسی فارن لیجن کے ساتھ اپنی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ گولبن بذات خود سوئٹزرلینڈ کا باشندہ تھا اور نیم یہودی تھا۔ بہت سے نازی لیجن سے علیحدہ ہوتے ہوئے کیمونسٹ ویٹ۔ من کے ساتھ جا ملے تھے۔

ڈیمی۔ بریگیڈ نے وہ دن اسارکوں کی تلاش میں گزارا۔ دوپہر کے وقت ان کے عین سامنے سڑک پر آگ کی ایک دیوار نمودار ہوئی اور جونہی لیجن کے ارکان اپنی گاڑیاں موڑنے لگے تو اسارکوں نے ان پر فائرنگ شروع کر دی۔ وہ درختوں پر مورچہ زن تھے۔ انہوں نے سڑک پر درختوں کی شاخیں ڈھیر کر رکھی تھیں اور ان پر پٹرول چھڑک کر انہیں نذر آتش کر دیا گیا تھا۔

اسارکوں کی فائرنگ کے دوران چارلاٹ ایبنر کو ایک ٹرک کے نیچے پناہ دے دی گئی تھی۔ اس کے اردگرد گولیاں چلنے اور دھماکوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ اس وقت اس کے خوف کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے یہ دیکھا کہ ایک سانپ اس کی پناہ گاہ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ سانپ اس کی پناہ گاہ تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے مابعد بتایا کہ اس وقت وہ جنگ کو بھول چکی تھی۔ اس کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ اسے اس جنگ کی تفصیلات

کی کوئی خبر نہ تھی۔ وہ اس وقت اپنے حواس میں آئی تھی جبکہ اسارک تین لاشیں چھوڑ کر راہ فرار اختیار کر چکے تھے۔

لیجن کے ارکان نے دریا کے کنارے اپنے ڈیرے ڈال دیے...... اپنے ٹرک اس انداز میں کھڑے کر دیے کہ وہ ایک گول قلعے کی شکل اختیار کر گئے اور انہوں نے ان کی اوٹ میں اپنی مشین گنیں نصب کر لیں۔

رات سر پر آن پہنچی تھی۔ لہٰذا وہیں پر رات گزارنے کا فیصلہ کیا گیا۔ گوبن نے مس ابینز کو برانڈی دی تاکہ اسے اعصابی سکون میسر آ سکے اور اس سے کہا کہ وہ زیادہ مقدار میں برانڈی پی لے تاکہ پُرسکون نیند سو سکے۔ جب اس نے مزید برانڈی پینے سے انکار کر دیا تو گوبن نے اس کے انکار کو اس نکتہ نظر کے تحت دیکھا کہ وہ اس خدشے کے تحت انکار کر رہی تھی کہ اسے زیادہ برانڈی پلا کر مدہوش کرتے ہوئے لیجن کے ارکان رات کو اس کے ساتھ زیادتی نہ کریں۔ لہٰذا اس نے اسے یقین دلایا کہ لیجن کے ارکان خواتین کی عزت کرتے تھے...... ان کا احترام کرتے تھے...... بالخصوص ان خواتین کا ازحد احترام کرتے تھے جو ان کے زیر تحفظ ہوتی تھیں۔ لہٰذا اس نے مزید برانڈی پی لی۔ اس نے زمین پر کینوس بچھا دی اور اسے اس پر سونے کے لئے کہا۔ وہ اس کینوس پر پڑ کر سو گئی۔

اگلی صبح ڈیمی۔ بریگیڈ نے دوبارہ جنگلوں میں اسارکوں کی تلاش جاری رکھی۔ وہ ربڑ کے درختوں کے قریب سے گزرے جن کے مالکان اپنے تحفظ کی خاطر سائیگون جا چکے تھے۔ وہ بھی سائیگون کی جانب روانہ ہوئے...... اس دوران وہ ویٹ۔ من گوریلوں کے حملے کا نشانہ بنے۔ یہ گوریلے اسارکوں کی نسبت زیادہ منظم تھے اور زیادہ مسلح بھی تھے۔

سائیگون روڈ پر لیجن کا سامنا ویٹ۔ من سے ہو گیا۔ انہوں نے سڑک کی دونوں جانب سے لیجن پر فائرنگ شروع کر دی۔ مس ابینز کہتی ہے کہ اسے کچھ بھی یاد نہیں کہ وہ کسی طرح اپنی جیپ سے باہر نکلی اور اسی جیپ کے نیچے پناہ حاصل کی۔ اسے محض اتنا یاد تھا کہ مشین گن کے پیچھے گوبن کا چہرہ مسکرا رہا تھا۔

لیجن نے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ وہ پوری طرح مسلح تھے۔ لہٰذا حملہ آور فرار ہو چکے تھے۔ جب اس نے مردہ ویٹ۔ من کو سڑک پر پڑا دیکھا تو وہ افسردہ ہو گئی۔ گوبن نے اسے تھپکی دی اور کہا کہ:

"چیخو چلاؤ...... تم ایک خاتون ہو...... جاؤ اور چیخو چلاؤ...... خدا کا شکر ادا کرو کہ تم ان ہلاک شدگان کا ماتم کرنے کیلئے زندہ بچ گئی ہو۔"

شام کے وقت جبکہ وہ سائیگون کے نزدیک تر پہنچ چکے تھے...... انہوں نے جنگل کی جانب سے کچھ آوازیں سنیں...... یہ لوگ جرمن زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔ یہ نازی تھے۔ انہوں نے لیجن سے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے ویٹ۔ من کے ساتھ شمولیت اختیار کر لی تھی اور وہ لیجن میں شامل دیگر جرمنوں کو بھی اس امر کی جانب راغب کر رہے تھے کہ وہ بھی لیجن کو چھوڑ دیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ویٹ۔ من کا ساتھ دینے میں خطرات کم تھے...... تنخواہ بھی معقول تھی اور مابعد وہ آسٹریلیا جانے کے بھی قابل ہو سکتے تھے۔

13 واں ڈیمی بریگیڈ سائیگون سے باہر واقع فرانسیسی فارن لیجن کے ہیڈکوارٹر 1946ء کے نئے سال کی شام کو پہنچ چکا تھا۔ یہاں پر

چارلاٹ ابینز کی تواضع آفیسر کلب میں فرانس کی شراب کے ساتھ کی گئی۔ اسے خواتین کے ملبوسات پیش کئے گئے جو فرانسیسی کپڑے سے تیار کئے گئے تھے۔

اسے بتایا گیا کہ:۔

''فارن لیجن کے ہیڈکوارٹر میں ہر چیز موجود تھی حتیٰ کہ خواتین کے خوبصورت ملبوسات بھی موجود تھے جو اس ہیڈکوارٹر کا دورہ کرنے والی خواتین کو پیش کئے جاتے تھے۔''

نیا سال شیمپئن پیتے ہوئے اور ناچتے گاتے ہوئے منایا گیا۔

مس ابینز نے گولبن سے دریافت کیا کہ وہ فارن لیجن کی زندگی کو کیوں پسند کرتا تھا۔

اس نے جواب دیا کہ:۔

''مجھے محض جنگ کرنا آتی ہے اور ایک سپاہی کی وفاداری مجھ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔''

جب وہ سائیگون جا پہنچی تب مس ابینز کے علم میں یہ بات آئی کہ ہنوئی کے مقام پر ایک بڑی داستان منظر عام پر آ چکی تھی...... یہ مقام شمال کی جانب 800 میل کی دوری پر واقع تھا۔

فرانسیسی حکام کچھ عرصے سے ہوچی من سے گفت وشنید سر انجام دے رہے تھے...... وہ ویٹ۔ من کا رہنما تھا اور یہ امید کی جا رہی تھی کہ اس گفت وشنید کے نتیجے میں انڈو۔ چائینا میں امن قائم ہو جائے گا۔ لیکن 1946ء کے کرسمس سے تھوڑی دیر پہلے ویٹ۔ من اچانک ان خفیہ سرنگوں سے نمودار ہوئے جو انہوں نے ہنوئی کے نیچے بنا رکھی تھیں اور شہر پر قبضہ جمانے کی کوشش کی۔ ہزاروں فرانسیسی خواتین اور بچے ہلا کر دیئے گئے۔ فرانسیسیوں نے بھی منہ توڑ جواب دیا اور نیپام بم استعمال کرتے ہوئے بغاوت کو کچل کر رکھ دیا۔

جب چارٹ لاٹ ابینز جنوری 1947ء کے آغاز میں ہنوئی پہنچی تب شہر کا ایک بڑا حصہ کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا تھا۔ فرانسیسیوں کی بمباری سے سینکڑوں کی تعداد میں ویٹ۔ من مارے جا چکے تھے اور ان کی لاشیں ان کی بنائی گئی سرنگوں میں پھینک دی گئی تھیں۔ کچھ ویٹ۔ من ان سرنگوں میں چھپے ہوئے تھے۔ لہٰذا ان سرنگوں کو بمباری کا نشانہ بنایا گیا اور وہ ان سرنگوں کے اندر ہی ہلاکت کا شکار ہو چکے تھے جن میں چھپے بیٹھے تھے۔ وہ لوگ جو ہنوئی آتے تھے وہ اس شہر کو اجڑا ہوا پاتے تھے اور اپنے ناک پر رومال رکھ کر اس کی ویران گلیوں اور بازاروں سے گزرتے تھے کیونکہ لاشیں بدبو چھوڑ چکی تھیں۔

اس کا ہوٹل ایک فوجی قلعے کی مانند تھا۔ اس کی کھڑکیوں اور دروازوں میں فرنیچر جوڑ دیا گیا تھا۔ ہوٹل میں اس کے قیام کی پہلی رات ایک ویٹ۔ من گوریلا ہوٹل کی چھت پر چڑھ گیا اور ایک سرخ جھنڈا چھت پر لہرا دیا۔ صبح جب ایک فرانسیسی سپاہی اس جھنڈے کو اتارنے کے لئے چھت پر چڑھا تو کمین گاہ میں چھپے ایک دشمن نے اسے گولی کا نشانہ بنا ڈالا۔

مس ابینز ایک فرانسیسی پبلک ریلیشن آفیسر کے ہمراہ ہنوئی شہر کے دورے پر روانہ ہوئی...... اس افسر نے اسے یقین دلایا تھا کہ یہ شہر اب

بالکل محفوظ تھا۔ وہ اسے وہ ظالمانہ فعل دکھانا چاہتا تھا جو ویٹ۔ من نے سرانجام دیے تھے۔

وہ اسے رہائشی کوارٹروں میں لے گیا جہاں پر فرانسیسی خواتین کی لاشیں موجود تھیں انہیں تشدد کر کے ہلاک کیا گیا تھا۔ ایک خاتون کا پیٹ چاک کیا گیا تھا اور اس کے پیٹ میں موجود اس کا بچہ اس کی لاش کے ایک جانب پڑا تھا۔ مردہ فرانسیسی اپنے گھروں کے باغیچوں میں پڑے تھے۔ ان کی آنکھیں نکال دی گئی تھیں۔

اس نے سوال کیا کہ ان لاشوں کو دفنایا کیوں نہ گیا تھا...... اس سوال کے جواب میں پبلک ریلیشن آفیسر اسے ہنوئی پارک میں لے گیا جہاں پر آبائی باشندے خندقیں کھود رہے تھے اور سڑی گلی لاشوں کو ان میں دفنا رہے تھے...... سفید اور براؤن اکٹھے دفنائے جا رہے تھے اور اتنی تیزی کے ساتھ دفنائے جا رہے تھے جتنی تیزی کے ساتھ انہیں دفنانا ممکن تھا۔

پبلک ریلیشن آفیسر کہنے لگا کہ:۔

"ویٹ۔ من یہ سمجھتے تھے کہ وہ ہمیں خوفزدہ کر کے انڈو۔ چائینا سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ جب ہم خوفناک قتل و غارت دیکھیں گے تب ہم یہاں سے بھاگ نکلیں گے۔"

پبلک ریلیشن آفیسر نے اسے وہ زمین دوز راستے دکھائے جو شہر کے مضافات سے لے کر شہر کے وسط تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں اسلحہ خانے بھی موجود تھے اور اسلحے کے ذخیرے بھی موجود تھے۔ فرانسیسیوں کو ان زمین دوز راستوں اور ان میں بنائے گئے اسلحہ خانوں کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ بغاوت کا آغاز ہونے سے چند روز پہلے وہ غدار ھوچی من سے گفت وشنید سرانجام دے رہے تھے جو ویٹ۔ من کا سربراہ تھا۔ اس نے فرانسیسیوں کو یہ اشارہ بھی دیا تھا کہ ان کے درمیان معاہدہ قرار پا سکتا تھا اور اس کے بعد وہ ہنوئی سے غائب ہو گیا تھا اور وہ اس بغاوت اور قتل و غارت سے کچھ ہی دیر پہلے شہر سے غائب ہوا تھا۔ فرانسیسیوں کو اس پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔

چارلاٹ ابینر نے ہنوئی میں امریکی وائس کونسل کے ہمراہ رات کا کھانا کھایا۔ فرانسیسیوں اور ویٹ۔ من کے درمیان شہر میں توپ خانے کی بمباری جاری تھی اور یہ بمباری تین روز تک جاری رہی۔ اس کے بعد ویٹ۔ من تہہ خانے کی جانب پسپائی اختیار کر گئے جو انہوں نے اسی مقصد کیلئے تیار کر رکھا تھا۔ امریکی وائس کونسل نے اسے بتایا کہ فرانسیسی گونگے...... بہرے...... اور اندھے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ہنوئی شہر میں کیا کچھ وقوع پذیر ہو رہا تھا۔ فرانسیسی اس حقیقت سے آنکھیں چرا رہے تھے کہ انڈو۔ چائینز آزادی چاہتے تھے اور وہ ہر قسم کی جنگ کے لئے تیار تھے اور آزادی کے حصول کی خاطر اپنی جانیں نچھاور کرنے پر بھی آمادہ تھے۔ جب بمباری کی شدت میں کچھ کمی واقع ہوئی تب امریکی وائس کونسل اسے اپنی جیپ میں اس کے ہوٹل واپس لے گیا۔

ہنوئی میں ایک ہفتہ گزارنے کے بعد وہ ایک ہسپتال کے طیارے میں سائیگون واپس چلی آئی۔ اس طیارے میں اس کی گنجائش سے زائد فرانسیسی زخمی سوار تھے جن کی تیمارداری ریڈ کراس کی ایک سابق نرس سرانجام دے رہی تھی۔ یہ سپاہی نوجوان لڑکے تھے جو نازیوں کے زیر تسلط فرانس میں جوان ہوئے تھے۔

چارلاٹ ابیئرافسردہ اوردل شکستہ انڈو۔ چائینز کی ایک خانقاہ کے صدر راہب کے ساتھ انٹرویو کرنے کے لئے اس کے پاس جاپہنچی جس کے کمیونزم مخالف ہونے کے بارے میں کوئی شک نہ تھا۔ اگرچہ ہنوئی کی قتل وغارت پر وہ افسردہ تھا لیکن اس کا کہنا تھا کہ:۔

''اس وقت تک کچھ نہیں کیا جاسکتا جب تک فرانسیسی فوجی دستے اس ملک سے نہ نکل جائیں۔''

اس نے مزید کہا کہ:۔

''تم نے غیر ملکیوں کے ہاتھوں میں اسلحہ تھماتے ہوئے اس لڑائی کو لڑنے کی کوشش کی ہے اور تم جیت سے ہمکنار نہیں ہوسکے ......تم کبھی نہیں جیت سکتے۔''

فرانسیسی مزید سات برس تک وہاں پر برسرپیکار رہے اور ناامیدی کے ساتھ جنگ لڑتے رہے۔

1954ء میں وہ چھوڑ کر چلے آئے اور ان کی جگہ امریکنوں نے سنبھال لی۔ 19 برس بعد...... جنگ بندی کے معاہدے کے باوجود بھی ......اور امریکنوں کے وہاں سے روانہ ہونے کے باوجود بھی......اس ملک میں امن بحال نہیں ہوسکا۔

ناٹی لس آب دوز کی تیاری کی جدوجہد

بنی نوع انسان صدیوں سے سب میرین (آب دوزوں) کے خواب دیکھتا چلا آ رہا ہے...... انسانی تخلیق کردہ مکینیکل مچھلیوں کے خواب دیکھتا چلا آ رہا ہے تاکہ سمندر کی تہہ میں تیراکی کر سکے اور کوئی اسے ڈھونڈ نہ پائے۔

بنی نوع انسان سب میرینیں (آب دوزیں) تیار کر چکا ہے...... سینکڑوں کی تعداد میں تیار کر چکا ہے اور بخوبی مطمئن ہو چکا ہے۔ اگرچہ زمانہ امن میں ان کا کوئی استعمال نہیں ہے...... یہ جنگی ہتھیار کی اہمیت کی حامل ہیں اور بطور جنگی ہتھیار اپنا آپ منوا چکی ہیں۔

لیکن جے مین رک اوور نے پہلی ایٹمی آب دوز تیار کی...... ناٹی لس...... اس قسم کی آبدوز پہلے کبھی تخلیق نہ کی گئی تھی۔

21 جنوری 1954ء کو اس پہلی حقیقی آبدوز کو امریکی بندرگاہ کنکٹی کٹ سے سمندر میں اتارا گیا۔ اس تقریب میں شریک افراد یہ جانتے تھے کہ بحری جنگ میں ایک انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ یہ ایک پراسرار تقریب تھی۔ اس تقریب میں مسٹر پرائس جس کا تعلق ولینگ ہاؤس سے تھا اور مسٹر ھوپ کنز جس کا تعلق جنرل ڈائینا مک سے تھا...... دونوں نے اپنی اپنی فرموں کی تعریف سرانجام دی اور بتایا کہ ان کی فرموں نے کیا کارہائے نمایاں سرانجام دیے تھے اور ایڈمرل کارنی نے امریکی بحریہ کی تعریف سرانجام دی۔ دریائے تھیمز پر گہری دھند چھائی ہوئی تھی اور اس دھند نے دریائے تھیمز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا...... دور دراز کے مقام پر نیولندن بھی دھند میں چھپا ہوا تھا اور عجیب قسم کی ٹھنڈک لوگوں کی ہڈیوں میں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ معمول کی سردی سے بڑھ کر سردی محسوس ہو رہی تھی۔ اس سردی سے بڑھ کر سردی محسوس ہو رہی تھی جتنی سردی ماہ جنوری میں کنکٹی کٹ میں محسوس کی جاتی تھی ایک شخص نے اس نکتہ نظر کا اظہار کیا کہ:۔

"یہ موت کی ٹھنڈک تھی"

لیکن جذبات اپنی انتہا پر تھے۔ ایک بحری کمانڈر کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ دیگر لوگ بھی فرط جذبات سے مغلوب تھے۔ جونہی رک اوور کا نام لیا گیا...... تالیاں گونجنے لگیں۔

جوں ہی تقاریر جاری رہیں جے مین جارج رک اوور بے حس و حرکت بیٹھا رہا...... جذبات سے عاری بیٹھا رہا...... وہ بحریہ کے سیکرٹری کی بیگم کی ساتھ والی نشست پر براجمان تھا...... وہ آج کا ہیرو تھا...... مہمان خصوصی تھا...... اس حقیقت کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا تھا۔

اچانک دھند اوپر اٹھ گئی...... ایسا دکھائی دیتا تھا کہ کسی مخفی ہاتھ نے دھند کو اوپر اٹھا لیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس عظیم جہاز کو دریا میں اتارا گیا۔ اس وقت صبح کے گیارہ بجنے میں تین منٹ باقی تھے...... ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔

اس آب دوز میں کیا انوکھا پن تھا...... کیا نرالا پن تھا؟

ناٹی لس نامی اس آب دوز کی کہانی جے مین رک اوور کی کہانی ہے۔آیئے ہم چند برس پیچھے چلتے ہیں اور اس کی اپنی آنکھوں کے ساتھ اس منظر کو دیکھتے ہیں۔وہ 1922ء میں جس لمحے امریکی بحریہ میں شامل ہوا تھا اسی لمحے سے ایک غیر معمولی افسر کے طور پر منظر عام پر آیا تھا۔غالبًا یہ اس کا ماخذ تھا......اس کا پس منظر تھا......جس نے اسے غیر معمولی بنا کر رکھ دیا تھا......امریکی بحریہ میں محض چند باقاعدہ بحری افسر ایسے ہیں جنھوں نے ایسے غریب یہودیوں کے ہاں جنم لیا تھا جو روسی پولینڈ میں درزی تھے......جے مین نے بھی وہاں پر ہی جنم لیا تھا......اس نے 1900ء میں جنم لیا تھا......غربت اور خوف و ہراس دونوں پائے جاتے تھے......روسی اسٹیٹ چرچ پہلے ہی اپنی اس خواہش کا اظہار کر چکا تھا کہ وہ پولینڈ کے ایک تہائی یہودیوں کا مذہب تبدیل کروالے گا......ایک تہائی کو ہجرت کرنے پر مجبور کردے گا اور بقایا کو موت کے حوالے کردے گا۔راک اوور خاندان نے دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہجرت کو ترجیح دی۔پہلے ابراہیم راک اوور بذات خود امریکہ جا پہنچا۔امریکہ نے اسے روزگار فراہم کیا......اسے دوستانہ ماحول فراہم کیا......اور کچھ نہ کچھ رقم پس انداز کرنے کا موقع فراہم کیا۔دو برس بعد...... 1906ء میں وہ اپنی بیوی اور بچوں کو بھی امریکہ بلانے کے قابل ہو چکا تھا۔

نیویارک میں چند برس تک جانفشانی سے کام کرنے کے بعد یہ خاندان شکاگو چلا آیا۔اس مقام پر بچے ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے قابل ہوئے......لیکن انہیں کام بھی کرنا پڑتا تھا......وہ اسکول سے چھٹی کرنے کے بعد کام کرتے تھے۔نوجوان جے مین سائیکل پر ٹیلی گراف قاصد کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔

ان کی زندگی میں پہلا انقلاب پولینڈ چھوڑنے پر آیا تھا جبکہ دوسرا انقلاب پہلی جنگ عظیم کے موقع پر آیا۔کانگریس کے ایک رکن نے نوجوان جے مین کو اناپولس بحری اکیڈیمی میں داخلہ دلا دیا تھا۔جے مین رک اوور نے کبھی بھی بحریہ کو اپنا کیریئر بنانے کے بارے میں نہ سوچا تھا......لیکن اسے ایک فرسٹ کلاس کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع میسر آ چکا تھا۔

لیکن وہ اس اکیڈیمی کی زندگی کے لئے ناموزوں تھا۔وہ سالہا سال سے اسکول سے چھٹی کرنے کے بعد ویسٹرن یونین کی ٹیلی گرامیں تقسیم کرتا رہا تھا......اس کی اس مصروفیت نے اسے فٹ بال......ہاکی......اور بیس بال جیسی کھیلوں سے دور رکھا تھا۔لہٰذا اس اکیڈیمی نے اسے قبول نہ کیا اور واپس بھیج دیا۔اسے جو بھی لمحہ میسر آیا اس نے اس لمحے کو اپنے کمرہ میں مطالعہ میں مگن رہتے ہوئے گزارا۔بالآخر 1992ء میں اس نے اپنی گریجوایشن مکمل کرلی۔لیکن اس وقت تک وہ بحریہ کی سروس کو پسند کرنے لگا تھا۔لہٰذا اس نے اس سروس میں شمولیت اختیار کرلی۔

اگرچہ وہ بحریہ کو پسند کرتا تھا لیکن اس نے اسے ایک واضح انداز میں دیکھا۔تنقیدی نکتہ نگاہ سے دیکھا......اس انداز سے دیکھا جیسے اس کی ترقی اور بہتری کی گنجائش موجود تھی۔اور یہی وہ سب کچھ تھا جو جے مین رک اوور اپنی سروس کے دوان سرانجام دینا چاہتا تھا۔

ابھی اس کی بحریہ کی سروس کا آغاز ہی ہوا تھا کہ اس کا تباہ کن جہاز پر ''پری وال'' سان ڈیگو کی بندرگاہ پر موجود تھا جبکہ خشکی پر ایک دھماکہ ہوا جس کے نتیجے میں ایک شخص بری طرح زخمی ہوگیا۔اس زخمی کے لئے اسے فوراً ڈاکٹر کی ضرورت تھی......لیکن پر ''پری وال'' پر کوئی ڈاکٹر موجود نہ تھا۔جہاز کا آدھا عملہ کشتیوں میں سوار ساحل کی جانب جا چکا تھا اور کوئی کشتی بھی موجود نہ تھی۔راک اوور نے فلیگ شپ......ایک کروزر کو سگنل روانہ

کیا...... اور ایک ڈاکٹر بھیجنے کو کہا اور یہ بھی کہا کہ ڈاکٹر کی از حد ضرورت درپیش تھی۔ کچھ دیر بعد واپسی جواب موصول ہوا کہ:۔

''اپنی کشتی بھیجو......ہم ڈاکٹر بھیج دیں گے''

راک اوور کا غصے سے بُرا حال تھا۔ اس نے ان کو بتایا کہ اسے ڈاکٹر اور کشتی دونوں کی ضرورت درپیش تھی اور تھوڑی دیر بعد دونوں پہنچ چکے تھے۔ معجزانہ طور پر وہ زخمی شخص صحت یاب ہو گیا۔

اسے بحریہ میں بہتری لانے کا پہلا موقع اس وقت میسر آیا جب وہ ایک لڑاکا جہاز یو۔ ایس۔ ایس ''نیوادا'' میں الیکٹریکل آفیسر مقرر ہوا۔ یہ کسی بھی افسر کیلئے ایک بہت بڑا اعزاز تھا کہ وہ اکیڈیمی چھوڑنے کے محض تین برس بعد اس عہدے پر فائز ہو جائے۔ وہ بحریہ کی ترقی اور نت نئی ایجادات کی جانب راغب رہا۔ اس نے ''نیوادا'' میں ہینڈل ٹیلی فون سسٹم نصب کر دیا اگرچہ اس کے اس عمل درآمد کی مخالفت کی گئی تھی۔ اس کے فوراً بعد اسے لیفٹیننٹ جونیئر گریڈ کے عہدے پر ترقی دے دی گئی تھی......وہ اپنے کام میں اس قدر محو رہتا تھا کہ ایک برس تک اس نے اپنے تبدیل شدہ رینک کے بیج بھی استعمال نہ کئے تھے۔ جب کبھی اسے کسی دوسرے جہاز پر پارٹی میں مدعو کیا جاتا تب وہ مناسب وردی زیب تن کرتا جس سے اس کے رینک کا اظہار ہوتا تھا۔

پانچ برس تک کمیشنڈ سروس سرانجام دینے کے بعد اسے یہ موقع میسر آیا کہ وہ واپس اناپولس اکیڈیمی میں پوسٹ گریجوایشن کے لئے جائے اور اس نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ جلد ہی اسے دیگر موزوں ترین امیدواران کے ہمراہ کولمبیا یونیورسٹی میں ٹرانسفر کر دیا گیا تاکہ وہ الیکٹریکل انجینئرنگ میں ماسٹرز ڈگری حاصل کر سکے۔

اس نے ڈگری بھی حاصل کر لی اور بیوی بھی حاصل کر لی۔ وہ دونوں کے حصول میں کامیاب ہوا۔ رتھ قانون بین الاقوام میں ماسٹرز ڈگری کر رہی تھی۔ اس دوران دونوں نے شادی کر لی۔

ڈگری حاصل کرنے کے بعد اس کی اپنی درخواست پر اسے سب میرین اسکول بھیج دیا گیا اور مابعد اس کو سب میرین ''ایس۔48'' پر تعینات کر دیا گیا۔ اس تعیناتی پر بھی اس نے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

سال پر سال گزرتے چلے گئے......ایک اور جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ اس موقع پر اس کی تعیناتی واشنگٹن میں بیورو آف شپ میں ہوئی تھی۔ اس کے وہاں پہنچنے پر برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا۔ اور اس نے اس جنگ کو ایسی بغور نظروں کے ساتھ دیکھا جیسے لندن میں بیٹھا ایک ایڈمرل اس جنگ کو بغور نظروں سے دیکھ سکتا تھا۔ چند ماہ کے اندر اندر وہ برطانیہ کے بحری نقصانات پر خوف وہراس کا شکار ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ جب اس امر کا انکشاف ہوا کہ برطانیہ کے زیادہ تر بحری نقصانات جرمنی کی مقناطیسی سرنگوں کی بدولت ہوئے تھے تو وہ یک دم اس سوچ بچار میں مصروف ہو گیا کہ اس نئے جنگی ہتھیار کا کیا توڑ ہونا چاہیئے۔ امریکہ میں اس وقت چند ایک افراد ہی ایسے تھے جو اس مسئلے یا اس مسئلے کے حل سے آگاہ تھے۔ لہٰذا اس نے اس ہتھیار کا توڑ دریافت کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔

لیکن جب اعلیٰ حکام کے علم میں یہ بات آئی کہ یہ سب کچھ ان کے علم میں لائے بغیر سرانجام دیا جا رہا تھا تو انہوں نے اس کی باز پرس کی۔

لیکن ایک ایڈمرل اس پراجیکٹ کی اہمیت سے بخوبی واقف تھا۔لہٰذا اس کی مداخلت سے بات ٹل گئی۔

امریکہ بھی جنگ میں شامل ہو چکا تھا اور چار برس بعد جرمنی نے ہتھیار پھینک دیے۔ جاپان کے حملہ آور ہونے کے بعد...... آپریشن ''کورونٹ'' جاری تھا...... رک اوور سے اس کی مرضی دریافت کی گئی کہ کیا وہ غیر ملکی ڈیوٹی سرانجام دینا پسند کرتا تھا۔ اس کی مرضی دریافت کرنے کے بعد اس کی تعیناتی اوکی ناوا میں کردی گئی لیکن امریکہ میں اہم بحری امور نپٹاتے ہوئے وہ جولائی 1945ء تک اپنے نئے تعیناتی مقام پر نہ پہنچ سکا۔ چند ماہ بعد اس نے محسوس کیا کہ اس مقام پر دشمن کی سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ لہٰذا وہ مغربی ساحل پر واپس آ گیا۔

اور اب ''ایٹم بم'' کا قصہ ہر ایک کی زبان پر تھا۔ راک اوور کے ذہن میں بھی ایک خواب ابھر رہا تھا۔

1944ء میں ایک خصوصی کمیٹی نے یہ سفارشات پیش کی تھیں کہ امریکی حکومت کو توانائی کے حصول کیلئے ایٹمی تجربات سرانجام دینے چاہئیں۔

اس منصوبے پر کام جاری رہا اور جلد ہی اس منصوبے میں کامیابی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔

1946ء میں مونسانٹو کیمیکل کمپنی نے یہ تجویز پیش کی کہ مسلح افواج کے نمائندے بھی ان کی تحقیقات میں شامل ہوں تب تینوں مسلح افواج نے ان کی اس تجویز کو قبول کرلیا اور کیپٹن رک اوور جو کئی ماہ سے انہیں خطوط پر سوچ بچار سرانجام دے رہا تھا...... اسے بحریہ کی ٹیم میں شامل کرلیا گیا ......اسے ایک اعلیٰ افسر کی حیثیت سے شامل کیا گیا تھا۔

واشنگٹن میں بہت سے لوگ یہ اعتراض کرتے دکھائی دیتے تھے کہ ایچ۔جی۔راک اوور اس کام کے لئے ایک موزوں ترین شخص نہ تھا۔ ان کے خیال میں اس کام کیلئے ایک سفارت کار کی ضرورت درپیش تھی جو ان سویلین اور دیگر دونوں سروسوں کے ساتھ باہم روابط رہتا۔

اب کام کا آغاز ہو چکا تھا۔ آٹھ برس تک انتہائی جانفشانی سے کام سرانجام دیا جاتا رہا اور رک اوور ''ناٹی لس'' بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس دوران اس کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا...... جن مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا...... چونکہ حکومتی ادارے اور کمرشل فرمیں اور بحریہ بھی اس کی حوصلہ شکنی پر کمربستہ تھی...... اس کی جگہ اگر کوئی اور شخص ہوتا تو وہ اپنا حوصلہ ہار چکا ہوتا اور مایوسی کا شکار ہوکر اپنے کام سے دست بردار ہو چکا ہوتا۔ پہلے پہل کوئی بھی فرم ''بحری ری ایکٹر'' بنانے پر آمادہ نہ تھی...... یہ آئیڈیا ایک ناپختہ آئیڈیا تھا۔ وہ پہلے بڑے بڑے دس منزلہ ری ایکٹر تیار کرنا چاہتے تھے اور اس سے مزید علم حاصل کرنے کے متمنی تھے۔ یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر ایک ری ایکٹر ڈیزائن کر بھی لیا جائے تو وہ کسی بھی سب میرین کیلئے بہت بڑا ثابت ہوگا (لہٰذا اس کی بجائے ہمیں ائرکرافٹ کیریئر بنانا چاہیے) اور مزید یہ کہ کوئی بھی دھات اس قدر حرارت اور دباؤ برداشت نہ کر سکے لیکن راک اوور نے اپنی کاوش جاری رکھی...... وہ روزانہ 16 گھنٹے سے زائد کام سرانجام دیتا تھا۔ وہ اس نکتہ نظر کا حامل تھا کہ ایٹم سے لیس پہلی جو چیز تیار ہونی چاہیے وہ ایک آبدوز ہونی چاہیے نہ کہ ایک ہوائی جہاز ہونا چاہیے اور نہ ہی لڑاکا بحری جہاز ہونا چاہیے۔ یہ کہا جانے لگا تھا کہ یہ شخص پاگل تھا لیکن وہ اپنے کام میں مصروف رہا۔ اس نے کسی کی پرواہ نہ کی۔ وہ منصوبے تشکیل دیتا رہا۔ مختلف فرموں کے ساتھ ان منصوبوں پر عمل درآمد کے معاہدے سرانجام دیتا رہا۔ اس نے وہ تحقیق محض دو یا تین برس میں مکمل کرلی جس تحقیق کو مکمل کرنے کے لئے دس برس کا عرصہ درکار تھا۔

جبکہ لوگ اس منصوبے کو ایک ناکام منصوبے کا عنوان دے رہے تھے...... اور ایک ناممکن منصوبہ تصور کر رہے تھے...... اس نے اپنا کام جاری رکھا اور ری ایکٹر بنانے میں کامیاب ہو گیا۔

درحقیقت راک اوور نے چار برس پیشتر ہی اس منصوبے کے ابتدائی مراحل کا آغاز کر دیا تھا۔ اس نے 1946ء میں اس کے ابتدائی کام کا آغاز کیا تھا جبکہ اس کی تعیناتی اوک ریج میں ہوئی تھی اور اپریل 1950ء تک وہ اس کامیابی سے ہمکنار ہو چکا تھا جسے بہت سے لوگ ناممکن تصور کرتے تھے۔ اس نے حکومت کو اس امر پر راغب کر لیا تھا کہ وہ اسے آبدوز بنانے کی اجازت فراہم کرے اور ایک ایسے اسکول کا اجراء کرے جہاں پر نئی طرز کی جدید انجینئرنگ کی تعلیم دی جا سکے۔ اس کے پاس متذکرہ آب دوز اور اس کے پاور پلانٹ کی مکمل تفصیلات موجود تھیں۔ اس نے امریکہ کی دو بڑی فرموں سے بھی رابطہ کیا تھا...... واشنگٹن ہاؤس اور الیکٹرک بوٹ کمپنی (یہ فرم جنرل ڈائینا مک کا حصہ تھی)۔

لیکن اس کا کام محض اس لئے متاثر ہوتا رہا کہ اسے اڑا ہو...... واشنگٹن اور کنکٹی کٹ کے ساحلوں پر ٹرانسفر کیا جاتا رہا۔ 14 جون 1952ء کو ''ناٹی لس'' کا آہنی پینداگروٹن۔ کنکٹی کٹ میں اس وقت کے صدر ٹرومین نے سمندر میں اتارا...... اس کے پیچھے ایک دبلا پتلا شخص کھڑا تھا جو اس تمام تر کاوش کا ذمہ دار تھا۔ اس نے اپنے تاثرات کا اظہار کئے بغیر وہ سب کچھ سنا جو صدر امریکہ کہہ رہا تھا کہ:۔

''غور کریں کہ یہ منصوبہ کیا کچھ درکار رکھتا تھا۔ نئی دھاتیں تیار کرنا ہوں گی۔ ان کو استعمال کرنے کے نت نئے پراسس دریافت کرنے ہوں گے۔ تمام تر اقسام کی حامل نئی مشینری تیار کرنا ہوگی۔ سب سے اہم مرحلہ ایٹم کو توڑنے کا مرحلہ ہوگا۔
حفاظتی تدابیر بھی وضع کرنی ہوں گی تاکہ جہاز کا عملہ نقصان دہ تابکاری اثرات سے محفوظ رہ سکے۔''

صدر امریکہ نے مزید کہا تھا کہ:۔

''اس آبدوز کی فوجی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اس آبدوز کی تیاری سے بحریہ کے میدان میں ایک انقلاب برپا ہو جائے گا۔''

18 ماہ بعد...... جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں...... ناٹی لس سمندر میں اتاری گئی اور جلد ہی اس نے نہ صرف اپنے بنانے والوں کی قابلیت کو ثابت کر دیا بلکہ یہ بھی ثابت کر دیا کہ وہ سب کچھ سرانجام دے سکتی تھی جس کی توقع اس سے کی جا رہی تھی۔

اس وقت تک ہے مین رک اوور ترقی کی منازل طے کرتا رہا تھا اور بالآخر وہ ریئر۔ ایڈمرل کے عہدے پر جا پہنچا تھا۔ سفید بالوں کا حامل ایڈمرل جانتا تھا کہ بالآخر اس کا کام پایہ تکمیل تک پہنچ چکا تھا۔

......❁......

قدیم مسودوں کی دریافت

1947ء کے موسم گرما میں ایک خانہ بدوش لڑکا جس کا نام محمد ادھ۔ وھب تھا اپنی گمشدہ بکری کی تلاش میں معروف تھا۔ وہ وادی قمران کے نزدیک موجود تھا اور یہ علاقہ ایک ویران علاقہ تھا۔ وہ بکری تلاش کرتے ہوئے ایک غار کے دہانے تک جا پہنچا تھا۔ اس نے ایک پتھر اٹھایا اور اس خیال سے غار کے اندر پھینک دیا کہ اگر اس کا کوئی مویشی اس غار میں موجود ہوا تو وہ باہر نکل آئے گا۔ بجائے اس کے کہ وہ پتھر کی زمین کے ساتھ ٹکرانے کی آواز سنتا اس نے کچھ ظروف (برتن) کے ٹوٹنے کی آواز سنی۔ اس نے مزید پتھر غار کے اندر پھینکے اور مزید برتنوں کے ٹوٹنے کی آوازیں سنیں۔

یہ ایک عجیب وغریب بات تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس ویران علاقے میں کوئی بھی فرد رہائش پذیر نہ تھا۔ اس کے اندر تجسس نے سر ابھارا۔ وہ اپنی بکریوں کے ریوڑ کو بھول چکا تھا۔ وہ غار کے اندر داخل ہوا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ غار کا فرش مرتبانوں سے بھرا پڑا تھا...... ان میں سے کئی ایک مرتبان ٹوٹ چکے تھے۔

اس لمحے ایسا دکھائی دیتا تھا کہ اس کا حوصلہ اور جرأت اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اس نے سوچا کہ کسی اور کو کیا ضرورت ہو سکتی تھی کہ وہ اس ویران غار میں مرتبان اکٹھے کرتا پھرے۔ لہٰذا وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔ لیکن اپنے خانہ بدوش قبیلے کے کیمپ میں اس نے اپنی اس دریافت کا انکشاف اپنے ایک دوست سے کیا۔ اس کے دوست نے اس امر کا اظہار کیا کہ عین ممکن تھا کہ وہ مرتبان سونے چاندی کے سکوں سے بھرے ہوئے ہوں۔ دوست کے منہ سے یہ بات سن کر محمد وھب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس خزانے کے بارے میں سوچنے لگا جس کے موجود ہونے کا گمان اس کے دوست کو ہوا تھا۔ لہٰذا وہ اگلے دن اپنے دوست کے ہمراہ دوبارہ وادی قمران آن پہنچا۔ لیکن جب انہوں نے مرتبانوں کا معائنہ کیا تو ان کو مایوسی ہوئی کیونکہ ان میں سونے چاندی کے سکے موجود نہ تھے۔ انہیں جو کچھ نظر آیا وہ چمڑے کے رول اور قدیم اوراق کے سوا کچھ نہ تھا جو ایک قدیم کپڑے میں لپٹے ہوئے تھے۔

انہوں نے ان میں سے کچھ رول اپنے ہمراہ لئے اور اپنے کیمپ واپس آگئے۔ انہوں نے سب سے بڑے رول کو کھولنا شروع کیا تو یہ دیکھ کر ان کی حیرانگی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ اس رول کی کی وسعت ان کے خیمے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تھی۔

انہیں کچھ خبر نہ تھی کہ یہ کیا تھا اور لکھائی بھی ایک ایسی زبان میں تھی جس سے وہ نابلد تھے۔ وہ یہ اندازہ بھی نہ کر سکتے تھے کہ ان کے علاوہ کوئی اور شخص ان اشیاء میں دلچسپی کا حامل ہو سکتا تھا۔

وہ بیت اللحم چلے آئے۔ یہاں پر یہ قبیلہ باقاعدگی کے ساتھ جاتا تھا اور دودھ اور پنیر فروخت کرتا تھا۔ یہاں پر محمد وھب نے یہ رول ایک

شامی تاجر کو پیش کئے۔ اس تاجر کا نام خلیل اسکندر شاہین تھا۔ اس تاجر کے ساتھ ان کے کاروباری روابط تھے اور وہ عام طور پر کاندو کے نام سے جانا جاتا تھا۔

کاندو کو بھی اس رول میں کوئی خوبی نظر نہ آئی۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ عین ممکن تھا کہ چمڑہ اس کے کسی کام آ جائے۔ مابعد اس نے اپنے فرصت کے اوقات میں ان کا بغور جائزہ لیا۔ اگرچہ قدیم لکھائی اس کی سمجھ سے بالاتر تھی اور اسے ایک سے کوئی واسطہ بھی نہ تھا لیکن وہ اس قدر ذہین تھا کہ وہ یہ سمجھ سکتا تھا کہ یہ رول گراں قدر اہمیت کے حامل بھی ہو سکتے تھے۔ لہٰذا اس نے اس دریافت کے بارے میں یروشلم کے شامی آرک بشپ سے بات کی جس کا نام سیموئیل تھا۔

آرک بشپ سیموئیل اس لکھائی کو پہچان چکا تھا۔ ان پر جو لکھائی تحریر تھی وہ عبرانی زبان میں تھی اور اگرچہ وہ اس دریافت کی اہمیت سے آگاہ نہ تھا لیکن اس نے اسے خریدنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اس نکتہ نظر کا حامل ہو چکا تھا کہ یہ قدیم شامی مسودے تھے۔ محمد دھب نے اسے یہ بھی بتایا کہ اس غار میں اس قسم کے مزید نسخے موجود تھے اور کاندو کے علاوہ ایک شامی جس کا نام جارج تھا بھی اس غار کی جانب چل تھے۔ وہ جتنے رول بھی اٹھا سکتے تھے انہوں نے وہ سب اٹھا لئے...... آرک بشپ نے بھی غار کی جانب ایک مہم جو پارٹی روانہ کی تاکہ وہ اس کی تحقیق وتفتیش سرانجام دے سکے۔ مگر یہ پارٹی ایک غیر قانونی پارٹی تھی اور اس پارٹی نے غاروں میں موجود انتہائی قیمتی دریافت کو از حد نقصان سے دوچار کیا تھا۔

آرک بشپ نے اس دریافت کی اہمیت کا اندازہ لگانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس تحریر کو فادر جے۔ پی۔ ایم۔ وان ڈر پولوگ نے پڑھا جو بائبل کا ایک ولندیزی پروفیسر تھا۔ اس نے آرک بشپ کو بتایا کہ ان تحریروں میں سے ایک تحریر بائبل کی ایک انتہائی ابتدائی کاپی تھی۔

اب پروفیسر ای۔ ایل سکنک...... یروشلم کی یہودی یونیورسٹی کا پروفیسر بھی منظر عام پر آ چکا تھا۔ وہ حال ہی میں امریکہ سے واپس آیا تھا۔ جب اس نے ایک رول کا معائنہ سرانجام دیا تو وہ بہت خوش ہوا اور اس نے نہ صرف اس کے انتہائی قدیم ہونے کا اعتراف کیا بلکہ اس کی اہمیت کا بھی اعتراف کیا۔ اس کے علم میں یہ بات آئی کہ یروشلم کے رہائشی کاندو کے پاس اس قسم کے مزید رول موجود تھے۔ لہٰذا اس نے یروشلم کا رخت سفر باندھا تاکہ اس سے وہ رول خرید سکے۔

یہ ایک کٹھن سفر تھا۔ 1947ء کے دوران فلسطین میں برطانوی حکومت اس کوشش میں مصروف تھی کہ یورپی مہاجرین کے سیلاب کو فلسطین کی جانب بڑھنے سے روکے۔ اس کے جواب میں یہودیوں نے برطانوی فوجی دستوں کے خلاف تشدد کی مہم چلا رکھی تھی۔ ماہ نومبر میں جب اقوام متحدہ نے فلسطین کی تقسیم کیلئے رائے شماری کروائی تب یہودیوں اور عربوں کے درمیان لڑائی چھڑ گئی۔

بہرکیف اس دریافت پر تحقیق جاری رہی اگرچہ اس پر تحقیق سرانجام دینے والے خطرات کا بھی شکار رہے اور اس دریافت اور اس پر ہونے والی تحقیق کو مکمل طور پر خفیہ رکھا گیا...... اس دریافت کو ان حکام سے چھپایا گیا جن کی ذمہ داری یہی تھی کہ وہ اس قسم کی دریافت کی نگرانی سرانجام دیں اور اس پر اپنی گرفت مضبوط کریں۔

بیت اللحم میں سکنک مزید رول کاندو سے خرید کر لایا۔ کاندو اب اس خدشے کا شکار تھا کہ وہ غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث تھا۔ وہ غیر قانونی

طور پر غار سے یہ رول حاصل کر رہا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر متعلقہ حکام کے کانوں تک یہ بات پہنچ گئی تو اس کے لئے ایک مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا۔

جبکہ یہودی اور عرب یروشلم کے گلی کوچوں میں آپس میں لڑ رہے تھے اس وقت آرک بشپ سیموئیل اس دریافت کی اہمیت کا اندازہ لگانے کی کوشش میں مصروف تھا جس کا ایک قلیل حصہ اس کے قبضے میں تھا۔ اس نے ڈاکٹر جان سی۔ ٹریور سے بھی اس سلسلے میں رابطہ قائم کر رکھا تھا جو یروشلم میں مشرقی تحقیق پر ایک امریکن اسکول کا قائم مقام ڈائریکٹر تھا۔ اس نے اس دریافت کے بارے میں اس کی رائے بھی طلب کی تھی۔ لیکن اس نے اسے اس دریافت کا مقام غلط بتایا تھا اور یہ بتایا تھا کہ یہ دریافت سینٹ مارک کی خانقاہ سے اس کے ہاتھ لگی تھی۔

اس دریافت کا بخوبی معائنہ کرنے کے بعد ٹریور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ یہ رول اس بائبل کا مسودہ تھا جو قدیم ترین تھا اور اس سے قدیم ترین بائبل کا کوئی وجود نہ تھا۔ اس نے آرک بشپ سے اجازت حاصل کرتے ہوئے ان مسودوں کی فوٹو گرافک کاپیاں بھی کروائی تھیں۔ اس نے یہ نقول پروفیسر ڈبلیو۔ ایف۔ البرائٹ کو بھی روانہ کر دی تھیں جو بالٹی مور۔ امریکہ کی جان ھوپ کنز یونیورسٹی میں بائبل کا پروفیسر تھا۔

البرائٹ نے ان مسودوں کے حقیقی ہونے کی تصدیق کر دی تھی اور اسے ایک نایاب دریافت قرار دیا تھا...... اس نے اسے جدید دور کی ایک اہم ترین دریافت بھی قرار دیا تھا جو مسودوں کی شکل میں تھی۔ اس کی رپورٹ اپریل 1948ء میں امریکن اسکولز آف اورئینٹل ریسرچ کے رسالے میں چھپی تھی۔ اس رپورٹ کے چھپنے سے مفکرین کے حلقوں میں کھلبلی مچ گئی تھی۔

اس دریافت کا انکشاف ہونے پر یروشلم میں ایک مختلف قسم کے ردعمل کا اظہار ہوا۔ مسٹر گیرالڈ لان کیسٹر ہارڈنگ حال ہی نوادرات کے ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہوا تھا۔ وہ اردن اور عرب فلسطین میں پائے جانے والے نوادرات کا ذمہ دار تھا اور جب اس دریافت کا انکشاف دنیا پر ہوا اس وقت وہ اس دریافت سے مکمل طور پر لاعلم تھا اگرچہ یہ دریافت اس علاقے سے ہوئی تھی جس کا وہ ذمہ دار تھا۔

یہ رول کئی ایک افراد کے ہاتھوں تک پہنچ چکے تھے...... آرک بشپ سیموئیل ...... پروفیسر سلکنک ...... یروشلم کے امریکی اسکول آف اورئینٹل ریسرچ کے حکام...... اور کسی کے ذہن میں بھی اس خیال نے جنم نہ لیا تھا کہ وہ اس دریافت کے بارے میں متعلقہ حکام کو آگاہ کرے۔ اب آرک بشپ ان رولوں کو ملک سے باہر بھی لے چکا تھا۔ وہ انہیں لے کر امریکہ جا چکا تھا۔

ڈائریکٹر ہارڈنگ خوف وہراس کا شکار تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ماہ مئی برطانیہ فلسطین کو چھوڑ کر جا رہا تھا اور یہودیوں اور عربوں کے درمیان شدید لڑائی جاری تھی...... اس لڑائی کے دوران یروشلم کے قدیم شہر کو بھی نشانہ بنایا جاتا تھا...... ایسی صورت میں یہ یقین دہانی ضروری تھی کہ یہ نایاب رول کم از کم محفوظ حالت کا شکار رہیں۔ مزید برآں اس دریافت کے ضمن میں تمام تر کارروائی غیر قانونی تھی اور یہ بتانا ناممکن تھا کہ یہ دریافت کس قدر نقصان سے دوچار ہو چکی تھی کیونکہ غیر ماہر ہاتھ اس دریافت میں ملوث رہے تھے۔

اردن کے حکام امریکہ سے اس بیش قیمت دریافت کی واپسی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس دوران ہارڈنگ اس امر میں مصروف تھا کہ وہ اس دریافت کی باقیات کو سمیٹے جس کو محمد دھب نے غار میں پتھر پھینکتے ہوئے گذشتہ برس دریافت کیا تھا۔ ہارڈنگ نے اس درست مقام کا یقین کرنا تھا جہاں پر یہ رول دریافت ہوئے تھے اور اس کے بعد اس نے دریافت کے مقام کا آثار قدیمہ کے نکتہ نظر سے معائنہ سرانجام دینا تھا۔

ہارڈنگ نے اس تحقیق وتفتیش کی ذمہ داری جوزف سعد کے سپرد کر دی تھی۔ وہ یروشلم کے فلسطینی آثار قدیمہ عجائب گھر کا سیکرٹری تھا۔ حقیقی غار کا صحیح مقام دریافت کرنا ایک مشکل امر تھا۔ وہ لوگ جو اس بارے میں جانتے تھے کہ غار کا صحیح مقام کہاں پر واقع تھا جہاں سے یہ دریافت ان کے ہاتھ لگی تھی انہوں نے کچھ بتانے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ وہ حکام سے خائف تھے۔ اس قصے میں کافی زیادہ لوگ ملوث ہو چکے تھے۔ یہ امید بھی کی جاتی کہ مزید رول بھی دریافت ہو سکتے تھے اور ان کی دریافت قمران کے نزدیک ہی متوقع تھی۔ آرک بشپ سیموئیل ابھی تک غائب تھا۔ وہ امریکہ میں مقیم تھا۔ وہ ان رولوں کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنے کا متمنی تھا اور اسے واپس آنے کی کوئی جلدی نہ تھی۔

کئی ہفتوں تک سعد اس کوشش میں مصروف رہا کہ سینٹ مارک خانقاہ اور امریکن اسکول سے کسی قدر معلومات حاصل کر سکے لیکن اس کی یہ کوشش کوئی رنگ نہ لائی اور بے کار ثابت ہوئی۔ یروشلم یہودی افواج کی بمباری کی زد میں تھا۔ بالآخر سعد کو اردنی فوجی دستے کی ہمراہی میں اس مقام کی جانب روانہ کیا گیا جہاں پر اس دریافت کی حامل غار پائی جاتی تھی۔ یہاں پر ایک منظم فوجی تلاش ترتیب دی گئی اور اس طرح اس حقیقی غار کا انکشاف ہو گیا جہاں سے متذکرہ دریافت منظر عام پر آئی تھی۔ ماہ فروری 1949ء میں اس مقام کی کھدائی کا آغاز کیا گیا اور یہ کھدائی ہارڈنگ کی ہدایات کے تحت عمل میں لائی گئی۔ کھدائی کے آغاز ہی سے یہ انکشاف ہو چکا تھا کہ غیر قانونی کھدائی کی بدولت اس بیش قیمت دریافت کو کافی زیادہ نقصان پہنچ چکا تھا۔

ہارڈنگ کے علم میں یہ بات آئی کہ بنیادی طور پر اس غار میں 40 اور 50 کے درمیان مرتبان رکھے گئے تھے اور ہر ایک مرتبان میں کئی ایک مسودے بھی موجود ہو سکتے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ مرتبان اب خانہ بدوشوں کے قبضے میں تھے اور ان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔

سعد کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ ان خانہ بدوشوں کو تلاش کرے اور ان سے کسی بھی قیمت پر یہ رول خرید کرے...... وہ قیمت کی پرواہ نہ کرے اور منہ مانگے داموں پر ان کی خریداری سرانجام دے۔

سعد نے اپنی تلاش جاری رکھی اور اس کے علم میں یہ بات آئی کہ کاندو...... جو بیت اللحم کا ایک ڈیلر تھا اس نے یہ رول محمد دھب سے خریدے تھے۔

بیت اللحم میں لاقانونیت تھی اور جنگ کی وجہ سے وہ دنیا سے کٹ کر رہ چکا تھا اور اس مقام پر پُرامن طور پر اور پُرسکون طور پر تفتیش وتحقیق جاری رکھنا ممکن نہ تھا بالخصوص سعد کیلئے ایسا کرنا ممکن نہ تھا کیونکہ وہ ایک پُرامن اور پُرسکون محقق تھا۔ کاندو نے دیگر افراد کی طرح اپنے اردگرد مسلح افراد اکٹھے کر رکھے تھے اور اپنی املاک بچانے کا یہی ایک واحد طریقہ تھا۔ لیکن سعد اس عجیب وغریب مہم کا ایک بہادر ترین کردار تھا۔ وہ بے خوف وخطر کاندو کی دوکان میں چلا آیا۔ کاندو نے ایک حکومتی کارندے کے ساتھ تعاون کرنا مناسب نہ سمجھا لیکن سعد بھی اس وقت تک اس کے ساتھ محو گفتگو رہا جب تک وہ اس کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو گیا۔

بالآخر سعد کا صبر رنگ لایا۔ اس وقت تک کاندو اس دریافت کی قدر وقیمت سے بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس نے ایک ہزار پونڈ کا مطالبہ کیا اور ساتھ کسی بھی قسم کی پوچھ گچھ سے تحفظ کا بھی مطالبہ کیا۔ سودے بازی جاری رہی۔ لیکن بالآخر وہ اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو گیا اور

اس طرح یہ بیش قیمت مسودے منظر عام پر آئے اور دنیا کی نگاہ کا مرکز بنے۔

مزید مسودے بھی دریافت کر لئے گئے اگرچہ ان کی دریافت قدرے کم ڈرامائی انداز میں ہوئی۔ یہ مسودے قدیم انجیل کے مسودے تھے اور ان کو 100 قبل از مسیح تحریر کیا گیا تھا۔

اس دریافت پر کافی لے دے بھی ہوتی رہی اور یہ دریافت تضادات کا شکار بھی رہی اور یہ لے دے کافی برسوں تک جاری رہی۔

1949ء میں آرک بشپ انہیں لے کر عازم امریکہ ہوا تھا۔ اردنی حکومت اسے نشانہ تنقید بنا رہی تھی۔ حکومت نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر وہ واپس یروشلم نہ پہنچا تو اس پر مقدمہ چلایا جائے گا۔

آرک بشپ نے یہ جواب دیا کہ جب اس نے فلسطین کو چھوڑا تھا اس وقت برطانوی حکومت ختم ہو چکی تھی اور ملک میں کوئی بھی قانونی حکومت قائم نہ تھی۔ اس نے یہ مؤقف بھی اختیار کیا کہ ان مسودوں کو فروخت کر کے جو رقم حاصل کی جائے گی وہ رقم شامی آرتھوڈوکس چرچ کے حوالے کر دی جائے گی۔ اس کی دانست میں یہ مسودے اسی کی جائیداد تصور کئے جا سکتے تھے۔

ان مسودوں پر برس ہا برس تک لے دے ہوتی رہی۔ امریکی ادارے انہیں خریدنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ لیکن ان کی ملکیت ابھی طے ہونا باقی تھی۔ 1955ء میں اسرائیل کے لئے ان کی خریداری عمل میں آئی اور انہیں یروشلم کی صیہونی یونیورسٹی کی زینت بنا دیا گیا۔

پائلٹ نے ولی ڈیوک نے بیک وقت دو ریکارڈ توڑ ڈالے

زمین پر پچیس منٹ...... مکلینک...... آئل کمپنی کے نمائندے...... صحافی...... سبھی موجود تھے...... تب اس نے دوبارہ کاک پٹ سنبھالا اور اپنی پرواز پر روانہ ہوا...... اس وقت تک آدھا دن بیت چکا تھا اور سورج اپنی تپش بکھیر رہا تھا...... لیکن جب کوئی شخص مشرق کی جانب ریکارڈ توڑنے والی اڑان میں محو ہوتا ہے تب جلد ہی وہ رات سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

چند منٹوں کے بعد وہ دوبارہ 21,000 فٹ کی بلندی پر محو پرواز تھا۔ اس کے اردگرد ستارے چمک رہے تھے اور اس کے سر کے اوپر ایک بڑا سا چاند بھی اپنی کرنیں بکھیر رہا تھا۔ چار میل نیچے مشرق وسطی دن کے اختتام پر محو خواب تھا اور کئی سو میل دور کراچی واقع تھا۔ 19 گھنٹے...... 14 منٹ...... یہ لندن سے پرواز کا ریکارڈ تھا...... کیا وہ اس ریکارڈ کو توڑ سکے گا؟

وقت گزرتا رہا...... منٹ گھنٹوں میں تبدیل ہوتے رہے...... اس نے سوچا کہ بہتر ہے کہ اب نقشے کی پڑتال کی جائے۔ اس کے کاک میں لائٹ نہ تھی...... لائٹ فٹ کرنا محو کر دیا گیا تھا۔ ٹارچ کہاں تھی؟ وہ بہتر محسوس کر رہا تھا۔ اور وہ تھکا ماندہ دکھائی نہ دیتا تھا۔

اسے ٹارچ مل چکی تھی...... اس نے ٹارچ روشن کی اور نقشے پر نگاہ دوڑائی...... اپنے فنی ساز و سامان کی پڑتال سرانجام دی۔

اسے بلوچستان کا ساحل دکھائی دیا جو 21,000 فٹ نیچے تھا اور کئی میلوں تک اس کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ اس نے ٹارچ بجھا دی۔ وہ اپنے آپ کو بہتر محسوس کر رہا تھا۔

لیکن وہ کیوں محو پرواز تھا...... آخر کیوں؟...... نے ولی ڈیوک ایک نوجوان تھا جو رائل ائرفورس میں اپنا شاندار کیریئر برقرار رکھ سکتا تھا (اور اس لمحے زمین پر خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہوتا)...... لیکن اب وہ مشرق کی جانب محو پرواز تھا اور ایک قائم شدہ ریکارڈ توڑنے کا متمنی تھا اور اسے یہ بھی یقین تھا کہ اس کا قائم کردہ ریکارڈ بھی کسی نہ کسی روز کوئی نہ کوئی فرد ضرور توڑ ڈالے گا...... اور جلد ہی توڑ ڈالے گا کیونکہ برق رفتار طیارے منظر عام پر آرہے تھے...... اور یہ ریکارڈ قائم کرنا اور ریکارڈ توڑنا بھی کیا خوشگوار عمل در آمد تھا۔

ایک شخص ایک پائلٹ کیوں بنتا ہے؟

نے ولی ڈیوک کیلئے بچپن ہی سے اس پیشے سے رغبت پائی جاتی تھی۔ وہ اپنا جیب خرچ جمع کرتا رہتا تھا اور پرواز سے لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔

ایک روز اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس کی والدہ کی عمر کی ایک خاتون نے اس سے کہا کہ کیا وہ اس کے ہمراہ شریک پرواز ہو سکتا تھا۔ کاک پٹ میں دو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ اس خاتون کا کہنا تھا کہ اگر وہ کاک پٹ میں تنہا رہی تو وہ لطف اندوز ہونے سے قاصر رہے گی۔

سات برس بعد جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ اس نے اپنے والدین کے ساتھ صلاح مشورہ کیا اور اس کے بعد فضائی وزارت سے

رابطہ قائم کیا۔اس وقت اس کی عمر 18 برس سے کم تھی جب اس نے فضائی وزارت سے رابطہ کیا تھا۔اس نے شارٹ سروس کمیشن کے لئے درخواست دے دی۔

لیکن آر۔اے۔ایف نے اس میں کوئی دلچسپی نہ لی اور جواب دیا کہ:۔

''گھر جاؤ اور مزید بڑے ہو کر ادھر کا رخ کرنا۔''

لہٰذا وہ واپس چلا آیا۔اس وقت اس کی عمر ساڑھے سترہ برس تھی۔اس نے کسی نہ کسی طرح چھ ماہ مزید گزارے اور دوبارہ متعلقہ محکمے سے رابطہ قائم کیا۔اس کو یہ غمناک خبر سنائی گئی کہ اس وقت پائلٹوں کو تربیت فراہم کرنے کی کوئی ضرورت درپیش نہ تھی۔برطانیہ کے پاس مطلوبہ تعداد میں پائلٹ موجود تھے......لہٰذا اس کا شکریہ ادا کیا گیا اور بہتر مستقبل کی دعا کے ساتھ اسے رخصت کر دیا گیا۔

لیکن بالآخر ڈن کرک کے سانحہ کے ساتھ ہی اسے بھی موقع میسر آ گیا۔اسے تربیت کے لئے منتخب کر لیا گیا اور تربیت مکمل کرنے کے بعد وہ مصروف جنگ ہو گیا۔بالآخر 1944ء کے آخر میں اس کے کیریئر کا وہ دن بھی آن پہنچا جبکہ اس سے یہ دریافت کیا گیا کہ کیا وہ ایک نئی اسکیم کے ساتھ وابستگی اختیار کرنے کا متمنی تھا...... یہ ایک ائرکرافٹ فرم تھی جو پروڈکشن ٹیسٹنگ میں مصروف تھی۔اس نے یہ پیشکش قبول کر لی اور اس فرم کو جوائن کر لیا اور جب تین برس بعد اس ہاکر کی فرم جوائن کرنے کا موقع میسر آیا تو اس نے آر۔اے۔ایف کے کیریئر کو خیر باد کہتے ہوئے اس فرم کو جوائن کر لیا۔اس کا یہ انتخاب ایک سادہ انتخاب نہ تھا کیونکہ وہ ائرفورس کی زندگی سے محبت کرتا تھا اور اس نے اس زندگی کے دوران کئی ایک دوستیاں بھی پال رکھی تھیں......اس کے کچھ دوست موت سے بھی ہمکنار ہو چکے تھے۔لیکن زمانہ امن میں اعلیٰ افسران کم پرواز سرانجام دیتے تھے اور 27 سالہ ڈیوک کیلئے پرواز دنیا کی اہم ترین چیز تھی۔اس نے پروڈکشن ٹیسٹنگ میں اپنی خدمات سرانجام دیں ور مابعد اگست 1948ء میں اس نے ہاکر کو بطور ٹیسٹ پائلٹ جوائن کر لیا اور مختلف اقسام کے طیاروں کی پروازوں کو ٹیسٹ کرنے کی خدمات سرانجام دینے لگا۔

ہاکر کو جوائن کرنے کے دس ماہ بعد اس کو یہ موقع میسر آیا تھا کہ وہ ریکارڈ توڑ سکے......اور شاید دو ریکارڈ توڑ سکے......وہ اس ریکارڈ کو اس طیارے کے ساتھ توڑنے کا متمنی تھا جس کی ٹیسٹنگ وہ سرانجام دے رہا تھا۔ہاکر کے جنگی جہاز پاکستانی فضائیہ کو فراہم کئے جانے تھے اور فرم یہ چاہتی تھی کہ لندن تا روم اور لندن تا کراچی پرواز کے ریکارڈ توڑے جائیں۔پہلا ریکارڈ ڈیوک کے ایک دوست جان ڈیری نے قائم کیا تھا۔جان کا روم پہنچنے کا وقت 2 گھنٹے، 50 منٹ اور 40 سیکنڈ تھا اور کراچی کا ریکارڈ لان کیسٹیرین ائرس نے قائم کیا تھا۔اس کا دورانیہ 19 گھنٹے، 14 منٹ تھا۔ڈیوک کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ ان دونوں ریکارڈوں کو توڑے اور نیا ریکارڈ قائم کرے۔

طیارے کے ایندھن کے نظام میں کسی خرابی کی بنیاد پر پرواز 12 مئی تک ملتوی کر دی گئی تھی حالانکہ یہ پرواز 10 مئی کو سرانجام دینا تھی۔

لیکن بالآخر ڈیوک کا جنگی طیارہ لندن کے ہیتھرو ائرپورٹ سے محو پرواز ہوا۔جلد ہی وہ 21,000 فٹ کی بلندی تک جا پہنچا۔اس بلندی پر صورت حال بہتر تھی۔لیکن الپس کے نزدیک برف کے بادل موجود تھے جس کی بنا پر اسے 27,500 فٹ کی بلندی اختیار کرنا پڑی۔

اسے یہ دیکھ کر پریشانی محسوس ہوئی کہ آئل ٹمپریچر از حد بڑھ چکا تھا۔اس نے سوچا کہ اس بلندی پر تیل جم چکا تھا اور اس کی ترسیل مناسب

طور پر ممکن نہ تھی۔

اس بلندی سے نیچے آنا ممکن نہ تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہ بہتر تھا کہ واپسی کا سفر اختیار کیا جائے اور کسی بہتر دن دوبارہ محو پرواز ہوا جائے یا پھر پرواز جاری رکھی جائے اور کسی ممکنہ خطرے کا مقابلہ کیا جائے جو اس کی موت کا باعث بھی بن سکتا تھا؟

لیکن اس نے اپنی پرواز جاری رکھی۔ اور گیج کی جانب دیکھنا چھوڑ دیا۔ اور جلد ہی آئل گیج کام چھوڑ چکی تھی۔ اب اس کی جانب دیکھنا ایک فضول امر تھا۔

طیارے میں ایندھن بھرنے کے لئے تین مقامات کا انتخاب کیا گیا تھا۔ ہر ایک مقام پر اسے ایک گھنٹے تک کے لئے رکنا تھا۔ پہلا مقام روم تھا اور جب وہ ہوائی اڈے پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہ مکمل طور پر بادلوں میں چھپا ہوا تھا...... یہ بادل تقریباً ایک میل کے رقبے پر پھیلے ہوئے تھے اسے بادلوں کے ہٹنے کا انتظار کرنا تھا۔ اس نے کنٹرول ٹاور سے رابطہ قائم کیا۔ کیا کنٹرول ٹاور والے اس کی آواز سن سکتے تھے؟

نہیں...... وہ اس کی آواز نہیں سن سکتے تھے۔

وہ اپنی بلندی کھو چکا تھا۔ اسے کنٹرول ٹاور سے بتایا گیا کہ:۔

''اب ہم تمہاری آواز سن سکتے ہیں۔ تمہارا ٹائم ریکارڈ کیا جا چکا ہے۔''

لیکن اب وہ نیچے آ چکا تھا...... انتہائی تیزی کے ساتھ...... دوبارہ ایندھن بھرنے کے لئے...... لیکن وہ مجوزہ ہوائی اڈے کیامپنو پر لینڈ نہیں کر رہا تھا بلکہ اس کے ذہن میں اچانک جنگ کے دور کا ایک ہوائی اڈا آ چکا تھا۔ یہ ہوائی اڈہ بیس میل کی دوری پر واقع تھا۔ لہٰذا اس نے اپنا راستہ تبدیل کیا اور اس ہوائی اڈے پر لینڈ کر گیا۔

اس نے پریشانی کا شکار ہوتے ہوئے اہل اٹلی کے درمیان لینڈ کیا تھا۔ وہ اس کے بارے میں یا اس کے ریکارڈ توڑنے کی کوشش کے بارے میں کچھ نہ جانتے تھے۔ جلد ہی وہ کیامپنو ہوائی اڈے کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔ یہاں پر پہنچنے کا اس کا وقت 2 گھنٹے، 30 منٹ اور 58.4 سیکنڈ تھا۔ اس نے جان ڈیری کے ریکارڈ سے 20 منٹ کم وقت میں یہ سفر طے کیا تھا۔ وہ خوش تھا۔ ہوائی اڈے کے ڈائریکٹر نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:۔

''تم ابھی روانہ نہیں ہو سکتے...... تمہارا پاسپورٹ میرے پاس موجود ہے۔''

اس نے جواب میں کہا کہ:۔

''روانہ؟ بے شک مجھے فوراً روانہ ہونا ہے۔''

ہوائی اڈے کے ڈائریکٹر نے جواب دیا کہ:۔

''کوئی ایسی اتھارٹی موجود نہیں ہے جو تمہیں روانہ ہونے کی اجازت فراہم کر سکے۔''

اس نے جواب دیا کہ:۔

''کیا مپینو ٹیلی فون کرو......''

ایک طوفان کی وجہ سے ٹیلی فون کی لائنیں خراب ہو چکی تھیں۔ڈائریکٹر کی جانب سے جواب موصول ہوا تھا۔

بالآخر صبح 9 بجکر 3 منٹ پر...... جبکہ اسے لینڈ کئے ڈیڑھ گھنٹہ گزر چکا تھا...... اسے رخصت ہونے کی اجازت فراہم کر دی گئی۔وہ مشتعل تھا۔اس کا اگلا اسٹاپ قبرص تھا جو 1,220 میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

یہاں اسے کوئی مسئلہ پیش نہ آیا تھا۔اس کے آر۔اے۔ایف کے پرانے دوستوں نے اسے خوش آمدید کہا تھا اور جلدی جلدی اس کے طیارے میں ایندھن بھرنے لگے تھے۔انہوں نے اسے دوپہر کا کھانا بھی کھلایا اور محض 25 منٹ بعد اسے محو پرواز کر دیا۔جلد ہی صورت حال انتہائی بُری ہو چکی تھی۔نہ ختم ہونے والے بادل چھائے ہوئے تھے اور یہ بادل 25,000 فٹ کی بلندی تک چھائے ہوئے تھے۔

حبانیہ کے بعد ریت کا طوفان بھی اس کے استقبال کے لئے موجود تھا۔لیکن وہ محو پرواز رہا اور اس نے کویت کے اوپر سے نصف سے زائد کویت کا سفر طے کر لیا تھا۔یہاں سے خلیج فارس تا بحرین اس کا سفر خوشگوار رہا۔اب وہ 21,000 فٹ کی بلندی سے نیچے آچکا تھا اور درجہ حرارت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔

قبرص سے وہ 3 گھنٹے اور 26 منٹ بعد یہاں پر آن پہنچا تھا اور جونہی وہ ہوائی اڈے پر اترا اندھیرا پھیل چکا تھا۔یہاں پر بھی اس کے طیارے میں جلد از جلد ایندھن بھر دیا گیا تھا اور وہ محض 25 منٹ بعد فارغ ہو چکا تھا۔اب اس کے سفر کا محض آخری مرحلہ باقی تھا......بحرین تا کراچی ......وہ ستاروں بھرے آسمان پر محو پرواز تھا۔

بالآخر وہ اپنی منزل مقصود تک جا پہنچا تھا۔ایک استقبالیہ کمیٹی اس کے استقبال کے لئے موجود تھی۔اس کمیٹی کا سربراہ پاک فضائیہ کا سربراہ بذات خود تھا۔کئی ایک ہاتھ اس کو تھپکی دینے کے لئے آگے بڑھے......اس نے بھی اپنا بازو ہوا میں لہرا دیا۔وہ مسکرا رہا تھا اور اپنے استقبال کے لئے آنے والوں کے ساتھ ہاتھ ملا رہا تھا۔وہ حیران بھی تھا۔اس نے دریافت کیا کہ:۔

''کیا وقت ہوا تھا......اوہ کیا وقت ہوا تھا؟''

15 گھنٹے، 18 منٹ، 36 سیکنڈ......ایک نیا ریکارڈ۔وہ دیر تک آرام کرتا رہا۔اس کے بعد وہ پشاور اور رسالپور کی جانب محو پرواز ہوا۔اس نے فضائیہ کے کالج میں لیکچر دینا تھا۔اس کے بعد اس نے ایک اور جنگی جہاز کی پرواز کا مظاہرہ کرنا تھا...... یہ دونشستوں کا حامل جنگی جہاز تھا جسے اس کے دوست بل ہمبل نے ایک برس قبل یہاں پہنچایا تھا۔

وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کل وہ کسی اور مقام پر کسی اور پرواز میں محو گا۔

ہدف مل گیا۔

کمیونسٹوں کی توپوں نے گولہ باری جاری رکھی۔ اس گولہ باری سے مزید نقصان اور ہلاکتیں ہوئیں۔ اب اس جنگی جہاز نے بھی جوابی گولہ باری کی اور حملہ آوروں کو بھی نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد فائر بندی عمل میں آ گئی۔

امیتھسٹ نے تمام بحری جہازوں کو سگنل دے دیا تھا اور اس حملے کی خبر بروقت سب کو مل چکی تھی۔ جلد ہی اس جہاز کا الیکٹریکل نظام ناکارہ ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی وائرلیس کا نظام بھی ناکارہ ہو چکا تھا۔

ولیسٹن سخت زخمی تھا۔ وہ خون تھوک رہا تھا اور بغیر کسی سہارے چلنے کے قابل نہ تھا۔ اس کا کپتان بھی شدید زخمی تھا۔ لہٰذا اس نے بذات خود زخمی ہونے کے باوجود بھی جہاز کی کمان سنبھال لی۔ جہاز پر تقریباً 30 افراد ہلاک یا زخمی ہوئے پڑے تھے۔ جہاز کو حرکت دینا مزید زندگیوں کو داؤ پر لگانے کے مترادف تھا۔ جہاز نیچے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ڈاکٹر بھی ہلاک ہو چکا تھا۔ ولیسٹن نے احکامات جاری کئے کہ فی الحال عارضی طور پر جہاز کو خالی کر دیا جائے۔ لہٰذا کشتی کے ذریعے زخمیوں کو جزیرے میں پہنچا دیا گیا۔ جو لوگ زخمی نہ تھے وہ تیر کر جزیرے تک جا پہنچے۔ اس دوران بھی کیمونسٹ فوجی دستے انہیں اپنی فائرنگ کا نشانہ بناتے رہے۔ کئی مزید افراد ہلاک یا زخمی ہوئے اور جب چین کے تقریباً 70 افسران ساحل پر پہنچے اس وقت انخلا روک دیا گیا تھا تاکہ مزید جانی نقصان نہ اٹھانا پڑے...... کچھ لوگوں نے نیشنلسٹ افواج سے رابطہ کیا اور تحفظ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اور کچھ لوگ جو توانا اور صحت مند تھے وہ رضا کارانہ طور پر واپس جہاز کی جانب لوٹ آئے حالانکہ اس دوران چھوٹے ہتھیاروں سے فائرنگ کا سلسلہ جاری رہا۔

اب گولہ باری بند ہو چکی تھی۔ جہاز کے ریڈار کا ساز و سامان اور خفیہ کوڈ بک تباہ ہو چکی تھی۔

دوپہر کے دوران ایچ۔ ایم۔ ایس ''کنسورٹ'' برق رفتاری کے ساتھ مدد کو آن پہنچا تھا۔ اس نے اس جہاز کو کھینچنے کیلئے اپنے ساتھ باندھ لیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے ساحل سے گولے اگلنے والی توپوں سے بھی نپٹنا شروع کر دیا تھا۔ وہ جلد ہی بے پناہ تباہی سے ہمکنار جہاز اور اس پر موجود زخمیوں اور ہلاک شدگان کو لے کر روانہ ہو چکا تھا۔

رات چھا چکی تھی۔ وہ جہاز کو کھینچتے ہوئے زیادہ دور تک نہ لے جا سکتا تھا لیکن وہ اس قابل تھا کہ اس جہاز کو کسی محفوظ مقام پر لنگر انداز کر سکے...... ایک ایسا مقام جو نیشنلسٹوں کے زیر تسلط ساحل سے چند سو گز دور ہو۔

اگلے روز نسبتاً سکون رہا۔ ایک سنڈرلینڈ فلائنگ بوٹ ہانگ کانگ سے آ رہی تھی اس میں ادویات کی کھیپ موجود تھی کیمونسٹوں کی توپوں کی وجہ سے اس نے بھی اپنا رخ بدل لیا تھا۔ کروزر لندن اور ''بلیک سوان'' جنگی جہاز بھی ''امیتھسٹ'' کی جانب بڑھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ وہ بھی گولہ باری کی زد میں آ چکا تھا۔ اس کو بھی کافی نقصان پہنچا تھا اور اس میں موجود افراد بھی نقصان سے دوچار ہوئے تھے۔ ساحل پر نصب توپوں کے لئے دریا میں محو سفر جہاز ایک آسان ہدف ہوتا ہے۔

اب سیاست دان حرکت میں آ چکے تھے لیکن وہ کسی کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکے تھے۔ سفارتی کوششوں کو کیمونسٹوں نے مسترد کر دیا تھا اور دنیا کو یہ خبر نشر کی تھی کہ برطانوی اور نیشنلسٹ چینی جہازوں نے مشترکہ طور پر ان کے ٹھکانوں پر حملہ کیا تھا اور انہوں نے اپنے دفاع میں یہ اقدام اٹھایا تھا۔

امیتھسٹ نامی بحری جہاز کا فرار

برطانیہ...... مغربی دنیا...... کبھی بھی اتنی عاجز دکھائی نہ دی تھی جتنی عاجز اس وقت دکھائی دے رہی تھی...... ایک چھوٹا بحری جنگی جہاز دریائے یانگٹس میں کھڑا تھا حالانکہ یہ 1949ء کا نسبتاً پرامن برس تھا۔ رائل نیوی ہنوز ایک طاقت کی حامل بحریہ تھی۔ ایک کا ایک بڑا اڈا ہانگ کانگ میں بھی موجود تھا جو اس مقام سے زیادہ دوری پر واقع نہ تھا۔ دنیا کی نظریں اس چھوٹے سے بحری جہاز پر لگی ہوئی تھیں اور اس کے لئے اظہار ہمدردی بھی ہو رہا تھا۔ برطانیہ کا تمام تر بحری بیڑہ بے بس ہو کر رہ گیا تھا اور اس جہاز سے نجات حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ سفارت کار بھی کامیابی سے ہمکنار نہ ہوئے تھے اور حکومتی وزیر بھی واپس وائٹ ہال جا چکے تھے۔

جنگی جہاز ایچ۔ ایم امیتھسٹ کی دریائے یانگٹس میں موجودگی کا پس منظر 19 ویں صدی کی یاد دلاتا تھا جبکہ ایک معاہدے کے تحت برطانوی حکومت کو یہ اختیار حاصل ہوا تھا کہ وہ چین کے قدیم دارالخلافہ پر اپنی نگرانی قائم رکھے تاکہ وہ وہاں پر موجود اپنے نمائندوں اور وہاں پر رہائش پذیر اپنے شہریوں کی حفاظت کر سکے اور کسی ممکنہ خطرے کی صورت میں ان کی امداد کر سکے۔ 19 اپریل 1949ء جب ایچ۔ ایم۔ امیتھسٹ شنگھائی سے روانہ ہوا تب خطرہ منظر عام پر آیا۔ دریا کے جنوبی کنارے پر چین کی نیشنلسٹ حکومت کی افواج اس کی منتظر تھیں۔ شمال کی جانب پانی کو عبور کرتے ہوئے چین کی پیپلز لبریشن آرمی کے دستے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے درمیان ایک مختصری عارضی صلح اس وقت تقریباً اپنے اختتام کو پہنچنے والی تھی جبکہ امیتھسٹ آہستہ آہستہ دریائے یانگٹس میں رواں دواں تھا۔

20 اپریل کو تقریباً ساڑھے آٹھ بجے صبح یانگٹس کا واقعہ پیش آیا جبکہ شمالی ساحل سے اس پر گولیاں برسائی گئی تھیں جو اس جنگی جہاز کے قریب آن گری تھیں۔ اس نے جوابی فائرنگ سرانجام نہ دی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس پر فائرنگ کسی غلطی کا نتیجہ تھی...... لیکن 40 منٹ بعد جب یہ جہاز شمالی ساحل اور دریا کے ایک جزیرے کے درمیان سے گزر رہا تھا اس وقت اسے ایک اور توپ کے گولوں کا نشانہ بنایا گیا اور اس کی جانب کئی ایک گولے پھینکے گئے۔ اس گولہ باری کے نتیجے میں جہاز میں موجود تمام تر افراد شدید زخمی ہو گئے اور جہاز کو بھی نقصان پہنچا اور جہاز کے ڈوبنے کا خطرہ بھی محسوس کیا جانے لگا۔

دو گولے براہ راست جہاز پر آن لگے تھے اور کئی افسر ہلاک ہو گئے تھے اور باقی ماندہ لوگ شدید زخمی ہوئے تھے۔ زخمی ہونے والوں میں جہاز کا کپتان۔ لیفٹیننٹ کمانڈر بی۔ ایم۔ سکر اور اس کا نمبر ون لیفٹیننٹ جی۔ ایل۔ ویسٹن بھی شامل تھا۔

ویسٹن اگرچہ شدید زخمی تھا...... اس کے پھیپھڑے زخمی ہو چکے تھے لیکن اس نے جہاز کی سمت درست کرنے کی کوشش سرانجام دی۔ لیکن چونکہ جہاز کو نقصان پہنچ چکا تھا لہٰذا وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا اور جہاز مٹی کے ایک کنارے کی جانب بڑھ گیا اور حملہ آوروں کو ایک ساکت

''امیتھسٹ'' تک کچھ مدد آن پہنچی تھی۔ ایک نیشنلسٹ چینی ڈاکٹر جہاز پر پہنچ چکا تھا جو عرصہ دراز سے طبی امداد کے طالب زخمیوں کو طبی امداد فراہم کر رہا تھا۔ ان میں سے بہت سے زخمیوں کی حالت نازک تھی۔ جلد ہی آر۔اے۔ایف کا ایک ڈاکٹر بھی آن پہنچا تھا جس نے فائرنگ کی چھاؤں میں ایک کشتی کے ذریعے زخمیوں کو خشکی پر پہنچانے کا بندوبست بھی کیا تھا۔ لیکن ایک انتہائی اہم شخص 22 تاریخ کو آن پہنچا تھا۔ وہ 33 سالہ لیفٹیننٹ کمانڈر جے۔ ایس۔ کیرانز تھا جو نانکنگ میں اسسٹنٹ بحری اتاشی کے عہدے پر فائز تھا۔ اسے ''امیتھسٹ'' کی صورت حال کی چھان بین کے لئے بھیجا گیا تھا اور اسے زخمیوں کے بہتر بندوبست کی انجام دہی کیلئے بھیجا گیا تھا۔ وہ ایک دقت طلب خشکی کا سفر طے کرتے ہوئے اس جہاز تک پہنچا تھا۔ وہ اس تباہ شدہ جہاز کی کمان سنبھالنے اور اس کے ساتھ تین ماہ سے زائد عرصہ تک قیدی رہنے کے لئے آیا تھا۔

سکنر...... موت کی دہلیز تک پہنچنے والا کپتان...... اس کو بھی ساحل پر لے جایا گیا۔ اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر وسٹن جہاز پر ہی مقیم رہنا چاہتا تھا لیکن اس کے احتجاج کے باوجود اس کو فوری طور پر ساحل پر منتقل کرنے کے احکامات صادر کر دیے گئے تھے۔ ایک سگنل موصول ہو چکا تھا جس کے تحت کیرانز کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس جہاز کی کمان سنبھال لے۔

کیرانز کے کمان سنبھالنے کے تھوڑی ہی دیر بعد کیمونسٹوں نے جنوبی ساحل پر اپنا تسلط جما لیا تھا۔ امیتھسٹ کی تمام تر امداد منقطع ہو کر رہ گئی تھی۔

تقریباً 173 افراد (ان میں سے نولڑکے تھے) اس چھوٹے سے جہاز میں موجود تھے۔ انہوں نے تمام تر موسم گرما انتہائی بے آرامی کے عالم میں گزارا۔

جہاز کے چوہے انہیں تنگ کرتے تھے...... خوراک کی قلت تھی...... ساحل کی جانب سے مچھروں کی یلغار آتی تھی...... لیکن ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ کسی بیماری سے ہمکنار نہ ہوئے تھے حالانکہ یہ مچھر بیماری پھیلانے والے مچھر تھے...... وہ برابر ملیریا سے بچنے کی ادویات استعمال کرتے رہتے تھے۔

گرمی الگ ایک مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ جہاز کا فولاد گرمی سے تپ کر تنور بن جاتا تھا اور یہ ایک ایسا تنور تھا جو کبھی ٹھنڈا نہ ہوتا تھا اور اسی تنور میں انہوں نے کام کرنا ہوتا تھا...... رہنا ہوتا تھا...... اور سونے کی کوشش سرانجام دینی ہوتی تھی۔ حبس بھی حد سے زیادہ تھا۔ جہاز کا عرشہ اکثر اس قدر گرم ہوتا تھا کہ اس پر قدم نہ رکھا جا سکتا تھا۔

ان تمام تر مصائب...... تکالیف اور بے آرامی کے باوجود بھی لوگوں کی یہ چھوٹی سی جماعت بہت خوش باش اور صحت مند رہی۔ انہیں ڈاک روانہ کرنے کی سہولت بھی دستیاب نہ تھی۔

کیمونسٹوں نے ''امیتھسٹ'' کو اپنے جال میں پھنسا رکھا تھا۔ وہ اسے اس جال سے نکلنے نہیں دے رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اہل جہاز یہ اعتراف کریں کہ انہوں نے چین کی پیپلز لبریشن کی ان توپوں پر پہلے حملہ کیا تھا جو ساحل پر پُرامن حالت میں نصب تھیں۔ ان کا یہ مطالبہ قبول نہ کیا گیا تھا۔ کیمونسٹوں کا یہ خیال تھا کہ امیتھسٹ جہاز کو چھوڑ دیا جائے۔ صورت حال سفارتی خطرات سے بھری پڑی تھی اور نوجوان کپتان پر ایک عظیم ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے ذہن میں کچھ اور خیال بھی موجود تھا۔

ماہ جولائی کے آخر تک جہاز کو حراست میں لئے تین ماہ سے زائد عرصہ بیت چکا تھا۔ کیرانز جانتا تھا کہ بحرانی کیفیت دور نہ تھی۔ کیمونسٹوں کا رویہ دن بہ دن سخت ہوتا چلا جارہا تھا۔ اہل جہاز بھی توڑ پھوڑ اور شکست و ریخت کا شکار ہونے لگے تھے اگرچہ انہوں نے انتہائی دلیری کا مظاہرہ کیا تھا لیکن دلیری کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اور کیرانز بذات خود اعصابی دباؤ کا شکار ہو چکا تھا۔ حکومتی سطح پر سفارتی کوششیں بارآور ثابت نہ ہوئی تھیں اور نہ ہی کسی پرقوت مداخلت کی کوئی امید تھی۔ محض ایک ہی امید باقی تھی کہ "ایمتھسٹ" بذات خود اس حراست سے باہر نکلے۔

کیرانز جانتا تھا کہ حصول کامیابی کی راہ میں کافی رکاوٹیں تھیں۔ اس کے جہاز میں کئی ایک مقامات پر سوراخ ہو چکے تھے اور اگر جہاز کو تیز رفتاری کے ساتھ چلاتا جاتا تو اس کی عارضی مرمت متاثر ہونے کا خطرہ تھا۔ دریا کے پہلے 14 میلوں کے ضمن میں اس کے پاس کوئی چارٹ موجود نہ تھا اور بقایا 140 میلوں کے لئے اس کے پاس چین کے چارٹ موجود تھے جو قابل اعتماد ہرگز نہ تھے۔ اس کا جہاز رانی کا زیادہ تر سامان بے کار تھا۔ چونکہ دریا کے دونوں کناروں پر توپیں نصب تھیں لہٰذا اسے اندھیرے میں برق رفتاری کے ساتھ جہاز کو بھگانا مطلوب تھا۔

لیکن اسے جلد ہی ایندھن کی قلت کا بھی سامنا کرنا تھا۔ اس کے جہاز میں اس قدر ایندھن موجود نہ تھا کہ وہ کھلے سمندر تک پہنچ سکے۔ یہی وجہ تھی کہ اسے ابھی اور اسی وقت موقع میسر تھا ورنہ اسے کبھی بھی موقع میسر نہ آسکتا تھا۔ لہٰذا 30 جولائی کو اس نے خفیہ طور پر اپنے افسران...... جونیئر افسران وغیرہ کو احکامات صادر کر دیے کہ اس رات وہ کوچ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ ان کی اس کاوش کے پہلے گھنٹے کے دوران چاند چمک رہا ہوگا لیکن یہ ان کے سفر کے آغاز میں معاون ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد اندھیرا چھا جائے گا...... ان کے دریا کی بھاری توپوں کی سرچ لائٹوں تک پہنچنے تک ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑا جاسکتا تھا۔

جوں ہی رات کے دس بجے تمام اہل جہاز تیار تھے۔ جہاز کا لنگر اٹھانے والی جماعت بھی اپنا کام سرانجام دینے کے لئے تیار تھی۔ جہاز کے انجن اسٹارٹ کئے گئے۔ ایک چھوٹی سی جماعت جہاز کو پہنچنے والے متوقع نقصان کی مرمت اور آتشزدگی کی صورت میں اس پر قابو پانے کیلئے تیار کھڑی تھی۔

چند منٹ کے بعد قسمت نے ان کی یاوری کی۔ ایک تجارتی جہاز جس کی تمام لائٹیں روشن تھیں منظر عام پر آیا۔ چونکہ اس کے پاس چارٹ موجود نہ تھا لہٰذا اس نے اس تجارتی جہاز کے پیچھے پیچھے چلنے کو ترجیح دی۔ چند منٹوں کے بعد اس کا جہاز آہستہ آہستہ...... تجارتی جہاز کے نقش قدم پر چلتا ہوا...... تجارتی جہاز کی رہنمائی میں اپنی آزادی کی منزل کی جانب گامزن تھا۔ اسے اپنے مقام سے رخصت ہوتے ہوئے کسی نے نہ دیکھا تھا۔

آدھ گھنٹے تک سب کچھ ٹھیک ٹھاک جارہا تھا۔ تب ساحل سے جھلملاتی ہوئی تیز روشنی سے تجارتی جہاز کو شناخت کر لیا گیا تھا۔ لیکن اس روشنی میں "ایمتھسٹ" کا انکشاف بھی ہو چکا تھا اور روشنی کے دوسرے راؤنڈ کے دوران اس کو خصوصی طور پر شناخت کر لیا گیا تھا۔ چند لمحوں کے اندر اندر توپیں اور ہلکا اسلحہ اسے اپنا نشانہ بنا رہا تھا۔ دریا کے دونوں کناروں سے اسے اپنا نشانہ بنایا جارہا تھا۔

تجارتی جہاز بھی ساحل سے کی گئی گولہ باری کی زد میں تھا اور اس میں آگ لگنی شروع ہو چکی تھی۔ وہ ساحل کی جانب مڑ چکا تھا۔ "ایمتھسٹ" نہ صرف اپنا رہنما کھو چکا تھا بلکہ اس میں ایک نیا سوراخ بھی ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ مکمل کنٹرول میں تھا اور اس پر سوار کوئی فرد زخمی یا ہلاک نہ ہوا تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اسے ساحل کی جانب لایا جاتا...... اس پر سوار تمام لوگوں کو ساحل پر اتارا جاتا...... اور جہاز

کو آگ لگا دی جاتی...... کیرانز چاہتا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے اس جہاز کو نذر آتش کرے۔

جہاز دریا کے وسط میں اندھیرے میں ٹکریں کھا رہا تھا۔ اس کے بوائلر روم کا درجہ حرارت 170 ڈگری تک پہنچ چکا تھا۔ مزید دو گھنٹوں تک ......اگرچہ جہاز پر سوار ہر ایک شخص دباؤ کا شکار رہا...... لیکن وہ محفوظ رہے۔

دوبارہ روشنی پھینکی جانے لگی اور ''ایمیتھسٹ'' پر گولہ باری کی جانے لگی۔ لیکن کیرانز نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ خوش قسمتی سے وہ درست سمت کی جانب گامزن تھا۔ چند لمحوں بعد ''ایمیتھسٹ'' توپوں کی زد سے باہر نکل چکا تھا۔

ان کے پاس کوڈ بکس بھی موجود نہ تھیں جن سے کام لیا جا سکتا تھا...... یہ تین ماہ پیشتر تباہی کا شکار ہو چکی تھیں اور اس کے علاوہ ریڈار اور دیگر خفیہ ساز و سامان بھی تباہی کا شکار ہو چکا تھا...... کیرانز نے کئی ہفتوں کی کوشش اور جدوجہد کے بعد بذات خود ریڈیو پر ایسا کوڈ تیار کیا جو اس کے کمانڈر انچیف کے فلیگ لیفٹیننٹ کی سمجھ میں آ سکے۔ اب وہ اپنی آزادی کے بارے میں پیغام نشر کر سکتا تھا اور جنگی جہاز طلب کر سکتا تھا۔ اس نے دوبارہ سگنل ارسال کیا کیونکہ وہ ابھی تک کمیونسٹوں کے دو مضبوط قلعوں کی زد سے باہر نہ نکل سکتا تھا اور ان پر نصب چھ انچ دہانے کی توپیں اس کے جہاز کو مکمل تباہی سے ہمکنار کر سکتی تھیں۔ وہاں پر سرچ لائٹوں کا بھی خطرہ تھا اور ان قلعوں تک پہنچنے تک دن کی روشنی بھی پھیلنے کا خدشہ تھا۔ کیرانز نے اپنے سگنل کے ذریعے ''کونکورڈ'' کیلئے درخواست کی تھی جو پہلے بھی اس کے جہاز کی مدد کیلئے ایک کوشش سرانجام دے چکا تھا تاکہ وہ ساحل کی توپوں کو نشانہ بنا سکے اگر وہ کمیونسٹوں کی حراست سے فرار حاصل کرنے والے اس جنگی جہاز کو اپنا نشانہ بنائیں۔ ''کونکورڈ'' نے واپسی سگنل روانہ کیا اور عمل درآمد کی حامی بھر لی۔

اس وقت صبح کے پانچ بج چکے تھے فرار حاصل کرنے والا یہ جنگی جہاز اب اپنی اوقات سے بڑھ تیز رفتاری سے سفر طے کر رہا تھا اور ان پانیوں کی جانب بڑھ رہا جن پر قلعوں کے ذریعے کنٹرول کیا جا رہا تھا۔ اس پر سرچ لائٹ پڑ چکی تھی...... وہ سرچ لائٹ کی زد میں تھا...... سرچ لائٹ کی روشنی میں ''ایمیتھسٹ'' سفید روشنی میں نہا چکا تھا...... لیکن کسی بھی توپ نے گولہ نہ اگلا...... سرچ لائٹ کی روشنی نے دوبارہ جہاز کو اپنی زد میں لے لیا ...... یہ روشنی بار بار جہاز کو اپنی زد میں لیتی رہی۔

اب وہ خطرے کی زد سے نکل چکے تھے اور کھلے سمندر میں پہنچ چکے تھے اور ''کونکرڈ'' ایک شان بے نیازی کے ساتھ کھڑا تھا اور اس کے پیچھے سے سورج بلند ہو رہا تھا۔ اس نے مبارکباد کا سگنل روانہ کیا۔ کیرانز نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ کسی بھی جہاز کا اس قدر استقبال نہ ہوا تھا جس قدر استقبال اس جہاز کو نصیب ہوا تھا۔

کمانڈر انچیف کا سگنل قوم کے جذبات کی عکاسی کرتا تھا۔

''بحری بیڑے میں واپسی پر خوش آمدید...... ہم سب کو آپ پر بے انتہا فخر ہے...... ہم تمہارے جرأت مندانہ اور مہارت کے حامل فرار پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ آپ نے جس جرأت اور جوانمردی کا مظاہرہ کیا اس نے آپ کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں اہم کردار سرانجام دیا۔ آپ کا کارنامہ بحریہ کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔

......❁......

ایورسٹ تک رسائی

اس عمل کا آغاز یکم ستمبر 1952ء سے ہوا تھا......اور 29 مئی 1953ء کو حصول مقصد میں کامیابی حاصل کر لی گئی تھی۔

کسی جرم کی تحقیقات سرانجام دینے کی طرح...... کسی پہاڑ پر دھاوا بولنا......حملہ آور ہونا کبھی کبھار فریب نظر دکھائی دیتا ہے۔اس کے لئے ایک تکلیف دہ تنظیم کی ضرورت درپیش ہوتی ہے......ایک صبر آزما معمول پر عمل درآمد کو ممکن بنانا ہوتا ہے......اور اس سے پیشتر منظر عام پر آنے والی ناکامیوں سے سبق سیکھنا ہوتا ہے......اس طرح ایک ڈرامائی ماحول تشکیل پا سکتا ہے......اور یہی کچھ ایورسٹ کے سلسلے میں بھی رونما ہوا تھا......اور اگرچہ دو افراد بالآخر اس چوٹی پر کھڑے تھے......دیگر افراد بھی اس جدوجہد میں مصروف رہے تھے......اور چند خواتین نے بھی قسمت آزمائی کی تھی......انہیں حصول مقصد کیلئے کئی عشرے صرف کرنے پڑے تھے۔

کوہ پیماؤں نے 1921ء میں ایورسٹ کو سر کرنے کی کوشش شروع کی تھی جبکہ ایڈمنڈ ہیلری کی عمر محض دو برس تھی اور تن زنگ نار کے کی عمر محض سات برس تھی۔اس چوٹی کو سر کرنے کے آغاز کے بعد کئی ایک لوگوں نے اسے سر کرنے کی کوششیں سرانجام دیں...... جدوجہد کی گئی...... زندگیاں بلاکتوں کی بھینٹ چڑھیں......تاہم 1952ء میں کامیابی نے قدم چومے جبکہ سوئٹزر لینڈ کا ہائیٹی پہاڑوں کا گائیڈ ریمنڈ لیبرٹ اور وی شرپا تن زنگ چوٹی کے 1000 فٹ کے اندر اندر تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔لہٰذا 1953ء میں ایک اور مہم سرانجام دی گئی۔اس مہم کے شرکاء اس ضمن میں زیادہ معلومات کے حامل ہونے کیلئے بہترین ساز و سامان کے بھی حامل تھے اور بہترین تنظیم کے بھی حامل تھے......وہ 29,002 فٹ اونچائی کی حامل چوٹی کو سر کرنے کی مہم پر روانہ ہوئے تھے......دنیا کی بلند ترین چوٹی......جس کے بارے میں خیال تھا کہ اسے کبھی بھی سر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس مہم کے انتظامات سرانجام دینے کی خاطر ستمبر 1952ء میں لندن میں ایک دفتر قائم کیا گیا اور اگلے ماہ مہم کا سربراہ بھی مہم پر روانہ ہو گیا۔وہ ایک فوجی افسر تھا۔اس کی عمر 42 برس تھی۔اس کا نام جان نیٹ تھا۔اس کی ٹیم بھی اپنی کارکردگی میں بے مثال تھی......اس ٹیم میں نو کوہ پیما شامل تھے۔ان میں سے دو کا تعلق نیوزی لینڈ سے تھا اور باقی سات انگریز تھے......اس کے علاوہ اس ٹیم میں ایک ڈاکٹر......ایک سوشیالوجسٹ اور ایک فلم کیمرہ مین بھی شامل تھا۔یہ سب لوگ پہلی مرتبہ نیپال کے دارالحکومت کھٹمنڈو میں مارچ 1953ء میں آپس میں ملے تھے۔انہوں نے اپنی مہم کا آغاز کیا اور اپنے پہلے عارضی کیمپ تھیان بوچی کی خانقاہ جا پہنچے۔وہ بخیریت اس مقام تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے اور اس دوران ایک دوسرے سے بخوبی تعارف بھی حاصل کر چکے تھے اور اگلے چند روز تک وہ اپنی مشق سرانجام دیتے رہے۔

9 اپریل کو حصول مقصد کیلئے پہلا قدم اٹھایا گیا جبکہ ہیلری لڈ مجل ویسٹما کاٹ' جارج بینڈ' جارج لو اور شرپا کے کئی ایک کوہ پیما اور 39 قلی

......جن میں مرد اور خواتین شامل تھے......ان سب نے مغربی سی ڈبلیو ایم کا روٹ اپنایا...... یہ روٹ ایورسٹ کی جنوب کی جانب لے جاتا تھا۔ یہ ایک مشکل اور خطرناک سفر ثابت ہوا تھا۔

کیمپ نمبر دو لگانے کے بعد وہ ایک مشکل اور خطرناک روٹ اختیار کرتے ہوئے سی ڈبلیو ایم کے کنارے تک جا پہنچے اور انہوں نے کیمپ نمبر تین لگا لیا۔ کئی ایک روز اس جدوجہد میں گزر چکے تھے کہ قلیوں کے استعمال کے لئے محفوظ راستہ بنایا جاسکے تاکہ قلی سامان اٹھا کر رینگتے ہوئے اس راستے پر آگے بڑھ سکیں۔

ان کا اگلا اقدام سی ڈبلیو ایم کے وسط تک پہنچنے کا راستہ تلاش کرنے سے متعلق تھا اور جلد ہی یہ راستہ تلاش کر لیا گیا۔ ہلیری اور تن زنگ اکٹھے کوہ پیمائی کرنے کا یہ پہلا تجربہ حاصل کر رہے تھے۔

مئی کے پہلے ہفتے میں وہ کیمپ نمبر پانچ (22,000 فٹ) اور کیمپ نمبر 6 (23,00 فٹ) قائم کر چکے تھے۔ اب وہ وقت آن پہنچا تھا کہ آکسیجن کا استعمال کیا جائے۔ کیونکہ بلندی پر ہوا میں آکسیجن کی مقدار میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔

ہنٹ اب اس قابل تھا کہ وہ بذات خود چوٹی کو سر کرنے کا منصوبہ بنا سکتا تھا۔ نو...... ویسٹماکاٹ اور بینڈ کیمپ نمبر سات قائم کر چکے تھے اور ولفرڈ نائس اور چارلس وائل شرپا کے قلیوں کو بمعہ ان کے سازوسامان اوپر لانے میں معاونت سرانجام دے رہے تھے۔ چارلس ایونز اور ٹام بورڈلن نے چوٹی پر پہلے دھاوا بولنا تھا۔ اگر ضرورت محسوس ہوتی تو ان کی جگہ ہیلری اور تن زنگ نے یہ معرکہ سرانجام دینا تھا۔ ہٹ نے اگرچہ بہترین منصوبہ بندی سرانجام دی تھی لیکن اس منصوبہ بندی میں موسم کے حالات کو مدنظر نہیں رکھا گیا تھا۔ اب موسم بھی اپنے رنگ دکھا رہا تھا اور موسمی صورت حال نے ایک اہم کردار سرانجام دینا تھا۔ تقریباً روزانہ ہی وہ برف باری کی زد میں رہتے تھے اور کبھی کبھار یہ برف باری شدت بھی اختیار کر جاتی تھی۔ ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے مون سون کا موسم اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ ان حالات میں وہ آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنے پر مجبور تھے۔ ان کو کیمپ نمبر آٹھ قائم کرنے میں دقت پیش آ رہی تھی اور ان کے کام کی رفتار سست پڑ چکی تھی۔ اس کیمپ نے چوٹی سر کرنے کی بنیاد فراہم کرنی تھی۔

لیکن 26 مئی تک ایونز اور بورڈلن جنوب کی جانب سے چوٹی پر اپنا پہلا دھاوا بولنے کے قابل ہو چکے تھے۔ ایورسٹ کی حقیقی چوٹی تک پہنچنے کے لئے اسے ابھی مزید 300 فٹ کی بلندی تک رسائی حاصل کرنا تھی۔ اگر کوہ پیما اس وقت بھی توانائی کے حامل ہوتے جب وہ جنوبی چوٹی سر کر لیتے اور صورت حال بھی ان کے حق میں بہتر رہتی تب وہ یقیناً مزید بلندی تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش سرانجام دیتے۔

اس وقت دوپہر ہو رہی تھی جبکہ جارج لو نے اپنے ساتھیوں سے چلاتے ہوئے کہا کہ:۔

''وہ اوپر چڑھ چکے ہیں...... بخدا وہ اوپر چڑھ چکے ہیں!''

ایک لمحے کیلئے بادل صاف ہوا تھا اور اس دوران اسے جنوبی چوٹی پر دو چھوٹے چھوٹے انسانی ہیولے دکھائی دیے تھے۔ وہ 28,700 فٹ کی بلندی پر کھڑے تھے...... بلندترین مقام جہاں پر کسی انسان نے قدم نہ رکھے تھے۔

کافی دیر تک دوبارہ بادل چھائے رہے۔ بالآخر بادل صاف ہو گئے اور اب ایونز اور بورڈلن کو بخوبی دیکھا جاسکتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ نیچے

کی جانب چلے آ رہے تھے۔ اپنے ساتھیوں تک پہنچتے پہنچتے ان کا تھکن سے بُرا حال تھا۔ لیکن وہ اپنے ساتھیوں تک بخریت آن پہنچے تھے۔ ان کے ساتھیوں نے ان کا خیر مقدم کیا اور انہیں مبارکباد پیش کی۔ برف کی تہہ ان پر اس حد تک جم چکی تھی کہ وہ ایک برفانی مخلوق دکھائے رہے تھے۔ وہ صبح سویرے سے چوٹی کی جانب چڑھ رہے تھے اور درجہ حرارت نقطہ انجماد سے کہیں نیچے تھا اور برفانی ہوائیں بھی چل رہی تھیں۔ ان کے آکسیجن فراہم کرنے کی ساز و سامان کچھ نقص پیش آ چکا تھا لیکن اس کے باوجود بھی انہوں نے ہمت نہ ہاری اور انتہائی جرأت...... بہادری......اور حوصلے کے ساتھ جنوبی چوٹی کی جانب بڑھتے رہے۔ لیکن ان کے علم میں یہ بات آ چکی تھی کہ 300 فٹ کی یہ چڑھائی ان کی تمام تر مہم کا ایک مشکل ترین مرحلہ تھا۔ بالآخر وہ اس مرحلے کو بھی طے کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

دو دن ہنٹ اور شرپا ڈانامگل سامان رسد کا بھاری بوجھ اٹھائے جنوبی چوٹی کی جانب رواں دواں رہے تھے۔ انہوں نے یہ مشقت دوسری دھاوا بولنے والی پارٹی کے مفاد میں اٹھائی تھی...... یہ پارٹی ہیلری اور تن زنگ پر مشتمل تھی۔ وہ ان کے بوجھ کو......ان کے سامان کو اتنی بلندی تک پہنچانے کے متمنی تھے جتنی بلندی تک اسے پہنچانا ممکن تھا تاکہ ان دونوں کوہ پیماؤں کی زیادہ سے زیادہ مدد......ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون ممکن ہو سکے۔ وہ اب اپنی توانائی کھو چکے تھے۔ لہٰذا جب ایونز اور بورڈلن بادل نخواستہ اگلے روز نیچے کیمپ نمبر سات کی جانب جانے لگے تو ہنٹ بھی بددلی کے ساتھ ان کے ہمراہ روانہ ہو گیا۔

ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے اس چوٹی کو مکمل طور پر سر کرنے میں ابھی چند روز مزید صرف ہوں گے۔

دو کیمپوں کے درمیان بیس گز کا فاصلہ طے کرتے ہوئے ہیلری کے پاؤں جواب دے چکے تھے۔ اس نے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل رینگتے ہوئے یہ فاصلہ طے کیا۔ ہوا اب بھی شدت کے ساتھ چل رہی تھی جبکہ ایک مختصر سی جماعت محو آرام تھی۔ وہ محدود آکسیجن کے ہمراہ سانس کی آمد و رفت جاری رکھے ہوئے تھے تاکہ چند گھنٹے پُرسکون انداز میں سو سکیں۔

اگلی صبح بھی شدید ہوا چل رہی تھی اور شرپا کے دو قلی رات بھر سے علیل تھے۔ وہ بذات خود اپنا سامان اٹھاتے ہوئے جنوب' مشرقی چوٹی تک جانے کے قابل نہ تھا جبکہ ہیلری اور تن زنگ آخری معرکہ سرانجام دینے سے پیشتر اپنا آخری کیمپ لگانے میں مصروف تھے۔

ان کی رفتار تکلیف دہ حد تک سست تھی۔ وہ اس مقام پر پہنچ چکے تھے جس مقام پر ایک برس پیشتر تن زنگ اور سوزلبرٹ ایک سرد رات سردی اور بھوک کی شدت کے باعث بغیر سوئے گزار چکے تھے...... بالآخر وہ اپنا آخری کیمپ لگانے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے اپنا بوجھ اتارا اور آپس میں ہاتھ ملائے اور لو......الفریڈ گرے گوری اور انگ نیما اپنے دقت طلب سفر پر روانہ ہوئے جو واپس جنوب کی جانب تھا۔ اب ہیلری اور تن زن دونوں اکیلے رہ گئے تھے۔

پہلا کام اپنے کیمپ کے مقام کو بہتر بنانا تھا۔ انہوں نے برف پر استعمال ہونے والے کلہاڑوں کے ذریعے ایک پلیٹ فارم تیار کیا۔ ان کے پاس محض ایک خیمہ موجود تھا۔ جب وہ اس خیمے کو نصب کرنے لگے تب ہوا اس قدر شدید تھی کہ ان کے خیمے کو اڑا لے جاتی تھی۔ سخت برف میں خیمے کی میخیں بھی نصب نہ ہو رہی تھیں۔ کسی نہ کسی طرح وہ خیمہ نصب کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے اور انہوں نے جلدی کے ساتھ اس خیمے میں گھسنے

کی کوشش کی تاکہ اپنے آپ کو موسم کی شدت سے محفوظ بنا سکیں۔ ہیلری نے اپنے آکسیجن کے سلنڈروں کی پڑتال کی۔ آکسیجن کی مقدار اس قدر زائد نہ تھی جس قدر وہ توقع کر رہے تھے۔ اس مقام تک پہنچنے تک وہ بہت زیادہ مقدار میں آکسیجن استعمال کر چکے تھے۔ ہیلری نے یہ تخمینہ لگایا کہ اگر وہ آکسیجن کی کم سے کم مقدار استعمال کریں تب یہ آکسیجن اگلے روز بھی سات یا آٹھ گھنٹوں تک ان کا ساتھ دے سکتی تھی۔ اگر انہیں چوٹی تک پہنچنے اور مابعد واپس پلٹنے میں اس سے زائد وقت صرف کرنا پڑتا...... اور اگر موسم کی خرابی کی بنا پر وہ اپنی مہم جاری نہ رکھ سکتے...... تب ناکامی ان کا مقدر تھی اور وہ یقیناً ناکامی کا شکار ہو کر رہ جاتے۔

انہوں نے خصوصی کھانا کھایا جس میں بسکٹ...... کھجوریں اور خوبانیوں کا ایک ڈبہ بھی شامل تھا جسے ہیلری نے کافی دیر سے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ اس ڈبے میں موجود خوراک جم چکی تھی اور اسے اسٹوو پر گرم کرنا درکار تھا۔ اس کے بعد وہ چکن سوپ سے لطف اندوز ہوئے۔ بلندی پر جہاں دیگر مصائب درپیش ہوئے ہیں وہاں ایک مسئلہ یہ بھی درپیش ہوتا ہے کہ جسم میں پانی کی مقدار کم پڑ جاتی ہے۔ لہٰذا جسم میں پانی کی اس کمی کو فوری طور پر پورا کرنا درکار رہتا ہے وگرنہ انسان شکست و ریخت کا شکار ہو جاتا ہے۔

انہوں نے سردی سے بچنے کی خاطر اپنے تمام کپڑے پہن رکھے تھے۔ وہ کچھ دیر تک کے لئے سونا چاہتے تھے۔ شدید ہوا ان کے خیمے پر حملہ آور ہو رہی تھی اور اس کو اکھاڑ رہی تھی۔ نیند میں معاونت حاصل کرنے کی غرض سے ان کے پاس قلیل مقدار میں آکسیجن موجود تھی۔ لہٰذا وہ محض دو گھنٹوں تک نیند سے لطف اندوز ہو سکے۔ 29 مئی کو صبح چار بجے وہ اپنے سلیپنگ بیگوں سے باہر نکلے۔ اس وقت درجہ حرارت 27- ڈگری سینٹی گریڈ تھا اور یہ ان کی پہلی روشنی تھی۔ ان کے لئے خوشی کی بات یہ تھی کہ شدید ہوا چلنا بند ہو چکی تھی۔

انہوں نے دوبارہ کھانا کھایا۔ جہاں تک ممکن ہو سکا مائع اشیاء کا استعمال کرتے ہوئے اپنے جسم میں پانی کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش سرانجام دی اور اپنے تمام کپڑے زیب تن کر لئے تاکہ سردی سے بچنا ممکن ہو سکے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں پر تین تین دستانے چڑھا لئے...... انہوں نے آکسیجن کے سلنڈر اپنے کندھوں پر لٹکائے...... آکسیجن کے بہاؤ کی پڑتال کی...... اپنے برف کے کلہاڑے سنبھالے اور نائیلون کے رسوں کی مدد سے ایک دوسرے کو محفوظ بنایا اور برف کی گہری ڈھلوانوں کی جانب چڑھائی شروع کی۔

انہوں نے صبح 6 بجکر 30 منٹ پر اپنی مہم کا آغاز کیا تھا اور مہم کا یہ آغاز ایک بہتر آغاز نہ تھا۔ ان کو اندازے سے بڑھ کر توانائی صرف کرنا پڑ رہی تھی حتیٰ کہ وہ ڈھلوانوں کو عبور کرتے ہوئے قدرے بہتر مقام تک جا پہنچے تھے جہاں پر برف مضبوطی کے ساتھ جمی ہوئی تھی۔

چوٹی سر کرنے والی پہلی پارٹی نے ایک ایسا روٹ اختیار کیا تھا جو ایک نرم چٹان اور نرم برف کی ایک گہری ڈھلوان پر مبنی تھا اور انہیں ایک مرتبہ پھر ایک برفانی ڈھلوان سے نیچے آنا تھا۔ ہیلری اور تن زنگ نے اپنی چڑھائی کے لئے جس راستے کا انتخاب کیا تھا وہ سخت محنت درکار رکھتا تھا کیونکہ نرم برف میں مضبوطی کے ساتھ پاؤں جمانا درکار تھا۔ ڈھلوان کا ایک حصہ ڈھلوان سے علیحدہ ہو کر ہیلری کے پاؤں کے نیچے سے کھسک کر یک دم نظروں سے غائب ہو چکا تھا اور 10,000 فٹ کی گہرائی کی نذر ہو چکا تھا۔

ہیلری نے مابعد بیان کیا کہ:۔

"یہ امر میرے لئے ایک بہت بڑے دھچکے کا باعث ثابت ہوا۔ میری تمام تربیت نے مجھ پر یہ واضح کیا تھا کہ ڈھلوان انتہائی خطرناک صورت حال کی حامل تھی۔ لیکن اس دوران میں اپنے آپ کو یہ یاد کروا رہا تھا کہ فکر مت کرو...... وہ رہی ایورسٹ کی چوٹی...... تمہیں ہر حال میں اسے سر کرنا ہے۔"

ان دونوں نے سخت جدوجہد جاری رکھی اور اور نو بجے تک وہ دونوں جنوبی چوٹی تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکے تھے...... اس چوٹی پر پہنچنے میں کامیاب ہو چکے تھے جس چوٹی پر ایونز اور بورڈلن دووز پہلے پہنچ چکے تھے اور وہ دونوں پہلے انسان تھے جنہوں نے اس چوٹی پر قدم رکھا تھا۔

ان کے پاس آکسیجن کی مقدار کم پڑ رہی تھی۔ ہیلری کے ایک محتاط اندازے کے مطابق ان کے پاس محض ساڑھے چار گھنٹے تک کے لئے آکسیجن کا ذخیرہ موجود تھا۔ آکسیجن کے اس قلیل ذخیرے کے ساتھ ان کے لئے 300 فٹ مزید بلندی تک جانا اور وہاں سے واپس آنا ایک مشکل امر تھا۔ لیکن انہوں نے اپنی کاوش جاری رکھی اور جلد ہی انہیں امید کی ایک کرن دکھائی دی۔ یہ امید کی کرن انہیں اس وقت دکھائی جب ہیلری نے برف کی کلہاڑی برفانی ڈھلوان پر چلائی۔ یہ برفانی سطح سخت پائی گئی تھی اور قدم جمانے کے لئے بہترین تھی۔ کچھ فاصلہ انہوں نے آہستہ اور پورے اعتماد کے ساتھ طے کیا۔ ہیلری راستہ بنا رہا تھا جبکہ تن زنگ اس کے پیچھے پیچھے ایک مضبوط رسے کی بدولت تحفظ فراہم کر رہا تھا۔ جوں ہی تن زنگ ہیلری کے پاس پہنچا ہیلری کو اچانک یہ محسوس ہوا کہ اس کے ساتھی کی رفتار عجیب وغریب ہونے کے علاوہ انتہائی سست تھی اور وہ دقت محسوس کر رہا تھا۔ اس کے علم میں یہ بات آئی کہ اسے آکسیجن مہیا کرنے والی ٹیوب برف کی وجہ سے بند ہو چکی تھی اور اسے آکسیجن کی مناسب مقدار مہیا نہیں ہو رہی تھی۔ یہ ٹیوب برف کی وجہ سے بالکل بند ہو چکی تھی۔ چند منٹوں کے بعد تن زنگ نے اس قابل نہیں رہنا تھا کہ وہ سانس لے سکے۔ ہیلری نے اس کی آکسیجن ٹیوب کو صاف کرنے کی کوشش کی اور اس کے بعد اپنی آکسیجن کی ٹیوب کی بھی پڑتال سرانجام دی۔ یہ بھی بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ اس میں بھی برف جم چکی تھی۔ اس نے اپنی آکسیجن ٹیوب کو بھی صاف کیا اور دوبارہ روبہ عمل ہو گئے۔ اب ایک اور رکاوٹ ان کی منتظر تھی۔

جس رکاوٹ سے وہ اب دوچار تھے اس کے بارے میں وہ جانتے تھے کہ وہ ان کی فتح یا شکست میں اہم کردار سرانجام دے گی۔ یہ رکاوٹ ایک بڑی چٹان تھی اور اس چٹان کو کئی ہزار فٹ نیچے سے بھی بخوبی دیکھا جا سکتا تھا۔ 29,000 فٹ کی بلندی پر اس چٹان پر چڑھنا ایک انتہائی مشکل امر تھا۔ ان کو اب ایک دوسری تدبیر آزمانی تھی۔ اگرچہ ہیلری نے تمام تر ممکنات کا جائزہ لے لیا تھا لیکن وہ کوئی بہتر روٹ دریافت کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ محض ایک ہی روٹ اس کی سمجھ میں آ سکا تھا۔ وہ یہ کہ وہ بائیں جانب پچاس یا ایک سو فٹ نیچے چلے آئیں۔ وہ جانتا تھا کہ وہ جس بلندی پر پہنچ چکے تھے اس بلندی کی قربانی دینا ایک احسن اقدام نہ تھا۔ لیکن وہ ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کا تصور نہ کر سکتے تھے کیونکہ ان کے پاس آکسیجن کی قلت تھی۔ ان کی آکسیجن کا ذخیرہ ختم ہونے کے قریب تر تھا۔ لہٰذا ہیلری نے چشم زدن میں فیصلہ کیا کہ انہیں چوٹی کے نزدیک تر پہنچنا چاہئے...... کوشش سرانجام دینے میں کوئی حرج نہ تھا بلکہ کوشش سرانجام دینا ایک احسن اقدام تھا۔

لہٰذا انہوں نے ایک ایک انچ کر کے اوپر چڑھنا شروع کیا اور اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ ان کی اس کوشش نے انہیں تھکاوٹ سے دوچار کر دیا تھا۔ انہیں خدشہ تھا کہ کوئی اور رکاوٹ ان کی فتح کو شکست میں نہ بدل دے۔ بہرکیف وہ آگے بڑھتے رہے...... تھکے ماندے اور مشکلات کا شکار

مگر انہوں نے حوصلے نہ ہارے۔ لیکن اس کے بعد انہیں کسی رکاوٹ کا سامنا نہ کرنا پڑا لیکن یہ چٹان ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ ہیلری کے حواس پر ایک ہی سوچ چھائی ہوئی تھی...... ایورسٹ کی چوٹی...... اور یہی چوٹی ایک برفانی گنبد کی شکل میں ان کے سامنے کھڑی تھی۔

وہ جانتے تھے کہ انہیں چند قدم مزید بڑھانے تھے اور منزل ان کے قدموں میں تھی۔

2 جون کو ملکہ الزبتھ دوم کی لندن میں رسم تاجپوشی تھی اور ایورسٹ سے خبر نشر کی گئی...... یہ خبر ہجوم کو لاؤڈ اسپیکروں پر سنائی گئی۔ برسوں کی جدوجہد رنگ لائی تھی اور بالآخر ایورسٹ کی چوٹی کو سر کر لیا گیا تھا

ڈیلٹا پلان

وکٹورین بچہ ایک اسٹول پر کھڑا اپنے ڈرائینگ روم کے سامعین کو یہ نظم سنا رہا تھا۔

''بند کے پشتے میں سوراخ۔

اس کی کاٹج سے نظر آنے والا ڈیم...... اس نے خوش کن انداز میں اپنے چھوٹے بیٹے کو پکارا جو گھر کے دروازے سے باہر کھیل کود میں مصروف تھا۔ آؤ...... پیٹر آؤ! میں چاہتا ہوں کہ تم جاؤ...... ابھی دن کی روشنی باقی ہے......

اس بوڑھے اندھے کی جھونپڑی میں جاؤ جو بند کے پشتے کے پار واقع ہے۔''

نظم پڑھنی جاری رہی۔ یہ نظم 14 مصرعوں پر مشتمل تھی۔ یہ نظم ایک چھوٹے لڑکے پیٹر کی داستان بیان کرتی تھی جو ایک بوڑھے شخص کے لئے ہاٹ کیک لے کر جاتا ہے...... واپس گھر کی راہ لیتے ہوئے وہ پھول چننے کے لئے رک جاتا ہے۔ اس دوران اسے ناراض پانی کی آواز سنائی دیتی ہے جو بند کے پشتے کے ساتھ ٹکرا رہا ہوتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ یہ کتنی خوش قسمتی کی بات تھی کہ ڈیم کے گیٹ بہترین اور مضبوط تھے۔

''تم ایک ظالم سمندر ہو! پیٹر نے کہا:

میں جانتا ہوں تم کیوں اتنے مچل رہے ہو......

تم ہماری زمینیں اور ہمارے گھر تباہ کرنا چاہتے ہو......

لیکن ہمارے بند تمہیں محفوظ رکھتے ہیں''

جلد ہی اس کی نظر پشتے میں ایک سوراخ پر پڑی۔ اس نے سوچا کہ اسے اب کیا کرنا چاہئے۔ جلدی میں اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا مگر اس نے عقلمندی اور ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے اس سوراخ میں اپنا ہاتھ داخل کر دیا اور اسے بند کر دیا۔ وقت گزرتا چلا گیا...... کئی گھنٹے بیت چکے تھے...... شام بھی بیت چکی تھی اور اب رات سر پر آن پہنچی تھی جبکہ گھر میں اس کے والدین اس کے انتظار میں تھے۔ وہ پریشان تھے کہ پیٹر ابھی تک گھر کیوں نہیں پہنچا تھا۔ وہ لوگ جنہوں نے اسے صبح دیکھا تھا وہ یہ سوچ رہے تھے کہ وہ موت سے ہمکنار ہو چکا ہوگا...... لیکن خوش قسمتی سے ان کا خیال غلط تھا اور وہ اسے انتہائی خوشی اور مسرت کے ساتھ اس کی والدہ کے پاس اسے واپس لے آئے تھے۔

''خدا کا شکر ادا کرو...... تمہارے بیٹے نے ہماری زمین بچالی ہے...... اور خدا نے اس کی جان بھی بچالی ہے۔

اور اس کے کارنامے کے گیت گائے جائیں گے......

اور دیگر بچوں کو اس کا کارنامہ بتایا جائے گا جب تک ہالینڈ کے ڈیموں کے پشتے

زمین کو سمندر سے جدا کرتے رہیں گے۔''

یہ کوئی فرضی قصہ یا کہانی نہ تھی اور نہ ہی یہ ایک جذباتی کہانی تھی...... بلکہ یہ ایک حقیقی کہانی تھی جو کہ عرصہ دراز تک لوگوں کے ذہنوں میں گردش کرتی رہی تھی۔ شمالی سمندر...... جو ہالینڈ کی شمالی اور مغربی سرحدوں کو تشکیل دیتا ہے...... اس نے حفاظتی پشتہ توڑ ڈالا تھا اور اس سے پانی بہہ نکلا تھا۔

31 جنوری 1953ء کو ہفتے کا دن تھا۔ صبح سویرے سے ہی ٹھنڈی اور یخ بستہ ہوا چل رہی تھی۔ قصبے میں اس ہوا نے ان جھنڈوں کو پھاڑ کر رکھ دیا تھا جو ولی عہد شہزادے بیٹ ریکس کی سالگرہ کے جشن میں بطور خاص لہرائے جا رہے تھے اس روز اس کی عمر 15 برس کو جا پہنچی تھی۔ درجہ حرارت مزید گر چکا تھا۔ ہوا کی شدت میں بھی اضافہ ہو چکا تھا۔ سمندر کا غصہ بھی عروج پر تھا۔ لیکن ہالینڈ کے شمالی ساحل پر یہ سب کچھ معمول کا ایک حصہ تھا اور کچھ بھی معمول سے ہٹ کر وقوع پذیر نہیں ہو رہا تھا۔ لہٰذا کسی کو بھی کوئی خدشہ نہ تھا۔ اگلی صبح اپنے دامن میں خوف و ہراس سمیٹ لائی تھی۔ 85 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والی تند و تیز ہوا نے شمالی سمندر کے غصے میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ اس کا پانی بند کے پشتوں کے ساتھ ٹکرا رہا تھا...... ان کو شکست و ریخت اور توڑ پھوڑ کا شکار کر رہا تھا اور ان سے بہہ کر باہر کا رخ کر رہا تھا۔ اس وقت کوئی پیٹر موجود نہ تھا جو پشتے میں اپنا ہاتھ دیتے ہوئے پانی کو باہر نکلنے سے روک لیتا۔ زی لینڈ کے جزیرے زیر آب آ چکے تھے۔ مکانوں کی دیواریں گر چکی تھیں اور مویشیوں کی ایک کثیر تعداد بھی پانی میں ڈوب چکی تھی۔ کچھ لوگوں نے درختوں پر پناہ لے رکھی تھی۔ کچھ لوگ چھتوں پر پناہ گزین ہوئے تھے...... ہر ایک فرد کی خواہش تھی کہ اسے پانی کی سطح سے بلند تر جگہ پر پناہ میسر آئے۔ کشتیوں کا ایک بیڑہ لوگوں کی امداد کیلئے آن پہنچا تھا جبکہ کچھ لوگ اس جزیرے کے پشتوں کی مرمت کا کام سرانجام دے رہے تھے۔

تین روز تک یہ جزیرہ سمندر کی لہروں کا مرکز بنا رہا۔ اونچی اونچی لہریں جزیرے پر بے تحاشہ پانی انڈیل رہی تھیں۔ یہ اس جزیرے کی تاریخ کا بدترین سیلاب تھا۔ تاہم اس مرتبہ غیر ملکی امداد بھی میسر آ چکی تھی۔ یورپ اور امریکہ سے افرادی قوت مہیا کی جا چکی تھی۔ ہوائی جہازوں سے خوراک گرائی جا رہی تھی۔ اس کے علاوہ ربڑ کی کشتیاں بھی گرائی جا رہی تھیں۔ جو لوگ بلندی پر پناہ گزین تھے ہیلی کاپٹر انہیں اٹھا کر محفوظ مقام کی جانب منتقل کر رہے تھے۔ ولندیزیوں نے بھی دن رات محنت کی...... جدوجہد سرانجام دی اور اپنے بھائیوں کی مدد کی...... ان لوگوں کی مدد کی جو موت کی دہلیز پر کھڑے تھے۔ سخت سردی میں مکانوں کی چھتوں پر پناہ حاصل کئے ہوئے تھے۔ آہستہ آہستہ سیلاب اترنا شروع ہوا۔ پانی میں ڈوبی ہوئی عمارات دوبارہ منظر عام پر آنے لگیں مگر اب وہ ملبے کا ڈھیر بن چکی تھیں اور ان کا ملبہ سطح آب پر تیر رہا تھا اور کچھ تہہ نشین ہو چکا تھا۔ جب سیلاب اتر چکا تب کھیت ویران ہو چکے تھے۔ گلیاں...... بازار...... اور کھیت مویشیوں کی لاشوں سے بھرے ہوئے تھے...... ان میں انسانی لاشیں بھی شامل تھیں۔ 1800 سے زائد افراد لقمہ اجل بن چکے تھے۔ زی لینڈ کا مطلب ہے ''سمندر کی سرزمین''...... اس مرتبہ سمندر نے اس سرزمین کو اپنے میں مدغم کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

جب یہ سانحہ گزر چکا تھا تب ایک اور مسئلہ منہ اٹھائے سامنے کھڑا تھا۔ وہ مسئلہ یہ تھا کہ آئندہ اس قسم کے سانحہ سے بچنے کیلئے کیا تدبیر اختیار کی جائے۔ گذشتہ صدیوں کے دوران بھی ہالینڈ اکثر اس قسم کے سانحہ جات سے دوچار رہتا تھا لیکن اس قسم کی قدرتی آفت سے بچاؤ کی کوئی خاص تدبیر سرانجام نہ دی گئی تھی۔ 1953ء کے سانحہ کے بعد یہ محسوس کیا گیا کہ کچھ نہ کچھ اقدام ضرور سرانجام دینا چاہئے تاکہ آئندہ اس قسم کی قدرتی آفت سے محفوظ رہنا ممکن ہو سکے۔

ماضی میں سمندر کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک سادہ سا طریقہ اختیار کیا جاتا تھا۔ ابتدائی قبائل مٹی کے ٹیلے بنا لیتے تھے جنہیں ''ٹرپن'' کہا جاتا

تھااور جب سیلاب آتا تھاتب وہ ان ٹیلوں پر چڑھ جاتے تھے اور پناہ حاصل کرتے تھے۔ چونکہ یہ "ٹرپن" مٹی سے بنے ہوتے تھے لہٰذا یہ تادیر پانی کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور جونہی ایک "ٹرپن" پانی میں بہہ جاتا تھا دوسرا "ٹرپن" بنالیا جاتا تھا۔ یہ پہلے "ٹرپن" سے قدرے مضبوط ہوتا تھا اور بلندی میں بھی بڑھ کر ہوتا تھا (بڑے سے بڑا "ٹرپن" 20 فٹ بلند ہوتا تھا اور 37 ایکڑ رقبے پر محیط ہوتا تھا)۔ اس کے بعد پشتے بنانے کی تدبیر منظر عام پر آئی۔

سمندر سے نپٹنے کے لئے مختلف ادوار میں مختلف تدابیر اختیار کی جاتی رہیں بالآخر 1920ء میں بیریئر ڈیم کی تعمیر منظر عام پر آئی۔

مشینری کا دور شروع ہو چکا تھا اور مشینری روز بہ روز ترقی کی منازل طے کر رہی تھی۔ لہٰذا ہالینڈ کی حکومت کو یہ موقع میسر آیا کہ ہالینڈ کے دفاع کو اس قدر مضبوط بنا سکے جس قدر مضبوط یہ اس سے پہلے کبھی نہ تھا۔ جبکہ حکومت ان خطوط پر سوچ رہی تھی اور منصوبہ بندی کے مراحل طے کر رہی تھی اس دوران 1953ء کا یہ سانحہ پیش آیا۔ اب کچھ نہ کچھ کرنے کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی تھی اور جو کچھ بھی کرنا تھا جلد از جلد کرنا تھا۔ سیلاب کو تباہ کاری پھیلائے تین ہفتے گزر چکے تھے کہ ایک کمیشن تشکیل دیا گیا۔ اس کمیشن نے اس امر پر غور کرنا تھا کہ کیا موجودہ سمندری پشتوں کو مزید بلند کر دیا جائے یا پھر ڈیموں کی تعمیر کو یقینی بنایا جائے۔ کمیشن نے ڈیموں کی تعمیر کی سفارشات پیش کر دیں۔ اس منصوبے کی حمائت ٹرانسپورٹ اور پانی کے وزیر نے بھی کی اور جون 1958ء میں پارلیمنٹ نے بھی اس منصوبے کی منظوری دے دی۔ لہٰذا ڈیلٹا ایکٹ پاس کیا گیا اور جب ڈیلٹا منصوبہ تیار کر لیا گیا تو اس پر عمل درآمد کی راہ متعین کرنے کا بندوبست کیا جانے لگا۔ یہ منصوبہ 25 برسوں پر محیط تھا۔

یہ ایک بہت بڑا منصوبہ تھا اور یہ تاریخ میں اپنی طرز کا واحد منصوبہ تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ زی لینڈ کے جزیروں کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اور ملک کے دیگر حصول کے ساتھ ملایا جا رہا تھا...... ان کو سڑکوں کے ذریعے آپس میں ملایا جا رہا تھا جن کو ڈیموں کو عبور کرتے ہوئے ہالینڈ کی بڑی سڑکوں سے آن ملنا تھا۔

دیگر تدابیر میں زی لینڈ کے پلے گراؤنڈ ایریا کو مزید ترقی دینا تھا تا کہ یہ سرسبز ایریا زیادہ سے زیادہ سیاحوں کی توجہ کا مرکز بن سکے۔ اس میں مزید شجر کاری اور پھول اگانے کی تجویز بھی زیر غور تھی۔ اس کے ساحلوں کو مزید رونقیں فراہم کرنا بھی اس منصوبے میں شامل تھا جہاں پر بہترین کھانے بہترین ماحول میں دستیاب ہو سکیں۔

منصوبے کی راہ میں کئی ایک فنی رکاوٹیں بھی حائل تھیں۔ جن لوگوں نے بیریئر ڈیم کی تعمیر میں حصہ لیا تھا وہ لوگ اتنے بڑے منصوبے کی تکمیل کے لئے ناکافی تھے۔ نہ ہی معقول لیبر اور نہ ہی معقول تعمیراتی سامان دستیاب تھا۔

جوں جوں منصوبے کا آغاز ہوتا چلا گیا توں توں اس کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور ہوتی چلی گئیں اور مطلوبہ ڈیم منظر عام پر آتے چلے گئے تعمیراتی برسوں کے دوران تین لاکھ ملین گرڈر استعمال ہونے تھے اور سالانہ اخراجات 150 ملین پونڈ تھے۔ اہل ہالینڈ سمندر کے ساتھ جنگ کرنے میں مصروف تھے تا کہ وہ دوبارہ 1953ء جیسے سانحہ سے دوچار نہ ہوں۔ شاید پیٹر کی کہانی ایک مثالی کہانی تھی...... ایک چھوٹے سے بچے نے ایک بڑی قوت سے ٹکر لی تھی اور فتح حاصل کی تھی۔

نانگا پربت کی فتح

نانگا پربت...... 26,600 فٹ بلند چوٹی سلسلہ ہمالیہ کے مغربی سرے پر واقع ہے......اس صدی کے بہت سے برسوں کے دوران یہ چوٹی برطانوی اور جرمنی کوہ پیماؤں کے لئے خوف و ہراس کا شکار بنی تھی......اس چوٹی کی دہشت کی وجہ یہ تھی کہ اس چوٹی کو سر کرنے کی جدوجہد میں کم و بیش 31 افراد جن میں قلی وغیرہ بھی شامل تھے لقمہ اجل بن چکے تھے۔ بالخصوص جرمنی کے چند بہترین کوہ پیما اس کی ڈھلوانوں کی نذر ہو چکے تھے...... نانگا پربت کی چوٹی ان کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت اختیار کر چکی تھی اور وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھ سکتے تھے جب تک وہ اس چوٹی سے اپنے ہلاک شدگان کا بدلہ نہ لے لیتے......اور بدلہ لینے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ اس چوٹی کو سر کیا جائے......اسے فتح کیا جائے۔

اس چوٹی کو سر کرنے کی پہلی مہم برطانیہ نے سرانجام دی تھی۔ اس مہم کا سربراہ اے۔ ایف۔ ممری تھا جو ایک معروف کوہ پیما تھا۔ یہ مہم 1895ء میں سرانجام دی گئی تھی۔ اس مہم کے دوران وہ معروف کوہ پیما دو گورکھوں کے ہمراہ غائب ہو گیا تھا اور ان تینوں کا کوئی سراغ نہ ملا تھا۔ یہ لوگ تقریباً 21,00 فٹ کی بلندی سے غائب ہوئے تھے جبکہ وہ چوٹی سر کرنے کی جانب رواں دواں تھے۔ شاید وہ برف کے کسی ڈھیر کے ساتھ اس بلندی سے نیچے پھسل گئے تھے اور ان کا سراغ بھی نہ ملا تھا

37 برس بعد...... 1932ء میں ایک جرمن۔ امریکن مہم جو پارٹی نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن خرابی موسم ان کی شکست کا باعث بن گئی تھی۔ دو برس بعد ایک اور جرمن مہم جو پارٹی اس چوٹی کو سر کرنے کیلئے میدان میں اتری تھی اور یہ پارٹی بھی سانحہ کا شکار ہونے سے نہ بچ سکی تھی۔ یہ لوگ بھی موسم کے ہاتھوں شکست کھا چکے تھے۔ بنی نوع انسان دوسری مرتبہ موسم کے ہاتھوں شکست کھا چکا تھا۔ بلندی پر تند و تیز ہوائیں چلنا شروع ہو چکی تھیں اور یہ سلسلہ کئی روز تک جاری رہا تھا۔ وہ لوگ جو چوٹی سر کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے وہ سامان اور ہر اقسام کی امداد سے محروم ہو چکے تھے۔ دو جرمن جن میں ولی مرکل بھی شامل تھا جو 1932ء کی مہم کا سربراہ بھی رہ چکا تھا...... وہ دونوں اپنے قلیوں کے ہمراہ گم ہو چکے تھے اور بقایا مہم جو پارٹی کو مجبوراً واپس پلٹنا پڑا تھا۔

اس سانحہ پر جرمنی میں کافی لے دے ہوتی رہی تھی۔ لہٰذا تین برس تک کسی مہم جو پارٹی نے اس چوٹی کو سر کرنے کا نام نہ لیا تھا۔ تین برس بعد ایک اور مہم جو پارٹی نے نانگا پربت کی چوٹی سر کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔ لیکن یہ پارٹی بھی بدقسمتی کا شکار ہو کر رہ گئی تھی۔ 14 جون 1939ء کی شب تک یہ پارٹی بخیریت تمام تھی جبکہ ایک بالائی کیمپ کے 16 افراد ایک برف کے تودے کے نیچے دب گئے تھے۔ وہ محو خواب تھے جبکہ برف کے تودے نے ان کو ہمیشہ کی نیند سلا دیا تھا۔

لہٰذا نانگا پربت کی چوٹی کو ابھی سر کرنا باقی تھا۔ ابھی اس پر کسی بنی نوع نے قدم نہ رکھے تھے اور اہل جرمن بھی اس چوٹی کو سر کرنے کی گہری

تمنار کھتے تھے۔لہٰذا 1938ء میں انہوں نے ایک مرتبہ پھر اس چوٹی کو سر کرنے کی کوشش کا آغاز کیا......لیکن یہ کوشش بھی ناکامی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ اگر چہ اس مرتبہ کوئی سانحہ پیش نہ آیا تھا مگر موسم کی خرابی کے علاوہ قلی خوف و ہراس کا شکار ہو گئے تھے......انہیں ان لوگوں کی لاشیں خوف و ہراس میں مبتلا کر چکی تھیں جو اس سے پیشتر اس چوٹی کو سر کرنے کے عمل کے دوران ہلاکت کا شکار ہو چکے تھے۔

اب تک جرمنوں نے اپنی توجہ اس پہاڑ کے شمال کی جانب مرکوز کر رکھی تھی اور جنگ سے پیشتر ایک اور مہم جو پارٹی اس چوٹی کو سر کرنے کے لئے روانہ ہوئی۔انہوں نے سابقہ مہم جو پارٹیوں کے روٹ کو تبدیل کرتے ہوئے شمال کی بجائے مغرب کے روٹ کو اپنایا۔لیکن اس کے بعد اس منصوبے کو غیر معینہ مدت تک کے لئے ملتوی کر دیا گیا تھا۔

اسی اثناء وہ خوش قسمت جس نے نانگا پربت کو فتح کرنا تھا انز بروک میں پرورش پا رہا تھا......وہ پندرہ برس کی عمر کا حامل ایک لڑکا تھا......وہ غریب والدین کا لخت جگر تھا......عمر کے مطابق اس کی صحت بہتر نہ تھی بلکہ وہ جسمانی کمزوری کا بھی شکار تھا۔اس کے علاوہ وہ کوئی ذہین نوجوان بھی واقع نہ ہوا تھا۔لیکن درحقیقت وہ دیگر بچوں سے قطعاً مختلف واقع ہوا تھا۔اہل انز بروک اپنے پہاڑوں سے محبت کرتے تھے لیکن اس کی پہاڑوں کے لئے محبت ان سب سے بڑھ کر تھی اور شدید نوعیت کی حامل تھی......اس کے اندر ایک جذبہ موجزن تھا......وہ اس جذبے کو نہ بجھنے والی آگ قرار دیتا تھا...... پہاڑوں کی چوٹیوں کی دنیا سر کرنے کا جذبہ......وہ اس جذبے سے کبھی عاری نہیں ہوا تھا......اس کی زندگی کا نصب العین ہی یہی تھا......وہ کسی بھی دلیل سے قائل نہ ہوتا تھا...... ہرمین بوہل نے پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنا تھا اور ضرور چڑھنا تھا۔

دس برس کی عمر میں وہ اپنے والد کے ہمراہ گلن گیزر کی چوٹی پر چڑھ رہا تھا جو انز بروک میں واقع تھی۔اس کے بعد وہ شمالی پہاڑی سلسلے پر طبع آزمائی کر رہا تھا اور تن تنہا یہ کارنامہ سرانجام دے رہا تھا۔اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہ ہوتے تھے کہ وہ پہاڑوں پر چڑھنے کے لئے استعمال ہونے والے جوتے خرید سکتا۔لہٰذا وہ عام جوتوں کے ساتھ ہی کارنامے سرانجام دیتا رہا۔13 برس کی عمر میں اس نے اپنے اسکول کے ایک دوست کے ہمراہ 9,000 فٹ کی بلندی پر واقع پہاڑ کی ایک چوٹی سر کر لی تھی۔اس کے بعد اس نے مزید مشکل چوٹیاں سر کرنا شروع کر دیں۔کئی مرتبہ وہ حادثات کا شکار ہونے سے بال بال بچا لیکن اس کے اس شوق میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی بلکہ دن بہ دن اس میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔اس کے اندر یہ آواز گونجتی تھی کہ پہاڑوں کو سر کرنے میں کاملیت حاصل کرو۔لہٰذا وہ اپنا تمام تر فاضل وقت اپنے اعصاب مضبوط بنانے اور کوہ پیمائی کے بارے میں مضامین پڑھنے میں صرف کرنے لگا۔اس کے علاوہ اس نے دیگر مشاغل کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔وہ گرل فرینڈز اور سینما بینی سے بھی دور رہا۔

جنگ بوہل کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ثابت ہو رہی تھی۔جونہی جنگ اپنے اختتام کو پہنچی تو بوہل نے محسوس کیا کہ کوئی عظیم کارنامہ اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔1950ء تک وہ خاصی شہرت حاصل کر چکا تھا۔

1952ء میں ہمالیہ کی سرکوبی کیلئے ایک مہم کی منصوبہ بندی سرانجام دی گئی لیکن اس مہم کا آغاز نہ ہو سکا۔

تب 1953ء میں مرکل کے برادر نسبتی ڈاکٹر ہرلنگ کوفر جس کا تعلق میونخ سے تھا......اس نے بذات خود کوئی قابل ذکر کوہ پیمائی سرانجام نہ دی تھی......اس نے ایک اور مہم کی سربراہی سرانجام دینے کا فیصلہ کیا جو آنجہانی مرکل کی یاد میں تھی اور بوہل کو دعوت تھی کہ وہ بھی اس مہماتی ٹیم میں

شرکت کرے۔ وہ پورے جوش و خروش اور جذبے کے ساتھ اس مہم کی تیاری کرنے لگا۔ ہرلنگ کوفر کے علاوہ اس ٹیم میں نو افراد شامل تھے اور بوہل اس ٹیم کا سب سے کم عمر رکن تھا۔ اس وقت اس کی عمر محض 29 برس تھی۔

اس پارٹی نے گلگت تک بحری اور ہوائی سفر طے کیا اور ماہ مئی میں نشیبی کیمپ قائم کرنے کا مشقت طلب کام شروع ہوا۔ 18 جون کو بوہل اور پارٹی کے تین دیگر ارکان 22,000 فٹ کی بلندی تک پہنچ چکے تھے اور انہوں نے وہاں پر کیمپ نمبر چار قائم کیا۔ اب چونکہ موسم کی صورت حال ابتر ہو چکی تھی لہٰذا چودہ روز تک ان کا پروگرام ملتوی رہا۔

اس مقام سے بوہل کے کارہائے نمایاں کی داستان کا آغاز ہوا۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ اس سے بھی بلند مقامات پر کیمپ قائم کئے جائیں جہاں پر آرام کرنے اور مناسب تیاری سرانجام دینے کے بعد ایک پارٹی چوٹی کو سر کرنے کے روانہ ہو۔ بلند ترین مقام پر پہنچنے کے بعد چار افراد اس کام کے آغاز کے منتظر تھے اور 2 جولائی کو بوہل اور اس کے دوست نے کیمپ نمبر پانچ قائم کرنے کیلئے ایک عارضی مقام کا انتخاب کیا اور ایک چھوٹا خیمہ نصب کر دیا تا کہ اس میں رات بسر کرنا ممکن ہو۔ اس وقت چوٹی کی جانب یلغار کرنے کی کوئی سوچ ان کے ذہن میں نہ تھی اور دن بھر ان کو بیس کیمپ سے ریڈیو پیغامات موصول ہوتے رہے کہ وہ نیچے آ جائیں اور آرام کریں۔ ان کو یہ بھی بتایا گیا کہ مون سون کے موسم کا آغاز ہونے والا تھا۔

لیکن دو روز سے موسم حیران کن حد تک بہتر تھا اور اس رات بوہل اور اس کے دوست نے اچانک یہ فیصلہ کیا کہ انہیں اگلی صبح چوٹی سر کرنے کی ایک کوشش سرانجام دینی چاہیے حالانکہ وہ تھکے ماندے تھے اور غذائی قلت کا بھی شکار تھے اور انہیں کسی قسم کی مدد بھی حاصل نہ تھی۔ مقررہ معیار کی روشنی میں یہ ایک پاگل پن کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اگر چہ ان کو پہاڑ کی چوٹی قریب ہی نظر آئی تھی لیکن یہ ہنوز ان سے 4,310 فٹ کی دوری پر واقع تھی۔ ان کے پاس آکسیجن بھی نہ تھی اور اس علاقہ کی تحقیق و تفتیش بھی سرانجام نہ دی گئی تھی اور اس مقام پر زیادہ سے زیادہ پندرہ گھنٹوں تک دن کی روشنی طاری رہتی تھی اور کبھی کبھار ایسی مشکل چڑھائی بھی درپیش ہوتی تھی کہ ایک تجربہ کار کوہ پیما بھی ایک گھنٹے میں محض 100 فٹ کی بلندی طے کر پاتا تھا۔ اور کھلے آسمان تلے رات گزارنا...... وحشیانہ موسم کی وجہ سے موت کی بھینٹ چڑھ جانا بھی بعید از قیاس نہ تھا۔

بوہل اور اس کا دوست اوٹو کمپسٹر یہ سب کچھ جانتے تھے۔ لیکن بوہل مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ قلی بھی ہڑتال پر تھے...... موسم بھی خوشگوار تھا...... یہ بہترین موقع تھا...... ایسا بہترین موقع دوبارہ میسر نہیں آ سکتا تھا...... اب یا پھر کبھی نہیں...... اوٹو پُرسکون نیند سویا لیکن بوہل سوچوں کے گرداب میں پھنسا ہوا تھا۔ وہ چوٹی تک پہنچنے کے روٹ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگر چہ یہ روٹ اس کے علم میں تھا لیکن وہ فاصلے اور وقت کا تخمینہ سرانجام دے رہا تھا۔ اس دوران ہوا نے ان کا خیمہ اڑانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ وقت گزرتا گیا۔ بوہل نے اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ کل کا دن اس کی زندگی کا اہم ترین دن ہوگا۔

صبح ایک بجے وہ مکمل طور پر تیار ہو چکا تھا۔ اس نے مکمل لباس زیب تن کر لیا تھا اور صبح دو بجے وہ مختصر سے ضروری ساز و سامان کے ہمراہ تن تنہا ہی کارہائے نمایاں سرانجام دینے کے لئے چل نکلا۔ ابھی اندھیرا تھا۔ اوٹو نے وعدہ کیا کہ وہ بھی اس کے پیچھے چلا آئے گا۔

بوہل نے ایک مختصر روٹ کا انتخاب کیا تھا۔ اس سے مختصر روٹ کا انتخاب ممکن نہ تھا۔ جوں ہی وہ چوٹی کے نیچے پہلی چٹانوں پر چڑھا اس

وقت سورج نکل چکا تھا اور آسمان بادلوں سے پاک تھا۔ وہ کچھ دیر آرام کرنے کیلئے بیٹھ گیا۔ اس کی گھڑی صبح کے پانچ بجا رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ کافی نیچے اوڈو آہستگی کے ساتھ چڑھتا چلا آ رہا تھا۔

وہ سورج کی گرمائش پہنچانے والی روشنی میں دوبارہ حرکت میں آ گیا۔ وہ 24,450 فٹ کی بلندی تک پہنچ چکا تھا۔

دس بجے تک وہ تھکاوٹ سے بے حال ہو چکا تھا۔ وہ نیچے برف کی جانب منہ کر کے لیٹ گیا۔ اسے سانس لینے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ وہ درپیش آنے والی مزید مشکلات سے بخوبی واقف تھا۔ اس وقت تک دو پہر کے دو بج چکے تھے اور دن کی روشنی کے مزید پانچ گھنٹے باقی تھے اور چوٹی ہنوز اس سے دور تھی۔ تھکاوٹ سے اس کا بُرا حال تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر آرام کرنے کے لئے بیٹھ گیا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد دوبارہ حرکت میں آ گیا۔ اس نے چوٹی کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا اور اپنی توجہ محض چند گز آگے تک مرکوز کروالی۔ وہ اوپر ہی اوپر چڑھتا چلا گیا...... گھنٹے کے بعد گھنٹے گزرتے گئے اور وہ مزید اوپر کی جانب گامزن رہا حتیٰ کہ وہ چوٹی کے قریب جا پہنچا اور چٹان کے ایک مینار نے اس کا راستہ روک لیا۔ اگر وہ چکر کاٹ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تو اس کے لئے توانائی کی ضرورت درپیش تھی جو فی الحال اس کے پاس موجود نہ تھی۔ وہ اپنی تمام تر توانائی صرف کر چکا تھا۔ لہٰذا اس نے اسی سمت سے اوپر چڑھنے کا فیصلہ کیا۔

شام کے چھ بج چکے تھے۔ وہ 26,000 فٹ سے زائد بلندی پر موجود تھا۔ اب وہ لاشعوری طور پر ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ اپنی کسی سوچ یا خواہش کے تحت آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ وہ راستے کی ہر رکاوٹ کو لاشعوری طور پر عبور کرتا چلا گیا۔ جب وہ چلنے کے قابل نہ رہا تب وہ رینگنے لگا۔ اس نے اپنے اوپر ایک چٹان دیکھی۔ اگرچہ چوٹی اسے دکھائی نہ دے رہی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ چوٹی اس چٹان کے پیچھے واقع تھی۔ چونکہ اس میں کھڑے ہونے کی سکت باقی نہ رہی تھی لہٰذا وہ ایک مرتبہ پھر رینگنے لگا...... اور چٹان تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا...... اس کے بعد چٹان کے اوپر چڑھنے میں بھی کامیاب ہو گیا...... اس نے محسوس کیا کہ اب اس میں حرکت کرنے کی سکت بالکل باقی نہ تھی...... لیکن وہ چوٹی پر پہنچ چکا تھا...... اس چوٹی پر پہنچ چکا تھا جس پر ابھی تک کسی انسان نے قدم نہ رکھے تھے...... وہ اپنی تخلیق سے لے کر اس وقت تک انسانی قدموں سے نا آشنا رہی تھی...... یہ چوٹی 26,620 فٹ کی بلندی پر واقع تھی۔

17 گھنٹے مسلسل چڑھائی سرانجام دینے کے بعد تھکن سے اس کا بُرا حال تھا...... اسے اپنی کامیابی اور اپنی فتح کا بھی کوئی احساس باقی نہ رہا تھا...... اسے محض اس خوشی کا احساس تھا کہ اس نے مزید چڑھائی سرانجام نہ دینا تھی۔ اب سورج کافی نیچے جا چکا تھا۔ لیکن وہ کچھ تصاویر بنانے کے لئے رکا رہا۔ اس دوران سورج مکمل طور پر غروب ہو چکا تھا اور سخت سردی شروع ہو چکی تھی...... اب وہ اگلے چند گھنٹوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے واپسی کی راہ اختیار کی اور ایک مناسب مقام پر رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔ جب دن کا اجالا پھیلا اس وقت وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ہنوز زندہ سلامت تھا۔ اس کے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔

ایک چٹان سے نیچے اترتے ہوئے اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ ایک گھنٹے تک پڑا سویا رہا۔ سورج پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا اور وہ پیاس سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے دوست مدد کیلئے آ رہے تھے۔ لیکن یک دم وہ غائب ہو گئے۔ یہ ایک سراب تھا

......ایک دھوکا تھا۔ اس نے سنا کہ اس کے دوست اسے پکار رہے تھے کہ:۔

''ہرمین! ہرمین!''

اس نے اردگرد دیکھا...... لیکن وہاں کوئی ذی روح موجود نہ تھا۔ لیکن بالآخر اس نے برف میں جوتوں کے نشان دیکھے...... یہ نشان اس کے کل کے سفر طے کرنے کے تھے...... وہ اسی مقام پر اپنی خوراک سے دست بردار ہوا تھا تاکہ اپنا بوجھ کم کرتے ہوئے بہ آسانی چوٹی تک رسائی حاصل کر سکے۔ اسے اپنی چھوڑی ہوئی خوراک مل چکی تھی۔ لیکن وہ اس خوراک کو نگل نہیں سکتا تھا۔ اسے جس چیز کی ضرورت تھی وہ پانی تھا یا کوئی اور مائع شے تھی۔ لیکن اس نے اس قسم کی کوئی شے کل وہاں پر نہ چھوڑی تھی۔

اس نے کافی وقت آرام کرنے میں گزارا اور اس کے بعد دوبارہ واپسی کی جانب گامزن ہوا۔ پیاس نے اسے بے حال کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر کیمپ نمبر چار کے ایک خیمے تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ لیکن یہ خیمہ ابھی اس کی پہنچ سے دور تھا۔ اس نے چلا کر اہل خیمہ کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ دوپہر ڈھل رہی تھی اور وہ جانتا تھا کہ وہ مزید ایک رات کھلے آسمان تلے نہیں گزار سکتا تھا۔ جسمانی کمزوری اور امید کے درمیان وہ ہچکولے کھاتا رہا...... چلتا رہا...... رینگتا رہا...... اور کپکپاتا رہا۔

اب اس کا جذبہ ماند پڑ چکا تھا۔ وہ ہمت ہار چکا تھا۔ اب وہ حقیقی مایوسی کا شکار تھا۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس نے جدوجہد سے کنارہ کشی اختیار نہ کی تھی اور ساڑھے پانچ بجے وہ خیمے کے پاس جا پہنچا تھا۔

بالآخر اسے یہ احساس ہو چکا تھا کہ وہ اب محفوظ تھا۔ سورج ایک مرتبہ پھر غروب ہو رہا تھا۔ بالآخر وہ لمحہ بھی آن پہنچا تھا کہ اس کے دوست اس کی جانب بڑھ رہے تھے...... وہ ان کے بازوؤں میں ڈھیر ہو چکا تھا اور وہ سب رو رہے تھے۔ اسے اپنے دوستوں سے بچھڑے 41 گھنٹے گزر چکے تھے اور وہ اس کی جانب سے ناامید ہو چکے تھے۔

اس کے دوستوں نے اس کی تیمارداری کی...... اس کے ساتھ محبت کے ساتھ پیش آئے...... اس کی احتیاط سرانجام دی...... اس کے معدے میں کافی انڈیلی...... اس کے پاؤں کا مساج کیا...... اور اس سے یہ سوال قطعاً نہ کیا کہ کیا وہ چوٹی سر کرنے میں کامیاب ہوا تھا یا نہیں۔ جب اس کے حواس بحال ہوئے تب اس نوجوان نے انہیں اپنی داستان سنانا شروع کی۔ وہ ایک عظیم کارہائے نمایاں سرانجام دے چکا تھا اور اس کے دوست اس دنیا کے پہلے چند افراد تھے جو اس کے اس کارہائے نمایاں سے باخبر ہوئے تھے۔

دولت مشترکہ کی قطب جنوبی کی مہم

قطب شمالی کے علاقہ جات تک تقریباً 400 برس قبل اہل یورپ رسائی حاصل کر چکے تھے۔لیکن وسیع تر رقبے پر پھیلا ہوا برفانی براعظم جو قطب جنوبی کو گھیرے ہوئے ہیں اسے حال ہی میں دریافت کیا گیا تھا۔اسے 1894ء میں ناروے کے ایک مہم جو نے دریافت کیا تھا۔قطب جنوبی کی موجودگی کی تصدیق 1841ء تک ممکن نہ ہوئی تھی جبکہ جیمز راس نے بڑے راس آئس بیریئر کی دو جہازوں کے ہمراہ تحقیق وتفتیش سرانجام دی تھی ..... ''اریبس''......اور''ٹیرر''......راس نے دو مزید بحری سفر سرانجام دیئے لیکن اس کے بعد تقریباً 40 برس کا ایک طویل وقفہ حائل ہو گیا اور اس کے بعد دیگر مہم جو اس انجانے علاقے کی جانب راغب ہوئے اور انہوں نے اس علاقے کا رخ کیا۔نئی صدی کے آغاز پر برطانیہ نے بھی اس مہم میں دلچسپی کا اظہار کیا اور قطب جنوب کی جانب مہم جو پارٹی روانہ کی۔سرارنسٹ شکلٹن اور کیپٹن رابرٹ فالکن تحقیق وتفتیش کے اس ابتدائی دور کے معروف لیڈر ہیں اگرچہ کیپٹن رابرٹ فالکن کو کسی قدر مایوسی کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا کیونکہ وہ جب اپنے چار ساتھیوں کے ہمراہ قطب جنوبی پر پہنچا تھا تو اس پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ ناروے کی ایک مہم جو پارٹی رونالڈ امنڈسن کی سربراہی میں ایک ماہ پہلے ہی انہیں اس مہم میں شکست سے دوچار کر چکی تھی۔اس کی ڈائری میں یہ تحریر درج ہے کہ:۔

''عظیم اور برتر خدا! یہ ایک خوفناک جگہ ہے اور ہمارے لئے وحشت ناک بھی ہے اور تکلیف دہ بھی ہے کیونکہ یہ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی سر کر لی گئی ہے''

دونوں جنگ عظیم کے دوران لاتعداد پرائیویٹ مہم جو پارٹیاں جن کا تعلق کئی ایک اقوام سے تھا نے تحقیق وتفتیش کے میدان میں قدم رکھا اور ہوائی جہاز متعارف ہونے اور مکینیکل گاڑیاں منظر عام پر آنے کے بعد تحقیق وتفتیش کی دنیا میں انقلاب برپا ہو چکا تھا۔1929ء میں ایک امریکن کمانڈر رچرڈ ای۔بائیرڈ نے قطب جنوبی پر پہلی پرواز سرانجام دی تھی۔

غالباً قطب جنوبی کی عظیم داستان شکلٹن کی 1914ء میں قطب جنوبی براعظم کو عبور کرنے کی ناکام داستان ہے۔اس کا بحری جہاز ''اینڈیورنس'' برف میں دھنس چکا تھا اور پانچ ماہ سے زائد عرصے تک یہ جہاز برف میں دھنسا رہا تھا اور بالآخر برف نے اسے توڑ پھوڑ کا شکار کر دیا تھا۔کئی ماہ تک یہ پارٹی خیموں میں مقیم رہی اور اس کے بعد وہ جزیرہ ایلیفنٹ پہنچنے میں کامیاب ہوگئی جہاں سے شکلٹن اور اس کے پانچ ساتھیوں نے جنوبی جارجیا کی جانب 800 میل تک کا سفر ایک کشتی کے ذریعے طے کیا تاکہ ایک امدادی جماعت تشکیل دے سکیں اور اس جماعت نے بالآخر ان لوگوں کو اس مصیبت سے نجات دلائی جس کا وہ شکار ہو چکے تھے۔اس تجربے کے بعد 40 برس تک کسی بھی جہاز نے ادھر کا رخ کرنے کی ہمت نہ کی۔

1949ء میں ڈاکٹر ویون فوچس......اس دور کا جزیرہ سٹونکٹن کے برطانوی اسٹیشن کا کمانڈر......وہ پہلا شخص تھا جس نے قطب جنوبی

عبور کرنے کا خواب دیکھا۔ اسے دولت مشترکہ کے پانچ ممالک کا تعاون حاصل کرنے میں چھ برس صرف ہوئے (برطانیہ...... نیوزی لینڈ...... آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ)۔ اس کے علاوہ صنعت کاروں سے مالی امداد حاصل کرنے میں بھی خاطر خواہ وقت صرف ہوا تاکہ وہ اپنے منصوبے کو آگے بڑھا سکے۔

چونکہ اس پارٹی کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اس قدر طویل سفر کے لئے سامان رسد اپنے ہمراہ لے جاسکے لہٰذا یہ طے پایا کہ ایورسٹ کے شہرت یافتہ سر ایڈمنڈ ہیلری کی زیر قیادت ایک معاون گروپ تشکیل دیا جائے جو براعظم کی دوسری جانب ایک استقبالیہ بیس قائم کرے۔ انہیں قطب جنوبی کی جانب 700 میل کا سفر طے کرنا تھا اور اسٹوروں کا ایک جال بچھانا تھا جہاں پر خوراک اور ایندھن دستیاب ہوتا کہ مہم جو پارٹی اپنا سفر جاری رکھ سکے۔

یہ مہم جو پارٹی 14 نومبر 1955ء کو لندن سے روانہ ہوئی۔ وہ ایک کینیڈین جہاز ''دی رون'' میں عازم بحری سفر ہوئے۔ ان کو تالیوں کی گونج میں رخصت کیا گیا۔ یہ چھوٹا بحری جہاز محض 849 ٹن وزن کا حامل تھا اور ساز وسامان سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے عرشے پر بھی ساز وسامان کا ڈھیر لگا تھا جس میں ایندھن کے ڈرم وغیرہ بھی شامل تھے۔ یہ جہاز جنوبی جارجیا سے 10,000 میل کے فاصلے سے عازم سفر ہوا۔

ایک ہفتہ بعد یہ جہاز بھی برف میں پھنس کر رہ گیا اور 33 دن بعد یہ کھلے سمندر میں جانے کے قابل ہوا۔ 29 جنوری کو بالآخر یہ مہم جو جماعت خلیج واسل پہنچ چکی تھی اور یہاں پر ایک بیس قائم کی گئی تھی۔ ساز وسامان کو جہاز سے اتار لیا گیا تھا اور آٹھ افراد پر مشتمل ایک جماعت کو سردیاں گزارنے کے لئے اس مقام پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ ان کے ذمہ یہ ذمہ داری بھی تھی کہ وہ اس مقام پر رہائش گاہیں تعمیر کرے جن میں یہ مہم جو پارٹی رہائش اختیار کرے گی حتیٰ کہ 18 ماہ بعد وہ اپنی مہم کا آغاز کر سکے۔

ماہ مارچ کے آغاز میں موسم بحرانی کیفیت اختیار کر چکا تھا۔ 9 تاریخ کو تیز ہواؤں نے سمندر کی اس برف کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا جس پر ہنوز جہاز سے اتارا گیا وافر مقدار میں ساز وسامان اور سامان رسد پڑا تھا اور جب ہوا کا یہ طوفان تھما اس وقت تک کثیر مقدار میں کوئلہ' خوراک اور ایندھن غائب ہو چکا تھا۔ اس کے نتیجے میں اس مہم جو پارٹی نے سخت ترین سردی کا مقابلہ کیا۔ ایسی سخت ترین سردی سے کوئی بھی مہم جو پارٹی اس سے پیشتر بالمقابل نہ ہوئی تھی۔ اگرچہ سردی شدت کی تھی اور تند وتیز اور یخ بستہ ہوائیں چلتی رہتی تھیں لیکن اس کے باوجود بھی انہوں نے ایک بڑی جھونپڑی کی تعمیر کا کام جاری رکھا۔ اس دوران وہ ایک کریٹ میں رہائش اختیار کئے ہوئے تھے جس کی پیمائش 8×9×20 تھی اور دو افراد کے خیموں میں رات بسر کرتے تھے۔ اس کریٹ کا ایک کنارہ ریڈیو روم تھا اور دوسرا کچن تھا۔ اس کے درمیان میں ایک چھوٹی سی لکڑی کی میز اور بینچ رکھے گئے تھے۔ گرمائش بہم پہنچانے والی سہولتوں کی عدم موجودگی میں درجہ حرارت نقطہ انجماد سے نیچے تھا اور پانچ ماہ تک سردی کا یہی حال رہا تھا۔ ان لوگوں نے اپنے بیرونی کپڑے کبھی نہیں اتارے تھے۔ آہستہ آہستہ خیمے بھی شکست وریخت کا شکار ہو چکے تھے۔ لیکن مصائب اور مشکلات کے باوجود آہستہ آہستہ بڑی جھونپڑی کی تعمیر کا کام جاری تھا اور ماہ اگست میں جب موسم بہار شروع ہوا اس وقت تک یہ جھونپڑی تیار ہو چکی تھی اور انہوں نے اس جھونپڑی میں رہائش اختیار کر لی تھی۔

اسی اثنا میں لندن اور ولنگٹن میں مرکزی جماعتوں کیلئے حتمی تیاریاں سرانجام دی جا رہی تھیں۔ نومبر 1956ء کو "میگاڈان" نامی بحری جہاز ٹاور برج سے روانہ ہوا۔ اس میں ڈاکٹر فوچس اور گیارہ دیگر افراد سوار تھے جو شیکلٹن کی جانب عازم سفر تھے۔ وہ 13 جنوری 1957ء کو شیکلٹن کے پاس جا پہنچے اور ایڈوانس پارٹی کو ایک برس بعد اپنے احباب کے اولین خطوط وصول ہوئے اور تازہ گوشت اور پھل بھی موصول ہوئے جو یہ پارٹی اپنے ہمراہ لائی تھی۔

اب تمام تر توانائی ایک ایڈوانس بیس قائم کرنے کا مقام تلاش کرنے پر صرف کی جا رہی تھی جو 300 میل اندر واقع تھا۔

ایچ ایم این زیڈ ایس 'ہانڈیور' 21 دسمبر 1956ء کو ولنگٹن سے مک مردو ساؤنڈ کے لئے روانہ ہوا۔ اس میں نیوزی لینڈ کی ایک پارٹی سوار تھی۔ انہوں نے اپنا اسٹیشن 'اسکاٹ بیس' پرام پوائنٹ قائم کیا اور سکلٹن گلیشیئر تک کا روٹ دریافت کرنے کے علاوہ آئندہ موسم بہار میں سرانجام دیئے جانے والے سفر کے لئے سامان رسد کی تیاری سرانجام دی۔ اس کے علاوہ تمام تر موسم سرما کیلئے اس بیس سے ایک سائینٹفک پروگرام کی تیاری بھی کی گئی۔

ماہ اگست میں اس مہم میں تیزی آ چکی تھی اور لاتعداد فیلڈ پارٹیاں اپنے کتوں کی ٹیموں کے ہمراہ دی رون پہاڑوں کی جانب محو پرواز ہوئیں تاکہ سروے کے علاوہ جیولاجیکل امور سے نپٹا جا سکے۔ اسکاٹ بیس سے اہل ہالینڈ دو فرگوسن ٹریکٹروں اور کتوں کی ٹیموں کے ہمراہ قطب جنوبی کی جانب 700 میل تک ڈپوؤں کا ایک جال بچھانے کے لئے روانہ ہوئے۔ گراؤنڈ پارٹی نے قابل عمل گاڑیوں کا روٹ دریافت کرنا تھا اور سائٹ کا انتخاب بھی سرانجام دینا تھا۔ اس کے بعد ان کے جہاز نے اسٹوروں کی جانب پرواز کرنی تھی تاکہ ان ڈپوؤں کو سامان رسد سے بھر سکیں۔ موسم کے حالات بہتر تھے۔ لہٰذا وہ جلد ہی اپنے کام کا آغاز کر سکتے تھے اور انہوں نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ اسی اثنا میں شیکلٹن کی جانب سے بھی ڈاکٹر فوچس ساؤتھ آئس تک ایک محفوظ روٹ کی تلاش میں روبہ عمل ہوا۔ یہ سفر تمام تر مہم جو ٹیم کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج ثابت ہوا کیونکہ تمام تر علاقے میں برفانی تودے تھے اور ان میں شگاف اور دراڑیں پڑی ہوئی تھیں اور وہ جو چار گاڑیاں استعمال کر رہے تھے وہ مستقل طور پر خطرے کی زد میں تھیں۔ ٹریکٹروں کو آپس میں رسوں کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔ یہ وہی عمل درآمد تھا جو کوہ پیما بروئے کار لاتے ہیں۔

کبھی کبھار شگاف کو پُر کرنے کے لئے یہ لوگ اپنے ہاتھوں سے بیلچے چلاتے تھے تاکہ شگاف کو پُر کرتے ہوئے اس پر سے گزرنا ممکن ہو سکے اور گاڑیاں بہ آسانی اور بہ حفاظت ان پر سے گزر سکیں۔

24 نومبر 1957ء کو کراسنگ پارٹی کے 12 افراد آخری مرتبہ شیکلٹن کو خدا حافظ کہتے ہوئے روانہ ہوئے۔ ساؤتھ آئس تک ان کا سفر دوبارہ انہی مصائب کا حامل تھا۔ برفانی تودے اور ان میں شگاف اور دراڑیں وغیرہ ان کی منتظر تھیں۔

بہرکیف یہ پارٹی 21 دسمبر کو ساؤتھ آئس پہنچ چکی تھی۔ اس مقام پر گاڑیوں کی مرمت سرانجام دی گئی اور برف گاڑیوں کو بھی ایک طویل سفر کے لئے تیار کیا گیا...... 550 میل کا قطب جنوبی کی جانب سفر اور اس کے علاوہ ایک اور 500 میل پر محیط اس پہلے ڈپو کی جانب سفر جو کہ اسکاٹ بیس نے قائم کیا تھا۔ آٹھ ٹریکٹروں کے ٹینک ایندھن سے بھرے گئے...... اس سلسلے میں 320 گیلن ایندھن استعمال ہوا جبکہ برف گاڑیوں پر مزید

109 بیرل ایندھن رکھا گیا...... اس طرح کل ایندھن کی مقدار 5,200 گیلن تک جا پہنچی اور اس کا وزن 21 ٹن تھا۔ اس کے علاوہ ان کے پاس نصف ٹن وزن کے حامل چکنا کرنے والے تیل (بریکنٹ) اور نصف ٹن وزن کے حامل اوزار اور فاضل پرزے بھی تھے۔ اس کے علاوہ نصف ٹن وزن کی حامل خوراک اور نصف ٹن وزن کی حامل پیرافین بھی ان کے پاس موجود تھی۔ اس کے علاوہ سائنسی آلات...... خیمہ جات...... رسے...... برف پر استعمال ہونے والے بیلچے اور دیگر ضروری ساز و سامان بھی ان کے سفر کا حصہ تھا۔ انہوں نے تین ماہ تک یہ سب کچھ اپنے ہمراہ اٹھانا تھا۔

جوں ہی یہ تیاریاں جاری تھیں اس دوران کتوں کے ہمراہ مختلف ٹیمیں روانہ کی گئیں تاکہ وہ قطب جنوبی کی سطح مرتفع کا مناسب روٹ تلاش کر سکیں۔

کرسمس کے روز ٹریکٹروں نے ساؤتھ آئس سے روانگی اختیار کی۔ رات کو سفر انجام دینا زیادہ بہتر اور مناسب تھا کیونکہ رات کے وقت برف کی سطح سخت ہوتی تھی۔ گاڑیاں آدھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر طے کر رہی تھیں۔ ہر ایک گاڑی کے پیچھے دو برف گاڑیاں بندھی ہوئی تھیں۔

اس وقت تک اہل نیوزی لینڈ کراسنگ پارٹی کے لئے ڈپو قائم کرنے کا کام ختم کر چکے تھے۔ چونکہ یہ بات واضح تھی کہ ان دونوں گروپوں کے باہم ملنے میں ابھی کچھ وقت درکار تھا لہٰذا سر ایڈمنڈ ہیلری نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے چھوٹے ٹریکٹروں کو بذات خود قطب جنوبی کی جانب لے جائے اور وہ 4 جنوری کو منزل مقصود تک جا پہنچے تھے...... اس وقت ان کے پاس محض چار میل مزید سفر سرانجام دینے کا ایندھن باقی تھا۔

اس دوران کراسنگ پارٹی نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ وہ 200 میل کا سفر طے کرنے کے بعد گاڑیوں کی دیکھ بھال اور مرمت کیلئے رک جاتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ سائنسی کام بھی سرانجام دیتے رہے تھے۔ اب برف گاڑیوں کو کتے کھینچ رہے تھے۔ کیونکہ وہ آہستہ آہستہ ٹریکٹروں سے دست برداری اختیار کرتے چلے جا رہے تھے کیونکہ ان پر لدا ہوا ایندھن اور سامان رسد وغیرہ استعمال کیا جا چکا تھا۔ کتے روزانہ بیس میل کا سفر سرانجام دیتے ہوئے تھکاوٹ کا شکار ہو جاتے تھے کیونکہ بلندی کے حامل اس مقام پر (قطب جنوبی سطح سمندر سے 10,000 فٹ کی بلندی پر واقع ہے) سفر سرانجام دینا ایک وقت طلب امر تھا لیکن 19 جنوری کو وہ دوبارہ تازہ دم ہو چکے تھے کیونکہ وہ اچانک جھونپڑیوں کا جھرمٹ دیکھ چکے تھے۔

امریکی گاڑیوں کی ایک قطار ان سے ملنے کیلئے آگے بڑھی۔ ان گاڑیوں پر دنیا بھر کے اخباری نمائندے سوار تھے جو مک مرڈو ساؤنڈ آن پہنچے تھے تاکہ اس مقام پر اس پارٹی کی تاریخی آمد کی رپورٹنگ کر سکیں۔

چار روز بعد وہ قطب جنوبی سے 1,250 میل کے سفر بجانب اسکاٹ بیس روانہ ہوئے۔ چونکہ نیوزی لینڈ کی پارٹی روٹ کو استعمال کر چکی تھی لہٰذا ان کے سفر کی کارکردگی بہتر رہی اور وہ اکثر 30 تا 40 میل روزانہ سفر طے کرنے کے قابل تھے۔ بالآخر وہ ڈپو 700 تک جا پہنچے تھے جہاں پر اسکاٹ بیس سے سر ایڈمنڈ ہیلری ان کے ساتھ شامل ہونے کے لئے پہنچ چکا تھا۔

اب ان کے مسائل جداگانہ نوعیت کے حامل تھے۔ ان کو جلدی بھی تھی کیونکہ وہ یہ جانتے تھے کہ اگر ان کو دیر ہو گئی تو ایچ ایم این زیڈ ایس "اینڈیور" مک مرڈو ساؤنڈ سے اس خطرے کے پیش نظر روانہ ہو جائے گا کہ کہیں وہ برف میں نہ پھنس جائے اور یہ پارٹی آئندہ سردیوں سے پیشتر واپس روانہ نہ ہو سکے گی۔ لہٰذا انہوں نے پوری قوت کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھا۔

لہٰذا وہ ڈپو 480 سے آگے بڑھ گئے جو کہ مڈوے ڈپو تھا......اس کے بعد سطح مرتفع کے ڈپو سے بھی آگے بڑھ گئے اور بالآخر سکلٹن گلیشیئر کی چوٹی تک جا پہنچے۔

تین روز بعد انہوں نے اپنے آخری کیمپ کو خیر باد کہا اور اسکاٹ بیس کی جانب تیاری شروع کی۔ یہ تاریخی سفر اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ قطب جنوبی کو پہلی مرتبہ 99 دنوں میں عبور کیا گیا تھا۔ اسکاٹ بیس کے سامنے ان کو مبارکباد دینے والوں کا ہجوم اکٹھا تھا۔ ریڈیو کے ذریعے یہ خبر بھی موصول ہو چکی تھی کہ ڈاکٹر فوچس کو ملکہ نے نائٹ (سر) کے خطاب سے نوازا تھا۔ یہ خطاب اس کے تمام ساتھیوں کیلئے ایک اعزاز تھا جنہوں نے اس عظیم مہم میں اس کا ساتھ دیا تھا۔

الپس میں سرنگوں کی تعمیر

1955ء میں اٹلی اور سوئٹزر لینڈ کی حکومتوں نے یہ فیصلہ کیا کہ بالآخراس مہم کا آغاز کیا جائے جو گذشتہ ایک صدی سے انجینئروں کا خواب بنی ہوئی تھی......انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ سڑک کی حامل ایک سرنگ بنائی جائے......سینٹ برنارڈ سرنگ......اور یہ سرنگ کوہ الپس سے نکالی جائے۔ مابعد اسی برس اٹلی نے فرانس کے ساتھ ایک دوسری اور طویل سرنگ تیار کرنے کا معاہدہ سرانجام دیا اور یہ سرنگ الپس کے بلند ترین پہاڑ سے نکالی جانی تھی......اس پہاڑ کا نام مونٹ بلانک تھا جس کی بلندی 15,728 فٹ ہے۔

یورپ میں روڈ ٹرانسپورٹ کیلئے یہ سرنگیں ناگزیر تھیں اور ان کی جلد از جلد ضرورت در پیش تھی۔

الپس......جو فرانس۔سوئٹزر لینڈ اور آسٹریا کے مابین شمال میں قدرتی رکاوٹ قائم کرتا ہے اور جنوب میں اٹلی کے جنوب کی جانب یہی قدرتی رکاوٹ فراہم کرتا ہے۔ یہ یورپ کے پار تقریباً 600 میل تک پھیلا ہوا ہے اور اس کی چوڑائی کی حد 80 تا 150 میل ہے۔ اس پہاڑ میں 16 درے ہیں اور موسم سرما میں ان میں سے اکثر دو سے کئی ہفتوں یا کئی مہینوں تک برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ درہ برینر جو نسبتاً کم بلندی پر واقع ہے وہ اکثر موسم سرما میں آمدورفت کیلئے کھلا رہتا ہے لیکن دیگر درے تین یا چار ماہ تک کے لئے بند رہتے ہیں۔ لہٰذا ایک طویل دورانیے تک کے لئے الپس کے پار بذریعہ سڑک آمدورفت بند رہتی ہے اور موسم سرما میں کسی کار کو پہاڑیوں کے پار لے جانے کا محض ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے کہ اسے ریل گاڑی کے ذریعہ سینٹ گوتھرڈ یا سمپلون سرنگوں کے ذریعے پار پہنچایا جائے۔ اس مسئلے کا واحد حل یہی تھا کہ پہاڑوں میں سڑک کی حامل سرنگیں تعمیر کی جائیں جو کہ برف باری سے متاثر نہ ہوں۔

سینٹ برنارڈ ضلع میں ایسی ہی ایک سرنگ کاٹنے کی کوشش تقریباً ایک صد برس پیشتر 1856ء میں سرانجام دی گئی تھی جو کہ ناکامی کا شکار ہو چکی تھی۔ انجینئر حضرات اپنے منصوبوں میں تبدیلی لاتے رہے......کبھی ایک منصوبے کو زیر نظر رکھتے اور کبھی دوسرے منصوبے کو زیر غور لاتے۔ بہت سے کاریگر بیمار پڑ گئے اور چند ایک موت سے بھی ہمکنار ہو گئے تھے۔ کاریگر پہاڑ کی دونوں جانب تقریباً ایک سو گز کے فاصلے پر محیط کھدائی کرتے لیکن یہ کام ان کے لئے اس قدر دقت طلب تھا کہ وہ تقریباً چھ ماہ بعد دل چھوڑ جاتے تھے۔ اپنے اوزاروں سے دست بردار ہو جاتے تھے اور اپنے گھروں کی راہ لیتے تھے۔ انجینئر یہ شکوہ کرتے تھے کہ:

''مشکلات بے پناہ ہیں......کوئی بھی انسان الپس سے کبھی بھی کوئی سرنگ نہیں نکال سکتا۔''

لیکن حالات نے جلد ہی ان کے اس دعویٰ کو غلط اور بے بنیاد ثابت کر دیا۔ 1874ء میں سینٹ گوتھرڈ ریلوے سرنگ نکالی گئی اور انہی پہاڑوں میں سے یہ سرنگ نکالی گئی اور 1906ء میں ایک دوسری ریلوے سرنگ سمپلون نکالی گئی اور ایک صد برس بعد ایک کوشش سرانجام دینے کی

تیاریاں کی جا رہی تھیں اور یہ تیاری سڑک کی حامل سرنگ نکالنے کی تیاریاں تھیں۔

1955ء میں اٹلی اور فرانس کی حکومتوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ساڑھے تین میل لمبائی کی حامل ایک سرنگ تعمیر کی جائے......سینٹ برنارڈ سرنگ......اور سرنگ کے دونوں سروں پر چھت کی حامل ایک طویل سڑک بھی تعمیر کی جائے جس کی لمبائی ہر ایک سرے پر تقریباً چھ میل ہو......اور یہ سڑک سوئٹزرلینڈ میں کینٹن ڈی پروز اور اٹلی میں سینٹ ربہی کے درمیان واقع ہو......کل فاصلہ تقریباً 15 میل بنتا تھا۔ اس سرنگ میں داخل ہونے کی دونوں اطراف کی جانب انہوں نے گیراج......کار پارک......ٹیلی فون ایکسچینج......ڈاک خانہ......پولیس اسٹیشن......کئی ایک انتظامی دفاتر......دوکانیں اور ہوٹل بنانے کا منصوبہ بھی بنایا تھا۔

ہر ایک ملک میں پرائیویٹ کمپنیاں تشکیل دی گئی تھیں تاکہ وہ اس پراجیکٹ سے نپٹ سکیں۔ اس منصوبے کی لاگت جزوی طور پر دونوں حکومتوں نے مہیا کی تھی اور جزوی طور پر پرائیویٹ اور پبلک سیکٹر نے مہیا کی تھی۔

اٹلی اور فرانس کی حکومتوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ بھی اپنے لئے ایک سرنگ تعمیر کریں......مونٹ بلانک سرنگ......فرانس میں چامونکس اور اٹلی میں کورمیئر کے درمیان اس سرنگ کے دونوں سروں پر بھی چھت کی حامل سڑکیں تھیں جن کی لمبائی سات میل سے زیادہ تھی......یہ لمبائی برنارڈ سرنگ کی لمبائی سے دوگنی تھی اور یہ سرنگ دنیا کی طویل ترین سڑک کی حامل سرنگ تھی۔

ان دونوں سرنگوں کے تعمیراتی منصوبے 1957ء میں تیار کر لئے گئے تھے اور اسی برس مختلف ممالک کی سروے سرانجام دینے والی ٹیمیں الپس آن پہنچی تھیں تاکہ دونوں پہاڑی ضلعوں کا سروے سرانجام دے سکیں اور ہر ایک سرنگ کی تعمیر کے لئے ایک صحیح اور مناسب نقشہ تیار کر سکیں......ایک وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے ہر ایک پہاڑ پر چڑھنے کا عمل ایک وقت طلب عمل تھا۔ سروے کرنے والے حضرات کے لئے یہ ضروری تھا کہ ان کی پیمائش اور تخمینہ جات اور حساب کتاب بالکل درست ہوں۔ چونکہ کھدائی سرانجام دینے والی ٹیموں نے پہاڑ کی دونوں مخالف سمتوں سے کھدائی سرانجام دینی تھی لہٰذا یہ خدشہ موجود تھا کہ اگر سروئیر حضرات کے کام میں معمولی سی بھی غلطی پائی جاتی تب ان دونوں مخالف سمت سے کھدائی کی جانی والی سرنگوں کا آپس میں باہم ملنا مشکل تھا۔

بالآخر کئی ایک ماہ تک کام سرانجام دینے کے بعد سروئیر حضرات کا کام اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا اور 1959ء میں دونوں سرنگوں کے تعمیراتی کام کا آغاز ہو چکا تھا۔

سینٹ برنارڈ کی سرنگ کی تعمیر کے لئے تقریباً 1,000 کاریگر لگائے گئے تھے۔ سوئزرلینڈ اور اٹلی کے انجینئروں اور سڑکوں کی تعمیر کے ماہرین کی پارٹیاں جن کی تعداد بھی تقریباً 1,000 کے لگ بھگ تھی......انہوں نے پہلے پہاڑوں کے دونوں اطراف تک رسائی حاصل کرنے والی سڑکوں کی تعمیر کا کام سرانجام دیا۔ یہ طویل اور صبر آزما کام مشکل بھی تھا اور خطرناک بھی تھا۔ ایک غلط حرکت کی بدولت کسی بھی کاریگر کے قدم لڑکھڑا سکتے تھے اور وہ موت کا شکار ہو سکتا تھا۔ اہل سوئزرلینڈ کی نسبت اہل اٹلی کا کام مشکل تھا۔ ان کی جانب کی نہ صرف زمین وقت طلب واقع ہوئی تھی بلکہ انہیں پہاڑی وادی پر ایک طویل پل بھی تعمیر کرنا تھا۔

جب سڑک کی کٹائی اور بھرتی کا کام مکمل ہو گیا تو اس کے بعد کاریگروں نے سینکڑوں ٹن موٹی بجری بچھانے کا کام سرانجام دیا...... اس بجری کی تیاری سائٹ پر ہی سرانجام دی تھی...... تاکہ اس سے سڑکیں تعمیر کی جاسکیں۔ انہوں نے سڑکوں کی دونوں جانب نیچی دیواریں بھی تعمیر کیں تاکہ ان کو برفباری سے بچایا جاسکے۔ اس کے بعد انہوں نے سڑکوں پر چھتیں ڈالیں۔ یہ چھتیں پری۔ کاسٹ کنکریٹ کی شیٹوں سے ڈالی گئی تھیں۔

جب رسائی حاصل کرنے والی سڑکوں کی تعمیر مکمل ہونے کے قریب تھی تب انجینئر حضرات کی دیگر پارٹیاں پہاڑوں پر عارضی کیمپوں میں منتقل ہو گئیں اور انہوں نے سرنگ کے دونوں جانب داخلے کے مقام پر وسیع تر کھلی جگہ کی تیاری کا کام سرانجام دینا شروع کر دیا اور اس کے بعد دیگر عمارات کی تعمیر کا کام شروع کر دیا...... مثلاً گیراج...... پولیس اسٹیشن...... ٹیلی فون ایکسچینج وغیرہ وغیرہ کی عمارات کی تعمیر کے کام کا آغاز ہوا۔

سوئٹزرلینڈ کے حصے کی جانب کئی ایک پارٹیاں پاور ہاؤس کی تعمیر کے کام میں مصروف تھیں تاکہ سرنگ کے لئے حرارت اور روشنی مہیا کرنے کا بندوبست ہو سکے اور تازہ ہوا کی آمدورفت کو بھی ممکن بنایا جاسکے۔ یہ بھی ایک مشکل مرحلہ تھا۔ حصول مقصد کی خاطر ایک ڈیم تعمیر کرنا ضروری تھا جو دونوں پہاڑوں کے پانی کے بہاؤ کو کنٹرول کر سکے اور ایک جھیل کی تعمیر بھی درکار تھی جو ٹربائنوں کی ضروریات پوری کر سکے جنہوں نے بجلی کے جنریٹروں کو چلانا تھا۔ اگرچہ یہ پاور اسٹیشن بہت بڑا نہ تھا۔ اس میں ٹربائنوں کے تین سیٹ اور جنریٹر تھے لیکن یہ تقریباً ناممکن تھا کہ بجلی کی سپلائی کسی تعطل کا شکار ہو۔ تین برسوں تک کام کا سلسلہ جاری رہنے کے بعد آخر وہ دن بھی آن پہنچا جس دن کا ہر کوئی انتظار کر رہا تھا...... انجینئر حضرات نے سرنگ کی کھدائی کے کام کا آغاز کر دیا تھا۔

کھدائی کی کئی ایک مشینیں کام پر لگائی گئی تھیں۔ سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کے انجینئر دونوں اطراف سے آہستہ آہستہ کھدائی کا کام سرانجام دے رہے تھے۔ کھدائی کا یہ کام سخت چٹانوں میں سرانجام دیا جا رہا تھا اور اس کام کے لئے کھدائی کی طاقت ور مشینوں کے علاوہ دھماکوں سے بھی چٹانوں کو اڑایا جا رہا تھا۔ کھدائی کی مشین چٹانوں میں سوراخ بناتی تھی اور کاریگران سوراخوں میں دھماکہ خیز مواد بھرتے تھے۔ اس کے بعد وہ اپنی مشین کے ہمراہ واپس چلے جاتے تھے اور محفوظ مقام پر پہنچنے کے بعد ریموٹ کے ذریعے دھماکہ سرانجام دیتے تھے۔ دھماکے سے چٹانیں گر جاتی تھیں اور بجلی کی ریل کے ذریعے ان کا ملبہ ہٹایا جاتا تھا۔ بیس تا تیس منٹ کے وقفے کے بعد کاریگر دوبارہ کھدائی کی مشینوں سے چٹانوں میں سوراخ کرتے تھے اور یہی عمل درآمد دوبارہ دہرایا جاتا تھا۔

چٹان اس قدر سخت تھی کہ اس میں مطلوبہ سوراخ ڈالنے کے لئے دو گھنٹے صرف ہو جاتے تھے اور اس کے بعد ایک گھنٹہ ان سوراخوں میں دھماکہ خیز مواد بھرنے میں صرف ہو جاتا تھا۔ کام کی رفتار سست تھی۔ ایک دن میں تقریباً 25 تا 30 فٹ کھدائی سرانجام دی جاتی تھی اور کبھی کبھار 10 تا 15 فٹ کھدائی فی دن سرانجام دی جاتی تھی۔ یہ ایک خطرناک کام تھا۔ کبھی کبھار ایسا بھی ممکن ہوتا تھا کہ وہ ایک اچانک کسی نرم چٹان میں سوراخ کرنے میں مصروف ہو جاتے تھے جو اچانک ٹوٹ کر ان کے کام کرنے کی جگہ سے محض چند گز کے فاصلے پر گر جاتی تھی۔ سرنگ کے دونوں سروں کی جانب کھدائی کرنے والی ٹیمیں کئی مرتبہ اس قسم کے حادثات سے بال بال بچی تھیں اور ایک مرتبہ اس قسم کے حادثے کی بدولت دو کاریگر ہلاک بھی ہو گئے تھے۔

یہ خطرہ بھی مستقل طور پر موجود تھا کہ سرنگ کے جس حصے کی کھدائی مکمل کی جا چکی تھی کہیں اس کی چھت گر نہ جائے اور کاریگر اس کے نیچے

نہ دب جائیں۔لہٰذا انجینئر حضرات نے اس خطرے کو کم کرنے کے لئے چھت پر دھاتی چادریں عارضی طور پر نصب کر دی تھیں تا کہ کاریگروں کو عارضی تحفظ میسر آ سکے۔

جس دوران سرنگ کی کھدائی کا کام جاری تھا اس دوران دیگر پارٹیاں بھی کھدائی کرنے والی ٹیم کے پیچھے پیچھے اپنے فرائض سرانجام دے رہی تھیں۔ وہ سرنگ کی دیواروں اور چھتوں' کنکریٹ لائننگ سرانجام دے رہی تھیں۔ کنکریٹ کی یہ لائننگ درکار شکلوں میں پری۔کاسٹ کی گئی تھیں اور یہ ورکشاپ جہاں پر یہ کام سرانجام دیا جارہا تھا سرنگ کے دونوں جانب کے سروں کے باہر واقع تھیں۔

دو سال سے زائد عرصے تک سوئزرلینڈ اور اٹلی کے انجینئر ایک دوسرے کی جانب سرنگ کی کھدائی سرانجام دیتے رہے اور وہ یہ کام سرد اور اندھیروں کے حامل پہاڑوں میں سرانجام دیتے رہے۔ کافی لمبے عرصے تک کوئی بھی پارٹی دوسری پارٹی کے کام کے بارے میں کچھ نہ سن سکی تھی۔ سرنگ کے دونوں مخالف سروں پر مکمل خاموشی چھائی رہتی تھی۔اس کے بعد دونوں پارٹیاں دور دراز کے مقام پر ایک دوسروں کے دھماکوں کی آوازیں سننے لگی تھیں جو وہ چٹان کو اڑانے کے لئے سرانجام دیتے تھے۔اس کے بعد انہوں نے کھدائی کی آوازیں بھی سننا شروع کر دیں۔اس کے بعد کھدائی کی آوازیں اور دھماکوں کی آوازیں دونوں پارٹیوں کے نزدیک تر آنا شروع ہوگئیں۔ بالآخر اپریل 1962ء میں اہل سوئٹزرلینڈ اور اہل اٹلی سرنگ کے درمیان میں سرنگ کے دونوں سروں کے ملاپ کے مقام پر پہنچ چکے تھے۔ چٹان کی محض ایک چھوٹی سی دیوار دونوں پارٹیوں کو ایک دوسرے سے جدا کئے ہوئے تھی۔

یہ ایک جذباتی لمحہ تھا......خوشیوں کا حامل لمحہ تھا......دونوں کمپنیوں کے ڈائریکٹر......اخباری نمائندے......فوٹو گرافر اور دیگر افراد سرنگ کے اندر چلے آئے تھے تا کہ انجینئر حضرات کو اس آخری دیوار کو توڑتے ہوئے دیکھ سکیں جو سرنگ کے دونوں حصوں کو تقسیم کئے ہوئے تھی۔ انجینئر حضرات نے آخری سوراخ سرانجام دیئے......ان کو دھماکہ خیز مواد سے بھرا......محفوظ مقامات کی جانب روانگی اختیار کی......اور دھماکے سرانجام دیئے گئے اور دونوں ٹیموں کو جدا کرنے والی دیوار پاش پاش ہو چکی تھی اور ہزاروں ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔

جوں ہی گرد و غبار سے خلاصی حاصل ہوئی تب اٹلی اور سوئزرلینڈ کے کاریگر آگے بڑھے اور ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے۔اخباری نمائندوں نے ان کے انٹرویو لئے...... پریس فوٹو گرافروں نے ان کی فوٹو اتاریں۔دونوں کی کمپنیوں کے ڈائریکٹروں نے ان کو مبارک باد دی اور اگلے شام ان کے اعزاز میں ایک ضیافت کی گئی۔

لیکن سرنگ کا کام ابھی پایہ تکمیل کو نہ پہنچا تھا۔ابھی اس کی تعمیر کے کئی ایک مراحل باقی تھے۔

اس سرنگ کی کھدائی کا کام شروع کرنے سے لیکر اس کی تکمیل تک چار برس کا عرصہ صرف ہوا اور اس چار برس کے عرصے کے بعد سینٹ برنارڈ سرنگ مکمل ہوئی تھی۔ اس سرنگ کی تعمیر میں تقریباً 10 ملین پونڈ کی لاگت آئی تھی۔ یہ سرنگ 1964ء کے موسم بہار میں آمد و رفت کیلئے کھول دی گئی تھی۔

اس دوران فرانسیسی اور اٹلی کے انجینئروں نے مونٹ بلانک سرنگ بالکل اسی طریقے سے تعمیر کی...... چٹان میں سوراخ کرتے ہوئے اور

تب دھما کہ خیز مواد ان سوراخوں میں بھرنے کے بعد ان کو دھماکے سے اڑاتے ہوئے انہوں نے بھی اپنا تعمیراتی کام سرانجام دیا تھا۔ چونکہ اس سرنگ کی لمبائی سینٹ برنارڈ کی سرنگ کی لمبائی سے دوگنی تھی۔ لہٰذا اس کی تعمیر پر زیادہ وقت صرف ہوا۔ اس تعمیر کے دوران دو بڑے حادثات بھی پیش آئے۔ پہلے مونٹ بلانک کی چوٹی سے اچانک برف کا ایک تودا گرا جس کے گرنے سے سرنگ کی چھت ڈھیر ہوئی اور سرنگ برفانی پانی سے بھر گئی۔ خوش قسمتی سے اس مقام پر کام سرانجام دینے والے کاریگر اس حادثے سے بال بال بچ گئے۔ کچھ عرصے بعد سخت اور مضبوط برف کی ایک بھاری مقدار اور چٹان کا کچھ حصہ بیک وقت ٹوٹ کر نئے پاور ہاؤس کے ساتھ ایک ظالم قوت کے ساتھ ٹکرایا اس دوسرے حادثے میں تین کاریگر ہلاک ہو گئے اور پچاس کے قریب کاریگر زخمی ہوئے۔ پاور اسٹیشن بھی تباہ ہو چکا تھا اور اسے دوبارہ تعمیر کرنا پڑا۔

انجینئرز کئی اقسام کے فنی مسائل کا بھی شکار رہے تھے اور ان میں سے کچھ مسائل ایسے بھی تھے جن کو حل کرنے میں کافی زیادہ وقت صرف ہوا تھا۔ لیکن ان مشکلات اور حادثات کے باوجود بھی انجینئروں کے کام کی رفتار معقول رہی اور انہوں نے مونٹ بلانک کی سرنگ کی تعمیر کو سینٹ برنارڈ کی سرنگ کی تعمیر کے تقریباً ایک برس بعد مکمل کر لیا تھا۔

مونٹ بلاک سرنگ کی تعمیر پر 23 ملین پاؤنڈ لاگت آئی تھی اور یہ سرنگ 1965ء کے موسم گرما میں آمد و رفت کے لئے کھول دی گئی تھی۔

سڑکوں کی حامل یہ دو سرنگیں جو دنیا کی بہترین سرنگوں میں سے ہیں ٹرانسپورٹ کیلئے ازحد سود مند ہیں۔ اس کے علاوہ یہ یورپ کی تجارت کے لئے بھی ازحد سود مند ثابت ہوئی ہیں۔ اس سرنگوں کے ذریعے سفر کا طویل فاصلہ سمٹ چکا ہے۔ کئی ایک مقامات پر اس فاصلے میں 100 تا 200 میل تک کی کمی واقع ہوئی ہے...... اس طرح وقت اور ایندھن دونوں کی بچت ہوتی ہے۔

ییٹی کا اسرار اور بھید

20 ویں صدی کے دوران ہمالیہ کی چوٹیاں بنی نوع انسانوں کیلئے عظیم ترین مہمات سرانجام دینے کا باعث ثابت ہوتی رہیں۔ ان چوٹیوں میں سے کئی ایک چوٹیاں اب سر کر لی گی ہیں...... فتح کر لی گئی ہیں اور وہ لوگ جو اس عظیم بلندی پر مہمات سرانجام دیتے رہے ان پر یہ انکشاف ہوا کہ یہ مہم جوؤں کی ایک پرانی داستان ہے...... ایک پرانی کہانی ہے...... ایک بھید ہے...... ایک اسرار ہے جس نے تمام دنیا کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے...... قابل نفرت اور مکروہ برفانی انسان...... **یا ییٹی**...... یہ اپنی دور کا ایک بڑا اسرار اور بھید بنا دیا ہے۔

کئی صدیوں تک سیاح اور مہم جو حضرات اس قابل نفرت اور مکروہ برفانی انسان کی داستانیں سناتے رہے تھے۔ لیکن اس مخلوق کو 1921ء تک کسی نے تسلیم نہ کیا تھا حتیٰ کہ ماؤنٹ ایورسٹ کی پہلی مہم کی سرانجام دہی کے دوران اس کے قدموں کے نشانات دیکھے گئے تھے۔ ایرک شپٹن نے 1951ء کے دوران ایک تمہیدی معائنے کے دوران ان قدموں کے نشانات کی تصاویر اتاری تھیں۔ ان تصاویر نے بہت سے سائنس دانوں کو اس امر پر یقین کرنے پر مجبور کر دیا تھا کہ ایک بڑی انسان نما مخلوق جو تاحال انجانی بنی ہوئی تھی وسطی ایشیا کے پہاڑوں کے بلند سلسلے پر موجود تھی۔ ایرک شپٹن اس امر پر یقین رکھتا تھا کہ جب اس نے اس مخلوق کے قدموں کے نشانات کی تصاویر بنائی تھیں اس وقت پر یہ قوی الجثہ مخلوق جو نہ انسان تھی اور نہ ہی ریچھ تھی اور نہ ہی کسی ایسی قسم کا حامل بندر تھی جو ایشیا میں جانے اور پہچانے جاتے تھے ابھی ابھی وہاں سے گزری تھی۔

یہ قابل نفرت اور مکروہ برفانی انسان فطری طور پر ایک بہت بڑی خبر تھی اور بہت سے لوگ اس مخلوق میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ اس کا نام کچھ وضاحت درکار رکھتا تھا۔

قابل نفرت اور مکروہ کیوں؟

شرپس جو اس مخلوق پر یقین رکھتا تھا انہیں ''مچھ کانگ می'' کے نام سے پکارتا تھا۔ ''کانگ'' کا مطلب ہے ''برف''...... ''می'' کا مطلب ہے ''انسان''...... لفظ ''مچھ'' کا حقیقی مطلب ''غصہ یا کراہت'' ہے۔ اس لفظ کا غلط ترجمہ سرانجام دیا گیا تھا اور اس کو ''قابل نفرت یا مکروہ'' کے معانی پہنائے گئے تھے۔ برف کے یہ وحشی انسان...... ان کے بارے میں یہ گمان کیا جاتا تھا کہ وہ انسان ہیں...... یہ یقیناً اہل تبت کیلئے قابل نفرت اور مکروہ ہو سکتے تھے...... بشرطیکہ ان کی کہانیاں حقیقت پر مبنی تھیں۔

ییٹی بھی ان کے لئے اس سے ملتا جلتا تبتی نام تھا۔ یہ قیاس کیا جاتا تھا کہ ان کا قد انسانی قد کے برابر تھا اور ان کے بال لمبے لمبے اور سرخ رنگت کے حامل تھے۔ کچھ لوگ ان کا قد 12 فٹ بتاتے تھے اور ان کے چہرے انسانوں اور گوریلوں کے چہروں کے درمیان بتاتے تھے۔ وہ حیرت انگیز رفتار کے ساتھ برف پر چلتے تھے اور شرپس کے مطابق ان کے پاؤں پچھلی جانب کو مڑے ہوئے تھے اور اس وجہ سے وہ زیادہ آسانی کے ساتھ

پہاڑوں پر چڑھ سکتے تھے۔ کچھ لوگ ییٹی کو برہنہ حالت میں بیان کرتے تھے...... اس کی چمڑی سفید بتاتے تھے...... اس کے بال لمبے بتاتے تھے۔

ییٹی کے قدموں کے نشانات بہت سے ذمہ دار افراد نے دیکھے تھے۔ ان میں لارڈ ہنٹ اور شپٹن بھی شامل تھا۔ 1951ء میں اس کے قدموں کے نشانات جو کہ ½12 لمبے تھے اور ان کے درمیان ½6 انچ کا فاصلہ تھا...... ان کی مین لنگ گلیشیئر پر تصاویر اتاری گئی تھیں۔ ان نشانات کو 21,000 فٹ کی بلندی پر دیکھا گیا تھا۔

وہ لوگ جو اس قابل نفرت اور مکروہ برفانی انسان کی تلاش میں نکلے تھے وہ نہ صرف ہمالیہ کی بلندیوں پر مصائب کا شکار ہوئے تھے بلکہ انہیں اس مخلوق سے متعلق کئی ایک کہانیاں اور داستانیں اور روایات بھی میسر آئی تھیں۔

تبتی ابھی تک اس امر پر یقین رکھتے ہیں کہ ییٹی انسانوں سے رغبت رکھتا ہے بالخصوص خوبصورت لڑکیوں سے رغبت رکھتا ہے۔ بلندی پر واقع تبتی دیہاتوں میں ایسی کہانیاں گردش کرتی ہیں جن کے تحت کئی ایک لڑکیاں ییٹی اٹھا کر لے گیا تھا اور ان کے ساتھ مہربانی کے ساتھ پیش آتا تھا۔ لیکن ان لڑکیوں یا عورتوں کو دوبارہ نہیں دیکھا گیا تھا۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ مؤنث ییٹی کی حسد کی بھینٹ چڑھ گئی تھیں۔

تحریر...... ''نیپال کی بیٹی'' میں لامہ نے بتایا کہ برسوں پیشتر کس طرح اس کی ایک گرل فرینڈ کو ییٹی اٹھا کر لے گیا تھا اور وہ دوبارہ اسے کبھی نہ مل سکی تھی۔ اس نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ برفانی انسانوں کا یہ رواج تھا کہ وہ خوبصورت اور نوجوان کنواری لڑکیوں کو اٹھا کر پہاڑوں پر واقع اپنے گھروں میں لے جاتے تھے۔ ایک شرپا نے اسے بتایا تھا کہ کس طرح اس کی اپنی بیٹی کو ایک عظیم الجثہ ییٹی نے اغوا کیا تھا جس کے لمبے لمبے سرخ بال تھے اور لمبا سر تھا۔

اس کتاب میں میرا بہن (میڈلین سلیڈ) کی بیان کردہ ایک داستان بھی درج ہے۔ یہ واقعہ کشمیر میں پیش آیا تھا جہاں پر گلہ بانوں نے اپنی ایک عورت کو بچایا تھا جسے ییٹی نے قابو کر لیا تھا اور اسے اٹھا کر اپنی پہاڑی غار میں لے گیا تھا۔ انہوں نے ییٹی کو ہلاک کر ڈالا تھا لیکن میرا بہن کو بتایا تھا کہ انہوں نے اس واقعہ کی رپورٹ درج کروانے کی جرأت نہ کی تھی کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں وہ قتل کے جرم میں ملوث نہ کر لئے جائیں کیونکہ وہ ییٹی کو انسان تصور کرتے تھے۔

ان داستانوں اور چونکہ یہ داستانیں ایک وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھیں...... انہوں نے بہت سے مغربی تحقیق کنندگان کو اس امر کی طرف راغب کیا کہ وہ ان داستانوں کو سنجیدگی کے ساتھ لیں۔ ییٹی کا نقشہ ہمیشہ ایک جیسا ہی بیان کیا جاتا رہا تھا۔ لمبا...... سرخ بالوں کا حامل...... اس کا جسم بالوں سے بھرا ہوا اور برہنہ حالت میں...... اس کے پاؤں بڑے بڑے بیان کئے جاتے تھے جو پچھلی جانب مڑے ہوئے تھے۔

اس برفانی انسان کے قدموں کے نشانات کی ایرک شپٹن کی حساس تصاویر اور ایورسٹ جانے والے کوہ پیاؤں کی شہادتیں...... مثلاً آنجہانی ولفرڈ نوائس اور لارڈ ہنٹ وغیرہ...... جس نے ییٹی کی سیٹی کی عجیب وغریب آواز سنی تھی...... اس نے یہ آوازیں ایک سرد رات کے دوران سنی تھیں اور مابعد صبح کی تازہ برف باری میں اس کے قدموں کے نشانات دیکھے تھے...... یہ سب کچھ قابل نفرت اور مکروہ برفانی انسان کی تحقیقات سرانجام دینے کا باعث ثابت ہوا۔ اس سلسلے کی ایک اہم تحقیق 1960ء تا 1961ء سر ایڈمنڈ ہیلری نے سرانجام دی...... وہ پہلا شخص تھا جس نے

ایورسٹ کی چوٹی کو سر کیا تھا اور اس کی اس تحقیق کی سرپرستی شکاگو کے ورلڈ بک انسائیکلو پیڈیا نے سرانجام دی تھی۔

اس مہم کا سادہ سا مقصد یہی تھا کہ یہ معلوم کیا جائے کہ کیا ییٹی کا وجود ہے یا نہیں ہے۔ ہیلری کو امید تھی کہ وہ ایک ییٹی کو گرفتار کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ اس کے پاس ایک ایسی بندوق تھی جس سے ایک سرنج فائر ہو کر لگتی تھی اور اس میں موجود دوا کی وجہ سے وہ مخلوق فالج زدہ ہو جاتی تھی جس کو یہ سرنج لگی ہوتی تھی۔

اس مہم جو جماعت نے کھٹمنڈو سے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا اور وادیوں اور جنگلات سے ہوتی ہوئی دور دراز کے برفانی علاقے میں جا پہنچی تھی جہاں پر انہیں ییٹی سے ملاقات کی امید تھی۔ سنتے سناتے ہوئے ییٹی کی تین اقسام ان کے علم میں آ ئی تھیں۔ عظیم الجثہ ییٹی...... ریچھ سے مشابہت رکھنے والا...... آٹھ فٹ سے زائد قد کا حامل جو مویشیوں کا شکار کرتا تھا...... درمیانی جسامت کا حامل ییٹی...... انسانی مشابہت کا حامل...... سرخ بالوں کا حامل...... یہ آدم خوری کے لئے مشہور تھا...... چھوٹی جسامت کا حامل ییٹی جو ہمالیہ کے جنگلوں میں پایا جاتا تھا...... غالباً وہ بندر تھا۔ پہلی دو اقسام زیادہ مشہور تھیں۔

ییٹی کے اسرار اور بھید کی تحقیقات سرانجام دینے والے بہت سے افراد اس برفانی انسان کی کھالوں اور کھوپڑیوں سے بھی بالمقابل ہوئے تھے اور نیپالیوں نے ہیلری کی جماعت کو بھی ییٹی کی کھالیں پیش کی تھیں۔ انہوں نے اس کی منہ مانگی قیمت وصول کی تھی کیونکہ دیار غیر میں بھی ییٹی کے بارے میں دلچسپی لی جا رہی تھی۔ انہوں نے ایک کھال 300 روپے میں خریدی تھی۔ جو مابعد تبت کے ایک نیلے ریچھ کی کھال نکلی تھی۔

انہوں نے 18,000 فٹ کی بلندی پر رپی منہ گلیشیر پر تبت کی سرحد کے قریب ییٹی کے قدموں کے پہلے نشانات دیکھے تھے۔ پہلی نظر میں یہ نشانات ایک بڑے اور ننگے انسانی پاؤں کے نشانات دکھائی دیتے تھے۔ چونکہ آگے ایک چٹان گری ہوئی تھی لہٰذا یہ نشانات غائب ہو چکے تھے۔ اس جماعت کے بہت سے اراکین اس امر پر یقین نہیں رکھتے تھے کہ یہ ییٹی کے پاؤں کے نشانات تھے۔ اس کے دو دن بعد مزید نشانات دیکھنے کو ملے تھے۔ یہ نشانات بھی اسی گلیشیر پر 18,400 فٹ کی بلندی پر پائے گئے تھے۔ لیکن یہ نشانات کسی مویشی کے قدموں کے نشانات تھے جو سورج کے اثر سے مسخ ہو چکے تھے۔

وہ سولو کھمبو کی جانب روانہ ہوئے...... یہ علاقہ براہ راست ایورسٹ کے جنوب میں واقع تھا اور ییٹی کی روایات کا مرکز بھی تھا۔ انہیں 19,000 فٹ کی بلندی پر ایک درہ عبور کرنا تھا...... تاشی پہچا...... یہ زیادہ گرمی کے موسم میں کھلا ملتا تھا اور اس وقت ماہ اکتوبر تھا۔ اس درے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا اایک مشکل ترین درہ ہے۔

اس خطرناک درے کی چوٹی پر انہوں نے بکریوں کا ایک ریوڑ دیکھا جسے چھ گلہ بان (چرواہے) درے کے پار لے جا رہے تھے۔

وہ بیرونی دنیا کے ساتھ باہم روابط رکھنے کے لئے ریڈیو استعمال کرتے تھے۔ انہیں اچانک یہ احساس ہوا کہ ان کے ریڈیو کو چینی حکام جان بوجھ کر جام کر رہے تھے۔ پہلے پہل انہوں نے یہ خیال کیا کہ چینی حکام یہ تصور کر رہے تھے کہ قابل نفرت اور مکروہ برفانی انسان کے ضمن میں ان کی معصومانہ تحقیقات ایک خطرناک مہم کے سوا کچھ نہ تھیں۔ تاہم ان کا یہ خیال درست ثابت نہ ہوا کیونکہ انہوں نے دور دراز تبت کے پہاڑوں کے

پیچھے سے ایک راکٹ کو اپنی جانب بڑھتا دیکھا۔ اس کے بعد ان کے ریڈیو کو جام کرنے کا سلسلہ موقوف کر دیا گیا۔

کھم جنگ کے مقام پر جو ایک پہاڑی دیہات تھا انہیں ییتی کی ایک کھوپڑی دکھائی گئی۔ یہ ایک مقامی خانقاہ کی بیش قیمت ملکیت تھی۔ اس کی بخوبی حفاظت سرانجام دی جاتی تھی اور اسے انتہائی فخر کے ساتھ اس مہم کے ارکان کو دکھایا گیا تھا۔

یہ کھوپڑی کافی پرانی تھی۔ یہ مصنوعی کھوپڑی ہونے کے شک وشبے سے بالاتر دکھائی دیتی تھی۔ ہلیری اور اس کی جماعت کے دیگر ارکان نے اس کھوپڑی میں ازحد دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔

ان کو کھم جنگ کے ییتیوں کی روائتوں اور اس کھوپڑی کے ماخذ کے بارے میں بتایا گیا۔ یہ سب کچھ انہیں اس دیہات کے بزرگوں نے بتایا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ دو صدیاں پیشتر اس ضلع پر ییتیوں نے دھاوا بول دیا تھا جو اس علاقے کے لوگوں کو چٹ کر جاتے تھے۔ اس طرح انسانوں کی نسبت ییتیوں کی تعداد زیادہ ہوگئی تھی کیونکہ کئی انسانوں کو وہ اپنا لقمہ بنا چکے تھے تب کئی ایک ہوشیار لامہ سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور انہوں نے درج ذیل طریقے سے ییتیوں کی تباہی و بربادی کا سامان کیا۔

"ییتی نقال ہوتے ہیں۔ لہٰذا چالاک اور ہوشیار لامہ نے دیہاتیوں کے مابین شراب نوشی اور بدمستی کی ایک پارٹی ترتیب دی۔ کھم جنگ کے لوگوں نے شراب پینے کی محض اداکاری کی اور شراب کے نشے میں ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے کی اداکاری کی۔ انہوں نے تلواریں نکال لیں اور ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے لگے۔ اور مرنے کی اداکاری کرنے لگے۔ لیکن یہ تلواریں محض لکڑی کی بنی ہوئی تھیں اور رات کے وقت یہ لوگ رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اپنے ٹھکانوں کو جا پہنچے اور اس مقام پر کثیر مقدار میں شراب اور اصلی تلواریں چھوڑنا نہ بھولے۔

ییتی پہاڑوں پر سے انہیں شراب نوشی کرتے اور آپس میں تلواروں کے ساتھ لڑتے دیکھ چکے تھے۔ وہ گاؤں میں آن پہنچے اور انسانوں کی نقل کرنے لگے۔ تمام رات وہ شراب نوشی کرتے رہے اور نشے میں بدمست دیہاتیوں کی چھوڑی ہوئی اصلی تلواروں کے ساتھ آپس میں لڑتے رہے۔ صبح ہونے تک وہ ایک دوسرے کو ہلاک کر چکے تھے۔ محض ایک ییتی زخمی حالت میں زمین پر پڑا تھا۔ اس کو ہلاک کیا گیا اور اس کی کھوپڑی اتار لی گئی۔ اور یہ وہی کھوپڑی تھی جسے محفوظ کر لیا گیا تھا۔"

یہ ایک اچھی کہانی تھی اگرچہ کسی نے حقیقی طور پر اس پر یقین نہ کیا تھا۔

کھم جنگ سے وہ لوگ تھیانگ بوچی کی جانب روانہ ہوئے...... خانقاہ کا حامل ایک دیہات...... یہ دیہات پہاڑوں سے پیار کرنے والے حضرات کے لئے دنیا کا ایک خوبصورت ترین دیہات ہے۔ یہ ایورسٹ کے لاثانی اور بے نظیر نظاروں کا حامل دیہات ہے...... تقریباً پندرہ میل کی دوری پر واقع ہے اور ییتی کے اسراروں اور بھیدوں سے بھرا پڑا ہے۔

خانقاہ کے لامہ برفانی انسانوں سے واقف تھے۔ وہ ان کو ڈرانے اور بھگانے کے لئے خانقاہ کے بگل بجاتے تھے اور ڈھول پیٹتے تھے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ برفانی انسان باقاعدگی کے ساتھ جنگل میں کھیلتے تھے اور یہ دیہات کی کئی ایک لڑکیوں کو اٹھا کر اپنے ٹھکانوں پر لے گئے تھے اور مابعد

ان سے ان کی اولادیں بھی پیدا ہوتی تھیں۔

اس مہم کے اراکین نے لامہ کو سوال کیا کہ کیا انہوں نے کسی ییتی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔لیکن ان کا جواب سن کران کو مایوسی ہوئی۔ کسی بھی لامہ نے ییتی کو اپنی آنکھوں کے ساتھ جنگل میں کھیلتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ہاں البتہ انہوں نے ان کے چیخنے چلانے کی آوازیں ضرور سنی تھیں۔انہوں نے بتایا کہ ان کے آباؤ اجداد ییتیوں کو دیکھا کرتے تھے۔

اس کے بعد اس مہم جو ٹیم کے اراکین کھم جنگ واپس چلے آئے اور ان سے دریافت کیا کہ کیا وہ اپنے ییتی کی کھوپڑی ان کو دے سکتے تھے تاکہ وہ اسے امریکہ یا یورپ لے جاسکیں تاکہ اس پر سائنسی بنیادوں پر تحقیقات سرانجام دی جاسکے۔

بہت زیادہ بحث مباحثے کے بعد ان کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت گاؤں کے بڑے بوڑھے اس امر پر رضامند ہو گئے کہ وہ ان کو چھ ہفتوں کے لئے یہ کھوپڑی مستعار دیں گے اور اس کے عوض مہم جو پارٹی کھم جنگ کی بدھ مت عبادت گاہ کو آٹھ ہزار روپے دینے پر آمادہ ہو گئی اور یہ بھی طے پایا کہ گاؤں کا ایک بزرگ خنجو چنبی ییتی کی کھوپڑی کے ہمراہ رہے گا اور یہ کھوپڑی جہاں بھی جائے گی وہ اس کے ہمراہ جائے گا اور اس کے اخراجات مہم جو ٹیم برداشت کرے گی۔

لہٰذا یہ مختصر جماعت جس کے ہمراہ ییتی کی کھوپڑی بھی تھی حقائق کی تلاش میں عازم سفر ہوئی۔خنجو چنبی کے علاوہ اس جماعت میں درج ذیل افراد شامل تھے:۔

☆ سرایڈمنڈ ہیلری

☆ مارٹن پرکنز...... پارٹی کا ماہر حیوانات

☆ ڈسمنڈ ڈوگ...... پارٹی کا نمائندہ پریس اور ترجمان

بے شک یہ درجہ اول کی اخباری کہانی تھی۔یہ لوگ براستہ کھٹمنڈو...... بنکاک اور ہونولولو شکاگو کی جانب محو پرواز ہوئے۔شکاگو میں چنبی کی جانب بھی اس قدر توجہ دی گئی......اس میں بھی اس قدر دلچسپی کا اظہار کیا گیا جس قدر توجہ ییتی کی کھوپڑی پر دی گئی اور جس قدر دلچسپی کا اظہار اس کھوپڑی میں کیا گیا۔نیشنل ہسٹری میوزیم کے سائنس دانوں نے اس کھوپڑی پر تحقیقات سرانجام دیں۔اس کے بعد یہ جماعت پیرس کی جانب محو پرواز ہوئی جہاں کھوپڑی کا ایک اور سائنسی معائنہ سرانجام دیا گیا اور اس کے بعد یہ جماعت لندن کے لئے محو پرواز ہوئی جہاں پر رائل زولاجیکل سوسائٹی کے ماہرین نے بھی اس کھوپڑی کا معائنہ سرانجام دیا۔تمام تر ماہرین کی متفقہ رائے تھی کہ یہ کھوپڑی نقلی تھی۔یہ غالباً اتنی ہی پرانی تھی جتنی پرانی ہونے کے بارے میں بتایا گیا تھا......یعنی دو تا تین صد برس پرانی......لیکن یہ نقلی چمڑے سے تیار کی گئی تھی۔

اس کے بعد یہ پارٹی دوبارہ عازم کھٹمنڈو ہوئی تاکہ اس نادر نمونے کو ان کے مالکان کے حوالے کر سکے۔ان لوگوں کو اس کے اصلی ہونے میں کوئی شک وشبہ نہ تھا۔وہ مغرب کے دانش وروں اور ماہرین کی بات ماننے کو تیار نہ تھے۔اہل مشرق یہ یقین نہیں رکھتے کہ دانش وری ان کے علاوہ دنیا کے کسی اور حصے میں بھی پائی جاتی ہے۔

ایڈمنڈ ہیلری نے ییٹی کی مہم کو انتہائی دلچسپ پایا اور پُر لطف بھی پایا۔ وہ اس امر پر یقین رکھتا تھا کہ ییٹی کے قدموں کے نشانات ہرگز کسی برفانی انسان کے قدموں کے نشانات نہ تھے۔ بلکہ کسی چھوٹے جانور یا مویشی کے قدموں کے نشانات تھے اور سورج کی تپش نے ان نشانات کو پھیلا کر بڑا کر دیا تھا۔

اس مہم جو جماعت کو کوئی ایسی مؤثر شہادت میسر نہ آئی جس کے تحت ییٹی کو بہ نفس نفیس دیکھا گیا ہو۔ ییٹی کی موجودگی محض ایک پراپیگنڈا تھا۔ اور لوگوں کے لئے یہ برفانی انسان ایک مافوق الفطرت مخلوق تھی بالکل اسی طرح جس طرح دیوتا جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر سکونت پذیر تھے۔

......❁......

سرفرانس شیشٹر کا تن تنہا دنیا کے گرد چکر

28 مئی 1967ء کو رات کے نو بجنے میں چار منٹ باقی تھے۔ جدید دور کا ایک حیران کن بحری سفر اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ شیشٹر واپس لوٹ چکا تھا اور دنیا اظہار مسرت کر رہی تھی۔ لاکھوں لوگ اپنے اپنے ٹیلی ویژن سیٹ کی اسکرین کو بغور گھور رہے تھے۔ وہ اپنی کرسیوں پر براجمان آگے کی جانب جھکے ہوئے ٹیلی ویژن کی اسکرین پر اپنی نظریں جمائے ہوئے تھے۔ وہ اپنے ٹیلی ویژن کی اسکرین پر عظیم لمحہ دیکھنے کے منتظر تھے...... ان کی اسکرینیں تقریباً سیاہ تھیں اور ان جہازوں کی روشنیوں کی زد میں تھیں...... بڑے اور چھوٹے جہاز...... وہ جہاز جو سرفرانس شیشٹر کو گھر واپس لائے تھے۔

اتوار کی اسی رات جس شب وہ پلے ماؤتھ پہنچا تھا اس نے اپنے شاندار استقبالیہ میں شرکت کی۔ اگرچہ وہ تھکا ماندہ تھا لیکن اس نے تقریر بھی کی۔ استقبالیہ سے خطاب کیا۔ لیکن افسوس کہ چند روز بعد 65 سالہ یہ شخص السر کا شکار ہو گیا۔ اسے فوری طور پر رائل بحریہ ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا اور جب یہ معلوم ہوا کہ وہ اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ ایک ماہ سے قبل ہسپتال سے فارغ نہیں کیا جا سکتا تھا تب اس کی آمد کے سلسلے میں تشکیل دیے جانے والے پروگراموں میں تبدیلی لانا پڑی اور ان کو نئے سرے سے ترتیب دیا گیا۔ وہ ماہ جون میں گرین وچ میں ملکہ سے نائٹ کا خطاب حاصل نہ کر سکا جہاں پر اس سے پہلے ملکہ الزبتھ نے ایک اور فرانس کو اسی خطاب سے نوازا تھا۔ وہ لندن منشن ہاؤس میں لارڈ میئر کے دوپہر کے کھانے میں شرکت کرنے سے بھی قاصر رہا۔ وہ سخت علیل تھا۔

لیکن ماہ جولائی میں وہ دوبارہ فعال ہو چکا تھا۔ اس ماہ کے آغاز میں ہی اس نے ہسپتال کے بستر کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے گائیلز اور بیوی شیلا کے ہمراہ "جپسی موتھ IV" میں عازم سفر ہوا اور لندن جا پہنچا جہاں پر 7 جولائی 1967ء کو ملکہ الزبتھ نے سرفرانس شیشٹر کا گرین وچ میں استقبال کیا...... اسے نائٹ کے خطاب سے نوازا اور اسے فرانس ڈریک کی تلوار سے بھی نوازا۔ نزدیک ہی عظیم تیز رو بحری جہاز "کٹی سارک" ہمیشہ کیلئے بحری میں دھنسا ہوا تھا۔ جلد ہی اس کا چھوٹا سا جہاز بھی اس جہاز کے ساتھ بحری کی زینت بن جانا تھا...... ایک شخص کے خواب...... اور ایک شخص کی جرأت کی مستقل یادگار۔

دیگر افراد بھی دنیا کے گرد چکر لگا چکے تھے۔ کچھ لوگوں نے یہ کارنامہ کشتیوں میں سرانجام دیا تھا جو کہ "جپسی موتھ" سے کہیں چھوٹی تھیں اور انہوں نے بھی یہ کارنامہ تن تنہا سرانجام دیا تھا اور ایسے جہاز ران بھی موجود تھے کہ انہوں نے 65 برس سے زائد عمر میں بھی طویل بحری سفر سرانجام دیے تھے۔

لیکن سرفرانس شیشٹر کی قسمت مثالی تھی۔ اس معمر شخص نے نہ صرف اپنے خواب کو تعبیر بخشی تھی بلکہ کئی ایک فنی کامیابیاں بھی حاصل کی تھیں۔

☆اس نے دنیا کے گرد ایک چھوٹے سے بحری جہاز میں تیز ترین سفر سرانجام دیا تھا...... دوگنی رفتار کے ساتھ طے کیا تھا۔

☆اس نے کسی دوسرے بحری جہاز کے تعاون کے بغیر یہ سفر طے کیا تھا۔

☆اس نے دنیا کے گرد تن تنہا چکر لگانے والے کسی بھی شخص سے دوگناہ سفر طے کیا تھا۔

☆اس نے کسی بھی تن تنہا شخص کے ایک ہفتے کے اندر طے کئے جانے والے سفر کا دو مرتبہ ریکارڈ توڑا تھا...... جو ایک سو میل سے زائد تھا۔

☆اس نے کسی بھی تن تنہا شخص کے طویل سفر کا ریکارڈ بھی توڑا تھا...... جاتی مرتبہ بھی...... اور واپس آتے ہوئے بھی...... یہ ریکارڈ 53 دن تک کے لئے 122½ میل فی دن تھا...... اس نے 107 دن تک کے لئے 131¾ میل فی دن کے حساب سے سفر طے کیا تھا...... یہ اس کے سفر پر روانہ ہونے کا ریکارڈ تھا...... اور واپسی کے سفر کے دوران اس نے 119 دن تک کے لئے 130½ میل فی دن کے حساب سے سفر طے کیا تھا۔

اس کی کامیابیاں نمایاں اور اہم تھیں۔ اس نے دنیا کے گرد تیز تر اور دور تک کا سفر طے کیا تھا اور کسی نے بھی کسی چھوٹی کشتی میں اتنا تیز تر اور دور تک سفر سرانجام نہ دیا تھا۔ لہٰذا اس کا کارنامہ قابل فخر کارنامہ تھا۔

فرانسس شسٹر کئی مرتبہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال چکا تھا اور اس نے کئی مرتبہ موت کو شکست دی تھی۔ وہ نہ صرف سمندر اور فضا میں برسر پیکار رہا تھا بلکہ سرطان کی بیماری کے ساتھ بھی برسر پیکار رہا تھا۔

ایک کارنامہ سرانجام دینے کے بعد اس کے ذہن میں یہ سوال گردش کرنے لگتا تھا کہ اس کے بعد کیا کارنامہ سرانجام دیا جائے؟

وہ دوسرا فرد تھا جس نے برطانیہ تا آسٹریلیا تن تنہا پرواز سرانجام دی تھی (1931ء میں)۔

وہ دنیا کے گرد فضائی چکر لگانے میں مصروف تھا کہ ایک جاپانی بندرگاہ پر ٹیلی فون کی تاریں اس کی راہ کی رکاوٹ بن چکی تھیں۔ لہٰذا اسے زمین پر اترنا پڑا اور وہ اپنے اس منصوبے سے دست بردار ہو گیا اور اس کی بجائے اس نے دنیا کے گرد بحری چکر لگانے کا فیصلہ کیا۔

جنگ نے مداخلت سرانجام دی لیکن جنگ ختم ہونے کے چند برس بعد اس نے بحر اوقیانوس میں پہلی تن تنہا ریس جیتی۔

اس نے "جپسی موتھ III" ...... 13 ٹن وزنی جہاز ...... میں پلے ماؤتھ تا نیویارک کا سفر 1960ء میں 40 روز میں طے کیا تھا۔ اسے "سال کے بہترین کشتی ران" کے خطاب سے نوازا گیا۔

اس نے بحر اوقیانوس میں تن تنہا کئی سفر سرانجام دیے اور مابعد دنیا کے گرد تن تنہا چکر لگانے کا فیصلہ کیا۔ اسے مالی سہولت میسر نہ تھی اور وہ جانتا تھا کہ مستحکم مالی صورت حال کی عدم موجودگی میں اس کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کی مالی ضرورت کا کچھ حصہ اس طرح پورا ہوا کہ اس نے "دی ٹائمز" اور "دی گارڈین" کے ساتھ معاہدے سرانجام دیے۔ ان معاہدوں کی روح سے اسے اپنے تمام تر سفر کے دوران اپنے سفر کے بارے میں ریڈیو رپورٹیں ان اخبارات کو روانہ کرنی تھیں جنہیں ان اخبارات کی زینت بننا تھا...... ان اخبارات میں چھپنا تھا۔ اخراجات کا بقایا حصہ کچھ اس طرح پورا کیا گیا کہ اس نے ان تیار کنندگان سے معاہدے سرانجام دے جو یہ چاہتے تھے کہ وہ ان کی تیار کردہ خوراک...... مشروبات اور ملبوسات اپنے ہمراہ لے جائے اور ان کی پبلسٹی سرانجام دے اور اس کے بدلے انہوں نے اسے مطلوبہ رقم فراہم کر دی۔ یہی وجہ تھی کہ جب "جپسی

موتھ'' تیار ہوا اور پانی میں اتارا گیا اس وقت اس کے مالک کے نے بیس بال کی ٹوپی پہن رکھی تھی جس پر انٹرنیشنل وول کی علامت نمایاں تھی۔

پیشتر اس کے کہ ''جپسی موتھ'' اپنے حتمی سفر پر روانہ ہوتا اسے بے شمار دیگر مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ روپے پیسے کی بھی کمی درپیش تھی۔ اسے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ ڈیزائنر اور جہاز کی تعمیر میں حصے لینے والے افراد مخصوص فنی اصطلاحات کو مدنظر نہیں رکھ رہے تھے۔ اس کے علاوہ بھی کئی ایک دیگر چھوٹے موٹے حادثات منظر عام پر آتے رہے اور وہ اپنی ٹانگ کی تکلیف کے ساتھ اپنے جہاز پر سوار ہوا۔

وہ پلے موتھ سے اپنے سفر پر روانہ ہوا۔ اس وقت دن کے ٹھیک گیارہ بجے تھے۔ اس روز ہفتے کا روز تھا اور تاریخ 27 اگست 1966ء تھی اور ایک سو دن میں وہ سڈنی پہنچ چکا تھا۔ اس مقام پر اس نے دوپہر کا کھانا تناول کیا اور کچھ دیر آرام کیا۔

اس کے بعد وہ دوبارہ اپنے جہاز پر موجود تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ کھلے سمندر میں اسے سمندر کی بیماری اور دردیں لاحق ہو جائیں گی۔

لیکن اس کی بیماری بذات خود ہی رفع ہو گئی اور اس کی ٹانگ کی درد بھی جاتی رہی۔ تین ہفتے مزید گزر چکے تھے جبکہ اس نے انتہائی خاموشی کے ساتھ اپنی 65 ویں سالگرہ منائی۔ وہ شمپین اور کاک ٹیل سے لطف اندوز ہوا۔ وہ شام کو شمپین اور کاک ٹیل سے لطف اندوز ہوا تھا لیکن اس کی سالگرہ کا آغاز صبح سویرے سے ہی ہو چکا تھا۔ اس نے دوپہر کے کھانے میں شراب کی وہ بوتل استعمال کی جو اس کے احباب نے اسے اس تقریب کے لئے خصوصی طور پر پیش کی تھی۔ وہ اپنی سالگرہ کے دن کا اختتام برانڈی کے ساتھ لطف اندوز ہوتے ہوئے کرنا چاہتا تھا اور اس نے ایسا ہی کیا۔

پانچ روز بعد اس نے خط استوا عبور کیا۔ ہفتے گزرتے گئے اور سفر طے ہوتا رہا۔ اس کے جہاز ''جپسی موتھ'' میں خرابی کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔

اس کے جہاز کا جنریٹر...... جو روشنی کے لئے بیٹریاں چارج کرتا تھا اور جس کی معاونت سے ریڈیو اپنی کارکردگی سرانجام دیتا تھا...... اس جنریٹر نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کو یہ محسوس کر کے بھی مایوسی ہوئی کہ وہ پانی کا استعمال زیادہ کر رہا تھا اور پانی کا ذخیرہ مائل بہ کمی تھا۔ اس نے ریڈیو کے ذریعے کیپ ٹاؤن سے یہ ہدایت حاصل کی کہ جنریٹر کا نقص کس طرح دور کرنا تھا۔ اسی رات بارش برتی اور اس کے پانی کی قلت کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

18 اکتوبر کو یہ اپنا نصف سفر طے کر چکا تھا۔ وہ 7,300 میل کا سفر طے کر چکا تھا اور 6,570 میل کا سفر طے کرنا ابھی باقی تھا۔ اس کے ریڈیو میں بھی کچھ خرابی واقع ہو چکی تھی۔ لیکن اسے اپنا وعدہ ہر حال میں نبھانا تھا...... اور اسے ان اخبارات کے لئے اپنے سفر کی رپورٹیں روانہ کرنی تھیں جن کے ساتھ اس نے ان رپورٹوں کی فراہمی کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ کبھی کبھار 250 الفاظ پر مشتمل رپورٹ روانہ کرنے کے لئے اسے ڈیڑھ گھنٹہ صرف کرنا پڑتا تھا۔

جمعرات 15 نومبر کو ایک اور سانحہ پیش آیا۔ سلف اسٹیرنگ گیئر ٹوٹ چکے تھے اور ان کو مرمت کرنے کی اس کی تمام تر کوششیں بیکار ثابت ہو چکی تھی۔

اس نے اپنی ڈائری میں تحریر کیا کہ:۔

''میرا منصوبہ اکارت جاتا دکھائی دیتا تھا۔ ایک سو دن میں سڈنی پہنچنے کا میرا منصوبہ ناکامی کا شکار ہوتا دکھائی دیتا تھا اور کسی

اپالو 13......اور چاند

''ہمیں یہاں پر مسئلے کا سامنا ہے......''

اوران چند پُرسکون الفاظ کے ساتھ جو خلا سے 205,000 میل کی بلندی سے زمین پر ٹکرائے تھے......اس امر کا آغاز ہوا جسے ''عالمگیر'' ڈرامے کے عنوان سے تعبیر کیا جاسکتا ہے......اور یہ ڈرامہ اس قدر عظیم تھا کہ اس قدر عظیم ڈرامے کا تجربہ بنی نوع انسان نے اس سے پیشتر کبھی نہیں کیا تھا۔

یہ بھی کہا جارہا تھا کہ بنی نوع انسان نے خلا کے بارے میں زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرلیا تھا اور وہ ان مشکلات اور رکاوٹوں سے نپٹنے کے تیار تھا جو اسے گذشتہ عشروں کے دوران درپیش تھیں۔

خلاء میں پہلی پرواز ایک روسی خلاباز نے سرانجام دی اور مابعد ایک امریکی خلاباز نے بھی یہی کارنامہ سرانجام دیا تھا......اس کے بعد ایک ناقابل یقین وقوعہ پیش آیا......امریکن اپالو 11 کے ذریعہ پہلے انسان نے جولائی 1969ء میں چاند پر قدم رکھا اور یہ ایک اہم ترین پیش رفت تھی۔

لیکن اپالو 13 کا سانحہ......نو ماہ کے اندر اندر چاند پر تیسری بار اترنے کا عمل...... یہ سانحہ ایک دوسرا سانحہ تھا۔ نیل آرم اسٹرونگ......چاند پر پہلا انسان......اس نے بڑے محتاط انداز میں چاند پر قدم رکھا تھا اور 600 ملین سامعین اور ٹیلی ویژن پر اس منظر کو دیکھنے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

''یہ انسان کے لئے ایک چھوٹا سا قدم ہے......لیکن انسانیت کیلئے ایک دیوقامت جست ہے''

اپالو 13 پر 1,700 صفحات پر مبنی چاند پر اترنے کی رپورٹ......اگرچہ چاند پر اترا ہی نہ گیا تھا......خلا کی تحقیق میں ایک سنگ میل کی اہمیت کی حامل ہے۔

ایک سنگ میل......ایک یادگار......اپالو 13 کے خلابازوں کو واپس بحفاظت زمین پر اتارا گیا اور اس عمل درآمد میں ہزاروں انسانوں نے اپنی کاوش سرانجام دی۔

دیگر منصوبہ بند چاند مشن روانہ کیے گئے......اور یہ مشن کامیابی کے ساتھ اپنی تکمیل کو جا پہنچے تھے۔ اپالو کی سیریز کو یہ اجازت فراہم نہیں کی جاسکتی تھی کہ اس کا خاتمہ کسی سانحہ پر ہو۔ لیکن یہ سیریز اب اپنے اختتام کو پہنچ چکی ہے۔ بنی نوع انسان 1970ء کے ایک ہفتے کے دوران اتنا کچھ سیکھ چکا تھا جتنا کچھ وہ دس برس کے عرصے کے دوران بھی نہ سیکھ سکتا تھا......اب وہ لاگت کا تخمینہ لگاسکتا تھا اور بیلنس شیٹ تیار کرسکتا تھا۔ اس شیٹ کی ایک جانب بھاری اخراجات جو وقت اور بلین ڈالروں اور روبل کی شکل میں برداشت کرنا ہوتے تھے اور دوسری جانب نسبتاً کم تعداد ان بنی نوع انسانوں کی جو ہلاک ہوچکے تھے......ایک اور جانب وہ علم جو بنی نوع انسان نے خلا کے بارے میں حاصل کیا تھا......اور اس کی مشکلات کے بارے میں حاصل کیا تھا۔

مقام پر رکے بغیر سفر سرانجام بھی ناممکن دکھائی دیتا تھا۔"

اسے اب سڈنی پہنچنے کی بجائے کسی نزدیکی خشکی کا رخ کرنا تھا۔لیکن 17 تاریخ تک وہ اپنا ذہن بدل چکا تھا۔اس نے سڈنی پہنچنے کا ارادہ کرلیا تھا......وہ اپنی شکست تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھا۔

بالآخر وہ 12 دسمبر کو بعد از دوپہر ساڑھے چار بجے سڈنی پہنچ چکا تھا۔اس نے یہ سفر 107 دنوں اور ½5 گھنٹوں میں طے کیا تھا۔وہ اب تک 14,100 میل کا کل سفر طے کرچکا تھا۔

سڈنی میں اس کا شاندار استقبال ہوا۔ریڈیو......ٹیلی ویژن اور اخبارات کے نمائندے سے موجود تھے۔یہاں پر اس کے جہاز کی مرمت بھی سرانجام دی گئی اور اس کا بھی پُر جوش خیر مقدم کیا گیا۔چھ ہفتوں کے بعد 29 جنوری کو وہ سڈنی سے روانہ ہوا۔اس وقت اس کا جہاز بہتر حالت میں تھا۔

وہ نیوزی لینڈ کے جنوب کی بجائے شمال کی جانب روانہ ہوا حالانکہ اسے یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ نیوزی لینڈ کے جنوب کی جانب روانہ ہو۔اسے سڈنی سے روانہ ہوئے 52 دن گزر چکے تھے۔اس سے محض آدھ میل کی دوری پر ایک جنگی جہاز موجود تھا۔وہ اس جنگی جہاز کو دیکھ کر از حد حیران ہو۔یہ جہاز برطانوی ایچ۔ایم۔ایس "پیرونگیر" تھا۔وہ اس پر فلاحی نظر رکھے ہوئے تھا۔اب وہ شمال۔مشرق کا راستہ اختیار کررہا تھا اور اب وہ واپس گھر کی جانب عازم سفر تھا۔اس کے جذبے جوان تھے اگرچہ وہ جنگی جہاز کو دیکھ کر قدرے غم و غصے کا شکار ہوئے بغیر نہ رہا تھا چونکہ وہ گھر کی جانب سفر طے کررہا تھا لہٰذا وہ خوش تھا۔24 اپریل کو اس نے خط استوا عبور کیا اور شمال کی جانب کا رخ کیا۔

ابھی اس کے سفر کے 210 میل باقی تھے کہ آزاد ٹیلی ویژن کے دو جہاز یکے بعد دیگرے اس کے نزدیک آن پہنچے۔

چند میل دور لوگ پولی ماؤتھ جمع ہونے شروع ہوچکے تھے تاکہ اس کو خوش آمدید کہہ سکیں اور اس کا استقبال کرسکیں......اتوار کے روز......جس روز اس نے واپس پہنچنا تھا......ہزاروں افراد کا ہجوم اس کو خوش آمدید کہنے کے لئے اکٹھا ہوچکا تھا اور لاکھوں لوگ ٹیلی ویژن کی اسکرینوں کے گرد جمع تھے۔اتوار کی شب کا آغاز ہوچکا تھا......لوگ ابھی تک اس کو خوش آمدید کہنے کے لئے جوق در جوق آرہے تھے......انہوں نے اندھیرے کی اوٹ سے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی کشتی میں ایک معمر شخص آہستہ آہستہ اسی بندرگاہ کی جانب واپس لوٹ رہا تھا جس بندرگاہ سے وہ نو ماہ پہلے دنیا کے گرد چکر لگانے کے لئے روانہ ہوا تھا۔

تاریخ کے چھوٹے ترین جہاز نے اپنا سفر مکمل کرلیا تھا......اس کی مہم 119 روز تک جاری رہی تھی۔اس نے روزانہ اوسطاً 130 میل کی رفتار سے سفر طے کیا تھا۔اس دوران اس نے تمام تر سابقہ ریکارڈ توڑ ڈالے تھے۔

وہ جانتا تھا کہ اس کی زندگی کے دن گنے جاچکے تھے۔بالآخر 1972ء میں موت نے اسے آن دبوچا تھا اور سرطان نے اس ناقابل شکست انسان کو شکست سے دوچار کردیا تھا۔

اپالو 13 مشن کا آغاز ایک کامیاب آغاز تھا۔ یہ مشن کامیابی کے ساتھ شروع ہوا تھا اور اس حقیقت کے بارے میں وہ تمام لوگ بتا سکتے جو اس مشن کے آغاز کو دیکھ رہے تھے یا سن رہے تھے۔

درحقیقت...... جیسا کہ مابعد رپورٹ سے واضح ہوا...... اس کی تیاری کے عمل کے دوران ہی کچھ خامیاں باقی رہ گئی تھی۔ عین ممکن تھا کہ حتمی پڑتال کے موقع پر ان خامیوں کو نظرانداز کر دیا گیا ہو یا پھر یہ خامیاں کسی کے علم میں ہی نہ آئی ہوں...... اپنی جانب سے تمام تر تیاری حقیقی کامیابی کے حصول کیلئے سرانجام دی گئی تھی۔ یہ تیاری ایک حقیقی سائنسی مشن کی کامیابی کے لئے سرانجام دی گئی تھی۔ بے شک کوئی مافوق الفطرت مخلوق ایسی تھی جس کو سیریز کے غیر خوش قسمت نمبر 13 پر اعتراض تھا اور اس مشن کو سانحہ بھی 13 اپریل کو ہی پیش آیا۔

ایک اخباری نمائندے نے تحریر کیا تھا کہ:۔

"اپالو 13 نے شاندار سفر کا آغاز کیا تھا۔"

اس کا وزن 2,900 ٹن سے زائد تھا اور یہ شیر کی موافق گرجتا ہوا فضا میں بلند ہوا تھا۔ اس وقت آسمان بادلوں سے تقریباً خالی تھا۔

اس پر درج ذیل خلاباز سوار تھے:۔

☆ کیپٹن جیمز لوول...... مشن کا کمانڈر

☆ لیفٹیننٹ کموڈور فریڈ ہیس

☆ جیک سواگرٹ

جیک سواگرٹ کو آخری لمحات میں لیفٹیننٹ کموڈور تام مینٹنگ لے کی جگہ ٹیم میں شامل کیا گیا تھا جو چیچک کے مرض کا شکار ہو چکا تھا۔

جلد ہی انہوں نے اپنی رفتار 2,400 میل فی گھنٹہ تک بڑھائی تھی تاکہ وہ کشش ثقل سے آزاد ہو سکیں اور چاند کی جانب پرواز کر سکیں۔

بدھ کے روز انہوں نے چاند پر اترنا تھا کیونکہ منصوبہ بندی اسی طور تشکیل دی گئی تھی۔ چاند گاڑی نے انہیں چاند کی سطح پر اتارنا تھا۔ لوول اور ہیس نے چاند کی سطح پر اترنا تھا۔ اس کی سطح کی تحقیق و تفتیش سرانجام دینی تھی...... نمونے اکٹھے کرنے تھے اور فوٹوگراف لینی تھی اور یہ سب کچھ زمین پر لانا تھا۔

لیکن ان میں سے کوئی کام بھی نہ کیا جا سکا اور جیمز لوول نے "ایک مسئلے" کا اعلان کر دیا۔ وہ آکسیجن اور الیکٹرک پاور سے محروم ہو چکے تھے اور وہاں پر ایک زوردار دھماکہ بھی ہوا تھا۔

لہٰذا یہ فیصلہ کیا گیا کہ چاند پر نہیں اترا جائے گا بلکہ واپسی کا سفر سرانجام دیا جائے گا۔ اس مشن کو کنٹرول کرنے والے افراد حیران تھے کہ کیا یہ خلاباز واپس زمین پر پہنچ بھی پائیں گے یا نہیں۔

مسئلہ وقت کا تھا...... الیکٹرک سٹی (بجلی) اور آکسیجن بڑی تیزی کے ساتھ ختم ہو رہی تھی۔ تمام غیر ضروری روشنیاں فوراً ختم کر دی گئی تھیں۔ خلائی جہاز کی ویلاسٹی بڑھائی جا سکتی تھی تاکہ واپسی کا سفر جلد از جلد طے کرنا ممکن ہو سکے۔ لیکن یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ اس کو آہستہ آہستہ بڑھایا جائے کیونکہ

برق رفتاری کے ساتھ زمین میں دوبارہ داخل ہونا خطرناک بھی ثابت ہوسکتا تھا۔

معجزانہ طور پر وہ زمین کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ اگر چہ ان کے زمین پر اترنے کا مقام اس مقام سے مختلف تھا جو مقام منصوبہ بند کیا گیا تھا لیکن وہ کامیابی کے ساتھ زمین پر اترنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ بہر کیف وہ چاند کی سطح پر اترنے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔

بنی نوع انسان صدیوں سے یہ خواب دیکھ رہا تھا کہ وہ چاند کی سیر کرے۔ گلیلو اور اس کی ٹیلی اسکوپ (دوربین) نے چاند کو زمین کی طرح حرکت کرنے والے ایک اجسام کی شکل میں پیش کیا...... جس میں پہاڑیاں اور وادیاں تھیں...... اور یہ سورج سے روشنی مستعار لیتا تھا۔

لیکن اس سلسلے میں کوئی پیش رفت ممکن نہ ہو سکی حتیٰ کہ دوسری زندگی عظیم میں راکٹ منظر عام پر آئے۔ اب چاند کی سیر کرنے کی ایک ہلکی سی امید دکھائی دینے لگی تھی...... ہوائی جہاز...... 20 ویں صدی کی ایک قابل فخر اور شاندار ایجاد...... اس سلسلے میں بے کار تھے کیونکہ ان کی اڑان کیلئے ہوا ضروری تھی...... اور بنی نوع انسان جان چکا تھا کہ خلا میں ہوا مفقود تھی۔

برطانیہ پر حملہ کرنے...... اور شاید اسے صفحۂ ہستی سے مٹانے اور نیست و نابود کرنے کی غرض سے جرمنوں نے وی II راکٹ ایجاد کیا تھا۔ یہ ایجاد ان کے عظیم ترین سائنس دان ورنر وون براؤن کی کاوش تھی...... یہ کسی بھی سابقہ ایجاد سے بڑا اور قوی تر تھا...... اس کی لمبائی 46 فٹ تھی اور وزن 12 ٹن تھا۔

یہ برطانیہ کی خوش قسمتی تھی کہ اس راکٹ کی تیاری سے پیشتر ہی جنگ کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ وون براؤن اپنی ٹیم کے ہمراہ روس سے فرار حاصل کرتے ہوئے امریکہ آن پہنچا تھا۔ دونوں ممالک سائنسی ترقی کی دوڑ میں مصروف تھے اور امریکہ اس کا مشکور تھا۔ اس کے ہاتھ ایک بہت بڑا انعام لگ چکا تھا اور روس بھی یہ جانتا تھا کہ اس کے ہاتھ سے کیا کچھ نکل چکا تھا۔

لیکن روس کی فنی اور سائنسی مہارت کی داد دی جانی چاہیئے کہ پہلا خلائی جہاز اس نے چاند کی جانب روانہ کیا تھا...... سپٹنک I...... اور یہ خلائی جہاز 4 اکتوبر 1957ء کو چاند پر بھیجا گیا تھا۔ ایک ماہ بعد سپٹنک II بھی روانہ کر دیا گیا تھا۔ اس خلائی جہاز میں ایک کتا محوسفر تھا۔ یہ کتا آکسیجن کی کمی کے باعث ہلاک ہو گیا تھا۔ جانوروں سے پیار کرنے والے افراد اس سانحہ پر افسوس کئے بنا نہ رہ سکے تھے لیکن کچھ اہم ترین چیز وقوع پذیر ہو چکی تھی۔

کئی ماہ گزر چکے تھے...... امریکہ بھی خلائی جہاز خلا میں روانہ کر چکا تھا...... ایکسپلورر I...... اس کے بعد دیگر خلائی جہاز بھی خلا میں بھیجے گئے...... امریکہ اور روس دونوں اس کاوش میں مصروف رہے۔ لیکن ہر کوئی جانتا تھا کہ انسان کو خلا میں اتارنے کے یہ ابتدائی اقدامات تھے جو سر انجام دیے جا رہے تھے۔

انسان کو چاند پر اتارنے کی کوششیں جاری رہیں لیکن 25 مئی 1961ء کو امریکی صدر جان ایف کینیڈی نے اپنی تاریخی تقریر کی کہ:۔

''مجھے امید واثق ہے کہ یہ قوم اس عشرے کے خاتمے تک اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جائے گی...... انسان کو چاند پر اتارنے کا مقصد...... اور اس کو بحفاظت زمین پر واپس لانے کا مقصد......''

پراجیکٹ اپالو جنم لے چکا تھا......اس کی کامیابی کی چابی قوت تھی......راکٹ کی قوت......ورنر وون براؤن کی کاوشوں کے نتیجے میں سٹرن راکٹوں کی پہلی عظیم سیریز اپنے ٹیسٹ کے انتظار میں تھی۔

1961ء اور 1965ء کے دوران وون براؤن نے دس سٹرن راکٹ فائر کیے۔

اس کے بعد سٹرن V تیار کیا گیا اور اس کو فائر کیا گیا......اس کے بعد اپالو IX......اپالو X معرض وجود میں آئے۔

یہ اس سفر کی تاریخ تھی۔ آرام اسٹرونگ اور الڈرن 75 گھنٹے اور 57 منٹوں میں چاند تک کا سفر طے کر چکے تھے۔

یہ ایک حیران کن اور پُر مسرت کامیابی تھی اور دنیا اس کامیابی پر خوش تھی۔ روس نے یہ اعلان کیا کہ انسان کو چاند پر اتارنا اس کے لئے ایک ثانوی بات تھی......یہ ان کے پروگرام میں ثانوی حیثیت کا حامل ایک امر تھا......وہ خلا کیلئے دیگر پروگراموں کے حامل تھے......کافی عرصہ بعد انہوں نے ایک خلائی جہاز چاند پر اتارا جس میں کوئی انسان سوار نہ تھا۔

امریکہ بھی دیگر پروگراموں کا حامل تھا......مستقل خلائی اسٹیشن قائم کرنا......دیگر سیاروں کو دریافت کرنا......اور مزید کئی کارگزاریاں سرانجام دینا اس کے پروگراموں کا حصہ تھیں۔

......❁......

ختم شُد